معارف القرآن

جلد چہارم

سورۂ اعراف، انفال، توبہ، یونس، ہود

پارہ ۹ رکوع ۲ تا پارہ ۱۲ رکوع ۱۰

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف
کراچی

معارف القرآن

ادارۃ المعارف

کراچی ۱۴ پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه

ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا

من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له

ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له

ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله

صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين

معارف القرآن

جلد چہارم

سورۂ اعراف، سورۂ توبہ، سورۂ یونس، سورۂ ہود ▫ پارہ: ۹، رکوع: ۲ تا پارہ: ۱۲، رکوع: ۱۰

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتئ اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم

ادارۃ المعارف کراچی

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

فون نمبر 021-99332012 — موبائل نمبر 0300-3311811

جامع مسجد آرام باغ کراچی

نشانِ مجاریہ: آر۔آر۔او(اوقاف)
R.O. 41-2021

مورخہ 04-02-2021

تصدیق نامہ

ہم نے ''اِدَارَۃُ المَعَارِف کَراچی'' احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کی مطبوعہ تفسیر ''مَعَارِفُ القُرآن'' مصنفہ حضرت مولانا مفتی مُحمّد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان، جلد چہارم کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد حنیف خالد صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمۂ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کروائی ہے۔ تفسیر ''مَعَارِفُ القُرآن'' کے مکمل متن کو بغور پڑھا گیا، جو اَغلاط تھیں، انہیں بحمد اللہ دُرست کروا دیا گیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ تفسیر ''مَعَارِفُ القُرآن'' حتی الامکان لفظی اور اعرابی اَغلاط سے اِن شاء اللہ تعالیٰ پاک ومبرّا ہے۔

نوٹ:۔حکومتِ پاکستان کے قانون کے مطابق کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر 2739 کے تحت تفسیر ''مَعَارِفُ القُرآن'' (جلد چہارم) کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

المصدق

4-2-2021

RESEARCH AND REGISTRATION OFFICER
GOVERNMENT OF SINDH
AUQAF DEPARTMENT

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومتِ سندھ

باہتمام : مُحمّد مُشتاق ستی
طبع جدید : محرم ۱۴۴۴ھ - اگست ۲۰۲۲ء ④
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِدَارَۃُ المَعَارِف کَراچی

عرضِ ناشر:- اگرچہ ''مَعَارِفُ القُرآن'' کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپیوٹر کمپوزنگ و کتابت، طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں سہواً غلطی ہوجاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو برائے کرم مُطّلع فرمائیں۔

اِدَارَۃُ المَعَارِف کَراچی
احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی پوسٹ کوڈ: 75180
فون: 021-35032020، 021-35123161
موبائل: 0300 - 2831960
ای میل: imaarif@live.com

Idaratul-ma-Arif Karachi-14 Pakistan

فہرست مضامین معارف القرآن جلد چہارم

سورۃ ہود

خلاصۂ تفسیر کے متعلق ضروری تنبیہ

''معارف القرآن'' میں خلاصۂ تفسیر سیّدی حکیم الاُمت تھانوی قدس سرہٗ کی تفسیر ''بیان القرآن'' سے بعینہٖ لیا گیا ہے، لیکن اس کے بعض مواقع میں خالص علمی اِصطلاحات آئی ہیں، جن کا سمجھنا عوام کے لئے مشکل ہے، احقر نے برعایتِ عوام اکثر ایسے الفاظ کی تسہیل کر کے لکھ دیا ہے، اور جو مضمون بھی خالص علمی تھا، اس کو ''معارف ومسائل'' کے عنوان میں لے کر سہل انداز میں لکھ دیا ہے، واللہ المستعان۔

بندہ محمد شفیع

***

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بقیہ

سُوْرَةُ الْاَعْرَاف

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو ہم نے وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں

لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا

تاکہ وہ گڑگڑائیں پھر بدل دی ہم نے بُرائی کی جگہ بھلائی یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ

قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

پہنچتی رہی ہے ہمارے باپ دادوں کو بھی تکلیف اور خوشی پھر پکڑا ہم نے ان کو ناگہاں اور ان کو خبر نہ تھی

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے اُن پر نعمتیں آسمان

وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾ اَفَاَمِنَ

اور زمین سے لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے اب کیا بے ڈر ہیں

اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَاَمِنَ

بستیوں والے اس سے کہ آپہنچے ان پر آفت ہماری راتوں رات جب سوتے ہوں یا بے ڈر ہیں

اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾ اَفَاَمِنُوْا

بستیوں والے اس بات سے کہ آپہنچے ان پر عذاب ہمارا دن چڑھے جب کھیلتے ہوں کیا بے ڈر ہوگئے

مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾ ع ١٢ ٢

اللہ کے داؤ سے، سو بے ڈر نہیں ہوتے اللہ کے داؤ سے مگر خرابی میں پڑنے والے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے جس کسی بستی میں کوئی پیغمبر بھیجا، اُس میں رہنے والوں کو بدحالی اور تکلیفوں میں گرفتار ضرور کیا، تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ ﴿٩٤﴾ پھر ہم نے کیفیت بدلی، بدحالی کی جگہ خوش حالی عطا فرمائی، یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے، اور کہنے لگے کہ دُکھ سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچتے رہے ہیں۔ پھر ہم نے انہیں اچانک اس طرح پکڑ لیا کہ اُنہیں (پہلے سے) پتہ بھی نہیں چل سکا ﴿٩٥﴾ اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین دونوں طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے (حق کو) جھٹلایا، اس لئے اُن کی مسلسل بدعملی کی پاداش میں ہم نے ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا ﴿٩٦﴾ اب بتاؤ کہ کیا (دوسری) بستیوں کے لوگ اس بات سے بالکل بے خوف ہوگئے ہیں کہ کسی رات ہمارا عذاب اُن پر ایسے وقت آپڑے جب وہ سوئے ہوئے ہوں؟ ﴿٩٧﴾ اور کیا ان بستیوں کے لوگوں کو اس بات کا (بھی) کوئی ڈر نہیں ہے کہ ہمارا عذاب اُن پر کبھی دن چڑھے آجائے جب وہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں؟ ﴿٩٨﴾ بھلا کیا یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی ڈھیل (کے انجام) سے بے فکر ہو چکے ہیں؟ (اگر ایسا ہے) تو (یہ یاد رکھیں کہ) اللہ کی دی ہوئی ڈھیل سے وہی لوگ بے فکر ہو بیٹھتے ہیں جو آخر کار نقصان اُٹھانے والے ہوتے ہیں۔ ﴿٩٩﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (ان مذکورہ اور ان کے علاوہ اور بھی دُوسری بستیوں میں سے) کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو (اس نبی کے نہ ماننے پر اوّل اوّل تنبیہ نہ کی ہو اور تنبیہ کی غرض سے ان کو) ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہوتا کہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں (اور اپنے کفر و تکذیب سے توبہ کریں) پھر (جب اس سے متنبہ نہ ہوئے تو اِستدراجاً یا اس غرض سے کہ مصیبت کے بعد جو نعمت ہوتی ہے اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے اور نعمت دینے والے کی آدمی بالطبع اطاعت کرنے لگتا ہے) ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی یہاں تک کہ ان کو (غنٰی اور صحت کے ساتھ مال و اولاد میں) خوب ترقی ہوئی اور (اس وقت براہِ کج فہمی) کہنے لگے کہ (وہ پہلی مصیبت ہم پر کفر و تکذیب کے سبب نہ تھی ورنہ پھر خوش حالی کیوں ہوتی بلکہ یہ اتفاقاتِ زمانہ سے ہے چنانچہ) ہمارے آباؤ اجداد کو بھی (یہ دو حالتیں کبھی) تنگی اور (کبھی) راحت پیش آئی تھیں (اسی طرح ہم پر یہ حالتیں گزر گئیں جب وہ اس بھول میں پڑ گئے) تو (اس وقت) ہم نے اُن کو دفعۃً (عذابِ مہلک میں) پکڑ لیا اور ان کو (اس عذاب کے آنے کی) خبر بھی نہ تھی (یعنی گو ان کو انبیاء نے خبر کی تھی مگر چونکہ وہ اس خبر کو غلط سمجھتے تھے اور عیش و آرام میں بھولے ہوئے تھے اس لئے ان کو گمان نہ تھا) اور (ہم نے جو ان کو عذابِ مہلک میں پکڑا تو اس کا سبب صرف ان کا کفر اور مخالفت تھی ورنہ) اگر ان بستیوں کے رہنے والے (پیغمبروں پر) ایمان لے آتے اور (ان کی مخالفت سے) پرہیز کرتے تو ہم (بجائے ارضی و سماوی آفات کے) ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے (یعنی آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار کو برکت کے ساتھ عطا فرماتے اور گو اس ہلاکت سے پہلے ان کو خوش حالی ایک حکمت کے لئے دی گئی لیکن اس خوش حالی میں اس لئے برکت نہ تھی کہ آخر وہ وبالِ جان ہوگئی بخلاف ان نعمتوں کے جو ایمان و اطاعت کے ساتھ ملتی ہیں کہ ان میں یہ خیر و برکت ہوتی ہے کہ وہ وبال کبھی نہیں ہوتیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں، حاصل یہ کہ اگر وہ ایمان و تقویٰ اختیار کرتے تو ان کو بھی یہ برکتیں دیتے) لیکن انہوں نے تو (پیغمبروں کی) تکذیب کی تو ہم نے (بھی) ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے ان کو عذابِ مہلک میں پکڑ لیا (جس کو اُوپر فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً سے تعبیر فرمایا ہے آگے کفارِ موجودین کو عبرت دِلاتے ہیں) کیا (ان قصص کو سن کر) پھر بھی ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوّت میں موجود ہیں) اس بات سے بےفکر ہوگئے ہیں کہ ان پر (بھی) ہمارا عذاب شب کے وقت آپڑے جس وقت وہ پڑے سوتے ہوں اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (باوجود کفر و تکذیب کے جو کہ کفارِ سابقین کے ہلاک کا سبب تھا) اس بات سے بےفکر ہوگئے ہیں کہ (انہی سابقین کی طرح) ان پر ہمارا عذاب دن دوپہر آپڑے جس وقت کہ وہ اپنے لایعنی قصوں میں مشغول ہوں (مراد اس سے دنیوی کاروبار ہیں) ہاں تو کیا اللہ تعالیٰ کی

اِس (ناگہانی) پکڑ سے (جس کا اوپر بیان ہوا ہے) بے فکر ہو گئے سو (سمجھ رکھو کہ) خدا تعالیٰ کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آ گئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔

معارف و مسائل

پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ اور ان کے عبرتناک حالات وواقعات میں سے جن کا سلسلہ کئی رکوع پہلے سے چل رہا ہے، یہاں تک پانچ حضرات انبیاء کے قصص کا بیان ہوا ہے، چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کا ہے جو تفصیل کے ساتھ نو آیتوں کے بعد آنے والا ہے۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ قرآنِ کریم تاریخِ عالم اور اَقوامِ عالم کے حالات بیان کرتا ہے مگر اُسلوبِ بیان یہ رہتا ہے کہ عام تاریخی کتابوں اور قصے کہانیوں کی کتابوں کی طرح کسی قصے کو ترتیب اور تفصیل کے ساتھ لانے کے بجائے ہر مقام کے مناسب کسی قصے کا ایک حصہ بیان کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ اس سے حاصل ہونے والے عبرت آموز نتائج ذکر کئے جاتے ہیں، اسی طریق پر یہاں ان پانچ قصوں کے بیان کے بعد ان آیات میں جو اوپر لکھی گئی ہیں کچھ تنبیہات مذکور ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ قومِ نوح علیہ السلام اور عاد و ثمود کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی عام عادت یہی ہے کہ قوموں کی ہدایت اور ان کی صلاح و فلاح کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجتے ہیں، جو لوگ ان کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے تو اول ان کو دنیا کی مصائب و تکالیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تاکہ تکلیف و مصیبت ان کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیں کیونکہ انسان کو فطرۃً مصیبت کے وقت خدا ہی یاد آتا ہے، اور یہ ظاہری تکلیف و مصیبت درحقیقت رحمٰن و رحیم کی رحمت و عنایت ہوتی ہے جیسا مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

خلق را با تو چنین بدخو کنند تاترا ناچار رو آنسو کنند [1]

آیت مذکورہ میں اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ کا یہی مطلب ہے۔ بُؤس اور بَاْسَاء کے معنی فقر و فاقہ اور ضــرّ و ضَــرّاء کے معنی بیماری و مرض کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جابجا اسی معنی میں آیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کے یہی معنیٰ بیان فرمائے ہیں، بعض اہلِ لغت نے کہا ہے کہ بؤس اور باساء مالی نقصان کے لئے بولا جاتا ہے اور ضر و ضرّاء جانی نقصان کے لئے، اس کا حاصل بھی یہی ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی قوم کی طرف اپنے رسول بھیجتے ہیں اور وہ ان کی بات نہیں مانتے تو ہماری

---

[1] ترجمہ: مخلوق کو تجھ سے اس طرح بدگمان کرتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر تجھ سے اپنا رُخ پھیر لیں۔

عادت یہ ہے کہ اول ان کو دنیا ہی میں مالی اور جانی تنگی و بیماری وغیرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں تا کہ وہ کچھ ڈھیلے ہو جائیں اور انجام پر نظر کر کے اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا، اس میں سیئہ سے مراد وہ فقر و فاقہ یا بیماری کی بدحالی ہے جس کا ذکر اوپر آیا اور حسنہ سے مراد اس کے بالمقابل مال میں وسعت و فراخی اور بدن میں صحت و سلامت ہے اور لفظ عَفَوْا، عَفْو سے بنا ہے، جس کے ایک معنٰی پڑھنے اور ترقی کرنے کے بھی ہیں، کہا جاتا ہے عَفَا النَّبَاتُ گھاس یا درخت بڑھ گئے، عَفَا الشَّحْمُ وَالْوَبَرُ جانور کی چربی اور بال بڑھ گئے، اسی معنٰی سے اس جگہ عَفَوْا کے معنی ہیں بڑھ گئے اور ترقی کر گئے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلا امتحان ان لوگوں کو فقر و فاقہ اور بیماری وغیرہ میں مبتلا کر کے لیا گیا تھا، جب اس میں ناکامیاب ہوئے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رُجوع نہ ہوئے تو دوسرا امتحان اس طرح لیا گیا کہ ان کے فقر و فاقہ کے بجائے مال و دولت کی وسعت اور بیماری کے بجائے صحت و سلامت ان کو عطا کر دی گئی یہاں تک کہ وہ خوب بڑھ گئے اور ہر چیز میں ترقی کر گئے، اس امتحان کا حاصل یہ تھا کہ مصیبت کے بعد راحت اور دولت ملنے پر وہ شکر گزار ہوں اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں لیکن یہ غفلت شعار مادی راحتوں میں اور لذتوں میں بدمست اس سے بھی ہوشیار نہ ہوئے بلکہ یہ کہنے لگے کہ:

وَقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں اور نہ یہ کسی اچھے یا بُرے عمل کا نتیجہ ہے، بلکہ زمانے کی عادت ہی یہی ہے کہ کبھی راحت کبھی رنج کبھی بیماری کبھی صحت کبھی تنگی کبھی فراخی ہوا ہی کرتی ہے، ہمارے باپ دادوں کو بھی ایسے ہی حالات پیش آئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلا امتحان تکلیف و مصیبت کے ذریعے کیا گیا اس میں ناکام ہوئے، دوسرا امتحان راحت و دولت سے کیا گیا اس میں ناکام رہے اور کسی طرح اپنی گمراہی سے باز نہ آئے، تب اچانک عذاب میں پکڑے گئے، فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ بَغْتَةً کے معنٰی اچانک۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ لوگ دونوں قسم کی آزمائشوں میں ناکام رہے اور ہوش میں نہ آئے تو پھر ہم نے اُن کو اچانک اس طرح عذاب میں پکڑ لیا کہ ان کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ یعنی اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔

برکت کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، آسمان اور زمین کی برکتوں سے مراد یہ ہے کہ ہر طرح کی بھلائی ہر طرف سے ان کے لئے کھول دیتے، آسمان سے پانی ضرورت کے مطابق وقت پر برستا، زمین سے ہر چیز خواہش کے مطابق پیدا

ہوتی، پھر ان چیزوں سے نفع اُٹھانے اور راحت حاصل کرنے کے سامان جمع کر دیئے جاتے کہ کوئی پریشانی اور فکر لاحق نہ ہوتی جس کی وجہ سے بڑی سے بڑی نعمت مکدّر ہو جاتی ہے، ہر چیز میں برکت یعنی زیادتی ہوتی۔

پھر برکت کا ظہور دنیا میں دو طرح سے ہوتا ہے کبھی تو اصل چیز واقع میں بڑھ جاتی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک معمولی برتن کے پانی سے پورے قافلہ کا سیراب ہونا، یا تھوڑے سے کھانے سے ایک مجمع کا شکم سیر ہو جانا روایاتِ صحیحہ میں مذکور ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر اس چیز میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی مقدار اتنی ہی رہی جتنی تھی لیکن اس سے کام اتنے نکلے جتنے اس سے دوگنی چوگنی چیز سے نکلتے، اور اس کا مشاہدہ عام طور سے کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن، کپڑا، گھر یا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے عمر بھر آدمی راحت اُٹھاتا ہے اور وہ پھر بھی قائم رہتا ہے، اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں یا سالم بھی رہیں، مگر ان سے نفع اُٹھانے کا موقع ہاتھ نہ آیا یا نفع بھی اُٹھایا لیکن پورا نفع نہ اُٹھا سکے۔

اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتی ہے جان میں بھی، کام میں بھی اور وقت میں بھی، بعض مرتبہ ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی قوت وصحت کا سبب بن جاتا ہے اور بعض اوقات بڑی سے بڑی طاقتور غذا اور دوا کام نہیں دیتی، اسی طرح بعض وقت میں برکت ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ میں اتنا کام ہو جاتا ہے کہ دوسرے اوقات میں چار گھنٹوں میں بھی نہیں ہوتا، اِن سب صورتوں میں اگرچہ مقدار کے اعتبار سے نہ مال بڑھا ہے نہ وقت مگر برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ اس سے کام بہت نکلے۔

اس آیت نے یہ بات واضح کردی کہ آسمان اور زمین کی کل مخلوقات وموجودات کی برکات ایمان اور تقویٰ پر موقوف ہیں ان کو اِختیار کیا جائے تو آخرت کی فلاح کے ساتھ دنیا کی فلاح وبرکات بھی حاصل ہوتے ہیں اور ایمان وتقویٰ کو چھوڑنے کے بعد ان کی برکات سے محرومی ہو جاتی ہے، آج کی دنیا کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ بات ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ آج کل ظاہری طور پر زمین کی پیداوار بہ نسبت پہلے کے بہت زائد ہے اور استعمالی اشیاء کی بہتات اور نئی نئی ایجادات تو اس قدر ہیں کہ پچھلی نسلوں کو ان کا تصور بھی نہ ہو سکتا تھا، مگر اس تمام ساز وسامان کی بہتات اور فراوانی کے باوجود آج کا اِنسان سخت، بیمار، تنگدست نظر آتا ہے، آرام وراحت اور امن واطمینان کا کہیں وجود نہیں، اس کا سبب اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ سامان سارے موجود اور بکثرت موجود ہیں مگر ان کی برکت مٹ گئی ہے۔

یہاں ایک یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ سورۂ انعام کی ایک آیت کے اندر کفار وفجار کے بارے میں آیا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (الانعام: ۴۴) یعنی جب ان لوگوں نے اَحکامِ خداوندی کو بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، اور پھر اچانک ان کو عذاب میں پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں ہر چیز کے

دروازے کسی پر کھل جانا کوئی حقیقی انعام نہیں بلکہ وہ ایک طرح کا قہر الٰہی بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر ایمان وتقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکات کھول دیتے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برکاتِ آسمان وزمین اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کی رضا کی علامات ہیں۔

بات یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں اور برکتیں کبھی گناہوں اور سرکشی میں حد سے گزر جانے پر ان کے جرم کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے محض عارضی چندروزہ ہوتی ہیں، وہ قہر وغضب کی علامت ہوتی ہیں اور کبھی رحمت وعنایت سے دائمی صلاح وفلاح کے لئے ہوتی ہیں وہ ایمان وتقویٰ کا نتیجہ ہوتی ہیں، صورت کے اعتبار سے ان میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ انجام اور عاقبت کا حال کسی کو معلوم نہیں مگر اہل اللہ نے علامات کے ذریعے یہ پہچان بتلائی ہے کہ جب مال ودولت اور عیش وآرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے شکر وعبادت کی اور زیادہ توفیق ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ رحمت ہے اور اگر مال ودولت اور عزّت وراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اِعراض اور گناہوں کی کثرت بڑھے تو یہ علامت اس کی ہے کہ استدراج یعنی قہرِ الٰہی کی ایک صورت ہے، اَعَاذَنَا اللہ منه۔

چوتھی آیت میں پھر دنیا کی سب قوموں کو تنبیہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ان بستیوں کے بسنے والے اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے کہ ہمارا عذاب ان کو اس حالت میں آ پکڑے جبکہ وہ رات کو سو رہے ہوں اور کیا یہ بستی والے اس سے بے خوف ہوگئے کہ ہمارا عذاب ان کو اس حالت میں آ پکڑے کہ وہ دِن چڑھے اپنے لہو ولعب میں مشغول ہوں، کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر وتقدیر سے مطمئن ہو بیٹھے، سو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر وتقدیر سے بے فکر وہی قوم ہوسکتی ہے جو خسارہ میں پڑی ہوئی ہو۔

خُلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ جو دنیا کی عیش وراحت میں مست ہوکر خدا تعالیٰ کو بُھلا بیٹھتے ہیں ان کو اس بات سے بے فکر نہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر رات کے وقت یا دن کے وقت کسی بھی حالت میں آسکتا ہے جیسا کہ پچھلی قوموں کے واقعاتِ عذاب کا ذکر اُوپر آچکا ہے، عقل مند کا کام یہ ہے کہ دوسروں کے حالات سے عبرت حاصل کرے اور جو کام دوسروں کے لئے ہلاکت وبربادی کا سبب بن چکے ہیں ان کے پاس جانے سے بچے۔

اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ

کیا نہیں ظاہر ہوا ان لوگوں پر جو وارث ہوئے زمین کے وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد کہ اگر ہم چاہیں

اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

تو ان کو پکڑلیں ان کے گناہوں پر، اور ہم نے مہر کردی ہے ان کے دِلوں پر سو وہ نہیں سنتے،

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآىٕهَا ۚ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

یہ بستیاں ہیں کہ سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے کچھ حالات، اور بیشک ان کے پاس پہنچ چکے ان کے رسول

بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ

نشانیاں لے کر، پھر ہرگز نہ ہوا کہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے، یوں مہر کردیتا ہے اللہ

عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ

کافروں کے دِل پر، اور نہ پایا ان کے اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا نباہ،

وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِیْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور اکثر ان میں پائے نافرمان۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ کسی زمین (کے باشندوں کی ہلاکت) کے بعد اُس کے وارث بن جاتے ہیں، بھلا کیا اُن کو یہ سبق نہیں ملا کہ اگر ہم چاہیں تو اُن کو (بھی) اُن کے گناہوں کی وجہ سے کسی مصیبت میں مبتلا کردیں؟ اور (جو لوگ اپنی ضد کی وجہ سے یہ سبق نہیں لیتے) ہم اُن کے دِلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کوئی بات نہیں سنتے ﴿۱۰۰﴾ یہ ہیں وہ بستیاں جن کے واقعات ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِن سب کے پاس اُن کے پیغمبر کھلے کھلے دلائل لے کر آئے تھے، مگر جس بات کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، اُس پر کبھی ایمان لانے کو تیار نہیں ہوئے۔ جو لوگ کفر کو اپنا چکے ہوتے ہیں، اُن کے دِلوں پر اللہ اِسی طرح مہر لگا دیتا ہے ﴿۱۰۱﴾ ہم نے ان کی اکثریت میں عہد کی کوئی پاسداری نہیں پائی، اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگوں کو ہم نے نافرمان ہی پایا ﴿۱۰۲﴾

خلاصہ تفسیر

(آگے اس کی علّت بتلاتے ہیں کہ ان کو عذاب سے کیوں ڈرنا چاہئے، اور وہ علّت ان کا امم سابقہ کے ساتھ جرم کفر میں شریک ہونا ہے یعنی) اور ان (گزشتہ) زمین پر رہنے والوں کے بعد جو لوگ (اب) زمین پر بجائے ان کے رہتے ہیں کیا ان واقعاتِ مذکورہ نے ان کو یہ بات (ہنوز) نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کو (بھی مثل امم سابقہ کے) ان کے جرائم (کفر و تکذیب) کے سبب ہلاک کر ڈالتے (کیونکہ امم سابقہ ان ہی جرائم کے سبب ہلاک کی گئیں) اور (واقعی یہ واقعات تو ایسے ہی ہیں کہ ان سے سبق لینا چاہئے تھا لیکن اصل یہ ہے کہ) ہم ان کے دِلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اس سے وہ (حق بات کو دِل سے) سنتے (بھی) نہیں (اور ماننا تو درکنار رہا پس اس بند لگانے سے ان کی قساوت بڑھ گئی کہ ایسے عبرت خیز واقعات سے بھی عبرت نہیں ہوتی اور اس بند لگانے کا سبب انہی کا ابتداء میں کفر کرنا ہے، لقولہ تعالیٰ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ آگے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لئے سارے مضمون مذکور کا خلاصہ ہے کہ) ان (مذکورہ) بستیوں کے کچھ کچھ قصے ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان سب (بستیوں میں رہنے والوں) کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے (مگر) پھر (بھی ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی یہ کیفیت تھی کہ) جس چیز کو انہوں نے اول (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوئی کہ پھر اس کو مان لیتے (اور جیسے یہ دل کے سخت تھے) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں اور (ان میں سے بعضے لوگ مصیبتوں میں ایمان لانے کا عہد بھی کر لیتے تھے لیکن) اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا (یعنی زوالِ مصیبت کے بعد پھر ویسے کے ویسے ہی ہو جاتے تھے) اور ہم نے اکثر لوگوں کو (باوجود ارسالِ رسل و اظہارِ معجزات و نزولِ بینات و توثیقِ معاہدات) بے حکم ہی پایا (پس کفار ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتے رہے ہیں، آپ بھی غم نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں بھی پچھلی قوموں کے واقعات و حالات سنا کر موجودہ اقوامِ عرب و عجم کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان واقعات میں تمہارے لئے بڑا درسِ عبرت ہے کہ جن کاموں کی وجہ سے پچھلے لوگوں پر اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوا ان کے پاس نہ جائیں اور جن کاموں کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کو کامیابی حاصل ہوئی ان کو اختیار کریں، چنانچہ پہلی آیت میں اِرشاد ہے اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۔

هَدٰى، يَهْدِىْ کے معنیٰ نشان دہی کرنے اور بتلانے کے آتے ہیں، اس جگہ اس کا فاعل وہ واقعات ہیں جن کا

اوپر ذکر کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ موجودہ زمانہ کے لوگ جو پچھلی قوموں کے ہلاک ہونے کے بعد ان کی زمینوں مکانوں کے وارث بنے یا آئندہ بنیں گے کیا ان کو پچھلے عبرتناک واقعات نے یہ نہیں بتلایا کہ کفر وانکار اور احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں جس طرح ان کے مورثِ اعلیٰ (یعنی پچھلی قومیں) ہلاک و برباد ہو چکی ہیں اسی طرح اگر یہ بھی انہیں جرائم کے مرتکب رہے تو ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا قہر وعذاب آسکتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ طبع کے معنی چھاپنے اور مہر لگانے کے ہیں، اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ واقعاتِ ماضیہ سے بھی کوئی عبرت اور ہدایت حاصل نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غضبِ الٰہی سے ان کے دِلوں پر مہر لگ جاتی ہے پھر وہ کچھ نہیں سنتے، حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک نقطہ سیاہی کا لگ جاتا ہے، دوسرا گناہ کرتا ہے تو دُوسرا اور تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ برابر گناہوں میں بڑھتا گیا توبہ نہ کی تو یہ سیاہی کے نقطے اس کے سارے قلب کو گھیر لیتے ہیں اور انسان کے قلب میں اللہ تعالیٰ نے جو فطری مادہ بھلے بُرے کی پہچان اور بُرائی سے بچنے کا رکھا ہے وہ فنا یا مغلوب ہو جاتا ہے، اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اچھی چیز کو بُرا اور بُری کو اچھا، مفید کو مضر اور مضر کو مفید خیال کرنے لگتا ہے، اسی حالت کو قرآن میں رَان یعنی قلب کے زنگ سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسی حالت کا آخری نتیجہ وہ ہے جس کو طبع یعنی مہر لگانے سے اس آیت میں اور بہت سی دوسری آیات میں تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ دل پر مہر لگ جانے کا نتیجہ تو عقل وفہم کا معدوم ہو جانا ہے، کانوں کی سماعت پر تو اس کا کوئی اثر عادۃً نہیں ہوا کرتا، تو اس آیت میں موقع اس کا تھا کہ اس جگہ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ فرمایا جاتا، یعنی وہ سمجھتے نہیں، مگر قرآنِ کریم میں یہاں فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ آیا ہے، یعنی وہ سنتے نہیں۔ سبب یہ ہے کہ سننے سے مراد اس جگہ ماننا اور اطاعت کرنا ہے جو نتیجہ ہوتا ہے سمجھنے کا، مطلب یہ ہے کہ دلوں پر مہر لگ جانے کے سبب وہ کسی حق بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام اعضاء وجوارح کا مرکز ہے جب قلب کے افعال میں خلل آتا ہے تو سارے اعضاء کے افعال مختل ہو جاتے ہیں، جب دل میں کسی چیز کی بھلائی یا برائی سما جاتی ہے تو پھر ہر چیز میں اس کو آنکھوں سے بھی وہی نظر آتا ہے کانوں سے بھی وہی سنائی دیتا ہے۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر [۱]

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا انباء، نبأ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں کوئی عظیم الشان خبر، معنی یہ ہیں کہ ہلاک شدہ بستیوں کے بعض واقعات ہم آپ سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں حرف مِنْ

---

[۱] ترجمہ: خدا کرے دشمن کی آنکھیں پھوٹ جائیں اس لئے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے۔

سے اِشارہ کردیا گیا کہ پچھلی اقوام کے حالات و واقعات جو ذکر کئے گئے ہیں وہ سب واقعات کا استیعاب نہیں بلکہ ہزاروں واقعات میں سے چند اہم واقعات کا بیان ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ یعنی ان سب لوگوں کے انبیاء ورسل ان کے پاس معجزات لے کر پہنچے جن کے ذریعہ حق وباطل کا فیصلہ ہوجاتا ہے، مگر ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ عالَم تھا کہ جس چیز کے متعلق ایک مرتبہ ان کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ یہ غلط اور جھوٹ ہے پھر اس کے حق وصدق ہونے پر کتنے ہی معجزات، دلائل اور حجتیں سامنے آگئیں مگر وہ اس کی تصدیق واقرار کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

اِس آیت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ معجزات تمام انبیاء ورسل کو عطا فرمائے گئے ہیں جن میں سے بعض انبیاء کے معجزات کا قرآن میں ذکر آیا ہے، بہت سوں کا نہیں آیا، اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ جن کے معجزات کا ذکر قرآن میں نہیں آیا ان سے کوئی معجزہ ثابت ہی نہیں، اور سورۂ ہود میں جو حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ قول مذکور ہے کہ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (ہود: ۵۳) یعنی آپ کوئی معجزہ نہیں لائے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کا یہ قول محض عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا، یا یہ کہ ان کے معجزات کو معمولی سمجھ کر ایسا کہا۔

دوسری بات یہ قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا جو حال بتلایا گیا ہے کہ غلط بات زبان سے نکل گئی تو اس کی سخن پروری کرتے رہے، اس کے خلاف کتنے ہی واضح دلائل آجائیں، اپنی بات کی پچ کرتے رہے، یہ خدا کی منکر اور کافر قوموں کا حال ہے جس میں بکثرت مسلمان بلکہ بعض علماء وخواص بھی مبتلا پائے جاتے ہیں کہ کسی چیز کو اول وہلہ میں غلط یا جھوٹ کہہ دیا تو اب اس کی سچائی کے ہزاروں دلائل بھی سامنے آجائیں تو اپنی غلط بات کی پیروی کرتے رہیں، یہ حالت قہرِ خداوندی اور غضبِ الٰہی کا موجب ہے، (از مسائل السلوک) اس کے بعد فرمایا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ یعنی جس طرح ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگادی گئی، اسی طرح عام کافر ومنکر لوگوں کے دِلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگادیتے ہیں کہ پھر نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ یعنی ان میں سے اکثر لوگوں کو ہم نے ایفائے عہد کرنے والا نہ پایا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہدِ اَلست ہے جو اَزل میں تمام مخلوقات کے پیدا کرنے سے پہلے ان سب کی روحوں کو پیدا فرما کر لیا گیا تھا، جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ (الاعراف: ۱۷۲) یعنی کیا میں تمہارا پروردگار نہیں، اس وقت تمام ارواح انسانی نے اقرار اور عہد کے طور پر جواب دیا بَلٰى ۚ یعنی ضرور آپ ہمارے ربّ ہیں، دنیا میں آکر اکثر لوگ اس عہد ازل کو بھول گئے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق پرستی کی لعنت

میں گرفتار ہوگئے اس لئے اِس آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد نہ پایا، یعنی عہد کی پاسداری اور ایفاء نہ پایا۔ (کبیر) [1]

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہدِ ایمان ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ (مریم) اس میں عہد سے عہدِ ایمان وطاعت مراد ہے، [2] تو آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر نے ایمان وطاعت کا عہد ہم سے باندھا تھا پھر اس کی خلاف ورزی کی، عہد باندھنے سے مراد یہ ہے کہ عموماً انسان جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت کتنا ہی فاسق فاجر ہو اس کو بھی خدا ہی یاد آتا ہے اور اکثر دل یا زبان سے عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی تو اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت میں لگ جاؤں گا نافرمانی سے بچوں گا جیسا کہ قرآنِ کریم میں بہت سے لوگوں کا یہ حال ذکر کیا گیا ہے، لیکن جب ان کو نجات ہوجاتی ہے اور آرام وراحت ملتی ہے تو پھر ہویٰ وہوس میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور اس عہد کو بھول جاتے ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں لفظ اَكْثَرَ سے اس کی طرف اِشارہ بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ تو ایسے شقی ہوتے ہیں کہ مصیبت کے وقت بھی انہیں خدا یاد نہیں آتا اور اس وقت بھی وہ ایمان وطاعت کا عہد نہیں کرتے تو ان سے بدعہدی کی شکایت کے کوئی معنی نہیں، اور بہت سے لوگ وہ بھی ہیں جو عہد کو پورا کرتے ہیں، ایمان وطاعت کے حقوق ادا کرتے ہیں اِس لئے فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ یعنی ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں ایفائے عہد نہ پایا۔

اس کے بعد فرمایا وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ یعنی ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو اطاعت وفرماں برداری سے خارج پایا۔

یہاں تک پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے پانچ واقعات کا بیان کرکے موجودہ لوگوں کو ان سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کے لئے تنبیہات فرمائی گئی ہیں۔

اس کے بعد چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، جس میں واقعات کے ضمن میں سینکڑوں اَحکام ومسائل اور عبرت ونصیحت کے بے شمار مواقع ہیں، اور اسی لئے قرآنِ کریم میں اس واقعے کے اجزاء بار بار دہرائے گئے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس

[1] التفسير الكبير تحت هٰذه الآية ج:۷ ص۱۹۸ [2] بحوالۂ بالا۔

فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى

پس کفر کیا انہوں نے ان کے مقابلہ میں، سو دیکھ کیا انجام ہوا مفسدوں کا، اور کہا موسیٰ نے

يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ لا حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ

اے فرعون میں رسول ہوں پروردگارِ عالم کا، قائم ہوں اس بات پر کہ نہ کہوں

عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ

اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے، لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے ربّ کی سو بھیج دے میرے ساتھ

بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿١٠٥﴾ ۭ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ

بنی اسرائیل کو، بولا اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا اس کو اگر تو

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٧﴾ ښ وَّنَزَعَ يَدَهٗ

سچا ہے، تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا تو اسی وقت ہوگیا اژدہا صریح، اور نکالا اپنا ہاتھ

فَاِذَا هِيَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ ع قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا ع ۱۳ ۹ ۳

تو اسی وقت وہ سفید نظر آنے لگا دیکھنے والوں کو، بولے سردار فرعون کی قوم کے یہ تو کوئی

لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٩﴾ لا يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿١١٠﴾

بڑا واقف جادوگر ہے، نکالنا چاہتا ہے تم کو تمہارے ملک سے، اب تمہاری کیا صلاح ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر ہم نے ان سب کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، تو انہوں

نے (بھی) ان (نشانیوں) کی ظالمانہ ناقدری کی۔ اب دیکھو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا ﴿۱۰۳﴾ موسیٰ نے کہا تھا کہ: "اے فرعون! یقین جانو کہ میں رَبّ العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں ﴿۱۰۴﴾ میرا فرض ہے کہ میں اللہ کی طرف منسوب کر کے حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک کھلی دلیل لے کر آیا ہوں، لہٰذا بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو" ﴿۱۰۵﴾ اُس نے کہا کہ: "اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اُسے پیش کرو، اگر تم ایک سچے آدمی ہو" ﴿۱۰۶﴾ اس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھینکی، تو اچانک وہ ایک صاف صاف اژدھا بن گیا ﴿۱۰۷﴾ اور اپنا ہاتھ (گریبان سے) کھینچا تو وہ سارے دیکھنے والوں کے سامنے یکا یک چمکنے لگا۔ ﴿۱۰۸﴾ فرعون کی قوم کے سردار (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ: "یہ تو یقینی طور پر بڑا ماہر جادوگر ہے ﴿۱۰۹﴾ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری زمین سے نکال باہر کرے۔ اب بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟" ﴿۱۱۰﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکورہ پیغمبروں) کے بعد ہم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (یعنی معجزات) دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس (ان کی ہدایت و تبلیغ کے لئے) بھیجا سو (جب موسیٰ علیہ السلام نے وہ دلائل ظاہر کئے تو) ان لوگوں نے ان (معجزات) کا بالکل حق ادا نہ کیا (کیونکہ ان کا حق اور مقتضا یہ تھا کہ ایمان لے آتے) سو دیکھئے ان مفسدوں کا کیا (بُرا) انجام ہوا (جیسا اور جگہ ان کا غرق اور ہلاک ہونا مذکور ہے۔ یہ تو تمام قصہ کا اجمال تھا آگے تفصیل ہے یعنی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (فرعون کے پاس بحکم الٰہی جا کر) فرمایا کہ میں ربّ العالمین کی طرف سے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے) پیغمبر (مقرر ہوا) ہوں (جو مجھ کو کاذِب بتلائے اس کی غلطی ہے کیونکہ) میرے لئے یہی شایان ہے کہ بجز سچ کے خدا کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں (اور میں رسالت کا خالی دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ) میں تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک بڑی دلیل (یعنی معجزہ) بھی لایا ہوں (جو طلب کے وقت دکھلا سکتا ہوں) سو (جب میں رسول مع الدلیل ہوں تو میں جو کہوں اس کی اطاعت کر، چنانچہ من جملہ ان امور کے ایک یہ کہتا ہوں کہ) تو بنی اسرائیل کو (اپنی بیگار سے خلاصی دے کر) میرے ساتھ (ملکِ شام کو جو ان کا اصلی وطن ہے) بھیج دے فرعون نے کہا کہ اگر آپ (من جانب اللہ) کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں تو اس کو اب پیش کیجئے اگر آپ (اِس دعویٰ میں) سچے ہیں، بس آپ نے (فوراً) اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیا سو دفعۃً وہ صاف ایک اژدہا بن گیا (جس کے اژدہا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا تھا،) اور (دوسرا معجزہ یہ ظاہر کیا کہ) اپنا ہاتھ (گریبان کے اندر بغل میں دبا کر) باہر نکال لیا سو وہ یکا یک سب دیکھنے والوں کے رُوبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی سب نے دیکھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزاتِ عظیمہ ظاہر

ہوئے تو فرعون نے اہلِ دربار سے کہا کہ یہ شخص بڑا جادوگر ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو سے تم لوگوں پر غالب آ کر یہاں کا رئیس ہو جائے اور تم کو یہاں آباد نہ رہنے دے سو اس بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے چنانچہ سورۂ شعراء میں یہ قول فرعون کا منقول ہے اس کو سن کر جیسا کہ مصاحبینِ سلاطین کی عادت ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی ہوتی ہے فرعون کے اس قول کی تصدیق وموافقت کے لئے) قومِ فرعون میں جو سردار (اور اہلِ دربار) لوگ تھے انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ واقعی (جیسا ہمارے بادشاہ کہتے ہیں کہ) یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے (ضرور) یہ (ہی) چاہتا ہے کہ (اپنے جادو کے زور سے خود مع بنی اسرائیل کے رئیس ہو جائے اور) تم کو (بوجہ اس کے کہ بنی اسرائیل کی نظر میں خار ہو) تمہاری (اس) سرزمین سے باہر کر دے سو تم لوگ (جیسا کہ بادشاہ دریافت کر رہے ہیں) کیا مشورہ دیتے ہو۔

معارف و مسائل

اِس سورت میں جتنے قصص اور واقعات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے ذِکر کئے گئے ہیں یہ ان میں سے چھٹا قصہ ہے، اِس کو زیادہ تشریح وتفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا سبب یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بہ نسبت دوسرے انبیاء سابقین کے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور قوتِ ظہور میں بھی۔ اسی طرح اس کے بالمقابل ان کی قوم بنی اسرائیل کی جہالت اور ہٹ دھرمی بھی پچھلی امتوں کے مقابلہ میں زیادہ اشد ہے اور یہ بھی ہے کہ اس قصہ کے ضمن میں بہت سے معارف ومسائل اور اَحکام بھی آئے ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ ان کے بعد یعنی نوح اور ہود اور صالح اور لوط اور شعیب علیہم السلام کے یا ان کی قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ آیات سے مراد تورات کی آیات بھی ہو سکتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی، اور فرعون اس زمانہ میں ہر بادشاہِ مصر کا لقب ہوتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا نام قابوس بیان کیا جاتا ہے۔ (قرطبی)[1]

فَظَلَمُوْا بِهَا کی ضمیر مجرور آیات کی طرف راجع ہے، معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری آیات پر ظلم کیا، اور آیاتِ الٰہیہ پر ظلم کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے آیاتِ الٰہیہ کی قدر نہ پہچانی، ان پر شکر کے بجائے ناشکری، اقرار کے بجائے اِنکار، ایمان کے بجائے کفر اختیار کیا۔ کیونکہ ظلم کے اصل معنی ہی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس کے محل اور موقع کے خلاف استعمال کرنا۔

پھر فرمایا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ یعنی دیکھو تو سہی کہ پھر ان فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا، مراد

[1] تفسیر القرطبی سورۃ البقرۃ آیۃ: ۴۹، ج: ۱ ص: ۳۸۳

یہ ہے کہ ان کے حالات انجامِ بد پر غور کرو اور عبرت حاصل کرو۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں ربُّ العالمین کا رسول ہوں، میرے حال اور منصبِ نبوّت کا تقاضا یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات بجز سچ کے منسوب نہ کروں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو جو پیغام حق تعالیٰ کی طرف سے دیئے جاتے ہیں وہ ان کے پاس خدائی امانت ہوتے ہیں، اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرنا خیانت ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام خیانت اور ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگوں کو میری بات پر اس لئے یقین کرنا چاہئے کہ میری سچائی تم سب کے سامنے ہے، میں نے کبھی نہ جھوٹ بولا ہے اور نہ بول سکتا ہوں، اس کے علاوہ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ یعنی صرف یہی بات نہیں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بلکہ میرے دعوے پر دلیل میرے معجزات بھی ہیں۔ اس لئے ان سب چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ میری بات سنیں اور مانیں، بنی اسرائیل کو مصنوعی غلامی سے نجات دے کر میرے ساتھ کردیں۔ فرعون نے اور کسی بات پر تو کان نہ دھرا، معجزہ دیکھنے کا مطالبہ کرنے لگا اور کہا اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ یعنی اگر تم واقعی کوئی معجزہ لائے ہو تو پیش کرو اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مطالبہ کو مانتے ہوئے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی وہ اژدہا بن گئی فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ ثُعْبَانٌ بڑے اژدہا کو کہا جاتا ہے اور اس کی صفت مُبِيْنٌ ذکر کر کے بتلا دیا کہ اس لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کسی اندھیرے یا گوشہ پردہ میں واقع ہوا ہو جس کو کوئی دیکھے کوئی نہ دیکھے، جیسے عموماً شعبدہ بازوں یا جادوگروں کا طرز ہوتا ہے، بلکہ یہ واقعہ بھرے دربار میں سب کے سامنے پیش آیا۔

بعض تاریخی روایات میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس اژدہا نے فرعون کی طرف منہ پھیلایا تو گھبرا کر تختِ شاہی سے کود کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پناہ لی اور دربار کے ہزاروں آدمی اس کی دہشت سے مر گئے۔ (تفسیر کبیر) [1]

لاٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی ناممکن یا محال چیز نہیں، ہاں عادتِ عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور قابلِ تعجب ضرور ہے، اور معجزہ و کرامت کا منشاء ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکیں وہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ عوام سمجھ لیں کہ ان کے ساتھ کوئی خدائی طاقت کام کر رہی ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی قابلِ تعجب و انکار نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد فرمایا وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ نزع کے معنیٰ ایک چیز کو دوسری چیز میں کسی قدر سختی کے

---

[1] التفسير الكبير تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۲۰۴، وتفسير القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۲۸۵

ساتھ نکالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو کھینچ کر نکالا، یہاں یہ مذکور نہیں کہ کس چیز میں سے نکالا۔ دوسری آیات میں دو چیزیں مذکور ہیں، ایک جگہ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ (النمل:۱۲) آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ دوسری جگہ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ (طٰہٰ:۲۲) مذکور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے دبالو۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہاتھ کا نکالنا گریبان کے اندر سے یا بازو کے نیچے سے ہوتا تھا۔ یعنی کبھی گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالنے سے اور کبھی بازو کے نیچے دبا کر نکالنے سے یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا کہ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ یعنی وہ ہاتھ چمکنے والا ہو جاتا ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

بَيْضَآءُ کے لفظی معنی سفید کے ہیں اور ہاتھ کا سفید ہو جانا کبھی برص کی بیماری کے سبب بھی ہوا کرتا ہے، اس لئے ایک دوسری آیت میں اس جگہ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (طٰہٰ:۲۲) کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کے سبب نہ تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفیدی بھی معمولی سفیدی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ روشنی ہوتی تھی جس سے ساری فضا روشن ہو جاتی تھی۔ (قرطبی) [۱]

اس جگہ لفظ لِلنّٰظِرِيْنَ بڑھا کر اس روشنی کے عجیب و غریب ہونے کی طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ یہ ایسی عجیب روشنی تھی کہ اس کے دیکھنے کے لئے ناظرین جمع ہو جاتے تھے۔

اس وقت فرعون کے مطالبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو معجزے دِکھلائے، ایک لاٹھی کا اژدہا بن جانا دوسرے ہاتھ کو گریبان یا بغل میں ڈال کر نکالنے سے اس میں روشنی پیدا ہو جانا۔ پہلا معجزہ مخالفین کی ترہیب اور ڈرانے کے لئے، اور دوسرا معجزہ ان کی ترغیب اور قریب کرنے کے لئے ہے، جس میں اشارہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم ایک نورِ ہدایت رکھتی ہے اس کا اِتباع باعثِ فلاح ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ لفظ مَلَاُ کسی قوم کے بااثر سرداروں کے لئے بولا جاتا ہے، معنی یہ ہیں کہ قومِ فرعون کے سردار یہ معجزات دیکھ کر اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے وجہ یہ تھی کہ ؎

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست [۲]

ان بیچاروں کو خدا تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی کیا خبر تھی جنہوں نے ساری عمر فرعون کو اپنا خدا اور جادوگروں کو اپنا رہبر سمجھا اور جادوگروں کے شعبدوں ہی کو دیکھا تھا، وہ اس حیرت انگیز واقعہ کو دیکھ کر اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ یہ بھی کوئی بڑا جادو ہے لیکن ان لوگوں نے بھی یہاں سَاحِرٌ کے ساتھ عَلِيْمٌ کا لفظ بڑھا کر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۲۵۷ [۲] ترجمہ: ہر شخص کی فکر اس کی ہمت کے بقدر ہوتی ہے۔

معجزہ کے متعلق یہ احساس ان کو بھی ہوگیا تھا کہ یہ کام عام جادوگروں کے کام سے ممتاز اور مختلف ہے اسی لئے اتنا اقرار کیا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق

اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو اسی انداز سے ظاہر فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ لیں۔ سحر کرنے والے عموماً ناپاک اور گندگی میں رہتے ہیں اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ طہارت ونظافت ان کی طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے، اور یہ بھی کھلا ہوا فرق من جانب اللہ ہے کہ نبوّت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہلِ بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرہ اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ مخفی اسباب ہوتے ہیں، اس لئے وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہوگیا، بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسبابِ طبعیہ کا مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ براہِ راست قدرتِ حق کا فعل ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال: ۱۷)

اس سے معلوم ہوا کہ معجزہ اور سحر کی حقیقتیں بالکل مختلف اور متباین ہیں، حقیقت شناس کے لئے تو کوئی التباس کی وجہ ہی نہیں، عوام کو التباس ہوسکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس اِلتباس کو دور کرنے کے لئے بھی ایسے امتیازات رکھ دیئے ہیں کہ جس کی وجہ سے لوگ دھوکہ سے بچ جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قوم فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو اپنے جادوگروں کے افعال سے کچھ ممتاز ومختلف پایا، اس لئے اس پر مجبور ہوئے کہ یہ کہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے کہ عام جادوگر اس جیسے کاموں کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ یعنی یہ ماہر جادوگر یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے، تو اب بتلادو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا مشورہ دیتے ہو؟

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ

بولے ڈھیل دے اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج پرگنوں میں جمع کرنے والوں کو، کہ جمع کر لائیں تیرے پاس

سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ

جو ہو کامل جادوگر اور آئے جادوگر فرعون کے پاس، بولے ہمارے لئے کچھ مزدوری ہے اگر

كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ہم غالب ہوئے، بولا ہاں اور بیشک تم مقرب ہوجاؤگے

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

بولے اے موسیٰ یا تو تُو ڈال اور یا ہم ڈالتے ہیں،

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ

کہا ڈالو پھر جب انہوں نے ڈالا، باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو اور ان کو ڈرا دیا

وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ

اور لائے بڑا جادو، اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا

فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ ۚ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ۚ

سو وہ جبھی لگا نگلنے جو سانگ انہوں نے بنایا تھا، پس ظاہر ہوگیا حق اور غلط ہوگیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا،

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ ۚ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ ۖ

پس ہار گئے اس جگہ اور لوٹ گئے ذلیل ہوکر، اور گر پڑے جادوگر سجدہ میں،

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ ۙ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

بولے ہم ایمان لائے پروردگار عالم پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

انہوں نے کہا کہ: ''ذرا اس کو اور اس کے بھائی کو کچھ مہلت دو، اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دو ﴿۱۱۱﴾ تاکہ وہ تمام ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تمہارے پاس لے آئیں۔ ﴿۱۱۲﴾ (چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور جادوگر فرعون کے پاس آگئے (اور) انہوں نے کہا کہ: ''اگر ہم (موسیٰ پر) غالب آگئے تو ہمیں کوئی اِنعام تو ضرور ملے گا'' ﴿۱۱۳﴾ فرعون نے کہا: ''ہاں، اور تمہارا شمار یقیناً ہمارے مقرّب لوگوں میں (بھی) ہوگا'' ﴿۱۱۴﴾ انہوں نے (موسیٰ سے) کہا: ''موسیٰ! چاہو تو (جو پھینکنا چاہتے ہو) تم پھینکو، ورنہ ہم (اپنے جادو کی چیز) پھینکیں؟'' ﴿۱۱۵﴾ موسیٰ نے کہا: ''تم پھینکو!'' چنانچہ جب انہوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں) پھینکیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، اُن پر دہشت طاری کر دی، اور زبردست جادو کا مظاہرہ کیا ﴿۱۱۶﴾ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ تم اپنی لاٹھی ڈال دو۔ بس پھر کیا تھا، اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساری چیزیں نگلنی شروع کر دیں جو انہوں نے جھوٹ موٹ بنائی تھیں ﴿۱۱۷﴾ اس طرح حق کھل کر سامنے آگیا، اور اُن کا بنا بنایا کام ملیامیٹ ہوگیا ﴿۱۱۸﴾ اس موقع پر وہ مغلوب ہوئے، اور شدید سُبکی کی حالت میں (مقابلے سے) پلٹ کر آگئے ﴿۱۱۹﴾ اور اس واقعے نے سارے جادوگروں کو بے ساختہ سجدے میں گرا دیا۔ ﴿۱۲۰﴾ وہ پکار اُٹھے کہ: ''ہم اُس ربّ العالمین پر ایمان لے آئے ﴿۱۲۱﴾ جو موسیٰ اور ہارون کا ربّ ہے۔'' ﴿۱۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(غرض مشورہ طے کر کرا کر) انہوں نے (فرعون سے) کہا کہ آپ ان (موسیٰ علیہ السلام) کو اور ان کے بھائی کو مہلت دیجئے اور (اپنی حدودِ قلمرو کے) شہروں میں (گرد آوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکم نامے دے کر) بھیج دیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں (چنانچہ ایسا ہی انتظام کیا گیا) اور وہ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے (اور) کہنے لگے کہ اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آئے تو (کیا) ہم کو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا کہ ہاں (انعام بھی بڑا ملے گا) اور (مزید برآں یہ ہوگا کہ) تم (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی جانب سے اس کی اطلاع دی گئی اور مقابلہ کے لئے تاریخ معین ہوئی اور تاریخ پر سب ایک میدان میں جمع ہوئے اس وقت) ان ساحروں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے موسیٰ (ہم آپ کو اختیار دیتے ہیں) خواہ آپ (اول اپنا عصا میدان میں) ڈالئے (جس کو آپ اپنا معجزہ بتلاتے ہیں) اور یا (آپ کہیں تو) ہم ہی (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں) ڈالیں، موسیٰ (علیہ

السلام) نے فرمایا کہ تم ہی (پہلے) ڈالو جب انہوں نے (اپنی رسوں اور لاٹھیوں کو) ڈالا تو (جادو سے دیکھنے والے) لوگوں کی نظر بندی کردی (جس سے وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی شکل میں لہراتی نظر آنے لگیں) اور ان پر ہیبت غالب کردی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا اور (اس وقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (وحی کے ذریعہ سے) حکم دیا کہ آپ اپنا عصا ڈال دیجئے (جیسا ڈالا کرتے ہیں) سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے (اژدہا بن کر) ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نگلنا شروع کیا پس (اس وقت) حق (کا حق ہونا) ظاہر ہوگیا اور انہوں نے (یعنی ساحروں نے) جو کچھ بنایا ونایا تھا سب آتا جاتا رہا پس وہ لوگ (یعنی فرعون اور اس کی قوم) اس موقع پر ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے (اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے) اور وہ جو ساحر تھے وہ سجدہ میں گر گئے، (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے ربّ العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی ربّ ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بقیہ قصہ مذکور ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کھلا معجزہ دیکھا کہ لاٹھی کا سانپ بن گیا اور پھر جب اس کو ہاتھ میں پکڑا تو پھر لاٹھی بن گئی اور ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر نکالا تو چمکنے لگا، اس آیتِ قدرت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا مگر جیسا اہل باطل کا عام طرز ہے کہ حق پر پردہ ڈالنے اور مکرنے کے لئے صحیح چیز کو غلط عنوان دیا کرتے ہیں، فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے بھی لوگوں سے یہی کہا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے ملک پر قبضہ کر کے تمہیں نکال دیں تو اب تم بتلاؤ کیا کرنا چاہئے؟

قومِ فرعون نے یہ سن کر جواب دیا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ اس میں لفظ اَرْجِهْ، اِرْجَاءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ڈھیل دینے اور امید دلانے کے آتے ہیں اور مَدَآئِن، مَدِيْنَةٌ کی جمع ہے جو ہر بڑے شہر کے لئے بولا جاتا ہے، حٰشِرِيْنَ، حَاشِرٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں اٹھانے اور جمع کرنے والا، مراد اس سے سپاہی ہیں جو اطرافِ ملک سے جادوگروں کو جمع کر کے لائیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ قوم کے لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر یہ جادوگر ہے اور جادو کے ذریعہ ہمارا ملک فتح کرنا چاہتا ہے تو اس کا مقابلہ ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں، ہمارے ملک میں بڑے بڑے ماہر جادوگر ہیں اس کو اپنے جادو سے شکست دے دیں گے، کچھ سپاہی ملک کے اطراف میں بھیج دیجئے جو ہر شہر کے جادوگروں کو بلا لائیں۔

وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں جادو، سحر کا رواج عام تھا اور عام لوگوں پر جادوگروں کا اقتدار تھا اور شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء کا معجزہ اسی لئے عطا فرمایا کہ جادوگروں سے مقابلہ ہو اور معجزہ کے مقابلہ میں جادو کی رسوائی

سب لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم عادت بھی یہی ہے کہ ہر زمانہ کے پیغمبر کو اس زمانہ کے مناسب معجزات عطا فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمتِ یونانی اور طبِ یونانی اپنے عروج پر تھی تو ان کو معجزہ یہ دیا گیا کہ مادرزاد اندھوں کو بینا بنا دیں اور جذامی کوڑھیوں کو تندرست کر دیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کا سب سے بڑا کمال فصاحت و بلاغت تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن بنایا گیا جس کے مقابلہ سے سارا عرب و عجم عاجز ہو گیا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ یعنی لوگوں کے مشورہ کے مطابق ملک بھر سے جادوگروں کے جمع کرنے کا انتظام کیا گیا، اور یہ جادوگر فرعون کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آ گئے تو ہمیں اس کی کچھ اُجرت اور انعام بھی ملے گا؟ فرعون نے کہا کہ ہاں اُجرت بھی ملے گی اور اس پر مزید یہ انعام ہوگا کہ تم سب ہمارے مُقَرَّبِیْن میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہ جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ملک بھر سے جمع کئے گئے تھے، ان کی تعداد میں تاریخی روایات مختلف ہیں، نو سو سے لے کر تین لاکھ تک کی روایات ہیں۔ ان کے ساتھ لاٹھیوں اور رسیوں کا ایک انبار تھا جو تین سو اُونٹوں پر لاد کر لایا گیا تھا۔ (قرطبی) [1]

فرعونی جادوگروں نے آتے ہی پہلی بات سودا بازی کی شروع کی کہ ہم مقابلہ کریں اور غالب آ جائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟ وجہ یہ تھی کہ اہلِ باطل کے سامنے صرف دنیا کے فوائد ہوتے ہیں اس لئے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے معاوضہ اور اُجرت کا سوال سامنے آتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین کے کہ وہ ہر قدم پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ (الشعراء) یعنی ہم جو پیغامِ حق تمہارے فائدہ کے لئے تمہیں پہنچاتے ہیں اس پر تم سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، بلکہ ہمارا معاوضہ صرف ربّ العالمین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ فرعون نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ اُجرت چاہتے ہو، ہم اُجرت بھی دیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ تمہیں شاہی دربار کا مقرّب بنالیں گے۔

فرعون سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کی جگہ اور وقت کا تعین کرایا، چنانچہ ایک کھلا میدان اور عید کے دِن آفتاب بلند ہونے کے بعد کا وقت اس کام کے لئے تجویز ہوا، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے، قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ (طٰہٰ) [2]

بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۲۵۸

[2] ترجمہ: موسیٰ نے فرمایا تمہارے وعدہ کا وقت وہ دن ہے جس میں میلا ہوتا ہے اور دن چڑھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

پر غالب آ گیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اُس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا، اِس لئے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا، اور اگر بالفرض تم غالب آ گئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (مظہری وقرطبی)[1]

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِلْقَاءٌ کے معنی ڈالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب میدان مقابلہ میں پہنچے تو جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یا تو آپ پہلے ڈالیں یا ہم پہلے ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں۔ جادوگروں کا یہ کہنا اپنی بے فکری اور بڑائی جتانے کے لئے تھا کہ ہمیں اس کی پروا نہیں کہ ابتدا ہماری طرف سے ہو، کیونکہ ہم ہر حالت میں اپنے فن پر اطمینان رکھتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ چاہتے تو یہی تھے کہ پہلا وار اُن کا ہو مگر اظہارِ قوت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پہل آپ کرنا چاہتے ہو یا ہم کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے منشاء کو محسوس کر کے اپنے معجزہ پر مکمل اطمینان ہونے کے سبب پہلا موقع ان کو دے دیا اور فرمایا اَلْقُوْا ۚ یعنی تم ہی پہلے ڈالو۔

اور ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ادب واحترام کا معاملہ کیا کہ پہلا موقع ان کو دینے کی پیش کش کی، اُسی کا یہ اثر تھا کہ ان کو ایمان کی توفیق ہوگئی۔[2]

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جادو خود ہی ایک حرام فعل ہے، پھر جبکہ وہ کسی پیغمبر کو شکست دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو بلاشبہ کفر ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے کیسے ان لوگوں کو اس کی اجازت دینے کے لئے فرمایا اَلْقُوْا ۚ یعنی تم ڈالو۔ لیکن حقیقتِ حال پر غور کرنے سے یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں تو یقینی تھا کہ یہ لوگ اپنا سحر مقابلہ پر ضرور پیش کریں گے، گفتگو صرف پہلے اور پیچھے کی تھی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اولوالعزمی کا ثبوت دینے کے لئے ان کو ہی موقع عطا فرمایا، اس کے علاوہ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ پہلے جادوگر اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنالیں تو پھر عصاءِ موسیٰ کا معجزہ، صرف یہی نہیں کہ وہ بھی سانپ بن جائے بلکہ اس طرح ظاہر ہو کہ وہ جادو کے سارے سانپوں کو نگل بھی جائے تا کہ جادوگری کی کھلی شکست پہلے ہی قدم پر سامنے آجائے۔ (بیان القرآن)

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ان کو جادوگری کرنے کی اجازت کے لئے نہیں بلکہ ان کی رسوائی کو واضح کرنے کے لئے تھا کہ اچھا تم ڈال کر دیکھو کہ تمہارے جادو کا کیا انجام ہوتا ہے۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ یعنی جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور

[1] التفسیر المظہری تحت ہذہ الآیۃ ج:۳ ص:۳۹۲　[2] التفسیر القرطبی تحت ہذہ الآیۃ ج:۷ ص:۲۵۸

رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور بڑا جادو دکھلایا۔

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی کر دی اور تخییل تھی جس سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ واقع میں اسی طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں، سانپ نہیں بنے تھے، یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر صِرف اسی قسم میں منحصر ہے، سحر کے ذریعہ انقلابِ ماہیت نہیں ہوسکتا، کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ سحر کی مختلف اقسام واقعات سے ثابت ہیں۔ کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے، کہیں صرف تخییل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم سے، اور اگر کہیں قلبِ ماہیت بھی ہو جاتا ہو کہ اِنسان کا پتھر بن جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ یعنی ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دو، وہ زمین پر گرتے ہی سب سے بڑا سانپ بن کر ان تمام سانپوں کو نگلنے لگا جو جادوگروں نے جادو سے ظاہر کئے تھے۔

تاریخی روایات میں ہے کہ ہزاروں جادوگروں کی ہزاروں لاٹھیاں اور رسیاں جب سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو سارا میدان سانپوں سے بھر گیا اور ایک عجیب ہیبت سارے مجمع پر مسلط ہوگئی تھی، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ایک بڑے اژدہا کی صورت میں سامنے آئی تو ان سب سانپوں کو نگل کر ختم کر دیا۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ یعنی حق ظاہر ہوگیا اور جو کچھ ساحروں نے بنایا تھا وہ سب باطل اور ہوا ہوگیا۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ یعنی اس موقع پر وہ سب ہار گئے اور خوب رُسوا ہوئے۔

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ یعنی جادوگر سجدے میں ڈال دیئے گئے اور کہنے لگے کہ ہم ربّ العالمین یعنی ربِّ موسیٰ وہارون پر ایمان لے آئے۔

سجدے میں ڈال دیئے گئے فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر یہ لوگ کچھ ایسے مبہوت اور مجبور ہوگئے کہ بے اختیار سجدہ میں گر گئے۔ اور اس کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرما کر ان کو سجدہ میں ڈال دیا۔ اور ''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کے ساتھ ''رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾'' بڑھا کر اپنی بات کو فرعون کے مقابلہ میں واضح کر دیا کیونکہ وہ بے وقوف تو اپنے آپ ہی کو ربّ العالمین کہتا تھا، اس لئے رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ کہہ کر اس کو بتلا دیا کہ ہم تیری خدائی کے قائل نہیں رہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ

بولا فرعون کیا تم ایمان لے آئے اس پر میری اجازت سے پہلے، یہ تو مکر ہے جو بنایا تم سب نے

فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ

اس شہر میں تا کہ نکال دو اس شہر سے اس کے رہنے والوں کو، سو اب تم کو معلوم ہو جائے گا میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ

وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ

اور دوسری طرف کے پاؤں، پھر سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو، وہ بولے ہم کو تو

اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ ۚ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا

اپنے ربّ کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے اور تجھ کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ مان لیا ہم نے اپنے ربّ کی نشانیوں کو

لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۸

جب وہ ہم تک پہنچیں اے ہمار ربّ! دہانے کھول دے ہم پر صبر کے اور ہم کو مار مسلمان،

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا

اور بولے سردار قومِ فرعون کے، کیوں چھوڑتا ہے تو موسیٰ اور اس کی قوم کو کہ دھوم مچائیں

فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ

ملک میں، اور موقوف کردے تجھ کو اور تیرے بتوں کو، بولا اب ہم مار ڈالیں گے ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے

نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

ان کی عورتوں کو، اور ہم ان پر زور آور ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

فرعون بولا: ''تم میرے اجازت دینے سے پہلے ہی اِس شخص پر ایمان لے آئے۔ یہ ضرور کوئی سازش ہے جو تم نے اِس شہر میں ملی بھگت کر کے بنائی ہے، تاکہ تم یہاں کے رہنے والوں کو یہاں سے نکال باہر کرو۔ اچھا تو تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا ﴿۱۲۳﴾ میں نے بھی پکا ارادہ کرلیا ہے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالوں گا، پھر تم سب کو اکٹھے سولی پر لٹکا کر رہوں گا'' ﴿۱۲۴﴾ انہوں نے کہا: ''یقین رکھ کہ ہم (مر کر) اپنے مالک ہی کے پاس واپس جائیں گے ﴿۱۲۵﴾ اور تُو اس کے سوا ہماری کس بات سے ناراض ہے کہ جب ہمارے مالک کی نشانیاں ہمارے پاس آگئیں تو ہم اُن پر ایمان لے آئے؟ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کے پیمانے اُنڈیل دے، اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے تابع دار ہوں۔'' ﴿۱۲۶﴾ اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے (فرعون سے) کہا: ''کیا آپ موسیٰ اور اُس کی قوم کو کُھلا چھوڑ رہے ہیں، تاکہ وہ زمین میں فساد مچائیں، اور آپ اور آپ کے خداؤں کو پس پشت ڈال دیں؟'' وہ بولا: ''ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے، اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے، اور ہمیں ان پر پورا پورا قابو حاصل ہے'' ﴿۱۲۷﴾

خلاصۂ تفسیر

فرعون (بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو ایک مضمون گھڑ کر ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے ہو بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں بیشک (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جو کچھ جنگ زرگری کے طور پر ہوا ہے) ایک کارروائی تھی جس پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اِس شہر میں (خفیہ سازش ہوگئی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے اور یہ کارروائی ملی بھگت اس لئے کی ہے) تاکہ تم سب (مل کر) اِس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو (پھر بفراغِ خاطر سب مل کر یہاں ریاست کرو) سو (بہتر ہے) اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا (تاکہ اوروں کو عبرت ہو) انہوں نے جواب دیا کہ (کچھ پروا نہیں) ہم مر کر (کسی بُرے ٹھکانے تو نہ جائیں گے بلکہ) اپنے مالک ہی کے پاس جائیں گے (جہاں ہر طرح امن وراحت ہے سو ہمارا نقصان ہی کیا ہے) اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا ہے (جس پر اس قدر شور وغل ہے) بجز اس کے کہ ہم اپنے ربّ کے اَحکام پر ایمان لے آئے (سو یہ کوئی عیب کی بات نہیں پھر اس سے اِعراض کر کے حق تعالیٰ سے دُعا کی کہ) اے ہمارے ربّ! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما (کہ اگر یہ سختی کرے تو مستقل رہیں) اور ہماری جان حالتِ اسلام پر نکالئے (کہ اس کی سختی

سے پریشان ہو کر کوئی بات ایمان کے خلاف نہ ہو جائے) اور (جب موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ عظیمہ منظرِ عام پر ظاہر ہوا اور ساحرین ایمان لے آئے اور بعضے اور لوگ بھی آپ کے تابع ہو گئے اس وقت) قوم فرعون کے سرداروں نے (جو کہ اعیانِ سلطنت تھے یہ دیکھ کر کہ بعضے آدمی مسلمان ہو چلے فرعون سے) کہا کہ کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کی قوم (تابعین) کو یوں ہی (مخلّی بالطبع و مطلق العنان آزاد) رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں (فساد یہ کہ اپنا مجمع بڑھائیں جس کے اخیر میں اندیشۂ بغاوت ہے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آپ کو اور آپ کے (تجویز کئے ہوئے) معبودوں کو ترک کئے رہیں (یعنی ان کے معبود ہونے کے منکر رہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم بھی ایسا ہی کرے یعنی آپ اس کا اِنتظام کیجئے) فرعون نے کہا کہ (سردست یہ انتظام مناسب معلوم ہوتا ہے کہ) ہم بھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں (تاکہ ان کا زور نہ بڑھنے پائے) اور (چونکہ عورتوں کے بڑھنے سے کوئی اندیشہ نہیں نیز ہم کو اپنے کار و خدمت کے لئے بھی ضرورت ہے اِس لئے) عورتوں کو زندہ رہنے دیں اور ہم کو ہر طرح کا ان پر زور ہے (اس انتظام میں کوئی دشواری نہ ہوگی)۔

معارف و مسائل

اِن سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ فرعون نے اپنی قوم کے سرداروں کے مشورہ سے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے جن ساحروں کو پورے ملک سے جمع کیا تھا وہ میدانِ مقابلہ میں ہار گئے۔ اور صرف یہی نہیں کہ اپنی ہار مان لی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

تاریخی روایات میں ہے کہ جادوگروں کے سردار مسلمان ہو گئے تو ان کو دیکھ کر قومِ فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اعلان کر دیا۔

اِس مقابلہ اور مناظرہ سے پہلے تو صرف دو حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے مخالف تھے۔ اس وقت سب سے بڑے جادوگر جو قوم میں اِقتدار کے مالک تھے اور ان کے ساتھ چھ لاکھ عوام مسلمان ہو کر ایک بہت بڑی طاقت مقابلہ پر آ گئی۔

اس وقت فرعون کی پریشانی اور سراسیمگی بیجا نہ تھی مگر اُس نے اس کو چھپا کر ایک چالاک ہوشیار سیاست دان کے انداز میں پہلے تو جادوگروں پر یہ باغیانہ الزام لگایا کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خفیہ سازش کر کے یہ کام اپنے ملک و ملت کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا ہے اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ یعنی یہ ایک سازش ہے جو تم نے میدانِ مقابلہ میں آنے سے پہلے شہر کے اندر آپس میں کر رکھی تھی۔ اور پھر جادوگروں کو خطاب کر کے کہا اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ

یعنی کیا تم نے میری اجازت سے پہلے ہی ایمان قبول کرلیا؟ یہ استفہام انکاری بطور زجر وتنبیہ کے تھا، اور اپنی اجازت سے پہلے ایمان لانے کا ذِکر کرکے لوگوں کو یہ یقین دِلانے کی کوشش کی ہے کہ ہم خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا حق پر ہونا واضح ہوجائے تو ہم بھی ان کو مانیں اور لوگوں کو بھی اجازت دیں کہ وہ مسلمان ہوجائیں لیکن تم لوگوں نے جلد بازی کی اور حقیقت کو سوچے سمجھے بغیر ایک سازش کے شکار ہوگئے۔

اس چالاکی سے ایک طرف تو لوگوں کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور جادوگروں کی تسلیم کو ایک سازش قرار دے کر اُن کو قدیم گمراہی میں مبتلا رکھنے کا انتظام کیا اور دوسری طرف سیاسی چالاکی یہ کی کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اور جادوگروں کا اسلام جو خالص فرعون کی گمراہی کو کھولنے کے لئے تھا، قوم اور عوام سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا اُس کو ایک ملکی اور سیاسی مسئلہ بنانے کے لئے کہا، لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ یعنی تم لوگوں نے یہ سازش اِس لئے کی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ ملکِ مصر پر تم غالب آجاؤ اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، اِن چالاکیوں کے بعد ان سب پر اپنی ہیبت اور حکومت کا رعب وخوف جمانے کے لئے جادوگروں کو دھمکیاں دینی شروع کیں، اوّل تو مبہم انداز میں کہا، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ یعنی تم ابھی دیکھ لوگے کہ تمہاری اس سازش کا کیا انجام ہوتا ہے، اس کے بعد اُس کو واضح کرکے بتلایا، لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ یعنی میں تم سب کے ہاتھ پیر مختلف جانبوں سے کاٹ کر تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا۔ مختلف جانبوں سے کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پیر جس سے دونوں جانبیں زخمی اور بدہیئت اور بیکار ہوجائیں۔

فرعون نے اس بدحالی پر قابو پانے اور درباریوں اور عوام کو قابو میں رکھنے کی کافی تدبیر کرلی تھی اور اس کی ظالمانہ سزائیں پہلے سے مشہور اور لوگوں کو لرزہ براندام کردینے کے لئے کافی تھیں۔

لیکن اسلام وایمان ایک ایسی زبردست قوت ہے کہ جب وہ کسی دِل میں گھر کرلیتی ہے تو پھر انسان ساری دنیا اور اس کے وسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔

یہ جادوگر جواب سے چند گھنٹے پہلے فرعون کو اپنا خدا مانتے اور اسی گمراہی کی لوگوں کو تلقین کرتے تھے، چند منٹ میں کلمۂ اسلام پڑھتے ہی ان میں کیا چیز پیدا ہوگئی تھی کہ وہ فرعون کی ساری دھمکیوں کے جواب میں یہ کہتے ہیں:-

اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ ۚ یعنی اگر تو ہمیں قتل کردے گا تو مضائقہ نہیں، ہم اپنے ربّ کے پاس چلے جائیں گے، جہاں ہم کو ہر طرح کی راحت ملے گی۔ جادوگر چونکہ فرعون کی سطوت وجبروت سے ناواقف نہ تھے اس لئے یہ نہیں کہا کہ ہم تیرے قابو میں نہیں آئیں گے یا ہم مقابلہ کریں گے بلکہ اس کی دھمکی کو صحیح مان کر یہ جواب دیا کہ یہ مانا کہ تو ہمیں ہر قسم کی سزا دینے پر دنیا میں قادر ہے مگر ہم دنیا کی زندگی ہی کو ایمان لانے کے بعد کوئی چیز نہیں سمجھتے، دنیا سے گزر جائیں گے تو اس

زندگی سے بہتر زندگی ملے گی اور اپنے ربّ کی ملاقات نصیب ہوگی۔ اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اس زندگی میں جو تیرا دل چاہے کرلے، آخر کار ہم اور تم سب ربّ العالمین کے سامنے پیش ہوں گے اور وہ ظالم سے مظلوم کا انتقام لیں گے اس وقت اپنے اس عمل کا نتیجہ تیرے سامنے آجائے گا۔ چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس موقع پر ان جادوگروں کے یہ الفاظ منقول ہیں، فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؀ (طٰہٰ) یعنی جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں حکم دے دے، بس اتنا ہی تو ہے کہ تیرا حکم ہماری اس دنیوی زندگی پر چل سکتا ہے اور تیرے غصہ کے نتیجے میں وہ زندگی ختم ہوسکتی ہے مگر ایمان لانے کے بعد ہماری نظر میں اس دنیوی زندگی کی وہ اہمیت ہی باقی نہیں رہی جو ایمان لانے سے پہلے تھی کیونکہ ہمیں معلوم ہوگیا کہ یہ زندگی راحت یا کلفت کے ساتھ گزر ہی جائے گی، فکر اُس زندگی کی کرنا چاہئے جس کے بعد موت نہیں اور جس کی راحت بھی دائمی اور کلفت بھی۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو کل تک بدترین کفر میں مبتلا تھے کہ فرعون جیسے بیہودہ انسان کو خدا مانتے تھے، خدا تعالیٰ کی شان وعظمت سے بالکل ناآشنا تھے، ان میں یکبارگی ایسا انقلاب کیسے آگیا کہ اب پچھلے سب عقائد واعمال سے یکسر تائب ہوکر دینِ حق پر اتنے پختہ ہوگئے کہ اس کے لئے جان تک دینے کو تیار نظر آتے ہیں، اور دنیا سے رخصت ہونے کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اپنے ربّ کے پاس چلے جائیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ ایمان کی قوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت ان میں پیدا ہوگئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم ومعرفت کے دروازے ان پر کھل گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ فرعون کے مقابلہ میں اس جرأت مندانہ بیان کے ساتھ یہ دعا بھی کرنے لگے:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ؀

یعنی اے ہمارے پروردگار ہمیں کامل صبر عطا فرما اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہمیں وفات دے۔

اس میں اشارہ اس معرفت کی طرف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو انسان کا عزم وہمت کچھ کام نہیں آتا، اس لئے اسی سے ثابت قدمی کی دعا کی گئی۔ اور یہ دعا جیسے معرفتِ حق کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اسی طرح اس مشکل کے حل کا بہترین ذریعہ بھی ہے جس میں یہ لوگ اس وقت مبتلا تھے، کیونکہ صبر اور ثابت قدمی ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ عظیم کے اسباب ونتائج پر غور کرنے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی وہ قوم ہے جو میدانِ جنگ میں سب سے زیادہ بہادر اور مصیبت ومشقت پر صبر کرنے میں سب سے آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی اقوام میں فنون حرب کے ماہرین اس کی تاکید کرتے تھے کہ فوج میں دینداری اور خوفِ آخرت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کیونکہ اس سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ (تفسیر المنار)

ساحروں میں ایمانی انقلاب موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا و یدِ بیضاء سے بھی بڑا تھا

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی بنانے کے لئے ساری ہی تدبیریں اختیار کر رہے ہیں مگر اس گُر کو بھول بیٹھے ہیں جو قوت اور وحدت کی روح ہے۔ فرعونی جادوگروں نے بھی اول مرحلہ میں اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدا ناشناس منکر کافروں کو دم بھر میں نہ فقط مسلمان بلکہ ایک عارف کامل اور مجاہد و غازی بنا دینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا اور یدِ بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔

فرعون پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی ہیبت کا اثر

فرعون کی چالاکی اور سیاسی جھوٹ نے اس کی جاہل قوم کو اس کے ساتھ قدیم گمراہی میں مبتلا رہنے کا کچھ سامان تو کر دیا مگر یہ اُعجوبہ ان کے لئے بھی ناقابلِ فہم تھا کہ فرعون کے غصہ کا سارا زور جادوگروں پر ختم ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام جو اصل مخالف تھے ان کے بارے میں فرعون کی زبان سے کچھ نہ نکلا، اس پر ان کو کہنا پڑا:

اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۚ یعنی کیا آپ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دیں گے کہ وہ آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں فساد کرتے پھریں۔

اس پر مجبور ہو کر فرعون نے کہا، سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ یعنی ان کا معاملہ ہمارے لئے کچھ قابلِ فکر نہیں، ہم ان کے لئے یہ کام کریں گے کہ ان میں جو لڑکا پیدا ہوگا اس کو قتل کر دیں گے صرف لڑکیوں کو زندہ رہنے دیں گے، جس کا نتیجہ کچھ عرصہ میں یہ ہو جائے گا کہ ان کی قوم مردوں سے خالی ہو کر صرف عورتیں رہ جائیں گی جو ہماری خدمت گار باندیاں بنیں گی، اور ہم تو ان سب پر پوری قدرت رکھتے ہیں جو چاہیں کریں یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

علماءِ مفسرین نے فرمایا کہ قوم کے اِس طرح جھنجوڑنے پر بھی فرعون نے یہ تو کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے، لیکن حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں اس وقت بھی اس کی زبان پر کوئی بات نہ آئی، وجہ یہ ہے

کہ اس معجزہ اور واقعہ نے فرعون کے قلب و دماغ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سخت ہیبت بٹھلادی تھی۔

حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ فرعون کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو پیشاب خطا ہوجاتا تھا، اور یہ بالکل صحیح ہے، ہیبتِ حق کا یہی حال ہوتا ہے ؎

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست [1]

اور مولانا رومیؒ نے فرمایا ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید   ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید [2]

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے ساری مخلوق اس سے ڈرنے لگتی ہے۔

اِس جگہ قومِ فرعون نے جو یہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر فساد کرتے پھریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون اگرچہ اپنی قوم کے سامنے خود خدائی کا دعویدار تھا اور اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى ﴿۲۴﴾ (النازعات) کہتا تھا، لیکن خود بتوں کی پوجا پاٹ بھی کیا کرتا تھا۔

اور بنی اسرائیل کو کمزور کرنے کے لئے یہ ظالمانہ قانون کہ جو لڑکا پیدا ہو اسے قتل کردیا جائے یہ اب دوسری مرتبہ نافذ کیا گیا، اس کا پہلا نمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہوچکا تھا، جس کے ناکام ہونے کا مشاہدہ یہ اس وقت تک کر رہا تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو رسوا کرنا چاہتے ہیں اس کی تدبیریں ایسی ہی ہوجایا کرتی ہیں جو انجامِ کار ان کے لئے تباہی کا سامان کردیتی ہیں، چنانچہ آگے معلوم ہوگا کہ فرعون کا یہ ظلم و جور آخر کار اُس کو اور اس کی قوم کو لے ڈوبا۔

قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهِ اسۡتَعِيۡنُوۡا بِاللّٰهِ وَاصۡبِرُوۡا ۚ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ ۙ

موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو، بیشک زمین ہے اللہ کی،

يُوۡرِثُهَا مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوۡۤا

اس کا وارث کردے جس کو وہ چاہے اپنے بندوں میں، اور آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کے لئے، وہ بولے

[1] ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ہیبت ہے مخلوق کی نہیں۔

[2] ترجمہ: جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اس سے تمام جن اور انسان ڈرتے ہیں اور جو بھی اسے دیکھ لے وہ اس سے ڈرتا ہے۔

اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ

ہم پر تکلیفیں رہیں تیرے آنے سے پہلے، اور تیرے آنے کے بعد، کہا نزدیک ہے کہ تمہارا ربّ

اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ع ۵

ہلاک کردے تمہارے دشمن کو اور خلیفہ کردے تم کو ملک میں، پھر دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو،

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ

تاکہ وہ نصیحت مانیں، پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق، اور اگر

تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

پہنچی بُرائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی، سن لو ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ

پر اکثر لوگ نہیں جانتے، اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا ہمارے پاس نشانی

لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے، سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: ”اللہ سے مدد مانگو، اور صبر سے کام لو، یقین رکھو کہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں

میں سے جسے چاہتا ہے، اُس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری انجام پرہیزگاروں ہی کے حق میں ہوتا ہے۔" (۱۲۸) انہوں نے کہا کہ: "ہمیں تو آپ کے آنے سے پہلے بھی ستایا گیا تھا، اور آپ کے آنے کے بعد بھی (ستایا جا رہا ہے)" موسیٰ نے کہا: "اُمید رکھو کہ تمہارا پروردگار تمہارے دُشمن کو ہلاک کر دے گا، اور تمہیں زمین میں اُس کا جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسا کام کرتے ہو۔" (۱۲۹) اور ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا، تا کہ اُن کو تنبیہ ہو۔ (۱۳۰) (مگر) نتیجہ یہ ہوا کہ اگر اُن پر خوش حالی آتی تو وہ کہتے: "یہ تو ہمارا حق تھا" اور اگر اُن پر کوئی مصیبت پڑ جاتی تو اُس کو موسیٰ اور اُن کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ ارے (یہ تو) خود اُن کی نحوست (تھی جو) اللہ کے علم میں تھی، لیکن اُن میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں تھے (۱۳۱) اور (موسیٰ سے) کہتے تھے کہ: "تم ہم پر اپنا جادو چلانے کے لئے چاہے کیسی بھی نشانی لے کر آ جاؤ، ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں" (۱۳۲)

خلاصۂ تفسیر

(اِس مجلس کی گفتگو کی خبر جو بنی اسرائیل کو پہنچی تو بڑے گھبرائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چارہ جوئی کی تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا سہارا رکھو اور مستقل رہو (گھبراؤ مت) یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک (اور حاکم) بنائیں اپنے بندوں میں سے (سو چند روز کے لئے فرعون کو دے دی ہے) اور اَخیر کامیابی ان ہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (سو تم ایمان وتقویٰ پر قائم رہو، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ سلطنت تم ہی کو مل جائے گی، تھوڑے دِنوں اِنتظار کی ضرورت ہے) قوم کے لوگ (غایت حسرت وحزن سے جس کا طبعی اقتضاء تکرارِ شکوہ ہے) کہنے لگے کہ (حضرت) ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (کہ فرعون بیگار لیتا تھا اور مدتوں ہمارے لڑکوں کو قتل کرتا رہا) اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی (کہ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جا رہی ہیں یہاں تک کہ اب پھر قتلِ اولاد کی تجویز ٹھہری ہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (گھبراؤ مت) بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس زمین کا حاکم بنا دیں گے پھر تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے (کہ شکر وقدر وطاعت کرتے ہو یا بے قدری اور غفلت ومعصیت، اس میں ترغیب ہے طاعت کی اور تحذیر ہے معصیت سے) اور (جب فرعون اور اس کے تابعین نے انکار ومخالفت پر کمر باندھی تو) ہم نے فرعون والوں (مع فرعون کے حسبِ عادت مذکورہ رکوع اول پارۂ ھٰذا، ان بلیات میں) مبتلا کیا ۱- قحط سالی میں اور ۲- پھلوں کی کم پیداواری میں تا کہ وہ (حق بات کو) سمجھ جائیں (اور سمجھ کر قبول کر لیں) سو (وہ پھر بھی نہ سمجھے بلکہ یہ کیفیت تھی کہ) جب ان پر خوشحالی (یعنی ارزانی وپیداواری) آ جاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے (یعنی ہم مبارک طالع ہیں یہ ہماری خوش بختی کا اثر ہے، یہ نہ تھا کہ اس کو خدا کی نعمت

سمجھ کر شکر بجالاتے اور اطاعت اختیار کرتے) اور اگر ان کو کوئی بدحالی (جیسے قحط و کم پیداواری مذکور) پیش آتی تو موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے (کہ یہ ان کی نحوست سے ہوا، یہ نہ ہوا کہ اس کو اپنے اعمالِ بد کفر و تکذیب کی شامت اور سزا سمجھ کر تائب ہوجاتے حالانکہ یہ سب ان کی شامتِ اعمال تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں کہ) یاد رکھو کہ ان کی (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی ان کے اعمالِ کفریہ تو اللہ کو معلوم ہیں یہ نحوست انہی اعمال کی سزا ہے) لیکن (اپنی بے تمیزی سے) ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے تھے اور (بلکہ اوپر سے) یوں کہتے (کہ خواہ کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے۔

معارف و مسائل

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد بنی اسرائیل پر اس طرح غصہ اتارا کہ ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف عورتوں کو باقی رکھنے کا قانون بنادیا تو بنی اسرائیل گھبرائے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے جو عذاب فرعون نے اُن پر ڈالا تھا وہ پھر آ گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اِس کو محسوس فرمایا تو پیغمبرانہ شفقت اور حکمت کے مطابق اس بلاء سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کو دو چیزوں کی تلقین فرمائی، ایک دشمن کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا۔ دوسرے کشود کار تک صبر و ہمت سے کام لینا۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ اِس نسخہ کا استعمال کرو گے تو یہ ملک تمہارا ہے تمہیں غالب آؤ گے۔ یہی مضمون ہے پہلی آیت کا جس میں فرمایا ہے، اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ یعنی اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔ اور پھر فرمایا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ یعنی ساری زمین اللہ کی ہے وہ جس کو چاہے اس کو اس زمین کا وارث و مالک بنائے گا۔ اور یہ بات متعین ہے کہ انجامِ کار کامیابی متقی پرہیزگاروں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا جس کا طریقہ اوپر مذکور ہوا ہے کہ استعانت باللہ اور صبر کا التزام کیا جائے تو انجام کار تم ہی ملکِ مصر کے مالک و قابض ہو گے۔

مشکلات و مصائب سے نجات کا نسخۂ اکسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جو حکیمانہ نسخہ دشمن پر غالب آنے کے لئے تلقین فرمایا تھا، غور کیا جائے تو یہی وہ نسخہ اکسیر ہے جو کبھی خطا نہیں ہوتا، جس کے بعد کامیابی یقینی ہوتی ہے، اس نسخہ کا پہلا جز استعانت باللہ ہے، جو اصل رُوح ہے اس نسخہ کی۔ وجہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات جس کی مدد پر ہو تو ساری کائنات کا رخ اس کی مدد کی طرف پھر جاتا ہے، کیونکہ ساری کائنات اُس کے تابع فرمان ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند   بامن وتو مردہ باحق زندہ اند [1]

حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا اِرادہ کرتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے دشمن کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی قوت انسان کے لئے اتنی کارآمد نہیں ہوسکتی جتنی اللہ تعالیٰ سے امداد کی طلب، بشرطیکہ طلب صادق ہو، محض زبان سے کچھ کلمات بولنا نہ ہو۔

دوسرا جزء اس نسخہ کا صبر ہے، صبر کے معنی اصل لغت کے اِعتبار سے خلافِ طبع چیزوں پر ثابت قدم رہنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے ہیں، کسی مصیبت پر صبر کرنے کو بھی اسی لئے صبر کہا جاتا ہے کہ اُس میں رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کے طبعی جذبہ کو دبایا جاتا ہے۔

ہر تجربہ کار عقل مند جانتا ہے کہ دنیا میں ہر بڑے مقصد کے لئے بہت سی خلافِ طبع محنت و مشقت برداشت کرنا لازمی ہے، جس شخص کو محنت و مشقت کی عادت اور خلافِ طبع چیزوں کی برداشت حاصل ہوجائے وہ اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر ایسی نعمت ہے کہ اس سے زیادہ وسیع تر نعمت کسی کو نہیں ملی۔ (ابوداؤد) [2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس حکیمانہ نصیحت اور اس پر مرتب ہونے والی فتح و نصرت کا اجمالی وعدہ کجروی کی خوگر بنی اسرائیل کی سمجھ میں کیا آتا، یہ سب کچھ سن کر بول اُٹھے اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا یعنی آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں ایذائیں دی گئیں اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے تو اس اُمید پر وقت گزارا جاسکتا تھا کہ کوئی پیغمبر ہماری گلوخلاصی کے لئے آئے گا، اب آپ کے آنے کے بعد بھی یہی ایذاؤں کا سلسلہ رہا تو ہم کیا کریں گے۔

اس لئے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حقیقت امر کو واضح کرنے کے لئے فرمایا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ بات دور نہیں کہ اگر تم نے ہماری نصیحت کو مانا تو بہت جلد تمہارا دشمن ہلاک و برباد ہوگا اور ملک پر تم کو قبضہ و اقتدار ملے گا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا، فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ جس میں بتلادیا کہ اِس دنیا میں کسی زمین کی حکومت و سلطنت خود کوئی مقصد نہیں بلکہ زمین میں عدل و انصاف قائم کرنے اور اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی نیکی کو پھیلانے اور بدی کو روکنے کے لئے کسی اِنسان کو کسی ملک کی حکومت دی جاتی ہے، اس لئے جب تم کو ملک مصر پر اِقتدار حاصل ہو تو ہوشیار رہو، ایسا نہ ہو کہ تم بھی حکومت و اقتدار کے نشہ میں اپنے سے پہلے لوگوں کے انجام کو بھلا بیٹھو۔

---

[1] ترجمہ: مٹی، ہوا، پانی اور آگ غلام ہیں، میرے اور تیرے اعتبار سے مردہ ہیں لیکن اللہ کے نزدیک زندہ ہیں۔

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب في الإستعفاف ج: ۱ ص: ۲۳۲

حکومت وسلطنت حکمران طبقہ کا اِمتحان ہے

اِس آیت میں خطاب اگرچہ خاص بنی اسرائیل کو ہے لیکن اللہ جل شانہٗ نے ہر حکمران طبقہ کو اس میں یہ تنبیہ فرمادی ہے کہ درحقیقت حکومت وسلطنت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، انسان کو بحیثیت خلیفہ کے وہی حکومت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھین لیتا ہے، تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ [1] (آل عمران:۲۶) کا یہی مطلب ہے۔ نیز یہ کہ جس کو کسی زمین پر حکومت عطا کی جاتی ہے وہ درحقیقت حکمران فرد یا حکمران جماعت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ مقصدِ حکومت یعنی قیامِ عدل وانصاف اور اِقامۃ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔

تفسیر بحرِ محیط میں اس جگہ نقل کیا ہے کہ بنی عباس کے دوسرے خلیفہ منصور کے پاس خلافت ملنے سے پہلے ایک روز عمرو بن عبید آپہنچے تو یہ آیت پڑھی، عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ، جس میں ان کے لئے خلافت ملنے کی بشارت تھی، اِتفاقاً اس کے بعد منصور خلیفہ بن گئے اور پھر عمرو بن عبید ان کے یہاں پہنچے تو منصور نے اُن کی پیشین گوئی جو آیتِ مذکورہ کے تحت اس سے پہلے فرمائی تھی یاد دِلائی تو عمرو بن عبید نے خوب جواب دیا کہ ہاں خلیفہ ہونے کی پیشین گوئی تو پوری ہوگئی مگر ایک چیز باقی ہے یعنی فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ [2]، مطلب یہ تھا کہ ملک کا خلیفہ وامیر بن جانا کوئی فخر ومسرّت کی چیز نہیں کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خلافت وحکومت میں اس کا رویہ کیا اور کیسا رہا، اب اس کے دیکھنے کا وقت ہے۔

اس کے بعد آیتِ مذکورہ کے وعدہ کا ایفاء اور قومِ فرعون کا طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار ہونا اور بالآخر غرقِ دریا ہوکر ختم ہوجانا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس میں سب سے پہلا عذاب قحط اور اشیاء کی کمیابی اور گرانی کا تھا جو قومِ فرعون پر مسلط ہوا۔

تفسیری روایات میں ہے کہ یہ قحط ان پر سات سال مسلسل رہا، اور آیت میں جو اس قحط کے بیان میں دو لفظ آئے ہیں، ایک سِنِيْن، دوسرے نقصِ ثمرات۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے فرمایا کہ قحط اور خشک سالی کا عذاب تو گاؤں والوں کے لئے تھا اور پھلوں کی کمی شہر والوں کے لئے، [3] کیونکہ عموماً دیہات میں غلہ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور شہروں میں پھلوں کے باغات ہوتے ہیں تو اشارہ اس طرف ہوا کہ نہ غلہ کے کھیت باقی رہے نہ پھلوں کے باغات۔

لیکن جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا قہر ہوتا ہے تو صحیح بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، قومِ فرعون بھی اسی قہر میں مبتلا تھی، عذاب کے اس ابتدائی جھٹکے سے بھی ان کو کوئی تنبیہ نہ ہوئی بلکہ اس کو اور ہر آنے والی مصیبت کو یہ کہنے لگے کہ یہ نحوست

---

[1] ترجمہ: آپ ملک جس کو چاہیں دیدیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں۔ [2] [3] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۵، ص:۴۲۷

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی ہے، فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ یعنی جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی اور راحت و آرام ملتا تو یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا حق ہے ہمیں ملنا ہی چاہئے، اور جب کوئی مصیبت اور برائی پیش آتی تو کہتے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے اثر سے ہے، حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

لفظِ طَآئِر کے لغوی معنی پرندے جانور کے ہیں، عرب پرندہ جانوروں کے داہنی بائیں جانب اترنے سے اچھی بری فالیں لیا کرتے تھے، اس لئے مطلق فال کو بھی "طائر" کہنے لگے، اس آیت میں طَآئِر کے یہی معنی ہیں۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان کی فال اچھی یا بُری جو کچھ بھی ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے جو کچھ اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے عمل میں آتا ہے، نہ اس میں کسی کی نحوست کا دخل ہے نہ برکت کا، یہ سب ان کی خام خیالی اور جہالت ہے جو پرندوں کے داہنے یا بائیں اڑ جانے سے اچھی بُری فالیں لے کر اپنے مقاصد اور عمل کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔

اور بالآخر قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کو سحر کہہ کر نظر انداز کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ یعنی آپ کتنی ہی علامتیں اپنی نبوّت کی پیش کرکے ہم پر اپنا جادو چلانا چاہیں تو سن لیجئے ہم کبھی آپ پر ایمان لانے والے نہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ

پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹڈی اور چچڑی اور مینڈک اور خون

اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَلَمَّا وَقَعَ

بہت سی نشانیاں جدی جدی، پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ گنہگار، اور جب پڑتا

عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ

ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ دعا کر ہمارے واسطے اپنے ربّ سے جیسا کہ اس نے بتلا رکھا ہے تجھ کو

لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ

اگر تُو نے دور کردیا ہم سے یہ عذاب تو بیشک ہم ایمان لے آئیں گے تجھ پر اور جانے دیں گے تیرے ساتھ

بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ

بنی اسرائیل کو، پھر جب ہم نے اٹھالیا ان سے عذاب ایک مدت تک کہ ان کو اس مدت تک پہنچنا تھا

اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا

اسی وقت عہد توڑ ڈالتے، پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے سو ڈبو دیا ہم نے ان کو دریا میں اِس وجہ سے کہ انہوں نے جھٹلایا

بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

ہماری آیتوں کو اور ان سے تغافل کرتے تھے

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ ہم نے اُن پر طوفان، ٹڈیوں، گھن کے کیڑوں، مینڈکوں اور خون کی بلائیں چھوڑیں، جو سب علیحدہ علیحدہ نشانیاں تھیں۔ پھر بھی انہوں نے تکبر کا مظاہرہ کیا، اور وہ بڑے مجرم لوگ تھے ﴿۱۳۳﴾ اور جب اُن پر عذاب آپڑتا تو وہ کہتے: ''اے موسیٰ! تمہارے پاس اللہ کا جو عہد ہے، اُس کا واسطہ دے کر ہمارے لئے اپنے رَبّ سے دُعا کردو (کہ یہ عذاب ہم سے دُور ہوجائے)۔ اور اگر واقعی تم نے ہم پر سے یہ عذاب ہٹادیا تو ہم تمہاری بات مان لیں گے، اور بنی اسرائیل کو ضرور تمہارے ساتھ بھیج دیں گے'' ﴿۱۳۴﴾ پھر جب ہم اُن پر سے عذاب کو، اتنی مدت تک ہٹا لیتے جس تک اُنہیں پہنچنا ہی تھا، تو وہ ایک دم اپنے وعدے سے پھر جاتے ﴿۱۳۵﴾ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُن سے بدلہ لیا، اور انہیں سمندر میں غرق کردیا، کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا، اور اُن سے بالکل بے پروا ہوگئے تھے ﴿۱۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(جب ایسی سرکشی اختیار کی تو) پھر ہم نے (ان دو بلاؤں کے علاوہ یہ بلائیں مسلط کیں کہ ۱۳۳) ان پر

(کثرتِ بارش کا) طوفان بھیجا (جس سے مال وجان تلف ہونے کا اندیشہ ہوگیا) اور (اس سے گھبرائے تو موسیٰ علیہ السلام سے عہد و پیمان کیا کہ ہم سے یہ بلا دُور کرائیے تو ہم ایمان لائیں اور جو آپ کہیں اطاعت کریں پھر جب وہ بلا دور ہوئی اور دِل خواہ غلہ وغیرہ نکلا پھر بے فکر ہوگئے کہ اب تو جان بھی بچ گئی مال بھی خوب ہوگا اور بدستور اپنے کفر وطغیان پر اڑے رہے تو ہم نے ان کے کھیتوں پر ۲) ٹڈیاں (مسلط کیں) اور (جب پھر کھیتوں کو تباہ ہوتے دیکھا تو گھبرا کر پھر ویسے ہی عہد و پیمان کئے اور پھر جب آپ کی دعا سے وہ بلا دور ہوئی اور غلہ وغیرہ تیار کرکے اپنے گھر لے آئے پھر بے فکر ہوگئے کہ اب تو غلہ قابو میں آگیا اور بدستور اپنے کفر ومخالفت پر جمے رہے تو ہم نے اس غلہ میں ۵) گھن کا کیڑا (پیدا کردیا) اور (جب گھبرا کر پھر اسی طرح عہد و پیمان کرکے دعا کرائی اور وہ بلا بھی دور ہوئی اور اس سے مطمئن ہوگئے کہ اب پیس کوٹ کر کھائیں پئیں گے، پھر وہی کفر اور وہی مخالفت، تو اس وقت ہم نے ان کے کھانے کو یوں بے لطف کردیا کہ ان پر ۶) مینڈک (ہجوم کرکے ان کے کھانے کے برتنوں میں ہنڈیوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہوا اور ویسے بھی گھر میں بیٹھنا مشکل کردیا) اور (پینا یوں بے لطف کردیا کہ ۷ ان کا پانی) خون (ہوجاتا، منہ میں لیا اور خون بنا، غرض ان پر یہ بلائیں مسلط ہوئیں) کہ یہ سب (موسیٰ علیہ السلام کے) کھلے کھلے معجزے تھے (کہ ان کی تکذیب ومخالفت پر ان کا ظہور ہوا اور یہ ساتوں، عصا اور یدِ بیضاء ملا کر آیاتِ تسعہ کہلاتے ہیں) سو (چاہئے تھا کہ ان معجزات وآیاتِ قہر کو دیکھ کر ڈھیلے پڑ جاتے مگر) وہ (پھر بھی) تکبر (ہی) کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ (کہ اتنی سختی پر بھی باز نہ آتے تھے) اور جب ان پر کوئی عذاب (مذکورہ بلاؤں میں سے) واقع ہوتا تو یوں کہتے، اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے ربّ سے اس بات کی دعا کردیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (وہ بات قہر کا دُور کردینا ہے ہمارے باز آجانے پر، سو ہم اب وعدہ کرتے ہیں کہ) اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹا دیں (یعنی دُعا کرکے ہٹوا دیں) تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی رہا کرکے آپ کے ہمراہ کردیں گے پھر جب (ببرکت دعائے موسیٰ علیہ السلام) ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے (جیسا اوپر بیان ہوا) پھر (جب ہر ہر طرح دیکھ لیا کہ وہ اپنی شرارت سے باز ہی نہیں آتے تب اس وقت) ہم نے ان سے (پورا) بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کردیا (جیسا دوسری جگہ ہے) اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے (اور تکذیب وغفلت بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ اِصرار وعناد کے ساتھ کہ اطاعت کا وعدہ کرلیں اور توڑ دیں)۔

معارف ومسائل

آیاتِ متذکرہ میں قومِ فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا باقی قصہ مذکور ہے کہ فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے مقابلہ میں ہار گئے اور ایمان لائے، مگر قومِ فرعون اسی طرح اپنی سرکشی اور کفر پر جمی رہی۔

اِس واقعہ کے بعد تاریخی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام بیس سال مصر میں مقیم رہ کر ان لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے اور حق کی طرف دعوت دیتے رہے، اور اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات عطا فرمائے، جن کے ذریعہ قومِ فرعون کو متنبہ کر کے راستہ پر لانا مقصود تھا، قرآنِ کریم میں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ (بنی اسرائیل:۱۰۱) میں انہی نو معجزات کا بیان ہے۔

اِن نو معجزات میں سب سے پہلے دو معجزے، عصا اور یدِ بیضاء کا ظہور فرعون کے دربار میں ہوا اور انہی دو معجزوں کے ذریعہ جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے فتح حاصل کی، اس کے بعد ایک معجزہ وہ تھا جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے کہ قومِ فرعون پر ان کی ضد اور کجروی کے سبب قحط مسلط کر دیا گیا، ان کی زمینوں اور باغوں میں پیداوار بہت گھٹ گئی جس سے یہ سخت پریشان ہوئے اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قحط رفع ہونے کے لئے دعا کرائی، مگر جب قحط رفع ہو گیا تو پھر اپنی سرکشی میں مبتلا ہو گئے اور لگے یہ کہنے کہ یہ قحط تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے سبب ہوا تھا، اب جو قحط رفع ہوا یہ ہمارے حال کا تقاضا ہے۔

باقی چھ آیات و معجزات کا بیان مذکورہ آیتوں میں ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ یعنی پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کا کیڑا اور مینڈک اور خون۔

اس میں قومِ فرعون پر مسلط ہونے والے پانچ قسم کے عذابوں کا ذکر ہے اور ان کو اس آیت میں اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فرمایا ہے جس کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ ان میں سے ہر عذاب ایک معین وقت تک رہا پھر موقوف ہو گیا، اور کچھ مہلت دی گئی، اس کے بعد دُوسرا اور تیسرا عذاب، اسی طرح الگ الگ ہو کر ان پر آیا، اسی کو ترجمہ شیخ الہندؒ میں اختیار کیا گیا ہے۔

ابنِ منذر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ان میں سے ہر عذاب قومِ فرعون پر سات روز تک مسلط رہتا تھا، ہفتہ کے دِن شروع ہو کر دوسرے ہفتہ کے دِن رفع ہو جاتا اور پھر تین ہفتے کی مہلت ان کو دی جاتی تھی۔

اِمام بغویؒ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ [1] جب پہلی مرتبہ قومِ فرعون پر قحط کا عذاب مسلط ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے رفع ہو گیا مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی کہ اے

[1] تفسیر البغوی تحت هذه الآية ج:۳ ص:۲۶۹ تا ۲۷۲

میرے پروردگار! یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ عذابِ قحط سے بھی متأثر نہ ہوئے اور معاہدہ کر کے پھر گئے، اب ان پر کوئی ایسا عذاب مسلط فرمادیجئے جو ان کے لئے دردناک ہو، اور ہماری قوم کے لئے ایک وعظ کا کام دے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درسِ عبرت بنے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے اُن پر طوفان کا عذاب بھیج دیا، مشہور مفسرین کے نزدیک طوفان سے مراد پانی کا طوفان ہے، قومِ فرعون کے سب گھروں اور زمینوں کو پانی کے طوفان نے گھیر لیا نہ کہیں بیٹھنے لیٹنے کی جگہ رہی نہ زمین میں کچھ کاشت وغیرہ کرنے کی، اور عجیب بات یہ تھی کہ قومِ فرعون کے مکانات اور زمینوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں تھیں، بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں سب بدستور خشک تھیں کہیں طوفان کا پانی نہ تھا اور قومِ فرعون کے سارے گھر اور زمین اس طوفان سے لبریز تھے۔

اِس طوفان سے گھبرا کر قومِ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ اپنے پروردگار سے دُعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے دُور فرمادیں تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کردیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے یہ طوفان دُور ہوا۔ اور اس کے بعد ان کی کھیتیاں پہلے سے زیادہ ہری بھری ہوگئیں، تو اب یہ کہنے لگے کہ درحقیقت یہ طوفان کوئی عذاب نہیں تھا بلکہ ہمارے فائدے کے لئے آیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری زمینوں کی پیداوار بڑھ گئی، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کا اس میں کچھ دخل نہیں اور یہ کہہ کر سب وعہد و پیمان نظر انداز کردیئے۔

اس طرح یہ لوگ ایک مہینہ امن و عافیت سے رہتے رہے، اللہ نے ان کو غور وفکر کی مہلت دی مگر یہ ہوش میں نہ آئے تو اب دوسرا عذاب ٹڈیوں کا ان پر مسلط کردیا گیا، ٹڈی دَل نے اُن کی ساری کھیتیوں اور باغوں کو کھالیا، بعض روایات میں ہے کہ لکڑی کے دروازوں اور چھتوں کو اور گھریلو سب سامان کو ٹڈیاں کھا گئیں، اور اس عذاب کے وقت بھی موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ سامنے تھا کہ یہ سارا ٹڈی دل صرف قبطی یعنی قومِ فرعوی کے باغوں، کھیتیوں، گھروں پر چھایا ہوا تھا، پاس ملے ہوئے اِسرائیلیوں کے مکانات، زمینیں، باغ سب اس سے محفوظ تھے۔

اس وقت پھر قومِ فرعون چلّا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اس مرتبہ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کردیں یہ عذاب ہٹ جائے تو ہم پختہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کردیں گے، موسیٰ علیہ السلام نے پھر دُعا کی اور یہ عذاب ہٹ گیا، مگر عذاب کے ہٹنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس اب بھی اتنا ذخیرہ غلہ کا موجود ہے کہ ہم سال بھر کھا سکتے ہیں، تو پھر سرکشی اور عہد شکنی پر آمادہ ہوگئے، نہ ایمان لائے نہ بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔

ایک مہینہ پھر اللہ تعالیٰ نے مہلت دی، اس مہلت کے بعد تیسرا عذاب **قُمَّل** کا مسلط ہوا، لفظِ **قُمَّل** اس جُوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو انسان کے بالوں اور کپڑوں میں پیدا ہوجاتی ہے، اور اس کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو غلہ میں لگ جاتا ہے جس کو گھُن بھی کہا جاتا ہے۔ **قُمَّل** کا یہ عذاب ممکن کہ دونوں قسم کے کیڑوں پر مشتمل ہو کہ غلوں میں گھُن لگ گیا اور

انسانوں کے بدن اور کپڑوں میں جوؤں کا طوفان امڈ آیا۔

غلوں کا حال اس گھن نے ایسا کر دیا کہ دس سیر گیہوں پیسنے کے لئے نکالیں تو اُس میں تین سیر آٹا بھی نہ نکلے، اور جوؤں نے ان کے بال اور پلکیں اور بھویں تک کھالیں۔

آخر پھر قومِ فرعون بلبلا اٹھی اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ اب کی مرتبہ ہم ہرگز وعدہ سے نہ پھریں گے آپ دعا کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی ٹل گیا، مگر جن بدنصیبوں کو ہلاک ہی ہونا تھا وہ کہاں عہد کو پورا کرتے، پھر عافیت ملتے ہی سب کچھ بھول گئے اور منکر ہو گئے۔

پھر ایک ماہ کی مہلت ایسی آرام وراحت کے ساتھ ان کو دی گئی مگر اس مہلت سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو چوتھا عذاب مینڈکوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، اور اس کثرت سے مینڈک ان کے گھروں میں پیدا ہو گئے کہ جہاں بیٹھتے تو ان کے گلے تک مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا، سونے کے لئے لیٹتے تو سارا بدن ان سے دب جاتا، کروٹ لینا ناممکن ہو جاتا، پکتی ہوئی ہنڈیا میں، رکھے ہوئے کھانے میں آٹے میں اور ہر چیز میں مینڈک بھر جاتے، اِس عذاب سے عاجز آ کر سب رونے لگے اور پہلے سے پختہ وعدوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی رفع ہو گیا۔

مگر جس قوم پر قہرِ الٰہی مسلط ہو اس کی عقل اور ہوش وحواس کام نہیں دیتے، اس واقعہ کے بعد بھی عذاب سے نجات پا کر یہ پھر اپنی ہٹ دھرمی پر جم گئے اور کہنے لگے کہ اب تو ہمیں اور بھی یقین ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام بڑے جادوگر ہیں یہ سب ان کے جادو کے کرشمے ہیں رسول نبی کچھ نہیں۔

پھر ایک ماہ کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی مگر اس مہلت سے بھی کوئی کام نہ لیا تو پانچواں عذاب خون کا مسلط کر دیا گیا کہ ان کے ہر کھانے اور پینے کی چیز خون بن گئی، کنویں سے، حوض سے، جہاں کہیں سے پانی نکالیں خون بن جائے، کھانا پکانے کے لئے رکھیں خون بن جائے اور ان سب عذابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ مسلسل تھا کہ ہر عذاب سے اسرائیلی حضرات بالکل مامون ومحفوظ تھے، خون کے عذاب کے وقت قومِ فرعون کے لوگوں نے بنی اسرائیل کے گھروں سے پانی مانگا جب وہ ان کے ہاتھ میں گیا تو خون ہو گیا، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر قبطی اور اسرائیلی کھانا کھاتے تو جو لقمہ اسرائیلی اٹھاتا وہ اپنی حالت پر کھانا ہوتا اور جو لقمہ یا پانی کا گھونٹ قبطی کے منہ میں جاتا خون بن جاتا، یہ عذاب بھی بدستورِ سابق سات روز رہا بالآخر پھر یہ بدکار بدعہد قوم چلّا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اور پہلے سے زیادہ موثق وعدہ کئے، دعا کی گئی عذاب ہٹ گیا مگر یہ لوگ اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر جمے رہے، اِس طرح یہ پانچ عذاب مسلسل ان پر آتے رہے مگر یہ لوگ اپنی گمراہی پر قائم رہے اسی کو قرآنِ کریم نے فرمایا:

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ یعنی ان لوگوں نے تکبر سے کام لیا اور یہ لوگ بڑے عادی مجرم تھے۔

اِس کے بعد ایک چھٹے عذاب کا ذِکر بعد کی آیت میں رِجز کے نام سے آیا ہے، یہ لفظ اکثر طاعون کے لئے بولا جاتا ہے، چیچک وغیرہ وبائی امراض کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، تفسیری روایات میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وباء مسلط کردی گئی، جس میں ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔ اس وقت پھر ان لوگوں نے فریاد کی اور پھر دعا کرنے پر یہ عذاب ہٹا اور پھر بدستور ان لوگوں نے عہد شکنی کی، اِتنی مسلسل آزمائشوں اور مہلتوں کے بعد جب ان میں کوئی اِحساس پیدا ہی نہ ہوا تو اب آخری عذاب آ گیا کہ سب کے سب اپنے مکان زمینیں سامان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلے اور بالآخر دریائے قلزم کا لقمہ بن گئے، فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ

اور وارث کردیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق

وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى

اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے اور پورا ہوگیا نیکی کا وعدہ تیرے ربّ کا

عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ

بنی اسرائیل پر، بسبب ان کے صبر کرنے کے، اور خراب کردیا ہم نے جو کچھ بنایا تھا فرعون

وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ

اور اس کی قوم نے اور جو اونچا کرکے چھایا تھا، اور پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے

فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ

تو پہنچے ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے کہنے لگے اے موسیٰ بنادے

لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ

ہماری عبادت کے لئے بھی ایک بت جیسے ان کے بت ہیں، کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو، یہ لوگ،

مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ

تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اور غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں، کہا، کیا اللہ کے سوا

اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ

ڈھونڈوں تمہارے واسطے کوئی اور معبود، حالانکہ اس نے تم کو بڑائی دی تمام جہان پر اور وہ وقت یاد کرو جب نجات دی ہم نے تم کو

مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

فرعون والوں سے کہ دیتے تھے تم کو برا عذاب کہ مار ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو

وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع

اور جیتا رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں احسان ہے تمہارے رب کا بڑا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن لوگوں کو کمزور سمجھا جاتا تھا، ہم نے اُنہیں اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس پر ہم نے برکتیں نازل کی تھیں۔ اور بنی اسرائیل کے حق میں تمہارے رَبّ کا کلمۂ خیر پورا ہوا، کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا۔ اور فرعون اور اُس کی قوم جو کچھ بناتی چڑھاتی رہی تھی، اُس سب کو ہم نے ملیامیٹ کر دیا ﴿۱۳۷﴾ اور ہم نے بنی اسرائیل سے سمندر پار کروایا، تو وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے جو اپنے بتوں سے لگے بیٹھے تھے۔ بنی اسرائیل کہنے لگے: ''اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی دیوتا بنا دو جیسے ان لوگوں کے دیوتا ہیں'' موسیٰ نے کہا: ''تم ایسے (عجیب) لوگ ہو جو جہالت کی باتیں کرتے ہو ﴿۱۳۸﴾ ارے یہ لوگ تو وہ ہیں کہ جس دھندے میں لگے ہوئے ہیں، سب برباد ہونے والا ہے، اور جو کچھ کرتے آرہے ہیں، سب باطل ہے'' ﴿۱۳۹﴾ (اور) کہا کہ: ''کیا تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور معبود ڈھونڈ کر لاؤں؟ حالانکہ اُسی نے تمہیں دُنیا جہان کے سارے لوگوں پر فضیلت دے رکھی ہے! ﴿۱۴۰﴾ اور (اللہ فرماتا ہے کہ) یاد کرو کہ ہم نے تمہیں فرعون کے لوگوں سے بچایا ہے جو تمہیں بدترین تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے، اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور اس میں تمہارے رَبّ کی طرف سے بڑی آزمائش تھی'' ﴿۱۴۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (فرعون اور اہلِ فرعون کو غرق کر کے) ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے (یعنی بنی اسرائیل) اُس سرزمین کے پورب پچھّم (یعنی تمام حدود) کا مالک بنادیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے (ظاہری برکت کثرتِ پیداوار سے اور باطنی برکت ذی فضائل ومدفن ومسکنِ انبیاء علیہم السلام ہونے سے) اور آپ کے ربّ کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں اُن کے صبر کی وجہ سے پورا ہوگیا (جس کا حکم انہیں دیا گیا تھا اِصْبِرُوْا) اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا اور (جس دریا میں فرعون کو غرق کیا گیا) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار اتار دیا (جس کا قصہ سورۂ شعراء میں ہے) پھر (پار ہونے کے بعد) ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھے تھے (یعنی ان کی پوجاپاٹ کر رہے تھے) کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک (مجسم) معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں (یہ من جانب اللہ بھی) تباہ کیا جائے گا (جیسا کہ عادۃ اللہ ہمیشہ سے جاری ہے کہ حق کو باطل پر غالب کر کے اس کو درہم برہم کر دیتے ہیں) اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے (کیونکہ شرک کا بطلان یقینی و بدیہی ہے، اور) فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو تمہارا معبود بنادوں حالانکہ اس نے تم کو (بعض نعمتوں میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی تائید کے لئے ارشاد فرمایا کہ) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں (کے ظلم وایذاء) سے بچالیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے کہ تمہارے بیٹوں کو بکثرت قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (اپنی بیگار اور خدمت کے لئے) زندہ چھوڑ دیتے تھے اور (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔

معارف ومسائل

پچھلی آیات میں قومِ فرعون کی مسلسل سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف عذابوں کے ذریعہ ان کی تنبیہات کا بیان تھا، مذکورہ آیات میں ان کے انجام بد اور بنی اسرائیل کی فتح وکامرانی کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا یعنی جس قوم کو کمزور ضعیف سمجھا جاتا تھا ان کو ہم نے اُس زمین کے مشرق ومغرب کا مالک بنادیا جس میں ہم نے برکات رکھی ہیں۔

الفاظِ قرآن میں غور کیجئے، یہ نہیں فرمایا کہ جو قوم ضعیف و کمزور تھی بلکہ یہ فرمایا کہ جس کو قومِ فرعون نے ضعیف و کمزور سمجھا تھا، اشارہ اس کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ جس قوم کی مدد پر ہوں وہ حقیقت میں کبھی کمزور و ذلیل نہیں ہوتی گو کسی وقت اس کے ظاہرِ حال سے دوسرے لوگ دھوکہ کھائیں اور ان کو کمزور سمجھیں مگر انجامِ کار پر سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کمزور و ذلیل نہ تھے، کیونکہ درحقیقت قوت و عزت حق تعالیٰ شانہٗ کے قبضہ میں ہے، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ[1] (آل عمران:۲۶)

اور زمین کا مالک بنا دینے کے لئے لفظ اَوْرَثْنَا ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو وارث بنا دیا، اس میں اشارہ اِس کی طرف ہے کہ جس طرح وارث ہی اپنے مورث کے مال کا مستحق ہوتا ہے، باپ کی حیات ہی میں ہر شخص یہ جان لیتا ہے کہ اس کے مال و جائیداد کی مالک آخر کار اس کی اولاد ہے اسی طرح علمِ الٰہی میں بنی اسرائیل پہلے ہی سے قومِ فرعون کے ملک و مال کے مستحق تھے۔

مَشَارِق مَشْرِق کی جمع ہے اور مَغَارِب مَغْرِب کی، سردی گرمی کے مختلف موسموں میں مغرب و مشرق کے بدلنے کی وجہ سے جمع کا لفظ لایا گیا، اور زمین سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے قول کے مطابق ملکِ شام اور مصر کی سرزمین ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قومِ فرعون اور قومِ عمالقہ کے ہلاک ہونے کے بعد قبضہ اور حکومت عطا فرمائی۔

اور الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا سے یہ بتلا دیا کہ ان زمینوں میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اپنی برکات نازل فرمائی ہیں، ملکِ شام کے بارے میں تو قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں محل برکات ہونے کا ذکر ہے الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ (بنی اسرائیل:۱) میں اسی کا بیان ہے، اسی طرح ارضِ مصر کے بارے میں بھی محل برکات و ثمرات ہونا متعدد روایات سے نیز مشاہدات سے ثابت ہے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مصر کا دریائے نیل سیّد الانہار یعنی دریاؤں کا سردار ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ برکات کے دس حصوں میں سے نو مصر میں ہیں اور باقی ایک پوری زمین میں۔[2] (بحرِ محیط)

خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم کو غرور و پندار کے نشہ والوں نے اپنی کوتاہ نظری سے ذلیل و کمزور سمجھ رکھا تھا، ہم نے اسی کو ان متکبرین کی دولت و سلطنت اور ملک و مال کا مالک بنا کر دکھلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کا وعدہ سچا ہوتا ہے، ارشاد فرمایا وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یعنی آپ کے ربّ کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہو گیا۔

اِس اچھے وعدے سے مراد یا تو وہ وعدہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیا تھا، عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ یعنی قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ان کی زمین کا تمہیں مالک بنا دے۔ اور یا وہ وعدہ ہے جو قرآنِ کریم میں دوسری جگہ خود حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا ہے:

---

[1] ترجمہ: اور جس کو آپ چاہیں، غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں۔

[2] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۴۳۴

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (القصص) یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس قوم پر احسان کریں جن کو اس ملک میں کمزور و ذلیل سمجھا گیا ہے، اور ان کو ہی سردار اور حکام بنادیں اور ان کو ہی اس زمین کا وارث قرار دیں اور اس زمین پر تصرفات کرنے کا حق دیں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز واقع کر کے دِکھلا دیں جس کے ڈر سے وہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں وعدے ایک ہی ہیں، اللہ تعالیٰ کے وعدے ہی کی بناء پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا، اِس آیت میں اس وعدہ کا پورا ہونا لفظ تَمَّتْ سے بیان کیا گیا، کیونکہ وعدہ کا اِتمام و تکمیل اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ پورا ہو جائے۔

اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر اس انعام واحسان کی وجہ بھی بیان فرمادی بِمَا صَبَرُوْا یعنی اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اللہ کے راستہ میں تکلیفیں برداشت کیں اور ان پر ثابت قدم رہے۔

اِس میں اشارہ کردیا کہ ہمارا یہ احسان وانعام کچھ بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ان کے عمل صبر وثابت قدمی کا نتیجہ تھا جو شخص یا جو قوم اِس عمل کو اختیار کرے ہمارا انعام ہر جگہ ہر وقت اُس کے لئے موجود ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب نصرتِ الٰہی کا وعدہ اپنی قوم سے کیا تھا اس وقت بھی انہوں نے قوم کو یہی بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا اور مصائب وآفات کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہی کلیدِ کامیابی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب انسان کا مقابلہ کسی ایسے شخص یا جماعت سے ہو جس کا دفاع کرنا اس کی قدرت میں نہ ہو تو ایسے وقت کامیابی اور فلاح کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ مقابلہ نہ کرے بلکہ صبر کرے، انہوں نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی کی اِیذاء کا مقابلہ اس کی ایذاء سے کرتا ہے یعنی اپنا انتقام خود لینے کی فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی کے حوالے کر دیتے ہیں کامیاب ہو یا ناکام، اور جب کوئی شخص لوگوں کی ایذاء کا مقابلہ صبر اور نصرتِ الٰہی کے انتظار سے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے راستے کھول دیتے ہیں۔

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے صبر وثابت قدمی پر یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کو دشمن پر فتح اور زمین پر حکومت عطا کریں گے اسی طرح اُمتِ محمدیہ سے بھی وعدہ فرمایا ہے جو سورۂ نور میں مذکور ہے، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور: ۵۵)، اور جس طرح بنی اسرائیل نے وعدۂ خداوندی کا مشاہدہ کرلیا

تھا، امتِ محمدیہ نے ان سے زیادہ واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی مدد کا مشاہدہ کیا کہ پوری زمین پر ان کی حکومت وسلطنت عام ہوگئی۔ (روح البیان) [1]

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بنی اسرائیل نے تو صبر سے کام نہیں لیا، بلکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے صبر کی تلقین فرمائی تو خفا ہو کر کہنے لگے اُوْذِیْنَا، وجہ یہ ہے کہ اوّل تو ان کا صبر بمقابلہ فرعونی ایذاؤں کے اور ایمان پر ثابت قدم رہنا مسلسل ثابت ہے اگر ایک دفعہ لفظِ شکایت نکل بھی گیا تو اس پر نظر نہیں کی گئی، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ قول بطورِ شکایت نہ ہو بلکہ بطور اظہارِ رنج وغم کے ہو۔

آیتِ متذکرہ میں اس کے بعد فرمایا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ یعنی ہم نے تباہ و برباد کر دیا اُن سب چیزوں کو جو فرعون اور اس کی قوم بنایا کرتی تھی اور ان عمارتوں یا درختوں کو جن کو وہ بلند کیا کرتی تھی۔ فرعون اور قومِ فرعون کی بنائی ہوئی چیزوں میں ان کے مکانات وعمارات اور گھریلو ضرورت کے سامان، نیز وہ مختلف قسم کی تدبیریں جو وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے کرتے تھے، سب داخل ہیں، اور وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ یعنی جس کو وہ بلند کرتے تھے، اس میں بلند محلات ومکانات بھی داخل ہیں اور بلند درخت اور وہ انگور کی بیلیں بھی جن کو چھتوں پر چڑھایا جاتا ہے۔

یہاں تک قوم فرعون کی تباہی کا ذکر تھا، آگے بنی اسرائیل کی فتح وکامرانی کے بعد ان کی سرکشی اور جہالت اور کجروی کا بیان شروع ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بیشمار نعمتوں کے مشاہدہ کے باوجود ان لوگوں سے سرزد ہوئی، جس کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ پچھلے انبیاء نے اپنی امت کے ہاتھوں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں، ان کو سامنے رکھنے سے موجودہ سرکشوں کی ایذاء ہلکی ہو جائے گی۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ، یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا، بنی اسرائیل کو قومِ فرعون کے مقابلہ میں معجزانہ کامیابی حاصل ہوئی اور اطمینان ملا تو اُس کا وہی اثر ہوا جو عام قوموں پر عیش وعشرت اور عزت ودولت کا ہوا کرتا ہے کہ ان میں جاہلانہ چیزیں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ یہ قوم ابھی ابھی اعجازِ موسوی کے ساتھ دریا سے پار ہوئی اور پوری قومِ فرعون کے غرقِ دریا ہونے کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ذرا آگے بڑھی تو ایک قبیلہ پر گزر ہوا جو مختلف بتوں کی پرستش میں مبتلا تھا، بنی اسرائیل کو کچھ ان کا ہی طریقہ پسند آنے لگا، اور موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ جیسے ان لوگوں کے بہت سے معبود ہیں آپ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے کہ ہم بھی ایک محسوس چیز کو سامنے رکھ کر عبادت کیا کریں، اللہ تعالیٰ کی ذات تو

[1] روح البیان تحت هذه الآیة ج: ۱ ص: ۷۶۱

سامنے نہیں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ یعنی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جن کے طریقہ کو تم نے پسند کیا ان کے اعمال سب ضائع و برباد ہیں یہ باطل کے پیرو ہیں تمہیں ان کی حرص نہ کرنا چاہئے، کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کسی کو معبود بنا دوں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تمام جہان والوں پر فضیلت بخشی ہے، مراد اُس وقت کے اہل عالم ہیں کہ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہی دوسرے سب لوگوں سے افضل و اعلیٰ تھے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کو ان کی پچھلی حالت یاد دلائی گئی کہ وہ فرعون کے ہاتھوں میں ایسے مجبور و مقہور تھے کہ ان کے لڑکوں کو قتل کیا جاتا تھا صرف لڑکیاں اپنی خدمت کے لئے رکھی جاتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برکت و دُعا سے اس عذاب سے نجات دی، کیا اِس احسان کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ تم اسی ربُّ العالمین کے ساتھ دنیا کے ذلیل ترین پتھروں کو شریک ٹھہراؤ، یہ کیسا ظلمِ عظیم ہے، اِس سے توبہ کرو۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس سے پوری ہوگئی مدّت تیرے ربّ کی

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ

چالیس راتیں اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا خلیفہ رہ میری قوم میں

وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کی راہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا (کہ ان راتوں میں کوہِ طور پر آکر اعتکاف کریں)، پھر دس راتیں مزید بڑھا کر ان کی تکمیل کی، اور اِس طرح اُن کے ربّ کی ٹھہرائی ہوئی میعاد کل چالیس راتیں ہوگئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ: ”میرے پیچھے تم میری قوم میں میرے قائم مقام بن جانا، تمام معاملات درست رکھنا، اور مفسد لوگوں کے پیچھے نہ چلنا“ ﴿۱۴۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (جب بنی اسرائیل سب پریشانیوں سے مطمئن ہوگئے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم کو کوئی شریعت ملے تو اس پر اطمینان کے ساتھ عمل کریں، موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی، حق تعالیٰ اس کا قصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ طور پر آکر اعتکاف کریں تو آپ کو شریعت اور کتاب تورات دی جائے گی) اور دس راتیں مزید ان تیس راتوں کا تتمہ بنادیا (یعنی تورات دے کر اُن میں دس راتیں عبادت کے لئے اور بڑھا دیں جس کی وجہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہوچکی ہے) اِس طرح اُن کے پروردگار کا (مقرر کیا ہوا) وقت (سب مل کر) پوری چالیس راتیں ہوگیا اور موسیٰ (علیہ السلام کو طور آنے لگے تو چلتے وقت) اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہہ دیا تھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل نہ کرنا۔

معارف و مسائل

اِس آیت میں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اِسرائیل کا وہ واقعہ مذکور ہے جو غرقِ فرعون اور بنی اسرائیل کے مطمئن ہونے کے بعد پیش آیا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم مطمئن ہیں، اب ہمیں کوئی کتاب اور شریعت ملے تو ہم بےفکری کے ساتھ اُس پر عمل کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے دعا کی۔

اِس میں لفظِ وٰعَدْنَا وعدہ سے مشتق ہے، اور وَعدہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو نفع پہنچانے سے پہلے اس کا اِظہار کردینا کہ ہم تمہارے لئے فلاں کام کریں گے۔

اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنا کلام نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کے لئے یہ شرط لگائی کہ تیس راتیں کوہِ طور پر اعتکاف اور ذِکر اللہ میں گزار دیں اور پھر ان تیس پر اور دس راتوں کا اِضافہ کر کے چالیس کردیا۔

لفظِ وٰعَدْنَا کے اصلی معنی دو طرف سے وعدے اور معاہدے کے آتے ہیں، یہاں بھی حضرت حق جل شانہ، کی طرف سے عطاءِ تورات کا وعدہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تیس چالیس راتوں کے اِعتکاف کا، اِس لئے بجائے وَعَدْنَا کے وٰعَدْنَا فرمایا۔

اِس آیت میں چند مسائل اور اَحکام قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہی یہ تھا کہ اعتکاف چالیس راتوں کا کرایا جائے تو پہلے تیس اور بعد میں دس کا

اضافہ کرکے چالیس کرنے میں کیا حکمت تھی، پہلے ہی چالیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دے دیا جاتا تو کیا حرج تھا، سو اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ تو کون کرسکتا ہے، بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں:

تفسیر روح البیان میں ہے کہ اس میں ایک حکمت تدریج اور آہستگی کی ہے کہ کوئی کام کسی کے ذمے لگایا جائے تو اول ہی زیادہ مقدار کام کی اس پر نہ ڈالی جائے تاکہ وہ آسانی سے برداشت کرے، پھر مزید کام دیا جائے۔ [۱]

اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس طرز میں حکام اور اولوالامر کو اس کی تعلیم دینا ہے کہ اگر کسی کو کوئی کام ایک معین وقت میں پورا کرنے کا حکم دیا جائے اور اس معین میعاد میں وہ پورا نہ کرسکے تو اس کو مزید مہلت دی جائے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پیش آیا کہ تیس راتیں پوری کرنے کے بعد جس کیفیت کا حاصل ہونا مطلوب تھا وہ پوری نہ ہوئی اس لئے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا کیونکہ ان دس راتوں کے اضافہ کا جو واقعہ مفسرین نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس راتوں کے اعتکاف میں موسیٰ علیہ السلام نے حسبِ قاعدہ تیس روزے بھی مسلسل رکھے بیچ میں افطار نہیں کیا، تیسواں روزہ پورا کرنے کے بعد افطار کرکے مقررہ مقام طُور پر حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ روزہ دار کے منہ سے جو ایک خاص قسم کی رائحہ معدہ کی تبخیر سے پیدا ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، آپ نے افطار کے بعد مسواک کرکے اس رائحہ کو زائل کر دیا، اس لئے مزید دس روزے اور رکھئے تاکہ وہ رائحہ پھر پیدا ہو جائے۔ [۲]

اور بعض روایاتِ تفسیر میں جو اس جگہ یہ منقول ہے کہ تیسویں روزہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کر لی تھی جس کے ذریعہ وہ رائحہ صوم زائل ہو گیا تھا، اِس سے اس بات پر استدلال نہیں ہوسکتا کہ روزہ دار کے لئے مسواک کرنا مکروہ یا ممنوع ہے کیونکہ اول تو اس روایت کی کوئی سند مذکور نہیں، دوسرے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے متعلق ہو عام لوگوں کے لئے نہ ہو یا شریعتِ موسوی میں ایسا ہی حکم سب کے لئے ہو کہ روزہ کی حالت میں مسواک نہ کی جائے، لیکن شریعتِ محمدیہ میں تو بحالتِ روزہ مسواک کرنے کا معمول حدیث سے ثابت ہے، جس کو بیہقی نے بروایتِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خَیْرُ خَصَائِلِ الصَّائِمِ السِّوَاكُ یعنی روزہ دار کا بہترین عمل مسواک ہے۔ [۳] اِس روایت کو جامع صغیر میں نقل کرکے حَسَن فرمایا ہے۔

فائدہ

اِس روایت پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تلاشِ خضرؑ میں سفر کر رہے تھے تو آدھے دِن بھوک پر صبر نہ ہوسکا اور اپنے ساتھی سے فرمانے لگے اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ (الکھف) یعنی ہمارا

---

[۱] روح البیان تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۷۶۴ [۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۲۷۵

[۳] السنن الکبریٰ للبیهقی، باب السواك للصائم ج:۴ ص:۲۷۲

ناشتہ لاؤ کیونکہ اس سفر نے ہم کو تکان میں ڈال دیا، اور کوہِ طور پر مسلسل تیس روزے اس طرح رکھے کہ رات کو بھی افطار نہیں، یہ عجیب بات ہے؟

تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ فرق ان دونوں سفروں کی نوعیت کے سبب سے تھا، پہلا سفر مخلوق کے ساتھ مخلوق کی تلاش میں تھا، اور کوہِ طور کا سفر مخلوق سے علیحدہ ہو کر ایک ذات حق سبحانہٗ کی جستجو میں، اس کا یہی اثر ہونا تھا کہ بشری تقاضے نہایت مضمحل ہو گئے، کھانے پینے کی حاجت اِتنی گھٹ گئی کہ تیس روز تک کوئی تکلیف محسوس نہیں فرمائی۔ [1]

عبادت میں قمری حساب معتبر ہے، دنیوی معاملات میں شمسی حساب کی گنجائش ہے

ایک اور مسئلہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں تاریخ کا حساب رات سے ہوتا ہے، کیونکہ اس آیت میں بھی تیس دِن کے بجائے تیس راتوں کا ذِکر فرمایا ہے، وجہ یہ ہے کہ شرائعِ انبیاء میں مہینے قمری معتبر ہیں اور قمری مہینہ کا شروع چاند دیکھنے سے ہوتا ہے، وہ رات ہی میں ہو سکتا ہے اس لئے مہینہ رات سے شروع ہوتا ہے پھر اس کی ہر تاریخ غروبِ آفتاب سے شمار ہوتی ہے۔ جتنے آسمانی مذہب ہیں ان سب کا حساب اسی طرح قمری مہینوں سے اور شروع تاریخ غروب آفتاب سے اعتبار کی جاتی ہے۔

قرطبی نے بحوالہ ابنِ عربی نقل کیا ہے کہ:

حِسَابُ الشَّمْسِ لِلْمَنَافِعِ وَحِسَابُ الْقَمَرِ لِلْمَنَاسِكِ یعنی شمسی حساب دنیوی منافع کے لئے ہے اور قمری حساب اداءِ عبادات کے لئے۔

اور یہ تیس راتیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق ماہ ذی القعدہ کی راتیں تھیں اور پھر ان پر دس راتیں ذی الحجہ کی بڑھائی گئیں، اس سے معلوم ہوا کہ تورات کا عطیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوم النحر (یعنی عید الاضحیٰ) کے دِن مِلا۔ (قرطبی) [2]

ایک مسئلہ، اِصلاحِ نفسی میں چالیس دن رات کو خاص دخل ہے

اِس آیت کے اِشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چالیس راتوں کو باطنی حالات کی اصلاح میں کوئی دخل ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس روز اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیتے ہیں۔ (رُوح البیان) [3]

---

[1] روح البیان تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۷۶۳ [2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۲۷۴، ۲۷۷

[3] روح البیان تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۷۶۴

انسان کو اپنے سب کاموں میں تدریج اور آہستگی کی تعلیم

اِس آیت سے ثابت ہوا کہ اہم کاموں کے لئے ایک خاص میعاد مقرر کرنا، اور سہولت و تدریج سے انجام دینا سنتِ الٰہیہ ہے، عُجلت اور جلد بازی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

سب سے پہلے خود حق تعالیٰ نے اپنے کام یعنی پیدائشِ عالم کے لئے ایک میعاد چھ روز کی متعین فرما کر یہ اصول بتلا دیا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ کو آسمان زمین اور سارے عالَم کو پیدا کرنے کے لئے ایک منٹ کی بھی ضرورت نہیں جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لئے فرما دیں کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے مگر اس خاص طرزِ عمل میں مخلوق کو یہ ہدایت دینا تھی کہ اپنے کاموں کو غور و فکر اور تدریج کے ساتھ انجام دیا کریں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تو اس کے لئے بھی ایک میعاد مقرر فرمائی اس میں اسی اصول کی تعلیم ہے۔ (قرطبی) [۱]

اور یہی وہ اصول تھا جس کو نظر انداز کر دینا بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب بنا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سابق حکمِ خداوندی کے مطابق اپنی قوم سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ تیس روز کے لئے جا رہا ہوں یہاں جب دس روز کی مدت بڑھ گئی تو اپنی جلد بازی کے سبب لگے یہ کہنے کہ موسیٰ علیہ السلام تو کہیں گم ہو گئے، اب ہمیں کوئی دوسرا پیشوا بنا لینا چاہئے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سامری کے دام میں پھنس کر ''گوسالہ'' پرستی شروع کر دی، اگر غور و فکر اور اپنے کاموں میں تدریج و تامّل کے عادی ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ (قرطبی) [۲]

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ اس جملہ سے بھی چند مسائل اور اَحکام نکلتے ہیں:

ضرورت کے وقت ناظمِ امور کو اپنا قائم مقام تجویز کرنا

اول یہ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق کوہِ طور پر جا کر اعتکاف کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے ساتھی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ یعنی میرے پیچھے آپ میری قوم میں میری قائم مقامی کے فرائض انجام دیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی کام کا ذمہ دار ہو وہ اگر کسی ضرورت سے کہیں جائے تو اس پر لازم ہے کہ اُس کام کا انتظام کر کے جائے۔

نیز یہ ثابت ہوا کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات جب کہیں سفر کریں تو اپنا قائم مقام اور خلیفہ مقرر کر کے جائیں۔

---

[۱] [۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۲۷۵

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہی تھی کہ جب کبھی مدینہ سے باہر جانا ہوا تو کسی شخص کو خلیفہ بنا کر جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا، ایک مرتبہ عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو اسی طرح مختلف اوقات میں مختلف صحابہ کو مدینہ میں خلیفہ بنا کر باہر تشریف لے گئے۔ (قرطبی) [1]

موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے وقت ان کو چند ہدایات دیں اِس سے معلوم ہوا کہ جس کو قائم مقام بنایا جائے اس کی سہولتِ کار کے لئے ضروری ہدایات دے کر جائے، ان ہدایات میں پہلی ہدایت یہ ہے کہ اَصْلِحْ، اس میں اَصْلِحْ کا مفعول ذکر نہیں فرمایا کہ کس کی اِصلاح کرو، اِس سے اشارہ اس عموم کی طرف ہے کہ اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنی قوم کی بھی، یعنی جب ان میں کوئی بات فساد کی محسوس کرو تو ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو، دوسری ہدایت یہ دی کہ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ یعنی فساد کرنے والوں کے راستہ کا اتباع نہ کرو، ظاہر ہے کہ ہارون علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، ان سے فساد میں مبتلا ہونے کا تو خطرہ نہ تھا اس لئے اِس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ مفسدین کی مدد یا ہمت افزائی کا کوئی کام نہ کرو۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب قوم کو دیکھا کہ سامری کے پیچھے چلنے لگے یہاں تک کہ اس کے کہنے سے گوسالہ پرستی شروع کردی تو قوم کو اس بے ہودگی سے روکا اور سامری کو ڈانٹا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپسی کے بعد جب یہ خیال کیا کہ ہارون علیہ السلام نے میرے پیچھے اپنے فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی تو ان سے مواخذہ فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو بدنظمی اور بے فکری ہی کو سب سے بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ

اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وعدہ پر اور کلام کیا اس سے اس کے ربّ نے بولا اے میرے ربّ تو مجھ کو دِکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں

قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ

فرمایا تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھے گا لیکن تو دیکھتا رہ پہاڑ کی طرف اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۷ ص:۲۷۷

فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ

تو تُو مجھ کو دیکھ لے گا پھر جب تجلّی کی اس کے ربّ نے پہاڑ کی طرف کر دیا اس کو ڈھا کر برابر اور گر پڑا موسیٰ بے ہوش ہو کر

فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾

پھر جب ہوش میں آیا بولا تیری ذات پاک ہے، میں نے توبہ کی تیری طرف اور میں سب سے پہلے یقین لایا،

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ

فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا

فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ

سو لے جو میں نے تجھ کو دیا اور شاکر رہ اور لکھ دی ہم نے اس کو تختیوں پر

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ

ہر قسم کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی، سو پکڑ لے ان کو زور سے اور حکم کر

قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾

اپنی قوم کو کہ پکڑے رہیں اس کی بہتر باتیں عنقریب میں تم کو دکھلاؤں گا گھر نافرمانوں کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب موسیٰ ہمارے مقرّرہ وقت پر پہنچے، اور اُن کا ربّ اُن سے ہم کلام ہوا، تو وہ کہنے لگے: ''میرے پروردگار! مجھے دیدار کرا دیجئے کہ میں آپ کو دیکھ لوں۔'' فرمایا: ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے، البتہ پہاڑ کی طرف نظر اُٹھاؤ، اِس کے بعد اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم مجھے دیکھ لوگے۔'' پھر جب اُن کے ربّ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اُس کو ریزہ ریزہ کر دیا، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے، بعد میں جب اُنہیں ہوش آیا تو انہوں نے کہا: ''پاک ہے آپ کی ذات! میں آپ کے حضور

توبہ کرتا ہوں، اور (آپ کی اس بات پر کہ دُنیا میں کوئی آپ کو نہیں دیکھ سکتا) میں سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں۔" ﴿۱۴۳﴾ فرمایا: "اے موسیٰ! میں نے اپنے پیغام دے کر اور تم سے ہم کلام ہو کر تمہیں تمام انسانوں پر فوقیت دی ہے۔ لہٰذا میں نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، اُسے لے لو، اور ایک شکر گذار شخص بن جاؤ۔" ﴿۱۴۴﴾ اور ہم نے ان کے لئے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، (اور یہ حکم دیا کہ:) "اب اس کو مضبوطی سے تھام لو، اور اپنی قوم کو حکم دو کہ اس کے بہترین اَحکام پر عمل کریں۔ میں عنقریب تم کو نافرمانوں کا گھر دِکھادوں گا۔" ﴿۱۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب موسیٰ (علیہ السلام اس واقعہ میں) ہمارے وقت (موعود) پر آئے (تھے جس کا قصہ بیان ہو رہا ہے) اور ان کے ربّ نے ان سے (بہت سی لطف وعنایت کی) باتیں کیں تو (شدّتِ انبساط سے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے، (کیونکہ یہ آنکھیں تابِ جمال نہیں لاسکتیں، کما فی المشکوٰۃ عن مسلم لأحرقت سبحات وجهه [1]) لیکن (تمہاری تشفی کے لئے یہ تجویز کرتے ہیں کہ) تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو (ہم اس پر ایک جھلک ڈالتے ہیں) سو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو (خیر) تم بھی دیکھ سکو گے (غرض موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف دیکھنے لگے) پس ان کے ربّ نے جو اس پر تجلّی فرمائی تو تجلّی نے اس (پہاڑ) کے پرخچے اُڑا دیئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بیہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب افاقہ میں آئے تو عرض کیا بیشک آپ کی ذات (ان آنکھوں کی برداشت سے) منزّہ (اور بلند) ہے میں آپ کی جناب میں (اِس مشتاقانہ درخواست سے) معذرت کرتا ہوں اور (جو کچھ حضور کا ارشاد ہے کہ لَنْ تَرٰىنِیْ) سب سے پہلے میں اِس پر یقین کرتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! (یہی بہت ہے کہ) میں نے (تم کو) اپنی (طرف سے) پیغمبری (کا عہدہ دے کر) اور اپنے (ساتھ) ہم کلامی (کا شرف بخش کر اس) سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو (اب) جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے (رسالت وہم کلامی وتورات) اس کو لو اور شکر کرو اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (اَحکامِ ضروریہ کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی (یہی تختیاں تورات ہیں، پھر حکم ہوا کہ جب یہ تختیاں ہم نے دی ہیں) تو ان کو کوشش کے ساتھ (خود بھی) عمل میں لاؤ اور اپنی قوم کو (بھی) حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے اَحکام پر (یعنی سب کہ سب ہی اچھے ہیں) عمل کریں میں اب بہت جلد تم لوگوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) ان بے حکموں کا (یعنی فرعونیوں کا یا عمالقہ کا) مقام دکھلاتا ہوں (اس میں بشارت اور وعدہ ہے کہ مصر یا شام پر عنقریب تسلط ہوا چاہتا ہے، مقصود اس سے ترغیب دینا ہے

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب معنی قول الله عز وجل "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى" إلخ ج: ۱ ص: ۹۹

اطاعت کی کہ اطاعتِ اَحکامِ الٰہیہ کے یہ برکات ہیں)۔

معارف و مسائل

لَنْ تَرٰىنِىْ، (یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے) اس میں اشارہ ہے کہ رؤیت ناممکن نہیں مگر مخاطب بحالتِ موجودہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا، ورنہ اگر رؤیت ممکن ہی نہ ہوتی تو لَنْ تَرٰىنِىْ کے بجائے لَـنْ اُرٰی کہا جاتا کہ میری رُؤیت نہیں ہوسکتی۔ (مظہری) [1]

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہوگیا اور یہی مذہب ہے جمہور اہلِ سنت کا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت عقلاً ممکن ہے مگر شرعاً ممتنع، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے لَنْ یَّرٰی اَحَدٌ مِّنْکُمْ رَبَّهٗ حَتّٰی یَمُوْتَ، یعنی تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے ربّ کو نہیں دیکھ سکتا۔

وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ، اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ بحالتِ موجودہ مخاطب رؤیتِ الٰہی کو برداشت نہیں کرسکتا اس لئے پہاڑ پر ادنیٰ سی جھلک ڈال کر بتلا دیا گیا کہ وہ بھی برداشت نہیں کرسکتا، اِنسان تو ضعیف الخلقت ہے وہ کیسے برداشت کرے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ، تَـجَـلِّـی کے معنی عربی لغت میں ظاہر اور منکشف ہونے کے ہیں، اور صوفیہ کرام کے نزدیک تجلّی کے معنی کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں، جیسے کوئی چیز بواسطہ آئینہ کے دیکھی جائے، اسی لئے تجلی کو رؤیت نہیں کہہ سکتے، خود اسی آیت میں اِس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت کی تو نفی فرمائی اور تجلی کا اثبات۔

اِمام احمد، ترمذی، حاکم نے بروایتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے اور اس کی سَنَد کو ترمذی و حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر ہاتھ کی چھوٹی انگلی (خِنْصر) کے سرے پر انگوٹھا رکھ کر اشارہ فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ کے نور کا صرف اتنا سا حصہ ظاہر کیا گیا تھا جس سے پہاڑ کے ٹکڑے اڑ گئے، [2] یہ ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کے ٹکڑے ہوگئے ہوں بلکہ جس حصہ پر حق تعالیٰ نے یہ تجلّی فرمائی وہ حصہ ہی اس سے متاثر ہوا ہو۔

---

[1] التفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۳ ص:۴۰۳

[2] مسند احمد مسند انس بن مالك رضی الله عنه رقم الحدیث:۱۲۷۰۱، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورة الأعراف ج:۲ ص:۱۳۸، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحدیث:۲۲

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام

اتنی بات تو قرآن کے واضح الفاظ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام فرمایا، پھر اس کلام میں بھی ایک تو وہ ہے جو اول عطاء نبوت کے وقت ہوا تھا، دوسرا کلام یہ ہے جو عطاء تورات کے وقت ہوا اور جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ آیت کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دوسرے کلام کو بہ نسبت پہلے کے کچھ مزید خصوصیت حاصل تھی، لیکن حقیقت اس کلام کی کیا اور کس طرح تھی اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا، اُس میں جتنے احتمالاتِ عقلیہ ایسے ہوں جو شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ ہوں سب کی گنجائش ضرور ہے مگر ان احتمالات میں کسی ایک کو متعین کرنا بلا دلیل درست نہیں، اور سلف صالحین صحابہ و تابعین ہی کا مسلک اس معاملہ میں اسلم ہے کہ اس معاملہ کو حوالۂ خدا کیا جائے، احتمالات نکالنے کی فکر میں نہ پڑیں۔ (بیان القرآن)

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۴۵ اس جگہ دار الفاسقین سے کیا مراد ہے، اس میں دو قول ہیں، ایک ملکِ مصر، دوسرا ملک شام، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فتح کرنے سے پہلے مصر پر فرعون اور اس کی قوم حکمران اور غالب تھی اُس کی وجہ سے مصر کو دار الفاسقین، اور ملک شام پر عمالقہ کا قبضہ تھا وہ بھی کافر فاسق تھے اس لئے اُس وقت شام بھی دار الفاسقین تھا، ان دونوں میں سے اس جگہ کونسا ملک مراد ہے، اس میں اختلاف اس بنیاد پر ہے کہ غرقِ فرعون کے بعد بنی اسرائیل مصر میں واپس چلے گئے تھے یا نہیں، اگر اس وقت مصر میں واپس گئے اور مملکتِ مصر پر قابض ہوئے جیسا کہ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ سے اس کی تائید ہوئی تو مصر پر قبضہ اور غلبہ اس واقعۂ تجلّی طور سے پہلے ہوچکا ہے اس میں سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۴۵ کا مفہوم ملکِ شام متعین ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس وقت واپس نہیں گئے تو دونوں ملک مراد ہوسکتے ہیں۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی تختیاں لکھی لکھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھیں، انہی تختیوں کے مجموعہ کا نام تورات ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ

میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ

اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر دیکھیں رستہ ہدایت کا

لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ

تو نہ ٹھہرائیں اس کو راہ اور اگر دیکھیں رستہ گمراہی کا تو اس کو ٹھہرالیں راہ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ

یہ اس لئے کہ انہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور رہے ان سے بے خبر اور جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ

جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو برباد ہوئیں ان کی محنتیں وہی بدلہ پائیں گے

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ

جو کچھ عمل کرتے تھے اور بنالیا موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے

عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ

بچھڑا، ایک بدن کہ اس میں گائے کی آواز تھی، کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور نہیں بتلاتا

سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا

رستہ معبود بنالیا اس کو اور وہ تھے ظالم اور جب پچتائے اور سمجھے

اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا

کہ ہم بیشک گمراہ ہوگئے تو کہنے لگے اگر نہ رحم کرے ہم پر ہمارا ربّ اور نہ بخشے ہم کو

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ

تو بیشک ہم تباہ ہوں گے، اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم میں غصہ میں بھرا ہوا افسوسناک

قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى

بولا کیا بُری نیابت کی تم نے میری میرے بعد کیوں جلدی کی تم نے اپنے ربّ کے حکم سے اور ڈال دیں

الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ

وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے اس کو اپنی طرف وہ بولا اے میری ماں کے جنے لوگوں نے

اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ

مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھ کو مار ڈالیں سو مت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو

وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥٠﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ

اور نہ ملا مجھ کو گنہگار لوگوں میں بولا اے میرے ربّ معاف کر مجھ کو اور میرے بھائی کو

وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٥١﴾ ع ١٨ ٨

اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تُو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کو برگشتہ رکھوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، اور وہ اگر ہر طرح کی نشانیاں دیکھ لیں، تو اُن پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اگر انہیں ہدایت کا سیدھا راستہ نظر آئے، تو اس کو اپنا طریقہ نہیں بنائیں گے، اور اگر گمراہی کا راستہ نظر آجائے تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں گے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، اور ان سے بالکل بے پرواہ ہو گئے ﴿١٤٦﴾ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو اور آخرت کا سامنا کرنے کو جھٹلایا ہے، اُن کے اعمال غارت ہو گئے ہیں۔ اُنہیں جو بدلہ دیا جائے گا، وہ کسی اور چیز کا نہیں، خود اُن اعمال کا ہوگا جو وہ کرتے آئے تھے۔ ﴿١٤٧﴾ اور موسیٰ کی قوم نے اُن کے جانے کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنالیا (بچھڑا کیا تھا؟) ایک بے جان جسم جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی! بھلا کیا انہوں نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ وہ نہ اُن سے بات کر سکتا ہے، اور نہ انہیں کوئی

راستہ بتا سکتا ہے؟ (مگر) اُسے معبود بنالیا، اور (خود اپنی جانوں کے لئے) ظالم بن بیٹھے ﴿۱۴۸﴾ اور جب اپنے کئے پر پچھتائے، اور سمجھ گئے کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں تو کہنے لگے: ''اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہ فرمایا، اور ہماری بخشش نہ کی تو یقیناً ہم برباد ہو جائیں گے۔'' ﴿۱۴۹﴾ اور جب موسیٰ غصّے اور رنج میں بھرے ہوئے اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو انہوں نے کہا: ''تم نے میرے بعد میری کتنی بُری نمائندگی کی! کیا تم نے اتنی جلد بازی سے کام لیا کہ اپنے رَبّ کے حکم کا بھی انتظار نہیں کیا؟'' اور (یہ کہہ کر) انہوں نے تختیاں پھینک دیں، (۷۰) اور اپنے بھائی (ہارون علیہ السلام) کا سر پکڑ کر اُن کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ وہ بولے: ''اے میری ماں کے بیٹے! یقین جانئے کہ ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا، اور قریب تھا کہ مجھے قتل ہی کر دیتے۔ اب آپ دُشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے، اور مجھے اِن ظالم لوگوں میں شمار نہ کیجئے'' ﴿۱۵۰﴾ موسیٰ نے کہا: ''میرے پروردگار! میری اور میرے بھائی کی مغفرت فرمادے، اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر دے۔ تُو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے'' ﴿۱۵۱﴾

خلاصۂ تفسیر

(اب ترغیبِ اطاعت کے بعد ترہیبِ مخالفت کے لئے ارشاد ہے کہ) میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں (اَحکام ماننے سے) تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں (کیونکہ اپنے کو بڑا سمجھنا حق اس کا ہے جو واقع میں بڑا ہو، اور وہ ایک خدا کی ذات ہے) اور (برگشتگی کا ان پر یہ اثر ہوگا کہ) اگر تمام (دنیا بھر کی) نشانیاں (بھی) دیکھ لیں تب بھی (غایتِ قساوت سے) ان پر ایمان نہ لاویں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں (یعنی حق کے قبول نہ کرنے سے پھر دِل سخت ہو جاتا ہے اور برگشتگی اِس حد تک پہنچ جاتی ہے) یہ (اس درجہ کی برگشتگی) اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو (تکبر کی وجہ سے) جھوٹا بتلایا اور ان (کی حقیقت میں غور کرنے) سے غافل رہے (یہ سزا تو دنیا میں ہوئی کہ ہدایت سے محروم رہے) اور (آخرت میں یہ سزا ہوگی کہ) یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام (جن سے ان کو توقع نفع کی تھی) غارت گئے (اور انجام اس حَبط کا جہنم ہے) ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے اور (جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لانے تشریف لے گئے تو) موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے ان کے (جانے کے) بعد اپنے (مقبوضہ) زیوروں کا (جو کہ قبطیوں سے مصر سے نکلتے وقت بہ بہانۂ شادی کے مانگ لیا تھا) ایک بچھڑا (بنا کر جس کا قصہ سورۂ طٰہٰ میں ہے، اس کو معبود) ٹھہرایا جو کہ (صرف اتنی حقیقت رکھتا تھا کہ) ایک قالب تھا جس

میں ایک آواز تھی (اور اس میں کوئی کمال نہ تھا، جس سے کسی عاقل کو اس کی معبودیت کا شبہ ہو سکے) کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ (اس میں آدمی کے برابر بھی تو قدرت نہ تھی چنانچہ) وہ ان سے بات تک نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو (دنیا یا دین کی) کوئی راہ بتلاتا تھا (اور خدا کی سی صفات تو اس میں کیا ہوتیں، غرض یہ کہ) اس (بچھڑے) کو انہوں نے معبود قرار دیا اور (چونکہ اس میں اصلاً کوئی شبہ کی وجہ نہ تھی اس لئے انہوں نے) بڑا بے ڈھنگا کام کیا اور (بعد رُجوع موسیٰ علیہ السلام (جس کا قصہ آگے آتا ہے ان کے تنبیہ فرمانے سے) جب (متنبہ ہوئے اور اپنی اس حرکت پر) نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو (ندامت سے بطور معذرت) کہنے لگے کہ اگر ہمارا ربّ ہم پر رحم نہ کرے اور ہمارا (یہ) گناہ معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے (چنانچہ خاص طریقہ سے ان کو تکمیلِ توبہ کا حکم ہوا جس کا قصہ سورۂ بقرہ آیت فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ (البقرۃ: ۵۴) میں گزرا ہے) اور (موسیٰ علیہ السلام کو متنبہ فرمانے کا قصہ یہ ہوا کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف (طور سے) واپس آئے غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے (کیونکہ ان کو وحی سے یہ معلوم ہو گیا تھا، طٰہٰ میں ہے قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا اِلـــخ طٰہٰ: ۸۵) تو (اوّل قوم کی طرف متوجہ ہوئے) فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی، کیا اپنے ربّ کے حکم (آنے) سے پہلے ہی تم نے (ایسی) جلد بازی کر لی (میں تو اَحکام ہی لینے گیا تھا اس کا انتظار تو کیا ہوتا) اور (پھر حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور دینی حمیت کے جوش میں) جلدی سے (توریت کی) تختیاں (تو) ایک طرف رکھیں (اور جلدی میں ایسے زور سے رکھی گئیں کہ دیکھنے والے کو اگر غور نہ کرے تو شبہ ہو کہ جیسے کسی نے پٹک دی ہوں) اور (ہاتھ خالی کر کے) اپنے بھائی (ہارون علیہ السلام) کا سر (یعنی بال) پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے (کہ تم نے کیوں پورا انتظام نہ کیا اور چونکہ غلبۂ غضب میں ایک گونہ بے اختیاری ہو گئی تھی اور غضب بھی دین کے لئے تھا اس لئے اس بے اختیاری کو معتبر قرار دیا جائے گا اور اس اجتہادی لغزش پر اعتراض نہ کیا جائے گا) ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (بھائی میں نے اپنی کوشش بھر بہت روکا لیکن) ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور (بلکہ نصیحت کرنے پر) قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں تو تم مجھ پر (سختی کر کے) دشمنوں کو مت ہنسواؤ اور مجھ کو (برتاؤ سے) ان ظالم لوگوں کے ذیل میں مت شمار کرو (کہ ان کی سی ناخوشی مجھ سے بھی برتنے لگو) موسیٰ (علیہ السلام) نے (اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور) کہا کہ اے میرے ربّ میری خطا (گو وہ اجتہادی ہو) معاف فرما دے اور میرے بھائی کی بھی (کوتاہی جو ان مشرکین کے ساتھ معاملہ متارکت میں شدید ہو گئی ہو جیسا اس قول سے معلوم ہوتا ہے، مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ (طٰہٰ: ۹۲، ۹۳) الآیـــۃ) اور ہم دونوں کو اپنی رحمت (خاص) میں داخل فرمایئے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں (اس لئے ہم کو قبولِ دُعا کی امید ہے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ ''میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان لوگوں کو جو بڑے بنتے ہیں زمین میں بغیر حق کے۔''

اِس میں بغیر حق سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تکبر کرنے والوں کے مقابلہ میں تکبر کرنا حق ہے وہ بُرا اور گناہ نہیں، کیونکہ وہ صرف صورت کے اعتبار سے تکبر ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہوتا، جیسا کہ مشہور ہے اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِیْنَ تَوَاضُعٌ۔ (مسائل السلوک)

تکبر انسان کو فہمِ سلیم اور علومِ الٰہیہ سے محروم کر دیتا ہے

اور تکبر کرنے والوں یعنی بڑے بننے والوں کو اپنی آیتوں سے پھیر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُن سے آیاتِ الٰہیہ کے سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، اور آیاتِ الٰہیہ بھی اس جگہ عام مراد ہو سکتی ہیں، جن میں آیات منزلہ تورات و انجیل کی یا قرآن کریم کی بھی داخل ہیں اور آیاتِ تکوینیہ جو تمام زمین و آسمان اور اُن کی مخلوقات میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ تکبر یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھنا ایسی مذموم اور منحوس خصلت ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے اس کی عقل و فہم سلیم نہیں، اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے سمجھنے سے محروم ہو جاتا ہے نہ اس کو قرآنی آیات صحیح سمجھنے کی توفیق باقی رہتی ہے اور نہ آیاتِ قدرت میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے میں اس کا ذہن چلتا ہے۔

روح البیان میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ تکبر اور نخوت ایک ایسی بُری خصلت ہے جو علوم ربانیہ کے لئے حجاب بن جاتی ہے کیونکہ علوم ربانیہ صرف اس کی رحمت سے حاصل ہوتے ہیں اور رحمتِ خداوندی تواضع سے متوجہ ہوتی ہے،[1] مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود[2]

پہلی دو آیتوں میں یہ مضمون ارشاد فرمانے کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا باقی قصہ اس طرح ذِکر فرمایا ہے کہ:

جب موسیٰ علیہ السلام تورات حاصل کرنے کے لئے کوہِ طور پر معتکف ہوئے اور شروع میں تیس دن رات کے

---

[1] روح البیان تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۲۲

[2] ترجمہ: جو جگہ نیچی ہو پانی وہیں جاتا ہے، جہاں کوئی بات مشکل ہو جواب وہیں موجود ہوتا ہے۔

اعتکاف کا حکم تھا اور اس کے مطابق اپنی قوم سے کہہ گئے تھے کہ تیس دن بعد لوٹیں گے، وہاں حق تعالیٰ نے اس پر دس روز کی میعاد اور بڑھادی تو اسرائیلی قوم جس کی جلد بازی اور کجروی پہلے سے معروف تھی، اس وقت بھی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے، ان کی قوم میں ایک شخص سامریؔ نام کا تھا، جو اپنی قوم میں بڑا اور چودھری مانا جاتا تھا، مگر کچے عقیدہ کا آدمی تھا اس نے موقع پاکر یہ حرکت کی کہ بنی اسرائیل کے پاس کچھ زیورات قومِ فرعون کے لوگوں کے رہ گئے تھے ان سے کہا کہ یہ زیورات تم نے قبطی لوگوں سے مستعار طور پر لئے تھے اب وہ سب غرق ہوگئے اور زیورات تمہارے پاس رہ گئے، یہ تمہارے لئے حلال نہیں، کیونکہ کفار سے جنگ کے وقت حاصل شدہ مالِ غنیمت بھی اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے حلال نہیں تھا، بنی اسرائیل نے اس کے کہنے کے مطابق سب زیورات لاکر اس کے پاس جمع کردیئے، اس نے اس سونے چاندی سے ایک بچھڑے یا گائے کا مجسمہ بنایا، اور جبریلِ امین کے گھوڑے کے سم کے نیچے کی مٹی جو اس نے کہیں پہلے سے جمع کر رکھی تھی اس مٹی میں اللہ تعالیٰ نے حیات و زندگی کا خاصہ رکھا تھا، اس نے سونا چاندی آگ پر پگھلانے کے وقت یہ مٹی اس میں شامل کردی اس کا یہ اثر ہوا کہ اس گائے کے مجسمہ میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے اور اس کے اندر سے گائے کی سی آواز نکلنے لگی، اس جگہ آیت میں عِجْلًا کی تفسیر جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فرما کر اس طرف اشارہ کردیا ہے۔

سامری کی یہ حیرت انگیز شیطانی ایجاد سامنے آئی تو اس نے بنی اسرائیل کو اس کفر کی دعوت دینا شروع کردی کہ یہی خدا ہے، موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کے لئے کوہِ طور پر گئے ہیں اور اللہ میاں (معاذ اللہ) خود یہاں آگئے موسیٰ علیہ السلام سے بھول ہوگئی بنی اسرائیل میں اس کی بات پہلے سے مانی جاتی تھی اور اس وقت تو یہ شعبدہ بھی اس نے دکھلا دیا تو اور بھی معتقد ہوگئے اور اسی گائے کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت میں لگ گئے۔

مذکورہ تیسری آیت میں اس مضمون کا بیان اختصار کے ساتھ آیا ہے، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد بنی اسرائیل کے نادِم ہوکر توبہ کرنے کا ذکر ہے، اس میں سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ کے معنٰی عربی محاورہ کے موافق نادم و شرمندہ ہونے کے ہیں۔

پانچویں آیت میں اس واقعہ کی تفصیل ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے تورات لے کر واپس آئے اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا تو اگرچہ قوم کی اس گمراہی کی خبر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور ہی پر کردی تھی، لیکن سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے جب ان لوگوں کو دیکھا کہ گائے کی پوجا پاٹ کررہے ہیں تو غصہ کی انتہا نہ رہی۔

پہلے اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ یعنی تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی ہے اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ کیا تم نے اپنے ربّ کا حکم آنے سے جلد بازی کی، یعنی اللہ کی کتاب تورات کے آنے

کا انتظار تو کر لیتے، تم نے اُس سے جلد بازی کر کے یہ گمراہی اختیار کر لی، اور بعض مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ کیا تم نے جلد بازی کر کے یہ قرار دے لیا تھا کہ میری موت آ گئی۔

اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کو اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے انہوں نے اس گمراہی سے ان لوگوں کو کیوں نہ روکا، اُن کی طرف ہاتھ بڑھانے کے لئے ہاتھ کو خالی کرنے کی فکر ہوئی تو تورات کی تختیاں جو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے جلدی سے رکھ دیں اسی کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ، اِلْقَاء کے لغوی معنٰی ڈال دینے کے ہیں، اور اَلْوَاح، لَوْح کی جمع ہے جس کے معنٰی ہیں تختی، یہاں لفظ اِلْقَاء سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصہ کی حالت میں تورات کی تختیوں کی بے ادبی کی کہ اُن کو ڈال دیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ الواحِ تورات کو بے ادبی کے ساتھ ڈال دینا گناہِ عظیم ہے اور انبیاء علیہم السلام سب گناہوں سے معصوم ہیں، اس لئے مراد آیت کی یہی ہے کہ اصل مقصود حضرت ہارون علیہ السلام کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ خالی کرنا تھا اور غصہ کی حالت میں جلدی سے ان کو رکھا، جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ ڈال دیا، اِس کو قرآنِ کریم نے بطور تنبیہ کے ڈالنے کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ (بیان القرآن)

اِس کے بعد اس خیال پر کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے فرائضِ قائم مقامی میں کوتاہی کی ہے ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچنے لگے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کیا کہ میرا قصور نہیں قوم نے میرا کوئی اثر نہ لیا اور میری بات نہ سنی بلکہ قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے اِس لئے آپ میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے میرے دشمن خوش ہوں اور آپ مجھے اِن گمراہوں کے ساتھ نہ سمجھیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِاَخِي وَاَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ یعنی اے میرے پروردگار مجھے بھی معاف فرما دیجئے اور میرے بھائی کو بھی اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما دیجئے اور آپ تو سب رحمت کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔

اِس میں اپنے بھائی ہارون کے لئے تو اس بناء پر دُعائے مغفرت کی کہ شاید ان سے کوئی کوتاہی قوم کو گمراہی سے روکنے میں ہوئی ہو اور اپنے لئے دعائے مغفرت یا تو اس بنا پر کی کہ جلدی کے ساتھ الواحِ تورات کو رکھ دینا جس کو قرآنِ کریم نے ڈال دینے سے تعبیر کر کے ایک غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اس سے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا۔ اور یا یہ کہ دُعا کا ادب ہی یہ ہے کہ دوسرے کے لئے دُعا کرے تو اپنے آپ کو بھی اس میں شامل کرے تاکہ اس کا استغناء محسوس نہ ہو یعنی یہ کہ یہ اپنے آپ کو دُعا کا محتاج نہیں سمجھتا۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

البتہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا ان کو پہنچے گا غضب ان کے رب کا

وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا

اور ذلت دنیا کی زندگی میں اور یہی سزا دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو اور جنہوں نے کئے

السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ز إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ

برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے تو بیشک تیرا رب توبہ کے پیچھے البتہ بخشنے والا

رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ صلے

مہربان ہے اور جب تھم گیا موسیٰ کا غصہ تو اس نے اٹھالیا تختیوں کو

وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۴﴾

اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور رحمت تھی ان کے واسطے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ج فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

اور چن لئے موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے وقت پر لانے کو، پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَإِيَّايَ ط أَتُهْلِكُنَا

تو بولا اے رب میرے اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ہلاک کردیتا ان کو اور مجھ کو کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے

بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ج إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ ط تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ

اس کام پر جو کیا ہماری قوم کے احمقوں نے یہ سب تیری آزمائش ہے بچلاوے اس میں جس کو تو چاہے

وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ

اور سیدھا رکھے جس کو چاہے تو ہی ہے ہمارا تھامنے والا سو بخش دے ہم کو اور رحمت کر ہم پر اور تو سب سے بہتر

الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ

بخشنے والا ہے اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں ہم نے رجوع کیا

اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ

تیری طرف فرمایا میرا عذاب ڈالتا ہوں میں اس کو جس پر چاہوں اور میری رحمت شامل ہے

كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ

ہر چیز کو سو اس کو لکھ دوں گا ان کے لئے جو ڈر رکھتے ہیں اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور جو

هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ۚ

ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اللہ نے فرمایا:) ''جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ہے، اُن پر جلد ہی اُن کے رَبّ کا غضب اور دُنیوی زندگی ہی میں ذِلت آپڑے گی۔ جو لوگ افترا پردازی کرتے ہیں، اُن کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں ﴿۱۵۲﴾ اور جو لوگ بُرے کام کر گذریں، پھر اُن کے بعد توبہ کرلیں، اور اِیمان لے آئیں، تو تمہارا رَبّ اس توبہ کے بعد (اُن کے لئے) بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔'' ﴿۱۵۳﴾ اور جب موسیٰ کا غصہ تھم گیا تو انہوں نے تختیاں اُٹھالیں، اور اُن میں جو باتیں لکھی تھیں، اُس میں اُن لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان تھا جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں ﴿۱۵۴﴾ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کئے، تاکہ انہیں ہمارے طے کئے ہوئے وقت پر (کوہِ طور) لائیں۔ پھر جب انہیں زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ نے کہا: ''میرے پروردگار! اگر آپ چاہتے تو اِن کو، اور خود مجھ کو بھی پہلے ہی ہلاک کر دیتے، کیا ہم میں سے کچھ بے وقوفوں کی حرکت کی وجہ

سے آپ ہم سب کو ہلاک کردیں گے؟ (ظاہر ہے کہ نہیں۔ لہٰذا پتہ چلا کہ) یہ واقعہ آپ کی طرف سے صرف ایک امتحان ہے جس کے ذریعے آپ جس کو چاہیں، گمراہ کردیں، اور جس کو چاہیں ہدایت دے دیں۔ آپ ہی ہمارے رکھوالے ہیں۔ اس لئے ہمیں معاف کردیجئے، اور ہم پر رحم فرمائیے۔ بیشک آپ سارے معاف کرنے والوں سے بہتر معاف کرنے والے ہیں ﴿۱۵۵﴾ اور ہمارے لئے اس دُنیا میں بھی بھلائی لکھ دیجئے، اور آخرت میں بھی۔ ہم (اس غرض کے لئے) آپ ہی سے رُجوع کرتے ہیں۔'' اللہ نے فرمایا: ''اپنا عذاب تو میں اُسی پر نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں۔ اور جہاں تک میری رحمت کا تعلق ہے، وہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں یہ رحمت (مکمل طور پر) اُن لوگوں کے لئے لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھیں ﴿۱۵۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(پھر حق تعالیٰ نے ان گوسالہ پرستوں کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ) جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے (اگر اب بھی توبہ نہ کریں گے تو) ان پر بہت جلد ان کے ربّ کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیاوی زندگی ہی میں پڑے گی اور (کچھ ان ہی کی تخصیص نہیں) ہم (تو) اِفتراء پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (کہ دنیا ہی میں مغضوب اور ذلیل ہوجاتے ہیں گو کسی عارض سے اس ذلت کا گاہے ظہور نہ ہو یا دیر میں ہو، چنانچہ سامری نے جو توبہ نہ کی، اس پر غضب اور ذلت کا نزول ہوا جس کا قصہ سورۂ طٰہٰ میں ہے، قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ [1] الآیۃ (طٰہٰ: ۹۷)) اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کئے (مثلاً گوسالہ پرستی ان سے سرزد ہوگئی مگر) پھر وہ ان (گناہوں) کے (کرنے کے) بعد توبہ کرلیں اور (اس کفر کو چھوڑ کر) ایمان لے آئیں، تمہارا ربّ اس توبہ کے بعد (ان کے) گناہ کا معاف کردینے والا (اور ان کے حال پر) رحمت کرنے والا ہے (گو تکمیلِ توبہ کے لئے فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (البقرۃ: ۵۴) کا بھی حکم ہوا ہو کیونکہ اصل رحمت آخرت کی ہے چنانچہ تائبین کی خطا اسی طرح معاف ہوئی) اور جب (ہارون علیہ السلام کی یہ معذرت سن کر) موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا تو ان تختیوں کو اٹھالیا اور ان (تختیوں) کے مضامین میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے ربّ سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی (مراد احکام ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے موصوف بہدایت اور موعود برحمت ہوتا ہے) اور (جب گوسالہ کا قصہ تمام ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان سے تورات کے اَحکام سنائے، اُن لوگوں کی عادت تھی ہی شبہات نکالنے کی، چنانچہ اس میں بھی شبہ نکالا کہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام ہیں، ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں تو یقین کیا جائے، آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، وہاں سے حکم ہوا کہ ان میں کے کچھ آدمی جن کو یہ لوگ معتبر سمجھتے ہوں منتخب کرکے ان کو کوہِ طور پر لے آؤ ہم خود ان سے کہہ دیں گے کہ یہ ہمارے احکام ہیں اور اس لانے کے

---

[1] ترجمہ: آپ نے فرمایا تو بس تیرے لئے اس زندگی میں یہ سزا ہے کہ تُو یہ کہتا پھرا کرے گا کہ مجھ کو کوئی ہاتھ نہ لگانا۔

لئے ایک وقت معین کیا گیا چنانچہ) موسیٰ (علیہ السلام) نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقتِ معین (پر لانے) کے لئے منتخب کئے (چنانچہ وہاں پہنچ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو اس میں ایک شاخ نکالی اور کہنے لگے کہ خدا جانے کون بول رہا ہوگا ہم تو جب یقین لائیں کہ خدا تعالیٰ کو کھلم کھلا اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، لقولہٖ تعالیٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً [1] (البقرة:۵۵)، خدا تعالیٰ نے اس گستاخی کی سزا دی نیچے سے زلزلہ شدید شروع ہوا اوپر سے ایسی کڑک بجلی ہوئی کہ سب وہاں ہی رہ گئے) سو جب ان کو زلزلہ (وغیرہ) نے آ پکڑا تو موسیٰ (علیہ السلام ڈرے کہ بنی اسرائیل جاہل اور بدگمان تو ہیں ہی، یوں سمجھیں گے کہ کہیں لے جا کر کسی طریق سے ان سب کا کام تمام کر دیا ہے گھبرا کر) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار (یہ تو مجھ کو یقین ہے کہ ان لوگوں کو محض سزا دینا منظور ہے خاص ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ) اگر آپ کو یہ منظور ہوتا تو آپ اس سے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتے (کیونکہ ان کا اس وقت ہلاک ہونا بنی اسرائیل کے ہاتھوں میرا ہلاک ہونا ہے سو اگر آپ کو یہ مقصود ہوتا تو آپ پہلے بھی ایسا کر سکتے تھے مگر جب ایسا نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ ان کو بھی ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے میری ہلاکت بھی ہے اور بدنامی کے ساتھ، آپ سے امید ہے کہ مجھ کو بدنام نہ کریں گے اور بھلا) کہیں آپ ہم میں کے چند بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دیں گے (کہ بے وقوفی تو کریں یہ لوگ کہ ایسی گستاخی کریں اور ساتھ میں بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ہلاک ہوں میں بھی، آپ سے امید ہے کہ آپ ایسا نہ کریں گے پس ثابت ہوا کہ) یہ واقعہ (رجفہ اور صاعقہ کا) محض آپ کی طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہی میں ڈال دیں (کہ حق تعالیٰ کی شکایت اور ناشکری کرنے لگے) اور جس کو آپ چاہیں ہدایت پر قائم رکھیں (کہ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے سو میں آپ کے فضل و کرم سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور) آپ ہی تو ہمارے خبرگیراں ہیں ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ ہیں (سو ان کی گستاخی بھی معاف کر دیجئے چنانچہ وہ لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے، سورۂ بقرہ میں تفصیل ملاحظہ ہو) اور (اس دُعا کے ساتھ آپ نے تفصیل رحمت کے لئے یہ بھی دُعا کی کہ) ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور (اسی طرح) آخرت میں بھی (کیونکہ) ہم آپ کی طرف (خلوص و اطاعت کے ساتھ) رجوع کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء قبول کی اور) فرمایا کہ (اے موسیٰ اول تو مطلقاً میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ) میں اپنا عذاب (اور غضب) تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں (گو مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر واقع نہیں کرتا بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر واقع کرتا ہوں جو غایت درجہ سرکش اور متمرد ہوتے ہیں) اور میری رحمت (ایسی عام ہے کہ) تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے (باوجودیکہ ان میں بہت سی مخلوق مثلاً سرکش و معاند لوگ اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی پس جب میری رحمت غیر مستحقین کے لئے بھی

[1] ترجمہ: ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہارے کہنے سے یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر۔

عام ہے) تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام تو (کامل طور پر) ضرور ہی لکھوں گا جو کہ (اس کے حسب وعدہ مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ وہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (جو من جملہ اعمالِ قلب سے ہے) اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ اعمالِ جوارح سے ہے) اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (جو کہ عقائد میں سے ہے، تو ایسے لوگ تو پہلے سے مستحق رحمت ہیں گو آپ درخواست بھی نہ کرتے اور اَب تو آپ درخواست بھی کر رہے ہیں اِرْحَمْنَا، وَاكْتُبْ لَنَا، پس ہم بشارتِ قبول دیتے ہیں کیونکہ آپ تو ایسے ہی ہیں اور آپ کی قوم میں بھی جو مورد رحمت بننا چاہے وہ ایسے ہی اوصاف اختیار کرے کہ مستحق ہو جائے)۔

معارف ومسائل

یہ سورۂ اعراف کا انیسواں رکوع ہے، اس کی پہلی آیت میں گوسالہ پرستی کرنے والے اور اُس پر قائم رہنے والے بنی اسرائیل کے انجامِ بد کا ذکر ہے کہ آخرت میں ان کو ربّ العالمین کے غضب سے سابقہ پڑے گا جس کے بعد کہیں پناہ کی جگہ نہیں اور دنیا میں اس کو ذلت وخواری نصیب ہوگی۔

بعض گناہوں کی کچھ سزا دُنیا میں بھی ملتی ہے

جیسے سامری اور اس کے ساتھیوں کا حال ہے کہ انہوں نے گوسالہ پرستی سے صحیح توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں ہی خوار و ذلیل کر دیا کہ اس کو موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دے دیا کہ وہ سب لوگوں سے الگ رہے نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے نہ کوئی اس کو ہاتھ لگائے، چنانچہ وہ عمر بھر اسی طرح جانوروں کے ساتھ پھرتا رہا کوئی انسان اس کے پاس نہ آتا تھا۔

تفسیرِ قرطبی میں بروایت قتادہؒ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا۔ (قرطبی) [1]

اور تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ خاصیت اس کی نسل میں بھی آج تک باقی ہے، [2] اور آخر آیت میں اِرشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ یعنی جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں ان کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے، سفیان بن عیینہؒ نے فرمایا کہ جو لوگ دین میں بدعت اِختیار کرتے ہیں وہ بھی اس افتراء علی اللہ کے مجرم ہو کر اس سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ (مظہری) [3]

اِمام مالکؒ نے اِسی آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ دین میں اپنی طرف سے بدعات ایجاد کرنے والوں کی یہی سزا ہے کہ آخرت میں غضب الٰہی کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذِلت کے۔ (قرطبی) [4]

دوسری آیت میں ان لوگوں کا حال مذکور ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد اپنے اس جرم

---

[1] تفسیر القرطبی سورۂ طٰہ آیت:۹۷، ج:۱۱ ص:۲۴۰،۲۴۱ [2] روح البیان تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۲۲۲

[3] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۴۱۳ [4] تفسیر القرطبی سورۂ طٰہ آیت:۹۷، ج:۱۱ ص:۲۴۱

سے توبہ کرلی اور توبہ کے لئے جو کڑی شرط اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگائی گئی تھی کہ یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں تب ان کی توبہ قبول ہوگی، یہ لوگ حکم بجالائے تو موسیٰ علیہ السلام نے بحکم خداوندی ان کو بلایا کہ تم سب کی توبہ قبول ہوگئی، اس قتلِ عام میں جو لوگ مارے گئے وہ شہید ہوئے جو باقی رہے ان کی مغفرت ہوگئی، اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ جو لوگ برے اعمال کے مرتکب ہوں، خواہ کیسے ہی بڑے گناہ کفر و معصیت کے ہوں اگر وہ اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان کو درست کرلیں یعنی مقتضائے ایمان کے مطابق اپنے اعمال کی اصلاح کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت سے معاف فرمادیں گے، اس لئے انسان کو چاہئے کہ جب کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو فوراً توبہ کی طرف رجوع کرے۔

تیسری آیت میں اِس کا بیان ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا تو تورات کی تختیاں جو جلدی سے رکھ دی تھیں پھر اٹھالیں، اور اس کے نسخہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت تھی۔

لفظ **نُسْخَہ** اس تحریر کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی کتاب وغیرہ سے نقل کی جائے، بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی تختیاں جلدی سے رکھیں تو وہ ٹوٹ گئی تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی دوسری چیز میں لکھا ہوا عطا فرمایا، اس کو نسخہ کہا گیا ہے۔

ستر بنی اسرائیل کا انتخاب اور ان کی ہلاکت کا واقعہ

چوتھی آیت میں ایک خاص واقعہ کا ذِکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات لاکر بنی اسرائیل کو دی تو اپنی کجروی اور حیلہ جوئی کی وجہ سے کہنے لگے کہ ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، ممکن ہے کہ آپ اپنی طرف سے لکھ لائے ہوں، ان کو اطمینان دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ اس قوم کے منتخب آدمیوں کو آپ کوہِ طور پر لے آئیں تو ہم ان کو بھی خود اپنا کلام سنادیں گے جس سے ان کو یقین آجائے، موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور کوہِ طور پر لے گئے، حسبِ وعدہ انہوں نے اپنے کانوں اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا، مگر جب یہ حجت بھی پوری ہوگئی تو کہنے لگے ہمیں کیا معلوم یہ آواز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یا کسی اور کی، ہم تو جب یقین کریں جب کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں، ان کا یہ سوال چونکہ ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی تھا، اس پر غضبِ الٰہی متوجہ ہوا، اُن کے نیچے سے زلزلہ آیا اور اوپر سے بجلی کی کڑک آئی جس سے یہ بیہوش ہوکر گر گئے اور بظاہر مردہ ہوگئے، سورۂ بقرہ میں اس جگہ صاعقہ کا لفظ آیا ہے اور یہاں **رجفہ** کا، صاعقہ کے معنی بجلی کی کڑک اور **رجفہ** کے معنی زلزلہ کے ہیں، اِس میں کوئی بُعد نہیں کہ دونوں چیزیں جمع ہوگئی ہوں۔

بہرحال یہ لوگ ایسے ہوکر گر گئے جیسے مُردے ہوتے ہیں خواہ حقیقۃً مر ہی گئے ہوں یا ظاہر میں مردہ نظر آتے

ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا، اول تو اس لئے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے منتخب لوگ تھے، دوسرے اس لئے کہ اب اپنی قوم میں جا کر کیا جواب دیں گے وہ یہ تہمت لگائیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سب کو کہیں لے جا کر قتل کرا دیا ہے اور اس تہمت کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے، اس لئے اللہ جل شانہٗ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں جانتا ہوں کہ اس واقعہ سے آپ کا مقصود ان کو ہلاک کرنا نہیں کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو اب سے پہلے بہت سے واقعات تھے جن میں یہ ہلاک کئے جا سکتے تھے، فرعون کے ساتھ غرق کر دیئے جاتے یا گوسالہ پرستی کے وقت سب کے سامنے ہلاک کر دیئے جاتے اور آپ چاہتے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے مگر آپ نے یہ نہیں چاہا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی ان کا ہلاک کرنا مقصود نہیں بلکہ سزا دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ہم سب کو چند بے وقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کر دیں۔ اِس جگہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا اس لئے ذکر کیا کہ ان ستر آدمیوں کی اس طرح غائبانہ ہلاکت کا نتیجہ یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کئے جائیں۔

پھر عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض آپ کا امتحان ہے جس کے ذریعہ آپ بعض لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت و ناشکری کرنے لگیں، اور بعض کو ہدایت پر قائم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، میں بھی آپ کے فضل سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں، ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ معافی دینے والے ہیں اس لئے ان کی اس گستاخی کو بھی معاف کر دیجئے، چنانچہ وہ سب لوگ صحیح سالم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ستر آدمی جن کا ذکر اس آیت میں ہے وہ نہیں جنہوں نے اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء: ۱۵۳) کی درخواست کی تھی اور اس پر صاعقہ کے ذریعہ ہلاک کئے گئے تھے، بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو خود تو گوسالہ پرستی میں شریک نہ تھے مگر قوم کو اس حرکت سے روکنے کی کوئی کوشش بھی نہ کی تھی اس کی سزا میں ان پر زلزلہ آیا اور بیہوش ہو گئے، واللہ اعلم۔ بہر حال یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔

پانچویں آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا کا تکملہ یہ بھی مذکور ہے، وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ یعنی اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے لئے اِس دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور آخرت میں بھی، کیونکہ ہم آپ کی طرف خلوص و اطاعت سے رجوع کرتے ہیں۔

اِس کے جواب میں حق تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ یعنی اے موسیٰ اوّل تو میری رحمت مطلقاً میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ میں اپنا عذاب اور غضب تو صرف اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اگرچہ مستحقِ عذاب ہر نافرمان

ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر عذاب واقع نہیں کرتا، بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر عذاب واقع کرتا ہوں جو انتہائی سرکش اور متمرّد ہوتے ہیں، اور میری رحمت ایسی عام ہے کہ سب اشیاء کو محیط ہو رہی ہے باوجودیکہ ان میں سے بہت سے لوگ مثلاً سرکش اور نافرمان اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت سب غیر مستحقین کے لئے بھی عام ہے تو وہ رحمت ان لوگوں کے لئے تو کامل طور پر ضرور ہی لکھ دوں گا جو حسبِ وعدہ اس کے مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، تو یہ لوگ پہلے ہی سے مستحقِ رحمت ہیں اس لئے آپ کو قبولِ دُعا کی بشارت دیتے ہیں۔

اِس جواب کی تقریر میں حضراتِ مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، کیونکہ یہاں صاف لفظوں میں قبولیتِ دُعا مذکور نہیں، جیسے دوسرے مواقع میں صاف فرما دیا گیا قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ (طٰہٰ) یعنی اے موسیٰ آپ کا سوال پورا کر دیا گیا، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس:۸۹) یعنی اے موسیٰ وہارون آپ دونوں کی دُعا قبول کر لی گئی، یہاں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان آیات کا مفہوم یہ قرار دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست اپنی امت کے بارے میں تو قبول نہ ہوئی البتہ اُمتِ محمدیہ کے حق میں قبول کر لی گئی جن کا ذکر بعد کی آیات میں وضاحت کے ساتھ آ رہا ہے، مگر تفسیر روح المعانی میں اس احتمال کو بعید قرار دیا ہے، اس لئے جواب کی صحیح تقریر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کے دو جزء تھے ایک یہ کہ جن لوگوں پر عتاب وعذاب ہوا ہے ان کو معافی دی جائے اور ان پر رحمت کی جائے، دوسرا یہ کہ میرے لئے اور میری پوری قوم کے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی مکمل لکھ دی جائے، پہلی دُعا کا جواب اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری دُعا کا جواب دوسری آیت میں مذکور ہے، پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ میری عادت ہی یہ ہے کہ میں ہر گنا ہگار پر عذاب نہیں کرتا بلکہ صرف ان پر جن کو میں (بوجہ انتہائی سرکشی کے) عذاب ہی دینا چاہتا ہوں اس لئے ان لوگوں کو بھی عذاب نہ دیا جائے گا آپ بے فکر رہیں، رہی رحمت کی درخواست سو میری رحمت تو ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے انسان ہو یا غیر انسان، مؤمن ہو یا کافر، فرماں بردار ہو یا نافرمان، بلکہ جن کو دنیا میں کوئی عذاب وتکلیف دی جاتی ہے وہ بھی رحمت سے خالی نہیں ہوتے کم از کم یہ کہ جس مصیبت میں مبتلا ہیں اس سے بڑی مصیبت ان پر نہیں ڈالی گئی حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت تھی۔

استاذِ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وسعتِ رحمت کے یہ معنیٰ ہیں کہ رحمت کا دائرہ کسی سے تنگ نہیں، اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ ہر چیز مرحوم ہے جیسا ابلیس ملعون نے کہا کہ میں بھی ایک شئ ہوں اور ہر شئ مرحوم ہے لہٰذا میں بھی مرحوم ہوں، قرآنِ کریم کے الفاظ میں اِس طرف اشارہ موجود ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ ہر شئ پر رحمت کی جائے گی بلکہ یہ فرمایا کہ صفتِ رحمت تنگ نہیں وسیع ہے جس پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمانا چاہیں فرما سکتے ہیں، قرآنِ کریم میں اس کی

شہادت دوسری جگہ اس طرح آئی ہے فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ (الانعام) یعنی اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو اِن سے فرما دیجئے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے مگر مجرمین سے ان کے عذاب کو کوئی نہیں ٹال سکتا، اس میں بتلا دیا کہ وسعتِ رحمت مجرمین پر عذاب کے منافی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ دُعا ان لوگوں کے حق میں بلا کسی شرط کے قبول کر لی گئی یعنی مغفرت و معافی کی بھی اور رحمت کی بھی۔

اور دوسری دُعا جس میں دُنیا و آخرت کی مکمل بھلائی ان کے لئے لکھ دینے کی درخواست تھی اس کے متعلق چند شرائط لگائی گئیں، مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں تو ہر مؤمن و کافر پر رحمت عام ہو سکتی ہے مگر عالمِ آخرت اچھے بُرے کے امتیاز کا مقام ہے یہاں رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو چند شرائط کو پورا کریں، اوّل یہ کہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں، یعنی تمام واجباتِ شرعیہ کو ادا کریں اور ناجائز کاموں سے دُور رہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ کے لئے زکوٰۃ نکالیں، تیسرے یہ کہ ہماری سب آیات پر بلا کسی استثناء اور تاویل کے ایمان لائیں، یہ موجودہ لوگ بھی اگر یہ صفات پوری اپنے اندر پیدا کر لیں تو ان کے لئے بھی دنیا و آخرت کی مکمل بھلائی لکھ دی جائے گی۔

لیکن اس کے بعد کی آیت میں اِس طرف اشارہ کر دیا کہ ان صفات کو پوری جامعیت کے ساتھ حاصل کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بعد آخر زمانہ میں آئیں گے اور نبیِ اُمّی کا اتباع کریں گے، اور اس کے نتیجہ میں وہ مکمل فلاح کے مستحق ہوں گے۔

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ جب آیت وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ نازل ہوئی تو ابلیس نے کہا کہ میں اس رحمت میں داخل ہوں، لیکن بعد کے جملوں میں بتلا دیا کہ رحمت آخرت ایمان وغیرہ کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس کو سن کر ابلیس مایوس ہو گیا، مگر یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم میں تو یہ صفات بھی موجود ہیں یعنی تقویٰ اور اداءِ زکوٰۃ اور ایمان، مگر اس کے بعد جو شرط نبی امّی پر ایمان لانے کی بیان ہوئی تو اس سے وہ یہود و نصاریٰ نکل گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔[1]

غرض اس اسلوبِ بدیع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبولیت دُعا کا بیان بھی ہو گیا اور اُمتِ محمدیہ کے مخصوص فضائل کا ذکر بھی۔

---

[1] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۲۸۷، ۲۸۸

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ

وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے کہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس

فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

توریت اور انجیل میں وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا منع کرتا ہے بُرے کام سے

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ

اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اس کی مدد کی

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾ ع

اور تابع ہوئے اس نور کے جو اس کے ساتھ اُترا ہے وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو اُس رسول، یعنی نبی اُمی کے پیچھے چلیں جس کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور اِنجیل میں لکھا ہوا پائیں گے، جو اُنہیں اچھی باتوں کا حکم دے گا، بُرائیوں سے روکے گا، اور اُن کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے گا، اور اُن پر سے وہ بوجھ اور گلے کے وہ طوق اُتار دے گا جو اُن پر لدے ہوئے تھے۔ چنانچہ جو لوگ اُس (نبی) پر اِیمان لائیں گے، اُس کی تعظیم کریں گے، اُس کی مدد کریں گے، اور اُس کے ساتھ جو نور اُتارا گیا ہے، اُس کے پیچھے چلیں گے، تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔" ﴿۱۵۷﴾

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ ایسے رسول نبی اُمی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی

صفت یہ بھی ہے کہ) وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں (گو وہ پہلی شرائع میں حرام تھیں) اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو (پہلے شرائع میں) بوجھ اور طوق (لدے ہوئے) تھے (یعنی سخت اور شدید احکام جن کا ان کو پابند کیا ہوا تھا) ان کو دور کرتے ہیں (یعنی ایسے سخت احکام ان کی شریعت میں منسوخ ہو جاتے ہیں) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور اُن کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں (کہ ابدی عذاب سے نجات پائیں گے)۔

معارف و مسائل

خاتم النّبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اُمت کے مخصوص صفات وفضائل

پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کے جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ یوں تو اللہ کی رحمت ہر چیز ہر شخص کے لئے وسیع ہے آپ کی موجودہ امت بھی اس سے محروم نہیں، لیکن مکمل نعمت ورحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو ایمان وتقویٰ اور زکوٰۃ وغیرہ کی مخصوص شرائط کو پورا کریں۔

اس آیت میں ان لوگوں کا پتہ دیا گیا ہے کہ ان شرائط پر پورے اترنے والے کون لوگ ہوں گے اور بتلایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں گے، اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خصوصی فضائل وکمالات اور علامات کا بھی ذکر فرما کر آپ پر صرف ایمان لانے کا نہیں بلکہ آپ کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ فلاحِ آخرت کے لئے ایمان کے ساتھ اتباع شریعت وسنت ضروری ہے۔

اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ اس جگہ رسول اور نبی کے دو لقبوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تیسری صفت امّی بھی بیان کی گئی ہے، اُمّی کے لفظی معنیٰ اَن پڑھ کے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، عام قومِ عرب کو قرآن میں اُمّیین اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اور اُمّی ہونا کسی انسان کے لئے کوئی صفت مدح نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے، مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم ومعارف اور خصوصیات اور حالات وکمالات کے ساتھ امّی ہونا آپ کے لئے بڑی صفت کمال بن گئی ہے، کیونکہ اگر علمی عملی اخلاقی کمالات کسی لکھے پڑھے آدمی سے ظاہر ہوں تو وہ اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ایک امّی محض سے ایسے بیش بہا علوم اور بے نظیر حقائق ومعارف کا صدور اس کا ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس سے کوئی پرلے درجے کا معاند ومخالف بھی انکار نہیں کر سکتا، خصوصاً جبکہ آپ کی عمر شریف کے چالیس سال مکہ مکرمہ

میں سب کے سامنے اس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا نہ سیکھا ٹھیک چالیس سال کی عمر ہونے پر یکایک آپ کی زبان مبارک پر وہ کلام جاری ہوا جس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہوگئی، تو ان حالات میں آپ کا اُمّی ہونا آپ کے رسول من جانب اللہ ہونے اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایک بہت بڑی شہادت ہے اس لئے اُمّی ہونا اگرچہ دوسروں کے لئے کوئی صفت مدح نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت بڑی صفت مدح وکمال ہے، جیسے متکبر کا لفظ عام انسانوں کے لئے صفتِ مدح نہیں بلکہ عیب ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے خصوصیت سے صفتِ مدح ہے۔

آیت میں چوتھی صفت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ آپ کو تورات وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے، یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ قرآنِ کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کی صفات وحالات کو لکھا ہوا پائیں گے بلکہ یَجِدُوْنَهٗ کا لفظ اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو لکھا ہوا پائیں گے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تورات وانجیل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ایسی تفصیل ووضاحت کے ساتھ ہوں گی کہ ان کو دیکھنا ایسا ہوگا جیسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا، اور تورات وانجیل کی تخصیص یہاں اس لئے کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل انہیں دو کتابوں کے قائل ہیں ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وصفات کا ذِکر زبور میں بھی موجود ہے۔

آیتِ مذکورہ کے اصل مخاطب موسیٰ علیہ السلام ہیں جس میں اُن کو بتلایا گیا ہے کہ دُنیا وآخرت کی مکمل فلاح آپ کی امت کے ان لوگوں کا حصہ ہے جو نبیِ اُمّی خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع کریں جن کا ذکر وہ تورات وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔

تورات وانجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور علامات

موجودہ تورات وانجیل بے شمار تحریفات اور تغیر وتبدل ہو جانے کے سبب قابلِ اعتماد نہیں رہی، اس کے باوجود اب بھی ان میں ایسے کلمات موجود ہیں جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ دیتے ہیں، اور اتنی بات بالکل واضح ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ اعلان کیا کہ خاتم الانبیاء کی صفات وعلامات تورات وانجیل میں لکھی ہوئی ہیں، اگر یہ بات واقعہ کے خلاف ہوتی تو اس زمانہ کے یہود ونصاریٰ کے لئے تو اِسلام کے خلاف ایک بہت بڑا ہتھیار ہاتھ آجاتا کہ اس کے ذریعہ قرآن کی تکذیب کر سکتے تھے کہ تورات وانجیل میں کہیں نبی اُمّی کے حالات کا ذکر نہیں، لیکن اس وقت کے یہود ونصاریٰ نے اس کے خلاف کوئی اعلان نہیں کیا، یہ خود اس پر شاہد ہے کہ اُس وقت تورات وانجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات وعلامات واضح طور پر موجود تھیں جس نے ان لوگوں کی زبانوں پر مہر لگا دی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات وانجیل میں لکھی تھیں ان کا کچھ بیان تو قرآن کریم میں بحوالہ تورات وانجیل آیا ہے اور کچھ روایاتِ حدیث میں ان حضرات سے منقول ہے جنہوں نے اصلی تورات وانجیل کو دیکھا اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک پڑھ کر ہی وہ مسلمان ہوئے۔

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ اتفاقاً بیمار ہو گیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے کھڑا ہوا تورات پڑھ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ اے یہودی میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے؟ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا یا رسول اللہ یہ غلط کہتا ہے، تورات میں ہم آپ کا ذکر اور آپ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین مسلمان کریں، باپ کے حوالہ نہ کریں۔ (مظہری) [1]

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا، اس نے آ کر اپنا قرض مانگا آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں کچھ مہلت دو، یہودی نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک میرا قرض ادا نہ کر دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں اختیار ہے میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر، عصر، مغرب عشاء کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی، صحابہ کرامؓ یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غضبناک ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تاڑ لیا اور صحابہؓ سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپ کو قید کرے، آپ نے فرمایا کہ ''مجھے میرے ربّ نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہد وغیرہ پر ظلم کروں'' یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اس طرح مشرف باسلام ہو کر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستہ میں دے دیا، اور قسم ہے خدا تعالیٰ کی کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ تورات میں جو آپ کی صفات بتلائی گئی ہیں وہ آپ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں میں نے تورات میں آپ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں:

---

[1] دلائل النبوة للبيهقيؒ، جماع ابواب اسئلة اليهود إلخ رقم الحديث: ۲۵۳۰، وتفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۳ ص:۴۱۷

"محمد بن عبداللہ، ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت طیبہ کی طرف اور ملک ان کا شام ہوگا، نہ وہ سخت مزاج ہوں گے نہ سخت بات کرنے والے نہ بازاروں میں شور کرنے والے، فحش اور بے حیائی سے دور ہوں گے۔"

اب میں نے ان تمام صفات کا امتحان کر کے آپ میں صحیح پایا، اس لئے شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، اور میرا یہ آدھا مال ہے آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں، اور یہ یہودی بہت مالدار تھا، آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی، اس روایت کو تفسیر مظہری میں بحوالہ دلائل النبوۃ بیہقی نقل فرمایا ہے۔ [۱]

اور امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبارؒ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ:

"محمد اللہ کے رسول اور منتخب بندے ہیں، نہ سخت مزاج ہیں نہ بیہودہ گو، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت طیبہ میں ہوگی، ملک آپ کا شام ہوگا اور امت آپ کی حَمَّادِیْن ہوگی، یعنی راحت وکلفت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر ادا کرے گی، ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی وہ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھے گی تاکہ اس کے ذریعہ اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرے، وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے، اُن کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا، جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز جماعت میں، رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے۔" (مظہری) [۲]

ابن سعدؒ اور ابن عساکرؒ نے حضرت سہل مولیٰ خیثمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات پڑھی ہیں کہ:

"وہ نہ پست قد ہوں گے نہ بہت دراز قد، سفید رنگ دو زلفوں والے ہوں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہرِ نبوّت ہوگی، صدقہ قبول نہ کریں گے، حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیا کریں گے، پیوند زدہ کرتہ استعمال فرماویں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بَری ہوتا

---

[۱] دلائل النبوة للبيهقیؒ جماع ابواب اسئلة اليهود إلخ رقم الحديث: ۲۵۳۹، وتفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۷۱

[۲] تفسير البغوی تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۲۸۹، والتفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۱۷، ۴۱۸

ہے، وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہوگا۔'' [۱]

اور ابن سعدؒ نے طبقات میں، دارمیؒ نے اپنے مسند میں، بیہقی نے دلائلِ نبوّت میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے، انہوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں:

''اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا، بُرے اعمال والوں کو ڈرانے والا بنا کر اور اُمّیّین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام مُتوکّل رکھا ہے، نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کردیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کردیں یہاں تک کہ وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے قائل ہوجائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں، اور بہرے کانوں کو سننے کے قابل بنادیں اور بند ھے ہوئے دلوں کو کھول دیں۔'' [۲]

اِس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بھی مذکور ہے۔ [۳]

اور کتبِ سابقہ کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہؒ سے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا، میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کے لئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کردی ہیں، ان کی اُمت اُمتِ مرحومہ ہے، میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے انبیاء پر لازم کئے گئے تھے، یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا، اے داؤد! میں نے محمد اور ان کی اُمت کو تمام اُمتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری اُمتوں کو نہیں دی گئیں، اوّل یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا، جو گناہ ان سے بغیر قصد کے صادر ہوجائے اگر وہ اس کی مغفرت

---

[۱] طبقات ابن سعد، باب ذکر اسماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکنیته ج:۱ ص:۱۰۴، وتاریخ مدینة دمشق ج:۱ ص:۴۱۸، ۴۱۹

[۲] طبقات ابن سعد، باب ذکر صفة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۳۶۰، ودلائل النبوة رقم الحدیث:۳۳۸، ومسند الدارمیؒ رقم الحدیث:۲، باب صفة النبی فی الکتب قبل مبعثه۔

[۳] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کراهیة السخب فی الأسواق ج:۱ ص:۲۸۵

مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کردوں گا، اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیبِ خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دے دوں گا، اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہیں تو میں ان پر اس مصیبت کو صلوٰۃ ورحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنادوں گا، وہ جو دُعا کریں گے میں قبول کروں گا، کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ اس دُعا کو ان کی آخرت کا سامان بنادوں۔ (روح المعانی) [1]

سینکڑوں میں سے یہ چند روایات تورات، انجیل، زبور کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں پوری روایات کو محدثین نے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

تورات وانجیل میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امتِ مرحومہ کے خاص فضائل وصفات اور علامات کی تفصیل پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس آخری دور میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں اس کو بڑے شرح وبسط اور تفصیل وتحقیق کے ساتھ لکھا ہے، اس میں موجودہ زمانے کی تورات وانجیل جس میں بے انتہا تحریفات ہوچکی ہیں ان میں بھی بہت سی صفات وفضائل کا ذکر موجود ہونا ثابت کیا ہے، اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ حال میں شائع ہوچکا ہے، قابلِ دید ہے۔

سابقہ آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات وعلامات کا تفصیلی بیان تھا جو تورات وانجیل اور زبور میں لکھی ہوئی تھیں، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ مزید صفات بھی مذکور ہیں۔

جن میں پہلی صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، ''معروف'' کے لفظی معنٰی جانا پہچانا ہوا، اور مُنکَر کے لغوی معنٰی اوپرا، اجنبی جو پہچانا نہ جائے، اس جگہ معروف سے وہ نیک کام مراد ہیں جو شریعتِ اسلام میں جانے پہچانے ہوئے ہیں اور منکر سے وہ بُرے کام جو دین وشریعت سے اجنبی ہیں۔

اِس جگہ اچھے کاموں کو معروف کے لفظ سے اور بُرے کاموں کو مُنکَر کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین میں نیک کام صرف اس کو سمجھا جائے گا جو قرنِ اول کے مسلمانوں میں رائج ہوا اور جانا پہچانا گیا اور جو ایسا نہ ہو وہ منکر کہلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ وتابعین نے جس کام کو نیک نہیں سمجھا وہ خواہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو از رُوئے شریعت وہ بھلا نہیں، احادیثِ صحیحہ میں اسی لئے ان کاموں کو جن کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین کی طرف سے نہیں پائی جاتی ان کو محدثات الامور اور بدعت فرما کر گمراہی قرار دیا ہے، معنٰی آیت کے اس جملہ کے یہ ہیں کہ

---

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآیة ج:٦ ص:٣٩٠، ودلائل النبوة للبیهقی، باب صفة رسول الله صلی الله علیه وسلم فی التورات والإنجیل، رقم الحدیث: ٣٤٣

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کریں گے اور بُرے کاموں سے منع فرماویں گے۔

یہ صفت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ ہر نبی اور رسول اسی کام کے لئے بھیجے جاتے ہیں کہ لوگوں کو نیک کاموں کی طرف ہدایت کریں اور بُرے کاموں سے منع کریں، لیکن اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کے موقع پر اس کا بیان کرنا اس کی خبر دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صفت میں دوسرے انبیاء علیہم السلام سے کوئی خاص امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ امتیاز کئی وجہ سے ہے، اول اس کام کا خاص سلیقہ کہ ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کے مناسبِ حال طریق سے فہمائش کرنا جس سے بات ان کے دِل میں اتر جائے اور بھاری نہ معلوم ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں غور کیا جائے تو اس کا مشاہدہ ہوگا کہ آپ کو حق تعالیٰ نے اس میں خصوصی اور امتیازی سلیقہ عطا فرمایا تھا، عرب کے بدوی جو اونٹ اور بکری چرانے کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے ان سے ان کے اندازِ فہم پر گفتگو فرماتے اور دقیق علمی مضامین کو ایسے سادہ الفاظ میں سمجھا دیتے تھے کہ اَن پڑھ لوگوں کی بھی سمجھ میں آجائے، اور قیصر وکسریٰ اور دوسرے ملوکِ عجم اور ان کے بھیجے ہوئے ذی علم وفہم سفراء سے ان کے انداز کے مطابق گفتگو ہوتی تھی اور بلا استثناء سب ہی اس گفتگو سے متأثر ہوتے تھے، دوسرے آپ کی اور آپ کے کلام کی خداداد مقبولیت اور دلوں میں تاثیر بھی ایک معجزانہ انداز رکھتی ہے بڑے سے بڑا دشمن بھی جب آپ کا کلام سنتا تو متأثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اُوپر بحوالۂ تورات جو صفات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی گئی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کو بینا اور بہرے کانوں کو سننے والا بنادے گا اور بند دِلوں کو کھول دے گا، یہ اوصاف شاید اسی خصوصیت کا نتیجہ ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا امتیازی سلیقہ عطا فرمایا تھا۔

دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لئے پاکیزہ اور پسندیدہ چیزوں کو حلال فرماویں گے اور گندی چیزوں کو حرام، مراد یہ ہے کہ بہت سی پاکیزہ اور پسندیدہ چیزیں جو بنی اسرائیل پر بطور سزا کے حرام کردی گئی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حرمت کو ختم کردیں گے مثلاً حلال جانوروں کی چربی وغیرہ جو بنی اسرائیل کی بدکاریوں کی سزا میں اُن پر حرام کردی گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حلال قرار دیا، اور گندی چیزوں میں خون اور مردار جانور، شراب اور تمام حرام جانور داخل ہیں اور تمام حرام ذرائع آمدنی بھی مثلاً سود، رشوت جوا وغیرہ (السراج المنیر)[1]، اور بعض حضرات نے بُرے اخلاق وعادات کو بھی گندی چیزوں میں شمار فرمایا ہے۔

تیسری صفت یہ بیان فرمائی گئی وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسیر السراج المنیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۱۱۳۷

ہٹا دیں گے لوگوں سے اس بوجھ اور بند کو جو ان پر مسلط تھی۔

لفظ اِصْر کے معنی بارِگراں کے ہیں جو آدمی کو حرکت کرنے سے روک دے اور اَغْلٰل غُلٌّ کی جمع ہے، اس ہتکڑی کو غُلّ کہتے ہیں جس کے ذریعہ مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔

اِصْر اور اَغْلَال یعنی بارِگراں اور قید سے مراد اس آیت میں وہ احکام شاقہ اور دشوار واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطور سزا کے لازم کر دیئے گئے تھے، مثلاً کپڑا ناپاک ہو جائے تو پانی سے دھو دینا بنی اسرائیل کے لئے کافی نہ تھا بلکہ یہ واجب تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس کو کاٹ دیا جائے، اور کفار سے جہاد کر کے جو مالِ غنیمت ان کو ہاتھ آئے، ان کے لئے حلال نہیں تھا بلکہ آسمان سے ایک آگ آ کر اس کو جلا دیتی تھی، ہفتہ کے دن شکار کھیلنا ان کے لئے حرام تھا، جن اعضاء سے کوئی گناہ صادر ہوا ان اعضاء کو کاٹ دینا واجب تھا، کسی کا قتل خواہ عمداً ہو یا خطاءً دونوں صورتوں میں قصاص یعنی قاتل کا قتل کرنا واجب تھا، خونبہا دینے کا قانون نہ تھا۔

ان احکامِ شاقہ کو جو بنی اسرائیل پر نافذ تھے قرآن میں اِصْر اور اَغْلَال فرمایا اور یہ خبر دی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سخت اَحکام کے منسوخ کر کے سہل اَحکام جاری فرماویں گے۔

اِسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ میں نے تم کو ایک سہل اور آسان شریعت پر چھوڑا ہے جس میں نہ کوئی مشقت ہے نہ گمراہی کا اندیشہ۔[1]

ایک حدیث میں ارشاد ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ یعنی دین آسان ہے،[2] قرآنِ کریم نے فرمایا، وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:۷۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔

نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفاتِ کمال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا:

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ یعنی تورات وانجیل میں نبی آخر الزمان کی واضح صفات وعلامات بتلا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تعظیم کریں اور مدد کریں اور اس نور کا اتباع کریں جو آپ کے ساتھ بھیجا گیا ہے یعنی قرآنِ عظیم تو یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔

یہاں فلاح پانے کے لئے چار شرطیں ذِکر کی گئی ہیں، اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، دوسرے آپ کی تعظیم وتکریم، تیسرے آپ کی امداد، چوتھے قرآنِ کریم کا اتباع۔

تعظیم وتکریم کے لئے اس جگہ لفظ عَزَّرُوْهُ لایا گیا ہے جو تعزیر سے مشتق ہے، تعزیر کے اصلی معنی شفقت کے

[1] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۹۵۱ [2] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب الدین یسر ج: ۱ ص: ۱۰

ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عَزَّرُوْهُ کے معنیٰ تعظیم وتکریم کرنے کے بتلائے ہیں اور مُبرّد نے کہا کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کوتعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [1]

مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت کے ساتھ آپ کی تائید وحمایت اور مخالفین کے مقابلہ میں آپ کی مدد کریں وہ مکمل فلاح پانے والے ہیں، زمانۂ نبوّت میں تو یہ تائید ونصرت آپ کی ذات کے ساتھ متعلق تھی اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی شریعت اور آپ کے دین کی تائید ونصرت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید ونصرت کا مصداق ہے۔

قرآن کریم کو اس آیت میں نور سے تعبیر کیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ جس طرح نور کے نور ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، نور خود اپنے وجود کی دلیل ہوتا ہے، اسی طرح قرآن کریم خود اپنے کلامِ ربانی اور کلامِ حق ہونے کی دلیل ہے کہ ایک امّی محض کی زبان سے ایسا اعلیٰ وابلغ کلام آیا جس کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہوگئی، یہ خود قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

نیز جس طرح نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسری اندھیریوں میں بھی اجالا کر دیتا ہے اسی طرح قرآن کریم نے اندھیریوں میں پھنسی ہوئی دنیا کو تاریکیوں سے نکالا۔

قرآن کے ساتھ سنت کا اتباع بھی فرض ہے

اِس آیت کے شروع میں يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ فرمایا تھا، اور آخر میں وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ فرمایا۔

ان میں سے پہلے جملہ میں نبیِّ امّی کے اتباع کا حکم ہے اور آخری جملہ میں قرآن کے اتباع کا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نجاتِ آخرت کتاب اور سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے کیونکہ نبی امّی کا اتباع ان کی سنت ہی کے اتباع کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

رسول کا صرف اتباع بھی کافی نہیں، ادب واحترام اور محبت بھی فرض ہے

اور ان دونوں جملوں کے درمیان عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے عام دنیا کے حکام کا اتباع جبراً قہراً کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت ومحبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے اَحکام کے اتباع پر مجبور

---

[1] تفسیر الطبری تحت هذه الآية رقم الحديث: ۱۵۲۴۴

ہو، کیونکہ اُمت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ امیر وحاکم ہے اور اُمت محکوم ورعیت، دُوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری اُمت ان کی مُحِبّ۔

ایک یہ کہ رسول اپنے کمالاتِ علمی، عملی، اخلاقی کی بناء پر صاحبِ عظمت ہے، اور ساری اُمت ان کے مقابلہ میں پست اور عاجز۔

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجۂ کمال میں پائی جاتی ہیں اس لئے اُمت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں، بحیثیت امیر وحاکم کے ان کے اَحکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالاتِ نبوّت ان کی تعظیم وتکریم بجالائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امّت پر فرض ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اِس کے بغیر پورا نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی پر اِکتفاء نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم وتوقیر اور احترام وادب کو بھی لازم قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جابجا اس کے آداب سکھائے گئے ہیں۔

اس آیت میں تو عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح:۹) آیا ہے، اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپ کی آواز سے بڑھ جائے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ [۱] (الحجرات:۲)

اور ایک جگہ ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (الحجرات:۱) یعنی اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو، یعنی جس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں اور کوئی معاملہ پیش آئے تو آپ سے پہلے کوئی نہ بولے۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے اس آیت کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نہ بولیں اور جب آپ کلام کریں تو سب خاموش ہوکر سنیں۔

ایک آیت قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا [۲] (النور:۶۳)، آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال حبط اور برباد ہوجائیں گے۔

---

[۱] ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو۔ [۲] ترجمہ: تم لوگ اس کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بُلا لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت، ہر حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریکِ کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام و تعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیتِ مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے، یہی حال حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تھا۔ (شفاء) [۱]

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپ کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا، اور اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لئے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ [۲]

ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مجلسِ صحابہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے، صرف صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ آپ کی طرف نظر کرتے اور آپ ان کی طرف نظر فرما کر تبسم فرماتے تھے۔ [۳]

عروہ بن مسعود کو اہلِ مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لئے مدینہ بھیجا اس نے صحابہ کرام کو پروانہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گرتا اور فدا ہوتا ہوا دیکھ کر واپسی میں یہ رپورٹ دی کہ میں نے کسریٰ وقیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں اور مَلِک نجاشی سے بھی ملا ہوں مگر جو حال میں نے اصحابِ محمد کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا، میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہوگے۔ [۴]

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما ہوتے تو صحابہ کرامؓ باہر سے آواز دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانا بے ادبی سمجھتے تھے دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔ [۵]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ و تابعین کا معمول یہ تھا کہ مسجدِ نبوی میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو درکنار کوئی وعظ تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے، اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے

---

[۱] الشفاء بتعریف حقوق المصطفی (صلی اللہ علیہ وسلم) الباب الثالث فی تعظیم امرہ ووجوب توقیرہ إلخ ج:۲ ص:۳٦

[۲] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبله وكذا الهجرة ج:۱ ص:۷٦

[۳] جامع الترمذی، ابواب المناقب، بابٌ ج:۲ ص:۲۰۸

[۴] سیرۃ ابن هشام ج:۲ ص:۳۱۲

[۵] الشفاء، الباب الثالث فی تعظیم امرہ ووجوب توقیرہ ج:۲ ص:۴۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہو گئے۔

اسی تعظیم وتوقیر کی برکت تھی کہ ان حضرات کو کمالاتِ نبوّت سے خاص حصہ ملا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے بعد سب سے اونچا مقام عطا فرمایا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ

تو کہہ اے لوگو میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

آسمانوں اور زمین میں کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر

وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ

اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امّی پر جو کہ یقین رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے سب کلاموں پر اور اس کی پیروی کرو

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ

تاکہ تم راہ پاؤ اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو راہ بتلاتے ہیں حق کی

وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے رسول! ان سے) کہو کہ: ''اے لوگو! میں تم سب کی طرف اُس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جس کے قبضے میں تمام آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندگی اور موت دیتا ہے۔ اب تم اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لے آؤ جو نبی امی ہے، اور جو اللہ پر اور اُس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، اور اُس کی پیروی کرو، تاکہ تمہیں ہدایت حاصل ہو'' ﴿۱۵۸﴾ اور موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو لوگوں کو حق کا راستہ دکھاتی ہے، اور اُسی

(حق) کے مطابق انصاف سے کام لیتی ہے۔ ﴿۱۵۹﴾

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہت ہے تمام آسمانوں اور زمین میں، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے، اِس لئے اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبیِّ اُمّی پر (بھی ایمان لاؤ) جو کہ (خود بھی) اللہ پر اور اس کے اَحکام پر ایمان رکھتے ہیں (یعنی جب باوجود اِس رتبۂ عظیمہ کے ان کو اللہ اور سب رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے عار نہیں تو تم کو اللہ و رسول پر ایمان لانے سے کیوں اِنکار ہے) اور ان (نبی) کا اتباع کرو تا کہ تم راہ (راست) پر آجاؤ اور (اگرچہ بعض لوگوں نے آپ کی مخالفت کی لیکن) قومِ موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دینِ حق (یعنی اسلام) کے موافق (لوگوں کو) ہدایت بھی کرتے ہیں اور اسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں (مراد اس سے عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ ہیں)۔

معارف و مسائل

اِس آیت میں اسلام کے اصولی مسائل میں سے مسئلۂ رسالت کے ایک ایک اہم پہلو کا بیان ہے کہ ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت دنیا کے تمام جن و بشر کے لئے اور ان میں بھی قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اِعلانِ عام کر دینے کا حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، میری بعثت و رسالت پچھلے انبیاء کی طرح کسی مخصوص قوم یا مخصوص خطۂ زمین یا خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اِنسانوں کے لئے دنیا کے ہر خطہ ہر ملک ہر آبادی کے لئے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے قیامت تک کے واسطے عام ہے، اور انسانوں کے علاوہ جنات بھی اس میں شریک ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام عالَم کے لئے تا قیامت ہے، اسی لئے آپ پر نبوّت ختم ہے

یہی اصلی راز ہے مسئلۂ ختمِ نبوّت کا، کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت قیامت تک آنے والی سب

نسلوں کے لئے عام ہے تو پھر کسی دوسرے رسول اور نبی کے مبعوث ہونے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش، اور یہی راز ہے امتِ محمدیہ کی اس خصوصیت کا کہ اس میں ارشادِ نبوی کے مطابق ہمیشہ ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو دین میں پیدا ہونے والے سارے فتنوں کا مقابلہ اور دینی معاملات میں پیدا ہونے والے سارے رخنوں کا انسداد کرتی رہے گی، کتاب وسنت کی تعبیر وتفسیر میں جو غلطیاں رائج ہوں گی یہ جماعت ان کو بھی دور کرے گی اور حق تعالیٰ کی خاص نصرت وامداد اس جماعت کو حاصل ہوگی جس کے سبب یہ سب پر غالب آ کر رہے گی، کیونکہ درحقیقت یہ جماعت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ رسالت ادا کرنے میں آپ کی قائم مقام ہوگی۔

امام رازیؒ نے آیت كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (التوبۃ) کے تحت میں بتلایا ہے کہ اِس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اس امّت میں صادقین کی ایک جماعت ضرور باقی رہے گی ورنہ دنیا کو صادقین کی معیت وصحبت کا حکم ہی نہ ہوتا اور اسی سے امام رازیؒ نے ہر دَور میں اجماعِ امت کا حجتِ شرعیہ ہونا ثابت کیا ہے، کیونکہ صادقین کی جماعت کے موجود ہوتے ہوئے کسی غلط بات یا گمراہی پر سب کا اجماع واتفاق نہیں ہوسکتا۔[1]

اِمام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النّبیین اور آخری پیغمبر ہونے کی طرف اشارہ ہے،[2] کیونکہ جب آپ کی بعثت ورسالت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پورے عالَم کے لئے عام ہوئی تو اب کسی دوسرے جدید نبی ورسول کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اپنی جگہ اپنی نبوّت پر برقرار ہونے کے باوجود شریعتِ محمدی پر عمل کریں گے، جیسا کہ صحیح روایاتِ حدیث سے ثابت ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ورسالت ساری دنیا اور قیامت تک کے لئے عام ہونے پر یہ آیت بھی بہت واضح ثبوت ہے، اِس کے علاوہ قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً ارشاد ہے وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۚ (الانعام:۱۹) یعنی یہ قرآن مجھ پر بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں اور ان لوگوں کو بھی جن کو میرے بعد یہ قرآن پہنچے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم خصوصیات

اور ابن کثیرؒ نے بحوالہ مسندِ احمد سندِ قوی کے ساتھ روایت کیا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ تہجد میں مشغول تھے صحابہ کرامؓ کو خوف ہوا کہ کوئی دشمن حملہ نہ کردے اِس لئے آپ کے گرد جمع ہوگئے، جب آپ نماز

---

[1] التفسیر الکبیر، سورۃ التوبۃ:۱۱۹، ج:۸ ص:۱۷۶،۱۷۷　[2] تفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۴۸۹

سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ آج کی رات مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی رسول و نبی کو نہیں ملیں، اول یہ کہ میری رسالت و نبوّت کو ساری دنیا کی کل اقوام کے لئے عام کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے جتنے انبیاء آئے ان کی دعوت و بعثت صرف اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی، دوسری بات یہ ہے کہ مجھے میرے دشمن کے مقابلہ میں ایسا رعب عطا کیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہو تو میرا رُعب اس پر چھا جاتا ہے، تیسرے یہ کہ میرے لئے کُفّار سے حاصل شدہ مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا حالانکہ پچھلی امتوں کے لئے حلال نہ تھا بلکہ اس کا اِستعمال کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا، ان کے مالِ غنیمت کا صرف یہ مصرف تھا کہ آسمان سے ایک بجلی آئے اور اس کو جلا کر خاک کر دے، چوتھے یہ کہ میرے لئے تمام زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنا دیا کہ ہماری نماز زمین پر ہر جگہ ہو جاتی ہے مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف پہلی امتوں کے کہ ان کی عبادت صرف ان کے عبادت خانوں کے ساتھ مخصوص تھی اپنے گھروں میں یا جنگل وغیرہ میں ان کی نماز و عبادت نہ ہوتی تھی، نیز یہ کہ جب پانی کے اِستعمال پر قدرت نہ ہو، خواہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا کسی بیماری کے سبب تو وضوء کے بجائے مٹی سے تیمّم کرنا اس امت کے لئے طہارت و وضوء کے قائم مقام ہو جاتا ہے، پچھلی امتوں کے لئے یہ آسانی نہ تھی، پھر فرمایا: اور پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ خود ہی اپنی نظیر ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر رسول کو ایک دُعا کی قبولیت ایسی عطا فرمائی ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور ہر رسول و نبی نے اپنی اپنی دُعا کو اپنے خاص خاص مقصدوں کے لئے استعمال کر لیا وہ مقصد حاصل ہو گئے مجھ سے یہی کہا گیا کہ آپ کوئی دعا کریں، میں نے اپنی دُعا کو آخرت کے لئے محفوظ کرا دیا، وہ دُعا تمہارے اور قیامت تک جو شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت دینے والا ہو گا اس کے کام آئے گی۔ [۱]

نیز امام احمدؒ کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میرا مبعوث ہونا سنے خواہ وہ میری امت میں ہو یا یہودی نصرانی ہو اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو جہنم میں جائے گا۔ [۲]

اور صحیح بخاری میں اسی آیت کے تحت میں بروایت ابو درداءؓ نقل کیا ہے کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر چلے گئے، یہ دیکھ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی ان کو منانے کے لئے چلے مگر حضرت عمرؓ نے نہ مانا، یہاں تک کہ اپنے گھر میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا، مجبوراً صدیقِ اکبرؓ واپس ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، ادھر کچھ دیر کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۹۰، ومسند احمد، رقم الحديث: ۷۰۶۸ مسند عبدالله بن عمرو (رضى الله عنه)۔

[۲] مسند احمد، رقم الحديث:۸۴۲۷، مسند ابى هريرة (رضى الله عنه)۔

یہ بھی گھر سے نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنا واقعہ عرض کیا، ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوگئے، جب صدیقِ اکبرؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پر عتاب ہونے لگا تو عرض کیا یا رسول اللہ زیادہ قصور میرا ہی تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے ایک ساتھی کو اپنی ایذاؤں سے چھوڑ دو، کیا تم نہیں جانتے کہ جب میں نے باذنِ خداوندی یہ کہا کہ:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

تو تم سب نے مجھے جھٹلایا، صرف ابوبکر ہی تھے جنہوں نے پہلی بار میری تصدیق کی۔ [۱]

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اور ہر ملک ہر خطہ کے باشندوں کے لئے اور ہر قوم و برادری کے لئے رسول عام ہونا ثابت ہوا اور یہ کہ آپ کی بعثت کے بعد جو شخص آپ پر ایمان نہیں لایا وہ اگرچہ کسی سابق شریعت و کتاب کا یا کسی اور مذہب و ملت کا پورا پورا اتباع تقویٰ و احتیاط کے ساتھ بھی کر رہا ہو وہ ہرگز نجات نہیں پائے گا۔

آخر آیت میں بتلایا کہ میں اس ذاتِ پاک کی طرف سے رسول ہوں جس کی مِلک میں ہیں تمام آسمان اور زمین، وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

یعنی جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوامِ عالم کے لئے رسول و نبی ہیں، ان کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہیں، تو ضروری ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود بھی اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتے ہیں، اور ان کا اتباع کرو تاکہ تم صحیح راستہ پر قائم رہو۔

اللہ کے کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتابیں تورات، انجیل، قرآن وغیرہ ہیں، ایمان کے حکم کے بعد پھر اتباع کا مزید حکم دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ محض ایمان لانا یا زبانی تصدیق کرنا آپ کی شریعت کا اتباع کرنے کے بغیر ہدایت کے لئے کافی نہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے کل راستے بند ہیں بجز اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب "قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" ج:۲ ص:۶۶۸

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک حق پرست جماعت

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو خود بھی حق کا اتباع کرتی ہے اور اپنے نزاعی معاملات کے فیصلوں میں حق کے موافق فیصلے کرتی ہے۔

سابقہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی کجروی، کج بحثی اور گمراہی کا بیان ہوا تھا، اس آیت میں بتلایا گیا کہ پوری قوم بنی اسرائیل ایسی نہیں بلکہ ان میں کچھ لوگ اچھے بھی ہیں جو حق کا اتباع کرتے ہیں، اور حق فیصلے کرتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے تورات وانجیل کے زمانہ میں ان کی ہدایت کے موافق پورا عمل کیا، اور جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو تورات وانجیل کی بشارت کے موافق آپ پر ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا بنی اسرائیل کی اس حق پرست جماعت کا ذکر بھی قرآن میں بار بار آیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ (آل عمران) یعنی اہل کتاب میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو حق پر قائم ہے، اللہ کی آیات کو رات بھر تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ (القصص) یعنی وہ لوگ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتاب (تورات وانجیل) دی گئی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔

اور ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ وغیرہ نے اس جگہ ایک عجیب حکایت نقل کی ہے کہ اس جماعت سے وہ جماعت مراد ہے جو بنی اسرائیل کی گمراہی اور بداعمالیوں، قتلِ انبیاء وغیرہ سے تنگ آکر ان سے الگ ہوگئی تھی، بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا جنہوں نے اپنی قوم سے تنگ آکر یہ دعا کی کہ یا اللہ ہمیں ان لوگوں سے دور کہیں اور بسا دیجئے تاکہ ہم اپنے دین پر پختگی سے عمل کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو ڈیڑھ سال کی مسافت پر مشرقِ بعید کی کسی زمین میں پہنچا دیا جہاں وہ خالص عبادت میں مشغول رہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد بھی نیرنگ قدرت سے ان کے مسلمان ہونے کا یہ سامان ہوا کہ شبِ معراج میں جبریلِ امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس طرف لے گئے وہ لوگ آپ پر ایمان لائے آپ نے ان کو کچھ قرآن کی سورتیں پڑھائیں اور ان سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس ناپ تول کا کچھ انتظام ہے اور تم لوگوں کے معاش کا کیا سامان ہے؟ جواب دیا کہ ہم زمین میں غلہ بوتے ہیں جب تیار ہوجاتا ہے کاٹ کر وہیں ڈھیر لگا دیتے ہیں ہر شخص کو جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں سے لے آتا ہے، ناپنے تولنے کی ضرورت

ہی نہیں ہوتی، آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم میں کوئی شخص جھوٹ بھی بولتا ہے؟ عرض کیا کہ نہیں، کیونکہ اگر کوئی ایسا کرے تو فوراً ایک آگ آکر اسے جلا دیتی ہے، آپ نے دریافت کیا کہ تم سب کے مکانات بالکل یکساں کیوں ہیں؟ عرض کیا اس لئے کہ کسی کو کسی پر بڑائی جتلانے کا موقع نہ ملے، پھر دریافت کیا کہ تم نے اپنے مکانات کے سامنے اپنی قبریں کیوں بنا رکھی ہیں؟ عرض کیا تاکہ ہمیں موت ہر وقت مستحضر رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس مکہ میں تشریف لائے تو یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ تفسیرِ قرطبی نے اِسی روایت کو اصل قرار دیا ہے اور دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں، ابن کثیرؒ نے اس کو حکایت عجیبہ تو فرمایا مگر رد نہیں کیا، البتہ تفسیرِ قرطبی میں اس کو نقل کر کے کہا ہے کہ غالباً یہ روایت صحیح نہیں۔ [1]

بہرحال اس آیت سے یہ مفہوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت ایسی ہے جو ہمیشہ حق پر قائم رہی خواہ یہ وہ لوگ ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پا کر مشرف باسلام ہوگئے، یا وہ بنی اسرائیل کا بارھواں قبیلہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے کسی خاص حصہ میں رکھا ہوا ہے جہاں دوسروں کی رسائی نہیں۔ واللہ اعلم

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى

اور جدا جدا کردیئے ہم نے ان کو بارہ دادوں کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو

اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ

جب پانی مانگا اس سے اس کی قوم نے کہ مار اپنی لاٹھی اس پتھر پر تو پھوٹ نکلے اس سے

اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ

بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قبیلہ نے اپنا گھاٹ، اور سایہ کیا ہم نے ان پر

الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ

ابر کا اور اتارا ہم نے ان پر من اور سلویٰ، کھاؤ ستھری چیزیں

---

[1] تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۱۷۳، وتفسیر الکبیر تحت هذه الآية ج:۳ ص:۴۹۲، والقرطبی تحت هذه الآية ج:۷ ص:۳۰۲

مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۶۰

جو ہم نے روزی دی تم کو، اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے رہے،

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب حکم ہوا ان کو کہ بسو اس شہر میں اور کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو،

وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْۗـٰٔتِكُمْ ۭ

اور کہو ہم کو بخش دے اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دیں گے ہم تمہاری خطائیں

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۶۱ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ

البتہ زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو سو بدل ڈالا ظالموں نے ان میں سے دوسرا لفظ اس کے سوا جو

قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝۱۶۲ ع ۲۰ ۵ ۱۰

ان سے کہہ دیا گیا تھا پھر بھیجا ہم نے ان پر عذاب آسمان سے بسبب ان کی شرارت کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے اُن کو (یعنی بنی اسرائیل کو) بارہ خاندانوں میں اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ وہ الگ الگ (انتظامی) جماعتوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اور جب موسیٰ کی قوم نے اُن سے پانی مانگا تو ہم نے اُن کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ اپنی لاٹھی فلاں پتھر پر مارو۔ چنانچہ اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ ہر خاندان کو اپنی پانی پینے کی جگہ معلوم ہوگئی۔ اور ہم نے اُن کو بادل کا سایہ دیا، اور ہم نے اُن پر من وسلویٰ (یہ کہہ کر) اُتارا کہ: "کھاؤ وہ پاکیزہ رزق جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔" اور (اس کے باوجود انہوں نے جو ناشکری کی تو) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۝۱۶۰ اور وہ وقت یاد کرو جب اُن سے کہا گیا تھا کہ: "اِس بستی میں جا کر بس جاؤ، اور اُس میں جہاں سے چاہو کھاؤ، اور یہ کہتے جانا کہ (یا اللہ!) ہم آپ کی بخشش کے طلب گار ہیں، اور (بستی کے) دروازے میں جھکے ہوئے سروں کے

ساتھ داخل ہونا، تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے، (اور) نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ (ثواب) بھی دیں گے۔'' (۱۶۱) پھر ہوا یہ کہ جو بات اُن سے کہی گئی تھی، اُن میں سے ظالم لوگوں نے اُسے بدل کر دوسری بات بنالی۔ تب ہم نے اُن کی مسلسل زیادتیوں کی وجہ سے اُن پر آسمان سے عذاب بھیجا۔ (۱۶۲)

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (ایک انعام بنی اسرائیل پر یہ کیا کہ ان کی اصلاح وانتظام کے لئے) ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کر دی (اور ہر ایک پر ایک سردار نگرانی کے لئے مقرر کر دیا، جن کا ذکر مائدہ کے رکوع سوم میں ہے وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا [1] (المائدۃ:۱۲)) اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا جبکہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا (اور انہوں نے حق تعالیٰ سے دعاء کی اس وقت یہ حکم ہوا) کہ اپنے اس عصاء کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آوے گا) بس (مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے (بعدد ان بارہ خاندانوں کے) پھوٹ نکلے (چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ہم نے اُن پر ابر کو سایہ افگن کیا اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ان کو (خزانۂ غیب سے) ترنجبین اور بٹیریں پہنچائیں، (اور اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (لیکن وہ لوگ اس میں بھی ایک بات خلافِ حکم کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے، (یہ واقعات وادئ تیہ کے ہیں جن کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ان کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو اور (یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب اندر جانے لگو تو) زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) اور (عاجزی سے) جھکے جھکے دروازے میں داخل ہونا ہم تمہاری (پچھلی) خطائیں معاف کر دیں گے (یہ تو سب کے لئے ہوگا اور) جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید براں اور دیں گے، سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے اُن پر ایک آفت سماوی بھیجی، اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ

اور پوچھ ان سے حال اس بستی کا جو تھی دریا کے کنارے جب حد سے بڑھنے لگے ہفتہ کے حکم میں

---

[1] ترجمہ: اور ہم نے اُن میں سے بارہ سردار مقرر کئے۔

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ

جب آنے لگیں ان کے پاس مچھلیاں ہفتہ کے دِن پانی کے اوپر اور جس دن ہفتہ نہ ہو تو نہ آتی تھیں

كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ

اس طرح ہم نے ان کو آزمایا اس لئے کہ وہ نافرمان تھے، اور جب بولا ان میں سے ایک فرقہ

لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا

کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے سخت

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا

وہ بولے الزام اتارنے کی غرض سے تمہارے ربّ کے آگے اور اس لئے کہ شاید وہ ڈریں پھر جب وہ بھول گئے

مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا

اس کو جو ان کو سمجھایا تھا تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بُرے کام سے اور پکڑا

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا

گنہگاروں کو بُرے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے پھر جب بڑھنے لگے

عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے حکم کیا کہ ہوجاؤ بندر ذلیل۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اِن سے اُس بستی کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے آباد تھی، جب وہ سبت (سنیچر) کے معاملے

میں زیادتیاں کرتے تھے، جب اُن (کے سمندر) کی مچھلیاں سنیچر کے دن تو اُچھل اُچھل کر سامنے آتی تھیں، اور جب وہ سنیچر کا دِن نہ منا رہے ہوتے، تو وہ نہیں آتی تھیں۔ اس طرح اُن کی مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے ہم انہیں آزماتے تھے۔ ﴿۱۶۳﴾ اور (وہ وقت انہیں یاد دِلاؤ) جب انہی کے ایک گروہ نے (دوسرے گروہ سے) کہا تھا کہ: ''تم اُن لوگوں کو کیوں نصیحت کر رہے ہو جنہیں اللہ یا تو ہلاک کرنے والا ہے، یا کوئی سخت قسم کا عذاب دینے والا ہے؟'' دوسرے گروہ کے لوگوں نے کہا کہ: ''یہ ہم اس لئے کرتے ہیں تا کہ تمہارے رَبّ کے حضور بری الذمہ ہو سکیں، اور شاید (اس نصیحت سے) یہ لوگ پرہیزگاری اختیار کرلیں۔'' ﴿۱۶۴﴾ پھر جب یہ لوگ وہ بات بُھلا بیٹھے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو بُرائی سے روکنے والوں کو تو ہم نے بچالیا، اور جنہوں نے زیادتیاں کی تھیں، اُن کی مسلسل نافرمانی کی بنا پر ہم نے اُنہیں ایک سخت عذاب میں پکڑلیا ﴿۱۶۵﴾ چنانچہ ہوا یہ کہ جس کام سے انہیں روکا گیا تھا، جب انہوں نے اس کے خلاف سرکشی کی تو ہم نے اُن سے کہا: ''جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ۔'' ﴿۱۶۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان (اپنے ہم عصر یہودی) لوگوں سے (بطور تنبیہ کے) اس بستی (والوں) کا جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے (اور اس میں یہودی رہتے تھے جن کو ہفتہ کے روز شکار کرنا ممنوع تھا) اس وقت کا حال پوچھئے جب کہ وہ (وہاں کے بسنے والے) ہفتہ (کے متعلق جو حکم تھا اس) کے بارے میں حد (شرعی) سے نکل رہے تھے جبکہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان (کے دریا) کی مچھلیاں (پانی سے سر نکال نکال) ظاہر ہو ہو کر (سطح دریا پر) ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں (بلکہ وہاں سے دُور کہیں چلی جاتی تھیں اور وجہ اس کی یہ تھی کہ) ہم ان کی اس طرح پر (شدید) آزمائش کرتے تھے (کہ کون حکم پر ثابت رہتا ہے کون نہیں رہتا اور یہ آزمائش) اس سبب سے (تھی) کہ وہ (پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے (اسی لئے ایسے سخت حکم سے ان کی آزمائش کی اور اہلِ طاعت کی آزمائش لطف اور توفیق اور تائید سے مقرون ہوا کرتی ہے) اور (اس وقت کا حال پوچھئے) جبکہ ان میں سے ایک جماعت نے (جو کہ ان کو نصیحت کرتے کرتے اثر و نفع ہونے سے مایوس ہوگئے تھے ایسے لوگوں سے جو اَب بھی نصیحت کئے چلے جا رہے تھے اور اس قدر مایوس بھی نہ ہوئے تھے جیسا لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے) یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن (سے قبول کی کچھ امید نہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان) کو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا (ہلاک نہ ہوئے تو) ان کو (کوئی اور طرح کی) سخت سزا دینے والے ہیں (یعنی ایسوں کے ساتھ کیوں دماغ خالی کرتے ہو) انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے (اور اپنے) ربّ کے روبرو عذر کرنے کے لئے (ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ کے روبرو کہہ سکیں کہ

اے اللہ ہم نے تو کہا تھا مگر انہوں نے نہ سنا ہم معذور ہیں) اور (نیز) اس لئے کہ شاید ڈر جائیں (اور عمل کرنے لگیں مگر وہ کب عمل کرتے تھے) سو (آخر) جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا (یعنی نہ مانا) تو ہم نے ان لوگوں کو تو (عذاب سے) بچالیا جو اس بری بات سے منع کیا کرتے تھے (خواہ برابر منع کرتے رہے اور خواہ بوجہ عذر یاس کے بیٹھ رہے) اور ان لوگوں کو جو کہ (حکم مذکور میں) زیادتی کرتے تھے ان کی (اس عدول حکمی کی وجہ سے) ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا یعنی جب وہ جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے (یہ تو تفسیر ہوئی نسیان مَاذُكِّرُوْا بِهٖ کی) تو ہم نے ان کو (براہِ قہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (یہ تفسیر ہوئی عذابِ بئیس کی)۔

واقعات مندرجہ آیات مذکورہ بھی معارف القرآن جلد اول سورۂ بقرہ میں تفصیل وتشریح کے ساتھ آچکے ہیں، اس کے متعلق ضروری باتیں وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ

اور اس وقت کو یاد کرو جب خبر کردی تھی تیرے ربّ نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو

يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ

کہ دیا کرے ان کو بُرا عذاب، بیشک تیرا ربّ جلد عذاب کرنے والا ہے، اور وہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ

مہربان ہے، اور متفرق کردیا ہم نے ان کو ملک میں فرقے فرقے، بعضے ان میں نیک اور بعضے

دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

اُور طرح کے اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوبیوں میں اور برائیوں میں تاکہ وہ پھر آئیں،

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى

پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف جو وارث بنے کتاب کے لے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا

وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ

اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوجائے گا اور اگر ایسا ہی اسباب ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیویں

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ

کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا کہ نہ بولیں اللہ پر سوا سچ کے

وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ

اور انہوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے، اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لئے

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

کیا تم نہیں سمجھتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (یاد کرو وہ وقت) جب تمہارے رَبّ نے اعلان کیا کہ وہ ان پر قیامت کے دن تک کوئی نہ کوئی ایسا شخص مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں پہنچائے گا۔ بیشک تمہارا رَبّ جلد ہی سزا دینے والا بھی ہے، اور یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان بھی ہے ﴿۱۶۷﴾ اور ہم نے دُنیا میں اُن کو مختلف جماعتوں میں بانٹ دیا۔ چنانچہ ان میں نیک لوگ بھی تھے، اور کچھ دوسری طرح کے لوگ بھی۔ اور ہم نے انہیں اچھے اور بُرے حالات سے آزمایا، تاکہ وہ (راہِ راست کی طرف) لوٹ آئیں ﴿۱۶۸﴾ پھر ان کے بعد اُن کی جگہ ایسے جانشین آئے جو کتاب (یعنی تورات) کے وارث بنے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ اس ذلیل دُنیا کا ساز و سامان (رِشوت میں) لیتے، اور یہ کہتے کہ: ''ہماری بخشش ہوجائے گی'' حالانکہ اگر اُسی جیسا ساز و سامان دوبارہ اُن کے پاس آتا تو وہ اُسے بھی (رِشوت میں) لے لیتے۔ کیا ان سے کتاب میں مذکور یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کریں؟ اور اُس (کتاب) میں جو کچھ لکھا تھا، وہ انہوں نے باقاعدہ پڑھا بھی تھا۔ اور آخرت والا گھر اُن لوگوں کے لئے کہیں بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ (اے یہود!) کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ﴿۱۶۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے ربّ نے (انبیاء بنی اسرائیل کی معرفت) یہ بات بتلادی کہ وہ ان یہود پر (ان کی گستاخیوں اور نافرمانیوں کی سزا میں) قیامت (کے قریب) تک ایسے (کسی نہ کسی) شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید (ذلت وخواری ومحکومیت) کی تکلیف پہنچاتا رہے گا (چنانچہ مدت سے یہودی کسی نہ کسی سلطنت کے محکوم ومقہور ہی چلے آتے ہیں) بلاشبہ آپ کا ربّ واقعی (جب چاہے) جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی (اگر باز آجاوے تو) بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا (بھی) ہے اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کردیں (چنانچہ) بعضے ان میں نیک (بھی) تھے اور بعضے ان میں اور طرح کے تھے (یعنی بد تھے) اور ہم (نے ان بدوں کو بھی اپنی عنایت اور تربیت واصلاح کے اسباب جمع کرنے سے کبھی مہمل نہیں چھوڑا بلکہ ہمیشہ) ان کو خوش حالیوں (یعنی صحت وغنا) اور بدحالیوں (یعنی بیماری وفقر) سے آزماتے رہے کہ شاید (اسی سے) باز آجائیں (کیونکہ گاہے حسنات سے ترغیب ہوجاتی ہے اور گاہے سیئات سے ترہیب ہوجاتی ہے، یہ حال تو ان کے سلف کا ہوا) پھر ان (سلف) کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے کہ کتاب (یعنی تورات) کو (تو) ان سے حاصل کیا (لیکن اس کے ساتھ ہی حرام خور ایسے ہیں کہ اَحکامِ کتاب کے عوض میں) اس دنیائے دنی کا مال متاع (اگر ملے تو بے تکلف اس کو) لے لیتے ہیں اور (بیباک ایسے ہیں کہ اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہوجاوے گی (کیونکہ ہم اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ہیں ایسے گناہ ہماری مقبولیت کے روبرو کیا چیز ہیں) حالانکہ (اپنی بیباکی اور استخفافِ معصیت پر مصر ہیں حتیٰ کہ) اگر ان کے پاس (پھر) ویسا ہی (دین فروشی کے عوض) مال متاع آنے لگے تو (اسی بے باکی کے ساتھ پھر) اس کو لے لیتے ہیں (اور استخفاف معصیت کا خود کفر ہے، جس پر مغفرت کا احتمال بھی نہیں، تابہ یقین چہ رسد، چنانچہ آگے یہی ارشاد ہے کہ) کیا ان سے اس کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ خدا کی طرف بجز حق (اور واقعی) بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں (مطلب یہ ہے کہ جب کسی آسمانی کتاب کو مانا جاتا ہے تو اس کے معنٰی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس کے سب مضامین مانیں گے) اور (عہد بھی کوئی اجمالی عہد نہیں لیا گیا جس میں احتمال ہو کہ شاید اس مضمونِ خاص کا اس کتاب میں ہونا ان کو معلوم نہ ہوگا بلکہ تفصیلی عہد لیا گیا چنانچہ) انہوں نے اِس کتاب میں جو کچھ (لکھا) تھا اس کو پڑھ (بھی) لیا (جس سے وہ احتمال بھی جاتا رہا پھر بھی یہ ایسی بڑی بات کا دعوٰی کرتے ہیں کہ باوجود اِستخفافِ معصیت کے مغفرت کا اعتقاد کئے ہوئے ہیں جو کہ اللہ تعالٰی پر محض تہمت ہے) اور (انہوں نے یہ سب قصہ دُنیا کے لئے کیا، باقی) آخرت والا گھر ان لوگوں کے لئے (اس دنیا سے) بہتر ہے جو ان عقائد واعمالِ قبیحہ سے) پرہیز رکھتے ہیں پھر کیا (اے یہود) تم (اس بات کو) نہیں سمجھتے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے پہلی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بقیہ قصہ ذکر کرنے کے بعد ان کی امت (یہود) کے غلط کار لوگوں کی مذمت اور ان کے انجام بد کا بیان آیا ہے اِن آیتوں میں بھی ان کی سزا اور بُرے انجام کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ان کی دو سزاؤں کا بیان ہے جو دنیا ہی میں ان پر مسلط کر دی گئی ہیں اوّل یہ کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ ان پر کسی ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت سزا دیتا رہے اور ذلت وخواری میں مبتلا رکھے، چنانچہ اس وقت سے آج تک ہمیشہ یہود ہر جگہ مقہور و مغلوب اور محکوم رہے، آج کل کی اسرائیلی حکومت سے اس پر شبہ اس لئے نہیں ہوسکتا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ درحقیقت آج بھی اسرائیل کی نہ اپنی کوئی قوت ہے نہ حکومت، وہ روس اور امریکہ کی اسلام دشمن سازش کے نتیجہ میں انہیں کی ایک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور آج بھی وہ بدستور انہیں کے محکوم ومقہور ہیں، جس دن جس وقت یہ دونوں اس کی امداد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اُسی روز اسرائیل کا وجود دنیا سے ختم ہوسکتا ہے۔

دُوسری آیت میں یہودیوں پر ایک اور سزاء کا ذِکر ہے، جو اسی دنیا میں ان کو دی گئی، وہ یہ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہوگئی، کسی جگہ ایک ملک میں ان کا اجتماع نہ رہا، وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا کا یہی مطلب ہے، قَطَّعْنَا، مصدر تَقْطِيْعٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں 'ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' اور اُمَم، اُمَّۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں 'ایک جماعت' یا 'ایک فرقہ'۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہود کی قوم کے ٹکڑے ٹکڑے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق کر دیئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت خدا تعالیٰ کا اِنعام واِحسان ہے اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر ہوجانا ایک طرح کا عذابِ الٰہی، مسلمانوں پر حق تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہے ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہوگئی، مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مشرق ومغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا، مشرق بعید میں، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومتیں اسی کے نتیجہ میں بنیں، اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے، مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار واختیار ان کے ہاتھ نہ آیا۔

چند سال سے فلسطین کے ایک حصہ میں ان کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ کھایا جائے، اجتماع تو ان کا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہئے تھا کہ کیونکہ صادقِ مصدوق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ صحیحہ میں قربِ قیامت کے لئے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، نصاریٰ سب مسلمان

ہو جائیں گے اور یہودیوں سے جہاد کر کے ان کو قتل کریں گے، خدا کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑ کر نہیں بلایا جاتا بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں چل کر ہزاروں کوششیں کر کے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ملکِ شام دمشق میں ہونے والا ہے، یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں بننا ہے تا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کا قلع قمع کر دینا سہل ہو، قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور بے قدری کا عذاب چکھایا اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسانی کے لئے ان کو ان کے مقتل میں جمع فرما دیا اس لئے یہ اجتماع اس عذاب کے منافی نہیں۔

رہا ان کی موجودہ حکومت اور مصنوعی اقتدار کا قضیہ سو یہ ایک ایسا دھوکہ ہے جس پر آج کی مہذب دنیا نے اگرچہ بہت خوبصورت ملمع کا پردہ چڑھایا ہوا ہے لیکن کوئی دنیا کی سیاست سے باخبر انسان ایک منٹ کے لئے بھی اس سے دھوکہ نہیں کھا سکتا کیونکہ آج جس خطہ کو اسرائیلی مملکت کا نام دیا جاتا ہے وہ درحقیقت روس، امریکہ اور انگلینڈ کی ایک مشترک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی وہ محض ان حکومتوں کی امداد سے زندہ ہے اور ان کے تابع فرمان رہنے ہی میں اس کے وجود کا راز مضمر ہے، ظاہر ہے کہ اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دے دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا، قرآنِ کریم نے ان کے بارے میں تا قیامت رسوائی اور خواری کے جس عذاب کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی بدستور موجود ہے جس کا ذِکر اس سے پہلی آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے، وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ یعنی جبکہ آپ کے ربّ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان لوگوں پر کسی ایسی طاقت کو قیامت تک مسلط کر دے گا جو ان کو بُرا عذاب چکھائے۔

جیسا کہ اوّل سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے پھر بخت نصر کے ذریعہ اور آخر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اور باقی ماندہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے ذریعہ ہر جگہ سے ذلت وخواری کے ساتھ ان کا نکالا جانا مشہور ومعروف اور تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔

اِس آیت کا دُوسرا جملہ یہ ہے، مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ یعنی ان لوگوں میں کچھ لوگ نیک ہیں اور کچھ دوسری طرح کے، دوسری طرح سے مراد کفّار فجّار بدکار لوگ ہیں مطلب یہ ہے کہ یہودیوں میں سب ایک ہی طرح کے لوگ نہیں، کچھ نیک بھی ہیں، مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو تورات کے زمانہ میں احکامِ تورات کے پورے پابند رہے، نہ ان کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے نہ کسی تاویل وتحریف کے درپے ہوئے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِس سے مراد وہ حضرات ہوں جو نزولِ قرآن کے بعد قرآن کے تابع ہو گئے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، اس کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنھوں نے تورات کو آسمانی کتاب ماننے کے

باوجود اس کی خلاف ورزی یا اس کے اَحکام میں تحریف کرکے اپنی آخرت کو دنیا کی گندی چیزوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا۔

آخرِ آیت میں ارشاد ہے وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ یعنی ہم نے اچھی بُری حالتوں سے ان کا امتحان لیا تاکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں ــــــ اچھی حالتوں سے مراد ان کو مال و دولت کے ذخیرے اور عیش و عشرت کے سامان دینا ہے، اور بُری حالتوں سے مراد یا تو ذلت و خواری کے وہ واقعات ہیں جو ہر زمانہ میں مختلف صورتوں سے پیش آتے رہے اور یا کسی وقت کا قحط و افلاس جوان پر ڈالا گیا وہ مراد ہے، بہرحال مطلب یہ ہے کہ اِنسان کی فرماں برداری یا سرکشی کا امتحان لینے کے دو ہی طریقے ہیں، دونوں استعمال کرلئے گئے ایک یہ کہ احسانات و انعامات کرکے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ احسان کرنے والے اور انعام دینے والے کے شکرگزار فرماں بردار ہوتے ہیں یا نہیں، دوسرے یہ کہ ان کو مختلف تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرکے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ اپنے ربّ کی طرف رجوع ہوتے اور اپنی بداعمالیوں سے توبہ کرتے ہیں یا نہیں۔

لیکن قوم یہود ان دونوں امتحانوں میں فیل ہوگئی۔

جب اللّٰہ تعالیٰ نے ان پر نعمت کے دروازے کھولے، مال و دولت کی فراوانی عطا فرمائی تو کہنے لگے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ (آل عمران: ۱۸۱) یعنی (معاذ اللّٰہ) اللّٰہ تعالیٰ فقیر ہیں اور ہم غنی، اور جب ان کو افلاس و ناداری سے آزمایا گیا تو کہنے لگے يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ (المائدۃ: ۶۴) یعنی اللّٰہ کا ہاتھ تنگ ہوگیا۔

فوائد

اِس آیت سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اللّٰہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا منتشر ہونا عذاب، دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس دنیا کی راحت و کلفت اور خوشی و غمی درحقیقت خداوندی امتحان کے مختلف پرچے ہیں جن کے ذریعے اس کے ایمان اور خداپرستی کی آزمائش کی جاتی ہے، نہ یہاں کی تکلیف کچھ زیادہ رونے دھونے کی چیز ہے نہ کوئی راحت مسرور و مغرور ہوجانے کا سامان، عاقبت اندیش عقل مند کے لئے یہ دونوں چیزیں قابل توجہ نہیں۔

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے　　　بہ پیشہ ہمت ما ہرچہ آمد بود مہمانے [1]

تیسری آیت میں ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اس میں پہلا لفظ خَلَفَ مصدر خِلافت سے مشتق ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں، قائم مقام اور خلیفہ ہوگئے، اور دوسرا لفظ خَلْفٌ مصدر جو قائم مقام اور خلیفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مفرد اور

[1] ترجمہ: نہ خوشی نے کچھ فائدہ پہنچایا نہ غمی نے نقصان پہنچایا، میرے ارادے کے سامنے جو چیز بھی آئی مہمان (یعنی عارضی) ہی ثابت ہوئی۔

جمع دونوں کے لئے یکساں بولا جاتا ہے، لیکن خَلْفٌ بسکون اللام اکثر بُرے خلیفہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے بڑوں کے طرز کے خلاف برائیوں میں مبتلا ہو، اور خَلَفٌ بفتح لام اس کے مقابل نیک اور قابل خلیفہ کو کہا جاتا ہے جو اپنے بڑوں کے نقشِ قدم پر چلے اور ان کے مقصد کی تکمیل کرے، اِس لفظ کا اکثری استعمال اسی طرح ہے کہیں کہیں اس کے خلاف بھی استعمال ہوا ہے۔

وَرِثُوا الْكِتٰبَ وراثت سے مشتق ہے، وہ چیز جو مرنے والوں کے بعد زندہ رہنے والوں کو ملتی ہے اس کو میراث یا وراثت کہا جاتا ہے، معنٰی یہ ہیں کہ کتاب تورات ان لوگوں کو اپنے بڑوں سے وراثت میں مل گئی یعنی ان کے مرنے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ آئی۔

لفظ عَرَض سامان کے معنٰی میں بولا جاتا ہے جو نقد کے بدلہ میں خریدا جاتا ہے اور کبھی مطلقاً مال کے معنٰی میں بھی استعمال ہوتا ہے خواہ نقد ہو یا سامان، تفسیرِ مظہری میں ہے کہ اس جگہ یہی عام معنٰی مراد ہیں،[1] اور اس جگہ مال کو لفظ عرض سے تعبیر کرنے میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا مال کتنا ہی ہو، ناپائیدار اور عارضی ہے کیونکہ عرض کا لفظ اصل میں جوہر کے بالمقابل ناپائیدار چیز کے لئے مستعمل ہوتا ہے جس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہ ہو بلکہ وہ اپنے وجود میں دوسری کسی چیز کا تابع ہو، اسی لئے عارِض کا لفظ بادل کے معنٰی میں آتا ہے کیونکہ اس کا وجود قائم رہنے والا نہیں، جلد زائل اور ختم ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف: ۲۴) اسی معنی کے لئے آیا ہے۔

هٰذَا الْاَدْنٰى میں لفظ اَدْنٰی، دُنُوٌّ بمعنی قرب سے بھی مشتق کہا جاسکتا ہے، اِس صورت میں اَدْنٰی کے معنی اَقْرَب کے ہو جائیں گے، اسی کا مؤنث دُنْیَا ہے جس کے معنٰی قریب کے ہیں، آخرت کے مقابلہ میں یہ جہان انسان سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کو اَدْنٰی اور دُنْیَا کہا جاتا ہے، اور دُوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ دَنَاءَۃ بمعنی ذلت سے مشتق ہو تو اس کے معنٰی ذلیل وحقیر کے ہو جائیں گے، دنیا اور اس کے سب سامان بمقابلہ آخرت کے حقیر و ذلیل ہیں اس لئے اس کو اَدْنٰی اور دُنْیَا کہا گیا۔

معنٰی آیت کے یہ ہیں کہ پہلے دور کے یہودیوں میں تو دو قسم کے لوگ تھے کچھ نیک صالح، پابندِ شریعتِ تورات اور کچھ نافرمان گنہگار، مگر ان کے بعد جو لوگ ان کی نسل میں ان کے خلیفہ اور قائم مقام اور تورات کے وارث بنے، انہوں نے یہ حرکت اختیار کی کہ اللہ کی کتاب کو سوداگری کا مال بنالیا کہ اہل غرض سے رشوت لے کر اللہ کے کلام میں تحریف کر کے ان کے مطلب کے موافق بنانے لگے۔

وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا اس پر مزید جرأت یہ کہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ہم نے گناہ کیا ہے مگر یہ گناہ ہمارا بخش دیا

---

[1] تفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۴۲۵

جائے گا، حق تعالیٰ نے ان کی غلطی پر اگلے جملے میں اس طرح تنبیہ فرمائی وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ ۔ یعنی ان کا حال یہ ہے کہ اگر اس وقت بھی ان کو تحریفِ کلام اللہ کے بدلہ میں کوئی مال ملنے لگے تو یہ اب بھی مال لے کر تحریف کرنے سے باز نہ آئیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش بجا اور حق ہے مگر اُنہیں لوگوں کے لئے جو اپنے کئے پر نادم ہوں اور آئندہ اس کے چھوڑنے کا پختہ عزم کرلیں جس کا اصطلاحی نام توبہ ہے۔

یہ لوگ اپنے جرم پر اصرار کے باوجود مغفرت کے امیدوار ہیں حالانکہ اس وقت ان کو پیسہ ملے تو تحریف کرنے میں کوتاہی نہ کریں، گناہ پر اِصرار کرتے ہوئے مغفرت کی امید رکھنا خود فریبی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

کیا ان لوگوں سے تورات میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے اِس معاہدہ کو تورات میں پڑھا پڑھایا بھی ہے، یہ سب ان کی عاقبت نااندیشی ہے، بات یہ ہے کہ دارِ آخرت ہی پرہیزگاروں کے لئے بہترین لازوال دولت ہے کیا وہ اِتنی بات کو نہیں سمجھتے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ

اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، بیشک ہم ضائع نہ کریں گے ثواب

الْمُصْلِحِيْنَ ۝۱۷۰ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا

نیکی والوں کا، اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر مثل سائبان کے اور ڈرے

اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ

کہ وہ ان پر گرے گا، ہم نے کہا پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے زور سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۱ ع

ع ۲۱ / ۱۱

تاکہ تم بچتے رہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، تو ہم ایسے اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع

نہیں کرتے۔ ⑰⓪ اور (یاد کرو) جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اُوپر اس طرح اُٹھا دیا تھا جیسے وہ کوئی سائبان ہو، اور انہیں یہ گمان ہو گیا تھا کہ وہ ان کے اُوپر گرنے ہی والا ہے، (اُس وقت ہم نے حکم دیا تھا کہ:) ''ہم نے تمہیں جو کتاب دی ہے، اُسے مضبوطی سے تھامو، اور اُس کی باتوں کو یاد کرو، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرسکو۔'' ⑰①

خلاصۂ تفسیر

اور (ان میں سے) جو لوگ کتاب (یعنی تورات) کے پابند ہیں (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا بھی حکم ہے پس پابندی یہی ہے کہ مسلمان ہو گئے) اور (عقائد کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے بھی پابند ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی (اس طرح) اِصلاح کریں ثواب ضائع نہ کریں گے اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اُٹھا کر چھت کی طرح ان (بنی اسرائیل) کے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا اور ان کو یقین ہوا کہ اب ان پر گرا اور (اس وقت) کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی تورات اور) مضبوطی کے ساتھ (قبول کرو) اور یاد رکھو جو اَحکام اس (کتاب) میں ہیں، جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں ایک عہد و میثاق کا ذکر تھا جو خصوصی طور پر علماءِ بنی اسرائیل سے تورات کے متعلق لیا گیا تھا کہ اس میں کوئی تصرف وتغیر نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بجز حق اور صحیح بات کے کوئی چیز منسوب نہ کریں گے، اور یہ بات پہلے بیان ہو چکی تھی کہ ان علماءِ بنی اسرائیل نے عہد شکنی کی اور اہلِ غرض سے رشوتیں لے کر تورات کے اَحکام بدلے اور ان کی غرض کے مطابق کر کے بتلائے اب یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے کہ علماءِ بنی اسرائیل سب کے سب ایسے نہیں، ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے تورات کے اَحکام کو مضبوطی سے تھاما، اور ایمان کے ساتھ عمل کے بھی پابند ہوئے، اور نماز کو پورے آداب کے ساتھ قائم کیا، ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے، تو جن لوگوں نے ایمان وعمل کے دونوں فرائض ادا کر کے اپنی اصلاح کر لی ان کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا۔

اِس آیت میں چند فوائد قابلِ غور ہیں، اول یہ کہ کتاب سے مراد اس میں وہی کتاب ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی تورات، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر آسمانی کتاب تورات، انجیل، قرآن سب مراد ہوں۔

دوسرے یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کتاب کو صرف اپنے پاس احتیاط اور تعظیم کے ساتھ رکھ لینے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے اَحکام کی پابندی مطلوب ہے شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس آیت میں

کتاب کے لینے یا پڑھنے کا ذکر نہیں، ورنہ یَاْخُذُوْنَ یا یَقْرَءُوْنَ کا لفظ ہوتا، اس کی جگہ یُمَسِّکُوْنَ کا لفظ اختیار کیا گیا جس کے معنٰی ہیں مضبوطی کے ساتھ پوری طرح تھامنا یعنی اس کے اَحکام کی تعمیل کرنا۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ یہاں اَحکامِ تورات کی تعمیل اور پابندی کا ذکر تھا اور اَحکام تورات سینکڑوں ہیں، ان میں سے اس جگہ صرف اقامتِ صلوٰۃ کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا، اس میں اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ کتاب اللہ کے اَحکام میں سب سے زیادہ اہم اور افضل واعلیٰ نماز ہے نیز یہ کہ نماز کی پابندی اَحکامِ الٰہیہ کی پابندی کی خاص نشانی اور علامت بھی ہے کہ اس کے ذریعہ فرماں بردار اور نافرمان کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی پابندی میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جو نماز کا پابند ہوگیا اس کے لئے دوسرے اَحکامِ خداوندی کی پابندی بھی سہل ہوجاتی ہے اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اُس سے دُوسرے اَحکام کی پابندی بھی نہ ہوسکے گی، جیسا کہ حدیثِ صحیح میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز دین کا عمود ہے [۱] جس پر اس کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے، جس نے اس عمود کو قائم کرلیا اس نے دین کو قائم کرلیا اور جس نے اسے منہدم کردیا اس نے پورے دین کی عمارت منہدم کردی۔

اِسی لئے اس آیت میں وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ کے بعد وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ فرما کر یہ بتلادیا کہ کتاب سے تمسک کرنے والا اور اس کی پابندی کرنے والا صرف اُسی کو سمجھا جائے گا جو نماز کو اس کے آداب وشرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرے، اور جو نماز میں کوتاہی کرے وہ کتنے ہی وظائف پڑھے یا مجاہدے کرے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ نہیں اگرچہ اس سے کشف وکرامت کا صدور بھی ہوتا ہو۔

یہاں تک بنی اسرائیل کو ان کی عہد شکنی اور اَحکامِ تورات میں تحریف کرنے پر تنبیہ کا بیان تھا اس کے بعد دوسری آیت میں بنی اسرائیل ہی کے ایک خاص عہد کا ذکر ہے جو ان سے اَحکامِ تورات کی پابندی کے لئے ڈرا دھمکا کر گویا زبردستی لیا گیا تھا، جس کا ذِکر سورۂ بقرہ میں بھی آچکا ہے۔

اس آیت میں لفظ نَتَقْنَا، نَتْــق سے مشتق ہے جس کے معنی کھینچنے اور اُٹھانے کے ہیں، سورۂ بقرہ میں اِسی واقعہ کا ذکر لفظ رَفَعْنَا سے کیا گیا ہے اِس لئے یہاں بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نَتَقْنَا کی تفسیر رَفَعْنَا سے فرمائی ہے۔

اور لفظ ظُلَّةٌ، ظِـــلّ بمعنی سایہ سے مشتق ہے جس کے معنٰی ہیں سائبان، مگر لفظ سائبان عرف میں ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس کا سایہ سر پر پڑتا ہو مگر وہ کسی عمود پر قائم ہو، اور اِس واقعہ میں پہاڑ ان کے سر پر معلق کردیا گیا تھا سائبان کی صورت میں نہ تھا اسی لئے اس کو حرف تشبیہ کے ساتھ ذِکر کیا گیا۔

معنٰی آیت کے یہ ہیں کہ وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو اُٹھا کر

---

[۱] شعب الإيمان، رقم الحديث:۲۸۰۷ باب في الصلوات۔

معلق کردیا جس سے وہ سمجھنے لگے کہ اب ہم پر پہاڑ گرا چاہتا ہے، اِس حالت میں ان سے کہا گیا خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ یعنی مضبوط پکڑو ان اَحکام کو جو ہم نے تمہیں دیئے ہیں اور یاد رکھو تورات کی ہدایات کو تاکہ تم برے اعمال واخلاق سے باز آجاؤ۔

واقعہ اس کا یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کی خواہش اور فرمائش کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کتاب وشریعت مانگی اور حسب الحکم اس سلسلہ میں چالیس راتوں کا اعتکاف کوہِ طور پر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب ملی اور بنی اسرائیل کو سنائی تو اس میں بہت سے اَحکام ایسے پائے جو ان کی طبیعت اور سہولت کے خلاف تھے ان کو سن کر انکار کرنے لگے کہ ہم سے تو ان اَحکام پر عمل نہیں ہوسکتا، اس وقت حق تعالیٰ نے جبرئیلِ امین کو حکم دیا انہوں نے کوہِ طور پر اس بستی کے اوپر معلق کردیا جس میں بنی اسرائیل آباد تھے، اس کا رقبہ تاریخی روایتوں میں تین مربع میل بیان کیا گیا ہے، اس طرح ان لوگوں نے موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو سب سجدہ میں گر گئے اور اَحکامِ تورات کی پابندی کا عہد کرلیا، لیکن اس کے باوجود پھر بار بار خلاف ورزی ہی کرتے رہے۔

دین میں جبر واِکراہ نہیں، اس کا صحیح مطلب اور شبہ کا جواب

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم کا عام اِعلان ہے لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ (البقرة:۲۵۶) یعنی دین میں جبر واکراہ نہیں کہ کسی کو زبردستی دینِ حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

لیکن ذرا غور کیا جائے تو فرق کھلا ہوا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا، لیکن جو شخص مسلمان ہوکر اسلامی عہد ومیثاق کا پابند ہوگیا اس کے بعد وہ اگر اَحکامِ اسلام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزاء دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کے لئے مقرر ہیں، اِس سے معلوم ہوا کہ لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو بجبر مسلمان نہیں بنایا جائے گا، اور بنی اسرائیل کے اِس واقعہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اَحکامِ تورات کی پابندی سے انکار کردیا، اِس لئے ان پر جبر واِکراہ کرکے پابندی کرانا لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ کے خلاف نہیں۔

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ

اور جب نکالا تیرے ربّ نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے

معانقہ ۷

عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا

ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا ربّ بولے ہاں ہے، ہم اقرار کرتے ہیں، کبھی کہنے لگو

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ

قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا

اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے ان کی اولاد ان کے پیچھے، تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا

الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

گمراہوں نے اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تاکہ وہ پھر آئیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے رسول! لوگوں کو وہ وقت یاد دِلاؤ) جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے اُن کی ساری اولاد کو نکالا تھا، اور اُن کو خود اپنے اُوپر گواہ بنایا تھا، (اور پوچھا تھا کہ:) ''کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟'' سب نے جواب دیا تھا کہ: ''کیوں نہیں؟ ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔'' (اور یہ اِقرار ہم نے اس لئے لیا تھا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ: ''ہم تو اس بات سے بے خبر تھے'' ﴿۱۷۲﴾ یا یہ نہ کہہ دو کہ: ''شرک (کا آغاز) تو بہت پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا تھا، اور ہم اُن کے بعد اُنہی کی اولاد بنے۔ تو کیا آپ ہمیں اُن کاموں کی وجہ سے ہلاک کردیں گے جو غلط کار لوگوں نے کئے تھے؟'' ﴿۱۷۳﴾ اور اسی طرح ہم نشانیوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، تاکہ لوگ (حق کی طرف) پلٹ آئیں ﴿۱۷۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (ان سے اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے) جبکہ آپ کے ربّ نے (عالمِ ارواح میں آدم علیہ السلام کی پشت سے تو

خود ان کی اولاد کو اور) اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (ان کو سمجھ عطا کر کے) ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں سب نے (اس عقلِ خداداد سے حقیقتِ امر کو سمجھ کر) جواب دیا کہ کیوں نہیں (واقعی آپ ہمارے ربّ ہیں، حق تعالیٰ نے وہاں جتنے ملائکہ اور مخلوقات حاضر تھے سب کو گواہ کر کے سب کی طرف سے فرمایا) ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (اور یہ اقرار اور شہادت سب اس لئے ہوا کہ) تا کہ تم لوگ (یعنی جو تم میں ترکِ توحید اور اختیارِ شرک پر سزا پائیں) قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے (اور عادۃً نسل عقائد و خیالات میں تابع اپنی اصل کے ہوتی ہے اس لئے ہم بے خطا ہیں پس ہمارے فعل پر تو ہم کو سزا ہو نہیں سکتی، اگر ہو گی تو لازم آتا ہے کہ اِن بڑوں کی خطاء میں ہم ماخوذ ہوں) سو کیا ان غلط راہ (نکالنے) والوں کے فعل پر آپ ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتے ہیں (سو اب اس اقرار و اشہاد کے بعد تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے پھر اس کے بعد ان سب سے وعدہ کیا گیا کہ یہ عہد تم کو دنیا میں پیغمبروں کے ذریعہ سے یاد دِلایا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا یہاں بھی اول میں اِذْ اَخَذَ کے ترجمہ سے معلوم ہوا کہ آپ کو اس واقعہ کے ذکر کا حکم ہوا) اور (آخر میں بھی اِس یاددہانی کو جتلاتے ہیں کہ) ہم اسی طرح (اپنی) آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں (تا کہ ان کو اس عہد کا ہونا معلوم ہو جائے) اور تا کہ (معلوم ہونے کے بعد شرک وغیرہ سے) وہ باز آجائیں۔

معارف و مسائل

عہدِ الست کی تفصیل و تحقیق

اِن آیتوں میں اس عظیم الشان عالمگیر عہد و پیمان کا ذِکر ہے جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان اس وقت ہوا جبکہ مخلوق اس جہان کون و فساد میں آئی بھی نہ تھی، جس کو عہدِ ازل یا عہدِ الست کہا جاتا ہے۔

اللہ جل شانہٗ سارے عالَموں کا خالق و مالک ہے، زمین و آسمان اور ان کے درمیان اور ان کے ماسوا جو کچھ ہے اس کی مخلوق اور مِلک ہے، نہ اس پر کوئی قانون کسی کا چل سکتا ہے، نہ اس کے کسی فعل پر کسی کو کوئی سوال کرنے کا حق ہے۔

لیکن اس نے محض اپنے فضل و کرم سے عالَم کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز کا ایک ضابطہ اور قانون ہے، قانون کے موافق چلنے والوں کے لئے ہر طرح کی دائمی راحت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے ہر طرح کا عذاب مقرر ہے۔

پھر خلاف ورزی کرنے والے مجرم کو سزا دینے کے لئے اس کا ذاتی علم محیط کافی تھا جو عالم کے ذرّہ ذرّہ پر حاوی ہے اور اس کے لئے کھلے اور چھپے ہوئے تمام اعمال و افعال بلکہ دلوں میں پوشیدہ ارادے تک بالکل ظاہر ہیں اس لئے کوئی

ضرورت نہ تھی کہ نگران مقرر کئے جائیں، اعمال نامے لکھے جائیں، اعمال تولے جائیں اور گواہ کھڑے کئے جائیں۔

لیکن اُسی نے خالص اپنے فضل و کرم سے یہ بھی چاہا کہ کسی کو اس وقت تک سزا نہ دیں جب تک دستاویزی ثبوت اور ناقابلِ انکار شہادتوں سے اس کا جرم اس کے سامنے اِس طرح کھل کر نہ آجائے کہ وہ خود بھی اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کرلے اور اپنے آپ کو مستحقِ سزا سمجھ لے۔

اس کے لئے ہر انسان کے ساتھ اس کے ہر عمل اور قول کو لکھنے والے فرشتے مقرر فرما دیئے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ (ق) یعنی کوئی کلمہ انسان کی زبان سے نہیں نکلتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگرانی کرنے والا فرشتہ مقرر نہ ہو، اور فرمایا وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ (القمر) یعنی انسان کا ہر چھوٹا بڑا کام لکھا ہوا ہے۔

پھر محشر میں میزانِ عدل قائم فرما کر انسان کے اعمال نیک و بد کو تولا جائے گا، اگر نیکیوں کا پلّہ بھاری ہو گیا تو نجات پائے گا اور گناہوں کا پلّہ بھاری ہو گیا تو گرفتارِ عذاب ہوگا۔

اس کے علاوہ جب احکم الحاکمین کا دربار عام محشر میں قائم ہوگا تو ہر ایک کے عمل پر شہادتیں بھی لی جائیں گی بعض مجرم گواہوں کی تکذیب کریں گے تو اس کے ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح سے اور اس زمین و مکان سے جس میں یہ افعال کئے گئے گواہی لی جائے گی وہ سب بحکمِ خداوندی گویا ہو کر صحیح صحیح واقعات بتلا دیں گے یہاں تک کہ مجرمین کو انکار و تکذیب کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا وہ اعتراف و اقرار کریں گے فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۱﴾ [۱] (الملک)

پھر رءوف و رحیم مالک نے اس نظام عدل و انصاف کے قائم کرنے ہی پر اکتفاء نہیں فرمایا، اور دنیا کی حکومتوں کی طرح نرا ایک ضابطہ اور قانون ان کو نہیں دے دیا بلکہ قانون کے ساتھ ایک نظامِ تربیت قائم کیا۔

جیسے بلاتشبیہ کے کوئی شفیق باپ اپنے گھریلو معاملات کو درست رکھنے اور اہل و عیال کو تہذیب و ادب سکھانے کے لئے کوئی گھریلو قانون اور ضابطہ بناتا ہے کہ جو شخص اس کے خلاف کرے گا اس کو سزا ملے گی، مگر اس کی شفقت و عنایت اس کو اس پر بھی آمادہ کرتی ہے کہ ایسا انتظام کرے جس کے سبب ان میں سے کوئی سزا کا مستحق نہ ہو بلکہ سب کے سب اُس ضابطہ کے مطابق چلیں، بچہ کے لئے اگر صبح کو اسکول جانے کی ہدایت اور اس کے خلاف کرنے پر سزا مقرر کر دی ہے تو باپ سویرے اس کی بھی فکر کرتا ہے کہ بچہ اس کام کے لئے وقت سے پہلے تیار ہو جائے۔

ربُّ العالمین کی رحمت اپنی مخلوق پر ماں اور باپ کی شفقت و رحمت سے کہیں زائد ہے اِس لئے اس نے اپنی کتاب کو محض قانون اور تعزیرات نہیں بنایا بلکہ ایک ہدایت نامہ بنایا ہے اور ہر قانون کے ساتھ ایسے طریقے بھی سکھائے ہیں جن کے ذریعہ قانون پر عمل سہل ہو جائے۔

---

[۱] ترجمہ: غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے، سو اہل دوزخ پر لعنت ہے۔

اِسی نظامِ ربوبیت کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ ہر قوم اور ہر فرد کو غفلت سے بیدار کرنے اور اپنے ربّ کریم کو یاد کرنے کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کئے، زمین وآسمان کی تمام مخلوقات اور دن رات کے تغیرات اور خود انسان کے اپنے وجود کی کائنات میں اپنی یاد دِلانے والی ایسی نشانیاں رکھ دیں کہ اگر ذرا بھی ہوش سے کام لے تو کسی وقت اپنے مالک کو نہ بھولے، وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) یعنی زمین میں اہلِ بصیرت کے لئے ہماری نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے۔

اِسی طرح غافل انسان کو بیدار کرنے اور عملِ صالح پر لگانے کے لئے ایک انتظام ربُّ العالمین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ افراد اور جماعتوں اور قوموں سے مختلف اوقات اور حالات میں اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عہد و پیمان لے کر ان کو قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا گیا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں بہت سے معاہدات و مواثیق کا ذِکر کیا گیا ہے جو مختلف جماعتوں سے مختلف اوقات و حالات میں لئے گئے، انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا کہ جو کچھ ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے پیغام رسالت ملے وہ اپنی اپنی امتوں کو ضرور پہنچادیں گے، اِس میں ان کے لئے کسی کا خوف اور لوگوں کی ملامت و توہین کا اندیشہ حائل نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی اِس مقدس جماعت نے اپنے اس معاہدہ کا پورا حق ادا کردیا، پیغامِ رسالت کے پہنچانے میں اپنا سب کچھ قربان کردیا۔

اِسی طرح ہر رسول و نبی کی امت سے اس کا معاہدہ لیا گیا کہ وہ اپنے اپنے انبیاء کا اتباع کریں گے، پھر خاص خاص اہم معاملات میں خصوصیت کے ساتھ اس کے پورا کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کا عہد لیا گیا، جس کو کسی نے پورا کیا کسی نے نہیں کیا۔

انہی معاہدات میں سے ایک اہم معاہدہ وہ ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام سے ہمارے رسول کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا گیا کہ سب انبیاء نبیِ اُمّی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں گے، اور جب موقع پائیں گے ان کی مدد کریں گے جس کا ذِکر اِس آیت میں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ [1] (آل عمران:۸۱)

یہ تمام عہود و مواثیق حق تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کے مظاہر ہیں اور مقصد ان کا یہ ہے کہ انسان جو کثیر النسیان ہے اکثر اپنے فرائض کو بھول جاتا ہے، اس کو بار بار ان معاہدات کے ذریعہ ہوشیار کیا گیا تاکہ وہ ان کی خلاف ورزی کرکے تباہی میں نہ پڑ جائے۔

[1] ترجمہ: اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اُس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔

بیعت لینے کی حقیقت

انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی سنتِ الٰہیہ کا اِتباع ہے، خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے معاملات میں صحابہ کرامؓ سے بیعت لی، جن میں سے بیعتِ رضوان کا تذکرہ قرآنِ کریم میں اِن الفاظ کے ساتھ موجود ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:۱۸) یعنی اللہ راضی ہوگیا ان لوگوں سے جنہوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ہجرت سے پہلے انصارِ مدینہ کی بیعتِ عقبہ بھی اِسی قسم کے معاہدات میں سے ہے۔

بہت سے صحابہ کرامؓ سے ایمان اور عملِ صالح کی پابندی پر بیعت لی۔ صوفیائے کرام میں جو بیعت مروّج ہے وہ بھی ایمان اور عملِ صالح کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کا عہد ہے اور اسی سنت اللہ اور سنت الانبیاء کا اتباع ہے، اسی وجہ سے اس میں خاص برکات ہیں کہ اِنسان کو گناہوں سے بچنے اور احکامِ شرعیہ بجالانے کی ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے، بیعت کی حقیقت معلوم ہونے سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جس طرح کی بیعت عام طور پر ناواقف جاہلوں میں رواج پا گئی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے ہی کو نجات کے لئے کافی سمجھ بیٹھتے ہیں، یہ سراسر جہالت ہے، بیعت ایک معاہدہ کا نام ہے، اس کا فائدہ جبھی ہے جب اس معاہدہ کو عملاً پورا کیا جائے ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔

سورۂ اَعراف کی گزشتہ آیات میں ان معاہدات کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے اَحکامِ تورات کی پابندی کے سلسلے میں لئے گئے تھے، مذکورالصدر آیات میں اس عالمگیر معاہدہ کا بیان ہے جو تمام اولادِ آدم سے اس عالَمِ دنیا میں آنے سے بھی پہلے ازل میں لیا گیا جو عام زبانوں پر عہدِ الست کے نام سے معروف و مشہور ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ الآیۃ، اِن آیتوں میں اولادِ آدم کے لئے لفظِ ذرّیت استعمال فرمایا ہے، امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ یہ لفظ دراصل لفظ ذرء سے مشتق ہے جس کے معنٰی ہیں پیدا کرنے کے، قرآنِ کریم میں کئی جگہ یہ لفظ اِس معنٰی کے لئے استعمال ہوا ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا [۱] [۲] (الاعراف:۱۷۹) وغیرہ، اِس لئے ذرّیت کا لفظی ترجمہ مخلوق کا ہوا، اِس لفظ سے اشارہ کردیا گیا کہ یہ عہد ان تمام لوگوں کے لئے عام و شامل تھا جو آدم علیہ السلام کے واسطہ سے اس دنیا میں پیدا کئے جائیں گے۔

روایاتِ حدیث میں اس عہدِ ازل کی مزید کچھ تفصیلات آئی ہیں:

امام مالکؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور امام احمدؒ نے بروایت مسلم بن یسار نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت فاروقِ اعظمؓ

[۱] ترجمہ: اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے۔

[۲] مفردات القرآن للأصفهاني ج:۱ ص:۱۷۸

سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ سے جو جواب میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دستِ قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک اِنسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے تو فرمایا کہ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دستِ قدرت پھیرا تو جتنے گناہگار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا اور فرمایا کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخ میں جانے ہی کے کام کریں گے۔

صحابہؓ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی متعین کردیئے گئے تو پھر عمل کس مقصد کے لئے کرایا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو وہ اہلِ جنت ہی کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہلِ جنت کا کام ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہلِ جہنم کا کام ہے۔'' [۱]

مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو معلوم نہیں کہ وہ کس طبقہ میں داخل ہے تو اس کو اپنی توانائی اور قدرت و اختیار ایسے کاموں میں خرچ کرنا چاہئے جو اہلِ جنت کے کام ہیں اور یہی امید رکھنا چاہئے کہ وہ انہی میں سے ہوگا۔

اور امام احمدؒ کی روایت میں یہی مضمون بروایت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ منقول ہے، اس میں اتنا اور زیادہ ہے کہ پہلی مرتبہ جو لوگ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلے وہ سفید رنگ کے تھے جن کو اہلِ جنت فرمایا، اور دوسری مرتبہ سیاہ رنگ کے تھے جن کو اہلِ جہنم قرار دیا۔ [۲]

اور ترمذی میں یہی مضمون بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اس طرح قیامت تک پیدا ہونے والی اولادِ آدم جو ظہور میں آئی ان میں سے ہر ایک کی پیشانی پر ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ [۳]

اب غور طلب یہ ہے کہ ان احادیث میں تو ذرّیت کو آدم علیہ السلام کی پشت سے لینے اور نکالنے کا ذکر ہے اور قرآنِ کریم کے الفاظ میں بنی آدم یعنی اولادِ آدم کی پشت سے نکالنا مذکور ہے ___ تطبیق اس کی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی

---

[۱] موطا مالکؒ، رقم الحدیث:۱۶۲۷ کتاب القدر باب النهی عن القول بالقدر، و سنن ابی داوٗد، کتاب السنة، باب فی القدر ج:۲ ص:۶۴۷، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الأعراف ج:۲ ص:۱۳۸، ومسند احمد، مسند عمر بن الخطاب رضی الله عنه رقم الحدیث:۳۱۸

[۲] مسند احمد ومن حدیث ابی الدرداء رضی الله عنه رقم الحدیث:۲۸۲۵۰

[۳] جامع الرمذی، ابواب التفسیر، باب سورة الأعراف ج:۲ ص:۱۳۸

پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلا واسطہ آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے، پھر ان کی نسل کی پشت سے دوسروں کو اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولادِ آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کی پشتوں سے نکالا گیا۔

حدیث میں سب کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کو پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو ترتیب وار پیدا کیا گیا۔

قرآن مجید میں اس سب ذرّیتِ آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لینے میں اس کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ ذرّیتِ آدم جو اس وقت پشتوں سے نکالی گئی تھی صرف ارواح نہیں تھیں بلکہ روح اور جسم کا ایسا مرکب تھا جو جسم کے لطیف ترین ذرات سے بنایا گیا تھا، کیونکہ ربوبیت اور تربیت کی ضرورت زیادہ تر وہی ہوتی ہے جہاں جسم و روح کا مرکب ہو اور جس کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف ترقی کرنا ہو، ارواح کی یہ شان نہیں وہ تو اول سے آخر تک ایک ہی حال پر ہوتی ہیں، اس کے علاوہ احادیثِ مذکورہ میں جو ان کے رنگ سفید و سیاہ مذکور ہیں یا ان کی پیشانی کی چمک مذکور ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف روح بلا جسم نہیں تھی ورنہ رُوح کا تو کوئی رنگ نہیں ہوتا، جسم ہی کے ساتھ یہ اوصاف متعلق ہوتے ہیں۔

اور اس پر کوئی تعجب نہ کیا جائے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسان ایک جگہ میں کس طرح سما گئے، کیونکہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیثِ مذکور میں اس کی بھی تصریح ہے کہ اس وقت جو ذریت پشتِ آدم علیہ السلام سے نکالی گئی تھی وہ اپنے اس ڈیل ڈول کے ساتھ نہیں تھی جس میں وہ دنیا میں آئیں گے بلکہ چھوٹی چیونٹی کے جثہ میں تھی، اور سائنس کی اِس ترقی کے زمانہ میں تو کسی سمجھ دار انسان کو کوئی اشکال اس میں ہونا ہی نہیں چاہئے کہ اِتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ایک چیونٹی کے جثہ میں کیسے ظاہر ہوا، آج تو ایٹم کے اندر تمام نظامِ شمسی کے موجود ہونے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، فلم کے ذریعہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک نقطہ کی مقدار دکھلایا جا سکتا ہے، اس لئے یہ کیا مشکل ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عہد و میثاق کے وقت تمام بنی آدم کو بہت چھوٹے جثہ میں وجود عطا فرمایا ہو۔

عہدِ ازل کے متعلق چند سوال و جواب

اِس عہدِ ازل کے متعلق چند چیزیں اور قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ عہد و اقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا؟

دوسرے یہ کہ جب اقرار اس حال میں لیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا انسان پیدا ابھی نہ ہوا تھا تو ان کو یہ عقل و علم کیسے حاصل ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اس کے ربّ ہونے کا اقرار کریں، کیونکہ ربوبیت کا اقرار وہ کر سکتا ہے

جس نے شانِ تربیت کا مشاہدہ کیا ہو اور یہ مشاہدہ اس دنیا میں پیدا ہونے کے بعد ہی ہوسکتا ہے؟

پہلا سوال کہ یہ عہد واقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا، اس کے متعلق مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت بسند قوی امام احمدؒ، نسائیؒ اور حاکمؒ نے نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ عہد واقرار اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا، اور مقام اس اقرار کا وادیٔ نعمان ہے جو میدانِ عرفات کے نام سے معروف ومشہور ہے۔ (تفسیر مظہری) [1]

رہا دوسرا سوال کہ یہ نئی مخلوق جس کو ابھی وجود عنصری بھی پوری طرح عطا نہیں ہوا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا اور پروردگار ہے، ایسی حالت میں ان سے سوال کرنا بھی ایک قسم کی ناقابلِ برداشت تکلیف ہے، اور وہ جواب بھی کیا دے سکتے ہیں ـــــ اِس کا جواب یہ ہے کہ خالقِ کائنات جس کی قدرتِ کاملہ نے تمام انسانوں کو ایک ذرّہ کی صورت میں پیدا فرمایا اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے اس نے ان کو عقل وفہم اور شعور وادراک بھی اس وقت بقدرِ ضرورت دے دیا ہو، اور یہی حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اس مختصر وجود میں انسان کے تمام قویٰ کو جمع فرما دیا تھا جن میں سب سے بڑی قوت عقل وشعور کی ہے۔

اِنسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی عظمت وقدرت کی وہ بے شمار نشانیاں ہیں جن پر ذرا بھی غور کرنے والا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے غافل نہیں رہ سکتا، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے، وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (الذاریات) یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے، اور خود تمہارے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے۔

یہاں ایک تیسرا سوال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ازلی عہد و پیمان کتنا ہی یقینی اور صحیح کیوں نہ ہو مگر کم از کم یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا تو پھر عہد کا فائدہ کیا ہوا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو اسی نوعِ بنی آدم میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے، حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ یہ عہد ومیثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں، اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذونادر کے درجہ میں ہیں، اس لئے عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں،

---

[1] التفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۳ ص:۴۲۸، ومسند احمد مسند عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما رقم الحدیث: ۲۴۹۹، ومستدرك للحاکم رقم الحدیث: ۳۹۵۹

یہ عہد واقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفتِ حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو، اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت وعظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو، وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہوکر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہوگیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دُھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، پھر چاہے مادّی خواہشات میں مبتلا ہوکر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ وفی بعض الروایات علی هٰذِهِ الْمِلَّةِ (اخرجه البخاری ومسلم)۔[1] یعنی ہر پیدا ہونے والے دینِ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستے سے دُور لے گئے۔[2]

اِسی طرح بالخاصہ اثر رکھنے والے بہت سے اعمال واقوال ہیں جو اس دنیا میں بھی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جاری ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور یاد رکھے یا نہ رکھے وہ بہرحال اپنا کام کرتے اور اپنا اثر دکھلاتے ہیں۔

مثلاً بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت وتکبیر کہنے کی جو سنت، جو ہر مسلمان جانتا ہے اور بحمد اللہ پورے عالَمِ اسلام میں جاری ہے، اگرچہ بچہ نہ کلمات کے معنی سمجھتا ہے نہ اس کو بڑا ہونے کے بعد یاد رہتا ہے کہ میرے کان میں کیا الفاظ کہے گئے تھے، اس کی حکمت یہی تو ہے کہ اس کے ذریعہ اس اقرارِ ازلی کو قوت پہنچا کر کانوں کی راہ سے دِل میں ایمان کی تخم ریزی کی جاتی ہے، اور اسی کا یہ اثر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بڑا ہونے کے بعد اگرچہ یہ اسلام اور اسلامیات سے کتنا ہی دور ہو جائے مگر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور مسلمانوں کی فہرست سے الگ ہونے کو انتہائی بُرا سمجھتا ہے، اسی طرح جو لوگ قرآن کی زبان نہیں جانتے ان کو بھی تلاوتِ قرآن کا حکم شاید اسی حکمت پر مبنی ہے کہ اس سے بھی کم ازکم یہ مخفی فائدہ ضرور پہنچ جاتا ہے کہ انسان کے قلب میں نورِ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

اِسی لئے آخرِ آیت میں ارشاد فرمایا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (۱۷۲) یعنی یہ اقرار ہم نے اس

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین ج:۱ ص:۱۸۵، وصحیح مسلم، کتاب القبور، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة إلخ ج:۲ ص:۳۳۶

[2] صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنة إلخ ج:۲ ص:۳۸۵

لئے لیا ہے کہ تم قیامت کے دِن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل تھے اشارہ اِس بات کی طرف ہے کہ اس ازلی سوال وجواب سے تمہارے دِلوں میں ایمان کی بنیاد ایسی قائم ہوگئی کہ ذرا بھی غور وفکر سے کام لوتو اللہ جل شانہٗ کی ربوبیت کے اِعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

اس کے بعد دُوسری آیت میں ارشاد فرمایا، اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے بھی لیا ہے کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ عذر نہ کرنے لگو کہ شرک وبت پرستی تو دراصل ہمارے بڑوں نے اِختیار کرلی تھی اور ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے، کھرے کھوٹے اور صحیح غلط کو نہیں پہچانتے تھے اس لئے بڑوں نے جو کچھ کیا ہم نے بھی اسی کو اختیار کرلیا تو بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں دی جائے۔ حق تعالیٰ نے بتلادیا کہ دوسروں کے فعل کی سزا تم کو نہیں دی گئی بلکہ خود تمہاری غفلت کی سزا ہے کیونکہ اس اقرارِ ازلی نے اِنسان میں ایک ایسی عقل وبصیرت کا تخم ڈال دیا تھا کہ ذرا بھی غور وفکر سے کام لیتا تو اِتنی بات سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ پتھر کے بت جن کو ہم نے اپنے ہاتھوں تراشا ہے، یا آگ اور پانی، اور درخت یا کوئی انسان، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو کوئی انسان اپنا پیدا کرنے والا اور پروردگار یا حاجت روا مشکل کُشا یقین کرسکے۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح آیا ہے، وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ یعنی ہم اسی طرح اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کیا کرتے ہیں تاکہ لوگ غفلت اور کجروی سے باز آجائیں، مراد یہ ہے کہ آیاتِ الٰہیہ میں ذرا بھی غور کریں تو وہ اس عہد ومیثاق کی طرف لوٹ آئیں جو ازل میں کیا گیا تھا یعنی اللہ جل شانہٗ کی ربوبیت کا اعتراف کرنے لگیں اور اس کے نتیجہ میں اس کی اطاعت کو لازم سمجھیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ

اور سنادے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا پھر اس کے پیچھے لگا شیطان

فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ

تو وہ ہوگیا گمراہوں میں اور ہم چاہتے تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت، لیکن وہ تو ہو رہا زمین کا

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ

اور پیچھے ہولیا اپنی خواہش کے تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کُتا، اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے

اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

اور چھوڑ دے تو ہانپے یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلًا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ

سو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ دھیان کریں بری مثال ہے ان لوگوں کی کہ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے رسول!) ان کو اُس شخص کا واقعہ پڑھ کر سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائیں، مگر وہ اُن کو بالکل ہی چھوڑ نکلا، پھر شیطان اُس کے پیچھے لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا۔ ﴿۱۷۵﴾ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اُسے سربلند کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا، اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا رہا، اس لئے اُس کی مثال اُس کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تم اُس پر حملہ کرو تب بھی وہ زبان لٹکا کر ہانپے گا، اور اگر اُسے (اُس کے حال پر) چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکا کر ہانپے گا۔ یہ ہے مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے۔ لہٰذا تم یہ واقعات ان کو سناتے رہو، تاکہ یہ کچھ سوچیں ﴿۱۷۶﴾ کتنی بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، اور جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں! ﴿۱۷۷﴾

خلاصہ تفسیر

اور ان لوگوں کو (عبرت کے واسطے) اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے کہ اس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں (یعنی اَحکام کا علم دیا) پھر وہ ان (آیتوں) سے بالکل ہی نکل گیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہوگیا، اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں (کے مقتضا پر عمل کرنے) کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے (یعنی اگر وہ ان آیتوں پر عمل کرتا جس کا وابستۂ قضاء وقدر ہونا امر معلوم ہے تو اس کا رتبۂ قبول بڑھتا) لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور (اِس میلان کے

سبب) اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا (اور آیات و اَحکام پر عمل چھوڑ دیا) سو (آیات کو چھوڑ کر جو پریشانی اور ذلت دائمی اس کو نصیب ہوئی اس کے اعتبار سے) اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (اور مار کر نکال دے) تب بھی ہانپے یا اس کو (اس کی حالت) پر چھوڑ دے تب بھی ہانپے (کسی حالت میں اس کو راحت نہیں، اسی طرح یہ شخص ذلت میں تو کتے کے مشابہ ہوگیا اور پریشانی میں کتے کی اِس صفت میں شریک ہوا پس جیسی اس شخص کی حالت ہوئی) یہی حالت (عام طور پر) ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو (جو کہ توحید و رسالت پر دال ہیں) جھٹلایا (کہ وضوحِ حق کے بعد محض ہویٰ پرستی کے سبب حق کو ترک کرتے ہیں) سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ (اس کو سن کر) کچھ سوچیں، (حقیقت میں) ان لوگوں کی حالت بھی بُری حالت ہے جو ہماری آیات (دالّہ علی التوحید والرسالۃ) کو جھٹلاتے ہیں اور (اس تکذیب سے) وہ اپنا (ہی) نقصان کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں بنی اِسرائیل کا ایک عبرت ناک قصہ مذکور ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم اور مشہور مقتدا کا علم و معرفت کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے بعد دفعۃً گمراہ و مردود ہو جانے کا واقعہ مع اس کے اسباب کے بیان کیا گیا ہے اور اس میں بہت سی عبرتیں ہیں۔

اور مناسبت اس واقعہ کی پچھلی آیتوں سے یہ ہے کہ ان میں عہد و میثاق کا ذِکر تھا جو ازل میں حق تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اور پھر خاص خاص حالات میں خاص خاص اقوام یہود و نصاریٰ وغیرہ سے لئے تھے، اور مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر آیا تھا کہ عہد کرنے والوں میں بہت سے لوگ اس عہد پر قائم نہیں رہے، جیسے یہود کہ حضرت خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آپ کے آنے کا انتظار کرتے اور آپ کی صفات و شمائل لوگوں سے بیان کیا کرتے اور ان کی تصدیق کیا کرتے تھے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دُنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے سے باز رہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عالم مقتدا کی گمراہی کا عبرتناک واقعہ

ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے یہ واقعہ پڑھ کر سنایئے جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم و عارف اور مشہور پیشوا کا ایسا ہی حال عروج کے بعد تنزّل اور ہدایت کے بعد گمراہی کا مذکور ہے کہ وسیع علم اور پوری معرفت حاصل ہونے کے باوجود، جب نفسانی اغراض اس پر غالب آئیں تو یہ سب علم و معرفت اور

مقبولیت ختم ہو کر گمراہ اور ذلیل وخوار ہو گیا۔

قرآنِ کریم میں اس شخص کا نام اور کوئی تشخص مذکور نہیں، ائمہ تفسیر صحابہؓ و تابعین سے اس کے بارے میں مختلف روایتیں مذکور ہیں، جن میں زیادہ مشہور اور جمہور کے نزدیک قابلِ اعتماد روایت وہ ہے جو حضرت ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ اس شخص کا نام بلعم بن باعوراء ہے یہ ملکِ شام میں بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا، اور ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا، اللہ تعالیٰ کی بعض کتابوں کا علم اس کو حاصل تھا، قرآنِ کریم میں جو اس کی صفت میں الَّذِیٓ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فرمایا ہے اس سے اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

جب غرقِ فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قومِ جبّارین سے جہاد کرنے کا حکم ملا اور جبّارین نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کا لشکر لے کر پہنچ گئے اور ان کے مقابل قومِ فرعون کا غرق وغارت ہونا ان کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا تو ان کو فکر ہوئی اور جمع ہو کر بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سخت آدمی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے لشکر ہیں اور وہ اس لئے آئے ہیں کہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دیں، آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ان کو ہمارے مقابلہ سے واپس کر دیں، وجہ یہ تھی کہ بلعم بن باعوراء کو اسم اعظم معلوم تھا وہ اس کے ذریعہ جو دُعا کرتا تھا قبول ہوتی تھی۔

بلعم نے کہا افسوس ہے تم کیسی بات کہتے ہو، وہ اللہ کے نبی ہیں ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں میں ان کے خلاف بددعا کیسے کر سکتا ہوں حالانکہ ان کا مقام جو اللہ کے نزدیک ہے وہ بھی میں جانتا ہوں اگر ایسا کروں گا تو میرا دین دنیا دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا تو اس پر بلعم نے کہا کہ اچھا میں اپنے ربّ سے اس معاملہ میں معلوم کر لوں کہ ایسی دعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں، اس نے اپنے معمول کے مطابق معلوم کرنے کے لئے استخارہ یا کوئی عمل کیا، خواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے، اس نے قوم کو بتلا دیا کہ مجھے بددعا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، اس وقت قومِ جبّارین نے بلعم کو کوئی بڑا ہدیہ پیش کیا جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کر لیا تو پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ آپ ضرور یہ کام کر دو اور اِلحاح واصرار کی حد نہ رہی، بعض روایات میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ یہ رشوت قبول کر لیں اور ان کا کام کر دیں، اس وقت بیوی کی رضا جوئی اور مال کی محبت نے اس کو اندھا کر دیا تھا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بدُدعا کرنا شروع کی۔

اس وقت قدرتِ الٰہیہ کا عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ وہ جو کلمات بدُدعا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لئے کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ الفاظ بدُدعا خود اپنی قوم جبارین کے لئے نکلے، وہ چلّا اٹھے کہ تم تو ہمارے لئے

بددُعا کر رہے ہو، بلعم نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھی تباہی نازل ہوئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کہ اس کی زبان اس کے سینہ پر لٹک گئی، اور اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میری تو دُنیا و آخرت تباہ ہوگئی اب دُعا تو میری چلتی نہیں لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آسکتے ہو۔

وہ یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان کو یہ تاکید کردو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ان کے ساتھ جو کچھ کریں کرنے دیں، رکاوٹ نہ بنیں، یہ لوگ مسافر ہیں، اپنے گھروں سے مدت کے نکلے ہوئے ہیں، اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلا ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام کاری انتہائی مبغوض چیز ہے، جس قوم میں یہ ہو، اس پر ضرور قہر و عذاب نازل ہوتا ہے، وہ فاتح و کامران نہیں ہوسکتی۔

بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آگئی، اس پر عمل کیا گیا، بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہوگیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس وبال سے روکا مگر وہ باز نہ آیا، اور شیطانی جال میں مبتلا ہوگیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون پھیلا جس سے ایک روز میں ستر ہزار اسرائیلی مرگئے، یہاں تک کہ جس شخص نے بُرا کام کیا تھا اس جوڑے کو بنی اسرائیل نے قتل کر کے منظرِ عام پر ٹانگ دیا کہ سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو، اور توبہ کی، اس وقت یہ طاعون رفع ہوا۔ [1]

قرآن مجید کی مذکور الصدر آیات میں اس کے متعلق فرمایا فَانْسَلَخَ مِنْهَا یعنی ہم نے اپنی آیات اور ان کا علم و معرفت اس شخص کو عطا کیا تھا لیکن وہ اس سے نکل گیا، انسلاخ کا لفظ اصل میں جانور کے کھال کے اندر سے یا سانپ کا کیچلی کے اندر سے نکل جانے کے لئے بولا جاتا ہے، اِس جگہ علمِ آیات کو ایک لباس یا کھال کے ساتھ تشبیہ دے کر یہ بتلایا گیا کہ یہ شخص علم و معرفت سے بالکل جدا ہوگیا، فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ یعنی پیچھے لگ گیا اس کے شیطان، مطلب یہ ہے کہ جب تک علمِ آیات اور ذکر اللہ اس کے ساتھ تھا، شیطان کا قابو اس پر نہ چل سکتا تھا جب وہ جاتا رہا تو شیطان اس پر قابو یافتہ ہوگیا فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ یعنی پھر ہوگیا وہ گمراہوں میں سے، مطلب یہ ہے کہ شیطان کے قابو میں آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں شامل ہوگیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ یعنی اگر ہم چاہتے تو انہی آیات کے ذریعہ اس کو بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگا، لفظ اَخْلَدَ، اِخْلَاد سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف میلان کے یا کسی جگہ کو لازم پکڑنے کے اور اَرْض

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۹ ص:۱۱۲، والبغوی تحت هذه الآیة رقم الحدیث:۱۷۵

کے اصلی معنی زمین کے ہیں، دُنیا کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب یا خود زمین ہے یا زمین سے متعلق گھر، جائیداد، کھیتی، باغ وغیرہ ہیں، یا زمین سے ہی پیدا ہونے والی کروڑوں چیزیں ہیں جو انسان کی زندگی اور عیش کا مدار ہیں، اس لئے لفظ اَرْض بول کر اس جگہ پوری دنیا مراد لی گئی ہے، اس آیت میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ آیاتِ الٰہیہ اور ان کا علم ہی اصل میں سربلندی اور ترقی کا سبب ہیں، لیکن جو شخص ان آیات کا احترام نہ کرے اور دنیا کی ذلیل خواہشات کو آیاتِ الٰہیہ پر مقدم جانے اس کے لئے یہی علم ایک وبال بن جاتا ہے۔

اسی وبال کا ذکر آیت میں اس طرح کیا گیا ہے فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۚ لفظ لہث کے اصل معنی یہ ہیں کہ زبان نکال کر سختی کے ساتھ سانس لیا جائے۔

ہر جاندار اپنی زندگی میں اس کا محتاج ہے کہ اندر کی گرم اور زہریلی ہوا کو باہر پھینکے اور باہر سے تازہ ہوا حلق اور ناک کے راستہ سے اندر لے جائے، اسی پر جاندار کی زندگی کا مدار ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے لئے اس اہم کام کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ بلا ارادہ اور بلا محنت اس کی ناک کے نتھنوں سے اندر کی ہوا باہر اور باہر کی تازہ ہوا اندر جاتی ہے، اس میں نہ اس کو کوئی زور لگانا پڑتا ہے نہ کسی اختیاری عمل کی ضرورت پڑتی ہے، قدرتی اور فطری طور پر یہ کام مسلسل خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

جانداروں میں صرف کتا ایسا جانور ہے جس کو اپنے سانس کی آمد و رفت میں زبان نکال کر زور لگانا اور محنت کرنا پڑتی ہے، اور دوسرے جانوروں کی یہ کیفیت صرف اس وقت ہوتی ہے جبکہ ان پر کوئی حملہ کرے یا وہ تھک جائیں یا کوئی اتفاقی محنت ان پر پڑ جائے۔

قرآنِ کریم نے اس شخص کی کتے کے ساتھ مثال دی، وجہ یہ ہے کہ حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کی اس کو یہ سزا ملی تھی کہ زبان منہ سے نکل کر سینہ پر لٹک گئی تھی اور وہ برابر کتے کی طرح ہانپتا تھا خواہ کوئی اس پر حملہ کرے یا نہ کرے وہ ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا، ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ یعنی یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مراد اس سے اہل مکہ ہیں جو ہمیشہ سے یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس کوئی ہادی اور رہبر آئے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف بلائے اور طاعت کے صحیح طریقے سکھائے، پھر جب وہ رہبر آگئے اور ایسی کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے کہ ان کے صدق و حقانیت میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تو ان کی تکذیب کرنے اور آیاتِ الٰہیہ سے روگردانی کرنے لگے۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جو بعثتِ نبوی سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی علامات وخصوصیات تورات میں پڑھ کر لوگوں کو بتلایا کرتے اور آپ کی تشریف آوری کا انتظار کیا کرتے تھے، مگر جب آپ تشریف لائے تو سب سے زیادہ دشمنی اور مخالفت انہی لوگوں نے کی اور تورات کے احکام سے ایسے صاف نکل گئے جیسے بلعم بن باعوراء نکل گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ یعنی آپ اس شخص کا واقعہ ان لوگوں کو سنا دیجئے، شاید یہ کچھ سوچیں اور اس کے واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلانے والوں کا بُرا حال ہے اور یہ لوگ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔

آیاتِ مذکورہ اور ان میں بیان کئے ہوئے واقعہ میں اہلِ فکر کے لئے بہت سے فوائد اور عبرتیں اور نصیحتیں ہیں:

اوّل یہ کہ کسی شخص کو اپنے علم وفضل اور زہد وعبادت پر ناز نہیں کرنا چاہئے، حالات بدلتے اور بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی، جیسے بلعم بن باعوراء کا حشر ہوا، طاعت وعبادت کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دُعا اور اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔

دُوسرے یہ کہ ایسے مواقع اور ان کے مقدمات سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہئے جہاں اس کو اپنے دین کی خرابی کا اندیشہ ہو، خصوصاً مال اور اہل وعیال کی محبت میں اس انجامِ بد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

تیسرے یہ کہ مفسد اور گمراہ لوگوں کے ساتھ تعلق اور ان کا ہدیہ یا دعوت وغیرہ قبول کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے، بلعم اس بلاء میں ان کا ہدیہ قبول کرنے کے سبب مبتلا ہوا۔

چوتھے یہ کہ بے حیائی اور حرام کاری پوری قوم کے لئے تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہے، جو قوم اپنے آپ کو بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہے اس پر لازم ہے کہ اپنی قوم کو بے حیائی کے کاموں سے پورے اہتمام کے ساتھ روکے ورنہ خدا تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہوگا۔

پانچویں یہ کہ آیاتِ الٰہیہ کی خلاف ورزی خود بھی ایک عذاب ہے اور اس کی وجہ سے شیطان اس پر غالب آکر ہزاروں خرابیوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علمِ دین عطا کیا ہو اُس کو چاہئے کہ اس کی قدر کرے اور اصلاحِ عمل کی فکر سے کسی وقت فارغ نہ ہو۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

جس کو اللہ رستہ دے وہ ہی رستہ پاوے اور جس کو وہ بچلاوے سو وہی ہیں ٹوٹے میں،

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ

اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور آدمی، ان کے دل ہیں کہ

لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ

ان سے سمجھتے نہیں، اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں، اور کان ہیں کہ

لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ

ان سے سنتے نہیں، وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ،

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

وہی لوگ ہیں غافل۔

آسان ترجمۂ قرآن

جسے اللہ ہدایت دے، بس وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے، اور جسے وہ گمراہ کردے، تو ایسے ہی لوگ ہیں جو نقصان اُٹھاتے ہیں ﴿۱۷۸﴾ اور ہم نے جنات اور انسانوں میں سے بہت سے لوگ جہنم کے لئے پیدا کئے۔ اُن کے پاس دِل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، اُن کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور اُن کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ اُن سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۱۷۹﴾

خلاصۂ تفسیر

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو گمراہ کردے سو ایسے ہی لوگ (ابدی) خسارہ میں پڑجاتے ہیں (پھر ان سے توقع ہدایت کی کرنا اور ہدایت نہ ہونے سے مغموم ہونا بیکار) اور (جب وہ لوگ اپنے قویٰ مدرکہ سے کام ہی نہیں لیتے تو ہدایت کہاں سے ہو، سو ان کے نصیب میں تو دوزخ ہی ہے چنانچہ) ہم نے ایسے بہت سے جنّ اور انسان دوزخ (ہی میں رہنے) کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے (نام کو تو) دل (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (حق

بات کو) نہیں سمجھتے (چونکہ اس کا ارادہ ہی نہیں کرتے) اور جن کے (نام کو تو) آنکھیں (ہیں مگر) ایسی ہیں جن سے (نظر استدلال کے طور پر کسی چیز کو) نہیں دیکھتے اور جن کے (نام کو تو) کان (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (متوجہ ہو کر حق بات کو) نہیں سنتے (غرض) یہ لوگ (آخرت کی طرف سے بے توجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (اس حیثیت سے کہ چوپایوں کو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا مکلّف تو نہیں بنایا گیا سو ان کا متوجہ نہ ہونا مذموم نہیں اور ان کو تو اس کا حکم ہے پھر بھی بے توجہی کرتے ہیں سو اس اعتبار سے) یہ لوگ (ان چوپایوں سے بھی) زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ) یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں (بخلاف چوپایوں کے، جیسا اوپر بیان ہوا)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت کا مضمون یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے صحیح راستہ کی ہدایت کر دی وہ ہی ہدایت پانے والا ہے اور جن کو گمراہ کر دیا تو وہ ہی خسارے اور نقصان میں پڑنے والے ہیں۔

یہ مضمون قرآن مجید کی بہت سی آیات میں بار بار آیا ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اور ہر خیر و شر، اچھے بُرے کا خالق صرف اللہ جل شانہٗ ہے، انسان کے سامنے اچھے بُرے، صحیح غلط دونوں راستے کر دیئے گئے ہیں اور اس کو ایک خاص قسم کا اختیار دیا گیا ہے وہ اپنے اس اختیار کو اگر اچھے اور صحیح راستہ میں خرچ کرتا ہے تو ثواب اور جنت کا مستحق ہوتا ہے، بُرے اور غلط راستے میں لگاتا ہے تو عذاب اور جہنم میں ٹھکانا ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہدایت پانے والے کو بصیغۂ مفرد ذکر کیا گیا اور گمراہی اختیار کرنے والوں کو بصیغۂ جمع، اِس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہی دینِ حق ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء علیہم السلام کا طریق رہا ہے، اصول سب کے مشترک اور ایک ہیں، اس لئے حق کی پیروی کرنے والے خواہ کسی زمانہ میں اور کسی نبی کی امّت میں اور کسی دین و مذہب سے متعلق ہوں وہ سب ایک ہیں۔

اور گمراہی کے ہزاروں راستے الگ الگ ہیں اس لئے گمراہوں کو بصیغۂ جمع فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ فرمایا گیا۔

نیز اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ گمراہی اختیار کرنے والوں کی تو سزا اور انجامِ بد کا ذکر کیا گیا کہ وہ لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں، اس کے بالمقابل ہدایت یافتہ حضرات کی کسی خاص جزاء کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں ــــــ اِس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہدایت ایسی عظیم الشان نعمت ہے جو دین و دنیا کی ساری نعمتوں اور رحمتوں پر حاوی ہے، دُنیا میں حیاتِ طیبہ اور آخرت میں جنت کی لازوال نعمتیں سب

ہدایت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں، اس لحاظ سے ہدایت خود ایک بھاری نعمت اور بہت بڑا انعام ہے جس کے بعد اِن نعمتوں کے شمار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، جو ہدایت کے صلہ میں ملنے والی ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے کوئی بڑی حکومت وسلطنت کا مالک کسی شخص کو یہ کہہ دے کہ تم ہمارے مقرب ہو ہم تمہاری بات سنیں اور مانیں گے تو ہر جاننے والا جانتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی عہدہ ومنصب یا کوئی دولت اس کے لئے نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو ہدایت یافتہ کا خطاب دے دیا تو اس کو دین ودنیا کی ساری نعمتیں حاصل ہوگئیں، اسی لئے بزرگانِ سلف نے فرمایا کہ اللہ کا ذِکر وعبادت خود ہی اپنی جزاء اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان عطا ہے، جو شخص ذکر اللہ میں مشغول ہے وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کا اِنعام نقد پا رہا ہے، آخرت وجنت کا انعام دُوسری نعمت ہے، اسی سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے جس میں فرمایا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً (النبا:۳۶) کہ ایک ہی چیز کو جزاء بھی فرمایا گیا اور عطاء بھی، حالانکہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، جزاء کسی عمل کا معاوضہ ہوتا ہے اور عطاء بلا معاوضہ۔

اس میں جزاء وعطاء کی حقیقت بتلادی کہ جس چیز کو تم جزاء اور عمل کا بدلہ سمجھتے ہو وہ بھی درحقیقت ہماری عطاء وانعام ہی ہے کیونکہ جس عمل کا یہ بدلہ ملا ہے وہ عمل خود ہمارا انعام تھا۔

دوسری آیت میں بھی اِسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں جس کو ہدایت مل گئی اس سے سارے کام ہدایت ہی کے مناسب سرزد ہوتے ہیں ۔

خرد چون دفتر تلقین کشاید ❊ زمن آن در وجود آید کہ باید [۱]

اور جو گمراہی میں پڑگیا اس کے سارے کام اسی انداز سے ہوتے ہیں۔

اس لئے فرمایا وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ یعنی ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے بہت سے جنات اور انسانوں کو جن کی علامات یہ ہیں کہ ان کے پاس سمجھنے کے لئے قلوب اور دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سننے کے لئے کان سب کچھ موجود ہیں، جن کو وہ صحیح استعمال کریں تو صراطِ مستقیم کو پالیں اور نفع نقصان کو سمجھ لیں، لیکن ان کا یہ حال ہے کہ نہ وہ قلوب سے بات سمجھتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور نہ کانوں سے سننے کی چیزوں کو سنتے ہیں۔

اِس میں یہ بتلادیا کہ اگرچہ تقدیرِ الٰہی ایک راز سربستہ ہے جس کا کسی کو اس دنیا میں علم نہیں ہوتا لیکن اس کی علامات سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اہلِ جہنم کی علامت یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو ان کے صحیح کاموں میں نہ لائیں، صحیح علم ومعرفت کے لئے جو اللہ جل شانہٗ نے عقل اور آنکھ کان عطا فرمائے ہیں ان کو وہ بے مصرف چیزوں میں

[۱] ترجمہ: عقل جب تلقین کا دفتر کھول دیتی ہے تو پھر مجھ سے وہی کام سرزد ہوتے ہیں جو ہونے چاہئیں۔

لگاتے ہیں اور اصل مقصد جس کے ذریعہ دائمی اور لازوال راحت و دولت مل سکتی تھی اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

آیت میں کافروں سے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی جو بظاہر مشاہدہ کے خلاف ہے، کس حقیقت پر مبنی ہے؟

اِس آیت میں ان لوگوں کی سمجھ بوجھ اور بینائی و شنوائی سب چیزوں کی بالکل نفی کی گئی ہے کہ یہ نہ کچھ سمجھتے ہیں نہ کوئی چیز دیکھتے ہیں نہ کوئی کلام سنتے ہیں، حالانکہ واقعہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ پاگل و دیوانے ہوتے ہیں جو کچھ نہ سمجھیں اور نہ نابینا ہوتے ہیں کہ کچھ نہ دیکھیں اور نہ بہرے ہوتے ہیں کہ کچھ نہ سنیں، بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ دُنیا کے کاموں میں یہ اکثر لوگوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار نظر آتے ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے اندر اس کی ضرورت کے مطابق اور اس کے مقصدِ حیات کے مناسب عقل و شعور رکھا ہے، جن چیزوں کو ہم بے عقل اور بے حس و شعور کہتے اور سمجھتے ہیں در حقیقت وہ بھی حس و اِدراک اور عقل و شعور سے خالی نہیں، البتہ یہ چیزیں ان میں اسی مقدار میں ہیں جو مقدار ان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو، سب سے کم عقل و شعور اور حس جمادات یعنی مٹی اور پتھر وغیرہ میں ہے، جن کو نہ کچھ بڑھنا ہے نہ اپنی جگہ سے نکلنا اور چلنا پھرنا، وہ اتنی قلیل ہے کہ ان میں حیات کے آثار کا پہچاننا بھی بہت دشوار ہے، اُس سے کچھ زائد نباتات میں ہے جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا، پھلنا پھولنا داخل ہے، اسی کے مناسب عقل و اِدراک ان کو دے دیا گیا، اس کے بعد حیوانات کا نمبر ہے، جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا بھی داخل ہے چلنا پھرنا بھی اور چل پھر کر اپنی غذا حاصل کرنا بھی اور مضر و مہلک چیزوں سے بچنا بھاگنا بھی اور نسل پیدا کرنا بھی، اِس لئے ان کو جو عقل و شعور مِلا وہ اوروں سے زیادہ مِلا مگر اتنا ہی جس سے وہ اپنے کھانے پینے پیٹ بھرنے سونے جاگنے وغیرہ کا انتظام کرلیں اور دشمن سے اپنی جان بچالیں، سب کے بعد انسان کا نمبر ہے جس کا مقصدِ وجود سب چیزوں سے آگے یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو پہچانے، اس کی مرضی کے مطابق چلے، اس کی ناپسند چیزوں سے پرہیز کرے، ساری مخلوقات کے حقائق پر نظر ڈالے اور ان سے کام لے اور ہر چیز کے نتائج اور عواقب کو سمجھے، کھرے کھوٹے اچھے برے کو پرکھے، برائیوں سے بچے، اچھائیوں کو اختیار کرے، اسی نوعِ انسانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو ترقی کرنے کا بڑا میدان مِلا ہے جو دوسری نوع کو حاصل نہیں، یہ جب ترقی کرتا ہے تو فرشتوں کی صف سے آگے مقام پاتا ہے، اسی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اعمال و افعال پر جزا و سزا ہے، اِسی لئے اس کو عقل و شعور تمام انواعِ مخلوقات سے زائد مِلا ہے تاکہ وہ عام حیوانات کی سطح سے بلند ہوکر اپنے مقصدِ وجود کے مناسب کاموں میں لگے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مخصوص عقل و شعور اور اس کی بخشی ہوئی بینائی و شنوائی کو اسی کام میں صرف کرے۔

جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو ایک انسان کا سمجھنا، دیکھنا، سننا دوسرے جانوروں کے سمجھنے، دیکھنے، سننے سے مختلف ہونا چاہئے اگر اس نے بھی صرف انہی چیزوں میں اپنی عقل اور بینائی وشنوائی کی طاقتوں کو لگادیا جن میں دوسرے جانور لگاتے ہیں اور جو کام انسان کے لئے مخصوص تھا کہ ہر چیز کے نتائج وعواقب پر نظر رکھے اور برائیوں سے بچے بھلائیوں کو اختیار کرے، ان پر دھیان نہ دیا، اس کو باوجود عقل رکھنے کے بے عقل، باوجود بینا ہونے نابینا، باوجود سننے والا ہونے کے بہرا ہی کہا جائے گا، اسی لئے قرآن کریم نے دوسری جگہ ایسے لوگوں کو صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ (البقرۃ:۱۸) یعنی بہرے، گونگے، اندھے فرمایا ہے۔

اِس میں اس کا بیان نہیں کہ وہ اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کی ضروریات کو سمجھتے نہیں، یا یہ کہ ان کے متعلق چیزوں کو دیکھتے سنتے نہیں بلکہ خود قرآن کریم نے ان لوگوں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (الروم) یعنی یہ لوگ ظاہرِ حیاتِ دنیا کو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل وجاہل ہیں، اور فرعون وہامان اور ان کی قوموں کے بارے میں فرمایا وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝ (العنکبوت) یعنی یہ لوگ بڑے روشن خیال تھے، مگر چونکہ ان کی دانائی وبینائی کا سارا مصرف صرف اُتنا ہی رہا جتنا عام جانوروں کا ہوتا ہے کہ اپنے تن بدن کی خدمت کرلیں، روح کی خدمت اور اس کی راحت کے متعلق کچھ نہ سوچا نہ دیکھا، اس لئے وہ ان معاشیات اور عمرانیات میں کتنی ہی ترقی کرلیں، چاند اور مریخ کو فتح کرلیں، مصنوعی سیاروں سے دنیا کی فضا کو بھر دیں لیکن یہ سب خدمت صرف تن بدن کے ڈھانچہ اور پیٹ ہی کی ہے، اس سے آگے نہیں جو رُوح کے لئے دائمی چین وراحت کا سامان بنے، اِس لئے قرآن کریم ان کو اندھا بہرا کہتا ہے اور اس آیت میں ان کے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو سمجھنا چاہئے تھا وہ نہیں سمجھے جو دیکھنا چاہئے تھا وہ نہیں دیکھا جو سننا چاہئے تھا وہ نہیں سنا، اور جو کچھ سمجھا اور دیکھا اور سُنا وہ عام حیوانات کی سطح کی چیزیں تھیں جن میں گدھا گھوڑا، بیل بکری سب شریک ہیں۔

اِسی لئے آیتِ مذکورہ کے آخر میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰۤىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ کہ یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں کہ بدن کے صرف موجودہ ڈھانچہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، روٹی اور پیٹ ان کے فکر کی آخری معراج ہے، پھر فرمایا بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ بلکہ یہ لوگ چوپاؤں اور جانوروں سے بھی زیادہ بے وقوف ہیں، وجہ یہ ہے کہ جانور احکامِ شرعیہ کے مکلّف نہیں، ان کے لئے جزا وسزا نہیں، ان کا مقصد اگر صرف موجودہ زندگی اور اس کے ڈھانچہ کی درستی تک رہے تو صحیح ہے، مگر انسان کو تو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس پر جزا وسزا ہونے والی ہے، اس لئے اس کا ان کاموں کو اپنا مقصد سمجھ بیٹھنا جانوروں سے زیادہ بے وقوفی ہے، اس کے علاوہ جانور اپنے آقا ومالک کی خدمت پوری بجالاتے ہیں اور نافرمان انسان

اپنے ربّ اور مالک کی خدمت میں قصور کرتا ہے اس لئے وہ جانوروں سے زیادہ بے وقوف اور غافل ٹھہرا، اِسی لئے فرمایا
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ

اور اللہ کے لئے ہیں سب اچھے نام سو اس کو پکارو وہی نام کہہ کر اور چھوڑ دو ان کو جو کج راہ چلتے ہیں

فِیْۤ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اس کے ناموں میں، وہ بدلہ پارہیں گے اپنے کئے کا

آسان ترجمۂ قرآن

اور اسمائے حسنیٰ (اچھے اچھے نام) اللہ ہی کے ہیں۔ لہٰذا اُس کو انہی ناموں سے پکارو، اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو جو اُس کے ناموں میں ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کررہے ہیں، اُس کا بدلہ اُنہیں دیا جائے گا ﴿۱۸۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اچھے اچھے (مخصوص) نام اللہ ہی کے لئے (خاص) ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو اور (دوسروں پر ان ناموں کا اِطلاق مت کیا کرو بلکہ) ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے (مذکورہ) ناموں میں کج روی کرتے ہیں (اس طرح سے کہ غیر اللہ پر ان کا اِطلاق کرتے ہیں جیسا وہ لوگ ان کو معبود اور اِلٰہ اعتقاد کے ساتھ کہتے تھے) ان لوگوں کو ان کے کئے کی ضرور سزا ملے گی۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اہل جہنم کا ذکر تھا جنہوں نے اپنی عقل وحواس کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے سوچنے میں صرف نہیں کیا اور آخرت کی دائمی اور لازوال زندگی کے لئے کوئی سامان فراہم نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوگیا کہ وہ خداداد عقل وبصیرت کو ضائع کرکے ذِکر اللہ کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح وفلاح سے غافل ہوگئے اور جانوروں سے زیادہ گمراہی اور بے وقوفی میں مبتلا ہوگئے۔

مذکورہ آیت میں ان کے مرض کا علاج اور درد کی دوا بتلائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور ذکر اللہ کی کثرت ہے، فرمایا وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ یعنی اللہ ہی کے لئے ہیں اچھے نام، تو تم پکارو اس کو انہی ناموں سے۔

اسمائے حسنیٰ کی تشریح

اچھے نام سے مراد وہ نام ہیں جو صفاتِ کمال کے اعلیٰ درجہ پر دلالت کرنے والے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ درجہ جس سے اوپر کوئی درجہ نہ ہو سکے وہ صرف خالقِ کائنات جل وعلا شانہٗ ہی کو حاصل ہے اس کے سوا کسی مخلوق کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہر کامل سے دوسرا شخص اکمل اور فاضل سے افضل ہو سکتا ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶ (یوسف) کا یہی مطلب ہے کہ ہر ذی علم سے بڑھ کر کوئی دوسرا علیم ہو سکتا ہے۔

اسی لئے اس آیت میں ایسی عبادت اختیار کی گئی جس سے معلوم ہو کہ یہ اسمائے حسنیٰ صرف اللہ ہی کی خصوصیت ہے دوسروں کو حاصل نہیں، فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء حسنیٰ ہیں اور وہ اسماء اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو اور انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارو۔

پکارنا یا بلانا دُعا کا ترجمہ ہے، اور دُعا کا لفظ قرآن میں دو معنیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک اللہ کا ذکر، اس کی حمد وثنا، تسبیح وتمجید کے ساتھ، دوسرے حاجات ومشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرنا اور مصائب وآفات سے نجات اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا، اس آیت میں فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ کا لفظ دونوں معنیٰ کو شامل ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ حمد وثنا اور تسبیح کے لائق بھی صرف اسی کی ذات پاک ہے اور مشکلات ومصائب سے نجات اور حاجت روائی بھی صرف اسی کے قبضہ میں ہے، اس لئے حمد وثنا کرو تو اسی کی کرو اور حاجت روائی، مشکل کشائی کے لئے پکارو تو اسی کو پکارو۔

اور پکارنے کا طریقہ بھی یہ بتلا دیا کہ انہی اسمائے حسنیٰ کے ساتھ پکارو جو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں۔

دُعا کے بعض آداب

اِس لئے اس آیت سے دو ہدایتیں امت کو ملیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات حقیقی حمد وثنا یا مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے پکارنے کے لائق نہیں، دوسرے یہ کہ اس کے پکارنے کے لئے بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو الفاظ چاہے اِختیار کر لے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں وہ الفاظ بھی بتلا دیئے جو اس کے شایاں ہیں اور ہمیں پابند کر دیا کہ انہی الفاظ کے ساتھ اس کو پکاریں، اپنی تجویز سے دوسرے الفاظ نہ بدلیں، کیونکہ انسان کی قدرت نہیں کہ تمام پہلوؤں کی رعایت کر کے شایانِ شان الفاظ بنا سکے۔

بخاری ومسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ننانوے نام ہیں جو شخص ان کو محفوظ کرلے وہ جنت میں داخل ہوگا، [۱] یہ ننانوے نام امام ترمذیؒ اور حاکمؒ نے تفصیل کے ساتھ بتلائے ہیں۔ [۲]

اللہ تعالیٰ کے یہ ننانوے نام پڑھ کر جس مقصد کے لئے دعا کی جائے قبول ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن:۶۰) یعنی تم مجھے پکارو تو میں تمہاری دُعا قبول کروں گا، حاجات ومشکلات کے لئے دُعا سے بڑھ کر کوئی تدبیر ایسی نہیں جس میں کسی ضرر کا خطرہ نہ ہو اور نفع یقینی ہو، اپنی حاجات کے لئے اللہ جل شانہٗ سے دُعا کرنے میں کسی نقصان کا تو کوئی اِحتمال ہی نہیں، اور ایک نفع نقد ہے کہ دُعا ایک عبادت ہے، اس کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے، حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ [۳] یعنی دُعا کرنا عبادت کا مغز ہے اور جس مقصد کے لئے اس نے دُعا کی ہے اکثر تو وہ مقصد بعینہٖ پورا ہوجاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس نے اپنا مقصد بنایا تھا وہ اس کے حق میں مفید نہ تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی دُعا کو دوسری طرف پھیر دیتے ہیں جو اس کے لئے مفید ہو، اور حمد وثنا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ایمان کی غذا ہے جس کے نتیجہ میں اِنسان کی رغبت ومحبت اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہوجاتی ہے اور دنیا کی تکلیفیں اگر پیش بھی آویں تو حقیر اور آسان ہوجاتی ہیں۔

اِسی لئے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی کی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی غم یا بے چینی یا مہم کام پیش آئے اس کو چاہئے کہ یہ کلمات پڑھے، سب مشکلات آسان ہوجائیں گی، وہ کلمات یہ ہیں:

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ [۴]

اور مستدرکِ حاکم میں بروایت اَنس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمہارے لئے اِس سے کیا چیز مانع ہے کہ تم میری وصیت کو سن لو (اور اس پر عمل کیا کرو) وہ وصیت یہ

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب لله مائة اسم غير واحد ج:۲ ص:۹۴۹، وصحيح مسلم، كتاب الذكر إلخ، باب في اسماء الله تعالىٰ وفضل من احصاها ج:۲ ص:۳۴۲

[۲] جامع الترمذي، ابواب الدعوات، بابٌ ج:۲ ص:۱۸۸ تا ۱۹۰، والمستدرك للحاكمؒ رقم الحديث:۴۰

[۳] جامع الترمذي، ابواب الدعوات، بابٌ منه ج:۲ ص:۱۷۵

[۴] صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب الدعاء عند الكرب ج:۲ ص:۹۳۹، وصحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء إلخ، باب دعاء الكرب ج:۲ ص:۳۵۱، وجامع الترمذي، ابواب الوتر، باب ما جاء في صلاة الحاجة ج:۱ ص:۱۰۸، ۱۰۹

ہے کہ صبح شام یہ دعا کرلیا کرو:

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ اَصْلِحْ لِيْ شَانِيْ كُلَّهٗ وَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ۔ [۱][۲]

یہ دُعا بھی تمام حاجات ومشکلات کے لئے بے نظیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ کے اِس جملہ میں دو ہدایتیں اُمت کو دی گئیں، ایک یہ کہ حمد وثنا اور مشکلات وحاجات کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو مخلوقات کو نہیں، دُوسرے یہ کہ اس کو انہی ناموں سے پکارو جو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اس کے الفاظ نہ بدلو۔

آیت کے اگلے جملہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ یعنی چھوڑ یئے ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنٰی میں اِلحاد یعنی کجروی کرتے ہیں، ان کو ان کی کجروی کا بدلہ مل جائے گا، اِلحاد کے معنٰی لغت میں میلان اور درمیانی راہ سے ہٹ جانے کے آتے ہیں، اسی لئے قبر کی لحد کو لحد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ درمیان سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے، قرآنِ کریم میں لفظ اِلحاد قرآنِ کریم کے صحیح معانی کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی تاویل وتحریف کرنے کے معنٰی میں بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے تعلق بھی چھوڑ دیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنٰی میں اِلحاد یعنی تحریف اور کجروی سے کام لیتے ہیں۔

اسمائے الٰہیہ میں کج رَوِی کی ممانعت اور اس کی مختلف صورتیں

اسمائے الٰہیہ میں تحریف یا کجروی کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں وہ سب اس آیت کے مضمون میں داخل ہیں۔ اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وہ نام استعمال کیا جائے جو قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں، علماءِ حق کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات میں کسی کو یہ اِختیار نہیں کہ جو چاہے نام رکھ دے یا جس صفت کے ساتھ چاہے اس کی حمد وثنا کرے بلکہ صرف وہی الفاظ ہونا ضروری ہیں جو قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کے لئے بطور نام یا صفت کے ذِکر کئے گئے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو کریم کہہ سکتے ہیں، سخی نہیں کہہ سکتے، نور کہہ سکتے ہیں ابیض نہیں کہہ سکتے، شافی کہہ سکتے ہیں طبیب نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ دُوسرے الفاظ منقول نہیں اگرچہ انہی الفاظ کے ہم معنٰی ہیں۔

دوسری صورت الحاد فی الاسماء کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو نام قرآن وسنت سے ثابت ہیں ان میں سے کسی نام کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دے، اس کا بے ادبی ہونا ظاہر ہے۔

---

[۱] ترجمہ: یاحی یاقیوم! میں تیری رحمت کے واسطے سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ میرے سارے حال کو درست کردے اور مجھے ایک لمحے کے لئے بھی میرے نفس کے حوالے نہ فرما۔

[۲] المستدرك للحاكم رقم الحديث: ۱۹۵۸

کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے مخصوص نام سے موسوم یا مخاطب کرنا جائز نہیں

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو کسی دوسرے شخص کے لئے استعمال کرے، مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ اسماء حسنیٰ میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن وحدیث میں دوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں، تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کے لئے قرآن وحدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ، اور اسماء حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں ان کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اِلحادِ مذکور میں داخل اور ناجائز وحرام ہے مثلاً رحمٰن، سبحان، رزّاق، خالق، غفار، قدوس وغیرہ۔

پھر ان مخصوص ناموں کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدہ کی بناء پر ہے کہ اس کو ہی خالق یا رازق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کر رہا ہے تب تو ایسا کہنا کفر ہے اور اگر عقیدہ غلط نہیں محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی شخص کو خالق، رزاق یا رحمٰن، سبحان کہہ دیا تو یہ اگرچہ کفر نہیں مگر مشرکانہ الفاظ ہونے کی وجہ سے گناہِ شدید ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اِسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیئے، ان کی صورت وسیرت سے تو پہلے بھی مسلمان سمجھنا ان کا مشکل تھا، نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے نام انگریزی طرز کے رکھنے جانے لگے، لڑکیوں کے نام خواتینِ اسلام کے طرز کے خلاف خدیجہ، عائشہ، فاطمہ کے بجائے نسیم، شمیم، شہناز، نجمہ، پروین ہونے لگے، اس سے زیادہ افسوس ناک یہ ہے کہ جن لوگوں کے اسلامی نام ہیں عبدالرحمٰن، عبدالخالق، عبدالرزّاق، عبدالغفار، عبدالقدوس وغیرہ، ان میں تخفیف کا یہ غلط طریقہ اختیار کر لیا گیا کہ صرف آخری لفظ ان کے نام کی جگہ پکارا جاتا ہے، رحمٰن، خالق، رزّاق، غفار کا خطاب اِنسانوں کو دیا جا رہا ہے اور اس سے زیادہ غضب کی بات یہ ہے کہ قدرت اللہ کو اللہ صاحب اور قدرتِ خدا کو خدا صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے، یہ سب ناجائز وحرام اور گناہِ کبیرہ ہے، جتنی مرتبہ یہ لفظ پکارا جاتا ہے اتنی ہی مرتبہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوتا ہے اور سننے والا بھی گناہ سے خالی نہیں رہتا۔

یہ گناہ بے لذت اور بے فائدہ ایسا ہے جس کو ہمارے ہزاروں بھائی اپنے شب وروز کا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں اور کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس ذرا سی حرکت کا انجام کتنا خطرناک ہے جس کی طرف آیتِ مذکورہ کے آخری جملہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے، سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ یعنی ان کو اپنے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، اُس بدلہ کی تعیین نہیں کی گئی، اس ابہام سے عذابِ شدید کی طرف اِشارہ ہے۔

جن گناہوں میں کوئی دنیوی فائدہ یا لذت وراحت ہے ان میں تو کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی خواہش یا ضرورت سے مجبور ہوگیا، مگر افسوس یہ ہے کہ آج مسلمان ایسے بہت سے فضول گناہوں میں بھی اپنی جہالت یا غفلت سے مبتلا نظر آتے ہیں جن میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے نہ ادنیٰ درجہ کی کوئی راحت ولذت ہے وجہ یہ ہے کہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی طرف دھیان ہی نہ رہا، نعوذ باللہ منه۔

ع ۲۲/۱۲

وَ مِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۸۱ ع

اور ان لوگوں میں کہ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے کہ راہ بتلاتے ہیں سچی اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۲ صلے ج

اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی،

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ط قف اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝۱۸۳ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا سکتة مَا بِصَاحِبِهِمْ

اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بیشک میرا داؤ پکا ہے، کیا انہوں نے دھیان نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو

مِّنْ جِنَّةٍ ط اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۸۴ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ

کچھ بھی جنون نہیں، وہ تو ڈرانے والا ہے صاف، کیا انہوں نے نظر نہیں کی سلطنت میں

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ لا وَّ اَنْ عَسٰٓى

آسمان اور زمین کی اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے اور اس میں کہ شاید

اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ج فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۸۵

قریب آگیا ہو ان کا وعدہ، سو اس کے پیچھے کس بات پر ایمان لائیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو لوگوں کو حق کا راستہ دِکھاتی ہے، اور اُسی (حق) کے مطابق انصاف سے کام لیتی ہے ﴿۱۸۱﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، انہیں ہم اس طرح دھیرے دھیرے پکڑ میں لیں گے کہ اُنہیں پتہ بھی نہیں چلے گا ﴿۱۸۲﴾ اور میں اُن کو ڈھیل دیتا ہوں، یقین جانو کہ میری خفیہ تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ ﴿۱۸۳﴾ بھلا کیا ان لوگوں نے سوچا نہیں کہ یہ صاحب جن سے ان کا سابقہ ہے، (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) ان میں جنون کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ کچھ اور نہیں، بلکہ صاف صاف طریقے سے لوگوں کو متنبہ کرنے والے ہیں۔ ﴿۱۸۴﴾ اور کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت پر اور اللہ نے جو جو چیزیں پیدا کی ہیں اُن پر غور نہیں کیا، اور یہ (نہیں سوچا) کہ شاید اِن کا مقررہ وقت قریب ہی آپہنچا ہو؟ اب اس کے بعد آخر وہ کونسی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے؟ ﴿۱۸۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہماری مخلوق جن وانس میں (سب گمراہ ہی نہیں بلکہ) ایک جماعت (ان میں) ایسی بھی ہے جو (دینِ) حق (یعنی اسلام) کے موافق (لوگوں کو) ہدایت (بھی) کرتے ہیں اور اسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لئے جارہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دُنیا میں عذاب نازل کرڈالنے سے) ان کو مہلت دیتا ہوں، بیشک میری تدبیر بہت مضبوط ہے کیا ان لوگوں نے اِس بات میں غور نہ کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنون نہیں وہ تو صرف ایک صاف صاف (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں (جو کہ اصالۃً پیغمبر کا کام ہوتا ہے) اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں (تاکہ ان کو توحید کا علم استدلالی حاصل ہو جاتا) اور اس بات میں (بھی غور نہیں کیا) کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی آپہنچی ہو (تاکہ احتمالِ عذاب سے ڈرتے اور اس سے بچنے کی فکر کرتے اور اس فکر سے دینِ حق مل جاتا اور امکان قربِ اجل ہر وقت ہے اور جب قرآن جیسے مؤثر کلام سے ان کی فکر تک کو حرکت نہیں ہوتی تو) پھر قرآن کے بعد کونسی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

معارف ومسائل

پچھلی آیات میں اہلِ جہنم کے حالات وصفات اور ان کی گمراہی کا یہ سبب بیان کیا تھا کہ انہوں نے خداداد عقل

وبصیرت اور فطری قوتوں کو ان کے اصلی کام میں نہ لگایا اور ضائع کر دیا پھر اس کے بعد ان کے مرض کا علاج اسماء الٰہیہ اور ذکر اللہ کے ذریعہ بتلایا گیا تھا، مذکورہ آیات سے پہلی آیت میں ان کے بالمقابل اہلِ ایمان اور اہلِ حق کا ذکر ہے جنہوں نے عقل خداداد سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کیا، ارشاد ہے، وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ یعنی جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک امت ایسی ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتے ہیں یعنی لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور جب ان کے آپس میں کوئی نزاع یا مقدمہ پیش آئے تو اپنے جھگڑوں کا فیصلہ بھی حق یعنی قانونِ الٰہی کے ماتحت کرتے ہیں۔

امامِ تفسیر ابنِ جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ امت جس کا ذِکر اس آیت میں ہے، میری امت ہے، جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق وانصاف یعنی قانونِ الٰہی کے مطابق کریں گے اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق وانصاف کو سامنے رکھیں گے۔ [۱]

اور عبد بن حُمید کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایک امت کو یہ صفات عطا ہو چکی ہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی، وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ [۲] (الاعراف) مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں بھی ایک جماعت ان صفات کی حامل تھی کہ لوگوں کی رہنمائی میں اور باہمی جھگڑوں کے تصفیہ میں حق یعنی شریعتِ الٰہیہ کا مکمل اتباع کرتی تھی، اور امتِ محمدیہ کو بھی حق تعالیٰ نے اِن صفات میں خصوصی امتیاز بخشا ہے۔

خلاصہ اس کا دو خصلتیں ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کی قیادت اور رہنمائی یا مشورہ میں شریعت کا اتباع کریں، دوسرے یہ کہ اگر کوئی جھگڑا آپس میں پیش آجائے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کریں۔

غور کیا جائے تو یہی دو صفتیں ہیں جو کسی قوم اور جماعت کی خیر وخوبی اور فلاح دنیا وآخرت کی ضامن ہو سکتی ہیں کہ صلح وجنگ اور دوستی اور عداوت کی ہر حالت میں ان کا نصب العین حق وانصاف ہی ہو، اپنے دوستوں اور رفیقوں کو جو طریقۂ کار بتلائیں اس میں بھی حق کا اتباع ہو اور دشمنوں اور حریفوں کے جھگڑوں میں بھی حق کے آگے اپنے سارے خیالات وخواہشات کو ترک کر دیں، جس کا خلاصہ ہے حق پرستی۔

امتِ محمدیہ کی دوسری تمام امتوں پر فضیلت اور فوقیت کا راز اور ان کا طغرائے امتیاز یہی حق پرستی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا، جس جماعت یا پارٹی کی قیادت اور رہنمائی کی وہ بھی خالص حق کے تقاضوں کے مطابق کی، اپنی ذاتی خواہشات اور خاندانی یا قومی رسوم کو اس میں مطلق دخل نہیں دیا، اور باہمی نزاعات میں بھی ہمیشہ حق

---

[۱] تفسیر الطبری رقم الحدیث: ۱۵۴۵۸
[۲] الدر المنثور تحت هذه الآية ج: ۴ ص: ۳۷۸

کے سامنے گردن جھکا دی، صحابہ وتابعین کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔

اور جب سے اس امت میں ان دو خصلتوں کے اندر خلل اور نقصان آیا اسی وقت سے اس کا تنزل وانحطاط شروع ہوگیا۔

نہایت رنج وافسوس کا مقام ہے کہ آج یہی حق پرست امت خالص ہوا پرست بن کر رہ گئی ہے، اس کی پارٹیاں اور جماعتیں بنتی ہیں تو وہ بھی خالص نفسانی اغراض اور دنیا کی حقیر وذلیل منفعت کی بنیادوں پر بنتی ہیں، ایک دوسرے کو جن امور کی پابندی کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ بھی خالص اہواء نفسانی یا خاندانی رُسوم ہوتی ہیں، کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو سب اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں، لیکن حق وشریعت کے مطابق چلنے کا نہ کہیں معاہدہ ہوتا ہے نہ کوئی اس کی پیروی کرنے کے لئے کسی کو کہتا ہے نہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کسی کی پیشانی پر بل آتا ہے۔

اسی طرح باہمی جھگڑوں اور نزاعی مقدمات میں دنیا کے چند روزہ موہوم نفع کی خاطر اللہ کے قانون کو چھوڑ کر طاغوتی قوانین کے ذریعہ فیصلہ کرانے پر راضی ہیں۔

اسی کا یہ انجام بد ہے جو ہر جگہ ہر ملک میں مشاہدہ میں آرہا ہے کہ یہ امت ہر جگہ ذلیل وخوار نظر آتی ہے، اِلَّا ماشاءاللہ، انہوں نے حق سے منہ موڑا، حق نے ان کی نصرت وامداد سے رُخ پھیر لیا۔

حق پرستی کے بجائے ہوا پرستی اختیار کر کے شخصی طور پر کسی کسی فرد کو جو دنیوی منافع مل گئے وہ اس پر مگن ہیں، مگر پوری قوم وملت کی تباہی جو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس کا کوئی دیکھنے سننے والا نہیں، اگر پوری امت کی فلاح وترقی پیش نظر ہو تو اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ ان قرآنی اصول کو مضبوطی سے پکڑا جائے، خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اُس کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

دوسری آیت میں اس شبہ کا جواب ہے کہ جب قومی ترقی کا مدار حق پرستی اور حق وانصاف کی پیروی پر ہے تو دوسری غیر مسلم قومیں جو حق سے سراسر دُور ہیں وہ کیوں دُنیا میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں، جواب یہ ہے وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ یعنی ہم اپنی آیات کے جھٹلانے والوں کو اپنی حکمت ورحمت کی بناء پر دفعۃً نہیں پکڑتے بلکہ آہستہ آہستہ تدریجاً پکڑتے ہیں جس کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی، اس لئے دنیا میں کفار وفجار کی مالداری یا عزت وجاہ سے دھوکہ نہ کھایا جائے، کیونکہ وہ درحقیقت ان کے لئے کوئی بھلائی کا سامان نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے، استدراج کے معنی درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے آتے ہیں، اصطلاحِ قرآن وسنت میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ بندہ کے گناہ پر دنیا میں کوئی تکلیف ومصیبت نہ آئے بلکہ جوں جوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا جائے، دنیاوی مال واسباب اور بڑھتے جائیں، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی بدکرداری پر کسی وقت تنبیہ نہیں ہوتی اور

غفلت سے آنکھ نہیں کھلتی اور اپنے برے اعمال اس کو بُرے نظر نہیں آتے کہ وہ ان سے باز آنے کی فکر کرے۔

اِنسان کی یہ حالت اس مریض لاعلاج کے مشابہ ہے جو بیماری ہی کو شفاء اور زہر ہی کو تریاق سمجھ کر استعمال کرنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو دنیا میں ہی یہ شخص دفعۃً عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے اور کبھی موت تک یہ سلسلہ چلتا ہے بالآخر موت ہی اس کی مستی اور بے ہوشی کا خاتمہ کرتی ہے اور دائمی عذاب اس کا ٹھکانہ بن جاتا ہے۔

قرآن کریم نے مختلف سورتوں اور آیتوں میں اس استدراج کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ (الانعام) یعنی جب یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے جو ان کو یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ یہ اپنی ملی ہوئی نعمت ودولت پر اکڑ گئے تو ہم نے ان کو اچانک عذاب میں پکڑ لیا تو وہ خلاصی سے ناامید ہو کر رہ گئے۔

یہ استدراج کفار کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور مسلمان گنہگار کے ساتھ بھی، اِسی لئے صحابہ اور سلف صالحین کو جب کبھی دنیا کی نعمت ودولت حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تو غلبۂ خوف کی وجہ سے استدراج سے ڈرا کرتے تھے کہ کہیں یہ دنیا کی دولت ہمارے لئے اِستدراج نہ ہو۔

تیسری آیت میں اسی استدراج کا بیان ہے وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾ یعنی میں ان گناہگاروں کو مہلت دیتا رہتا ہوں، میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

چوتھی آیت میں کفار کے اس لغو خیال کی تردید ہے کہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنون میں مبتلا ہیں، فرمایا اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸۴﴾ یعنی کیا ان لوگوں نے غور وفکر نہیں کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنون نہیں، ان کی عقل وحکمت کے سامنے تو ساری دنیا کے عقلاء وحکماء حیران ہیں، ان کے بارے میں جنون کا گمان کرنا خود جنون ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو صاف صاف حقائق کو بیان کر کے آخرت اور عذابِ خداوندی سے ڈرانے والے ہیں۔

پانچویں آیت میں ان کو دو چیزوں کی طرف دعوتِ فکر دی گئی ہے، اوّل اللہ تعالیٰ کی مخلوقات آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی بے شمار مصنوعاتِ عجیبہ میں غور وفکر۔ دُوسرے اپنی مدتِ عمر اور فرصتِ عمل پر نظر۔

مصنوعاتِ قدرت میں ذرا بھی عقل وفہم کے ساتھ غور کیا جائے تو ایک موٹی سمجھ والے انسان کو بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت کی معرفت اور نظارہ ہونے لگتا ہے، اور ذرا گہری نظر کرنے والے کے لئے تو عالم کا ذرہ ذرہ قادرِ مطلق اور حکیمِ مطلق کی حمد وثنا کا تسبیح خوان نظر آنے لگتا ہے، جس کے بعد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ایک فطری تقاضہ بن جاتا ہے۔

اور اپنی مدت عمر میں غور وفکر کا یہ نتیجہ ہے کہ جب اِنسان یہ سمجھ لے کہ موت کا وقت معلوم نہیں کب آجائے تو

ضروری کاموں کے پورا کرنے میں غفلت سے باز آجاتا ہے، اور مستعدی سے کام کرنے لگتا ہے، موت سے غفلت ہی انسان کو تمام خرافات اور جرائم میں مبتلا رکھتی ہے، اور موت کا استحضار ہی وہ چیز ہے جو انسان کو بہت سے جرائم سے بچنے پر آمادہ کردیتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتُ [1] یعنی تم اس چیز کو کثرت سے یاد کیا کرو جو سب لذتوں کو ختم کردینے والی ہے یعنی موت۔

اسی لئے آیتِ مذکورہ میں فرمایا گیا اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ لفظ مَلَكُوْت ملک کے معنٰی میں مبالغہ کے لئے بولا جاتا ہے اس کے معنٰی ہیں ملکِ عظیم، معنٰی آیت کے یہ ہیں کہ ان منکرین نے کیا اللہ تعالیٰ کے ملکِ عظیم میں غور نہیں کیا جو آسمانوں اور زمینوں اور بیشمار اشیاء پر محیط ہے، اور کیا اس پر نظر نہیں کی کہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی موت قریب ہو جس کے بعد ایمان و عمل کی فرصت ختم ہوجائے گی۔

آخرِ آیت میں فرمایا فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ یعنی جو لوگ قرآنِ کریم کی ایسی واضح نشانیوں سے بھی ایمان نہیں لاتے وہ اور کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جس کو اللہ بچلائے اس کو کوئی نہیں راہ دکھلانے والا، اور اللہ چھوڑے رکھتا ہے ان کو ان کی شرارت میں سرگرداں،

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ

تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو کہ کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت، تو کہہ اس کی خبر تو میرے ربّ ہی کے پاس ہے،

لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ (وقف لازم)

وہی کھول دکھائے گا اس کو اس کے وقت پر وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں، جب تم پر آئے گی

اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ

تو بے خبر آئے گی، تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ گویا تو اس کی تلاش میں لگا ہوا ہے، تو کہہ دے اس کی خبر ہے خالص اللہ کے پاس

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی ذکر الموت ج:۲ ص: ۵۷۱

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٧﴾

لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جس کو اللہ گمراہ کر دے، اُس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، اور ایسے لوگوں کو اللہ (بے یار و مددگار) چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں ﴿١٨٦﴾ (اے رسول!) لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب برپا ہوگی؟ کہہ دو کہ: ''اُس کا علم تو صرف میرے ربّ کے پاس ہے۔ وہی اُسے اپنے وقت پر کھول کر دِکھائے گا، کوئی اور نہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑی بھاری چیز ہے، جب آئے گی تو تمہارے پاس اچانک آجائے گی۔'' یہ لوگ تم سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے تم نے اُس کی پوری تحقیق کر رکھی ہے۔ کہہ دو کہ: ''اُس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے۔'' ﴿١٨٧﴾

خلاصۂ تفسیر

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اس کو کوئی راہ پر نہیں لاسکتا (پھر غم لاحاصل) اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے (تاکہ ایک دفعہ ہی پوری سزا دے دے) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، آپ فرما دیجئے کہ اس کا (یہ) علم (کہ کب واقع ہوگی) صرف میرے ربّ ہی کے پاس ہے (دوسرے کسی کو اس کی اطلاع نہیں) اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا (اور وہ ظاہر کرنا یہ ہوگا کہ اس کو واقع کر دے گا اس وقت سب کو پوری خبر ہو جائے گی اس کے قبل ویسے کسی کو بتلانے کے طور پر بھی اس کو ظاہر نہ کیا جائے گا کیونکہ) وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری حادثہ ہوگا (اس لئے) وہ تم پر محض اچانک (بے خبری میں) آپڑے گی (تاکہ وہ جس طرح اجسام پر ان کو متغیر و متفرق کر دینے میں بھاری ہے اسی طرح قلوب پر بھی اس کا بھاری اثر ہوگا اور پہلے سے بتلا دینے میں یہ بات نہیں رہتی اور پوچھنا بھی تو ان کا معمولی طور پر نہیں بلکہ) وہ آپ سے اس طرح (اصرار و مبالغہ سے) پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں (اور تحقیقات کے بعد آپ کو اس کا پورا احاطہ ہو گیا ہے) آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم (مذکور) خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے (کہ بعض علوم حق تعالیٰ نے اپنے خزانہ علم میں مکنون رکھے ہیں انبیاء کو بھی تفصیلاً اطلاع نہیں دی، پس اس کے نہ جاننے سے کسی نبی کے عدم اطلاع

تعیین قیامت کو معاذ اللہ دلیل نفی نبوّت کی سمجھتے ہیں، اس طرح سے کہ نبوّت کے لئے یہ علم لازم ہے اور انتفاءِ لازم مستلزم انتفاءِ ملزوم ہے، حالانکہ پہلا مقدمہ محض غلط ہے)۔

معارف ومسائل

ان سے پہلی آیات میں کفار ومنکرین کی ضد وہٹ دھرمی اور کھلی ہوئی آیاتِ قدرت کے ہوتے ہوئے ایمان نہ لانے کا ذکر تھا، یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے امت اور عام مخلوق کے ساتھ غایتِ شفقت ورحمت کی بناء پر انتہائی رنج وغم کا سبب ہوسکتا تھا، اس لئے متذکرہ تین آیات میں سے پہلی آیت میں آپ کو تسلی دینے کے لئے اِرشاد فرمایا کہ:

''جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے اس کو کوئی راہ پر نہیں لاسکتا اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور قبولِ حق سے اعراض پر آپ رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ آپ کا فریضہ منصبی اتنا ہی تھا کہ حق بات کو صاف صاف مؤثر انداز میں پہنچادیں وہ آپ پورا کرچکے، آپ کی ذمہ داری ختم ہوچکی اب کسی کا ماننا یا نہ ماننا یہ ایک تقدیری امر ہے جس میں آپ کو دخل نہیں پھر آپ غمگین کیوں ہوں۔

اس سورت کے مضامین میں سے تین مضمون بہت اہم تھے، توحید، رسالت، آخرت، اور یہی تین چیزیں ایمان اور اسلام کی اصل بنیادیں ہیں، ان میں سے توحید ورسالت کا مضمون پچھلی آیتوں میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، مذکورہ آیتوں میں سے آخری دو آیتیں مضمون آخرت وقیامت کے بیان میں ہیں جن کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے جو امام تفسیر ابن جریرؒ اور عبد بن حُمید نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریشِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور استہزاء وتمسخر کے دریافت کیا کہ آپ قیامت کے آنے کی خبریں دیتے اور لوگوں کو اس سے ڈراتے ہیں اگر آپ سچے ہیں تو متعین کرکے بتلایئے کہ قیامت کس سن اور کس تاریخ میں آنے والی ہے تاکہ ہم اس کے آنے سے پہلے کچھ تیاری کرلیں، آپ کے اور ہمارے درمیان جو تعلقاتِ رشتہ داری ہیں ان کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ اگر آپ عام طور سے لوگوں کو بتلانا نہیں چاہتے تو کم ازکم ہمیں بتلادیجئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ الآیة۔

اِس میں لفظ ساعة عربی لغت میں تھوڑے سے زمانہ کے لئے بولا جاتا ہے جس کی کوئی خاص تحدید لغت کے اعتبار سے نہیں ہے، اور اہل نجوم کی اِصطلاح میں رات اور دن کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ساعة ہے جس کو اردو میں گھنٹہ کہا جاتا ہے، اور قرآن کی اِصطلاح میں یہ لفظ اس دِن کے لئے بولا جاتا ہے جو ساری مخلوقات کی موت کا دِن

ہوگا اور اس دِن کے لئے بھی جس میں ساری مخلوقات دوبارہ زندہ ہوکر ربُّ العالمین کے دربار میں حاضر ہوں گی۔ اَیَّانَ کے معنی کب اور مُرْسٰی کے معنی ٹھہرنے اور قائم ہونے کے ہیں۔

لَا یُجَلِّیْهَا، تَجْلِیه سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کھولنے اور ظاہر کرنے کے، بَغْتَةً کے معنی اچانک حَفِیٌّ کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عالم اور باخبر کے بیان کئے ہیں، اور اصل میں اس شخص کو حَفِیٌّ کہا جاتا ہے جو سوالات کر کے کسی معاملہ کی پوری تحقیق کرلے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آئے گی، آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اس کی تعیین کا صحیح علم صرف میرے ربّ کے پاس ہے، نہ پہلے سے اور کسی کو معلوم ہے اور عین وقت پر بھی کسی کو پہلے معلوم نہ ہوگا، جب وقتِ مقدر آجائے گا تو خود اللہ تعالیٰ ہی اس کو ظاہر فرمادیں گے کوئی واسطہ درمیان میں نہ ہوگا، یہ حادثۂ قیامت آسمانوں اور زمین پر بہت بھاری واقعہ ہوگا کہ ان کے ٹکڑے ہوکر اڑ جائیں گے اس لئے تقاضائے حکمت یہ ہے کہ ایسے شدید واقعہ کا اظہار پہلے سے نہ کیا جائے ورنہ یقین کرنے والوں کی زندگی تلخ ہوجائے گی اور منکرین کو مزید استہزاء و تمسخر کا موقع ملے گا، اس لئے فرمایا لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یعنی قیامت تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دفعۃً اور اچانک آنے کے متعلق یہ بیان فرمایا کہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہوں گے، ایک شخص نے گاہک کو دکھلانے کے لئے کپڑے کا تھان کھولا ہوا ہوگا وہ ابھی معاملہ طے نہ کر پائیں گے کہ قیامت قائم ہوجائے گی، ایک شخص اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے چلے گا اور ابھی اُس کو استعمال کرنے نہ پائے گا کہ قیامت آجائے گی، کوئی شخص اپنے حوض کی مرمت کر رہا ہوگا اس سے فارغ نہ ہو پائے گا کہ قیامت آجائے گی، کوئی شخص کھانے کا لقمہ ہاتھ میں اٹھائے گا ابھی منہ تک نہ پہنچے گا کہ قیامت برپا ہوجائے گی۔ (رُوح المعانی) [1]

مقصد اس کا یہ ہے کہ جس طرح انسان کی شخصی موت کی تاریخ اور وقت کو غیر معین و مبہم رکھنے میں بڑی حکمتیں ہیں اسی طرح قیامت کو جو پورے عالَم کی اِجتماعی موت کا نام ہے اس کو مخفی اور مبہم رکھنے میں بھی بڑی حکمتیں ہیں، اوّل تو یہی ہے کہ یقین کرنے والوں کے لئے اس صورت میں زندگی دوبھر اور دنیا کے کام مشکل ہوجائیں گے اور منکرین کو طویل میعاد سن کر استہزاء و تمسخر کا بہانہ ملے گا اور ان کی سرکشی میں اور اضافہ ہوگا۔

اس لئے بتقاضائے حکمت اس کی تاریخ کو مبہم رکھا گیا تاکہ لوگ اس کے ہولناک واقعات سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اور یہ ڈر ہی انسان کو جرائم سے باز رکھنے کا سب سے زیادہ مؤثر علاج ہے، اس لئے ان آیات سے تعلیم یہ دی گئی کہ

[1] تفسیر روح المعانی تحت هذه الآیة ج:٦ ص:١٢٨، وصحیح البخاری، کتاب الفتن، باب خروج النار ج:٢ ص:١٠٥٤

جب اس کا یقین ہے کہ قیامت کسی روز آئے گی اور ربّ العالمین کے سامنے سب کی پیشی ہوگی، ان کے عمر بھر کے چھوٹے بڑے اچھے برے سب اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، جس کے نتیجہ میں یا جنت کی نا قابل قیاس اور لازوال نعمتیں ملیں گی اور یا پھر معاذ اللہ جہنم کا وہ شدید عذاب ہوگا جس کے تصور سے بھی پتہ پانی ہونے لگتا ہے، تو پھر ایک عقل مند کا کام یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فرصت عمل کے وقت ان کو بحثوں میں ضائع کرے کہ یہ واقعہ کب کس سن اور کس تاریخ میں ہوگا، بلکہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ فرصتِ عمر کو غنیمت جان کر اس دن کے لئے تیاری میں مشغول ہو جائے، ربّ العالمین کے اَحکام کی خلاف ورزی سے ایسا ڈرے جیسے آگ سے ہر انسان ڈرتا ہے۔

آیت کے آخر میں پھر ان لوگوں کے سوال کا اعادہ کر کے فرمایا یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا پہلا سوال تو اس بات سے متعلق تھا کہ جب ایسا اہم واقعہ ہونے والا ہے تو ہمیں اس کا پورا پورا صحیح تاریخ اور وقت کے ساتھ علم ہونا چاہئے، جس کا جواب دے دیا گیا کہ یہ سوال بے عقلی اور بے وقوفی سے پیدا ہوا ہے، عقل کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کی تعیین کی کسی کو خبر نہ کی جائے تاکہ ہر عمل کرنے والا ہر وقت عذاب آخرت سے ڈر کر نیک عمل کے اختیار کرنے اور بُرے اعمال سے باز رہنے میں پوری توجہ دے۔

اور اس دوسرے سوال کا منشاء ان لوگوں کا یہ سمجھنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور قیامت کی صحیح تاریخ اور وقت معلوم ہے اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے تحقیق کر کے اس کا علم ضرور حاصل کر لیا ہے مگر آپ کسی وجہ سے بتاتے نہیں، اس لئے اپنی قرابت ورشتہ داری کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کیا کہ ہمیں قیامت کا پورا پتہ بتلا دیں، اس سوال کے جواب میں ارشاد ہوا، قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

یعنی آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ حقیقت یہی ہے کہ قیامت کی صحیح تاریخ کا سوائے اللہ جل شانہٗ کے کسی فرشتہ یا نبی کو بھی علم نہیں ہے، مگر بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بہت سے علوم اللہ تعالیٰ صرف اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں جن کا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو بھی پتہ نہیں ہوتا، لوگ اپنی جہالت سے یہ سمجھتے ہیں تاریخ قیامت کا علم نبوّت ورسالت کے لئے لازمی ہے اور پھر اس کا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پورا علم نہیں تو یہ علامت اس کی ہے کہ معاذ اللہ آپ نبی نہیں، مگر اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ خیال سرے سے غلط ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے سوالات کرنے والے بڑے بے وقوف اور بے خبر ہیں، نہ ان کو مسئلہ کی حقیقت معلوم ہے نہ اس کی حکمت اور نہ سوال کرنے کا طریقہ۔

ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کی کچھ علامات کا علم دیا گیا تھا اور یہ کہ وہ اب قریب ہے، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیثِ صحیحہ میں واضح طور پر بیان فرما دیا ہے، ارشاد فرمایا کہ میری بعثت اور قیامت اس طرح

ملی ہوئی ہیں جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ (ترمذی) [۱]

اور بعض اسلامی کتابوں میں جو پوری دنیا کی عمر سات ہزار سال بتلائی ہے یہ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں، بلکہ اسرائیلی روایات سے لیا ہوا مضمون ہے۔

علماء طبقات الارض نے جو نئی تحقیقات سے دنیا کی عمر لاکھوں سال بتلائی ہے یہ نہ کسی قرآنی آیت سے ٹکراتی ہے نہ کسی حدیث صحیح سے، اسلامی روایات میں ایسی کچی بے سند باتوں کو داخل کر دینے کا مقصد ہی شاید اسلام کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنا ہو، جن کی تردید خود صحیح احادیث میں موجود ہے، ایک صحیح حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو مخاطب کر کے ارشاد ہے کہ تمہاری مثال پچھلی امتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سیاہ بیل کے بدن پر ایک سفید بال ہو، [۲] اس سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی عمر کتنی دراز ہے کہ اُس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، اِسی لئے حافظ ابن حزم اندلسیؒ نے فرمایا کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دنیا کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اس کا صحیح علم صرف پیدا کرنے والے ہی کو ہے۔ (مراغی)

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ

تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں جان لیا کرتا

معانقة ٨

الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ

غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کرلیتا، اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی، میں تو بس ڈر

وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۸۸ؑ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایماندار لوگوں کو وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے

وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا

اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تا کہ اس کے پاس آرام پکڑے، پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا حمل رہا ہلکا سا حمل

[۱] جامع الترمذی، ابواب الفتن، باب ج: ۲ ص: ۴۵

[۲] صحیح البخاری، کتاب الأنبیاء، باب قصة یأجوج ومأجوج ج: ۱ ص: ۴۷۲

فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا

تو چلتی پھرتی رہی اس کے ساتھ، پھر جب بوجھل ہوگئی تو دونوں نے پکارا اللہ اپنے ربّ کو کہ اگر تو ہم کو بخشے چنگا بھلا

لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ

تو ہم تیرا شکر کریں، پھر جب ان کو دیا چنگا بھلا تو بنانے لگے اس کے لئے شریک

فِيْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٩٠﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا

اس کی بخشی ہوئی چیز میں، سو اللہ برتر ہے ان کے شریک بنانے سے کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو پیدا نہ کریں ایک چیز بھی

وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾ ۖ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾

اور وہ پیدا ہوئے ہیں، اور نہیں کرسکتے ہیں ان کی مدد، اور نہ اپنی مدد کریں،

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ

اور اگر تم ان کو پکارو رستہ کی طرف تو نہ چلیں تمہاری پکار پر، برابر ہے تم پر

اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾

کہ ان کو پکارو یا چپکے رہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

کہو کہ: ’’جب تک اللہ نہ چاہے، میں خود اپنے آپ کو بھی کوئی نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا، اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اچھی اچھی چیزیں خوب جمع کرتا، اور مجھے کبھی کوئی تکلیف ہی نہ پہنچتی۔ میں تو بس ایک ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں، اُن لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں۔‘‘ ﴿١٨٨﴾ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اُسی سے اُس کی بیوی بنائی، تاکہ وہ اُس کے پاس آکر تسکین حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو

عورت نے حمل کا ایک ہلکا سا بوجھ اُٹھالیا، جسے لے کر وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں (میاں بیوی) نے اپنے پروردگار اللہ سے دُعا کی کہ: "اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ہم ضرور بالضرور تیرا شکرادا کریں گے۔" ﴿۱۸۹﴾ لیکن جب اللہ نے ان کو ایک تندرست بچہ دے دیا تو ان دونوں نے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا شروع کردیا، حالانکہ اللہ ان کی مشرکانہ باتوں سے کہیں بلند اور برتر ہے ﴿۱۹۰﴾ کیا وہ ایسی چیزوں کو (اللہ کے ساتھ خدائی میں) شریک مانتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود اُن کو پیدا کیا جاتا ہے؟ ﴿۱۹۱﴾ اور جو نہ ان لوگوں کی کوئی مدد کرسکتے ہیں، اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اور اگر تم انہیں کسی صحیح راستے کی طرف دعوت دو تو وہ تمہاری بات نہ مانیں، (بلکہ) تم انہیں پکارو یا خاموش رہو، اُن کے لئے دونوں باتیں برابر ہیں ﴿۱۹۳﴾

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے (بھی چہ جائے کہ دوسرے کے لئے) کسی نفع (تکوینی کے حاصل کرنے) کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر (تکوینی کے دفع کرنے) کا (اختیار رکھتا ہوں) مگر اتنا ہی کہ جتنا خدا تعالیٰ نے چاہا ہو (کہ مجھ کو اختیار دے دیں اور جس امر میں اختیار نہیں دیا اس میں بعض اوقات منافع فوت ہوجاتے ہیں اور مضار واقع ہوجاتے ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا) اور (دُوسرا مقدمہ یہ ہے کہ) اگر میں غیب کی باتیں (اُمورِ اختیاریہ کے متعلق) جانتا ہوتا تو میں (اپنے لئے) بہت سے منافع حاصل کرلیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی (کیونکہ علمِ غیب کے سبب معلوم ہوجاتا کہ فلاں امر میرے لئے یقیناً نافع ہوگا اس کو اختیار کرلیتا اور فلاں امر میرے لئے یقیناً مضر ہوگا اس سے احتراز کرتا اور اب چونکہ علمِ غیب نہیں اس لئے بعض اوقات نافع کا علم نہیں ہوتا کہ اس کو اختیار کروں اسی طرح مضر کا علم نہیں ہوتا کہ اس سے بچوں بلکہ گاہے بالعکس نافع کو مضر اور مضر کو نافع سمجھ لیا جاتا ہے، حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ علمِ غیب کے لئے نفع وضرر کا مالک ہونا لازم تھا، یہ مقدمہ ذکر میں مؤخر ہے اور لازم منتفی ہے یہ مقدمہ ذکر میں مقدم ہے پس ملزوم یعنی علمِ غیب منتفی ہے اور یہ مطلوب ہے، غرض میں ایسے امور کا علم نہیں رکھتا) میں تو محض (اَحکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی) بشارت دینے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں (خلاصہ یہ کہ نبوّت کا اصلی مقصود امور تکوینیہ کا احاطہ نہیں اس لئے ان امور کا علم جن میں تعیینِ قیامت بھی داخل ہے نبی کو ملنا ضروری نہیں البتہ نبوّت کا اصل مقصود امور تشریعیّہ کا علم وافی ہے سو وہ مجھ کو حاصل ہے) وہ اللہ ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تم کو ایک تن واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا (مراد حوّا جس کی کیفیت شروع تفسیر سورۂ نساء میں گزر چکی) تاکہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس حاصل کرے (پس جب وہ خالق بھی ہے اور محسن بھی تو عبادت اسی کا حق ہے) پھر (آگے ان کی اولاد بڑھی اور

ان میں بھی میاں بی بی ہوئے لیکن ان میں بعض کی یہ حالت ہوئی کہ) جب میاں نے بی بی سے قربت کی تو اس کو حمل رہ گیا (جو اول اول) ہلکا سا (رہا) سو وہ اس کو (پیٹ میں) لئے ہوئے (بے تکلف) چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ (حاملہ اس حمل کے بڑھ جانے سے) بوجھل ہوگئی (اور دونوں میاں بی بی کو یقین ہوگیا کہ حمل ہے) تو (اس وقت ان کو طرح طرح کے احتمالات وتوہمات ہونے لگے جیسا کہ بعضے حمل میں خطرات پیش آتے ہیں اس لئے) دونوں میاں بی بی اللہ سے جو کہ ان کا مالک ہے دُعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے (جیسا عام عادت ہے کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے بڑے بڑے عہد و پیمان ہوا کرتے ہیں) سو جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے (مختلف طور پر کسی نے اعتقاد سے کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مُردہ نے دی ہے، کسی نے عمل سے کہ اس کے نام کی نذر و نیاز کرنے لگے یا بچہ کو لے جا کر اس کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیا، یا قول سے کہ اس کی بندگی پر نام رکھ دیا جیسے عبدشمس یا بندۂ علی وغیرہما، یعنی یہ حق تو تھا خدا کا جو کہ منعم اور خالق اور قادر و محسن ہے اور صَرف کیا اس کو دوسرے معبودوں کے لئے) سو اللہ تعالیٰ پاک ہے ان کے شرک سے (یہاں تک تو حق تعالیٰ کی صفات مذکور تھیں جو مقتضی ہیں اس کے استحقاق معبودیت کو، آگے آلہۂ باطلہ کے نقائص کا ذکر ہے جو مقتضی ہیں ان کے عدم استحقاقِ معبودیت کو پس فرماتے ہیں کہ) کیا (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بنا نہ سکیں اور (بلکہ) وہ خود ہی بنائے جاتے ہوں (چنانچہ ظاہر ہے کہ بت پرست خود ان کو تراشتے تھے) اور (کسی چیز کا بنانا تو بڑی بات ہے) وہ (تو ایسے عاجز ہیں کہ اس سے آسان کام بھی نہیں کر سکتے مثلاً) ان کو کسی قسم کی مدد (بھی) نہیں دے سکتے اور (اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ) وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے (اگر کوئی حادثہ ان کو پیش آ جائے مثلاً کوئی شخص ان کو توڑنے پھوڑنے ہی لگے) اور (اس سے بھی بڑھ کر سنو کہ) اگر تم ان کو کوئی بات بتلانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں (اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ تم ان کو پکارو کہ وہ تم کو کوئی بات بتلائیں تو تمہارا کہنا نہ کریں یعنی نہ بتلائیں اور دوسرے اس سے زیادہ یہ کہ تم ان کو پکارو کہ آؤ ہم تم کو کچھ بتلائیں تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں یعنی تمہاری بتلائی ہوئی بات پر عمل نہ کر سکیں بہرحال) تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو (وہ جب نہیں سنتے) اور یا تم خاموش رہو (جب تو نہ سننا ظاہر ہی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جو کام سب سے سہل تر ہے کہ کوئی بات بتلانے کے لئے پکارے تو سن لینا وہ اسی سے عاجز ہیں تو جو اس سے مشکل ہے کہ اپنی حفاظت کریں اور پھر جو اس سے مشکل ہے کہ دوسروں کی امداد کرنا اور پھر ان سے جو دشوار تر ہے کہ کسی شئے کو پیدا کرنا ان سے تو بدرجۂ اولیٰ زیادہ تر عاجز ہوں گے پھر ایسے عاجز محتاج کب معبودیت کے لائق ہوسکتے ہیں)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مشرکین اور عوام کے اس غلط عقیدہ کی تردید ہے جو ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں قائم کر رکھا تھا کہ وہ غیب دان ہوتے ہیں، ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرح تمام کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر حاوی ہوتا ہے، نیز یہ کہ وہ ہر نفع اور نقصان کے مالک ہوتے ہیں جس کو جو چاہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

اور اسی عقیدہ کے سبب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی معین تاریخ بتلانے کا مطالبہ کرتے تھے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔

اس آیت نے ان کے اس مشرکانہ عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے بتلا دیا کہ علمِ غیب اور تمام کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے اس میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی و رسول شرک اور ظلمِ عظیم ہے، اسی طرح ہر نفع نقصان کا مالک ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفتِ خاص ہے اس میں کسی کو شریک ٹھہرانا بھی شرک ہے، جس کے مٹانے ہی کے لئے قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

قرآنِ کریم نے بے شمار آیات میں بار بار اس کو واضح فرما دیا ہے کہ علمِ غیب اور علمِ محیط جس سے کوئی ذرّہ چھپا نہ رہے یہ صرف اللہ جل شانہ کی صفتِ خاص ہے اسی طرح قدرتِ مطلقہ کہ ہر نفع نقصان قبضہ میں ہو یہ بھی صفت خاص ہے حق تعالیٰ شانہ کی، ان صفتوں میں غیر اللہ کو شریک قرار دینا شرک ہے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس کا اعلان کر دیں کہ میں اپنے نفس کے لئے بھی نفع نقصان کا مالک نہیں، دوسروں کے نفع نقصان کا تو کیا ذکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لئے ضروری ہو، اور اگر مجھے علمِ غیب ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا، اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا، حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، بہت سے کام ایسے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے، اور بہت سی تکلیفیں اور مضرتیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ مضرّت و تکلیف پہنچ گئی غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر آپ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ اِحرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کر کے حدودِ حرم تک پہنچ گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی اس وقت نہ ہو سکی سب کو اِحرام کھول کر واپس ہونا پڑا۔

اسی طرح غزوۂ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم پہنچا اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی، اسی طرح کے

اور بہت سے واقعات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معروف و مشہور ہیں۔

اور شاید ایسے واقعات کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہو کہ لوگوں پر عملاً یہ بات واضح کر دی جائے کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول اور افضل خلائق ہیں مگر پھر بھی وہ خدائی علم وقدرت کے مالک نہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کے شکار نہ ہو جائیں جس میں عیسائی اور نصرانی مبتلا ہو گئے کہ اپنے رسول کو خدائی صفات کا مالک سمجھ بیٹھے اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے۔

اس آیت نے بھی یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام نہ قادرِ مطلق ہوتے ہیں نہ عالم الغیب بلکہ ان کو علم وقدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جتنا من جانب اللہ ان کو دے دیا جائے۔

ہاں اس میں شک وشبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطا ہوتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھا ہوا ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین وآخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا، یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا تھا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا تھا، اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں جن کی سچائی کا ہر عام وخاص نے مشاہدہ کیا، اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہزاروں لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا، مگر اس کو اصطلاح قرآن میں علمِ غیب نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ سے رسول کو عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی اعلان کر دیں کہ میرا فریضۂ منصبی صرف یہ ہے کہ میں بدکاروں کو عذاب سے ڈراؤں اور نیک لوگوں کو ثوابِ عظیم کی خوشخبری سناؤں۔

دوسری آیت میں عقیدہ توحید کا ذکر ہے جو اسلام کا سب سے بڑا بنیادی عقیدہ ہے اور اس کے ساتھ شرک کے باطل اور نامعقول ہونے کا بیان کسی قدر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک مظہر حضرت آدم وحوّاء کی پیدائش سے اس طرح بیان فرمایا هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے جس نے سارے بنی آدم کو ایک ذات آدم سے پیدا کیا اور انہیں سے ان کی بی بی حضرت حوّاء کو پیدا کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو ایک ہم جنس، ہم دم کے ذریعہ سکون حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ کی اس صنعتِ عجیبہ کا تقاضہ یہ تھا کہ تمام اولادِ آدم ہمیشہ اس کی شکر گزار ہوتی اور کسی مخلوق کو اس کی صفاتِ کاملہ میں شریک نہ ٹھہراتی، مگر غفلت شعار انسان نے معاملہ اس کے خلاف کیا جس کا بیان اسی آیت کے دوسرے

جملہ اور بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا گیا:

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

یعنی اولادِ آدم نے اپنی غفلت وناشکری سے اس معاملہ میں عمل یہ کیا کہ جب نر و مادہ کے باہمی اختلاط سے حمل قرار پایا تو شروع شروع میں جب تک حمل کا کوئی بوجھ نہ تھا عورت آزادی کے ساتھ چلتی پھرتی رہی پھر جب حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تین اندھیریوں کے اندر اس حمل کی تربیت کر کے اس کو بڑھایا اور اس کا بوجھ محسوس ہونے لگا تو اب ماں باپ فکر میں پڑ گئے اور یہ خطرے محسوس کرنے لگے کہ اس حمل سے کیسی اولاد پیدا ہوگی کیونکہ بعض اوقات انسان ہی کے پیٹ سے عجیب عجیب طرح کی مخلوق بھی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ناقص الخلقت بچہ پیدا ہو جاتا ہے، اندھا یا بہرا یا گونگا یا ہاتھ پیر سے معذور، ان خطرات کے سبب ماں باپ یہ دعائیں مانگنے لگے کہ یا اللہ ہمیں صحیح سالم بچہ عنایت فرمایئے اگر صحیح سالم بچہ پیدا ہوا تو ہم شکر گزار رہوں گے۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لیں اور بچہ صحیح سالم عطا کر دیا تو اب شکر گزاری کے بجائے شرک میں مبتلا ہو گئے اور یہ اولاد ہی ان کے شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئی، جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی تو عقیدہ ہی فاسد ہوتا ہے، یوں سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ بیٹا کسی ولی یا بزرگ نے دیا ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ عملاً اس بچہ کو کسی زندہ یا مُردہ بزرگ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کے نام کی نذر و نیاز کرنے لگتے ہیں یا بچہ کو لے جا کر اُن کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیتے ہیں اور کبھی بچہ کا نام رکھنے میں مشرکانہ انداز اختیار کرتے ہیں، عبداللّات، عبدالعزّٰی یا عبدالشّمس یا بندہ علی وغیرہ ایسے نام رکھ دیتے ہیں جن سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان بتوں یا ان بزرگوں کا پیدا کیا ہوا بندہ ہے یہ سب مشرکانہ عقائد و اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کے مقابلہ میں شکر کے بجائے ناشکری کی مختلف صورتیں ہیں۔

تیسری آیت کے آخر میں ان لوگوں کی بے راہی اور کج روی کو واضح کرنے کے لئے فرمایا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ یعنی پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔

آیاتِ مذکورہ کی اس تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس آیت کے پہلے جملہ میں حضرت آدم وحوّاء کا ذکر کر کے اولادِ آدم کو ان کے اتباع اور شکر گزاری کی تعلیم دی گئی ہے، اور آخری جملوں میں بعد کی آنے والی اولادِ آدم کی گمراہی اور کجروی کا بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے بجائے شکر گزاری کے شرک کو اختیار کر لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ شرک اختیار کرنے والوں کے معاملہ کا تعلق حضرت آدم وحوّاء سے مطلق نہیں جس کے سبب حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی شبہ ہو، بلکہ اس کا تعلق بعد کی آنے والی نسلوں کے عمل سے ہے، اور یہ تفسیر جو ہم نے

اختیار کی ہے تفسیر درمنثور میں بروایت ابن المنذر و ابن ابی حاتم مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ [۱]

ترمذی اور حاکم کی روایات میں جو ایک قصہ حضرت آدم و حوّاء علیہما السلام کا اور شیطان کے فریب دینے کا مذکور ہے [۲] اس کو بعض نے اسرائیلی روایات قرار دے ناقابلِ اعتماد بتلایا ہے لیکن بہت سے محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے، متذکرہ تفسیر پر اگر اس قصہ کی روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال و شبہ باقی نہیں رہتا۔

اس آیت سے چند اَحکام و فوائد حاصل ہوئے:

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورت و مرد کے جوڑے کو ہم جنس بنایا تا کہ طبعی موافقت اور پورا انس ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہو سکے اور ازدواجی زندگی سے جو تعمیر عالم کے فوائد وابستہ ہیں وہ پوری طرح انجام پا سکیں۔

دوسرے یہ کہ ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق و فرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون کو برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں، اور آج کی مہذب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے اور چار طرف طلاقوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو مستحسن سمجھ لیا گیا ہے جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنے والی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اس کی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالمگیر ہوتی جاتی ہے اس کو ازدواجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جوں جوں یہ بے پردگی اور بے حیائی عورتوں میں بڑھتی جاتی ہے اسی رفتار سے گھریلو سکون و اطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ بچوں کے ایسے نام رکھنا جن سے مشرکانہ مفہوم لیا جا سکتا ہو، چاہے نام رکھنے والوں کی نیت یہ نہ ہو، وہ بھی ایک مشرکانہ رسم ہونے کے سبب گناہِ عظیم ہے جیسے عبدالشّمس عبدالعزیٰ وغیرہ نام رکھنا۔

چوتھے یہ کہ بچوں کے نام رکھنے میں بھی اداءِ شکر کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نام اللہ و رسول کے ناموں پر رکھے جائیں، اِسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن، عبداللہ وغیرہ کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔ [۳]

افسوس ہے کہ آج مسلمانوں میں سے یہ رہی سہی اسلامی رسم بھی ختم ہوتی جاتی ہے، اول تو نام ہی غیر اسلامی رکھے جاتے ہیں، اور جو کہیں ماں باپ نے اسلامی نام رکھ بھی دیئے تو ان کو بھی انگریزی کے مخفف حروف میں منتقل کر کے ختم کر دیا

---

[۱] الدر المنثور تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۳۸۹، وَ تفسير ابن ابی حاتم رقم الحديث:۹۴۲۲

[۲] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الأعراف ج:۲ ص:۱۳۸

[۳] جامع الترمذی، ابواب الإستئذان، باب ما جاء فی ما يستحب من الأسماء ج:۲ ص:۱۱۰

جاتا ہے، سیرت وصورت سے تو کسی کا مسلمان سمجھنا پہلے ہی مشکل ہو چکا تھا، ناموں کے اِس نئے طرز نے اسلام کی اس آخری علامت کو بھی رخصت کر دیا، اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم اور اسلام کی محبت عطا فرمائے، آمین۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے بھلا پکارو تو اُن کو

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ز

پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو اگر تم سچے ہو، کیا اُن کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں،

اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ

یا اُن کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں، یا اُن کے آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں، یا اُن کے کان ہیں

يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ط قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

جن سے سنتے ہیں، تو کہہ دے کہ پکارو اپنے شریکوں کو پھر برائی کرو میرے حق میں اور مجھ کو ڈھیل نہ

اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ صلے ز وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

دو میرا حمایتی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب، اور وہی حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی،

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ

اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہیں کر سکتے تمہاری مدد

وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ط

اور نہ اپنی جان بچاسکیں، اور اگر تم اُن کو پکارو رستہ کی طرف تو کچھ نہ سنیں،

وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

اور تو دیکھتا ہے اُن کو کہ تک رہے ہیں تیری طرف اور وہ کچھ نہیں دیکھتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یقین جانو کہ اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو تم پکارتے ہو، وہ سب تمہاری طرح (اللہ کے) بندے ہیں۔ اب ذرا ان سے دُعا مانگو، پھر اگر تم سچے ہو تو انہیں تمہاری دُعا قبول کرنی چاہئے ﴿۱۹۴﴾ بھلا کیا اُن کے پاس پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں؟ یا اُن کے پاس ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑیں؟ یا اُن کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھیں؟ یا اُن کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنیں؟ (ان سے کہہ دو کہ:) "تم اُن سب دیوتاؤں کو بلالاؤ جنہیں تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، پھر میرے خلاف کوئی سازش کرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ ﴿۱۹۵﴾ میرا رکھوالا تو اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے، اور وہ نیک لوگوں کی رکھوالی کرتا ہے ﴿۱۹۶﴾ اور تم اُس کو چھوڑ کر جن جن کو پکارتے ہو، وہ نہ تمہاری مدد کرسکتے ہیں، نہ اپنی مدد کرتے ہیں ﴿۱۹۷﴾ اور اگر تم انہیں صحیح راستے کی طرف بلاؤ تو وہ سنیں گے بھی نہیں۔ وہ تمہیں نظر تو اس طرح آتے ہیں جیسے تمہیں دیکھ رہے ہوں، لیکن حقیقت میں انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا" ﴿۱۹۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(غرض) واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے (اللہ کے مملوک) بندے ہیں (یعنی تم سے بڑھ کر نہیں خواہ گھٹے ہوئے ہوں) سو (ہم تو تم کو سچا جب جانیں کہ) تم (تو) ان کو پکارو (اور) پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کردیں، اگر تم (ان کے اعتقادِ الوہیت میں) سچے ہو (اور وہ بیچارے تمہارا کہنا تو کیا کریں گے، کہنا ماننے کے آلات تک ان کو نصیب نہیں، دیکھ لو) کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے کسی چیز کو تھام سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں (جب ان میں قویٰ فاعلہ تک نہیں تو کوئی فعل ان سے کیا صادر ہوگا اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جس طرح وہ اپنے معتقدین کو نفع پہنچانے سے عاجز ہیں اسی طرح اپنے مخالفین کو ضرر بھی نہیں پہنچا سکتے، جیسا تم کہا کرتے ہو کہ ہمارے بتوں کی بے ادبی نہ کیا کرو ورنہ وہ تم پر کوئی آفت نازل کردیں گے اخرجه فی اللباب عن عبدالرزاق فی قوله تعالیٰ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ [1] (الزمر:۳۶) اور اگر تم سمجھو کہ وہ مجھ کو ضرر پہنچا سکتے ہیں تو) تم (اپنا ارمان نکال لو اور) اپنے سب شرکاء کو بلالو پھر (سب مل کر) میری ضرر

[1] ترجمہ: اور یہ لوگ آپ کو اُن سے ڈراتے ہیں جو خدا کے سوا ہیں۔

رسانی کی تدبیر کر و پھر (جب تدبیر بن جائے تو) مجھ کو ذرا مہلت مت دو (بلکہ فوراً اس کو نافذ کر دو، دیکھوں کیا ہوتا ہے اور خاک بھی نہیں ہوگا کیونکہ شرکاء تو مہمل محض ہیں، رہ گئے تم جو کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہو تو تم میرا اس لئے کچھ نہیں کر سکتے کہ) یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس (کے مددگار اور رفیق ہونے کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ اس) نے (مجھ پر) یہ کتاب (مبارک جامع خیر دارین) نازل فرمائی (اور اگر میرا رفیق و معین نہ ہوتا تو اتنی بڑی نعمت کیوں عطا فرماتا) اور (علاوہ اس دلیل خاص کے ایک عام قاعدہ سے بھی اس کا مددگار رہنا معلوم ہے وہ قاعدہ یہ ہے کہ) وہ (عموماً) نیک بندوں کی مدد کیا کرتا ہے (تو انبیاء تو ان نیک بندوں میں فرد کامل ہیں اور میں نبی ہوں تو میرا بھی ضرور مددگار رہوگا، غرض یہ کہ جن کے ضرر سے ڈراتے ہو وہ عاجز اور جو مجھ کو ضرر سے بچاتا ہے وہ قادر، پھر اندیشہ کاہے کا) اور (گو ان کا عاجز ہونا اوپر بِاَبْلَغ وجوہ بیان ہو چکا ہے لیکن چونکہ وہاں بیان عجز مقصود بالغیر تھا اور مقصود بالذات نفی استحقاق معبودیت تھی اس لئے آگے مقصوداً بیان عجز کا فرماتے ہیں کہ) تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ (تمہارے دشمن کے مقابلہ میں جیسا میں ہوں) تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ (اپنے دشمن کے مقابلہ میں جیسا میں ہوں) اپنی مدد کر سکتے ہیں اور (مدد کرنا تو بڑی بات ہے) ان کو (تو) اگر کوئی بات بتلانے کو پکارو تو اس کو (بھی تو) نہ سنیں (اس کے بھی وہی مذکورہ بالا دونوں معنی ہو سکتے ہیں) اور (جیسے ان کے پاس سننے کا آلہ نہیں اسی طرح دیکھنے کا آلہ بھی نہیں اور ان کی تصویر میں جو آنکھیں بنادی جاتی ہیں وہ محض نام ہی کی ہوتی ہیں کام کی نہیں چنانچہ) اُن (بتوں) کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں (کیونکہ شکل تو آنکھوں کی سی بنی ہوئی ہے) اور وہ (واقع میں) کچھ بھی نہیں دیکھتے (کیونکہ حقیقت میں تو وہ آنکھیں نہیں اسی پر دوسرے قویٰ فاعلہ ایدی وارجل کی نفی سمجھ لینا چاہئے، پس ایسے عاجز کا کیا ڈراوا دکھلاتے ہو)۔

معارف و مسائل

اِنَّ وَلِیِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ یہاں ولی کے معنی محافظ و مددگار کے ہیں، اور کتاب سے مراد قرآن اور صالحین سے مراد بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو برابر نہ کریں، اس میں انبیاء علیہم السلام سے لے کر عام نیک مسلمانوں تک سب داخل ہیں۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفت کی اس لئے پرواہ نہیں کہ میرا محافظ و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی سب صفات میں سے قرآن نازل کرنے کو خصوصیت سے اِس لئے ذکر کیا کہ تم جو میری عداوت و مخالفت پر جمے ہو، اس کی وجہ قرآن کی تعلیم و دعوت ہے جو میں تمہیں دیتا ہوں تو جس نے مجھ پر یہ قرآن نازل کیا

ہے وہ ہی میرا مددگار و محافظ ہے اس لئے مجھے کیوں فکر ہو۔

اس کے بعد آخری جملے میں عام ضابطہ بتلا دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے عام صالح اور نیک مسلمانوں کا بھی اللہ متولّی اور کفیل ہوتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے اِس لئے ان کو کسی دشمن کی مخالفت اور دشمنی مضر نہیں ہوتی، اکثر اوقات تو دنیا ہی میں وہ ان پر غالب کر دیا جاتا ہے اور اگر کسی وقت بتقاضائے حکمت غالب بھی نہ ہو تو بھی اس کے اصل مقصد میں کوئی خلل نہیں پڑتا، وہ ظاہر میں ناکام ہو کر بھی مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہی ہوتا ہے کیونکہ مؤمن صالح کا اصل مقصد ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور اس کی اِطاعت کرنا ہے، اگر وہ دنیا میں کسی وجہ سے ناکام بھی ہو جائے تو رضائے الٰہی کا اصل مقصد پھر بھی اس کو حاصل ہوتا ہے اور وہ کامیاب ہی ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ

عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے، اور اگر اُبھارے تجھ کو

مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا

شیطان کی چھیڑ تو پناہ مانگ اللہ سے، وہی ہے سننے والا جاننے والا، جن کے دل میں ڈر ہے

اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ۚ

جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا گزر چونک گئے پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے،

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے چلے جاتے ہیں گمراہی میں پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) درگذر کا رویہ اپناؤ، اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو ﴿۱۹۹﴾ اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی کچوکا لگ جائے تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔ یقیناً وہ ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے ﴿۲۰۰﴾ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، اُنہیں جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال آ کر چھوتا بھی ہے تو وہ (اللہ کو) یاد کر لیتے

ہیں، چنانچہ اچانک اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ﴿۲۰۱﴾ اور جو ان شیاطین کے بھائی ہیں، اُن کو یہ شیاطین گمراہی میں گھسیٹے لے جاتے ہیں، نتیجہ یہ کہ وہ (گمراہی سے) باز نہیں آتے ﴿۲۰۲﴾

خلاصہ تفسیر

لوگوں سے یہ برتاؤ رکھئے کہ ان کے اعمال واخلاق میں سے) سرسری (نظر میں جو) برتاؤ (معقول ومناسب معلوم ہوں ان) کو قبول کرلیا کیجئے (ان کی تہ اور حقیقت کی تلاش نہ کیجئے بلکہ ظاہری نظر میں سرسری طور پر جو کام کسی سے اچھا ہو اس کو بھلائی پر محمول کیجئے، باطن کا حال اللہ کے سپرد کیجئے کیونکہ پورا اخلاص ونیز شرائط قبول کی جامعیت اخص الخواص کا حصہ ہے، حاصل یہ کہ معاشرت میں سہولت رکھئے، تشدد نہ کیجئے، یہ برتاؤ تو اچھے کاموں میں ہے) اور (جو کام ظاہر نظر میں بھی بُرا ہو اس میں یہ برتاؤ رکھئے کہ اس باب میں) نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجئے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجئے (اور ان کے بہت درپے نہ ہوجئے) اور اگر (اتفاقاً ان کی جہالت پر) آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا) آنے لگے (جس میں احتمال ہو کہ کوئی بات خلاف مصلحت کے صادر ہو جائے) تو (ایسی حالت میں فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (آپ کے استعاذہ کو سنتا ہے، آپ کے مقصود کو جانتا ہے وہ آپ کو اس سے پناہ دے گا اور جس طرح استعاذہ وتوجہ الی اللہ آپ کے لئے نافع ہے اسی طرح تمام خداترس لوگوں کے لئے بھی نافع ہے، چنانچہ) یقیناً (یہ بات ہے کہ) جو لوگ خداترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا یا اور کسی امر کا) آجاتا ہے تو وہ (فوراً خدا کی) یاد میں لگ جاتے ہیں (جیسے استعاذہ و دُعا اور خدا تعالیٰ کی عظمت وعذاب وثواب کو یاد کرنا) سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (اور حقیقتِ امر اُن پر منکشف ہو جاتی ہے جس سے وہ خطرہ اثر نہیں کرتا) اور (برخلاف اس کے) جو شیاطین کے تابع ہیں وہ (شیاطین) ان کو گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں پس وہ (تابعین گمراہی سے) باز نہیں آتے (نہ وہ استعاذہ کریں نہ محفوظ رہیں، سو وہ مشرکین تو شیطان کے تابع ہیں یہ کب باز آئیں گے اس لئے ان کے غم وغصہ میں پڑنا بے کار ہے)۔

معارف ومسائل

اَخلاقِ قرآنی کا ایک جامع ہدایت نامہ

آیاتِ مذکورہ قرآنی اخلاقِ فاضلہ کا ایک جامع ہدایت نامہ ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

تربیت کر کے آپ کو تمام اوّلین و آخرین میں صاحبِ خلقِ عظیم کا خطاب دیا گیا ہے۔

پچھلی آیتوں میں دشمنانِ اسلام کی کجروی، ہٹ دھرمی اور بد اخلاقیوں کا ذکر کرنے کے بعد ان آیات میں اس کے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاقِ فاضلہ کی ہدایت دی گئی ہے جس کے تین جملے ہیں، پہلا جملہ خُذِ الْعَفْوَ ہے، عربی لغت کے اعتبار سے لفظ عفو کے کئی معنٰی ہو سکتے ہیں اور اس موقع پر ہر معنٰی کی گنجائش ہے، اسی لئے علماءِ تفسیر کی مختلف جماعتوں نے مختلف معنٰی لئے ہیں، جمہورِ مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عفو کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو آسانی کے ساتھ بغیر کسی کلفت اور مشقت کے ہو سکے، تو معنٰی اس جملہ کے یہ ہوئے کہ آپ قبول کر لیا کریں اُس چیز کو جو لوگ آسانی سے کر سکیں یعنی واجباتِ شرعیہ میں آپ لوگوں سے اعلیٰ معیار کا مطالبہ نہ کریں بلکہ وہ جس پیمانہ پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکیں اُتنے ہی درجہ کو قبول کر لیا کریں، مثلاً نماز کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ ساری دُنیا سے منقطع اور یکسو ہو کر اپنے ربّ کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے اس لئے کھڑا ہے کہ حمد و ثنا کے ساتھ اپنے معروضات کو بلا واسطہ بارگاہِ الٰہی میں خود پیش کر رہا ہے گویا وہ اس وقت براہِ راست حق تعالیٰ شانہٗ سے مخاطب ہے، اس کے جو آثار خشوع، خضوع ادب و احترام کے ہونے چاہئیں، ظاہر ہے کہ لاکھوں نمازیوں میں سے کسی کسی اللہ کے بندے کو نصیب ہوتے ہیں عام لوگ اس درجہ کو نہیں پا سکتے تو اِس آیت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی کہ آپ ان لوگوں سے اس اعلیٰ معیار کا مطالبہ ہی نہ رکھیں بلکہ جس درجہ کو وہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہ ہی قبول فرما لیں، اسی طرح دوسری عبادات زکوٰۃ، روزہ، حج اور عام معاملات و معاشرت کے واجباتِ شرعیہ میں جو لوگ پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتے ان سے سرسری اطاعت و فرماں برداری ہی کو قبول کر لیا جائے۔

صحیح بخاری میں بروایت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کے یہی معنٰی نقل کئے گئے ہیں۔ [1]

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال و اخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے، میں نے عزم کر لیا ہے کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا۔ (ابن کثیر) [2]

ائمہ تفسیر کی ایک بڑی جماعت حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، صدیقہ عائشہؓ اور مجاہدؒ وغیرہ نے اس جملہ کے بھی یہی معنٰی قرار دیئے ہیں۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب خذ العفو وأمر بالعرف الآیة ج:۲ ص:۶۶۹

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۳ ص:۵۳۱

دوسرے معنٰی **عفو** کے معافی اور درگزر کرنے کے بھی آتے ہیں، علماء تفسیر کی ایک جماعت نے اس جگہ یہی معنٰی مراد لے کر اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آپ گناہگاروں، خطا کاروں کے گناہ و قصور کو معاف کر دیا کریں۔

امامِ تفسیر ابن جریر طبری نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلِ امین سے آیت کا مطلب پوچھا، جبریلِ امین نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتلایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کر دیں اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اُس پر بخشش کریں اور جو آپ سے تعلق قطع کرے آپ اس سے بھی ملا کریں۔ [۱]

اِس جگہ ابنِ مردویہ نے بروایت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا گیا اور بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر لاش کی بے حرمتی کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش کو اس ہیئت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حمزہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے چھوڑوں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایانِ شان یہ ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیں۔ [۲]

اِس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے عقبہؓ بن عامر کی روایت سے نقل کی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی وہ وہی تھی کہ جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو، جو تم سے قطع تعلق کر دے تم اس سے ملا کرو، جو تمہیں محروم کر دے تم اس کو بخشش دیا کرو۔ [۳]

اور بیہقی نے بروایت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اوّلین و آخرین کے اخلاق سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جو شخص تم کو محروم کرے تم اُس پر بخشش کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو، جو تم سے تعلق قطع کرے تم اُس سے بھی ملا کرو۔ [۴]

لفظ **عفو** کے پہلے اور دوسرے معنٰی میں اگرچہ فرق ہے لیکن حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ لوگوں کے اعمال و اخلاق میں سرسری اطاعت و فرماں برداری کو قبول فرما لیا کریں، زیادہ تجسّس اور تفتیش میں نہ پڑیں، اور ان سے اعلیٰ معیار کی اطاعت کا مطالبہ نہ کریں اور ان کی خطاؤں اور قصور سے درگزر فرمائیں، ظلم کا انتقام نہ لیں، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اخلاق ہمیشہ اسی سانچے میں ڈھلے رہے، جس کا پورا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مکہ فتح ہو کر آپ کے جانی دشمن آپ کے قبضہ میں آئے تو آپ نے سب کو آزاد کر کے فرما دیا کہ تمہارے مظالم کا بدلہ لینا تو کیا ہم تمہیں پچھلے معاملات

---

۱ تفسیر الطبری رقم الحدیث:۱۵۵۴۷ ۲ تفسیر البغوی تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۵۳

۳ مسند احمد، رقم الحدیث:۱۶۶۹۶ ۴ السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۱۰ ص:۲۳۵

پر ملامت بھی نہیں کرتے۔

دوسرا جملہ اِس ہدایت نامہ کا وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ ہے، عُرْف بمعنی معروف ہر اچھے اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ برائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کردیں مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے، ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

تیسرا جملہ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ ہے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ جاہلوں سے آپ کنارہ کش ہوجائیں، مطلب یہ ہے کہ ظلم کا انتقام چھوڑ کر آپ ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو حق بات بتلائیں مگر بہت سے جاہل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس شریفانہ معاملہ سے متأثر نہیں ہوتے، اس کے باوجود جہالت اور سختی سے پیش آتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے دلخراش اور جاہلانہ کلام سے متأثر ہو کر انہیں جیسی سخت گفتگو نہ کریں بلکہ ان سے کنارہ کش ہوجائیں۔

امام تفسیر ابنِ کثیر نے فرمایا کہ کنارہ کش ہونے کا بھی مطلب یہ ہے کہ ان کی بُرائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ معنٰی نہیں کہ ان کو ہدایت کرنا چھوڑ دیں کہ یہ وظیفہ رسالت و نبوّت کے شایانِ شان نہیں۔ [۱]

صحیح بخاری میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں عیینہ ابن حصن مدینہ آیا اور اپنے بھتیجے حُرّ ابن قیس رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا، حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہ اُن اہلِ علم حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلسِ مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجے حرّ بن قیسؓ سے کہا کہ تم امیر المؤمنین کے مقرب ہو میرے لئے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو، حُرّ بن قیسؓ نے فاروق اعظمؓ سے درخواست کی کہ میرا چچا عیینہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، آپ نے اجازت دے دی۔

مگر عیینہ نے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی کہ نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں، نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں، فاروقِ اعظمؓ کو اس پر غصہ آیا تو حرّ بن قیسؓ نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے، یہ آیت سنتے ہی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا سارا غصہ ختم ہوگیا اور اس کو کچھ نہیں کہا، حضرت فاروقِ اعظمؓ کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ یعنی کتاب اللہ کے اَحکام کے آگے گردن ڈالتے تھے۔ [۲]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۵۳۲

[۲] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب "خذ العفو وامر بالعرف" الآية ج:۲ ص:۶۶۹

یہ آیت مکارمِ اخلاق کی جامع آیت ہے، بعض علماء نے اس کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں ایک محسن یعنی اچھے کام کرنے والے، دوسرے بدکار ظالم، اس آیت نے دونوں طبقوں کے ساتھ اخلاقِ کریمانہ برتنے کی یہ ہدایت دی ہے کہ نیک کام کرنے والوں سے ان کی ظاہری نیکی کو قبول کرلو، زیادہ تفتیش و تجسّس میں نہ پڑو، اور نیکی کے اعلیٰ معیار کا ان سے مطالبہ نہ کرو بلکہ جتنا وہ آسانی سے کرسکیں اس کو کافی سمجھو، اور بدکاروں کے معاملہ میں یہ ہدایت دی کہ ان کو نیک کام سکھلاؤ اور نیکی کا راستہ بتلاؤ، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں اور اپنی گمراہی اور غلطی پر جمے رہیں اور جاہلانہ گفتگو سے پیش آئیں تو ان سے علیحدہ ہوجائیں اور ان کی جاہلانہ گفتگو کا جواب نہ دیں، اس طرز سے یہ امید ہے کہ ان کو کسی وقت ہوش آئے اور اپنی غلطی سے باز آجائیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ یعنی اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ سے پناہ مانگ لیں، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

درحقیقت یہ آیت بھی پہلی آیت کے مضمون کی تکمیل ہے کیونکہ اُس میں جو ہدایت دی گئی ہے کہ ظلم کرنے والوں اور جہالت سے پیش آنے والوں کی خطا سے درگزر کریں، ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ بات اِنسانی طبیعت کے لئے سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہے، خصوصاً ایسے مواقع میں شیطان اچھے بھلے انسان کو بھی غصہ دِلا کر لڑنے جھگڑنے پر آمادہ کرہی دیتا ہے، اس لئے دوسری آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر ایسے صبر آزما موقع میں غصہ کے جذبات زیادہ مشتعل ہوتے نظر آئیں تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

حدیث میں ہے کہ دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے لڑ جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصہ میں بے قابو ہو رہا تھا، آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا یہ اشتعال جاتا رہے، فرمایا وہ کلمہ یہ ہے، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر فوراً یہ کلمہ پڑھ لیا تو فوراً ہی سارا غصہ اور اشتعال ختم ہوگیا۔ [1]

فائدہ عجیبہ

امامِ تفسیر ابن کثیرؒ نے اس جگہ ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ پورے قرآن میں تین آیتیں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تلقین کے لئے جامع آئی ہیں اور تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، ایک تو یہی سورۂ اعراف کی آیت ہے، دوسری سورۂ مؤمنون کی یہ آیت ہے، اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ

[1] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ما یقول عند الغضب ج:۲ ص:۱۸۳

هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيۡنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ يَّحۡضُرُوۡنِ ﴿۹۸﴾ (المؤمنون) یعنی دفع کرو برائی کو بھلائی سے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں اور آپ یوں دُعا کیجئے کہ اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے دباؤ سے اور اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

تیسری آیت سورہ حم سجدہ کی یہ ہے، وَلَا تَسۡتَوِى الۡحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِىۡ بَيۡنَكَ وَبَيۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰٮهَاۤ اِلَّا الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا يُلَقّٰٮهَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِيۡمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۶﴾

یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں، اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہے، اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

اِن تینوں آیتوں میں غصہ دلانے والوں سے عفو ودرگزر اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے، جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے شیاطین اس کو اپنی شکارگاہ بنا لیتے ہیں، اور بڑے سے بڑے بُردبار باوقار آدمی کو غصہ دِلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے پناہ مانگیں تب مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہو سکے گی، اسی لئے بعد کی تیسری اور چوتھی آیت میں بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ [۱]

وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ

اور جب تو لے کر نہ جائے ان کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہ چھانٹ لایا تو اپنی طرف سے، تو کہہ دے میں تو چلتا ہوں

مَا يُوۡحٰۤى اِلَىَّ مِنۡ رَّبِّىۡ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ

اس پر جو حکم آئے میری طرف میرے ربّ سے، یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمہارے ربّ کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج: ۳ ص: ۵۳۱، ۵۳۲

لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا

ان لوگوں کو جو مؤمن ہیں، اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

تاکہ تم پر رحم ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) جب تم ان کے سامنے (ان کا منہ مانگا) معجزہ پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ: ''تم نے یہ معجزہ خود اپنی پسند سے کیوں نہ پیش کر دیا؟'' کہہ دو کہ: ''میں تو اُسی بات کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رَبّ کی طرف سے وحی کے ذریعے مجھ تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ (قرآن) تمہارے رَبّ کی طرف سے بصیرتوں کا مجموعہ ہے، اور جو لوگ ایمان لائیں اُن کے لئے ہدایت اور رحمت!'' ﴿۲۰۳﴾ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اُس کو کان لگا کر سنو، اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحمت ہو۔ ﴿۲۰۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب آپ (ان کے فرمائشی معجزات میں سے جن کی فرمائش براہِ عناد کرتے تھے) کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے (بوجہ اس کے کہ حق تعالیٰ اس معجزہ کو مقتضائے حکمت پیدا نہیں کرتے) تو وہ لوگ (بقصد نفی رسالت آپ سے) کہتے ہیں کہ آپ (اگر نبی ہیں تو) یہ معجزہ کیوں نہ (ظہور میں) لائے، آپ فرما دیجئے کہ (میرا کام معجزات باختیارِ خود لانا نہیں بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ) میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے ربّ کی طرف سے حکم بھیجا گیا ہے (اس میں تبلیغ بھی آ گئی البتہ نبوّت کے اثبات کے لئے نفسِ معجزہ ضروری ہے سو ان کا وقوع ہو چکا ہے چنانچہ ان میں سب سے اعظم ایک یہی قرآن ہے جس کی شان یہ ہے کہ) یہ (بجائے خود) گویا بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے ربّ کی طرف سے (کیونکہ اس کی ہر مقدار سورت مثلاً ایک معجزہ ہے تو اس حساب سے مجموعۂ قرآن کتنی دلیلیں ہوا اور اس کا یہ دلیل ہونا تو عام ہے) اور (رہا اس کا نفع بالفعل تو وہ خاص ہے ماننے والوں کے ساتھ چنانچہ وہ) ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو (اس پر) ایمان رکھتے ہیں اور (آپ ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) جب قرآن پڑھا جایا کرے (مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس کی تبلیغ فرمائیں) تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو (تا کہ اس کا معجز ہونا اور اس کی تعلیم کی خوبی سمجھ میں آئے جس سے) اُمید ہے کہ تم پر رحمت ہو (جدید یا مزید)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کا ثبوت اور اُس پر مخالفین کے شبہات کا جواب اور ان دونوں کے ضمن میں چند احکامِ شرعیہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

رسالت کے ثبوت کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے جاتے ہیں، سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مناسبت سے اتنے معجزات عطا کئے گئے جو پچھلے انبیاء کے معجزات سے بہت زائد بھی ہیں اور واضح بھی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو قرآن مجید اور صحیح روایات حدیث سے ثابت ہیں ان کی بڑی تعداد ہے، علماء نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب خصائصِ کبریٰ دو ضخیم جلدوں میں اسی موضوع پر لکھی ہوئی مشہور و معروف ہے۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات سامنے آنے کے باوجود مخالفین اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اپنی طرف سے متعین کر کے نئے نئے معجزات دکھلانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جس کا ذکر اسی سورت میں پہلے بھی آچکا ہے۔

متذکرہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں ان کا ایک اصولی جواب دیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر کا معجزہ اس کی رسالت کی ایک شہادت اور ثبوت ہوتا ہے اور جب مدعی کا دعویٰ کسی معتبر شہادت سے ثابت ہو جائے اور فریق مخالف نے اس پر کوئی جرح بھی نہ کی ہو تو اس کو دنیا کی کسی عدالت میں یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مدعی سے اس کا مطالبہ کرے کہ فلاں فلاں مخصوص لوگوں کی شہادت پیش کرے تو ہم مانیں گے موجودہ شہادت پر کوئی جرح پیش کئے بغیر ہم تسلیم نہیں کرتے، اس لئے بہت سے واضح معجزات کے دیکھنے کے بعد مخالفین کا یہ کہنا کہ فلاں قسم کا خاص معجزہ دکھلایئے تو ہم آپ کو رسول مانیں ــــ یہ ایک معاندانہ مطالبہ ہے جس کو کوئی عدالت صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جب آپ ان لوگوں کا متعین کیا ہوا کوئی خاص معجزہ نہیں دکھلاتے تو یہ آپ کی رسالت کا انکار کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ آپ نے فلاں معجزہ کیوں نہیں دکھلایا، تو آپ ان کو یہ جواب دے دیجئے کہ میرا کام باختیارِ خود معجزات دِکھلانا نہیں بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ میں ان احکام کا اتباع کروں جو مجھ پر میرے ربّ کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجے جاتے ہیں جن میں تبلیغ بھی شامل ہے اس لئے میں اپنے اصلی کام میں مشغول ہوں اور رسالت کے لئے وہ دُوسرے معجزات بھی کافی ہیں جو تم سب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد کسی خاص

معجزہ کا مطالبہ ایک معاندانہ مطالبہ ہے جو قابل اِلتفات نہیں۔

اور جو معجزات دکھلائے گئے ہیں ان میں سے قرآن خود ایک عظیم معجزہ ہے جس نے ساری دنیا کو اپنا بلکہ اپنی ایک چھوٹی سی سورت کا مثل لانے کا کھلا چیلنج دیا اور ساری دنیا باوجود پوری کوششوں کے اس کا مثل لانے سے عاجز ہوگئی جو نہایت واضح علامت اس بات کی ہے کہ قرآن کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کا بے مثل کلام ہے۔

اس لئے فرمایا هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی یہ قرآن تمہارے رَبّ کی طرف سے بہت سی دلیلوں اور معجزوں کا مجموعہ ہے، جن میں ادنیٰ غور کرنے والا یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ شانہٗ کا ہی ہے، کسی مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں، اس کے بعد فرمایا وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ یعنی یہ قرآن دلیلِ حق تو سارے جہان کے لئے ہے مگر مقصد تک پہنچانے والا اور رحمتِ حق تعالیٰ کا مستحق بنانے والا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس پر ایمان لائیں۔

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ قرآن مجید مؤمنین کے لئے رحمت ہے مگر اس رحمت سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط وآداب ہیں جن کو خطاب عام کے ساتھ اس طرح ذکر فرمایا، وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو تم اس پر کان لگاؤ اور خاموش رہو۔

اِس آیت کے شانِ نزول میں روایات مختلف ہیں کہ یہ حکم نماز کی قراءت کے بارے میں آیا ہے یا خطبہ کے یا مطلقاً قراءتِ قرآن کے خواہ نماز یا خطبہ میں ہو یا دوسرے حالات میں، لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس طرح الفاظ آیت کے عام ہیں اِسی طرح اس کا حکم بھی سب حالات کے لئے عام ہے بجز خاص اِستثنائی مواقع کے۔

اسی لئے حنفیہ نے اس آیت سے اس پر اِستدلال کیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قراءت نہیں کرنا چاہئے، اور جن فقہاء نے مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی ہدایت کی ہے ان میں بھی بعض نے اس کی رعایت رکھی ہے کہ امام کے سکتہ کے وقت فاتحہ پڑھی جائے یہاں اُس بحث کا موقع نہیں، اس بحث میں علماء نے مستقل کتابیں چھوٹی بڑی بہت لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اصل مضمون آیت کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم جن لوگوں کے لئے رحمت قرار دیا گیا اس کی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن کے ادب واحترام کو پہچانیں اور اس پر عمل کریں، اور بڑا ادب قرآن کا یہ ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو سننے والے اپنے کان اس پر لگائیں اور خاموش رہیں۔

کان لگانے میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو سنیں اور یہ بھی کہ اس کے اَحکام پر عمل کرنے کی جدوجہد کریں (مظہری وقرطبی)[1]، آخرِ آیت میں لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ فرما کر اِس طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کا رحمت ہونا اس کے مذکورہ آداب

---

[1] التفسیر المظہری تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۴۴۸، وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۳۵۵

بجالانے پر موقوف ہے۔

تلاوتِ قرآن کے وقت خاموش رہ کر سننے کے متعلق چند ضروری مسائل

اس کے بالمقابل یہ خود ظاہر ہے کہ اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کر کے قرآن کی بے حرمتی کی تو وہ رحمت کے بجائے قہر وغضب کا مستحق ہوگا۔

نماز کے اندر قرآن کی طرف کان لگانا اور خاموش رہنا تو عام طور پر مسلمانوں کو معلوم ہے گو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ امام نے کون سی سورت پڑھی ہے، ان پر لازم ہے کہ وہ قرآن کی عظمت کو پہچانیں اور سننے کی طرف دھیان رکھیں، خطبہ جمعہ وغیرہ کا بھی شرعاً یہی حکم ہے، علاوہ اس آیت کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد خاص طور سے خطبہ کے متعلق یہ آیا ہے کہ:

اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَا صَلَاۃَ وَلَا کَلَامَ یعنی جب امام خطبہ کے لئے نکل آئے تو نہ نماز ہے نہ کلام۔[1]

اور ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس وقت کوئی شخص دوسرے کو نصیحت کے لئے زبان سے یہ بھی نہ کہے کہ خاموش رہو[2] (کرنا ہی ہو تو ہاتھ سے اشارہ کر دے) غرض دورانِ خطبہ میں کسی طرح کا کلام، تسبیح، درود یا نماز وغیرہ جائز نہیں۔

فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو حکم خطبہ جمعہ کا ہے وہی عیدین کے خطبہ کا اور نکاح وغیرہ کے خطبہ کا ہے کہ اس وقت کان لگانا اور خاموش رہنا واجب ہے۔[3]

البتہ نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہے تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے اس صورت میں بھی کان لگانے اور خاموش رہنے کو واجب اور اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا ہے، اور اسی لئے ایسی جگہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں یا آرام کرتے ہوں کسی کے لئے بآوازِ بلند قرآن پڑھنے کو جائز نہیں رکھا اور جو شخص ایسے مواقع میں قرآن بآوازِ بلند پڑھتا ہے اس کو گناہگار فرمایا ہے، خلاصۃ الفتاویٰ وغیرہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔[4]

لیکن بعض دوسرے فقہاء نے یہ تفصیل فرمائی ہے کہ کان لگانا اور سننا صرف ان جگہوں میں واجب ہے جہاں قرآن کو سنانے ہی کے لئے پڑھا جا رہا ہو، جیسے نماز وخطبہ وغیرہ ہیں اور اگر کوئی شخص بطورِ خود تلاوت کر رہا ہے یا چند آدمی کسی ایک مکان میں اپنی اپنی تلاوت کر رہے ہیں تو دوسرے کی آواز پر کان لگانا اور خاموش رہنا واجب نہیں، کیونکہ احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں جہراً قراءت فرماتے تھے اور ازواجِ مطہرات اس وقت نیند

---

۱ مجمع الزوائد رقم الحدیث: ۳۱۲، لکن الفاظہ مختلفۃ۔ ۲ کنز العمال رقم الحدیث: ۲۱۲۱۴

۳ الشامی، کتاب الصلوٰۃ، مطلب السنۃ تکون سنۃ عین وسنۃ کفایۃ ج: ۱ ص: ۵۴۵ ۴ خلاصۃ الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۱۰۳

میں ہوتی تھیں، بعض اوقات حجرہ سے باہر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی جاتی تھی۔

اور بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں رات کو پڑاؤ ڈالنے کے بعد صبح کو فرمایا کہ میں نے اپنے اشعری رفقائے سفر کو ان کی تلاوت کی آوازوں سے رات کے اندھیرے میں پہچان لیا کہ ان کے خیمے کس طرف اور کہاں ہیں، اگرچہ دن میں مجھے ان کے جائے قیام کا علم نہیں تھا۔[1]

اس واقعہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعری حضرات کو اس سے منع نہیں فرمایا کہ بلند آواز سے کیوں قراءت کی اور نہ سونے والوں کو ہدایت فرمائی کہ جب قرآن پڑھا جارہا ہو تو تم سب اٹھ بیٹھو اور قرآن سنو۔

اس قسم کی روایات سے فقہاء نے خارج نماز کی تلاوت کے معاملہ میں کچھ گنجائش دی ہے، لیکن اولیٰ اور بہتر سب کے نزدیک یہی ہے کہ خارج نماز بھی جب کہیں سے تلاوتِ قرآن کی آواز آئے تو اس پر کان لگائے اور خاموش رہے اور اسی لئے ایسے مواقع میں جہاں لوگ سونے میں یا اپنے کاروبار میں مشغول ہوں، تلاوتِ قرآن بآوازِ بلند کرنا مناسب نہیں۔

اس سے ان حضرات کی غلطی معلوم ہوگئی جو تلاوتِ قرآن کے وقت ریڈیو ایسے مجامع میں کھول دیتے ہیں جہاں لوگ اس کے سننے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اِسی طرح رات کو لاؤڈ اسپیکر لگا کر مسجدوں میں تلاوتِ قرآن اس طرح کرنا کہ اس کی آواز سے باہر کے سونے والوں کی نیند یا کام کرنے والوں کے کام میں خلل آئے، دُرست نہیں۔

علامہ ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ جس وقت امام نماز میں یا خطیب خطبہ میں کوئی مضمون جنت و دوزخ کے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس وقت جنت کی دُعاء یا دوزخ سے پناہ مانگنا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وعدہ اس شخص کے لئے ہے جو تلاوت قرآن کے وقت خاموش رہے، اور جو خاموش نہ رہے اس سے وعدہ نہیں، البتہ نفل نمازوں میں ایسی آیات کی تلاوت کے بعد آہستہ دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے اور موجبِ ثواب ہے۔ (مظہری)[2]

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ

اور یاد کرتا رہ اپنے رَبّ کو اپنے دِل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو

---

۱ صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر ج:۲ ص:۶۰۸، وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل الأشعریین ج:۲ ص:۳۰۳

۲ التفسیر المظہری تحت هذه الآیة ج:۳ ص:۴۵۲، وفتح القدیر ج:۲ ص:۱۶۲، کتاب الصلوٰة، فصل فی القراءة

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ

صبح کے وقت اور شام کے وقت اور مت رہ بے خبر، بیشک جو تیرے ربّ کے نزدیک ہیں

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدة ع ۲۴/۱۴

وہ تکبر نہیں کرتے اس کی بندگی سے اور یاد کرتے ہیں اس کی پاک ذات کو اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں

السجدة ۱ الثلثة

آسان ترجمۂ قرآن

اور اپنے رَبّ کا صبح وشام ذکر کیا کرو، اپنے دِل میں بھی، عاجزی اور خوف کے (جذبات کے) ساتھ، اور زبان سے بھی، آواز بہت بلند کئے بغیر! اور اُن لوگوں میں شامل نہ ہوجانا جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۲۰۵﴾ یاد رکھو کہ جو (فرشتے) تمہارے رَبّ کے پاس ہیں، وہ اُس کی عبادت سے تکبر کر کے منہ نہیں موڑتے، اور اُس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اُسی کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ﴿۲۰۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (آپ ہر شخص سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) اے شخص اپنے رَبّ کی یاد کیا کر (قرآن سے یا تسبیح وغیرہ سے خواہ) اپنے دل میں (یعنی آہستہ آواز سے) عاجزی کے ساتھ اور (خواہ) زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ اسی عاجزی اور خوف کے ساتھ صبح وشام، (یعنی علی الدوام) اور (دوام کا مطلب یہ ہے کہ) اہلِ غفلت میں شمار مت ہونا (کہ اذکارِ ماموربہا بھی ترک کردو) یقیناً جو (ملائکہ) تیرے ربّ کے نزدیک (مقرّب) ہیں وہ اس کی عبادت سے (جس میں اصلی عقائد ہیں) تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں (جو کہ طاعت لسانی ہے) اور اس کو سجدہ کرتے ہیں (جو کہ اعمالِ جوارح سے ہے)۔

معارف ومسائل

ان سے پہلی آیات میں قرآن مجید سننے کا ذِکر اور اس کے آداب کا بیان تھا، اِن دو آیتوں میں جمہور کے نزدیک مطلق ذِکر اللہ کا حکم اور اس کے آداب کا بیان ہے جس میں تلاوتِ قرآن بھی شامل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس

رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس میں بھی ذکر سے مراد قرآن ہی ہے اور جو آداب اس میں بیان ہوئے ہیں وہ بھی تلاوتِ قرآن ہی سے متعلق ہیں، لیکن یہ کوئی اختلاف نہیں کیونکہ علاوہ قرآن کے دوسرے اذکار کا بھی سب کے نزدیک یہی حکم اور یہی آداب ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اِس آیت میں انسان کو اللہ کی یاد اور ذکر کا حکم اور اس کے ساتھ اُس کے اوقات اور آداب کا بیان ہے۔

ذِکرِ خفی اور ذِکرِ جہر کے اَحکام

پہلا ادب ذکر کے آہستہ یا بلند آواز سے کرنے کے متعلق ہے اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے اس آیت میں دو طرح کا اختیار دیا ہے، ذکرِ خفی اور ذکرِ جہر ـــــــ ذکرِ خفی کے بارے میں فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ یعنی اپنے ربّ کو یاد کیا کرو اپنے دل میں، اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بغیر زبان کی حرکت کے صرف دل میں دھیان اور خیال اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا رکھے جس کو ذکرِ قلبی یا تفکر کہا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان سے بھی آہستہ آواز میں اسماءِ الٰہیہ کے حروف ادا کرے، سب سے افضل اور بہتر صورت یہی ہے کہ جو ذکر کر رہا ہے اس کے مفہوم کو سمجھ کر دِل میں بھی اس کا پورا استحضار اور دھیان ہو اور زبان سے بھی ادا کرے کیونکہ اس صورت میں قلب کے ساتھ زبان بھی ذکر میں شریک ہو جاتی ہے اور اگر صرف دِل ہی دل میں دھیان اور تفکر میں مشغول رہے زبان سے کوئی حرف ادا نہ کرے وہ بھی بڑا ثواب ہے اور سب سے کم درجہ اس کا ہے کہ صرف زبان پر ذکر ہو اور قلب اس سے خالی اور غافل ہو، ایسے ہی ذکر کو مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

بر زُباں تسبیح ودر دِل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر [1]

اور مقصد مولانا رومیؒ کا یہ ہے کہ قلبِ غافل کے ذکر کرنے سے ذکر کے آثار وبرکات کامل حاصل نہیں ہوتے، اس کا انکار نہیں کہ یہ صرف زبانی ذکر بھی ثواب اور فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ بعض اوقات یہ زبانی ذکر ہی قلبی ذکر کا ذریعہ اور سبب بن جاتا ہے، زبان سے کہتے کہتے قلب بھی متاثر ہونے لگتا ہے اور کم از کم ایک عضو تو ذکر میں مشغول ہے ہی، وہ بھی ثواب سے خالی نہیں، اس لئے جن لوگوں کو ذکر وتسبیح میں دلجمعی اور دھیان اور استحضار نہیں ہوتا وہ بھی ایسے ذکر کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑیں نہیں، جاری رکھیں اور استحضار کی کوشش کرتے رہیں۔

دوسرا طریقہ ذکر کا اسی آیت میں یہ بتلایا وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ یعنی زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔

---

[1] ترجمہ: زبان پر تسبیح اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال، ایسی تسبیح کیا اثر رکھتی ہے؟

یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے والے کو یہ بھی اختیار ہے کہ آواز سے ذکر کرے مگر اس کا ادب یہ ہے کہ بہت زور سے چیخ کر نہ کرے متوسّط آواز کے ساتھ کرے جس میں ادب واحترام ملحوظ رہے، بہت زور سے ذکر و تلاوت کرنا اس کی علامت ہوتی ہے کہ مخاطب کا ادب واحترام اس کے دل میں نہیں، جس ہستی کا ادب واحترام اور رعب انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کے سامنے طبعی طور پر انسان بہت بلند آواز سے نہیں بول سکتا، اس لئے عام ذکر اللہ ہو یا تلاوتِ قرآن جب آواز سے پڑھا جائے تو اس کی رعایت رکھنا چاہئے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن کے تین طریقے حاصل ہوئے، ایک یہ کہ صرف ذکرِ قلبی یعنی معانی قرآن اور معانی ذکر کے تصوّر اور تفکر پر اکتفاء کرے، زبان کو بالکل حرکت نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان کو بھی حرکت دے مگر آواز بلند نہ ہو جس کو دوسرے آدمی سن سکیں، یہ دونوں طریقے ذکر کے ارشادِ ربانی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ میں داخل ہیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ استحضارِ قلب اور دھیان کے ساتھ زبان کی حرکت بھی ہو اور آواز بھی، مگر اس طریق کے لئے ادب یہ ہے کہ آواز کو زیادہ بلند نہ کرے، متوسط حد سے آگے نہ بڑھائے، یہ طریقہ ارشادِ قرآنی وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ میں تلقین فرمایا گیا ہے، قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے، وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ (بنی اسرائیل) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اپنی قراءت میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل اخفاء، بلکہ جہر اور اخفاء کے درمیانی کیفیت رکھا کریں۔

نماز میں قراءتِ قرآن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کو یہی ہدایت فرمائی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر رات میں گھر سے نکلے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ کر رہے تھے، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، جب صبح کو یہ دونوں حضرات حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ نے صدیقِ اکبرؓ سے فرمایا کہ میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے، صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے، اسی طرح فاروقِ اعظمؓ سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ قراءت میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صدیق اکبرؓ کو یہ ہدایت کی کہ ذرا کچھ آواز بلند کیا کریں اور فاروقِ اعظمؓ کو یہ کہ کچھ پست کیا کریں۔ (ابوداؤد) [1]

---

[1] سنن ابی داوٗد، کتاب الصلوٰة، باب فی رفع الصوت بالقراءة فی صلوٰة اللیل ج:۱ ص:۱۸۸

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے بارے میں بعض حضرات نے سوال کیا کہ جہراً کرتے تھے یا سِرّاً؟ انہوں نے فرمایا کہ کبھی جہراً کبھی سِرّا، دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے۔ [۱]

رات کی نفل نماز میں اور خارجِ نماز تلاوت میں بعض حضرات نے جہر پسند کیا، بعض نے آہستہ کو، اسی لئے امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ تلاوت کرنے والے کو اختیار ہے جس طرح چاہے تلاوت کرے، البتہ آواز سے تلاوت کرنے میں چند شرائط سب کے نزدیک ضروری ہیں، اوّل یہ کہ اس میں نام ونمود اور رِیاء کا اندیشہ نہ ہو، دوسرے اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کا حرج یا تکلیف نہ ہو، کسی دوسرے شخص کی نماز وتلاوت یا کام میں یا آرام میں خلل انداز نہ ہو، اور جہاں نام ونمود اور ریاء کا یا دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل کا اندیشہ ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔

اور جو حکم تلاوتِ قرآن کا ہے وہی دوسرے اذکار وتسبیح کا ہے کہ آہستہ اور بلند آواز سے دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ آواز اتنی بلند نہ ہو جو خشوع وخضوع اور ادب کے خلاف ہو نیز اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل نہ آتا ہو۔

اور اس کا فیصلہ کہ سرّاً اور جہراً میں سے افضل کیا ہے، اشخاص اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہے، بعض لوگوں کے لئے جہر بہتر ہوتا ہے بعض کے لئے آہستہ، نیز بعض اوقات جہر بہتر ہوتا ہے بعض وقت سرّ۔ (تفسیر مظہری وروح البیان وغیرہ) [۲]

دوسرا ادب تلاوت اور ذکر کا یہ ہے کہ عاجزی اور تضرّع کے ساتھ ذکر کیا جاوے جو نتیجہ اس کا ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال مستحضر ہو اور جو ذکر کر رہا ہے اس کے معنٰی ومفہوم پر نظر ہو۔

تیسرا ادب اسی آیت میں لفظ خِیْفَۃً سے یہ بتلایا گیا کہ ذکر وتلاوت کے وقت انسان پر ہیبت اور خوف کی کیفیت ہونا چاہیئے، خوف اس کا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور عظمت کا حق ادا نہیں کر سکتے، ممکن ہے کہ ہم سے کوئی بے ادبی ہو جائے، نیز اپنے گناہوں کے استحضار سے عذابِ الٰہی کا خوف نیز انجام اور خاتمہ کا خوف کہ معلوم نہیں ہمارا خاتمہ کس حال پر ہونا ہے، بہر حال ذکر وتلاوت اس طرح کیا جائے جیسے کوئی ہیبت زدہ ڈرنے والا کیا کرتا ہے۔

یہی آدابِ دُعا اسی سورۂ اعراف کے شروع میں بھی ایک آیت میں اس طرح آئے ہیں اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (الاعراف:۵۵) اس میں خِیْفَۃً کے بجائے خُفْيَةً کا لفظ آیا ہے جس کے معنٰی آہستہ آواز سے ذکر کرنے کے

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی قراءۃ اللیل ج:۱ ص:۱۰۰

[۲] التفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۴۵۳، ۴۵۴، وروح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۸۱۶، ۸۱۷

ہیں، گویا ذکر و تلاوت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آہستہ پست آواز سے کیا جائے، لیکن اس آیت نے اس کے معنی بھی واضح کر دیئے کہ اگرچہ آواز سے ذکر کرنا بھی ممنوع نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ کرے، نیز اتنی بلند نہ کرے جس میں خشوع خضوع اور عاجزی و تضرّع کی کیفیت جاتی رہے۔

آخرِ آیت میں ذکر و تلاوت کے اوقات بتلائے کہ صبح و شام ہونا چاہئے اس کے یہ معنٰی بھی ہو سکتے ہیں کہ کم از کم دن میں دو مرتبہ صبح اور شام ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح شام بول کر مراد تمام لیل و نہار کے اوقات ہوں جیسے مشرق مغرب بول کر سارا عالم مراد لیا جاتا ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ اِنسان پر لازم ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں ذکر و تلاوت کا پابند رہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ [1]

آخرِ آیت میں فرمایا وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ یعنی اللہ کی یاد کو چھوڑ کر غفلت والوں میں شامل نہ ہو جانا کہ یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔

دُوسری آیت میں لوگوں کی عبرت و نصیحت کے لئے مقرّبانِ بارگاہِ الٰہی کا ایک مخصوص حال بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے مراد اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونا ہے، جس میں سب فرشتے اور تمام انبیاء علیہم السلام اور صالحین اُمت شامل ہیں، اور تکبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھ کر ان عبادات میں قصور نہیں کرتے بلکہ اپنے کو عاجز و محتاج سمجھ کر ہمیشہ اللہ کی یاد اور عبادت میں مشغول اور تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے رہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو دائمی عبادت اور یادِ خدا کی توفیق ہوتی ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے پاس ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معیت ان کو حاصل ہے۔

سجدہ کے بعض فضائل اور اَحکام

یہاں عبادتِ نماز میں سے صرف سجدہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ تمام ارکانِ نماز میں سجدہ کو خاص فضیلت حاصل ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جس سے میں جنت میں جا سکوں، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا، پھر بھی خاموش رہے، جب تیسری مرتبہ

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب ذكر الله تعالى في حال الجنابة وغيرها ج:۱ ص:۱۶۲

سوال کو دہرایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے یہی سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، آپ نے مجھے یہ وصیت فرمائی کہ کثرت سے سجدے کیا کرو کیونکہ جب تم ایک سجدہ کرتے ہو تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرما دیتے ہیں، یہ شخص کہتے ہیں کہ حضرت ثوبانؓ کے بعد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ملا تو ان سے بھی یہی سوال کیا، اُنہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ [۱]

اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اپنے رَبّ کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جبکہ بندہ سجدہ میں ہو، اس لئے تم سجدہ کی حالت میں خوب دُعاء کیا کرو کہ اس کے قبول ہونے کی بڑی امید ہے۔ [۲]

یاد رہے کہ تنہا سجدہ کی کوئی عبادت معروف نہیں، اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کثرت سجود سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کریں، جتنی نفلیں زیادہ ہوں گی سجدے زیادہ ہوں گے۔

لیکن اگر کوئی شخص تنہا سجدہ ہی کر کے دُعا کر لے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور سجدہ میں دُعا کرنے کی ہدایت نفلی نمازوں کے لئے مخصوص ہے فرائض میں نہیں۔

سورۂ اعراف ختم ہوئی، اس کی آخری آیت آیتِ سجدہ ہے، صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ جب کوئی آدم کا بیٹا کوئی آیتِ سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا بھاگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ملا اور اس نے تعمیل کر لی تو اس کا ٹھکانہ جنت ہوا، اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا میں نے نافرمانی کی تو میرا ٹھکانہ جہنم ہوا۔ [۳]

***

[۱] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل السجود والحث علیه، ج:۱ ص:۱۹۳

[۲] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود ج:۱ ص:۱۹۱

[۳] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ ج:۱ ص:۶۱

سُوْرَةُ الْاَنْفَال

اٰیاتها ۷۵ ۸ سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ ۸۸ رکوعاتها ۱۰

سورۂ انفال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچھتّر آیتیں اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا، تو کہہ دے کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا، سو ڈرو اللہ سے

وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

اور صلح کرو آپس میں، اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر ایمان رکھتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) لوگ تم سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ مالِ غنیمت (کے بارے میں فیصلے)

کا اختیار اللہ اور رسول کو حاصل ہے۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور آپس کے تعلقات درست کرلو، اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم واقعی مؤمن ہو ①

مضامینِ سورت

سورۂ انفال جو اس وقت شروع ہو رہی ہے مدنی سورت ہے، اس سے پہلی سورت یعنی سورۂ اعراف میں مشرکین اور اہلِ کتاب کے جہل و عناد اور کفر و فساد کا تذکرہ اور اس کے متعلقہ مباحث کا بیان تھا۔

اس سورت میں زیادہ تر مضامین غزوۂ بدر کے موقع پر انہیں لوگوں کے انجامِ بد، ناکامی اور شکست، اور اُن کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی اور فتوحات سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کے لئے احسان و انعام اور کفار کے لئے عذاب و انتقام تھا۔

اور چونکہ اس انعام کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا خلوص اور للّٰہیت اور اُن کا باہمی اتفاق ہے اور یہ اخلاص و اتفاق کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کا اس لئے شروع سورت میں تقویٰ اور اطاعتِ حق اور ذکر اللہ اور توکل وغیرہ کی تعلیم دی گئی۔

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں (یعنی وہ اللہ کی مِلک ہیں اُسی کو حق ہے کہ اُن کے متعلق جو چاہیں حکم دے) اور رسول کی ہیں (بایں معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر اُس کو نافذ کریں گے حاصل یہ ہے کہ اموالِ غنیمت کے بارہ میں تمہاری رائے اور تجویز کا کوئی دخل نہیں بلکہ اُس کا فیصلہ حکمِ شرعی پر ہوگا) تو تم (دنیا کی حرص مت کرو آخرت کے طالب رہو اس طرح پر کہ) اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (کہ آپس میں حسد اور بغض نہ رہے) اور اللہ کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

معارف و مسائل

یہ آیت غزوۂ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے متعلق ہے، آیت کی مفصل تفسیر سے پہلے وہ واقعہ سامنے رکھا جائے تو تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جو کفر و اسلام کا سب سے پہلا معرکہ تھا اس میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ

مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرام کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جو اخلاص و اتفاق کے اُس مقام کے شایان نہ تھا جس پر صحابہ کرام کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی تھی اس لئے سب سے پہلی ہی آیت میں اس کا فیصلہ فرما دیا گیا تا کہ اس مقدس گروہ کے قلوب میں صدق و اخلاص اور اتفاق و ایثار کے سوا کچھ نہ رہے۔

اس واقعہ کی تفصیل غزوۂ بدر کے شریک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی مسند احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ، مستدرک حاکم وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے کسی نے آیتِ مذکورہ میں لفظ انفال کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحابِ بدر ہی کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارہ میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ اموالِ غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرینِ بدر میں اُس کو مساوی طور پر تقسیم فرما دیا۔ [1]

صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی تو اب ہمارے لشکر کے تین حصے ہو گئے، کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تا کہ وہ پھر واپس نہ آ سکے، کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اس لئے جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہ کر دے۔ جب جنگ ختم ہو گئی اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے اس لئے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں۔ اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے اُنہوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو، کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو پسپا کیا اور تمہارے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مالِ غنیمت جمع کر لو۔ اور جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آپ کے گرد جمع رہے اُنہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہوتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا ہم اس میں مشغول رہے اس لئے ہم بھی اس کے مستحق ہیں۔

صحابہ کرام کی یہ گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے واضح کر دیا کہ یہ مال اللہ کا ہے اس کا کوئی مالک و حقدار نہیں بجز اُس کے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاداتِ ربانی کے ماتحت اس مال کو سب شرکاءِ جہاد میں مساوی طور پر تقسیم فرما دیا (ابنِ کثیر)۔ [2] اور

[1] مسند احمد رقم الحدیث:۲۱٦۸۵، ومستدرك للحاكم رقم الحديث:۳۲۱۷ تفسير سورة الأنفال۔

[2] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۴ ص:۸،۷

سب کے سب اللہ ورسول کے اس فیصلہ پر راضی ہوگئے۔ اور اُن کے خلافِ شان جو صورت حال باہمی مسابقت کی پیش آگئی تھی اس پر نادم ہوئے۔

اور مسند احمد ہی میں اس آیت کے شانِ نزول کا ایک دوسرا واقعہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھی منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میرے بھائی عمیر شہید ہوگئے۔ میں نے اُن کے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کر دیا اور اُس کی تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مالِ غنیمت میں جمع کردو۔ میں حکم ماننے پر مجبور تھا مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا اور میں نے اُس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اُس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی مگر بایں ہمہ تعمیل ارشاد کے لئے مالِ غنیمت میں جمع کرنے کے لئے آگے بڑھا تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے مجھے بلوا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرما دی۔[1] بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض بھی کیا تھا کہ یہ تلوار مجھے دے دی جائے مگر آپ نے فرمایا کہ نہ یہ میری چیز ہے جو کسی کو دے دوں اور نہ آپ کی مِلک ہے اس کو پورے مالِ غنیمت میں جمع کردو اس کا فیصلہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اُس کے مطابق ہوگا۔ (ابن کثیر، مظہری)[2]

اس میں کوئی بُعد نہیں کہ یہ دونوں واقعے پیش آئے ہوں اور دونوں ہی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔

آیت کی پوری تفسیر یہ ہے

اس میں لفظ اَنْفَالٌ نَفْلٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فضل وانعام۔ نفلی نماز، روزہ، صدقہ کو بھی نفل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے ذمہ لازم وواجب نہیں، کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ اصطلاحِ قرآن وسنت میں لفظ نفل اور انفال مالِ غنیمت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقتِ جہاد حاصل ہوتا ہے مگر قرآن کریم میں اس معنی کے لئے تین لفظ استعمال ہوئے ہیں انفال، غنیمه، فیئے۔ لفظ انفال تو اسی آیت میں مذکور ہے اور لفظ غنیمة اور اُس کی تفصیل اسی سورت کی اکتالیسویں آیت میں آنے والی ہے اور لفظ فیئے اور اُس کے متعلق تفصیل سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ الآیة (الحشر:٦) اور ان تینوں کے معانی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف ہیں، فرق معمولی اور قلیل ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مالِ غنیمت کے لئے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے۔ غنیمة عموماً اُس مال کو کہتے ہیں جو جنگ و جہاد کے ذریعہ مخالف فریق سے حاصل ہو۔ اور فیئے اُس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ وقتال کے کفار

---

[1] مسند احمد رقم الحديث: ١٤٧٤

[2] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:٤ ص:٨، والتفسير المظهري ج:٤ ص:٧

سے ملے خواہ وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ یا رضامندی سے دے دینا قبول کریں۔ اور نفل اور انفال کا لفظ اکثر اُس انعام کے لئے بولا جاتا ہے جو امیرِ جہاد کسی خاص مجاہد کو اُس کی کارگزاری کے صلہ میں علاوہ حصہ غنیمت کے بطورِ انعام عطا کرے۔ یہ معنی تفسیر ابنِ جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کئے ہیں (ابن کثیر)۔ [۱] اور کبھی مطلقاً مالِ غنیمت کو بھی نفل اور انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی لئے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی عام معنی نقل کئے ہیں۔ [۲] اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لئے بولا جاتا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور اس کی بہترین تشریح وتحقیق وہ ہے جو امام ابوعبیدؒ نے اپنی کتاب الاموال میں ذکر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اصل لغت میں نفل کہتے ہیں فضل وانعام کو اور اس اُمتِ مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جہاد وقتال کے ذریعہ جو اموال کفار سے حاصل ہوں ان کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا گیا۔ ورنہ پچھلی اُمتوں میں یہ دستور نہ تھا بلکہ مالِ غنیمت کے لئے قانون یہ تھا کہ وہ کسی کے لئے حلال نہیں تھے تمام اموالِ غنیمت کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا۔ اور آسمان سے قدرتی طور پر ایک آگ (بجلی) آتی تھی اور اُس کو جلا کر خاک کر دیتی تھی یہی اُس جہاد کے مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی مالِ غنیمت جمع کیا گیا اور آسمانی بجلی نے آکر اس کو نہ جلایا تو یہ علامت اس کی ہوتی تھی کہ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں اس لئے اُس مالِ غنیمت کو بھی مردود اور منحوس سمجھا جاتا تھا اور اسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایتِ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بخاری ومسلم میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر اور اُن کی اُمت کو نہیں ملیں۔ انہیں پانچ میں سے ایک یہ ہے کہ اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ یعنی میرے لئے اموالِ غنیمت حلال کر دیئے گئے حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھے۔ [۳]

آیتِ مذکورہ میں انفال کا حکم یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ کے ہیں اور رسول کے۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ اصل ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور متصرف اُن میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جو حکمِ خداوندی کے مطابق اپنی صوابدید پر اُن کو تقسیم کرتے ہیں۔

اسی لئے ائمۂ تفسیر کی ایک جماعت نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، عکرمہ، سُدّی، وغیرہ داخل ہیں یہ فرمایا کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا جب تک تقسیمِ غنائم کا وہ قانون نازل نہ ہوا تھا جو اسی سورت کے پانچویں رکوع

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۴ ص:۵　[۲] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قوله يسألونك عن الأنفال الآية ج:۲ ص:۶۶۹

[۳] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ج:۱ ص:۱۹۹، وصحيح البخاري، كتاب التيمم، باب وقول الله تعالى: فلم تجدوا ماءً الآية ج:۱ ص:۴۸

میں آرہا ہے کیونکہ اس میں پورے مالِ غنیمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں اور آگے جو تفصیلی اَحکام آئے ہیں اُن میں یہ ہے کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے محفوظ کر دیا جائے اور چار حصے شرکاءِ جہاد میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کر دیئے جائیں جن کی تفصیل احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے۔ اس تفصیلی بیان نے سورۂ انفال کی پہلی آیت کو منسوخ کر دیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں کوئی ناسخ منسوخ نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے سورۂ انفال کی پہلی آیت میں اجمال ہے اور اکتالیسویں آیت میں اسی کی تفصیل ہے۔ البتہ مالِ فیئ جس کے اَحکام سورۂ حشر میں بیان ہوئے ہیں وہ پورا کا پورا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تصرف ہے آپ اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں عمل فرمائیں۔ اسی لئے اُس جگہ اَحکام بیان فرمانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (الحشر: ۷) یعنی جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے دے اُس کو لے لو اور جس کو روک دے اُس سے باز رہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مالِ فیئ وہ جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے۔ اور لفظ **انفال** دونوں کے لئے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اُس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیرِ جہاد عطا کرے۔

اس سلسلہ میں غازیوں کو انعام دینے کی چار صورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے رائج ہیں ایک یہ کہ یہ اعلان فرمادیں کہ جو شخص کسی مخالف کو قتل کرے تو جو سامان مقتول سپاہی سے حاصل ہو وہ اسی کا ہے جس نے قتل کیا۔ یہ سامان مالِ غنیمت میں جمع ہی نہ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ بڑے لشکر میں سے کوئی جماعت الگ کر کے کسی خاص جانب جہاد کے لئے بھیجی جائے اور یہ حکم دے دیا جائے کہ اس جانب سے جو مالِ غنیمت حاصل ہو وہ اسی خاص جماعت کا ہوگا جو وہاں گئی ہے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ اُس مال میں سے پانچواں حصہ عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ پانچواں حصہ جو بیت المال میں جمع کیا جاتا ہے اس میں سے کسی خاص غازی کو اُس کی ممتاز کارگزاری کے صلہ میں امیر کی صوابدید کے مطابق دیا جائے۔ چوتھے یہ کہ پورے مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ الگ کر کے خدمت پیشہ لوگوں کو بطور انعام دیا جائے جو مجاہدین کے گھوڑوں وغیرہ کی نگہداشت کرتے ہیں اور اُن کے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ (ابن کثیر) [1]

خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگ آپ سے انفال کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ انفال سب اللہ کے ہیں اور اُس کے رسول کے یعنی خود کوئی اُن کا حقدار یا مالک

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج: ۲ ص: ۱۰۰۹

نہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُس کے رسول جو کچھ فیصلہ فرمائیں وہ ہی نافذ ہوگا۔

لوگوں کے باہمی اتفاق واتحاد کی بنیاد تقویٰ اور خوفِ خدا ہے

اس آیت کے آخری جملے میں ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ① جس میں صحابہ کرام کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات کو درست رکھو اس میں اشارہ اُس واقعہ کی طرف ہے جو غزوہ بدر میں اموالِ غنیمت کی تقسیم کی بابت صحابہ کرام کے آپس میں پیش آ گیا تھا جس میں باہمی کشیدگی اور ناراضی کا خطرہ تھا۔ حق تعالیٰ نے تقسیمِ غنیمت کا قضیہ تو خود اس آیت کے ذریعہ طے فرما دیا۔ اب اُن کے دلوں کی اصلاح اور باہمی تعلقات کی خوشگواری کی تدبیر بتلائی گئی ہے جس کا مرکزی نقطہ تقویٰ اور خوفِ خدا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ جب تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت غالب ہوتا ہے تو بڑے بڑے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ باہمی منافرت کے پہاڑ گرد بن کر اُڑ جاتے ہیں، اہلِ تقویٰ کا حال بقول مولانا رومیؒ یہ ہو جاتا ہے ؎

[1] خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد کیں الم از صلحہا ہم میرمد

یعنی ان لوگوں کو کسی جنگ و جدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی، ان کو تو خلائق کی صلح اور درستی کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔ کیونکہ جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت و خوف اور یاد میں مشغول ہو اُس کو دوسروں سے تعلقات بڑھانے کی کہاں فرصت ؎

[2] بسودائے جاناں ز جاں مشتغل بذکر حبیب از جہاں مشتغل

اسی لئے اس آیت میں تقویٰ کی تدبیر بتلا کر فرمایا اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ یعنی بذریعہ تقویٰ آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو۔ اس کی مزید تشریح اس طرح فرمائی وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ① یعنی اللہ اور رسول کی مکمل اطاعت ہو اگر تم مؤمن ہو یعنی ایمان کا تقاضا ہے اطاعت اور طاعت نتیجہ ہے تقویٰ کا اور جب یہ چیزیں لوگوں کو حاصل ہو جائیں تو اُن کے آپس کے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور دشمنی کی جگہ دلوں میں اُلفت و محبت پیدا ہو جائے گی۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ

ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل

[1] ترجمہ: ان لوگوں کو کسی جنگ وجدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی، ان کو تو خلائق کی صلح اور درستی کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔

[2] ترجمہ: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اپنی جان اور جہان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲

اور جب پڑھا جائے اُن پر اُس کا کلام تو زیادہ ہوجاتا ہے اُن کا ایمان اور وہ اپنے رَبّ پر بھروسا رکھتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ

وہ لوگ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز کو اور ہم نے جو اُن کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ وہی ہیں

الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

سچے ایمان والے، ان کے لئے درجے ہیں اپنے رَبّ کے پاس اور معافی اور روزی عزت کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

مؤمن تو وہ لوگ ہیں کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کے دِل ڈر جاتے ہیں، اور جب اُن کے سامنے اُس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں اُن کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں، اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں ۝۲ جو نماز قائم کرتے ہیں، اور ہم نے اُن کو جو رزق دیا ہے، اُس میں سے (فی سبیل اللہ) خرچ کرتے ہیں ۝۳ یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں مؤمن ہیں۔ اُن کے لئے اُن کے رَبّ کے پاس بڑے درجے ہیں، مغفرت ہے، اور باعزت رزق ہے ۝۴

خلاصۂ تفسیر

(بس) ایمان والے تو وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جب (اُن کے سامنے) اللہ کا ذکر آتا ہے تو (اُس کی عظمت کے استحضار سے) اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں اُن کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کردیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رَبّ پر توکل کرتے ہیں (اور) جو کہ نماز کی اقامت کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (بس) سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں اُن کے لئے بڑے بڑے درجے ہیں ان کے رَبّ کے پاس اور (ان کے لئے) مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔

معارف ومسائل

مؤمن کی مخصوص صفات

آیاتِ مذکورہ میں اُن مخصوص صفات کا بیان ہے جو ہر مؤمن میں ہونا چاہئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر مؤمن اپنی ظاہری اور باطنی کیفیات اور صفات کا جائزہ لیتا رہے اگر یہ صفات اس میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے کہ اُس نے اس کو مؤمنین کی صفات عطا فرمادی۔ اور اگر ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں یا ہے مگر ضعیف و کمزور ہے تو اُس کے حاصل کرنے یا قوی کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صفت خوفِ خدا

پہلی صفت یہ بیان فرمائی الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ یعنی جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں رچی اور بھری ہوئی ہے جس کا ایک تقاضا ہیبت وخوف ہے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا ذکر کر کے اہلِ محبت کو بشارت دی گئی ہے وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الحج) یعنی خوشخبری دے دیجئے اُن متواضع نرم خولوگوں کو جن کے دل ڈر جاتے ہیں جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے۔ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کے ایک خاص تقاضا کا ذکر ہے یعنی ہیبت اور خوف اور دوسری آیت میں ذکر اللہ کی یہ خاصیت بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ اُس سے دل مطمئن ہوجاتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (الرعد) یعنی اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس خوف وہیبت کا ذکر ہے وہ دل کے سکون واطمینان کے خلاف نہیں جیسے کسی درندے یا دشمن کا خوف قلب کے سکون کو برباد کردیتا ہے ذکر اللہ کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والا خوف اس سے بالکل مختلف ہے اور اسی لئے یہاں لفظ خوف استعمال نہیں فرمایا وَجَل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا ترجمہ مطلق خوف نہیں بلکہ وہ ہیبت ہے جو بڑوں کی جلالتِ شان کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اللہ کے ذکر اور یاد سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر رہا تھا اسی حال میں اُس کو خدا تعالیٰ کی یاد آگئی تو وہ اللہ کے عذاب سے ڈر گیا اور گناہ سے باز آگیا، اس صورت میں خوف سے مراد خوفِ عذاب ہی ہوگا۔ (محیط) [1]

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۳۱

دوسری صفت ایمان میں ترقی

مؤمن کی دوسری صفت یہ بتلائی کہ جب اُس کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اُس کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ ایمان بڑھنے کے ایسے معنی جن پر سب علماء مفسرین و محدثین کا اتفاق ہے یہ ہیں کہ ایمان کی قوت و کیفیت اور نورِ ایمان میں ترقی ہو جاتی ہے۔ اور یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے ایمان میں قوت اور ایسا شرحِ صدر پیدا ہو جاتا ہے کہ اعمالِ صالحہ اُس کی عادت طبعی بن جاتے ہیں جس کے چھوڑنے سے اُس کو تکلیف ہوتی ہے اور گناہ سے اُس کو طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس نہیں جاتا۔ ایمان کے اسی مقام کو حدیث میں حلاوتِ ایمان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کو کسی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

وَاِذَا حَلَّتِ الْحَلَاوَةُ قَلْبًا　　　نَشَطَتْ فِي الْعِبَادَةِ الْاَعْضَاءُ

یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان جگہ پکڑ لیتی ہے تو اُس کے ہاتھ پیر اور سب اعضاء عبادت میں راحت ولذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس لئے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مؤمن کامل کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ جب اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جائیں تو اُس کے ایمان میں جلاو ترقی ہو اور اعمالِ صالحہ کی طرف رغبت بڑھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح عام مسلمان قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں کہ نہ قرآن کے ادب واحترام کا کوئی اہتمام ہے نہ اللہ جل شانہٗ کی عظمت پر نظر ہے ایسی تلاوت مقصود اور اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والی نہیں گو ثواب سے وہ بھی خالی نہ ہو۔

تیسری صفت اللہ پر توکل

تیسری صفت مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے، توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال واحوال میں اُس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذاتِ واحد حق تعالیٰ پر ہو۔ صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے مادّی اسباب اور تدابیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادّی اسباب وآلات کو اصل کامیابی کے لئے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت وہمت مادّی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اُن اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں۔ ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا اَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوْا عَلَيْهِ۔ یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لئے متوسط درجہ کی طلب اور مادّی

اسباب کے ذریعہ کوشش کرلو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ اپنے دل و دماغ کو صرف مادّی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھا رکھو۔

چوتھی صفت اقامتِ صلوٰۃ

چوتھی صفت مؤمن کی اقامتِ صلوٰۃ بتلائی۔ اس میں یہ بات قابل یاد رکھنے کے ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کا نہیں بلکہ نماز کی اقامت کا ذکر ہے۔ اقامت کے لفظی معنی کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ مراد اقامتِ صلوٰۃ سے یہ ہے کہ نماز کے پورے آداب و شرائط اُس طرح بجالائے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول وعمل سے بتلائے ہیں۔ آداب و شرائط میں کوتاہی ہوئی تو اُس کو نماز پڑھنا تو کہہ سکتے ہیں مگر اقامتِ صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے۔ قرآن مجید میں نماز کے جو فوائد اور آثار اور برکات ذکر کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت: ۴۵) یعنی نماز روکتی ہے بے حیائی اور ہر گناہ سے۔ یہ بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی پر موقوف ہے جب نماز کے آداب میں کوتاہی ہوئی تو گوفتویٰ کی رُو سے اُس کی نماز کو جائز ہی کہا جائے گا مگر نماز کی برکات میں کوتاہی کی مقدار پر فرق پڑ جائے گا۔ اور بعض صورتوں میں ان برکات سے کُلی طور پر محرومی ہو جائے گی۔

پانچویں صفت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

پانچویں صفت مردِ مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُس کو رزق دیا ہے وہ اُس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عام ہے تمام صدقات وخیرات اور وقف وصِلَہ کو جس میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ واجبات شرعی بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات وتبرّعات بھی، مہمانوں، دوستوں، بزرگوں کی مالی خدمت بھی۔

مردِ مؤمن کی یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یعنی ایسے ہی لوگ سچے مؤمن ہیں جن کا ظاہر و باطن یکساں اور زبان اور دل متفق ہیں ورنہ جن میں یہ صفات نہیں وہ زبان سے تو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں نہ توحید کا رنگ نہ اطاعتِ رسول کا، اُن کے اعمال اُن کے اقوال کی تردید کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے جب وہ حاصل نہ ہو تو حق حاصل نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابوسعید کیا آپ مؤمن ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں۔ تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر اور جنت دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بیشک میں مؤمن ہوں۔ اور اگر

تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا ذکر سورۂ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں اُن میں داخل ہوں یا نہیں۔ سورۂ انفال کی آیات سے وہی آیات مراد ہیں جو ابھی آپ نے پڑھی ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں سچے مؤمن کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

اس میں سچے مؤمنین کے لئے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک درجاتِ عالیہ، دوسرے مغفرت، تیسرے رزق عمدہ۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے پہلی آیات میں سچے مؤمنین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تین قسم کی ہیں، ایک وہ جن کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے جیسے ایمان، خوفِ خدا، توکل علی اللہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے جیسے نماز وغیرہ۔ تیسرے وہ جن کا تعلق انسان کے مال سے ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

ان تینوں قسموں کے بالمقابل تین انعاموں کا ذکر آیا ہے۔ درجاتِ عالیہ قلبی اور باطنی صفات کے مقابلہ میں اور مغفرت اُن اعمال کے مقابلہ میں جو انسان کے ظاہر بدن سے متعلق ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نماز گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہے اور رزق کریم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بالمقابل آیا ہے کہ جو کچھ خرچ کیا اُس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اُس کو آخرت میں ملے گا۔ [1]

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

جیسے نکالا تجھ کو تیرے ربّ نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے، اور ایک جماعت اہلِ ایمان کی

لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ لا يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ

راضی نہ تھی۔ وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اُس کے ظاہر ہوچکنے کے بعد گویا وہ ہانکے جاتے ہیں

اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ ط

موت کی طرف آنکھوں دیکھتے۔

---

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآیة ج:۶ ص:۳۲

آسان ترجمۂ قرآن

(مالِ غنیمت کی تقسیم کا) یہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے تمہارے رَبّ نے تمہیں اپنے گھر سے حق کی خاطر نکالا، جبکہ مسلمانوں کے ایک گروہ کو یہ بات ناپسند تھی۔ ⑤ وہ تم سے حق کے معاملے میں اس کے واضح ہو جانے کے باوجود اس طرح بحث کر رہے تھے جیسے اُن کو موت کی طرف ہنکا کر لے جایا جا رہا ہو، اور وہ (اُسے) آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں ⑥

خلاصۂ تفسیر

(مالِ غنیمت کا لوگوں کی مرضی کے موافق تقسیم نہ ہونا بلکہ منجانب اللہ اس کی تقسیم ہونا اگرچہ بعض لوگوں کو طبعًا گراں گزرا ہو مگر مصالح کثیرہ کی وجہ سے یہی خیر اور بہتر ہے۔ اور یہ معاملہ خلافِ طبع مگر مصالح کثیرہ کو متضمن ہونے میں ایسا ہی ہے) جیسا آپ کے رَبّ نے آپ کے گھر (اور بستی) سے مصلحت کے ساتھ آپ کو (بدر کی طرف) روانہ کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت (اپنی تعداد اور سامانِ جنگ کی قلّت کی وجہ سے طبعًا) اس کو گراں سمجھتی تھی وہ اس مصلحت (کے کام) میں (یعنی جہاد اور مقابلہ لشکر کے معاملے میں) بعد اس کے کہ اُس کا ظہور ہو چکا تھا (اپنے بچاؤ کے لئے بطور مشورہ کے) آپ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی اُن کو موت کی طرف ہانکے لئے جاتا ہے اور وہ (موت کو گویا) دیکھ رہے ہیں (مگر آخر کار انجام اس کا بھی اچھا ہوا کہ اسلام غالب اور کفر مغلوب ہوا)۔

معارف ومسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ انفال کے بیشتر مضامین کفار ومشرکین پر عذاب وانتقام اور مسلمانوں پر احسان وانعام کے متعلق ہیں اور اُس کے ضمن میں دونوں فریق کے لئے عبرت ونصیحت کے اَحکام بیان ہوئے ہیں۔ اور ان معاملات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم واقعہ غزوۂ بدر کا تھا جس میں بڑے ساز وسامان اور تعداد وقوت کے باوجود مشرکین کو جانی اور مالی نقصانات کے ساتھ شکست اور مسلمانوں کو باوجود ہر طرح کی قلّت اور بے سامانی کے فتح عظیم نصیب ہوئی۔ اس سورت مین واقعہ بدر کا تفصیلی بیان ہے۔ جو آیاتِ مذکورہ سے شروع ہو رہا ہے۔

پہلی آیت میں اس بات کا ذِکر ہے کہ بعض مسلمانوں کو بدر کے موقع پر جہاد کے لئے اقدام ناپسند تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فرمان کے ذریعہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا تو ناپسند کرنے والے بھی ساتھ ہو گئے۔ اس بات کے بیان کرنے کے لئے قرآن کریم نے جو الفاظ اختیار فرمائے ہیں وہ کئی طرح سے قابلِ غور ہیں۔

اوّل یہ کہ آیت کا شروع كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ سے ہوتا ہے۔ اس میں لفظ كَمَا ایک ایسا لفظ ہے جو تشبیہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو غور طلب یہ ہے کہ یہاں تشبیہ کس چیز کی کس چیز سے ہے۔ حضرات مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں۔ امام تفسیر ابو حیان نے اس طرح کے پندرہ اقوال نقل کئے ہیں ان میں زیادہ اقرب تین احتمال ہیں۔

اوّل یہ کہ اس تشبیہ سے مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ جس طرح غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت صحابہ کرامؓ کے آپس میں کچھ اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ پھر حکمِ خداوندی کے تحت سب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی برکات اور اچھے نتائج کا ظہور سامنے آ گیا۔ اسی طرح اس جہاد کے شروع میں کچھ لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا پھر حکمِ ربانی کے ماتحت سب نے اطاعت کی اور اُس کے مفید نتائج اور اعلیٰ ثمرات کا مشاہدہ ہو گیا۔ یہ توجیہ فراء اور مبرّد کی طرف منسوب ہے (بحر محیط)۔[1] اسی کو بیان القرآن میں ترجیح دی ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں سچے مؤمنین کے لئے آخرت میں درجاتِ عالیہ اور مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ان آیات میں اس وعدہ کے یقینی ہونے کا ذکر اس طرح کیا گیا کہ آخرت کا وعدہ اگرچہ ابھی آنکھوں کے سامنے نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ نصرت و فتح غزوۂ بدر میں آنکھوں کے سامنے آچکا ہے اس سے عبرت پکڑو اور یقین کرو کہ جس طرح یہ وعدہ دنیا ہی میں پورا ہو چکا ہے اسی طرح آخرت کا وعدہ بھی ضرور پورا ہو گا۔ (تفسیر قرطبی بحوالہ نحاس)[2]

تیسرا احتمال وہ ہے جس کو ابو حیان نے مفسرین کے پندرہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے ان میں سے کسی قول پر اطمینان نہیں تھا۔ ایک روز میں اسی آیت پر غور و فکر کرتے ہوئے سو گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی جگہ جا رہا ہوں اور ایک شخص میرے ساتھ ہے میں اسی آیت کے متعلق اُس سے بحث کر رہا ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی جیسی اس آیت کے الفاظ میں پیش آئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ محذوف ہے۔ پھر یکا یک خواب ہی میں میرے دل میں پڑا کہ یہاں لفظ نَصَرَكَ محذوف ہے اس کو میں نے بھی پسند کیا اور جس شخص سے بحث کر رہا تھا اُس نے بھی پسند کیا۔ بیدار ہونے کے بعد اس پر غور کیا تو میرا اشکال ختم ہو گیا کیونکہ اس صورت میں لفظ كَمَا تشبیہ کے لئے نہیں بلکہ بیانِ سبب کے لئے استعمال ہوا ہے اور معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ غزوۂ بدر میں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے جو خاص نصرت و امداد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوئی اُس کا سبب یہ تھا کہ اس جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں بلکہ خالص امرِ ربی اور حکمِ خداوندی کے تابع کیا۔ اُس کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے۔ اور

[1] تفسیر البحر المحیط تحت ھٰذہ الآیۃ ج:٦ ص:٣٢،٣٣ [2] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:٧ ص:٣٦٨

اطاعتِ حق کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے اور یہی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد و نصرت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ [۱]

بہر حال آیت کے اس جملہ میں یہ تینوں معنی محتمل اور صحیح ہیں۔ اس کے بعد اس پر نظر ڈالئے کہ قرآن کریم نے اس جہاد کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود نکلنا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نکالا۔ اس میں اشارہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمالِ عبدیت و اطاعت کی طرف کہ آپ کا فعل درحقیقت حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو آپ کے اعضاء و جوارح سے صادر ہوتا ہے۔ جیسا ایک حدیث قدسی میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت و عبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرّب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے میرے ذریعہ دیکھتا ہے میں اُس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے۔ میں اُس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعہ پکڑتا ہے جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعہ چلتا ہے۔ [۲] خلاصہ اس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جن افعال کا صدور بظاہر اُس کے آنکھ کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، درحقیقت اُس میں قدرت حق تعالیٰ شانہٗ کی کارفرما ہوتی ہے ۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست میبرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ اَخْرَجَكَ میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد کے لئے نکلنا درحقیقت حق تعالیٰ کا نکالنا تھا جو آپ کی ذات سے ظاہر ہوا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ فرمایا جس میں اللہ جل شانہٗ کا ذکر صفتِ رَبّ کے ساتھ کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس جہاد کے لئے آپ کو نکالنا شانِ ربوبیت سے اور تربیت کے تقاضا سے تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ مظلوم و مقہور مسلمانوں کے لئے فتح یاب اور مغرور و ظالم کفار کے لئے پہلے عذاب کا مظاہرہ کرنا تھا۔

مِنْۢ بَيْتِكَ کے معنی ہیں آپ کے گھر سے۔ مطلب یہ ہوا کہ نکالا آپ کو آپ کے رَبّ نے آپ کے گھر سے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس گھر سے مراد مدینہ طیبہ کا گھر یا خود مدینہ طیبہ ہے، جس میں ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقیم ہوئے۔ کیونکہ واقعۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال میں پیش آیا ہے۔ اس کے ساتھ لفظ بِالْحَقِّ کا اضافہ کر کے بتلا دیا کہ یہ ساری کارروائی احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے عمل میں آئی ہے۔ دوسری حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس یا بادشاہوں کا غصہ اس کا سبب نہیں۔

---

[۱] تفسير البحر المحيط تحت هذه الآية ج:٦ ص:٣٥

[۲] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب التواضع ج:٢ ص:٩٦٣

[۳] ترجمہ: میری گردن میں دوست کا رشتہ پڑا ہوا ہے، جہاں اس کا دل چاہے مجھے کھینچ کر لے جاتا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو گراں سمجھتی اور ناپسند کرتی تھی۔ صحابہ کرام کو یہ گرانی کس طرح اور کیوں پیش آئی اس کے سمجھنے کے لئے نیز آئندہ آنے والی دوسری آیات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے غزوۂ بدر کے ابتدائی حالات اور اسباب کا پہلے معلوم کرلینا مناسب ہے۔ اس لئے پہلے غزوۂ بدر کا پورا واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

ابن عقبہؒ و ابن عامر کے بیان کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں یہ خبر ملی کہ ابوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ملک شام سے مالِ تجارت لے کر مکہ معظّمہ کی طرف جارہے ہیں۔ اور اس تجارت میں مکہ کے تمام قریشی شریک ہیں۔ ابن عقبہ کے بیان کے مطابق مکہ کا کوئی قریشی مرد یا عورت باقی نہ تھی جس کا اس میں حصہ نہ ہو۔ اگر کسی کے پاس صرف ایک مثقال (یعنی ساڑھے چار ماشہ) سونا بھی تھا تو اُس نے اس میں اپنا حصہ ڈال دیا تھا۔ اس قافلہ کے پورے سرمایہ کے متعلق ابن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ پچاس ہزار دینار تھے۔ دینار سونے کا سکہ ہے جو ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے سونے کے موجودہ بھاؤ کے حساب سے اُس کی قیمت باون روپیہ اور پورے سرمایہ کی قیمت چھبیس لاکھ روپیہ بنتی ہے اور یہ بھی آج کے نہیں بلکہ اب سے چودہ سو برس پہلے کے چھبیس لاکھ ہیں جو آج کے چھبیس کروڑ سے بھی زیادہ کی حیثیت رکھتے تھے اس تجارتی قافلہ کی حفاظت اور کاروبار کے لئے قریش کے ستر جوان اور سردار ساتھ تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ تجارتی قافلہ درحقیقت قریش مکہ کی ایک تجارتی کمپنی تھی۔

بغوی نے بروایت ابن عباسؓ وغیرہ نقل کیا ہے کہ اس قافلہ میں قریش کے چالیس سوار قریش کے سرداروں میں سے تھے جن میں عمرو بن العاص، مخرمہ بن نوفل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قریش کی سب سے بڑی طاقت اُن کی یہی تجارت اور تجارتی سرمایہ تھا۔ جس کے بَل پر اُنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تنگ کر کے مکہ چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر شام سے اس قافلہ کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپ کی رائے ہوئی کہ اس وقت اس قافلہ کا مقابلہ کر کے قریش کی طاقت توڑ دینے کا موقع ہے۔ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو زمانہ رمضان کا تھا پہلے سے کسی جنگ کی تیاری نہ تھی۔ بعض حضرات نے تو چستی اور ہمت کا اظہار کیا مگر بعض نے کچھ پس و پیش کی۔ آپ نے بھی سب پر اس جہاد کی شرکت کو لازم نہ قرار دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ جن لوگوں کے پاس سواریاں موجود ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ اس وقت بہت سے آدمی جہاد میں جانے سے رک گئے اور جو لوگ جانا چاہتے تھے اور اُن کی سواریاں دیہات میں تھیں اُنہوں نے اجازت چاہی کہ ہم اپنی سواریاں لے آویں تو ساتھ چلیں۔ مگر وقت اتنے انتظار کا نہ تھا۔ اس لئے حکم یہ ہوا کہ جن لوگوں کی سواریاں پاس موجود ہیں اور جہاد میں جانا چاہیں صرف وہی لوگ چلیں۔ باہر سے سواریاں منگانے کا وقت نہیں۔ اس لئے ساتھ جانے کا ارادہ رکھنے والوں میں سے بھی تھوڑے ہی آدمی تیار

ہوسکے۔ اور جن حضرات نے اس جہاد میں ساتھ جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا اُس کا سبب بھی یہ تھا کہ آپ نے سب کے ذمہ اس جہاد کی شرکت کو واجب نہ قرار دیا تھا۔ اور ان لوگوں کو یہ بھی اطمینان تھا کہ یہ تجارتی قافلہ ہے کوئی جنگی لشکر نہیں جس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو زیادہ لشکر اور مجاہدین کی ضرورت پڑے۔ اس لئے صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد اس جہاد میں شریک نہ ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیر سُقیا پر پہنچ کر قیس بن صعصعہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ لشکر کو شمار کریں تو اُنہوں نے شمار کر کے اطلاع دی کہ تین سو تیرہ حضرات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تعداد اصحابِ طالوت کی ہے اس لئے فال نیک، فتح اور کامیابی کی ہے۔ صحابہ کرام کے ساتھ کل ستر اونٹ تھے۔ ہر تین آدمی کے لئے ایک اونٹ تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو حضرات ایک اونٹ کے شریک تھے ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری پیدل چلنے کی آتی تو یہ حضرات عرض کرتے کہ آپ سوار رہیں ہم آپ کے بدلے پیدل چلیں گے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ جواب ملتا کہ نہ تو تم مجھ سے زیادہ قوی ہو اور نہ میں آخرت کے ثواب سے مستغنی ہوں کہ اپنے ثواب کا موقع تمہیں دے دوں، اس لئے اپنی باری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیدل ہی چلتے تھے۔

دوسری طرف کسی شخص نے ملک شام کے مشہور مقام عین زرقا پر پہنچ کر رئیسِ قافلہ ابوسفیان کو اس کی خبر پہنچادی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قافلہ کے انتظار میں ہیں ان کا تعاقب کریں گے۔ ابوسفیان نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ جب یہ قافلہ حدودِ حجاز میں داخل ہوا تو ایک ہوشیار مستعد آدمی ضمضم بن عمر کو بیس مثقال سونا یعنی تقریباً دو ہزار روپیہ اُجرت دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر جلد سے جلد مکہ مکرمہ میں یہ خبر پہنچادے کہ ان کے قافلہ کو صحابہ کرام سے خطرہ لاحق ہے۔

ضمضم بن عمر نے اُس زمانہ کی خاص رسم کے مطابق خطرہ کا اعلان کرنے کے لئے اپنی اونٹنی کے ناک کان کاٹ دیئے اور اپنے کپڑے آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالے۔ اور کجاوہ کو اُلٹا کر کے اونٹنی کی پشت پر رکھا۔ یہ علامات اُس زمانہ میں خطرہ کی گھنٹی سمجھی جاتی تھی۔ جب وہ اس شان سے مکہ میں داخل ہوا تو پورے مکہ میں ہلچل مچ گئی اور تمام قریش مدافعت کے لئے تیار ہوگئے۔ جو لوگ اس جنگ کے لئے نکل سکتے تھے خود نکلے اور جو کسی وجہ سے معذور تھے اُنہوں نے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر جنگ کے لئے تیار کیا۔ اور صرف تین روز میں یہ لشکر پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہوگیا۔

ان میں جو لوگ اس جنگ میں شرکت سے ہچکچاتے اُس کو یہ لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور مسلمانوں کا ہم خیال سمجھتے اس لئے ایسے لوگوں کو خصوصیت سے جنگ کے واسطے نکلنے پر مجبور کیا۔ جو لوگ علانیہ طور پر مسلمان تھے اور ابھی تک

بوجہ اپنے اعذار کے ہجرت نہیں کر سکے تھے بلکہ مکہ مکرمہ میں بس رہے تھے اُن کو اور بنو ہاشم کے خاندان میں جس پر بھی یہ گمان تھا کہ یہ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے اُن کو بھی اس جنگ کے لئے نکلنے پر مجبور کیا۔ انہیں مجبور لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ابوطالب کے دو بیٹے طالب اور عقیل بھی تھے۔

اس طرح اس لشکر میں ایک ہزار جوان دو سو گھوڑے اور چھ سو زرہیں اور ترانے گانے والی لونڈیاں اور اُن کے طبلے وغیرہ لے کر بدر کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ہر منزل پر دس اونٹ ان لوگوں کے کھانے کے لئے ذبح ہوتے تھے۔

دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک تجارتی قافلہ کے انداز سے مقابلہ کی تیاری کر کے بارہ رمضان کو شنبہ کے دن مدینہ طیبہ سے نکلے اور کئی منزل طے کرنے کے بعد بدر کے قریب پہنچ کر آپ نے دو شخصوں کو آگے بھیجا کہ وہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر لائیں۔ (مظہری)[1]

مخبروں نے یہ خبر پہنچائی کہ ابوسفیان کا قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاقب کی خبر پا کر ساحلِ دریا کے کنارے کنارے گزر گیا اور اُس کی حفاظت اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکہ مکرمہ سے ایک ہزار جوانوں کا لشکر جنگ کے لئے آ رہا ہے۔ (ابن کثیر)[2]

ظاہر ہے کہ اس خبر نے حالات کا نقشہ پلٹ دیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کہ اس آنے والے لشکر سے جنگ کرنا ہے یا نہیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے حضرات نے عرض کیا کہ ہم میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں اور نہ ہم اس قصد سے آئے ہیں۔ اس پر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور تعمیلِ حکم کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا پھر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اسی طرح تعمیلِ حکم اور جہاد کے لئے تیار ہونے کا اظہار کیا پھر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ:

> یا رسول اللہ جو کچھ آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ملا ہے آپ اُس کو جاری کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بخدا ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ (المائدۃ) یعنی جایئے آپ اور آپ کا ربّ لڑ بھڑ لیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں ملک حبشہ کے مقام برک الغماد تک بھی لے جائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ جنگ کے لئے چلیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور اُن کو دُعائیں دیں، مگر ابھی تک حضرات انصار کی طرف سے موافقت میں کوئی آواز نہ اُٹھی تھی اور یہ احتمال تھا کہ حضرات انصار نے جو معاہدہ نصرت وامداد کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

---

[1] التفسیر المظہری ج:۴ ص:۱۶ [2] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۱۷

کیا تھا وہ اندرونِ مدینہ کا تھا۔ مدینہ سے باہر امداد کرنے کے وہ پابند نہیں اس لئے آپ نے پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگو مجھے مشورہ دو کہ اس جہاد پر اقدام کریں یا نہیں۔ اس خطاب کا روئے سخن انصار کی طرف تھا۔ حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! ہم آپ پر ایمان لائے اور اس کی شہادت دی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں سب حق ہے اور ہم نے آپ سے عہد و پیمان کئے ہیں کہ ہر حال میں آپ کی اطاعت کریں گے۔ اس لئے آپ کو جو کچھ اللہ تعالیٰ کا حکم ملا ہو اُس کو جاری فرمایئے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہم کو سمندر میں لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ دریا میں گھس جائیں گے ہم میں سے ایک آدمی بھی آپ سے پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں اس میں کوئی گرانی نہیں کہ آپ کل ہی ہمیں دشمن سے بھڑا دیں۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے کام سے ایسے حالات کا مشاہدہ کرائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ہمیں اللہ کے نام پر جہاں چاہیں لے چلئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بہت مسرور ہوئے، اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ اللہ کے نام پر چلو۔ اور یہ خوشخبری سنائی کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر ہمارا غلبہ ہوگا۔ دونوں جماعتوں سے مراد، ایک ابوسفیان کا تجارتی قافلہ اور دوسرا یہ مکہ سے آنے والا لشکر ہے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم میں گویا اپنی آنکھوں سے مشرکین کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ پورا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری سے لیا گیا ہے۔ [۱]

واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد ان آیات مذکورالصدر کو دیکھئے پہلی آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو بھاری سمجھ رہی تھی۔ اس سے اشارہ اس حال کی طرف ہے جو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کے وقت بعض صحابہ کرامؓ کی طرف سے ظاہر ہوا کہ اُنہوں نے جہاد سے پست ہمتی کا اظہار کیا۔

اور اسی واقعہ کا بیان دوسری آیت میں ہے يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ یعنی یہ لوگ آپ سے حق کے معاملہ میں مجادلہ اور اختلاف کرتے ہیں گویا ان کو موت کی طرف کھینچا جا رہا ہے جس کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

صحابہ کرام نے اگرچہ کوئی عدول حکمی نہ کی تھی بلکہ مشورہ کے جواب میں اپنے ضعف اور پست ہمتی کا اظہار کیا تھا۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۴ تا ۱۸، والتفسير المظهري ج:۴ ص:۱۱ تا ۱۷

مگر رسول کے ساتھیوں سے ایسی رائے کا اظہار بھی ان کے مقامِ بلند کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند تھا اس لئے ناراضی کے الفاظ سے اُس کو بیان فرمایا گیا۔

وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ

اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے

اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ

کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کردے سچ کو اپنے کلاموں سے

وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِیْنَ ۙ۝۷ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَ یُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ

اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی۔ تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کردے جھوٹ کو اور اگرچہ ناراض ہوں

الْمُجْرِمُوْنَ ۚ۝۸ اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ

گنہگار۔ جب تم لگے فریاد کرنے اپنے ربّ سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں مدد کو بھیجوں گا تمہاری

بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝۹ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىِٕنَّ

ہزار فرشتے لگاتار آنے والے۔ اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوش خبری اور تاکہ مطمئن ہوجائیں

بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۱۰ ع ۱۵

اس سے تمہارے دل، اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے، بیشک اللہ زور آور ہے حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے یہ وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے کوئی ایک تمہارا ہوگا، اور تمہاری خواہش تھی کہ جس گروہ میں (خطرے کا) کوئی کانٹا نہیں تھا، وہ تمہیں ملے، اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام سے حق کو حق کر

دکھائے، اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے ⑦ تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دے، چاہے مجرم لوگوں کو یہ بات کتنی نا گوار ہو ⑧ یاد کرو جب تم اپنے رَبّ سے فریاد کر رہے تھے، تو اُس نے تمہاری فریاد کا جواب دیا کہ میں تمہاری مدد کے لئے ایک ہزار فرشتوں کی کمک بھیجنے والا ہوں جو لگاتار آئیں گے ⑨ اور یہ وعدہ اللہ نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس لئے کیا کہ وہ خوشخبری بنے، اور تا کہ تمہارے دِلوں کو اُس سے اِطمینان حاصل ہو، ورنہ مدد کسی اور کے پاس سے نہیں، صرف اللہ کے پاس سے آتی ہے۔ یقیناً اللہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک ⑩

خلاصۂ تفسیر

اور تم لوگ اُس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے اُن دو جماعتوں (یعنی تجارتی قافلہ یا لشکر) میں سے ایک (جماعت) کا وعدہ کر رہے تھے کہ وہ (جماعت) تمہارے ہاتھ آجائے گی (یعنی مغلوب ہو جائے گی، یہ وعدہ مسلمانوں سے بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی ہوا تھا) اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت (یعنی تجارتی قافلہ) تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنے اَحکام سے حق کا حق ہونا (اُس کو عملاً غلبہ دے کر) ثابت کر دے اور (یہ منظور تھا کہ) ان کافروں کی بنیاد کو قطع کر دے تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا (عملاً) ثابت کر دے اگر چہ یہ مجرم لوگ (یعنی مغلوب ہونے والے کفار اس کو کتنا ہی) ناپسند کریں۔ اُس وقت کو یاد کرو جبکہ تم اپنے رَبّ سے (اپنی تعداد اور سامانِ جنگ کی قلّت اور دشمن کی کثرت دیکھ کر) فریاد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی (اور وعدہ فرمایا) کہ تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آویں گے اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد صرف اس (حکمت) کے لئے کی کہ (تم کو غلبہ پانے کی) بشارت ہو اور تا کہ تمہارے دلوں کو قرار آجائے (یعنی انسان کی تسلی طبعی طور پر اسباب، سامان سے ہوتی ہے اس لئے وہ بھی جمع کر دیا گیا) اور (واقع میں تو) نصرت (اور غلبہ) صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکمت والے ہیں۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں غزوۂ بدر کا واقعہ اور اُس میں جو حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت و امداد کے مخصوص انعامات مسلمانوں پر مبذول ہوئے ان کا بیان ہے۔

پہلی اور دوسری آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو یہ اطلاع ملی کہ قریشیوں کا ایک عظیم لشکر اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے مکہ سے نکل چکا ہے تو اب مسلمانوں کے سامنے دو

جماعتیں تھیں ایک تجارتی قافلہ جس کو روایات میں عِیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری یہ مسلح فوج جو مکہ سے چلی تھی جس کو نفیر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ بتلایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بواسطہ آپ کے سب مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر تمہارا مکمل قبضہ ہو جائے گا، کہ اُس کے متعلق جو تم چاہو گے کر سکو گے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ تجارتی قافلہ پر قبضہ آسان اور بے خطر تھا اور مسلح فوج پر مشکل اور خطرات سے پُر۔ اس لئے اس مبہم وعدہ کو سُن کر بہت سے صحابہ کرام کی تمنا اور خواہش یہ ہوئی کہ وہ جماعت جس پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے وہ غیر مسلم تجارتی قافلہ ہو جائے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے اکابر صحابہ کا باشاراتِ ربانی یہ ارادہ ہوا کہ مسلح فوج پر قبضہ ہو تو بہتر ہوگا۔

اس آیت میں غیر مسلح جماعت پر قبضہ چاہنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہیں تو اپنی سہولت پسندی اور خطرات سے یکسوئی کے پیش نظر یہی پسند تھا کہ غیر مسلح تجارتی قافلہ پر تمہارا قبضہ ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اسلام کا اصل مقصد حاصل ہو یعنی حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور کافروں کی جڑ کٹ جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام اُسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ مسلح فوج سے مقابلہ اور اُس پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ اور غلبہ ہو۔

خلاصہ اس کا مسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ تم نے جو صورت پسند کی وہ نہایت پست ہمتی اور آرام طلبی اور وقتی اور ہنگامی فائدہ کی چیز تھی اور اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا وہ عالی ہمتی اور بلند مقاصد اور مکمل اور دائمی فوائد پر مشتمل تھا۔ پھر دوسری آیت میں اس کو مزید واضح فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت سے تو کوئی چیز باہر نہ تھی اگر وہ چاہتے تو تجارتی قافلہ پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہو جاتا مگر اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی شان کے شایان اس کو سمجھا کہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو کر اس پر قبضہ ہو تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو جائے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حق تعالیٰ تو علیم خبیر اور ہر کام کے آغاز وانجام سے باخبر ہیں اُن کی طرف سے اس مبہم وعدہ میں کیا مصلحت تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کر کے بھی فرما سکتے تھے کہ فلاں جماعت پر قبضہ ہو جائے گا۔

اس ابہام کی وجہ واللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں صحابہ کرام کا امتحان کرنا تھا کہ آسان کام کو پسند کرتے ہیں یا مشکل کو۔ اور اُن کی اخلاقی تربیت بھی تھی جس کے ذریعہ اُن کو عالی ہمتی اور اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد اور خطرات سے نہ گھبرانا سکھایا گیا۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں اُس واقعہ کا بیان ہے جو مسلح فوج سے مقابلہ ٹھن جانے کے بعد پیش آیا کہ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ آپ کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے تو اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں نصرت و امداد کی دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ آپ دُعا مانگتے تھے اور صحابہ کرام آپ کے ساتھ آمین کہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں:

''یا اللہ! مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اُس کو جلد پورا فرما دے۔ یا اللہ! اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمین فنا ہو گئی تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا'' (کیونکہ ساری زمین کفر و شرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی طرح الحاح و زاری کے ساتھ دُعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دُعاء ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

آیت میں اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ کے الفاظ سے یہی واقعہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب تم اپنے ربّ سے استغاثہ کر رہے تھے اور مدد طلب کر رہے تھے یہ استغاثہ اگرچہ دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا تھا مگر تمام صحابہ آمین کہہ رہے تھے اس لئے پوری جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔

اس کے بعد اس دُعا کی قبولیت کا بیان اس طرح فرمایا فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی اور فرمایا کہ ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کروں گا جو یکے بعد دیگرے قطار کی صورت میں آنے والے ہوں گے۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جو بے نظیر قوت و طاقت عطا فرمائی ہے اُس کا اندازہ اُس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو قومِ لوط علیہ السلام کی زمین کا تختہ اُلٹنے کے وقت پیش آیا کہ جبریلِ امین نے ایک پَر کے ذریعہ یہ تختہ اُلٹ دیا۔ ایسی بے مثال طاقت والے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد مقابلہ میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی ایک بھی کافی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی فطرت سے واقف ہیں کہ وہ تعداد سے بھی متاثر ہوتے ہیں اس لئے مقابل فریق کی تعداد کے مطابق فرشتوں کی تعداد بھیجنے کا وعدہ فرمایا تا کہ اُن کے قلوب پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔

چوتھی آیت میں بھی یہی مضمون ارشاد فرمایا وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تمہیں بشارت ہو اور تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔

غزوۂ بدر میں جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے امداد کے لئے بھیجے گئے ان کی تعداد اس جگہ ایک ہزار مذکور ہے اور

سورۂ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے۔ اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں جو مختلف حالات میں کئے گئے ہیں۔ پہلا وعدہ ایک ہزار فرشتوں کا ہوا جس کا سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی۔ دوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا سورۂ آل عمران میں پہلے مذکور ہے وہ اُس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کے لئے اور کمک آرہی ہے۔ رُوح المعانی میں ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہ سے بروایت شعبی منقول ہے کہ مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کے لئے کمک لے کر آرہا ہے۔ اس خبر سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس پر آل عمران کی آیت اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ نازل ہوئی جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لئے آسمان سے نازل کرنے کا وعدہ ذکر کیا گیا۔ [1]

اور تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کے ساتھ مشروط تھا کہ اگر فریقِ مخالف نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی وہ آل عمران کی آیتِ مذکورہ کے بعد کی آیت میں اس طرح مذکور ہے بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ یعنی اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا ربّ تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو خاص نشان یعنی خاص وردی میں ہوں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس وعدہ میں تین شرطیں تھیں ایک ثابت قدمی دوسرے تقویٰ تیسرے مخالف فریق کا یکبارگی حملہ۔ پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرام میں موجود تھیں اور اس میدان میں اوّل سے آخر تک اُن میں کہیں فرق نہیں آیا مگر تیسری شرط یکبارگی ہلہ کی واقع نہیں ہوئی اس لئے پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کی نوبت نہیں آئی۔

اس لئے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار میں دائر رہا۔ جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے اُن کے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اُس سے پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ان تین آیتوں میں ملائکہ کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے اور ہر جماعت کے ساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے۔ سورۂ انفال کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے اُس میں تو ان ملائکہ کی صفت میں مُرْدِفِيْنَ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے لگانے والے اس میں شاید اس طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنے والے ہیں۔ اور سورۂ آل عمران کی پہلی آیت میں ملائکہ کی صفت مُنْزَلِيْنَ ارشاد فرمائی۔ یعنی یہ فرشتے آسمان سے اُتارے جائیں گے اس میں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں

---

[1] روح المعانی، تفسیر سورة آل عمران آیت: ۱۲۴، ج: ۳ ص: ۱۹۶

ان سے کام لینے کے بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کے لئے بھیجے جائیں گے اور آل عمران کی دوسری آیت جس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اُس میں ملائکہ کی صفت مُسَوِّمِیْنَ ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ ہوں گے۔ جیسا کہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے عمامے سفید اور غزوۂ حنین میں مدد کے لئے آنے والے فرشتوں کے عمامے سرخ تھے۔ [1]

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اس میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمادی کہ جو مدد بھی کہیں سے ملتی ہے خواہ ظاہری صورت سے ہو یا مخفی انداز سے سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اُسی کے قبضہ میں ہے فرشتوں کی مدد بھی اسی کے تابع فرمان ہے اس لئے تمہاری نظر صرف اُسی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف رہنی چاہئے کیونکہ وہ بڑا اقدرت والا حکمت والا ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً

جس وقت کہ ڈال دی اس نے تم پر اُونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے اور اُتارا تم پر آسمان سے پانی

لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ

کہ اُس سے تم کو پاک کردے اور دور کردے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کردے تمہارے دلوں کو

وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ

اور جمادے اُس سے تمہارے قدم۔ جب حکم بھیجا تیرے رَبّ نے فرشتوں کو کہ میں ساتھ ہوں تمہارے

فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں کے، میں ڈال دوں دل میں کافروں کے دہشت

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

سو مارو گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور۔ یہ اس واسطے ہے کہ

[1] المعجم الكبير للطبراني رقم الحديث: ۱۱۹۱۷

شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ

وہ مخالف ہوئے اللہ کے اور اُس کے رسول کے، اور جو کوئی مخالف ہوا اللہ کا اور اس کے رسول کا تو بے شک اللہ کا

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

عذاب سخت ہے۔ یہ تو تم چکھ لو اور جان رکھو کہ کافروں کے لئے ہے عذاب دوزخ کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

یاد کرو جب تم پر سے گھبراہٹ دُور کرنے کے لئے وہ اپنے حکم سے تم پر غنودگی طاری کر رہا تھا، اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا، تاکہ اُس کے ذریعے تمہیں پاک کرے، تم سے شیطان کی گندگی دُور کرے، تمہارے دِلوں کی ڈھارس بندھائے، اور اُس کے ذریعے (تمہارے) پاؤں اچھی طرح جمادے ﴿۱۱﴾ وہ وقت جب تمہارا ربّ فرشتوں کو وحی کے ذریعے حکم دے رہا تھا کہ: ''میں تمہارے ساتھ ہوں، اب تم مؤمنوں کے قدم جماؤ، میں کافروں کے دِلوں میں رُعب طاری کردوں گا، پھر تم گردنوں کے اُوپر وار کرو، اور ان کی اُنگلیوں کے ہر ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔'' ﴿۱۲﴾ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے دُشمنی مول لی ہے، اور اگر کوئی شخص اللہ اور اُس کے رسول سے دُشمنی مول لیتا ہے تو یقیناً اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ﴿۱۳﴾ یہ سب تو (اب) چکھ لو، اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ کافروں کے لئے (اصل) عذاب دوزخ کا ہے ﴿۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اُس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تم پر اُونگ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کے لئے اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ اس پانی کے ذریعہ تم کو (بے وضو یا بے غسل ہونے کی حالت سے) پاک کردے اور (تاکہ اُس کے ذریعہ) تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کردے اور (تاکہ) تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور (تاکہ) تمہارے پاؤں جمادے (یعنی تم ریگ میں نہ دھسو) اُس وقت کو یاد کرو جبکہ آپ کا ربّ (اُن) فرشتوں کو (جو امداد کے لئے نازل ہوئے تھے) حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں تو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے قلوب میں رُعب ڈالے دیتا ہوں سو تم کفار کی گردنوں پر (حربہ) مارو اور اُن کے پور پور کو مارو۔ یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ کی اور اُس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اُس کو) سخت سزا دیتے ہیں

(خواہ دنیا میں کسی حکمت سے یا آخرت میں یا دونوں میں) سو (بالفعل) یہ سزا چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کے لئے جہنم کا عذاب مقرر ہی ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورۂ انفال سے اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کا بیان ہو رہا ہے جو اُس کے فرمانبردار بندوں پر مبذول ہوئے۔ غزوۂ بدر کے واقعات بھی اُسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ غزوۂ بدر میں جو انعامات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے اُن میں سے پہلا انعام تو خود اس جہاد کے لئے مسلمانوں کو نکالنا ہے جس کا بیان آیت كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ میں ہوا ہے، دوسرا انعام فرشتوں کی مدد کا وعدہ ہے جس کا ذکر آیت اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ میں آیا ہے، تیسرا انعام دُعاء کی قبولیت اور مدد کا وعدہ پورا کرنا ہے جس کا ذکر آیت اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ میں ہوا ہے۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں چوتھے انعام کا تذکرہ ہے جس میں مسلمانوں کے لئے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک سب پر نیند غالب آ کر پریشانی اور تکان کا دور ہو جانا دوسرے بارش کے ذریعہ ان کے لئے پانی مہیا فرمانا اور میدانِ جنگ کو ان کے لئے ہموار اور دشمن کے لئے دلدل بنا دینا۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ جس وقت کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ ٹھن گیا تو کفارِ مکہ کا لشکر پہلے پہنچ کر ایک ایسے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا جو اونچائی پر تھا۔ پانی اُس کے قریب تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس جگہ پہنچے تو وادی کے نچلے حصہ میں جگہ ملی۔ قرآن کریم نے اس میدانِ جنگ کا نقشہ اسی سورت کی بیالیسویں آیت میں اس طرح کھینچا ہے اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى جس کا مفصل بیان بعد میں آئے گا۔

جس جگہ پہنچ کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل قیام فرمایا۔ اُس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیشِ نظر اختیار فرمایا گیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکمِ خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدل کیا جا سکتا ہے۔ تب حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اُس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی افراط کے ساتھ مل جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کے لئے بنا کر اُس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔

اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لئے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ میں بنادیں جہاں آپ مقیم رہیں اور آپ کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں۔ منشاء اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلہ میں جہاد کریں گے اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر اُن صحابہ کرام کے ساتھ جاملیں جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے ہیں کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جان نثاری اور آپ سے محبت میں ہم سے کم نہیں اور اگر اُن کو آپ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپ کا اس مسلح لشکر سے مقابلہ ہوگا تو اُن میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا، آپ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کے رفیق کار رہیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اس جانبازانہ پیش کش پر دُعائیں دیں۔ اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ کے لئے بنادیا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ دروازہ پر حفاظت کے لئے تلوار لئے کھڑے تھے۔

معرکہ کی پہلی رات تھی، تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا، میدانِ جنگ کا بھی اچھا مقام اُن کے قبضہ میں آچکا تھا، نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا جس میں چلنا دشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی، بعض لوگوں کے دل میں شیطان نے یہ وساوس بھی ڈالنے شروع کئے کہ تم لوگ اپنے آپ کو حق پر کہتے ہو اور اس وقت بھی بجائے آرام کرنے کے نمازِ تہجد وغیرہ میں مشغول ہو مگر حال یہ ہے کہ دشمن ہر حیثیت سے تم پر غالب اور تم سے بڑھا ہوا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک خاص قسم کی نیند مسلط فرمادی جس نے ہر مسلمان کو خواہ اُس کا ارادہ سونے کا تھا یا نہیں جبراً سلادیا۔

حافظِ حدیث ابویعلیٰ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غزوۂ بدر کی اس رات میں ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو سونہ گیا ہو۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات بیدار رہ کر صبح تک نمازِ تہجد میں مشغول رہے۔ [1]

اور ابن کثیرؒ نے بحوالۂ صحیح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں جبکہ اپنے عریش یعنی سائبان میں نمازِ تہجد میں مشغول تھے آپ کو بھی کسی قدر اُونگھ آگئی مگر فوراً ہی ہنستے ہوئے بیدار ہو کر فرمایا۔ اے ابوبکر خوشخبری سنو یہ جبرئیل علیہ السلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں اور یہ کہہ کر آپ سائبان سے باہر یہ آیت پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ (القمر) یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔ بعض

[1] مسند ابی یعلی الموصلی رقم الحدیث: ۲۶۴

روایات میں ہے کہ آپ نے باہر نکل کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ ابوجہل کی قتل گاہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی، اور پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ (تفسیر مظہری) [۱]

اور جیسا غزوۂ بدر میں تکان اور پریشانی دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام پر خاص قسم کی نیند مسلط فرمائی اسی طرح غزوۂ اُحد میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ جنگ کی حالت میں نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن واطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔ اور نماز میں نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ابن کثیر) [۲]

دوسری نعمت مسلمانوں کو اس رات میں یہ ملی کہ بارش ہوگئی جس نے میدان جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ دیا، قریشی لشکر نے جس جگہ پر قبضہ کیا تھا وہاں تو بارش بہت تیز آئی اور میدان میں دلدل ہوکر چلنا مشکل ہوگیا، اور جس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ مقیم تھے یہاں ریت کی وجہ سے چلنا مشکل تھا یہاں بارش ہلکی ہوئی جس نے تمام ریتے کو جما کر میدان کو نہایت ہموار خوشگوار بنادیا۔

آیتِ مذکورہ میں انہیں دو نعمتوں کا ذکر ہے نیند اور بارش جس نے میدانِ کارزار کا نقشہ پلٹ کر وہ شیطانی وساوس دھوڈالے جو بعض کمزور لوگوں کو ستا رہے تھے کہ ہم حق پر ہونے کے باوجود مقہور ومغلوب نظر آتے ہیں اور دشمن باطل پر ہونے کے باوجود قوت وشوکت اور اطمینان کی حالت میں ہے۔

آیتِ مذکورہ میں فرمایا کہ اُس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا چین دینے کے لئے اور تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اُس پانی سے تم کو پاک کردے۔ اور تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کردے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور تمہارے پاؤں جمادے۔

دوسری آیت میں پانچویں انعام کا ذکر ہے جو اس غزوۂ بدر کے میدانِ کارزار میں مسلمانوں پر مبذول ہوا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرشتے مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیجے تھے اُن کو خطاب کرکے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، سو تم کفار کی گردنوں پر حربہ مارو اور اُن کے پور پور کو مارو۔

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کئے گئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائی یہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آکر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کردیں اور اُن میں قوت پیدا کردیں۔ دوسرا کام یہ بھی اُن کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۳، والتفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۲

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۲

میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت وقوت بھی بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کی تائید چند روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر درمنثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتالِ ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرام سے نقل کی ہیں۔ [1]

تیسری آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اس معرکۂ کفر واسلام میں جو کچھ ہوا اُس کا سبب یہ تھا کہ ان کفار نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور جو اللہ ورسول کی مخالفت کرتا ہے اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب شدید اور سخت ہوا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غزوۂ بدر میں ایک طرف تو مسلمانوں پر انعامات نازل ہوئے۔ فتح ونصرت اُن کو حاصل ہوئی۔ دوسری طرف کفار پر مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب نازل فرما کر اُن کی بدکرداریوں کی تھوڑی سی سزا دے دی گئی۔ اور اس سے زیادہ بھاری سزا آخرت میں ہونے والی ہے جس کو چوتھی آیت میں بیان فرمایا ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

یعنی یہ ہمارا تھوڑا سا عذاب ہے اس کو چکھو اور سمجھ لو کہ اس کے بعد کافروں کے لئے جہنم کا عذاب آنے والا ہے جو نہایت شدید ومدید اور نا قابلِ قیاس ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ

اے ایمان والو جب بھڑو تم کافروں سے میدانِ جنگ میں تو مت پھیرو اُن سے

الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ

پیٹھ۔ اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ اُس دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو لڑائی کا

اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ

یا جا مِلتا ہو فوج میں سو وہ پھرا اللہ کا غضب لے کر اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ

اور وہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔ سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا، اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی

---

[1] التفسير المظهرى ج:۴ ص:۲۹، ۳۰، والدر المنثور تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۴۱۹

اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ

جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی، اور تاکہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان،

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

بیشک اللہ ہے سننے والا جاننے والا۔ یہ تو ہو چکا اور جان رکھو کہ اللہ سست کر دے گا تدبیر کافروں کی۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا تمہارے پاس فیصلہ، اور اگر باز آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے،

وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْــًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ

اور یہی کرو گے تو ہم بھی پھر یہی کریں گے، اور کچھ کام نہ آئے گا تمہارے تمہارا جتھا اگرچہ بہت ہوں

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع

ع ۲ ۹ ۱۶

اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب کافروں سے تمہارا آمنا سامنا ہو جائے، جبکہ وہ چڑھائی کر کے آرہے ہوں، تو اُن کو پیٹھ مت دِکھاؤ ﴿۱۵﴾ اور اگر کوئی شخص کسی جنگی چال کی وجہ سے ایسا کر رہا ہو، یا اپنی کسی جماعت سے جا ملنا چاہتا ہو، اُس کی بات تو اور ہے، مگر اُس کے سوا جو شخص ایسے دن اپنی پیٹھ پھیرے گا تو وہ اللہ کی طرف سے غضب لے کر لوٹے گا، اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ﴿۱۶﴾ چنانچہ (مسلمانو! حقیقت میں) تم نے ان (کافروں کو) قتل نہیں کیا تھا، بلکہ انہیں اللہ نے قتل کیا تھا، اور (اے پیغمبر!) جب تم نے ان پر (مٹی) پھینکی تھی تو وہ تم نے نہیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی، اور (تمہارے ہاتھوں یہ کام اس لئے کرایا تھا) تاکہ اس کے ذریعے اللہ مؤمنوں کو بہترین اَجر عطا کرے۔ بیشک اللہ ہر بات کو سننے والا، ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۱۷﴾ یہ سب کچھ تو اپنی جگہ، اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ اللہ کو کافروں کی ہر سازش کو کمزور کرنا تھا۔ ﴿۱۸﴾

(اے کافرو!) اگر تم فیصلہ چاہتے تھے، تو لو! اب فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا۔ اب اگر تم باز آ جاؤ تو یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہوگا، اور اگر تم پھر وہی کام کروگے (جواَب تک کرتے رہے ہو) تو ہم بھی پھر وہی کام کریں گے (جواَب کیا ہے)۔ اور تمہارا جتھہ تمہارے کچھ کام نہیں آئے گا، چاہے وہ کتنا زیادہ ہو، اور یاد رکھو کہ اللہ مؤمنوں کے ساتھ ہے۔ ⑲

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم کافروں سے (جہاد میں) دوبدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرنا (یعنی جہاد سے مت بھاگنا) اور جو شخص ان سے اس موقع پر (یعنی مقابلہ کے وقت) پشت پھیرے گا مگر ہاں جو لڑائی کے لئے پینترا بدلتا ہو یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آتا ہو وہ مستثنیٰ ہے باقی اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے (فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ الآیۃ کے اندر بھی ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ آپ نے بدر کے روز ایک مٹھی کنکریوں کی اٹھا کر کافروں کی طرف پھینکی جس کے ریزے سب کی آنکھوں میں جا گرے اور ان کو شکست ہوئی اور فرشتوں کا امداد کے لئے آنا اوپر آ چکا ہے اس پر بطور تفریع فرماتے ہیں کہ جب ایسے عجیب واقعات ہوئے جو کہ بالکل تمہارے اختیار سے خارج ہیں) سو (اس سے معلوم ہوا کہ تاثیر حقیقی کے مرتبہ میں) تم نے ان (کافروں) کو قتل نہیں کیا لیکن (ہاں اس مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے (بیشک) ان کو قتل کیا (یعنی مؤثر حقیقی اس کی قدرت ہے) اور (اسی طرح تاثیر حقیقی کے مرتبہ میں) آپ نے خاک کی مٹھی (ان کی طرف) نہیں پھینکی، لیکن (ہاں اس مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے (واقعی) وہ پھینکی اور (باوجود اس کے کہ مؤثر حقیقی قدرتِ حق ہے پھر جو آثارِ قتل وغیرہ کو قدرتِ عبد پر مرتب فرما دیا تو اس میں حکمت یہ ہے کہ) تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے (ان کے عمل کا) خوب اجر دے (اور اجر کا ملنا حسبِ سنتِ الٰہیہ موقوف ہے اس پر کہ فعل ان کے عزم و اختیار سے صادر ہو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ان مؤمنین کے اقوال کے) خوب سننے والے (اور ان کے افعال و احوال کے) خوب جاننے والے ہیں (ان اقوال استغاثہ اور افعال قتال و احوال تشویش وغیرہا میں جو ان کو محنت پیش آئی ہم کو اس کی اطلاع ہے ان کو اس پر جزا دیں گے) ایک بات تو یہ ہوئی اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کافروں کی تدبیر کا کمزور کرنا تھا (اور زیادہ کمزوری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اپنے برابر والے کے بلکہ اپنے سے کمزور کے ہاتھ سے مغلوب ہو جائے اور یہ بھی موقوف ہے اس پر کہ وہ آثار مؤمنین کے ہاتھ سے ظاہر ہوں ورنہ کہہ سکتے تھے کہ تدابیر تو ہماری قوی تھیں لیکن اقویٰ کے سامنے کہ تدبیر الٰہی ہے نہ چل سکیں تو اس سے آئندہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا حوصلہ پست نہ ہو کیونکہ ان کو تو ضعیف ہی سمجھتے) اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تو تمہارے پاس آ موجود ہوا (کہ جو حق پر تھا اس کو غلبہ ہو گیا) اور اگر (اب حق زیادہ واضح ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے) باز آجاؤ تو یہ

تمہارے لئے نہایت خوب ہے اور اگر (اب بھی باز نہ آئے بلکہ) تم پھر وہی کام کرو گے (یعنی مخالفت) تو ہم بھی پھر یہی کام کریں گے (یعنی تم کو مغلوب اور مسلمانوں کو غالب کر دینا) اور (اگر تم کو اپنی جمعیت کا گھمنڈ ہو کہ اب کی بار اس سے زیادہ جمع کر لیں گے تو یاد رکھو کہ) تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آئے گی گو کتنی زیادہ ہو اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (اصل میں) ایمان والوں کے ساتھ (یعنی ان کا مددگار) ہے (گو کسی عارض کی وجہ سے کسی وقت ان کے غلبہ کا ظہور نہ ہو لیکن اصل محل غلبہ کے یہی ہیں اس لئے ان سے مقابلہ کرنا اپنا نقصان کرنا ہے)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اسلام کا ایک جنگی قانون بتلایا گیا ہے۔ پہلی آیت میں لفظ زُحف سے مراد دونوں لشکروں کا مقابلہ اور اختلاط ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ایسی جنگ چھڑ جانے کے بعد پشت پھیرنا اور میدان سے بھاگنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

دوسری آیت میں اس حکم سے ایک استثناء کا ذکر اور ناجائز طور پر بھاگنے والوں کے عذابِ شدید کا بیان ہے۔

استثناء دو حالتوں کا ہے اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ یعنی جنگ کے وقت پشت پھیرنا صرف دو حالتوں میں جائز ہے۔ ایک تو یہ کہ میدان سے پشت پھیرنا محض ایک جنگی چال کے طور پر دشمن کو دکھلانے کے لئے ہو حقیقۃً میدان سے ہٹنا مقصد نہ ہو بلکہ مخالف کو ایک غفلت میں ڈال کر یکبارگی حملہ پیشِ نظر ہو۔ یہ معنی ہیں اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ کے کیونکہ تحرّف کے معنی کسی ایک جانب مائل ہونے کے آتے ہیں۔ (روح المعانی)[1]

دوسری استثنائی حالت جس میں میدان سے پشت پھیرنے کی اجازت ہے یہ ہے کہ اپنے موجودہ لشکر کی کمزوری کا احساس کر کے اس لئے پیچھے ہٹیں کہ مجاہدین کی مزید کمک حاصل کر کے پھر حملہ آور ہوں۔ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ کے یہی معنی ہیں کیونکہ تَحَيُّز کے لفظی معنی انضمام اور ملنے کے ہیں اور فِئَه کے معنی جماعت کے، مطلب یہ ہے کہ اپنی جماعت سے مل کر قوت حاصل کرنے اور پھر حملہ کرنے کی نیت سے میدان چھوڑے تو یہ جائز ہے۔

یہ استثناء ذکر کرنے کے بعد اُن لوگوں کی سزا کا ذکر ہے جنہوں نے استثنائی حالات کے بغیر ناجائز طور پر میدان چھوڑا یا پشت موڑی۔ ارشاد ہے فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ یعنی میدان سے بھاگنے والے اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے یہ حکم معلوم ہوا کہ فریقِ مقابل کتنی ہی زیادہ تعداد اور قوت و شوکت میں ہو مسلمانوں کو اُن

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۷ ص:۳۷

کے مقابلہ سے پشت پھیرنا حرام ہے، بجز دو استثنائی صورتوں کے یہ کہ پشت پھیرنا بھاگنے کے لئے نہ ہو بلکہ یا تو پینترا بدلنے کے طور پر ہو اور یا کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے کے قصد سے ہو۔

غزوۂ بدر میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اُس وقت یہی حکم عام تھا کہ خواہ کتنی ہی بڑی تعداد سے مقابلہ ہو جائے اور اپنی تعداد سے اُن کی کوئی نسبت نہ ہو پھر بھی پشت پھیرنا اور میدان چھوڑنا جائز نہیں۔ میدانِ بدر میں یہی صورت تھی کہ تین سو تیرہ کا مقابلہ تگنی تعداد یعنی ایک ہزار سے ہو رہا تھا۔ بعد میں تخفیف کے اَحکام سورۂ انفال کی آیت ۶۵ اور ۶۶ میں نازل ہوئے آیت ۶۵ میں بیس مسلمانوں کو دو سو کافروں کے اور سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کے مقابلہ میں جہاد کرنے کا حکم ہے اور آیت ۶۶ میں مزید تخفیف کا یہ قانون نازل ہو گیا: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ الآیـة۔ یعنی اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور تمہارے ضعف کے پیش نظر یہ قانون جاری کر دیا کہ اگر مسلمان سو آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو کفار پر غالب آسکیں گے۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ اپنے سے دوگنی تعداد تک تو مسلمانوں ہی کے غالب رہنے کی توقع ہے اس لئے پشت پھیرنا جائز نہیں۔ ہاں فریقِ مخالف کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو جائے تو ایسی حالت میں میدان چھوڑ دینا جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو شخص اکیلا تین آدمیوں کے مقابلے سے بھاگا وہ بھاگا نہیں ہاں جو دو آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگنے والا ہے یعنی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے (رُوح البیان)۔[1] اب یہی حکم قیامت تک باقی ہے ___ جمہور اُمت اور ائمہ اربعہؒ کے نزدیک حکمِ شرعی یہی ہے کہ جب تک فریقِ مخالف کی تعداد دوگنی سے زائد نہ ہو اُس وقت تک میدانِ جنگ سے بھاگنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

صحیحین میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں کو انسان کے لئے مہلک فرمایا اُن میں میدانِ جنگ سے بھاگنا بھی شمار فرمایا۔[2] اور غزوۂ حُنین کے واقعہ میں صحابہ کرام کی ابتدائی پسپائی کو قرآنِ کریم نے ایک شیطانی لغزش قرار دیا جو اُس کے گناہِ عظیم ہونے کی دلیل ہے ارشاد فرمایا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ (آل عمران:۱۵۵)

اور ترمذی، ابوداؤد کی ایک روایت میں جو قصہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا منقول ہے کہ ایک مرتبہ جنگ سے بھاگ کر انہوں نے مدینہ میں پناہ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اعترافِ جرم کیا کہ ہم

---

[1] روح البیان ج:۱ ص:۸۲۸، ۸۲۹

[2] صحيح البخاری، کتاب الوصايا، باب قول الله تعالى ان الذين يأكلون اموال اليتامٰى ظلمًا إلخ ج:۱ ص:۳۸۷، وصحيح مسلم، کتاب الإيمان، باب الكبائر واكبرها ج:۱ ص:۶۴

میدانِ جنگ سے بھاگنے والے مجرم ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اظہار ناراضی کے اُن کو تسلی دی اور فرمایا بَلْ اَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ وَاَنَا فِئَتُكُمْ یعنی تم بھاگنے والے نہیں بلکہ کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہارے لئے کمک ہوں۔[1] اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح فرمادیا کہ ان لوگوں کا بھاگ کر مدینہ میں پناہ لینا اُس استثناء کے اندر داخل ہے جس میں کمک حاصل کرنے کے لئے میدان چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو حق تعالیٰ کے خوف اور ہیبت وعظمت کا جو مقام خاص حاصل تھا اُس کی بناپر وہ اس ظاہری پسپائی سے بھی گھبرائے اور اپنے آپ کو مجرم کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا۔

تیسری آیت میں غزوۂ بدر کے بقیہ واقعہ کا بیان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ غزوۂ بدر کی معجزانہ فتح میں کثرت کے قلّت سے اور قوت کے ضعف سے مغلوب ہوجانے کو اپنی سعی وعمل کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ اُس ذاتِ پاک کی طرف دیکھو جس کی نصرت وامداد نے یہ نقشۂ جنگ پلٹ دیا۔

واقعہ جو اس آیت میں بیان ہوا اُس کی تفصیل ابن جریر طبریؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے یہ نقل کی ہے کہ معرکۂ بدر کے دن جب مکہ کے ایک ہزار جوانوں کا لشکر ٹیلہ کے پیچھے سے میدان میں آیا تو مسلمانوں کی قلّت وضعف اور اپنی کثرت وقوت پر فخر کرتا ہوا متکبرانہ انداز سے سامنے آیا۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی کہ یا اللہ! یہ تیرے جھٹلانے والے قریش فخر وتکبر کرتے ہوئے آرہے ہیں آپ نے جو فتح کا وعدہ مجھ سے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرما (روح البیان)۔[2] تو جبریل امین نازل ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ایک مٹھی خاک کی لے کر دشمن کے لشکر کی طرف پھینک دیں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اور ابن ابی حاتم نے بروایت ابن زید نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ مٹی اور کنکروں کی مٹھی بھری ایک لشکر کے داہنے حصہ پر دوسری بائیں حصہ پر تیسری سامنے کی جانب پھینک دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس ایک یا تین مٹھی بھر کنکریوں کو قدرت نے معجزانہ انداز میں اس طرح پھیلادیا کہ مخالف لشکر کا کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کی آنکھوں ں میں اور چہروں پر یہ دھول اور کنکریاں نہ پہنچی ہوں جس کا اثر یہ ہوا کہ پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا فرشتے الگ ان کے ساتھ شریکِ قتال تھے۔ (مظہری، روح)[3]

بالآخر کچھ لوگ مخالف فریق کے قتل ہوگئے کچھ گرفتار کر لئے گئے باقی بھاگ گئے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الجهاد، بابٌ ج:۱ ص:۳۰۱، ۳۰۲

[2] تفسير الطبری تحت هٰذه الآية رقم الحديث:۱۵۸۲۱، دلائل النبوة للبيهقیؒ رقم الحديث:۹۷۱

[3] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۷ ص:۴۲، والتفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۳۸، ۳۹

بالکل مایوسی اور نا امیدی کے عالم میں یہ فتح عظیم مسلمانوں کو حاصل ہوئی میدانِ جنگ سے واپس آ کر آپس میں گفتگوئیں شروع ہوئیں صحابہ کرام اپنے اپنے کارنامے ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ جس میں اُن کو یہ ہدایت دی گئی کہ اپنی سعی و عمل پر نازل نہ کرو یہ جو کچھ ہوا وہ صرف تمہاری محنت و کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خالص حق تعالیٰ کی نصرت و امداد کا ثمرہ تھا۔ جو دشمن تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے اُن کو درحقیقت تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى یعنی یہ مٹھی کنکریوں کی جو آپ نے پھینکی وہ درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھینکنے کا یہ نتیجہ کہ لشکرِ دشمن کے ہر فرد کی آنکھوں میں پہنچ کر سب کو سراسیمہ کر دے یہ آپ کے پھینکنے کا اثر نہیں تھا بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ صورت پیدا فرمائی۔

ما رمیت اذ رمیت گفت حق　　کار ما بر کارہا دارد سبق [۱]

غور کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے جہاد کی فتح و کامیابی سے زیادہ قیمتی یہ ہدایت تھی جس نے اُن کے ذہنوں کو اسباب سے پھیر کر مسبّب الاسباب سے وابستہ کر دیا اور اس کے ذریعہ اُس فخر و عُجب کی خرابی سے بچا لیا جس کے نشہ میں عموماً فاتح اقوام مبتلا ہو جایا کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتلایا کہ فتح و شکست ہمارے حکم کے تابع ہیں۔ اور ہماری فتح و نصرت اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اطاعت گزار ہوں۔ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا یعنی یہ فتح عظیم ہم نے اس لئے دی کہ مؤمنین کو اُن کی محنت کا پورا صلہ دے دے۔ بـلاء کے لفظی معنی امتحان کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا امتحان کبھی مصیبت و مشقت میں مبتلا کر کے ہوتا ہے اور کبھی راحت و دولت دے کر۔ بـلاء حَسَن اُس امتحان کو کہا گیا ہے جو راحت، دولت اور فتح و نصرت دے کر لیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کو ہمارا انعام سمجھ کر شکر گزار ہوتے ہیں یا اُس کو اپنی ذاتی قابلیت کا اثر سمجھ کر فخر و ناز میں مبتلا ہو جاتے اور اپنے عمل کو برباد کر دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کے فخر و ناز کی کوئی گنجائش نہیں ہے بقول مولانا رومیؒ۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ [۲]

چوتھی آیت میں اس کے بالمقابل اس فتح کا ایک اور فائدہ بھی یہ بتلایا گیا کہ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ یعنی یہ فتح و نصرت اس لئے بھی مسلمانوں کو دی گئی کہ اس کے ذریعہ کافروں کی تدبیروں کو ناکام اور ناکارہ

---

[۱] ترجمہ: مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میرا کام بہت سے کاموں سے بڑھ گیا۔
[۲] ترجمہ: عقل اور طبیعت کو تیز کر لینا راہ نہیں ہے، شاہ کا فضل، عاجز کے سوا کسی کی دستگیری نہیں کرتا۔

بنا دیا جائے۔ جس سے وہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ نہیں، اور کوئی تدبیر بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کامیاب نہیں ہوسکتی۔

پانچویں آیت میں شکست خوردہ قریشی کفار کو خطاب اور ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو قریشی لشکر کے مسلمانوں کے مقابلہ پر مکہ سے نکلنے کے وقت پیش آیا تھا۔

وہ یہ کہ جب قریشی کفار کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا تو مکہ سے نکلنے سے پہلے لشکر کے سردار ابوجہل وغیرہ نے بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دُعائیں مانگی تھیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس دعاء میں انہوں نے اپنی فتح کی دُعا کرنے کے بجائے عام الفاظ میں اس طرح دُعا مانگی:

''یا اللہ! دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ و افضل ہے اور دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اور دونوں پارٹیوں میں سے جو زیادہ کریم و شریف ہے اور دونوں میں سے جو دین افضل ہے اُس کو فتح دیجئے۔'' (مظہری) [1]

یہ بے وقوف تو یوں سمجھ رہے تھے کہ بمقابلہ مسلمانوں کے ہم ہی اعلیٰ و افضل اور زیادہ ہدایت پر ہیں اس لئے یہ دُعا ہمارے حق میں ہے اور اس دُعا کے ذریعہ وہ یہ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کا فیصلہ ہوجائے۔ اور جب ہم فتح پائیں تو یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے حق پر ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

مگر اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ اس دُعا میں درحقیقت وہ اپنے لئے بددُعا اور مسلمانوں کے لئے دُعا کر رہے ہیں۔ انجامِ جنگ سامنے آنے کے بعد قرآن کریم نے اُن کو بتلایا اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ یعنی اگر تم خدائی فیصلہ چاہتے ہو تو وہ سامنے آچکا کہ حق کو فتح اور باطل کو شکست ہوگئی۔ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ اور اگر تم اب بھی اپنے کفر و عناد سے باز آگئے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ اور اگر تم پھر اپنی شرارت اور جنگ کی طرف لوٹے تو ہم بھی مسلمانوں کی امداد کی طرف لوٹیں گے۔ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ یعنی تمہاری جماعت اور جتھا کتنا ہی زیادہ ہو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے مقابلہ میں تمہیں کچھ کام نہ دے گا۔ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ یعنی کوئی جماعت تمہیں کیا کام دے سکتی ہے جبکہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس سے مت پھرو

[1] التفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۴۲

وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ۝۲۰ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ قَالُوۡا سَمِعۡنَا

سن کر۔ اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا

وَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ۝۲۱ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ

اور وہ سنتے نہیں۔ بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں

الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝۲۲ وَلَوۡ عَلِمَ اللّٰهُ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا لَّاَسۡمَعَهُمۡ

جو نہیں سمجھتے۔ اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا،

وَلَوۡ اَسۡمَعَهُمۡ لَتَوَلَّوۡا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝۲۳ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا

اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر۔ اے ایمان والو

اسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ‌ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ

حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے، اور جان لو کہ اللہ

يَحُوۡلُ بَيۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ۝۲۴

روک لیتا ہے آدمی سے اس کے دل کو اور یہ کہ اسی کے پاس تم جمع ہو گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی تابع داری کرو، اور اس (تابع داری) سے منہ نہ موڑو، جبکہ تم (اللہ اور رسول کے احکام) سن رہے ہو ۝۲۰ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو ہیں کہ ہم نے سن لیا، مگر وہ (حقیقت میں) سنتے نہیں ہیں ۝۲۱ یقین رکھو کہ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۝۲۲ اور اگر اللہ کے علم میں ان کے اندر کوئی بھلائی ہوتی تو وہ ان کو سننے کی توفیق دے دیتا، لیکن اب (جبکہ ان میں بھلائی نہیں ہے) اگر

اُن کو سننے کی توفیق دے بھی دے تو وہ منہ موڑ کر بھاگ جائیں گے۔ ﴿۲۳﴾ اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی دعوت قبول کرو، جب رسول تمہیں اُس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔ اور یہ بات جان رکھو کہ اللہ انسان اور اُس کے دِل کے درمیان آڑ بن جاتا ہے، اور یہ کہ تم سب کو اسی کی طرف اِکٹھا کر کے لے جایا جائے گا ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا اور اس کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم (اعتقاد سے) سن تو لیتے ہی ہو (یعنی جیسا اعتقاد سے سن لیتے ہو ایسا ہی عمل بھی کیا کرو) اور تم (ترکِ اطاعت میں) ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا (جیسا کہ کفار کہ مطلق سماع کے اور منافقین سماع مع الاعتقاد کے مدعی تھے) حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں (کیونکہ تفہم اور اعتقاد دونوں میں مفقود ہے مطلب یہ کہ ثمرہ اعتقاد سننے کا عمل ہے جب عمل نہ ہوا تو بعض وجوہ سے مشابہ اسی کے ہو گیا کہ جیسے اعتقاد کے ساتھ سنا ہی نہیں جس کو تم بھی سخت مذموم جانتے ہو) بیشک (یہ بات ضرور ہے کہ اعتقاد سے سُن کر عمل نہ کرنے والے اور ایک بلا اعتقاد سننے والے جو مثل نہ سننے کے ہے بُرے ہونے میں متفاوت ضرور ہیں کیونکہ کافر اور عاصی برابر نہیں چنانچہ) بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو (حق بات کو اعتقاد کے ساتھ سننے سے) بہرے ہیں (اور حق بات کے کہنے سے) گونگے ہیں (اور) جو کہ (حق بات کو) ذرا نہیں سمجھتے (اور باوجود اعتقاد کے جن سے عمل میں کوتاہی ہو جاتی ہے وہ بدتر نہیں ہیں گو بد ہیں سو بد بھی نہ ہونا چاہئے) اور (جن کا حال مذکور ہوا کہ وہ اعتقاد سے نہیں سنتے وجہ اس کی یہ ہے کہ ان میں ایک بڑی خوبی کی کسر ہے اور وہ خوبی طلب حق ہے کیونکہ مبدأ اعتقاد کا بھی طلب اور تلاش ہے گو اس وقت اعتقاد نہ ہو مگر کم از کم تردد تو ہو پھر اسی تردد وطلب کی برکت سے حق واضح ہو جاتا ہے اور وہ تردد اعتقاد بن جاتا ہے جس پر سماع کا نافع ہونا موقوف ہے سو ان میں یہی خوبی مفقود ہے چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے (مراد یہ کہ ان میں وہ خوبیٔ مذکور ہوتی کیونکہ خوبی کے وجود کے وقت علمِ الٰہی کا تعلق لازم ہے پس لازم بول کر ملزوم مراد لے لیا اور کوئی خوبی اس لئے کہا کہ جب ایسی خوبی نہیں جس پر مدار نجات ہے تو گویا کوئی خوبی بھی نہیں یعنی اگر ان میں طلبِ حق ہوتی) تو (اللہ تعالیٰ) ان کو (اعتقاد کے ساتھ) سننے کی توفیق دیتے (جیسا مذکور ہوا کہ طلب سے اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے) اور اگر (اللہ تعالیٰ) ان کو اب (حالت موجودہ میں کہ ان میں طلب حق نہیں ہے) سُنا دیں (جیسا کہ گاہ گاہ ظاہری کانوں سے سن ہی لیتے ہیں) تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے (یعنی یہ نہیں کہ تأمل وتدبر کے بعد بوجہ ظہور غلطی کے روگردانی کی ہو کیونکہ یہاں غلطی کا نام ونشان ہی نہیں بلکہ غضب تو یہ ہے کہ ادھر توجہ ہی نہیں کرتے اور) اے ایمان والو! (ہم نے جو اوپر تم کو اطاعت کا حکم کیا ہے تو یاد رکھو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کہ وہ حیات

ابدی ہے جب یہ بات ہے تو) تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول (جن کا ارشاد خدا ہی کا ارشاد ہے) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف (یعنی دین کی طرف جس سے زندگی جاوید میسر ہوتی ہے) بلاتے ہوں (تو اس حالت میں جبکہ ہر طرح تمہارا ہی فائدہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ تم عمل نہ کرو) اور (اس کے متعلق دو باتیں اور) جان رکھو (ایک بات یہ) کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں (دو طریق سے ایک طریق یہ کہ مؤمن کے قلب میں طاعت کی برکت سے کفر و معصیت کو نہیں آنے دیتا دوسرا طریق یہ کہ کافر کے قلب میں مخالفت کی نحوست سے ایمان وطاعت کو نہیں آنے دیتا اس سے معلوم ہوا کہ طاعت کی مداومت بڑی نافع چیز ہے اور مخالفت کی مواظبت بڑی مضر چیز ہے) اور (دوسری بات یہ جان رکھو کہ) بلاشبہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے (اس وقت طاعت پر جزا اور مخالفت پر سزا ہوگی اس سے بھی طاعت کا نافع ہونا اور مخالفت کا مضر ہونا ثابت ہوا)۔

معارف ومسائل

غزوۂ بدر جس کا واقعہ پچھلی آیات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اُس میں اہلِ اسلام اور کفار دونوں کے لئے عبرت اور حکمت کے بہت سے اسباق ہیں جن کی طرف قصہ کے درمیانی جملوں میں تنبیہ فرمائی گئی ہے۔

مثلاً پچھلی آیات میں مشرکینِ مکہ کی شکست وذلت کا واقعہ بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی ہر طرح کی قوت وسامان کے باوجود مشرکینِ مکہ کی شکست کا اصلی سبب اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت تھی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے جو زمین وآسمان کے خالق ومالک کی قدرتِ کاملہ اور غیبی قوت سے قطع نظر کر کے صرف مادّی قوتوں پر بھروسہ کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے باوجود اُس کی امداد ونصرت کی غلط آرزوؤں سے اپنے نفس کو فریب دیتے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں اسی مسئلہ کا دوسرا رُخ مسلمانوں کو خطاب کر کے بیان فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو باوجود قلّتِ تعداد اور بے سامانی کے یہ فتح عظیم صرف اللہ جل شانہٗ کی نصرت وامداد سے حاصل ہوئی اور یہ نصرت وامداد نتیجہ ہے اُن کی اطاعت حق کا۔ اس اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی اے ایمان والو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کرو اور اُس پر مضبوطی سے قائم رہو۔ پھر اسی مضمون کی مزید تاکید کے لئے فرمایا وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ یعنی قرآن اور کلمۂ حق سن لینے کے باوجود اطاعت سے روگردانی نہ کرو۔

سُن لینے سے مراد حق بات کا سننا ہے اور سننے کے چار درجات ہیں ایک یہ کہ کوئی آواز صرف کانوں سے سن لی مگر

نہ اُس کو سمجھنے کی کوشش کی نہ سمجھا اور نہ اُس پر اعتقاد و اعتماد کیا اور نہ عمل کیا۔ دوسرے یہ کہ کانوں سے سنا بھی اور سمجھا بھی مگر نہ اُس پر اعتقاد کیا نہ عمل۔ تیسرے یہ کہ سُنا بھی اور سمجھا بھی اور اعتقاد و اعتماد بھی کیا مگر عمل نہیں کیا۔ چوتھے یہ کہ سُنا بھی سمجھا بھی اور اعتماد بھی کیا اور عمل بھی۔

یہ ظاہر ہے کہ سننے کا اصل مقصد پوری طرح تو چوتھے درجہ ہی سے حاصل ہوتا ہے جو مؤمنینِ کاملین کا مقام ہے اور ابتدائی تینوں درجوں میں سننا ناقص اور نامکمل ہے جس کو ایک حیثیت سے نہ سننا بھی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ اگلی آیات میں آتا ہے۔ اور تیسرا درجہ جس میں حق کا سننا، سمجھنا، اعتقاد کرنا تو موجود ہے مگر عمل نہیں۔ اس میں اگرچہ سننے کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا مگر اعتقاد بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے وہ بھی بیکار نہیں، یہ درجہ گناہگار مسلمانوں کا ہے۔ اور دوسرا درجہ جس میں صرف سننا اور سمجھنا ہے نہ اعتقاد ہے نہ عمل، یہ منافقین کا درجہ ہے کہ قرآن کو سنتے بھی ہیں سمجھتے بھی ہیں اور ظاہر میں اعتقاد و عمل کا دعویٰ بھی ہے مگر حقیقت میں عقیدہ اور عمل سے خالی ہیں اور پہلا درجہ عامِ مشرکین و کفار کا ہے جنہوں نے کلمہ حق اور قرآن کی آیات کانوں سے تو سُن لی مگر کبھی سمجھنے اور غور کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم لوگ حق بات کو سن تو لیتے ہی ہو یعنی سننا، سمجھنا، اعتقاد رکھنا تو تمہاری طرف سے موجود ہے مگر آگے اُس پر عمل بھی پورا کرو اطاعت سے روگردانی نہ کرو تا کہ سننے کا اصل مقصد مکمل ہو جائے۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید کے لئے ارشاد فرمایا وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۲۱﴾ یعنی تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے سُن لیا مگر در حقیقت سنا سنایا کچھ نہیں۔ ان لوگوں سے مراد عام کفار بھی ہیں جو سننے کا دعویٰ کرتے ہیں اعتقاد کا نہیں کرتے۔ اور منافقین بھی ہیں جو سننے کے ساتھ سمجھنے اور اعتقاد رکھنے کے بھی مدعی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غور و فکر اور صحیح سمجھ سے یہ دونوں محروم ہیں۔ اس لئے ان کا سننا نہ سننے کے حکم میں ہے۔ مسلمانوں کو ان لوگوں کے مشابہ ہونے سے منع فرمایا گیا۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کی شدید مذمت ہے جو حق بات کو غور و تدبر کے ساتھ نہیں سنتے اور اُس کو قبول نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۲۲﴾

لفظ **دوابّ** دابّۃ کی جمع ہے اصل لغت کے اعتبار سے ہر زمین پر چلنے والے کو دابّۃ کہا جاتا ہے مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابّۃ کہتے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہوئے کہ سب سے بدترین چوپائے اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو حق کو سننے سے بہرے اور اُس کے قبول کرنے سے گونگے ہیں اور بہرے گونگے میں اگر کچھ عقل ہو تو وہ بھی اشاروں سے اپنے دل کی بات کہہ لیتا ہے اور دوسروں کی بات سمجھ لیتا ہے۔ یہ لوگ بہرے گونگے ہونے کے ساتھ بے عقل بھی ہیں اور یہ

ظاہر ہے جو بہرا گونگا عقل سے بھی خالی ہو اُس کے سمجھنے سمجھانے کا کوئی راستہ نہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ انسان کو جو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا اور اشرف المخلوقات اور مخدومِ کائنات بنایا گیا یہ سب انعامات صرف اطاعتِ حق میں مضمر اور منحصر ہیں جب انسان نے حق بات کے سننے سمجھنے اور ماننے سے اعراض کیا تو یہ سارے انعامات اُس سے سلب ہو جاتے ہیں اور وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

تفسیر رُوح البیان میں ہے کہ انسان اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے سب جانوروں سے افضل و اعلیٰ ہے اور فرشتوں سے کم درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے سعی و عمل اور طاعتِ حق میں جدوجہد کرتا ہے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ واشرف ہو جاتا ہے اور اگر اُس نے اطاعتِ حق سے روگردانی کی تو پھر وہ اسفل سافلین میں جاتا ہے اور جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہو جاتا ہے۔

چوتھی آیت میں ارشاد ہے وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اُن میں کوئی بھلائی دیکھتے تو اُن کو اعتقاد کے ساتھ سننے کی توفیق بخش دیتے اور اگر ان کو بحالت موجودہ کہ اُن میں طلبِ حق نہیں ہے حق بات سنا دیں تو وہ ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

بھلائی سے مراد اس جگہ طلب حق ہے کہ طلب ہی کے ذریعہ تدبر اور فہم کے دروازے کھلتے ہیں اور اسی سے اعتقاد و عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اور جس میں طلب حق نہیں گویا اُس میں کوئی بھلائی نہیں معنی یہ ہیں کہ اگر اُن میں کوئی بھلائی موجود ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی جب اللہ تعالیٰ کے علم میں اُن کے اندر کوئی بھلائی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ درحقیقت وہ ہر بھلائی سے محروم ہیں اور اس محرومی کی حالت میں اگر ان کو غور و تدبر اور اِعتقادِ حق کی دعوت دی جائے تو وہ ہرگز قبول نہ کریں گے بلکہ اُس سے منہ پھیر کر بھاگیں گے۔ یعنی ان کی یہ روگردانی اس بنا پر نہ ہوگی کہ دین میں اُن کو اعتراض کی بات نظر آ گئی اس لئے نہیں مانا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حق بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔

اس تقریر سے وہ منطقی شبہ بھی رفع ہو گیا جو اہلِ علم کے دلوں میں کھٹکتا ہے کہ یہ قیاس کی شکل اوّل ہے حد اوسط حذف کریں تو نتیجہ غلط نکل رہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں حد اوسط مکرر نہیں کیونکہ پہلے لَّاَسْمَعَهُمْ کا مفہوم الگ ہے دوسرے اَسْمَعَهُمْ کا الگ پہلے میں سماع قبول اور سماع نافع مراد ہے دوسرے میں خالی سماع۔

پانچویں آیت میں پھر اہلِ ایمان کو خطاب کر کے اللہ اور رسول کے اَحکام کی تعمیل و اطاعت کا حکم ایک خاص انداز سے دیا گیا کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جس چیز کی دعوت دیتے ہیں اُس میں اللہ اور رسول کا اپنا کوئی فائدہ مضمر نہیں بلکہ سب اَحکام تمہارے ہی فائدہ کے لئے دیئے گئے ہیں۔

ارشاد فرمایا اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ یعنی بات مانو اللہ کی اور رسول کی جبکہ رسول تم کو ایسی

چیز کی طرف بلائے جو تمہارے لئے زندگی بخش ہے۔

وہ حیات جس کا ذکر اس آیت میں ہے کیا ہے اس میں کئی احتمال ہیں اس لئے علماء تفسیر نے مختلف قول اختیار کئے ہیں سُدی نے کہا کہ وہ حیات بخش چیز ایمان ہے کیونکہ کافر مردہ ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ وہ قرآن ہے جس میں دنیا وآخرت کی زندگی اور فلاح مضمر ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ وہ حق ہے۔ ابن اسحاق نے فرمایا کہ مراد اُس سے جہاد ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت بخشی۔ اور یہ سب احتمالات اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں اور مراد یہ ہے کہ ایمان یا قرآن یا اتباع حق وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کا دل زندہ ہوتا ہے اور دل کی زندگی یہ ہے کہ بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو غفلت وشہوت وغیرہ کے حجابات حائل ہیں وہ راہ سے ہٹ جائیں اور حجابات کی ظلمت دور ہو کر نور معرفت دل میں جگہ کر لے۔

ترمذی اور نسائی نے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلایا، اُبیّ بن کعبؓ نماز پڑھ رہے تھے جلدی جلدی نماز پوری کر کے حاضر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پکارنے پر آنے میں دیر کیوں لگائی۔ اُبیّ بن کعبؓ نے عرض کیا کہ میں نماز میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ۔ اُبیّ بن کعبؓ نے عرض کیا کہ آئندہ اس کی اطاعت کروں گا اگر بحالتِ نماز بھی آپ بلائیں گے فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔ [1]

اس حدیث کی بنا پر بعض فقہاء نے فرمایا کہ حکمِ رسول کی اطاعت سے نماز میں جو کام بھی کریں اس سے نماز میں خلل نہیں ہوتا اور بعض نے فرمایا کہ اگرچہ خلافِ نماز افعال سے نماز قطع ہو جائے گی اور اُس کی بعد میں قضا کرنا پڑے گی لیکن کرنا یہی چاہئے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو بلائیں اور وہ نماز میں بھی ہو تو نماز کو قطع کر کے تعمیلِ حکم کرے۔

یہ صورت تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے لیکن دوسرے ایسے کام جن میں تاخیر کرنے سے کسی شدید نقصان کا خطرہ ہو اُس وقت بھی نماز قطع کر دینا اور پھر قضا کر لینا چاہئے جیسے کوئی نمازی یہ دیکھے کہ نابینا آدمی کنویں یا گڑھے کے قریب پہنچ کر گرا چاہتا ہے تو فوراً نماز توڑ کر اس کو بچانا چاہئے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ یعنی یہ بات سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اُس کے قلب کے درمیان۔ اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں میں عظیم حکمت وموعظت پائی جاتی ہے جو ہر انسان کو ہر وقت یاد رکھنی چاہئے۔

ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ جب کسی نیک کام کے کرنے یا گناہ سے بچنے کا موقع آئے تو اُس کو فوراً کر گزرو۔ دیر

---

[1] جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل فاتحة الکتاب ج:۲ ص:۱۱۴

نہ کرو اور اس فرصت وقت کو غنیمت سمجھو کیونکہ بعض اوقات آدمی کے ارادہ کے درمیان قضاء الٰہی حائل ہو جاتی ہے وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کوئی بیماری پیش آجائے یا موت آجائے یا کوئی ایسا مشغلہ پیش آجائے کہ اس کام کی فرصت نہ ملے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ فرصتِ عمر اور فرصتِ وقت کو غنیمت سمجھ کر آج کا کام کل پر نہ ڈالے کیونکہ معلوم نہیں کل کیا ہونا ہے ؎

[۱] من نمی گویم زیان کن یا بفکر سود باش ای زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اور دوسرا مطلب اس جملہ کا یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے نہایت قریب ہونا بتلایا گیا جیسے دوسری آیت میں وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ (قٓ) میں اللہ تعالیٰ کا انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہونے کا بیان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کا قلب ہر وقت حق تعالیٰ کے خاص تصرف میں ہے جب وہ کسی بندے کی بُرائیوں سے حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے قلب اور گناہوں کے درمیان آڑ کر دیتے ہیں اور جب کسی کی بدبختی مقدر ہوتی ہے تو اُس کے دل اور نیک کاموں کے درمیان آڑ کر دی جاتی ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دُعاؤں میں اکثر یہ دُعاء کیا کرتے تھے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ۔ یعنی اے دلوں کے پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت اور قائم رکھئے۔ [۲]

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ اللہ اور رسول کے اَحکام کی تعمیل میں دیر نہ لگاؤ اور فرصت وقت کو غنیمت جان کر فوراً کر گزرو معلوم نہیں کہ پھر دل میں نیکی کا جذبہ اور اُمنگ باقی رہتی ہے یا نہیں۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا

اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر، اور جان لو

اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ

کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے مغلوب پڑے ہوئے

[۱] ترجمہ: ہم یہ نہیں کہتے کہ اپنا نقصان کرلو یا نفع کی فکر میں رہو، اے فرصت سے بے خبر شخص جس حالت میں بھی رہو کام جلد سے جلد کرو۔

[۲] جامع الترمذی، ابواب القدر، باب ما جاء ان القلوب بين اصبعی الرحمٰن ج:۲ ص:۳۵

فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ

ملک میں ڈرتے تھے کہ اُچک لیں تم کو لوگ پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم شکر کرو۔ اے ایمان والو!

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا

خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں جان کر۔ اور جان لو

اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع ۳ ع ۱۷

کہ بیشک تمہارے مال اور اولاد خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ڈرو اُس وبال سے جو تم میں سے صرف اُن لوگوں پر نہیں پڑے گا جنھوں نے ظلم کیا ہوگا، اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ﴿۲۵﴾ اور وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، تمہیں لوگوں نے (تمہاری) سرزمین میں دبا کر رکھا ہوا تھا، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اُچک کر لے جائیں گے۔ پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا، اور اپنی مدد سے تمہیں مضبوط بنادیا، اور تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا، تاکہ تم شکر کرو۔ ﴿۲۶﴾ اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے بے وفائی نہ کرنا، اور نہ جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہونا ﴿۲۷﴾ اور یہ بات سمجھ لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں، اور یہ کہ عظیم انعام اللہ ہی کے پاس ہے۔ ﴿۲۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (جس طرح تم پر اپنی اصلاح کے متعلق طاعت واجب ہے اسی طرح یہ بھی طاعتِ واجبہ میں داخل ہے کہ بقدرِ وسع دوسروں کی اصلاح میں بطریق امر بالمعروف ونہی عن المنکر بالید یا باللسان ترک اختلاط یا نفرت بالقلب جو کہ

آخری درجہ ہے کوشش کرو ورنہ درصورت مداہنت ان منکرات کا وبال جیسا مرتکبینِ منکرات پر واقع ہوگا ایسا ہی کسی درجہ میں ان مداہنت کرنے والوں پر بھی واقع ہوگا جب یہ بات ہے تو) تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں میں مرتکب ہوئے ہیں (بلکہ ان گناہوں کو دیکھ کر جنہوں نے مداہنت کی ہے وہ بھی اس میں شریک ہوں گے اور اس سے بچنا یہی ہے کہ مداہنت مت کرو) اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں (ان کی سزا سے خوف کر کے مداہنت سے بچو) اور (اس غرض سے کہ نعمتوں کے یاد کرنے سے اطاعتِ منعم کا شوق ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو اور خاص کر) اس حالت کو یاد کرو جبکہ تم (ایک وقت میں یعنی قبل ہجرت عدد میں بھی) قلیل تھے (اور قوت کے اعتبار سے بھی) سرزمین (مکہ) میں کمزور شمار کئے جاتے تھے (اور غایت ضعف حال سے) اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو (مخالف) لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں سو (ایسی حالت میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو (مدینہ میں اطمینان سے) رہنے کو جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی (سامان سے بھی اور مردم شماری کو زیادہ کرنے سے بھی جس سے قلّت اور استضعاف اور خوف اختطاف سب زائل ہوگیا) اور (صرف یہی نہیں کہ تمہاری مصیبت ہی کو دور کر دیا ہو بلکہ اعلیٰ درجہ کی خوشحالی بھی عطا فرمائی کہ دشمنوں پر تم کو غلبہ دے کر کثرت فتوحات سے) تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم (ان نعمتوں کا) شکر کرو (اور بڑا شکر یہ ہے کہ اطاعت کرو) اے ایمان والو (ہم مخالفت اور معصیت سے اس لئے ممانعت کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کے تم پر کچھ حقوق ہیں جن کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے اور معصیت سے ان حقوق میں خلل پڑتا ہے جس سے واقع میں تمہارے ہی نفع میں خلل پڑتا ہے جب یہ بات ہے تو) تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو اور (باعتبار انجام کے اس مضمون کو اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تم) اپنی قابل حفاظت چیزوں میں (کہ وہ تمہارے منافع ہیں جو اعمال پر مرتب ہوتے ہیں) خلل مت ڈالو اور تم تو (اس کا مضر ہونا) جانتے ہو اور (اکثر اوقات مال و اولاد کی محبت مخل طاعت ہو جاتی ہے اس لئے تم کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ) تم اس بات کو جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے (کہ دیکھیں کون ان کی محبت کو ترجیح دیتا ہے اور کون اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دیتا ہے سو تم ان کی محبت کو ترجیح مت دینا) اور (اگر ان کے منافع کی طرف نظر جائے تو تم) اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں) بڑا بھاری اجر (موجود) ہے (کہ اس کے سامنے یہ فانی منفعتیں محض ہیچ ہیں)۔

معارف و مسائل

قرآن کریم نے غزوۂ بدر کی کچھ تفصیلات اور اُس میں مسلمانوں پر اپنے انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد اُس سے حاصل شدہ نتائج اور پھر اُس کے مناسب مسلمانوں کو کچھ پند و نصیحت کے ارشادات بیان فرمائے ہیں جن کا سلسلہ یٰٓاَیُّہَا

الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ سے شروع ہوا ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ آیات ہیں جو اوپر لکھی گئی ہیں۔

ان میں سے پہلی آیت میں ایسے گناہ سے بچنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے جس کا عذابِ شدید صرف گناہ کرنے والوں پر محدود نہیں رہتا بلکہ ناکردہ گناہ لوگ بھی اُس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وہ گناہ کونسا ہے اس میں علماء تفسیر کے متعدد اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ گناہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت اور بُرے کاموں سے روکنے کی جدوجہد کا ترک کر دینا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا حکم دیا ہے کہ کسی جرم و گناہ کو اپنے ماحول میں قائم نہ رہنے دیں کیونکہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا یعنی جرم و گناہ دیکھے ہوئے باوجود قدرت کے اُس کو منع نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنا عذاب عام کر دیں گے جس سے نہ گناہگار بچیں گے نہ بے گناہ۔

اور بے گناہ سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اصل گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں مگر امر بالمعروف کے ترک کر دینے کے گناہگار وہ بھی ہیں اس لئے یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ایک کے گناہ کا عذاب دوسرے پر ڈالنا بے انصافی اور قرآنی فیصلہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی [1] (فاطر:۱۸) کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہاں گناہگار اپنے اصل گناہ کے وبال میں اور بے گناہ ترک امر بالمعروف کے گناہ میں پکڑے گئے، کسی کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالا گیا۔

امام بغویؒ نے شرح السّنّہ اور معالم میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وصدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جماعت کے گناہ کا عذاب عام لوگوں پر نہیں ڈالتے جب تک کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے ماحول میں گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور اُن کو یہ قدرت بھی ہو کہ اُس کو روک سکیں اس کے باوجود اُنہوں نے اس کو روکا نہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سب کو گھیر لیتا ہے۔ [2]

اور ترمذیؒ ابوداؤد وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے اُس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنا عذاب عام کر دیں۔ [3]

صحیح بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود کو توڑنے والے گناہگار ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مداہنت کرنے والے ہیں، یعنی باوجود قدرت کے اُن کو گناہ سے نہیں روکتے ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے

---

[1] ترجمہ: اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ [2] معالم التنزيل تحت هذه الآية ج:۳ ص:۳۴۶، وشرح السنة ج:۱۴ ص:۳۴۶

[3] سننِ ابی داوٗد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنهی ج:۲ ص:۵۹۶، وجامع الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی نزول العذاب إلخ ج:۲ ص:۳۹

کے طبقہ والے اوپر آکر اپنی ضرورت کے لئے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں۔ نیچے والے یہ دیکھ کر یہ صورت اختیار کریں کہ کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کر کے اُس سے اپنے لئے پانی حاصل کریں اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہ بچیں گے۔ [۱]

ان روایات کی بنا پر بہت سے حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا کہ اس آیت میں فتنہ سے مراد یہی گناہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کر دینا ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس گناہ سے مراد ترکِ جہاد کا گناہ ہے خصوصاً اُس وقت جبکہ امیر المؤمنین کی طرف سے جہاد کی دعوتِ عام مسلمانوں کو دے دی جائے اور اسلامی شعائر کی حفاظت اس پر موقوف ہو کیونکہ اس وقت ترک جہاد کا وبال صرف تارکینِ جہاد پر نہیں بلکہ پورے مسلمانوں پر پڑتا ہے۔ کفار کے غلبہ کے سبب عورتیں بچے بوڑھے اور بہت سے بے گناہ مسلمان قتل و غارت کا شکار ہو جاتے ہیں، ان کے جان و مال خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں عذاب سے مراد دنیوی مصائب اور تکلیفیں ہوں گی۔ [۲]

اور قرینہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ پچھلی آیات میں بھی ترکِ جہاد کرنے والوں پر ملامت کی گئی ہے وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝۱۵ وغیرہ آیاتِ سابقہ اسی بیان میں آئی ہیں۔

اور غزوۂ اُحد میں جبکہ چند مسلمانوں کو لغزش ہوئی کہ گھاٹی کی حفاظت چھوڑ کر نیچے آگئے تو اُس کی مصیبت صرف غلطی کرنے والوں پر نہیں بلکہ پورے مسلم لشکر پر پڑی یہاں تک کہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معرکہ میں زخم آئے۔

دوسری آیت میں بھی اَحکامِ الٰہیہ کی اطاعت کو آسان کرنے اور اُس پر ترغیب دینے کے لئے مسلمانوں کو ان کی پچھلی خستہ حالی اور ضعف و کمزوری پھر اُس کے بعد اپنے فضل و انعام سے حالات بدل کر اُن کو قوت اور اطمینان عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب القرعة في المشكلات ج: ۱ ص: ۳۶۹

[۲] التفسير المظهري تحت هذه الآية ج: ۴ ص: ۴۹

یعنی اے مسلمانو اپنے اُس حال کو یاد کرو جو قبل ہجرت مکہ معظّمہ میں تھا کہ تعداد میں بھی کم تھے اور قوت میں بھی، ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ دشمن اُن کو نوچ کھسوٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو مدینہ میں بہترین ٹھکانا عطا فرمایا۔ اور نہ صرف ٹھکانا بلکہ اپنی تائید و نصرت سے اُن کو قوت اور دشمنوں پر فتح اور اموال عظیمہ عطا فرمادیئے۔ آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ یعنی تمہارے حالات کی اس کایا پلٹ اور انعاماتِ الٰہیہ کا مقصد یہ ہے کہ تم شکر گزار بندے بنو۔ اور ظاہر ہے کہ شکر گزاری اُس کے اَحکام کی اطاعت میں منحصر ہے۔

تیسری آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں یا آپس میں بندوں کے حقوق میں خیانت نہ کریں کہ حق ادا ہی نہ کریں یا اُس میں کوئی اور کوتاہی کرکے ادا کریں۔ آخر آیت میں وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ فرما کر یہ بتلا دیا کہ تم تو خیانت کی بُرائی اور اُس کے وبال کو جانتے ہی ہو پھر اُس پر اقدام کرنا قرینِ دانشمندی نہیں اور چونکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے غفلت و کوتاہی کا سبب عموماً انسان کے اموال و اولاد ہوا کرتے ہیں اس لئے اس پر تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ یعنی یہ بات سمجھ رکھو کہ تمہارے مال و اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔

فتنہ کے معنی امتحان کے بھی آتے ہیں اور عذاب کے بھی اور ایسی چیزوں کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے جو عذاب کا سبب بنیں۔ قرآنِ کریم کی مختلف آیتوں میں ان تینوں معنی کے لئے لفظ فتنہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں تینوں معنی کی گنجائش ہے بعض اوقات مال و اولاد خود بھی انسان کے لئے دنیا ہی میں وبالِ جان بن جاتے ہیں اور ان کے سبب غفلت و معصیت میں مبتلا ہو کر سببِ عذاب بن جانا تو بالکل ظاہر ہے۔ اوّل یہ کہ مال و اولاد کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا مقصود ہے کہ یہ چیزیں ہمارے انعامات ہیں۔ تم انعام لے کر شکر گزار اور اطاعت شعار بنتے ہو یا ناشکرے اور نافرمان۔ دوسرے اور تیسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا تو یہی مال و اولاد تمہارے لئے عذاب بن جائیں گے۔ بعض اوقات تو دنیا ہی میں یہ چیزیں انسان کو سخت مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اور دنیا ہی میں مال و اولاد کو وہ عذاب محسوس کرنے لگتے ہیں ورنہ یہ تو لازمی ہے کہ دنیا میں جو مال اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے خلاف کمایا گیا یا خرچ کیا گیا وہ مال ہی آخرت میں اس کے لئے سانپ بچھو اور آگ میں داغ دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جیسا کہ قرآنِ کریم کی متعدّد آیات میں اور بے شمار روایاتِ حدیث میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ اور تیسرے معنی یہ کہ یہ چیزیں سببِ عذاب بن جائیں یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کے اَحکام کی خلاف ورزی کا سبب بنیں تو عذاب کا سبب بن گئیں۔ آخر آیت میں فرمایا وَاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ یعنی یہ بھی سمجھ لو کہ جو شخص اللہ اور رسول کے اَحکام کی تعمیل میں

مال واولاد کی محبت سے مغلوب نہ ہو اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

اس آیت کا مضمون تو سب مسلمانوں کو عام اور شامل ہے، مگر واقعہ اس کے نزول کا اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جو غزوۂ بنوقریظہ میں پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بنوقریظہ کے قلعہ کا اکیس روز تک محاصرہ جاری رکھا جس سے عاجز ہو کر انہوں نے وطن چھوڑ کر ملک شام چلے جانے کی درخواست کی آپ نے ان کی شرارتوں کے پیشِ نظر اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ صلح کی صرف یہ صورت ہے کہ سعد بن معاذ تمہارے بارہ میں جو کچھ فیصلہ کریں اُس پر راضی ہو جاؤ۔ اُنہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذؓ کے بجائے ابولبابہؓ کو یہ کام سپرد کر دیا جائے، کیونکہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال اور جائیداد بنوقریظہ میں تھے، اُن سے یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے۔ آپ نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ بنوقریظہ کے سب مرد وزن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اُتر آئیں تو کیا ہمارے معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے۔ اُنہوں نے کچھ ان لوگوں کی گریہ زاری سے اور کچھ اپنے اہل وعیال کی محبت سے متأثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلا دیا کہ ذبح کئے جاؤ گے۔ گویا اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کر دیا۔

مال واولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے۔ مگر فوراً تنبہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ کی خدمت میں لوٹنے کے بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہوگی اسی طرح بندھا رہوں گا چاہے اسی حالت میں موت آجائے۔ چنانچہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے کھڑے رہے ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی ضرورت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں، کھانے پینے کے پاس نہ جاتے تھے یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اوّل اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اگر وہ اوّل ہی میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے استغفار کرتا اور توبہ قبول ہو جاتی اب جبکہ وہ یہ کام کر گزرے تو اب قبولیت توبہ نازل ہونے کا انتظار ہی کرنا ہے۔

چنانچہ سات روز کے بعد آخر شب میں آپ پر یہ آیتیں ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئیں بعض حضرات نے ان کو خوشخبری سنائی اور کھولنا چاہا مگر اُنہوں نے کہا کہ جب تک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے میں کھلنا پسند نہ کروں گا۔ چنانچہ جب آپ صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا۔

آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال واولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اُس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔[1] واللہ اعلم۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا

اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہوگے اللہ سے تو کردے گا تم میں فیصلہ

وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

اور دور کردے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ

اور جب فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کردیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں،

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا، اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ اور جب کوئی پڑھے اُن پر

آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ

ہماری آیتیں تو کہیں ہم سُن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا یہ تو کچھ بھی نہیں مگر احوال ہیں

الْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ

اگلوں کے۔ اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین حق ہے تیری طرف سے

فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾

تو ہم پر برسادے پتھر آسمان سے یا لا ہم پر کوئی عذاب دردناک۔

---

[1] تفسیر الطبری، رقم الحدیث: ۱۵۹۲۳، ودلائل النبوۃ للبیہقیؒ رقم الحدیث: ۱۳۶۳

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ

اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا اُن پر جب تک تو رہتا ان میں، اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرے گا اُن پر

وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے ساتھ تقویٰ کی رَوِش اختیار کرو گے تو وہ تمہیں (حق و باطل کی) تمیز عطا کر دے گا، اور تمہاری بُرائیوں کا کفارہ کر دے گا، اور تمہیں مغفرت سے نوازے گا، اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔ ﴿۲۹﴾ اور (اے پیغمبر!) وہ وقت یاد کرو جب کافر لوگ تمہارے خلاف منصوبے بنا رہے تھے کہ تمہیں گرفتار کرلیں، یا تمہیں قتل کر دیں، یا تمہیں (وطن سے) نکال دیں۔ وہ اپنے منصوبے بنا رہے تھے، اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر منصوبہ بنانے والا ہے۔ ﴿۳۰﴾ اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ: ''(بس!) ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اس جیسی باتیں ہم بھی کہہ لائیں۔ یہ (قرآن) اور کچھ نہیں، صرف پچھلے لوگوں کے افسانے ہیں۔'' ﴿۳۱﴾ (اور ایک وقت وہ تھا) جب انہوں نے کہا تھا کہ: ''یا اللہ! اگر یہ (قرآن) ہی وہ حق ہے جو تیری طرف سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے، یا ہم پر کوئی اور تکلیف دہ عذاب ڈال دے۔'' ﴿۳۲﴾ اور (اے پیغمبر!) اللہ ایسا نہیں ہے کہ اِن کو اِس حالت میں عذاب دے جب تم ان کے درمیان موجود ہو، اور اللہ اِس حالت میں بھی ان کو عذاب دینے والا نہیں ہے جب وہ اِستغفار کرتے ہوں۔ ﴿۳۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور) اے ایمان والو (اطاعت کی اَور برکات سنو وہ یہ کہ) اگر تم اللہ سے ڈر (کر اطاعت کر) تے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا (اس میں ہدایت اور نورِ قلب جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور غلبہ علی الاعداء اور نجاتِ آخرت جس سے حق و باطل میں عملی فیصلہ ہوتا ہے سب آ گیا) اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے (خدا جانے اپنے فضل سے اور کیا کیا دے دے جو قیاس و گمان میں بھی نہ آتا ہو)

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے سامنے تذکیرِ نعمت کے لئے) اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جبکہ کافر لوگ آپ کی نسبت (بُری بُری) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ (آیا) آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر (ان تدبیروں کے دفع کرنے کے لئے) کر رہے تھے اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے (جس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں گاؤ خورد ہوگئیں اور آپ بال بال محفوظ رہے اور صحیح سالم مدینہ آپہنچے، چونکہ آپ کا اس طرح بچ رہنا مؤمنین کے حق میں بے انتہا ابوابِ سعادات کی مفتاح ہے اس لئے اس واقعہ کے ذکر کا حکم فرمایا) اور (ان کفار کی یہ حالت ہے کہ) جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہم نے سن (کر دیکھ) لیا (یہ تو کوئی معجزہ نہیں کیونکہ) اگر ہم ارادہ کریں تو اس کی برابر ہم بھی کہہ لائیں (پس) یہ (قرآن) تو (کلامِ الٰہی و معجزہ وغیرہ) کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (کہ پہلے اہلِ مِلل بھی یہی دعویٰ توحید و بعثت وغیرہ کے کرتے آئے ہیں انہی کے مضامین آپ نقل کر رہے ہیں) اور (اس سے بڑھ کر قابلِ ذکر وہ حالت ہے) جبکہ ان لوگوں نے (اپنے اس جہل مرکب میں غایت صلابت وجلادت ظاہر کرنے کو یہ بھی) کہا کہ اے اللہ اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر (اس کے نہ ماننے کی وجہ سے) آسمان سے پتھر برسائیے یا ہم پر کوئی (اور) دردناک عذاب واقع کر دیجئے (جو کہ خارق عادت ہونے میں مثل بارش سنگ کے ہو اور جب ایسے عذاب واقع نہ ہوئے تو اپنی حقانیت پر ناز کرتے ہیں) اور (یہ نہیں سمجھتے کہ باوجود ان کے بطلان کے خاص موانع کی وجہ سے یہ عقوبات مذکورہ نازل نہیں ہوتیں ان موانع کا بیان یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب دیں اور (نیز) اللہ تعالیٰ ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں (گو وہ آخرت میں بوجہ ایمان نہ ہونے کے نافع نہ ہو لیکن آخر عمل صالح ہے دنیا میں تو کفار کو نافع ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان عقوباتِ خارقہ سے دو امر مانع ہیں ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف رکھنا مکہ میں یا دنیا میں۔ اور دوسرا ان لوگوں کا اپنے طواف وغیرہ میں یہ کہنا غُفْرَانَكَ جو کہ بعد ہجرت و بعد وفات بھی باقی ہے اور ایک مانع حدیثوں میں ہے کہ حضور کی اُمت میں کسی کا ہونا گو اُمت دعوت ہی ہو یہ مانع باوجود کسی کے استغفار نہ کرنے کے بھی باقی ہے پس یہ امور فی نفسہٖ مانع ہوئے گو احیاناً مانع کے ہوتے ہوئے بھی کوئی عذاب خارق کسی عارضی مصلحت سے واقع ہو جائے جیسا قذف ومسخ وغیرہ کا قربِ قیامت میں ہونا حدیثوں میں وارد ہے)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیت میں اس کا ذکر تھا کہ انسان کے لئے مال اور اولاد ایک فتنہ یعنی آزمائش کی چیز ہے۔ کیونکہ ان چیزوں

کی محبت میں مغلوب ہوکر انسان عموماً خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل ہوجاتا ہے حالانکہ اس عظیم نعمت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی وجہ سے اُس کی طرف اور زیادہ جھکتا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت اُسی مضمون کی تکمیل ہے اس میں فرمایا ہے کہ جو شخص عقل کو طبیعت پر غالب رکھ کر اس آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و محبت کو سب چیزوں پر مقدم رکھے جس کو قرآن و شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کہا جاتا ہے تو اُس کو اس کے صلہ میں تین چیزیں عطا ہوتی ہیں فرقان، کفارۂ سیئات، مغفرت۔

فرقان اور فرق دونوں مصدر ایک ہی معنی کے ہیں۔ محاورات میں فرقان اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کردے۔ اسی لئے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کردیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے ذریعہ اہلِ حق کو فتح اور اُن کے مخالف کو شکست ہوکر حق و باطل کا فرق واضح ہوجاتا ہے قرآن کریم میں اسی معنی کے لئے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کو فرقان عطا ہونے کا اکثر مفسرین صحابہ کے نزدیک یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد اور حفاظت اُن کے ساتھ ہوتی ہے کوئی دشمن اُن کو گزند نہیں پہنچا سکتا اور تمام مقاصد میں کامیابی اُن کی رفیق ہوتی ہے ۔

ہر کہ ترسید از حق وتقویٰ گزید ترسد از وے جن وانس وہر کہ دید [1]

تفسیر مہائمی میں ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پچھلے واقعہ میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت کی خاطر لغزش ہوگئی تھی وہ اس لئے بھی خطا تھی کہ اہل وعیال کی حفاظت کا بھی صحیح راستہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کو اپنا شعار بنایا جاتا تو سب مال واولاد اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں آجاتے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اس آیت میں وہ عقل وبصیرت ہے جس کے ذریعہ حق وباطل، کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہوجائے تو معنی یہ ہوئے کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت اور فراست عطا فرمادیتے ہیں کہ اُن کو اچھے بُرے میں فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

دوسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں عطا ہوتی ہے وہ کفارۂ سیئات ہے یعنی جو خطائیں اور لغزشیں اُس سے سرزد ہوتی ہیں دنیا میں ان کا کفارہ اور بدل کردیا جاتا ہے یعنی اُس کو ایسے اعمال صالحہ کی توفیق ہوجاتی ہے جو اُس کی سب لغزشوں پر غالب آجاتے ہیں۔ تیسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں ملتی ہے وہ آخرت کی مغفرت اور سب گناہوں، خطاؤں کی معافی ہے۔

آخرِ آیت میں ارشاد ہے فرمایا وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بڑے فضل واحسان والے ہیں۔ اس

---

[1] ترجمہ: جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اس سے تمام جن اور انسان ڈرتے ہیں اور جو بھی اسے دیکھ لے وہ اس سے ڈرتا ہے۔

میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ عمل کی جزا تو عمل کے پیمانہ پر ہوتی ہے۔ یہاں بھی تقویٰ کی جو جزائے خیر تین چیزوں میں مذکور ہے وہ تو جزا اور بدلہ کے طور پر ہے مگر اللہ تعالیٰ بڑے فضل واحسان والے ہیں اُن کی دادودہش کسی پیمانہ کے ساتھ مقید نہیں اور اُن کے احسان وانعام کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اس لئے تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام سے ان تین چیزوں کے علاوہ بھی بہت بڑی امیدیں رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک خاص انعام واحسان کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر بلکہ پوری دنیا پر ہوا ہے۔ کہ قبل از ہجرت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے نرغہ میں تھے اور وہ آپ کے قید یا قتل کرنے کے مشورے کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بسلامت وعافیت مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔

جس کا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری میں بروایت محمد بن اسحاقؒ وامام احمدؒ وابن جریرؒ وغیرہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ سے آنے والے انصار کا مسلمان ہو جانا مکہ میں مشہور ہوا تو قریشِ مکہ کو یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ اب تک تو ان کا معاملہ صرف مکہ میں دائر تھا جہاں ہر طرح کی قوت ہمارے ہاتھ میں ہے اور اب جبکہ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا اور بہت سے صحابہ کرامؓ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو اب ان کا ایک مرکز مدینہ طیبہ میں قائم ہو گیا جہاں یہ ہر طرح کی قوت ہمارے خلاف جمع کر سکتے ہیں اور پھر ہم پر حملہ آوار ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو یہ بھی احساس ہو گیا کہ اب تک تو کچھ صحابہ کرامؓ ہی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے ہیں اب یہ بھی قوی امکان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی وہاں چلے جائیں اس لئے رؤساء مکہ نے مشورہ کے لئے دارالندوہ میں ایک خاص مجلس طلب کی۔ دارالندوہ مسجد حرام کے متصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جس کو ان لوگوں نے قومی مسائل میں مشورہ اور مجلس کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور زمانۂ اسلام میں اُس کو مسجد حرام میں داخل کر لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ باب الزیادات ہی وہ جگہ تھی جس کو دارالندوہ کہا جاتا تھا۔

حسبِ عادت اس مہم مشورہ کے لئے قریشی سرداروں کا اجتماع دارالندوہ میں ہوا جس میں ابوجہل، نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ، اُمیہ بن خلف، ابوسفیان وغیرہ قریش کے تمام نمایاں اشخاص شامل ہوئے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ کی تدبیریں زیرِ غور آئیں۔

ابھی مشورہ کی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ابلیس لعین ایک سن رسیدہ عربی شیخ کی صورت میں دارالندوہ کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم کون ہو کیوں آئے ہو۔ بتلایا کہ میں نجد کا باشندہ ہوں مجھے معلوم ہوا کہ آپ لوگ ایک اہم مشورہ کر رہے ہیں تو قومی ہمدردی کے پیشِ نظر میں بھی حاضر ہو گیا کہ ممکن ہے میں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔

یہ سُن کر اس کو اندر بلا لیا گیا اور مشورہ شروع ہوا تو سہیلی کی روایت کے مطابق ابو البختری ابن ہشام نے یہ

مشورہ پیش کیا کہ ان کو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ معاذ اللہ وہ آپ اپنی موت مرجائیں۔ یہ سن کر شیخ نجدی ابلیس لعین نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو معاملہ چھپے گا نہیں بلکہ اس کی شہرت دور دور پہنچ جائے گی اور ان کے صحابہ اور رفقاء کے فدائیانہ کارنامے تمہارے سامنے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں اور اپنے قیدی کو تم سے چھڑا لیں۔ سب طرف سے آوازیں اُٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات صحیح ہے اس کے بعد ابوالاسود نے یہ رائے پیش کی کہ ان کو مکہ سے نکال دیا جائے یہ باہر جا کر جو چاہیں کرتے رہیں ہمارا شہر ان کے فساد سے مأمون ہو جائے گا۔ اور ہمیں کچھ جنگ وجدال بھی کرنا نہ پڑے گا۔

شیخ نجدی یہ سن کر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے شیریں کلام آدمی ہیں لوگ اُن کا کلام سن کر مفتون اور مسحور ہو جاتے ہیں۔ اگر اُن کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا تو بہت جلد اپنی طاقتور جماعت بنالیں گے اور تم پر حملہ کر کے شکست دے دیں گے۔ اب ابوجہل بولا کہ جو کرنے کا کام ہے تم میں سے کسی نے نہیں سمجھا۔ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک نوجوان لے لیں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں۔ یہ سب لوگ یکبارگی اُن پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔ ہم ان کے فساد سے تو اس طرح نجات حاصل کر لیں۔ اب رہا اُن کے قبیلہ بنوعبد مناف کا مطالبہ جوان کے قتل کے سبب ہم پر عائد ہوگا سو ایسی صورت میں جبکہ قتل کسی ایک نے نہیں بلکہ ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص نے کیا ہے تو قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا مطالبہ تو باقی نہیں رہ سکتا۔ صرف خونبہا یا دیت کے مال کا مطالبہ رہ جائے گا وہ ہم سب قبیلوں سے جمع کر کے اُن کو دے دیں گے اور بے فکر ہو جائیں گے۔

شیخ نجدی ابلیس لعین نے یہ سُن کر کہا کہ بس رائے یہی ہے اور اس کے سوا کوئی چیز کارگر نہیں۔ پوری مجلس نے اسی کے حق میں رائے دے دی اور آج ہی رات میں اپنا یہ ناپاک عزم پورا کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔

مگر انبیاء علیہم السلام کی غیبی طاقت کو یہ جاہل کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس طرف جبرئیل امین نے ان کے دارالمشورہ کی ساری کیفیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر کے یہ تدبیر بتلائی کہ آج رات میں آپ اپنے بستر پر آرام نہ کریں اور بتلایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

ادھر مشورہ کے مطابق شام ہی سے قریشی نوجوانوں نے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر آرام کریں اور یہ خوشخبری سنادی کہ اگرچہ بظاہر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے مگر دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور آپ کے بستر پر لیٹ گئے مگر اب

مشکل یہ درپیش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس محاصرہ سے کیسے نکلیں۔ اس مشکل کو اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ کے ذریعہ حل کیا وہ یہ کہ بامر الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مٹھی میں مٹی بھر کر باہر تشریف لائے اور محاصرہ کرنے والے جو کچھ آپ کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے اُس کا جواب دیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی نظروں اور فکروں کو آپ کی طرف سے پھیر دیا کہ کسی نے آپ کو نہ دیکھا حالانکہ آپ ان میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے نکلے چلے گئے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی آنے والے نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو تو اُنھوں نے بتلایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتظار میں۔ اس نے کہا کہ تم کس خام خیالی میں وہ تو یہاں سے نکل کر جا بھی چکے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے سروں پر ہاتھ رکھا تو اس کی تصدیق ہوئی کہ ہر ایک کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر محاصرہ کرنے والوں نے ان کے کروٹیں بدلنے سے پہچان لیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں اس لئے قتل پر اقدام نہیں کیا۔ صبح تک محاصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ خائب و خاسر ہو کر واپس ہو گئے۔ یہ رات اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خاص فضائل میں سے ہے۔

قریشی سرداروں کے مشورہ میں جو تین رائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش کی گئی تھیں اُن تینوں کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ۚ یعنی وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جبکہ کفار آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں۔ [۱]

مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تدبیریں خاک میں ملا دیں۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۳۰﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں۔ جو ساری تدبیروں پر غالب آجاتی ہے جیسا کہ اس واقعہ میں مشاہدہ ہوا۔

لفظ **مکر** کے معنی عربی لغت میں یہ ہیں کہ کسی حیلہ و تدبیر کے ذریعہ اپنے مقابل شخص کو اُس کے ارادہ سے روک دیا جائے۔ پھر اگر یہ کام کسی نیک مقصد سے کیا جائے تو یہ مکر محمود اور اچھا ہے اور کسی بُرے مقصد سے کیا جائے تو مذموم اور بُرا ہے اس لئے یہ لفظ انسان کے لئے بھی بولا جاسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے صرف ایسے ماحول میں استعمال ہوتا ہے جہاں کلام کے سیاق اور تقابل کے ذریعہ مکر مذموم کا شبہ نہ ہو سکے (مظہری) [۲] جیسے یہاں ہے۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آخر آیت میں جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ بصیغہ مضارع ہیں جو حال و استقبال

---

[۱] التفسیر المظهری ج:۴ ص:۵۵ تا ۵۸، وتفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۴ ص:۴۴

[۲] التفسیر المظهری ج:۴ ص:۵۸

کے معنی پر دلالت کرتا ہے ارشاد فرمایا وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ یعنی وہ اہلِ ایمان کی ایذا رسانی کی تدبیریں کرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی تدبیروں کے ناکام کرنے کی تدبیر کرتے رہیں گے اس میں اشارہ ہے کہ کفار کا یہ دائمی شعار رہے گا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد بھی ہمیشہ ہی سچے مسلمانوں سے ان کی تدبیروں کو دفع کرتی رہے گی۔

اکتیسویں اور بتیسویں آیتوں میں اسی دار الندوہ کے ایک شریک نضر بن حارث کی ایک بے ہودہ گفتگو اور تینتیسویں آیت میں اُس کا جواب مذکور ہے۔ نضر بن حارث چونکہ تجارت پیشہ آدمی تھا مختلف ملکوں کے سفروں میں یہود ونصاریٰ کی کتابیں اور اُن کی عبادتیں دیکھنے کا بار بار اتفاق ہوتا تھا اس لئے جب اس نے قرآنِ کریم میں پچھلی اُمتوں کے حالات سنے تو کہنے لگا کہ قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۱ یعنی یہ باتیں تو ہماری سنی ہوئی ہیں اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور جب بعض صحابہ نے اُس کو لاجواب کیا کہ اگر تم ایسا کلام کہہ سکتے ہو تو پھر کہتے کیوں نہیں جبکہ قرآن نے حق و باطل کا فیصلہ اس پر رکھ دیا ہے اور پوری دنیا کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر خلاف کرنے والے سچے ہیں تو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت ہی کی مثال پیش کریں۔ اور خلاف میں سر دھڑ کی بازی لگانے والے مال و اولاد قربان کرنے والے سب مل کر بھی ایک چھوٹی سی سورت قرآن کے مقابلہ میں پیش نہ کر سکے تو اب یہ کہنا کہ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ سکتے ہیں ایک ایسی بات ہے جو کوئی غیرت مند آدمی نہیں کہہ سکتا۔ پھر جب نضر بن حارث سے صحابہ کرامؓ نے اس کلام الٰہی کا حق ہونا بیان کیا تو اپنے غلط مذہب پر پختگی دکھلانے کے لئے کہنے لگا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۲ یعنی اے اللہ اگر یہی قرآن آپ کی طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھر برسا دیجئے یا کوئی دوسرا سخت عذاب نازل کر دیجئے۔

قرآنِ کریم نے خود اس کا جواب دیا۔ پہلے ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے کہ آپ کے مکہ میں ہوتے ہوئے اُن پر عذاب نازل کردیں۔ کیونکہ اوّل تو سب ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ جس بستی میں وہ موجود ہوں اُس پر اُس وقت تک عذاب نازل نہیں فرماتے جب تک اپنے پیغمبروں کو وہاں سے نکال نہ لیں۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے معاملہ میں مشاہدہ ہوا کہ جب تک یہ حضرات بستی میں رہے عذاب نہیں آیا جب وہاں سے نکال لئے گئے اُس وقت عذاب نازل ہوا۔ خصوصاً سیّد الانبیاء جو رحمۃ للعالمین کا لقب دے کر بھیجے گئے ہیں آپ کے کسی بستی میں موجود ہوتے ہوئے اُن پر عذاب آنا آپ کی شان کے خلاف تھا۔

خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ تم تو قرآن اور اسلام کی مخالفت کی وجہ سے اسی کے مستحق ہو کہ تم پر پتھر برسائے جائیں مگر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا اس سے مانع ہے۔ امام ابن جریرؒ نے فرمایا کہ آیت کا یہ حصہ اُس وقت نازل ہوا جبکہ آپ مکہ مکرمہ میں موجود تھے پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد آیت کا دوسرا حصہ یہ نازل ہوا وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اُن پر عذاب نازل کرنے والے نہیں جبکہ وہ استغفار کرتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ آپ کے مدینہ شریف چلے جانے کے بعد اگرچہ عذابِ عام کا یہ مانع رفع ہوگیا کہ آپ وہاں موجود تھے مگر اس وقت بھی ایک مانع عذاب کا یہ موجود رہا کہ بہت سے ضعفاء مسلمین جو ہجرت نہ کرسکتے تھے مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہتے تھے، اُن کی خاطر سے اہلِ مکہ پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔

پھر جب یہ سب حضرات بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے تو بعد کی آیت کا یہ جملہ نازل ہوا وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ اب مانع عذاب دونوں رفع ہوچکے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اور نہ استغفار کرنے والے مسلمان مکہ میں باقی رہے تو اب عذاب آنے سے کوئی رکاوٹ باقی نہیں۔ خصوصاً ان کے استحقاقِ عذاب میں خود مخالف اسلام ہونے کے علاوہ اس جرم کا بھی اضافہ ہوگیا کہ یہ لوگ خود تو عبادت کے قابل نہ تھے اور جو مسلمان عبادت عمرہ وطواف کے لئے مسجد حرام میں جانا چاہیں اُن کو روکنے لگے تو اب ان کا استحقاقِ عذاب بالکل مکمل ہوگیا چنانچہ فتح مکہ کے ذریعہ ان پر عذاب نازل کیا گیا۔

مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنے کا واقعہ غزوۂ حدیبیہ میں پیش آیا تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کے قصد سے تشریف لے گئے اور مشرکینِ مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور آپ کو اور سب صحابہ کرام کو اپنے اِحرام کھولنے اور واپس جانے پر مجبور کیا یہ واقعہ ۶ھ کا ہے اس کے دو سال بعد ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، اس طرح ان پر مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔

ابن جریرؒ کی اس تفسیر کا مدار اس پر ہے کہ مانع عذاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں ہونا قرار دیا جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں وجود مانع عذاب ہے جب تک آپ دنیا میں تشریف فرما ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آپ کا حال دوسرے انبیاء کی طرح نہیں کہ وہ خاص خاص مقامات یا قبائل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ جب وہاں سے نکل کر کسی دوسرے خطہ میں پہنچ گئے تو ان کی قوم پر عذاب آجاتا تھا۔ بخلاف سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی نبوّت و رسالت سارے عالم کے لئے اور قیامت تک کے لئے عام اور

---

[1] تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج:۱۳ ص:۵۰۹

شامل ہے پوری دنیا آپ کا مقامِ بعثت اور دائرہ رسالت ہے اس لئے جب تک آپ دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوگا کہ اہلِ مکہ کے افعال کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر پتھر برسائے جائیں مگر دو چیزیں اس عذاب سے مانع ہوئیں ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف فرما ہونا، دوسرا اہلِ مکہ کا استغفار کرنا کیونکہ یہ لوگ مشرک و کافر ہونے کے باوجود اپنے طواف وغیرہ میں غُفْرَانَکَ، غُفْرَانَکَ کہا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ استغفار کفر و شرک کے ساتھ گو آخرت میں نافع نہ ہو مگر دنیا میں اُس کا بھی یہ نفع اُن کو مل گیا کہ دنیا میں عذاب سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتے، کفار و مشرکین اگر کوئی نیک عمل کرتے ہیں تو اس کا بدلہ اُن کو اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب نہ دے حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں، اس کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ دنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لوگ مغرور اور مطمئن نہ ہوجائیں کہ ہم مجرم ہی نہیں یا ہم پر عذاب نہیں ہوگا۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت کے عذاب سے ان کی کسی طرح نجات نہیں۔ اس تفسیر پر وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ میں عذاب سے عذاب آخرت مراد ہوگا۔

آیاتِ مذکورہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ جس بستی میں لوگ استغفار کرتے ہوں اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ اُس پر عذاب نازل نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ کی اُمت پر خواہ مسلم ہوں یا کافر عذاب نہیں آئے گا اور مراد اس سے یہ ہے کہ عذابِ عام جس سے پوری قوم تباہ ہوجائے ایسا عذاب نہیں آئے گا جیسے قومِ نوح، قومِ لوط، قومِ شعیب وغیرہ کے ساتھ پیش آیا کہ اُن کا نام ونشان مٹ گیا۔ افراد و احاد پر کوئی عذاب آجائے وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت میں خسف اور مسخ کا عذاب آئے گا۔[1] خسف کے معنی زمین میں اُتر جانا اور مسخ کے معنی صورت مسخ ہوکر بندر یا سؤر وغیرہ جانوروں کی شکل میں تبدیل ہوجانا۔ اِس کی مراد یہی ہے کہ بعض بعض افرادِ اُمت پر ایسے عذاب بھی آئیں گے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ہونا قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ آپ کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی زندہ ہیں گو اُس زندگی کی صورت سابق زندگی سے مختلف ہے اور یہ بحث لغو اور فضول ہے کہ ان دونوں زندگیوں میں فرق کیا ہے کیونکہ نہ اِس پر اُمت کا کوئی دینی یا دنیوی کام موقوف ہے نہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے ایسی فضول اور بے ضرورت بحثوں کو پسند فرمایا بلکہ منع فرمایا ہے۔

---

[1] جامع الترمذي، ابواب القدر، باب ما جاء في الرضا بالقضاء ج:۲ ص:۳۷، وسنن ابن ماجة، ابواب الفتن، باب الخسوف ج:۲ ص:۲۹۵

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ قیامت تک دنیا میں ہیں اس لئے یہ اُمت قیامت تک عذابِ عام سے مامون رہے گی۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے اُن پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں مسجد حرام سے

وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ

اور وہ اس کے اختیار والے نہیں، اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں اکثروں کو

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ

اس کی خبر نہیں۔ اور اُن کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور تالیاں،

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ

سو چکھو عذاب بدلہ اپنے کفر کا۔ بیشک جو لوگ کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں

اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ

اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے، سو ابھی اور خرچ کریں گے پھر آخر ہوگا وہ

عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾

اُن پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے، اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ

تاکہ جدا کردے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے ناپاک کو ایک کو ایک پر

ع ۴ ۹ ۱۸

فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۳۷ ع

پھر اُس کو ڈھیر کر دے اِکٹھا پھر ڈال دے اُس کو دوزخ میں، وہی لوگ ہیں نقصان میں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا

تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں تو معاف ہو اُن کو جو کچھ ہو چکا، اور اگر پھر بھی وہی کریں گے

فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۸

تو پڑ چکی ہے راہ اگلوں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور بھلا ان میں کیا خوبی ہے کہ اللہ اُن کو عذاب نہ دے جبکہ وہ لوگوں کو مسجدِ حرام سے روکتے ہیں، حالانکہ وہ اُس کے متوّلی نہیں ہیں۔ متقی لوگوں کے سوا کسی قسم کے لوگ اُس کے متوّلی نہیں ہو سکتے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے ۝۳۴ اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا (اے کافرو!) جو کافرانہ باتیں تم کرتے رہے ہو، ان کی وجہ سے اب عذاب کا مزہ چکھو ۝۳۵ جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا ہے وہ اپنے مال اس کام کے لئے خرچ کر رہے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ انہیں خرچ تو کریں گے، مگر پھر یہ سب کچھ ان کے لئے حسرت کا سبب بن جائے گا، اور آخرکار یہ مغلوب ہو جائیں گے۔ اور (آخرت میں) ان کافر لوگوں کو جہنم کی طرف اِکٹھا کر کے لایا جائے گا ۝۳۶ تاکہ اللہ ناپاک (لوگوں) کو پاک (لوگوں) سے الگ کر دے، اور ایک ناپاک کو دوسرے ناپاک پر رکھ کر سب کا ایک ڈھیر بنائے، اور اس ڈھیر کو جہنم میں ڈال دے۔ یہی لوگ ہیں جو سراسر خسارے میں ہیں ۝۳۷ (اے پیغمبر!) جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا ہے، ان سے کہہ دو کہ: ''اگر وہ باز آجائیں تو پہلے ان سے جو کچھ ہوا ہے، اُسے معاف کر دیا جائے گا۔'' اور اگر وہ پھر وہی کام کریں گے تو پچھلے لوگوں کے ساتھ جو معاملہ ہوا، وہ (ان کے سامنے) گذر ہی چکا ہے۔ ۝۳۸

خلاصۂ تفسیر

اور (ان موانع کے سبب عذاب خارق نازل نہ ہونے سے بالکل ہی عذاب سے مطمئن نہ ہو جائیں کیونکہ جس طرح اُمورِ مذکورہ مانع عذاب ہیں اسی طرح ان کی حرکتیں مقتضی عذاب بھی ہیں پس مانع کا اثر عذاب خارق میں ظاہر ہوا اور مقتضی کا اثر نفس عذاب میں ظاہر ہوگا کہ عذاب غیر خارق ان پر نازل ہوگا چنانچہ اس مقتضی کا بیان فرماتے ہیں کہ) ان کا کیا استحقاق ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ (بالکل ہی معمولی) سزا (بھی) نہ دے حالانکہ (ان کی یہ حرکتیں مقتضی سزا کی ہیں مثلاً) وہ لوگ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو) مسجد حرام (میں جانے اور اس میں نماز پڑھنے اور اس میں طواف کرنے) سے روکتے ہیں (جیسا حدیبیہ میں حقیقۃً روکا جس کا قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا اور زمانۂ قیام مکہ میں حکماً روکا کہ اس قدر تنگ کیا کہ ہجرت کی ضرورت ہوئی) حالانکہ وہ لوگ اس مسجد کے متولّی (بننے کے بھی لائق) نہیں (اور عابدین کو روکنا تو درکنار رہا جس کا اختیار خود متولّی کو بھی نہیں ہوتا) اس کے متولّی (بننے کے لائق) تو سوا متقیوں کے (کہ وہ اہل ایمان ہیں) اور کوئی بھی اشخاص نہیں لیکن ان میں اکثر لوگ (اپنی نالائقی کا) علم نہیں رکھتے (خواہ علم ہی نہ ہو یا یہ کہ جب اس علم پر عمل نہ کیا تو وہ مثل عدمِ علم کے ہے غرض جو سچ مچ نمازی تھے ان کو تو مسجد سے اس طرح روکا) اور (خود مسجد کا کیسا حق ادا کیا اور اس میں کیسی اچھی نماز پڑھی جس کا بیان یہ ہے کہ) ان کی نماز خانۂ کعبہ (مذکور بعنوان مسجد حرام) کے پاس صرف یہ تھی سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا (یعنی بجائے نماز کے ان کی یہ نامعقول حرکتیں ہوتی تھیں) سو (ان حرکات کا ضرور مقتضا ہے کہ ان پر کوئی نہ کوئی عذاب گو وہ معمولی اور عادی ہو نازل کر کے ان کو خطاب کیا جائے کہ لو) اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کے سبب (جس کا ایک اثر وہ قول ہے لَوْ نَشَآءُ الخ اور ایک اثر وہ قول ہے۔ اِنْ كَانَ هٰذَا الخ اور ایک اثر وہ فعل ہے۔ يَصُدُّوْنَ الخ اور ایک اثر وہ فعل ہے۔ مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً الخ چنانچہ غزوات متعددہ میں یہ سزا واقع ہوئی جیسا کہ اس سورت کے رکوع دوم میں بھی ہے ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ الخ بعد ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا الخ کے یہاں تک تو ان لوگوں کے اقوال و اعمال بدنیہ کا ذکر تھا آگے ان اعمال مالیہ کا بیان ہے کہ) بلاشک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے (یعنی دین سے لوگوں کو) روکیں (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور مخالفت کے سامان جمع کرنے میں ظاہر ہے کہ جو خرچ ہوتا تھا اس میں یہی غرض تھی) سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو (اسی غرض کے لئے) خرچ کرتے ہی رہیں گے (مگر) پھر (آخر میں جب آثار ناکامی کے محسوس ہوں گے) وہ مال ان کے حق میں باعثِ حسرت ہو جائیں گے (کہ خواہ مخواہ خرچ کیا اور) پھر (آخر) مغلوب (ہی) ہو جائیں گے (جس سے حسرت ضیاع اموال کے ساتھ یہ دوسری حسرت مغلوبیت کی جمع ہو جائے گی) اور (یہ سزا و حسرت و مغلوبیت تو ان کی دنیا میں ہے باقی آخرت کی سزا وہ الگ ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) کافر

لوگوں کو دوزخ کی طرف (لے جانے کے لئے قیامت میں) جمع کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک (لوگوں) کو پاک (لوگوں) سے الگ کردے (کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لائیں گے ظاہر ہے کہ اہلِ جنت ان سے علیحدہ رہ جائیں گے) اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملادے یعنی ان سب کو متصل کردے پھر (متصل کر کے) ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے ہی لوگ پورے خسارہ میں ہیں (جس کا کہیں منتہٰی نہیں، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں گے (اور اسلام قبول کرلیں گے) تو ان کے سارے گناہ جو (اسلام سے) پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کردیئے جائیں گے (یہ حکم تو حالتِ اسلام کا ہوا) اور اگر اپنی وہی (کفر کی) عادت رکھیں گے تو (ان کو سنا دیجئے کہ) کفارِ سابقین کے حق میں (ہمارا) قانون نافذ ہو چکا ہے (کہ دنیا میں ہلاک اور آخرت میں عذاب وہی تمہارے لئے ہوگا، چنانچہ قتل سے ہلاک بھی ہوئے اور غیر کفار عرب کا ہلاک ذمی ہونا بھی ہے تم جانو)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں یہ بتلایا گیا تھا کہ مشرکینِ مکہ اپنے کفر و انکار کی وجہ سے اگرچہ اس کے مستحق ہیں کہ اُن پر آسمانی عذاب آجائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا عذابِ عام آنے سے مانع ہے اور ہجرت کے بعد اُن ضعفاء مسلمین کی وجہ سے ایسا عذاب نہیں آتا جو مکہ میں رہ کر اللہ سے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

مذکورہ آیتوں میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ضعفاء مسلمین کی رعایت سے اگر دنیا میں اُن کا عذاب ٹل ہی گیا تو ان لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں بلکہ ان کا استحقاقِ عذاب کھلا ہوا ہے اور علاوہ کفر وانکار کے اور بھی ان کے ایسے جرائم ہیں جن کی وجہ سے ان پر عذاب آجانا چاہئے۔ ان دونوں آیتوں میں اُن کے تین جرم شمار کئے گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ یہ لوگ خود تو مسجد حرام میں عبادت گزاری کے قابل ہی نہیں اور جو مسلمان وہاں عبادت نماز طواف وغیرہ ادا کرنا چاہتے ہیں اُن کو آنے سے روک دیتے ہیں۔ اس میں واقعہ حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے جبکہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور مشرکینِ مکہ نے آپ کو روک کر واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔

دوسرا جرم یہ فرمایا کہ یہ بے وقوف یوں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم مسجدِ حرام کے متولّی ہیں جس کو چاہیں اس میں آنے کی اجازت دیں جس کو چاہیں نہ دیں۔

ان کا یہ خیال دو غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا اوّل یہ کہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولّی سمجھا حالانکہ کوئی کافر کسی مسجد کا متولّی نہیں ہوسکتا دوسرے یہ کہ متولّی کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے مسجد میں آنے سے روک دے۔ جبکہ مسجد خانۂ خدا ہے اُس میں آنے سے روکنے کا کسی کو حق نہیں بجز ایسی خاص صورتوں کے جن میں مسجد کی بے حرمتی یا دوسرے نمازیوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے، اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے [1] چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذا کا بھی، اور باہمی جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی ہے اور نمازیوں کی ایذا بھی۔

اس حدیث کی رو سے متولّی مسجد کے لئے تو یہ حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے، لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولّی مسجد کو حق نہیں۔

قرآن کریم کی آیت متذکرہ میں صرف پہلی بات بیان کرنے پر اکتفاء کیا کہ ان لوگوں کو مسجد حرام کا متولّی کیسے مانا جائے۔ جبکہ اصول یہ ہے کہ اُس کے متولّی صرف متقی مسلمان ہی ہوسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا متولّی مسلمان دیندار پرہیزگار ہونا چاہئے اور بعض حضرات مفسرین نے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع قرار دے کر یہ معنیٰ لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیزگار لوگ ہوسکتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت وسنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

تیسرا جرم ان لوگوں کا یہ بتلایا کہ کفر وشرک کی گندگی تو تھی ہی ان کے افعال واعمال تو عام انسانی سطح سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے جس فعل کا نام نماز رکھتے ہیں وہ بجز اس کے نہیں کہ اُس میں کچھ منہ سے سیٹیاں بجائیں کچھ ہاتھوں سے تالیاں اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو ذرا بھی عقل ہو وہ ان افعال کو عبادت ونماز کیا کوئی صحیح انسانی فعل بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے آخرِ آیت میں ارشاد فرمایا فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی تمہارے کفر اور جرائم کا انجام یہی ہے کہ اب اللہ کا عذاب چکھو۔ عذاب سے اس جگہ عذابِ آخرت بھی مراد ہوسکتا ہے اور عذابِ دنیا بھی جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر نازل ہوا۔

اس کے بعد چھتیسویں آیت میں کفار مکہ کے ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قوّت جمع کرنے کے لئے مالِ عظیم جمع کیا اور پھر اُس کو دینِ حق اور مسلمانوں کے مٹانے کے لئے خرچ کیا۔ مگر انجام کار یہ ہوا کہ وہ مال بھی ہاتھ سے گیا اور مقصد حاصل ہونے کے بجائے خود ذلیل وخوار ہوئے۔

---

[1] سنن ابن ماجة، ابواب المساجد والجماعات، باب ما يكره في المساجد ج: ۱ ص: ۵۴

واقعہ اس کا بروایت محمد بن اسحاق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست خوردہ زخم خوردہ، بچے کھچے کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اُٹھانے پڑے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تا کہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔ ان لوگوں نے اس کو منظور کر کے ایک بڑی رقم دے دی جس کو انہوں نے غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لئے غزوۂ اُحد میں خرچ کیا اور اُس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہوگئی۔ [1]

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے انجام کی خبر دے دی۔ ارشاد فرمایا: وہ لوگ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو اس کام کے لئے خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روک دیں۔ سو اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنا مال بھی خرچ کر ڈالیں گے اور پھر ان کو مال خرچ کرنے پر حسرت ہوگی، اور انجام کار مغلوب ہو جائیں گے۔ چنانچہ غزوۂ اُحد میں ٹھیک یہی صورت ہوئی کہ جمع شدہ مال بھی خرچ کر ڈالا۔ اور پھر مغلوب ہوئے تو شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع ہونے پر الگ حسرت وندامت ہوئی۔

اور بغوی وغیرہ بعض مفسرین نے اس آیت کے مضمون کو خود غزوۂ بدر کے اخراجات پر محمول فرمایا ہے کہ غزوۂ بدر میں ایک ہزار جوانوں کا جو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر گیا تھا ان کے کھانے پینے وغیرہ کے کل اخراجات مکہ کے بارہ سرداروں نے اپنے ذمہ لئے تھے جن میں ابوجہل۔ عتبہ۔ شیبہ وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے آنے جانے کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات پر بڑی رقم خرچ ہوئی۔ تو ان لوگوں کو اپنی شکست کے ساتھ اپنے اموال ضائع ہونے پر بھی شدید حسرت وندامت پیش آئی۔ (مظہری) [2]

آخر آیت میں آخرت کے اعتبار سے ان لوگوں کے انجامِ بد کا بیان ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ یعنی جو لوگ کافر ہیں اُن کا حشر جہنم کی طرف ہوگا۔

مذکورہ آیتوں میں دینِ حق سے روکنے کے لئے مال خرچ کرنے کا جو انجامِ بد ذکر کیا گیا ہے اُس میں آج کے وہ کفار بھی داخل ہیں جو لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اپنے باطل کی طرف دعوت دینے پر لاکھوں روپیہ شفا خانوں، تعلیم گاہوں اور صدقہ خیرات کے عنوان سے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلام کے

---

[1] تفسیر ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۵۳

[2] تفسير البغوي تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۳۵۵، والتفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۶۴

اجماعی عقائد میں شبہات واوہام پیدا کر کے اُن کے خلاف لوگوں کو دعوت دینے کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ بڑے بڑے اموال خرچ کرنے کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔

سینتیسویں آیت میں واقعاتِ مذکورہ کے کچھ نتائج کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے جو اموال کفار نے اسلام کے خلاف استعمال کئے اور پھر اُن کو حسرت وندامت ہوئی اور ذلیل وخوار ہوئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ:

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ گندی چیز اور پاک صاف چیز میں فرق ظاہر کر دیں۔ لفظ خبیث اور طیب دو متقابل لفظ ہیں۔ لفظ خبیث ناپاک، گندے اور حرام کے لئے بولا جاتا ہے اور طیب اس کے بالمقابل پاک، صاف ستھرے اور حلال کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس جگہ ان دونوں لفظوں سے کفار کے اموال خبیثہ اور مسلمانوں کے اموال طیبہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ کفار نے جو مال عظیم خرچ کئے وہ مال خبیث اور ناپاک تھے اُس کا بُرا نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ مال بھی گیا اور جانیں بھی گئی اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بہت تھوڑا مال خرچ کیا مگر وہ مال پاک اور حلال تھا۔ اُن کے خرچ کرنے والے کامیاب ہوئے اور مزید مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٣٧﴾

"یعنی اللہ تعالیٰ جمع کر دیتا ہے ایک خبیث کو دوسرے خبیث کے ساتھ پھر ان سب کو جمع کر دے گا جہنم میں یہی لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے کہربا گھاس کو کھینچتا ہے اور نئی سائنس کے تجربات میں ساری دنیا کا نظام ہی باہمی کشش پر قائم ہے اسی طرح اعمال واخلاق میں بھی کشش ہے۔ ایک بُرا عمل دوسرے بُرے عمل کو اور ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کو کھینچتا ہے مالِ خبیث دوسرے مالِ خبیث کو کھینچتا ہے اور پھر یہ اموالِ خبیثہ آثارِ خبیثہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں جتنے اموالِ خبیثہ ہیں سب کو جہنم میں جمع فرما دیں گے۔ اور یہ مال والے بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے۔

اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ خبیث اور طیب کی مراد عام قرار دی ہے یعنی پاک اور ناپاک۔ پاک سے مؤمن اور ناپاک سے کافر مراد ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حالاتِ مذکورہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ پاک وناپاک یعنی مؤمن وکافر میں امتیاز ہو جائے مؤمنین جنت میں اور کفار سب ایک جگہ جہنم میں جمع کر دیئے جائیں۔

اڑتیسویں آیت میں کفار کے لئے پھر ایک مربیانہ خطاب ہے جس میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ ترغیب

اس کی ہے کہ اگر وہ ان تمام افعالِ شنیعہ کے بعد اب بھی توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور ترہیب یہ کہ اگر وہ اب بھی باز نہ آئے تو سمجھ لیں کہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی نیا قانون بنانا یا سوچنا نہیں پڑتا۔ پہلے زمانہ کے کافروں کے لئے جو قانون جاری ہو چکا ہے وہ ہی اُن پر بھی جاری ہوگا کہ دنیا میں ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہوئے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا

اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے حکم سب اللہ کا، پھر اگر وہ باز آجائیں

فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ

تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے۔ اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے،

نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دِین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔ پھر اگر یہ باز آجائیں تو اُن کے اعمال کو اللہ خوب دیکھ رہا ہے ﴿۳۹﴾ اور اگر یہ منہ موڑے رکھیں، تو یقین جانو کہ اللہ تمہارا رکھوالا ہے، بہترین رکھوالا، اور بہترین مددگار! ﴿۴۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (پھر ان کے اس کافر رہنے کی صورت میں اے مسلمانو) تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فسادِ عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (اللہ کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (اور کسی کے دین کا خالصۃً اللہ ہی کے لئے ہو جانا موقوف ہے قبولِ اسلام پر۔ تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کریں۔ خلاصہ یہ کہ اگر اسلام نہ لائیں تو ان سے لڑو جب تک اسلام نہ لائیں کیونکہ کفار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا) پھر اگر یہ (کفر سے) باز آجائیں تو (ان کے ظاہری

اسلام کو قبول کرو دل کا حال مت ٹٹولو کیونکہ اگر یہ دل سے ایمان نہ لائیں گے تو) اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں (وہ آپ سمجھ لیں گے تم کو کیا) اور اگر (اسلام سے) روگردانی کریں تو (اللہ کا نام لے کر ان کے مقابلہ سے مت ہٹو اور) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (ان کے مقابلہ میں) تمہارا رفیق ہے وہ بہت اچھا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے (سو وہ تمہاری رفاقت اور نصرت کرے گا)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ انفال کی انتالیسویں آیت ہے اس میں دو لفظ قابل غور ہیں ایک لفظ **فتنہ** دوسرا **دین**۔ یہ دونوں لفظ عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے اس جگہ دو معنی منقول ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ سے مراد کفر و شرک اور دین سے مراد دینِ اسلام لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اس تفسیر پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کو کفار سے قتال اُس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک کہ کفر مٹ کر اُس کی جگہ اسلام آجائے اسلام کے سوا کوئی دین و مذہب باقی نہ رہے۔ اس صورت میں یہ حکم صرف اہل مکہ اور اہل عرب کے لئے مخصوص ہوگا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا گھر ہے اس میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین رہے تو دینِ اسلام کے لئے خطرہ ہے۔ باقی ساری دنیا میں دوسرے ادیان و مذاہب کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں۔

اور دوسری تفسیر جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ فتنہ سے مراد اس جگہ وہ ایذاء اور عذاب و مصیبت ہے جس کا سلسلہ کفارِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر ہمیشہ جاری رہا تھا جب تک وہ مکہ میں تھے تو ہر وقت ان کے نرغہ میں پھنسے ہوئے طرح طرح کی ایذائیں سہتے رہے پھر جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو ایک ایک مسلمان کا تعاقب کر کے قتل و غارتگری کرتے رہے مدینہ میں پہنچنے کے بعد بھی پورے مدینہ پر حملوں کی صورت میں ان کا غیظ و غضب ظاہر ہوتا رہا۔

اور اس کے بالمقابل دین کے معنی قہر و غلبہ کے ہیں اس صورت میں تفسیر آیت کی یہ ہوگئی کہ مسلمانوں کو کفار سے اُس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہوجائیں اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہوجائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک واقعہ سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب امیر مکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مقابلہ میں حجاج بن یوسف

نے فوج کشی کی اور دونوں طرف مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ پر چل رہی تھیں تو دو شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اس وقت جس بلاء میں مسلمان مبتلا ہیں آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں جو کسی طرح ایسے فتنوں کو برداشت کرنے والے نہ تھے۔ کیا سبب ہے کہ آپ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کا خون بہانا حرام قرار دیا ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ کیا آپ قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ یعنی مقاتلہ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بیشک میں یہ آیت پڑھتا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ ہم نے اس آیت کے مطابق کفار سے قتال جاری رکھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور غلبہ دین اسلام کا ہو گیا۔ اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اب باہم قتال کر کے فتنہ پھر پیدا کر دو اور غلبہ غیر اللہ کا اور دینِ حق کے خلاف کا ہو جائے۔ [1] مطلب یہ تھا کہ جہاد و قتال کا حکم فتنۂ کفر اور مظالم کفار کے مقابلہ میں تھا وہ ہم کر چکے اور برابر کرتے رہے یہاں تک کہ یہ فتنہ فرو ہو گیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو اُس پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مقاتلہ کے وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہے۔

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداءِ اسلام کے خلاف جہاد و قتال اُس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر اُن کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب اَدیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے۔ اور یہ صورت صرف قربِ قیامت میں ہوگی اس لئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔

اعداءِ اسلام کے خلاف جہاد و قتال کے نتیجہ میں دو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ وہ مسلمانوں پر ظلم و جور سے باز آجائیں خواہ اس طرح کہ اسلامی برادری میں داخل ہو کر بھائی بن جائیں یا اس طرح کہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم و ستم سے باز آجائیں اور اطاعت کا معاہدہ کر لیں۔

دوسرے یہ کہ وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی کو قبول نہ کریں اور مقابلہ پر جمے رہیں اگلی آیت میں ان دونوں صورتوں کے اَحکام مذکور ہیں۔ ارشاد فرمایا:

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٣٩﴾

''یعنی اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں۔''

اُس کے مطابق اُن کے ساتھ معاملہ فرما دیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے خلاف جہاد کو بند کر دیا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ معرکۂ قتال کے بعد کفار کی طرف سے صلح کا معاہدہ یا مسلمان

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير سورة الأنفال، باب قوله "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" إلخ ج: ۲ ص: ۶۷۰

ہو جانے کا اظہار بہت ممکن ہے کہ محض کوئی جنگی چال اور دھوکہ ہو۔ ایسی صورت میں جنگ بند کر دینا مسلمانوں کے لئے مضر ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ان الفاظ سے دیا گیا کہ مسلمان تو ظاہری اعمال کے پابند ہیں، دلوں کا دیکھنے والا اور اُن کے مخفی سرائر کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے جب وہ مسلمان ہونے کا اظہار کریں یا معاہدہ صلح کر لیں تو مسلمان اس پر مجبور ہیں کہ جہاد و قتال بند کر دیں۔ رہا یہ معاملہ کہ اُنہوں نے سچے دل سے اسلام یا صلح کو قبول کیا ہے یا اس میں دھوکہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے جانتے ہیں اگر وہ ایسا کریں گے تو اُس کا دوسرا انتظام ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو ان خیالات اور خطرات پر اپنے معاملات کی بنیاد نہیں رکھنا چاہئے۔

اگر اظہارِ اسلام یا معاہدہ صلح کے بعد اُن پر ہاتھ اُٹھایا گیا تو جہاد کرنے والے مجرم ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں دشمنانِ اسلام سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو قبول کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کر لیں تو اُن کے خون اور اموال سب محفوظ ہو جائیں گے۔ بجز اس کے کہ اسلامی قانون کے ماتحت کسی جرم کی پاداش میں اُن کو سزا دی جائے۔ اور اُن کے دلوں کا حساب اللہ پر رہے گا [۱] کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ اور اعمال اسلام کو قبول کر رہے ہیں یا نفاق سے۔

دوسری ایک حدیث جو ابوداؤد نے بہت سے صحابہ کرامؓ کی روایت سے نقل کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد پر یعنی اُس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت و وفاداری کا معاہدہ کر لیا ہو کوئی ظلم کرے یا اُس کو نقصان پہنچائے یا اُس سے کوئی ایسا کام لے جو اُس کی طاقت سے زائد ہے یا اُس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہد کی حمایت کروں گا۔ [۲]

قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور روایاتِ حدیث نے بظاہر مسلمانوں کو ایک سیاسی خطرہ میں مبتلا کر دیا کہ بڑے سے بڑا دشمنِ اسلام جب ان کی زد میں آجائے اور محض جان بچانے کے لئے کلمۂ اسلام پڑھ لے تو مسلمانوں پر لازم کر دیا کہ فوراً اپنا ہاتھ روک لیں اس طرح تو وہ کسی دشمن پر بھی قابو نہیں پا سکتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے مخفی سرائر کو اپنے ذمہ لے کر معجزانہ انداز میں یہ کر دکھایا کہ عملی طور پر مسلمانوں کو کسی میدانِ جنگ میں ایسا ابتلاء پیش نہیں آیا۔ البتہ صلح کی حالت میں سیکڑوں منافقین پیدا ہوئے جنہوں نے دھوکہ دینے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور بظاہر نماز روزہ بھی ادا کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کم ظرف لوگوں کا تو اتنا ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں سے کچھ فوائد حاصل کر لیں اور دشمنی کرنے کے

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب فإن تابوا وأقاموا الصلوٰة إلخ ج:۱ ص:۸، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس إلخ ج:۱ ص:۳۷

[۲] سنن ابی داوٗد، کتاب الخراج والامارة والفیء، باب فی تعشیر اهل الذمة إلخ ج:۲ ص:۴۳۲

باوجودان کے انتقام سے محفوظ رہیں۔ اور بعض وہ بھی تھے جو سیاسی مقاصد لے کر مسلمانوں کے راز معلوم کرنے اور مخالفین سے سازش کرنے کے لئے ایسا کررہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے قانون نے ان سب کے بارہ میں مسلمانوں کو یہی ہدایت دی کہ وہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں جب تک خود اُن کی طرف سے اسلام دشمنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی ثابت نہ ہو جائے۔

قرآن کی یہ تعلیم تو اُس صورت میں تھی جبکہ دشمنانِ اسلام اپنی دشمنی سے باز آجانے کا اقرار اور معاہدہ کرلیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ضد اور عناد پر قائم رہیں اُس کے متعلق حکم اس کے بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ؀ یعنی اگر وہ بات نہ مانیں تو تم یہ سمجھ رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار حمایتی ہے اور وہ بہت اچھا حمایتی اور بہت اچھا مددگار ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم وجور اور کفر وشرک سے باز نہ آئیں تو مسلمانوں کے ذمہ وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ اُن سے قتال جاری رکھیں۔ اور جہاد وقتال چونکہ بڑے لشکر اور بہت سے اسلحہ اور ساز وسامان پر عادۃً موقوف ہے اور مسلمانوں کو عام طور پر یہ چیزیں کم حاصل تھیں اس لئے یہ ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کو حکمِ قتال بھاری معلوم ہو یا وہ اپنی قلّتِ تعداد اور قلّتِ سامان کی وجہ سے یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس لئے اس کا علاج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ اگرچہ تعداد اور سامان ان لوگوں کے پاس مسلمانوں سے زائد سہی مگر وہ اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت وحمایت کہاں سے لائیں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہے جس کو وہ ہر میدان میں اپنے ساتھ مشاہدہ کرتے رہے ہیں، اور فرمایا کہ یوں تو امداد وحمایت دنیا میں ہر فریق کسی نہ کسی سے حاصل کرہی لیتا ہے مگر مدار کار اس مددگار کی قوت وطاقت اور علم وتجربہ پر ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت وقوت اور علم وبصر سے زیادہ کیا، برابر بھی سارے جہان کو حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ سب سے بہتر حمایتی اور مددگار ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ

وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ

اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اُتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن جس دن

الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿٤١﴾

بھڑ گئیں دونوں فوجیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (مسلمانو!) یہ بات اپنے علم میں لے آؤ کہ تم جو کچھ مالِ غنیمت حاصل کرو، اُس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور اُن کے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے (جس کی ادائیگی تم پر واجب ہے،) اگر تم اللہ پر اور اُس چیز پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن نازل کی تھی، جس دن دو جماعتیں باہم ٹکرائی تھیں۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿٤١﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اس بات کو جان لو کہ جو شئے (کفار سے) بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ (اس کے کل پانچ حصے کئے جائیں جن میں سے چار حصے تو مقاتلین کا حق ہے اور ایک حصہ یعنی) اس کا پانچواں حصہ (پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہوگا جن میں سے ایک تو) اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا جن کو دینا بمنزلہ اس کے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دیا) اور (ایک حصہ) آپ کے قرابت داروں کا ہے اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے (ایک حصہ) غریبوں کا ہے اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو اور اس چیز پر (یقین رکھتے ہو) جس کو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر فیصلہ کے دن (یعنی) جس دن کہ (بدر میں) دونوں جماعتیں (مؤمنین اور کفار کی) باہم مقابل ہوئی تھیں نازل فرمایا تھا (مراد اس سے امداد غیبی بواسطہ ملائکہ کے ہے یعنی اگر ہم پر اور ہمارے الطاف غیبیہ پر یقین رکھتے ہو تو اس حکم کو جان رکھو اور عمل کرو یہ اس لئے بڑھا دیا کہ خمس نکالنا شاق نہ ہو اور یہ سمجھ لیں کہ یہ ساری غنیمت اللہ ہی کی امداد سے تو ہاتھ آئی پھر اگر ہم کو ایک خمس نہ ملا تو کیا ہوا وہ چار خمس بھی تو ہماری قدرت سے خارج تھے بلکہ محض

قدرتِ الٰہیہ سے حاصل ہوئے) اور اللہ (ہی) ہر شیٔ پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (پھر تمہارا استحقاق تو اتنا بھی نہیں تھا یہ بھی بہت مل گیا)۔

معارف ومسائل

اس آیت میں مالِ غنیمت کے اَحکام اور اس کی تقسیم کا قانون مذکور ہے۔ اس سے پہلے چند ضروری الفاظ کی تشریح سن لیجئے۔

لفظ غنیمت لغت میں اُس مال کے لئے بولا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔ اصطلاحِ شریعت میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ وقتال اور قہر وغلبہ کے ذریعہ حاصل ہو اُس کو غنیمت کہتے ہیں اور جو صلح ورضامندی سے حاصل ہو جیسے جزیہ وخراج وغیرہ اُس کو فَــیْء کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں انہیں دونوں لفظوں سے ان دونوں قسموں کے اَحکام بتلائے گئے ہیں۔ سورۂ انفال میں مالِ غنیمت کے اَحکام کا ذکر ہے جو جنگ وقتال کے وقت غیر مسلموں سے حاصل ہو۔

یہاں سب سے پہلے ایک بات پیش نظر رہنا چاہئے وہ یہ کہ اسلامی اور قرآنی نظریہ کے مطابق تمام کائنات کی اصلی ملکیت صرف اُس ذاتِ حق تعالیٰ کی ہے جس نے اُنہیں پیدا کیا ہے انسان کی طرف کسی چیز کی ملکیت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے ذریعہ کسی شخص کی ملکیت قرار دے دی ہو۔ جیسے سورۂ یٰسٓ میں چوپائے جانوروں کے ذکر میں ارشاد فرمایا اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ چوپاؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا پھر لوگ اُن کے مالک بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ملکیت ذاتی نہیں ہم نے اپنے فضل سے اُن کو مالک بنادیا۔

جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرتی ہے یعنی کفر وشرک میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پہلے حق تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے اپنے رسول اور کتابیں بھیجتے ہیں جو بدبخت اس انعامِ الٰہی سے بھی متأثر نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اُن کے مقابلہ میں جہاد وقتال کا حکم دے دیتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان باغیوں کے جان ومال سب مباح کر دیئے گئے ان کو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اموال سے نفع اُٹھانے کا حق نہیں رہا۔ بلکہ ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہو گئے۔ انہیں ضبط شدہ اموال کا دوسرا نام مالِ غنیمت ہے۔ جو کفار کی ملکیت سے نکل کر خالص حق تعالیٰ کی ملکیت میں رہ گئے۔

ان ضبط شدہ اموال کے لئے زمانۂ قدیم سے حق تعالیٰ کا قانون یہ رہا ہے کہ ان سے کسی کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ ایسے اموال کو جمع کر کے کسی کھلی جگہ میں رکھ دیا جاتا تھا اور آسمان سے ایک بجلی آ کر اُن کو جلا دیتی تھی۔ یہی علامت ہوتی تھی اس جہاد کے قبول ہونے کی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چند خصوصیات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت آپ کی اُمت کے لئے حلال کر دیا گیا (کمافی حدیث مسلم) [1] اور حلال بھی ایسا کہ اُس کو اَطیب الاموال کہا جاتا ہے یعنی سب سے زیادہ پاک مال۔ وجہ یہ ہے کہ جو مال انسان اپنے کسب اور کمائی سے حاصل کرتا ہے اُس میں انسانوں کی ملکیت سے واسطہ در واسطہ منتقل ہو کر ایک مال اس کی ملکیت میں آتا ہے اور ان واسطوں میں حرام و ناجائز یا مکروہ طریقوں کا احتمال رہتا ہے بخلاف مالِ غنیمت کے کہ کفار کی ملکیت اُن سے ختم ہو کر براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت رہ گئی اور اب جس کو ملتا ہے براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت سے ملتا ہے جس میں کوئی شبہ اور شائبہ حرمت یا کراہت کا نہیں رہتا جیسے کنویں سے نکالا ہوا پانی یا خودرو گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا انعام انسان کو ملتا ہے کوئی انسانی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مالِ غنیمت جو پچھلی اُمتوں کے لئے حلال نہیں تھا اُمتِ مرحومہ کے لئے بطورِ انعام حلال کر دیا گیا۔ آیتِ مذکورہ میں اُس کی تقسیم کا ضابطہ اس عنوان سے بیان فرمایا گیا ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ اس میں عربی لغت کے قاعدہ سے اوّل تو لفظ ما عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اُس عموم کی تاکید مزید کے لئے لفظ مِنْ شَيْءٍ بڑھایا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ چھوٹی بڑی چیز مالِ غنیمت میں حاصل ہو وہ سب اسی قانون کے تحت داخل ہے کسی چیز کو معمولی یا چھوٹا سمجھ کر کوئی شخص قانونِ تقسیم کے علاوہ اگر لے لے گا تو وہ سخت مجرم قرار پائے گا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک سوئی اور اُس کا دھاگہ بھی جو مالِ غنیمت کا جز ہو کسی کے لئے اُس کا بغیر اپنے حصہ شرعی کے لے لینا جائز نہیں۔ [2] اور مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز بغیر حصہ کے لینے کو حدیث میں غلول فرما کر اُس پر شدید وعید فرمائی ہے اور عام چوری سے زیادہ شدید حرام قرار دیا ہے۔

ضابطۂ تقسیم کا یہ عنوان دے کر تمام مجاہد مسلمانوں کو اس سے باخبر کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مال تمہارے لئے حلال کر دیا ہے مگر ایک خاص ضابطہ کے تحت حلال ہے اُس کے خلاف اگر کوئی لے گا تو وہ جہنم کا ایک انگارہ ہوگا۔

قرآنی قانون کا یہی وہ امتیاز ہے جو دنیا کے دوسرے قوانین کو حاصل نہیں۔ اور یہی قانونِ قرآنی کی تاثیر کامل اور کامیابی کا اصلی راز ہے کہ اوّل خوفِ خدا و آخرت کو پیشِ نظر کر کے اُس سے ڈرایا گیا دوسرے نمبر میں تعزیری سزائیں بھی جاری کی گئیں۔

ورنہ غور کا مقام ہے کہ عین میدانِ جنگ کی افراتفری کے وقت جو اموال غیر مسلموں کے قبضہ سے حاصل کئے جائیں جن کی تفصیل نہ پہلے سے مسلمانوں کے امیر کے علم میں ہے نہ کسی دوسرے کے۔ اور موقع میدانِ جنگ کا ہے جو عموماً جنگل اور صحراء ہوتے ہیں جن میں چھپنے چھپانے کے ہزاروں مواقع ہوتے ہیں۔ نرے قانون کے زور سے ان اموال کی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ ج: ۱ ص: ۱۹۹ [2] شعب الإیمان للبیهقیؒ رقم الحدیث: ۵۲۶۱

حفاظت کسی کے بس میں نہیں، صرف خوفِ خدا وآخرت ہی وہ چیز تھی جس نے ایک ایک مسلمان کو ان اموال میں ادنیٰ تصرّف کرنے سے باز رکھا۔

اب اس ضابطۂ تقسیم کو دیکھئے ارشاد فرمایا فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ یعنی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس کے رشتہ داروں کا اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں کا ہے۔

یہاں پہلے تو یہ بات غور طلب ہے کہ ضابطہ پورے مالِ غنیمت کی تقسیم کا بیان ہو رہا ہے مگر قرآن نے صرف اس کے پانچویں حصے کی تقسیم کا ضابطہ یہاں ذکر فرمایا باقی چار حصوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں کیا راز ہے اور باقی چار حصوں کی تقسیم کا کیا قانون ہے۔ لیکن قرآن میں غور و تدبر کرنے سے ان دونوں باتوں کا جواب انہیں لفظوں میں یہ نکل آتا ہے کہ قرآن کریم نے جہاد کرنے والے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا مَا غَنِمْتُمْ یعنی جو کچھ تم نے غنیمت میں حاصل کیا۔ اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ مال ان حاصل کرنے والوں کا حق ہے اور اس کے بعد جب یہ ارشاد فرما دیا کہ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور رسول وغیرہ کا ہے تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکل آیا کہ باقی چار حصے غانمین اور مجاہدین کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے قانونِ وراثت میں ایک جگہ ارشاد ہے وَوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (النساء:۱۱) یعنی جب کسی شخص کے وارث اُس کے ماں باپ ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے۔ یہاں بھی صرف ماں کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ باقی دو حصے باپ کا حق ہیں۔ اسی طرح مَا غَنِمْتُمْ کے بعد جب صرف پانچویں حصہ کو اللہ کے لئے رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ باقی چار حصے مجاہدین کا حق ہیں۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل نے اس کو اور اس کی پوری تفصیلات کو واضح کر دیا کہ یہ چار حصے مجاہدین میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم فرمائے۔

اب اُس پانچویں حصہ کی تفصیل سنئے جس کو قرآن کریم نے اس آیت میں متعین فرما دیا ہے الفاظِ قرآنی میں اس جگہ چھ الفاظ مذکور ہیں: لِلّٰهِ، لِلرَّسُوْلِ، لِذِی الْقُرْبٰى، الْيَتٰمٰى، الْمَسٰكِيْنِ، ابْنِ السَّبِيْلِ۔

اس میں لفظ لِلّٰهِ تو ایک جلی عنوان ہے اُن مصارف کا جن میں یہ پانچواں حصہ تقسیم ہوگا یعنی یہ سب مصارف خالص اللہ کے لئے ہیں۔ اور اس لفظ کے اس جگہ لانے میں ایک خاص حکمت ہے جس کی طرف تفسیر مظہری میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے صدقات کا مال حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے شایانِ شان نہیں کیونکہ عام لوگوں کے اموال کو پاک کرنے کے لئے ان میں سے نکالا ہوا حصہ ہے جس کو حدیث میں اوساخ الناس [۱] فرمایا ہے، یعنی لوگوں کا میل کچیل، وہ شانِ نبوّت کے لائق نہیں۔ [۲]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب تحریم الزکاۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ إلخ ج:۱ ص:۳۴۴

[۲] التفسیر المظھری تحت ھذہ الآیة ج:۴ ص:۶۸

مالِ غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے چونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو بھی قرآن کی اس آیت نے حصہ دیا ہے اس لئے اس پر متنبہ کیا گیا کہ یہ حصہ لوگوں کی ملکیت سے منتقل ہو کر نہیں آیا بلکہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کفار کی مِلک سے نکل کر براہِ راست حق تعالیٰ کی خالص ملکیت ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام تقسیم ہوتا ہے۔ اس لئے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذَوِی القربیٰ کو جو حصہ مالِ غنیمت کے خُمس سے دیا گیا ہے وہ لوگوں کے صدقات کا نہیں بلکہ براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے فضل و انعام ہے۔ شروع آیت میں فرمایا گیا لِلّٰهِ یعنی یہ سب مال اصل میں خالص ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اُسی کے فرمان کے مطابق مذکورہ مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔

اس لئے اس خُمس کے اصلی مصارف پانچ رہ گئے: رسول، ذَوِی القربیٰ، یتیم، مسکین، مسافر، پھر ان میں استحقاق کے درجے مختلف ہیں۔ قرآنِ کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان درجاتِ استحقاق کا فرق کس باریک اور لطیف انداز سے ظاہر فرمایا گیا ہے کہ ان پانچ میں سے پہلے دو پر حرف لام لایا گیا وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی اور باقی تین قسموں کو بغیر حرف لام کے باہم معطوف بنا کر ذکر کر دیا گیا۔

حرف لام عربی زبان میں کسی خصوصیت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ لِلّٰهِ میں حرف لام اختصاص ملکیت کے بیان کے لئے ہے کہ اصل مالک سب چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہے اور لفظ لِلرَّسُوْلِ میں استحقاق کی خصوصیت کا بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ خُمس غنیمت کے صَرف کرنے اور تقسیم کرنے کا حق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ جس کا حاصل امام طحاویؒ کی تحقیق اور تفسیر مظہری [1] کی تقریر کے مطابق یہ ہے کہ اگرچہ اس جگہ خُمس کے مصارف میں پانچ ناموں کا ذکر ہے لیکن درحقیقت اس میں پورا تصرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ اپنی صوابدید کے مطابق ان پانچ قسموں میں خُمس غنیمت کو صَرف فرمائیں جیسا کہ سورۂ انفال کی پہلی آیت میں پورے مالِ غنیمت کا حکم یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں صَرف فرمائیں جس کو چاہیں دیں۔ آیت وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ نے کل مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے چار کو مجاہدین کا حق قرار دے دیا مگر پانچواں حصہ بدستور اُسی حکم میں رہا کہ اس کا صَرف کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا صرف اتنی بات کا اضافہ ہوا کہ اس پانچویں حصے کے پانچ مصارف بیان کر دیئے گئے کہ یہ ان میں دائر رہے گا۔ مگر جمہور ائمۂ اہلِ تحقیق کے نزدیک آپ کے ذمہ یہ لازم نہیں تھا کہ اس خُمس کے پانچ حصے برابر کریں اور مندرجہ آیت پانچوں قسموں میں برابر تقسیم کریں بلکہ صرف اتنا ضروری تھا کہ خُمس غنیمت کو انہیں پانچ قسموں کے اندر سب کو یا بعض کو اپنی صوابدید کے مطابق عطا فرمائیں۔

---

[1] التفسیر المظہری تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۷۱

اس کی سب سے بڑی واضح دلیل خود اس آیت کے الفاظ اور اُن میں بیان کی ہوئی مصارف کی قسمیں ہیں کہ یہ سب قسمیں عملاً الگ الگ نہیں بلکہ باہم مشترک بھی ہوسکتی ہیں مثلاً جو شخص ذَوِی القربیٰ میں داخل ہے وہ یتیم بھی ہوسکتا ہے مسکین اور مسافر بھی۔ اسی طرح مسکین اور مسافر یتیم بھی ہوسکتے ہیں ذَوِی القربیٰ بھی، جو مسکین ہے وہ مسافر کی فہرست میں بھی آسکتا ہے اگر ان سب قسموں میں الگ الگ برابر تقسیم کرانا مقصود ہوتا تو یہ قسمیں ایسی ہونا چاہئے تھا کہ ایک قسم کا آدمی دوسری قسم میں داخل نہ ہو۔ ورنہ پھر یہ لازم آئے گا کہ جو ذَوِی القربیٰ میں سے ہے اور وہ یتیم بھی ہے مسکین بھی مسافر بھی تو اُس کو ہر حیثیت سے ایک ایک حصہ ملا کر چار حصے دیئے جائیں جیسا کہ تقسیم فرائض ومیراث کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک شخص کو میّت کے ساتھ مختلف قسم کی قرابتیں حاصل ہیں تو ہر قرابت کا حصہ اُس کو الگ ملتا ہے اور اُمت میں اس کا کوئی قائل نہیں کہ ایک شخص کو چار حصے دیئے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اس آیت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی عائد کرنا نہیں ہے کہ ان سب قسموں کو ضرور ہی دیں اور برابر دیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ خُمس غنیمت کا مال ان پانچ قسموں میں سے جس قسم پر جتنا خرچ کرنا آپ کی رائے میں مناسب ہو اُتنا دے دیں۔ (تفسیر مظہری) [۱]

یہی وجہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب اس خُمس میں سے ایک خادم کا سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور گھر کے کاموں میں اپنی محنت ومشقت اور کمزوری کا سبب بھی ظاہر کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عذر فرما کر اُن کو دینے سے انکار کردیا کہ میرے سامنے تمہاری ضرورت سے زیادہ اہلِ صفہ صحابہ کرام کی ضرورت ہے جو انتہائی فقر وافلاس میں مبتلا ہیں اُن کو چھوڑ کر میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ (صحیح بخاری ومسلم) [۲]

اس سے واضح ہوگیا کہ ہر ایک قسم کا الگ حق نہیں تھا ورنہ ذَوِی القربیٰ کے حق میں فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا سے کون مقدم ہوتا۔ بلکہ یہ سب بیانِ مصارف ہے بیانِ استحقاق نہیں۔

تقسیمِ خمس بعد وفاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جمہور ائمہ کے نزدیک خُمس غنیمت میں جو حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا گیا وہ آپ کے منصب نبوّت ورسالت کی بنا پر ایسا ہی تھا جیسے آپ کو خصوصی طور پر یہ بھی حق دیا گیا تھا کہ پورے مالِ غنیمت میں آپ اپنے لئے کوئی چیز انتخاب کرکے لے لیں جس کی وجہ سے بعض غنیمتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشیاء لی بھی تھیں۔ اور خمس غنیمت میں سے آپ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ حصہ خود بخود ختم ہوگیا کیونکہ آپ کے بعد کوئی رسول و نبی نہیں۔

---

[۱] التفسیر المظہری ج:۴ ص:۷۱ [۲] یہ الفاظ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں نہ مل سکے البتہ مسند احمد رقم الحدیث:۷۹۷ پر اس قسم کے الفاظ موجود ہیں۔

خُمس ذَوِی القربیٰ

اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں کہ فقراء ذَوِی القربیٰ کا حق خمس غنیمت میں دوسرے مصارف یعنی یتیم، مسکین، مسافر سے مقدم ہے۔ کیونکہ فقراء ذَوِی القربیٰ کی امداد زکوٰۃ وصدقات سے نہیں ہوسکتی دوسرے مصارف زکوٰۃ وصدقات سے بھی ہوسکتے ہیں (کما صرح بہ فی الھدایہ ویقدّمون) [1] البتہ اغنیاء ذَوِی القربیٰ کو اس میں سے دیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا فرمانا یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو ذَوِی القربیٰ کو عطا فرماتے تھے تو اُس کی دو بنیادیں تھیں ایک اُن کی حاجت مندی اور فقر دوسرے اقامتِ دین اور دفاع عن الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وامداد۔ دوسرا سبب تو وفاتِ نبوی کے ساتھ ختم ہوگیا صرف پہلا سبب فقر وحاجت مندی رہ گیا اُس کی بنا پر تاقیامت ہر امام وامیر اُن کو دوسروں سے مقدم رکھے گا (ہدایہ۔ جصاص)۔ [2] امام شافعیؒ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ (قرطبی) [3]

اور بعض فقہاء کے نزدیک سہم ذَوِی القربیٰ بحیثیت قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے باقی ہے جس میں اغنیاء اور فقراء سب شریک ہیں البتہ امیر وقت اپنی صوابدید کے مطابق اُن کو حصہ دے گا۔ (مظہری) [4]

اور اصل چیز اس معاملہ میں خلفاء راشدینؓ کا تعامل ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا کیا۔ صاحبِ ہدایہ نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ان الخلفاء الأربعة الراشدين قسّموه على ثلاثة اسهم۔ [5]

چاروں خلفاء راشدینؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس غنیمت کو صرف تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے یتیم، مسکین، فقیر۔

البتہ حضرت فاروقِ اعظمؓ سے ثابت ہے کہ فقراء ذَوِی القربیٰ کو خمس غنیمت سے دیا کرتے تھے (اخرجہ ابوداؤد) [6] اور ظاہر ہے کہ یہ تخصیص صرف فاروقِ اعظمؓ کی نہیں دوسرے خلفاء کا بھی یہی عمل ہوگا۔

اور جن روایات سے یہ ثابت ہے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ اپنے آخری زمانہ خلافت تک ذَوِی القربیٰ کا حق

---

[1] الهداية فصل فی كيفية القسمة ج:۲ ص:۱۴۸

[2] احكام القرآن للجصاص ج:۶ ص:۳۰۰، باب قسمة الخمس والهداية بحوالۂ بالا۔

[3] تفسير القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۶ ص:۱۱

[4] التفسير المظهری ج:۴ ص:۷۵، ۷۶

[5] الهداية فصل فی كيفية القسمة ج:۲ ص:۱۴۸

[6] سنن ابی داؤد، كتاب الخراج والفیء، باب فی بيان مواضع قسم الخمس واسم ذوی القربیٰ ج:۲ ص:۴۱۶

نکالتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اُس کا متولّی بنا کر ذَوِي الْقُرْبىٰ میں تقسیم کراتے تھے (كما في رواية كتاب الخراج لأبي يوسف) [1] تو یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ تقسیم فقراء ذَوِي الْقُرْبىٰ کے لئے مخصوص ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

فائدہ

ذَوِي الْقُرْبىٰ کی تعیین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمادی کہ بنو ہاشم تو آپ کا اپنا قبیلہ ہی تھا بنو المطلب کو بھی ان کے ساتھ اس لئے شامل فرمالیا تھا کہ یہ لوگ بھی جاہلیت و اسلام میں کبھی بنو ہاشم سے الگ نہیں ہوئے یہاں تک کہ قریشِ مکہ نے جب غذائی مقاطعہ بنو ہاشم کا کیا اور اُن کو شعب ابی طالب میں بند کردیا تو بنو المطلب کو اگرچہ قریش نے مقاطعہ میں داخل نہیں کیا تھا مگر یہ لوگ اپنی رضامندی سے مقاطعہ میں شریک ہوگئے۔ (مظہری) [2]

غزوۂ بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا گیا

آیتِ مذکورہ میں بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے پہلے مادّی اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی واضح فتح اور کفار کی عبرتناک شکست اس دن میں ہونے کی بنا پر کفر و اسلام کا ظاہری فیصلہ بھی اس دن ہوگیا۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ

جس وقت تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ پرلے کنارہ پر اور قافلہ نیچے اُتر گیا تھا

مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا

تم سے، اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ لیکن اللہ کو ڈالنا تھا ایک کام کو

كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ

جو مقرر ہوچکا تھا، تاکہ مرے جس کو مرنا ہے قیامِ حجت کے بعد اور جیوے جس کو جینا ہے

---

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف ج:۱ ص:۲۶ رقم الحديث:۵۷ [2] التفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۴ ص:۶۸

عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾ إِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ

قیامِ حجت کے بعد، اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں

قَلِيْلًا ۖ وَلَوْ أَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

تھوڑے، اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا تو تم لوگ نامردی کرتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے

سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٤٣﴾ وَإِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ

بچالیا، اُس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے دلوں میں۔ اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت

فِيْٓ أَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا

تمہاری آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا اُن کی آنکھوں میں تاکہ کرڈالے اللہ ایک کام

كَانَ مَفْعُوْلًا ۗ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ ﴿٤٤﴾ ع ۵

جو مقرر ہو چکا تھا، اور اللہ تک پہنچتا ہے ہر کام۔

آسان ترجمۂ قرآن

وہ وقت یاد کرو جب تم لوگ وادی کے قریب والے کنارے پر تھے، اور وہ لوگ دُور والے کنارے پر، اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف۔ اور اگر تم پہلے سے (لڑائی کا) وقت آپس میں طے کرتے تو وقت طے کرنے میں تمہارے درمیان ضرور اختلاف ہو جاتا، لیکن یہ واقعہ (کہ پہلے سے طے کئے بغیر لشکر ٹکرا گئے) اس لئے ہوا کہ جو کام ہو کر رہنا تھا، اللہ اُسے پورا کر دِکھائے، تاکہ جسے برباد ہونا ہو، وہ واضح دلیل دیکھ کر برباد ہو، اور جسے زندہ رہنا ہو، وہ واضح دلیل دیکھ کر زندہ رہے، اور اللہ ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے ﴿۴۲﴾ اور (اے پیغمبر!) وہ وقت یاد کرو جب اللہ خواب میں تمہیں اُن (دشمنوں) کی تعداد کم دِکھا رہا تھا، اور اگر تمہیں اُن کی تعداد زیادہ دِکھا دیتا تو (اے مسلمانو!) تم ہمت ہار جاتے، اور تمہارے درمیان اس معاملے میں اختلاف پیدا ہو جاتا، لیکن اللہ نے (تمہیں اس سے) بچالیا۔ یقیناً وہ سینوں میں چھپی باتیں خوب جانتا

ہے ﴿۴۳﴾ اور وہ وقت یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے مدِ مقابل آئے تھے تو اللہ تمہاری نگاہوں میں اُن کی تعداد کم دِکھا رہا تھا، اور اُن کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے دِکھا رہا تھا، تا کہ جو کام ہو کر رہنا تھا، اللہ اُسے پورا کر دِکھائے۔ اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ﴿۴۴﴾

خلاصہ تفسیر

یہ وہ وقت تھا کہ جب تم اس میدان کے اِدھر والے کنارہ پر تھے اور وہ لوگ (یعنی کفار) اُس میدان کے اُدھر والے کنارہ پر تھے (اِدھر والے سے مراد مدینہ سے نزدیک کا موقع اور اُدھر والے سے مراد مدینہ سے دور کا موقع) اور وہ قافلہ (قریش کا) تم سے نیچے کی طرف کو (بچا ہوا) تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے جارہا تھا حاصل یہ کہ پورے جوش کا سامان جمع ہو رہا تھا کہ دونوں آپس میں آمنے سامنے تھے کہ ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر جوش میں آئے اُدھر قافلہ رستہ ہی میں تھا جس کی وجہ سے لشکر کفار کو اس کی حمایت کا خیال دلنشین ہوا جس سے اور جوش میں زیادتی ہو غرض وہ ایسا شدید وقت تھا پھر بھی خدا تعالیٰ نے تم پر امدادِ غیبی نازل کی جیسا اوپر ارشاد ہوا ہے اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا) اور (وہ تو مصلحت یہ ہوئی کہ اتفاقاً مقابلہ ہو گیا ورنہ) اگر (پہلے سے حسبِ معمول وعادت) تم اور وہ (لڑائی کے لئے) کوئی بات ٹھہراتے (کہ فلاں وقت لڑیں گے) تو (مقتضا حالتِ موجودہ کا یہ تھا کہ) ضرور اس تقرر کے بارہ میں تم میں اختلاف ہوتا (یعنی خواہ صرف مسلمانوں میں باہم کہ بوجہ بے سروسامانی کے کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا اور خواہ کفار کے ساتھ اختلاف ہوتا جس کی وجہ اس طرف کی بے سروسامانی اور اس طرف مسلمانوں کا رعب بہر حال دونوں طرح اس جنگ کی نوبت نہ آتی پس اس میں جو فوائد ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے جن کا بیان لِيَهْلِكَ میں آتا ہے) لیکن (اللہ تعالیٰ نے ایسا سامان کر دیا کہ اس کی نوبت نہیں آئی بلاقصد لڑائی ٹھن گئی) تا کہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے یعنی تا کہ (حق کا نشان ظاہر ہو جائے اور) جس کو برباد (یعنی گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو اور جس کو زندہ (یعنی ہدایت یافتہ) ہونا ہے وہ (بھی) نشان آئے پیچھے زندہ ہو (مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا لڑائی ہونا تا کہ ایک خاص طریق سے اسلام کا حق ہونا ظاہر ہو جائے کہ اس قلّتِ عدد و کم سامان پر مسلمان غالب آئے جو کہ خارق عادت ہے جس سے معلوم ہوا کہ اسلام حق ہے پس اس سے حجتِ الٰہیہ تام ہو گئی اس کے بعد جو گمراہ ہو گا وہ وضوحِ حق کے بعد ہو گا کہ جس میں عذاب کا پورا استحقاق ہو گیا اور عذر کی گنجائش ہی نہ رہی اسی طرح جس کو ہدایت ہونا ہو گا وہ حق کو قبول کر لے گا۔ خلاصہ حکمت کا یہ ہوا کہ حق واضح ہو جائے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں (کہ اس وضوح کے بعد زبان اور قلب سے کون کفر کرتا ہے اور کون ایمان لاتا ہے اور) وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب میں آپ کو وہ لوگ کم دکھلائے (چنانچہ آپ نے صحابہ کو اس

خواب کی خبر کی ان کے دل خوب قوی ہو گئے) اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ زیادہ کر کے دکھا دیتے (اور آپ صحابہ سے فرما دیتے تو (اے صحابہؓ) تمہاری ہمتیں ہار جاتیں اور اس امر (قتال) میں تم میں باہم نزاع (اور اختلاف) ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے (اس کم ہمتی اور اختلاف سے تم کو) بچا لیا بیشک وہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے (اس کو معلوم تھا کہ اس طرح ضعف پیدا ہوگا اس طرح قوت، اس لئے ایسی تدبیر کی) اور (صرف خواب ہی میں آپ کو کم دکھلانے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تمیم حکمت کے لئے بیداری میں مقابلہ کے وقت مسلمانوں کی نظر میں بھی کفار کم دکھلائی دیئے جیسا کہ بالعکس بھی ہوا جو کہ واقع کے مطابق بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ) اس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں جبکہ تم مقابل ہوئے ان لوگوں کو تمہاری نظر میں کم کر کے دکھلا رہے تھے اور (اسی طرح) ان کی نگاہ میں تم کو کم کر کے دکھلا رہے تھے تاکہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے (جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ الخ) اور سب مقدمے خدا ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے (وہ ہالک اور حی یعنی گمراہ اور مہتد کو سزا و جزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

غزوۂ بدر کفر و اسلام کا وہ پہلا معرکہ تھا جس نے ظاہری اور مادّی طور پر بھی اسلام کی برتری اور حقانیت کا ثبوت دیا اس لئے قرآن کریم نے اس کی تفصیلات بیان کرنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ آیاتِ متذکرہ میں اسی کا بیان ہے۔ جس کے ذکر میں بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے علاوہ ایک خاص مصلحت اس کا اظہار ہے کہ اس معرکہ میں ظاہری اور مادّی طور پر مسلمانوں کے فتح پانے کا کوئی امکان نہ تھا اور مشرکینِ مکہ کی شکست کا کوئی احتمال نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی غیبی قوت نے سارے ساز و سامان اور ظاہری اسباب کی کایا پلٹ دی۔ اسی واقعہ کی وضاحت کے لئے ان آیات میں غزوۂ بدر کے محاذِ جنگ کا پورا نقشہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے ان آیات کی تشریح سے پہلے چند الفاظ و لغات کی تشریح دیکھ لیجئے۔

عُدْوَة کے معنی ایک جانب کے آتے ہیں اور لفظ دنیا ادنی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قریب تر۔ آخرت کے مقابلہ میں اس جہان کو بھی دنیا اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عالمِ آخرت کی نسبت انسان کی طرف قریب تر ہے۔ اور لفظ **قُصوای** اقصیٰ سے بنا ہے اقصیٰ کے معنی ہیں بعید تر۔

بیالیسویں آیت میں ہلاکت اور اُس کے مقابلہ میں حیات کا ذکر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں سے موت و حیات کے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ معنوی موت و حیات یا ہلاکت و نجات مراد ہے۔ معنوی حیات اسلام و ایمان ہے اور موت شرک و کفر۔ قرآن کریم نے کئی جگہ یہ الفاظ اس معنی میں استعمال کئے۔ ایک جگہ ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال: ۲۴) یعنی اے ایمان والو تم کہا مانو اللہ و رسول کا جب تم کو وہ ایسی چیز کی طرف

بلائیں جس میں تمہاری حیات ہے۔ مراد حیات سے وہ حقیقی حیات اور دائمی راحت ہے جو ایمان و اسلام کے صلہ میں ملتی ہے۔ اب آیات کی تفسیر یہ ہوئی کہ:

بیالیسویں آیت میں غزوۂ بدر کے محاذِ جنگ کا نقشہ یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان عُدْوَہ دُنیا کے پاس تھے اور کفار عُدْوَہ قُصْوٰی کے پاس۔ مسلمانوں کا مقام اس میدان کے اس کنارہ پر تھا جو مدینہ سے قریب تھا اور کفار میدان کے دوسرے کنارے پر تھے جو مدینہ سے بعید تھا۔ اور ابوسفیان کا تجارتی قافلہ جس کی وجہ سے یہ جہاد کھڑا کیا گیا تھا وہ بھی مکہ سے آنے والے لشکر کفار سے قریب اور مسلمانوں کی زد سے باہر تین میل کے فاصلہ پر سمندر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اس نقشہ جنگ کے بیان سے مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنگی اعتبار سے مسلمان بالکل بے موقع غلط جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے دشمن پر قابو پانے کا بلکہ اپنی جان بچانے کا بھی کوئی امکان ظاہری اعتبار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس میدان کی وہ جانب جو مدینہ سے قریب تھی ایک ریتیلی زمین تھی جس میں چلنا بھی دُوبھر تھا۔ پھر پانی کی کوئی جگہ ان کے پاس نہ تھی۔ اور مدینہ سے بعید والی جانب جس پر کفار نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا وہ صاف زمین تھی اور پانی بھی وہاں سے قریب تھا۔

اور اس میدان کے دونوں کناروں کا پتہ دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ دونوں لشکر بالکل آمنے سامنے تھے کہ کسی کی طاقت یا ضعف دوسرے سے مخفی نہ رہ سکتا۔ نیز یہ بھی بتلا دیا کہ مشرکین مکہ کے لشکر کو یہ بھی اطمینان حاصل تھا کہ ہمارا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے نکل چکا ہے اب اگر ہمیں ضرورت پڑے تو وہ بھی ہماری امداد کر سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل مسلمان اپنی جگہ کے اعتبار سے بھی تکلیف و پریشانی میں تھے اور کہیں سے کمک ملنے کا بھی کوئی احتمال نہ تھا۔ اور یہ بات پہلے سے متعین اور ہر لکھے پڑھے آدمی کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی اور کفار کی تعداد ایک ہزار۔ مسلمانوں کے پاس نہ سواریوں کی تعداد کافی تھی اور نہ اسلحہ کی۔ اُس کے بالمقابل لشکرِ کفار ان سب چیزوں سے آراستہ تھا۔ نہ مسلمان اس جہاد میں کسی مسلح لشکر سے جنگ کی تیاری کر کے نکلے تھے۔ ہنگامی طور پر ایک تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے اور دشمن کی قوت کو پسپا کرنے کے خیال سے صرف تین سو تیرہ مسلمان بے سامانی کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے تھے اچانک غیر ارادی طور پر ایک ہزار جوانوں کے مسلح لشکر سے مقابلہ پڑ گیا۔

قرآن کی اس آیت نے بتلایا کہ لوگوں کی نظر میں یہ واقعہ اگرچہ ایک اتفاقی حادثہ کی صورت میں بلا ارادہ پیش آیا۔ لیکن دنیا میں جتنے اتفاقات غیر اختیاری صورت سے پیش آیا کرتے ہیں اُن کی سطح اور صورت اگرچہ محض اتفاقات کی ہوتی ہے لیکن خالقِ کائنات کی نظر میں وہ سب کے سب ایک مستحکم نظام کی لگی بندھی کڑیاں ہوتی ہیں اُن میں کوئی چیز بے ربط یا بے موقع نہیں ہوتی۔ جب وہ پورا نظام سامنے آجائے اُس وقت انسان کو پتہ لگ سکتا ہے کہ اس اتفاقی واقعہ میں کیا کیا حکمتیں مستور تھیں۔

غزوۂ بدر ہی کے واقعہ کو لے لیجئے اس کی اتفاقی اور غیر اختیاری صورت سے ظاہر ہونے میں یہ مصلحت تھی کہ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ یعنی اگر عام دنیا کی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی تمام پہلوؤں پر غور وفکر اور باہمی قراردادوں کے ذریعہ لڑی جاتی تو حالات کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جنگ ہوتی ہی نہیں بلکہ اس میں اختلاف پڑ جاتا خواہ اس طرح کہ خود مسلمانوں کی رائے اپنی قلت وکمزوری اور مقابل کی کثرت وقوت کو دیکھ کر مختلف ہوجاتی یا اس طرح کہ دونوں فریق اہل کفر واہل اسلام مقررہ وعدہ پر میدان میں نہ پہنچتے۔ مسلمان تو اپنی قلت وکمزوری کو دیکھ کر اقدام کی ہمت نہ کرتے اور کفار پر حق تعالیٰ نے مسلمانوں کا رعب جمایا ہوا تھا وہ کثرت وقوت کے باوجود مقابلہ پر آنے سے گھبراتے۔

اس لئے قدرت کے مستحکم نظام نے دونوں طرف ایسے حالات پیدا کردیئے کہ زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مکہ والوں کو تو ابوسفیان کے قافلے کی گھبرائی ہوئی فریاد نے ایک ہولناک صورت میں سامنے آکر بے سوچے سمجھے چلنے پر آمادہ کردیا۔ مسلمانوں کو اس خیال نے کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی جنگی مسلح لشکر نہیں۔ ایک معمولی تجارتی قافلہ ہے۔ مگر علیم وخبیر کو منظور یہ تھا کہ دونوں میں باقاعدہ جنگ ہوجائے تاکہ اس جنگ کے پیچھے جو نتائج فتح اسلام کے ظہور میں آنے والے ہیں وہ سامنے آجائیں۔ اسی لئے فرمایا وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا یعنی ان حالات کے باوجود جنگ اس لئے ہوکر رہی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام کرنا ہے اُس کی تکمیل کر دکھائے۔ اور وہ یہ تھا کہ ایک ہزار جوانوں کے مسلح باسامان لشکر کے مقابلہ میں تین سو تیرہ بے سروسامان فاقہ زدہ مسلمانوں کی ایک ٹولی اور وہ بھی محاذ جنگ کے اعتبار سے بے موقع جب اس پہاڑ سے ٹکراتی ہے تو یہ پہاڑ پاش پاش ہوجاتا ہے اور یہ چھوٹی سی جماعت فتح مند ہوتی ہے، جو کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہے کہ اس جماعت کی پیٹھ پر کوئی بڑی قدرت اور طاقت کام کررہی تھی جس سے یہ ایک ہزار کا لشکر محروم تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کی تائید اسلام کی وجہ سے اور اس کی محرومی کفر کی وجہ سے تھی۔ جس سے حق وباطل اور کھرے کھوٹے کا پورا امتیاز ہر سمجھدار انسان کے سامنے آگیا۔ اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا۔ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ یعنی واقعۂ بدر میں اسلام کی کھلی حقانیت اور کفر وشرک کے باطل ومردود ہونے کو اس لئے کھول دیا گیا کہ آئندہ جو ہلاکت میں پڑے وہ دیکھ بھال کر پڑے اور جو زندہ رہے وہ بھی دیکھ بھال کر رہے۔ اندھیرے اور مغالطہ میں کوئی کام نہ ہو۔

اس آیت کے الفاظ میں ہلاکت سے مراد کفر اور حیات وزندگی سے مراد اسلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق واضح ہوجانے کے بعد غلط فہمی کا احتمال اور عذر تو ختم ہوگیا اب جو کفر اختیار کرتا ہے وہ دیکھتی آنکھوں ہلاکت کی طرف جارہا ہے اور جو اسلام اختیار کرتا ہے وہ دیکھ بھال کر دائمی زندگی اختیار کررہا ہے۔ پھر فرمایا وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ خوب سننے والے جاننے والے ہیں کہ سب کے دلوں میں چھپے ہوئے کفر وایمان تک اُن کے سامنے ہیں اور ہر ایک کی سزا وجزا بھی۔

تینتالیسویں اور چوالیسویں دونوں آیتوں میں ایک خاص کرشمۂ قدرت کا ذکر ہے جو غزوۂ بدر کے میدان میں اس غرض کے لئے عمل میں لایا گیا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دونوں لشکروں میں سے کوئی بھی میدانِ جنگ چھوڑ کر اس جنگ کو ہی ختم کرڈالے کیونکہ اس جنگ کے نتیجہ میں مادّی حیثیت سے بھی حقانیتِ اسلام کا مظاہرہ کرنا مقدّر تھا۔

اور وہ کرشمۂ قدرت یہ تھا کہ لشکرِ کفار اگر چہ واقع میں مسلمانوں سے تین گنا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں کو اُن کی تعداد بہت کم کر کے دکھلائی۔ تاکہ مسلمانوں میں کمزوری اور اختلاف پیدا نہ ہوجائے۔ اور یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھلایا گیا آپ نے سب مسلمانوں سے بتلا دیا جس سے اُن کی ہمت بڑھ گئی۔ دوسری مرتبہ عین میدانِ جنگ میں جبکہ دونوں فریق آمنے سامنے کھڑے تھے مسلمانوں کو اُن کی تعداد کم دکھلائی گئی۔ آیت نمبر ۴۳ میں خواب کا واقعہ اور نمبر ۴۴ میں بیداری کا مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں اپنا مقابل لشکر ایسا نظر آرہا تھا کہ میں نے اپنے قریب کے ایک آدمی سے کہا کہ یہ لوگ نوّے آدمیوں کی تعداد میں ہوں گے۔ اُس شخص نے کہا کہ نہیں سو ہوں گے۔ [۱]

آخری آیت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے یُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی مقابل لشکر کی نظر میں کم کر کے دکھلایا۔ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد تو حقیقت ہی میں کم تھی وہ صحیح تعداد اُن کو دکھلا دی اور یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جتنی تعداد واقعی تھی اُس سے بھی کم کر کے دکھلایا گیا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کی تعداد تو اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی جن کی خوراک ایک اونٹ ہو۔ عرب میں کسی لشکر کی تعداد معلوم کرنے کے لئے اس سے اندازہ قائم کیا جاتا تھا کہ کتنے جانور ان کی خوراک کے لئے ذبح ہوتے ہیں، ایک اونٹ سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میدانِ بدر میں وہاں کے کچھ لوگوں سے قریشِ مکہ کے لشکر کا پتہ چلانے کے لئے پوچھا تھا کہ ان کے لشکر میں روزانہ کتنے اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں تو آپ کو دس اونٹ روزانہ بتلائے گئے جس سے آپ نے ایک ہزار لشکر کا تخمینہ قائم فرمایا۔ [۲]

خلاصہ یہ ہے کہ ابوجہل کی نظر میں مسلمان کُل سو آدمی کی تعداد میں دکھلائے گئے۔ یہاں بھی کم کر کے دکھلانے میں یہ حکمت تھی کہ مشرکین کے قلوب پر مسلمانوں کا رُعب پہلے ہی نہ چھا جائے جس کی وجہ سے وہ میدان چھوڑ بھاگیں۔

فائدہ

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات معجزہ اور خرقِ عادت کے طور پر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنکھوں کا مشاہدہ غلط ہوجائے، جیسا یہاں ہوا۔

[۱] المعجم الكبير للطبراني بألفاظ مختلفة رقم الحديث:١٠١١٧ [۲] دلائل النبوة للبيهقيّ رقم الحديث:٩٢١، ورقم الحديث:٨٩٠

اسی لئے اس جگہ دوبارہ فرمایا لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا یعنی یہ کرشمہ قدرت اور آنکھوں کے مشاہدات پر تصرف اس لئے ظاہر کیا گیا کہ جو کام اللہ تعالیٰ کرنا چاہتے ہیں وہ پورا ہو جائے۔ یعنی مسلمانوں کو قلت و بے سامانی کے باوجود فتح دے کر اسلام کی حقانیت اور تائید غیبی کا اظہار جو اس جنگ سے مقصود تھا وہ پورا کر دکھائے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ یعنی آخر کار سب کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتے ہیں جو چاہے کرے جو چاہے حکم دے۔ قلّت کو کثرت پر قوّت کو ضعف پر غلبہ دے دے کم کو زیادہ، زیادہ کو کم کر دے۔ مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

گر تو خواہی عینِ غم شادی شود — عین بند پائے آزادی شود
چوں تو خواہی آتش آب خوش شود — ور تو خواہی آب ہم آتش شود
خاک و باد و آب و آتش بندہ اند — بامن و تو مردہ باحق زندہ اند [1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا

اے ایمان والو جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو

لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا

تاکہ تم مراد پاؤ۔ اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامرد ہو جاؤ گے

وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا

اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو، بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے اور نہ ہو جاؤ

كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ

اُن جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اِتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھانے کو اور روکتے تھے

---

[1] ترجمہ: اگر تو چاہے تو عینِ غم بھی خوشی ہو جائے، بالکل قید بھی آزادی ہو جائے، جب تو چاہے تو آگ خوشگوار پانی ہو جائے، اور اگر تو چاہے تو پانی بھی آگ ہو جائے، مٹی، ہوا، پانی اور آگ غلام ہیں میرے اور تیرے اعتبار سے مردہ ہیں لیکن اللہ کے نزدیک زندہ ہیں۔

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

اللہ کی راہ سے، اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب تمہارا کسی گروہ سے مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو، اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو، تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو ﴿۴۵﴾ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اور صبر سے کام لو۔ یقین رکھو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۴۶﴾ اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے، اور لوگوں کو اپنی شان دِکھاتے ہوئے نکلے تھے، اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روک رہے تھے۔ اور اللہ نے لوگوں کے سارے اعمال کو (اپنے علم کے) احاطے میں لیا ہوا ہے۔ ﴿۴۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب تم کو (کفار کی کسی) جماعت سے (جہاد میں) مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو (ان آداب کا لحاظ رکھو ایک یہ کہ) ثابت قدم رہو (بھاگو مت) اور (دوسرے یہ کہ) اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو (کہ ذکر سے قلب میں قوت ہوتی ہے) امید ہے کہ تم (مقابلہ میں) کامیاب ہو (کیونکہ ثباتِ قدم اور ثباتِ قلب جب جمع ہوں تو کامیابی غالب ہے) اور (تیسرے یہ کہ تمام امور متعلقہ حرب میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (کا لحاظ) کیا کرو (کہ کوئی کارروائی خلافِ شرع نہ ہو) اور (چوتھے یہ کہ اپنے امام سے اور باہم بھی) نزاع مت کرو ورنہ (باہمی نااتفاقی سے) کم ہمت ہو جاؤ گے (کیونکہ قوتیں منتشر ہو جائیں گی ایک کو دوسرے پر وثوق نہ ہوگا اور اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (ہوا خیزی سے مراد بد رعبی ہے کیونکہ دوسروں کو اس نااتفاقی کی اطلاع ہونے سے یہ امر لازمی ہے) اور (پانچویں یہ کہ اگر کوئی امر ناگواری کا پیش آئے تو اس پر) صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (اور معیتِ الٰہی موجبِ نصرت ہے) اور (چھٹے یہ کہ نیت خالص رکھو تفاخر اور نمائش میں) ان (کافر) لوگوں کے مشابہ مت ہونا کہ جو (اسی واقعۂ بدر میں) اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنی شان و سامان) دکھلاتے ہوئے نکلے اور (اس فخر و ریا کے ساتھ یہ بھی نیت تھی کہ) لوگوں کو اللہ کے رستہ (یعنی دین) سے روکتے تھے (کیونکہ مسلمانوں کو زک دینے چلے تھے جس کا اثر عام طبائع پر بھی دین سے بُعد ہوتا) اور اللہ تعالیٰ (ان لوگوں کو پوری سزا دے گا چنانچہ وہ) ان کے اعمال کو (اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

معارف ومسائل

جنگ وجہاد میں کامیابی کے لئے قرآنی ہدایات

پہلی دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو میدانِ جنگ اور مقابلہ دُشمن کے لئے ایک خاص ہدایت نامہ دیا ہے جو اُن کے لئے دنیا میں کامیابی اور فتح مندی کا اور آخرت کی نجات وفلاح کا نسخۂ اکسیر ہے اور قرونِ اُولیٰ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں کی فوق العادت کامیابیوں اور فتوحات کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اور وہ چند چیزیں ہیں:

اوّل ثبات یعنی ثابت رہنا اور جمنا۔ جس میں ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم دونوں داخل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط اور ثابت نہ ہو اُس کا قدم اور اعضاء ثابت نہیں رہ سکتے اور یہ چیز ایسی ہے جس کو ہر مؤمن وکافر جانتا اور سمجھتا ہے اور دنیا کی ہر قوم اپنی جنگوں میں اس کا اہتمام کرتی ہے۔ کیونکہ اہلِ تجربہ سے مخفی نہیں کہ میدانِ جنگ کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار ثبات قلب وقدم ہی ہے دوسرے سارے ہتھیار اس کے بغیر بیکار ہیں۔

دوسرے ذکر اللہ یہ وہ مخصوص اور معنوی ہتھیار ہے جس سے مؤمن کے سوا عام دنیا غافل ہے پوری دنیا جنگ کے لئے بہترین اسلحہ اور نئے سے نیا سامان مہیا کرنے اور فوج کے ثابت قدم رکھنے کی تو پوری تدبیریں کرتی ہے، مگر مسلمانوں کے اس روحانی اور معنوی ہتھیار سے بے خبر اور نا آشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر میدان میں جہاں مسلمانوں کا مقابلہ ان ہدایات کے مطابق کسی قوم سے ہوا مخالف کی پوری طاقت اور اسلحہ اور سامان کو بیکار کردیا، ذکر اللہ کی اپنی ذاتی اور معنوی برکات تو اپنی جگہ ہیں ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ثباتِ قدم کا اس سے بہتر کوئی نسخہ بھی نہیں، اللہ کی یاد اور اس پر اعتماد وہ بجلی کی طاقت ہے جو ایک انسان ضعیف کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے پر آمادہ کردیتی ہے اور کیسی ہی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ کی یاد سب کو ہوا میں اُڑا دیتی ہے اور انسان کے قلب کو مضبوط اور قدم کو ثابت رکھتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھئے کہ جنگ وقتال کا وقت عادۃً ایسا وقت ہوتا ہے کہ اُس میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا اپنی فکر پڑی ہوتی ہے۔ اسی لئے جاہلیتِ عرب کے شعراء میدانِ جنگ میں بھی اپنے محبوب کو یاد کرنے پر فخر کیا کرتے ہیں کہ وہ بڑی قوّتِ قلب اور محبت کی پختگی کی دلیل ہے ایک جاہلی شاعر نے کہا ہے۔ ذَكَرْتُكَ وَالْخَطِّيُّ يَخْطُرُ بَيْنَنَا۔ یعنی میں نے تجھے اُس وقت بھی یاد کیا جبکہ نیزے ہمارے درمیان لچک رہے تھے۔

قرآن کریم نے اس پُرخطر موقع میں مسلمانوں کو ذکر اللہ کی تلقین فرمائی اور وہ بھی كَثِيْرًا کی تاکید کے ساتھ۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پورے قرآن میں ذکر اللہ کے سوا کسی عبادت کو کثرت سے کرنے کا حکم نہیں صَلٰوةً كَثِيْرًا صِيَامًا كَثِيْرًا کہیں مذکور نہیں۔ سبب یہ ہے کہ ذکر اللہ ایک ایسی آسان عبادت ہے کہ اُس میں نہ کوئی بڑا

وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت نہ کسی دوسرے کام میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُس پر مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ذکر اللہ کے لئے کوئی شرط اور پابندی، وضو، طہارت، لباس اور قبلہ وغیرہ کی بھی نہیں لگائی ہر شخص ہر حال میں باوضو، بے وضو، کھڑے، بیٹھے، لیٹے کر سکتا ہے اور اُس پر اگر امام جزریؒ کی اس تحقیق کا اضافہ کر لیا جائے جو انہوں نے حصن حصین میں لکھی ہے کہ ذکر اللہ صرف زبان یا دل سے ذکر کرنے ہی کو نہیں کہتے بلکہ ہر جائز کام جو اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں رہ کر کیا جائے وہ بھی ذکر اللہ ہے۔ تو اس تحقیق پر ذکر اللہ کا مفہوم اس قدر عام اور آسان ہو جاتا ہے کہ سوتے ہوئے بھی انسان کو ذاکر کہہ سکتے ہیں۔ جیسے بعض روایات میں ہے نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ [1] یعنی عالم کی نیند بھی عبادت میں داخل ہے کیونکہ عالم جو اپنے علم کے مقتضی پر عمل کرتا ہو اُس کے لئے یہ لازم ہے کہ اُس کا سونا اور جاگنا سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کے دائرہ میں ہو۔

میدانِ جنگ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اگرچہ بظاہر مجاہدین کے لئے ایک کام کا اضافہ نظر آتا ہے جو عادۃً مشقت و محنت کو چاہتا ہے۔ لیکن ذکر اللہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ محنت نہیں لیتا بلکہ ایک فرحت وقوت اور لذّت بخشتا ہے اور انسان کے کام میں اور معین و مددگار بنتا ہے۔ یوں بھی محنت و مشقت کے کام کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کلمہ یا گیت گنگنایا کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اُس کا نعم البدل دے دیا جو ہزاروں فوائد اور حکمتوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٤٥﴾ یعنی اگر تم نے ثبات اور ذکر اللہ کے دو گُر یاد کر لئے اور ان کو میدانِ جنگ میں استعمال کیا تو فلاح و کامیابی تمہاری ہے۔

میدانِ جنگ کا ذکر ایک تو وہ ہے جو عام طور پر نعرۂ تکبیر کے انداز میں کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر نظر اور اعتماد و توکل اور دل سے اُس کی یاد۔ لفظ ذکر اللہ ان سب کو شامل ہے۔

چھیالیسویں آیت میں ایک تیسری چیز کی تلقین اور کی گئی وہ ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت اس کی اطاعت ہی کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، معصیت اور نافرمانی تو اللہ کی ناراضی اور ہر فضل سے محرومی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اس طرح میدانِ جنگ کے لئے قرآنی ہدایت نامہ کی تین دفعات ہو گئیں ثبات، ذکر اللہ، اطاعت۔ اس کے بعد فرمایا وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اس میں مضر پہلوؤں پر تنبیہ کر کے اُن سے بچنے کی ہدایت ہے۔ اور وہ مضر پہلو جو جنگ کی کامیابی میں مانع ہوتا ہے باہمی نزاع واختلاف ہے۔ اس لئے فرمایا وَلَا تَنَازَعُوْا یعنی آپس میں نزاع اور کشاکش نہ کرو۔ ورنہ تم میں بزدلی پھیل جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

---

[1] کشف الخفاء رقم الحدیث: ۲۸۳۹ ج:۲ ص:۳۲۵

اس میں باہمی نزاع کے دو نتیجے بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی دشمن کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے باہمی کشاکش اور نزاع سے دوسروں کی نظر میں حقیر ہو جانا تو بدیہی امر ہے لیکن خود اپنی قوت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے کہ اُس میں کمزوری اور بزدلی آجائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی اتحاد و اعتماد کی صورت میں ہر ایک انسان کے ساتھ پوری جماعت کی طاقت لگی ہوئی ہوتی ہے اس لئے ایک آدمی اپنے اندر بقدر اپنی جماعت کے قوت محسوس کرتا ہے اور جب باہمی اتحاد و اعتماد نہ رہا تو اس کی اکیلی قوت رہ گئی وہ ظاہر ہے جنگ و قتال کے میدان میں کوئی چیز نہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاصْبِرُوْا ۭ یعنی صبر کو لازم پکڑو۔ سیاقِ کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتلایا گیا ہے اور بیان اس کا یہ ہے کہ کوئی جماعت کتنی ہی متحد الخیال اور متحد المقصد ہو مگر افرادِ انسانی کی طبعی خصوصیات ضرور مختلف ہوا کرتی ہیں، نیز کسی مقصد کے لئے سعی و کوشش میں اہل عقل و تجربہ کی رایوں کا اختلاف بھی ناگزیر ہے۔ اس لئے دوسروں کے ساتھ چلنے اور اُن کو ساتھ رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آدمی خلافِ طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا عادی ہو اور اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اُس کو قبول نہ کیا جائے تو لڑ بیٹھے۔ اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔ آج کل یہ تو ہر شخص جانتا اور کہتا ہے کہ آپس کا نزاع بہت بُری چیز ہے مگر اُس سے بچنے کا جو گُر ہے کہ آدمی خلافِ طبع امور پر صبر کرنے کا خوگر بنے اپنی بات منوانے اور چلانے کی فکر میں نہ پڑے، یہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اسی لئے اتحاد و اتفاق کے سارے وعظ و پند بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں، آدمی کو دوسرے سے اپنی بات منوانے پر قدرت نہیں ہوتی مگر خود دوسرے کی بات مان لینا اور اگر اُس کی عقل و دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ اُس کو نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لئے سکوت کر لینا تو بہر حال اختیار میں ہے اس لئے قرآن کریم نے نزاع سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی ہر فرد جماعت کو کر دی تا کہ نزاع سے بچنا عملی دنیا میں آسان ہو جائے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآنِ کریم نے اس جگہ لَا تَنَازَعُوْا فرمایا ہے یعنی باہمی کشاکش کو روکا ہے رائے کے اختلاف یا اُس کے اظہار سے منع نہیں کیا۔ اختلاف رائے جو دیانت اور اخلاص کے ساتھ ہو وہ کبھی نزاع کی صورت اختیار نہیں کیا کرتا۔ نزاع و جدال وہیں ہوتا ہے جہاں اختلاف رائے کے ساتھ اپنی بات منوانے اور دوسرے کی بات نہ ماننے کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس کو قرآن کریم نے وَاصْبِرُوْا ۭ کے لفظ سے ختم کیا ہے اور آخر میں صبر کرنے کا ایک عظیم الشان فائدہ بتلا کر صبر کی تلخی کو دور فرما دیا۔ ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶ یعنی صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر حال میں ان کا رفیق ہوتا ہے اور یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ دونوں جہان کی ساری دولتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں انہیں ہدایات کو مستحضر کرانے کے لئے عین میدانِ جنگ میں یہ خطبہ دیا "اے لوگو دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور جب ناگزیر طور پر مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر صبر و ثبات کو لازم پکڑو اور یہ سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔" (مسلم) [۱]

سینتالیسویں آیت میں ایک اور مضر پہلو پر تنبیہ اور اُس سے پرہیز کی ہدایت دی گئی ہے وہ ہے اپنی قوت و کثرت پر نازیا کام میں اخلاص کے بجائے اپنی کوئی اور غرض مضمر ہونا کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی بڑی بڑی طاقتور جماعتوں کو پسپا اور زیر کر دیا کرتی ہیں۔

اس آیت میں اشارہ قریش مکہ کے حالات کی طرف بھی ہے جو اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے بھاری تعداد اور سامان لے کر اپنی قوت و کثرت پر اتراتے ہوئے نکلے تھے۔ اور جب تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے باہر ہو گیا اُس وقت بھی اس لئے واپس نہیں ہوئے کہ اپنی شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرنا تھا۔

مستند روایات میں ہے کہ جب ابوسفیان اپنا تجارتی قافلہ لے کر مسلمانوں کی زد سے بچ نکلے تو ابوجہل کے پاس قاصد بھیجا کہ اب تمہارے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں رہی واپس آجاؤ اور بھی بہت سے قریش سرداروں کی یہی رائے تھی۔ مگر ابوجہل اپنے کبر و غرور اور شہرت پرستی کے جذبہ میں قسم کھا بیٹھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک چند روز مقامِ بدر پر پہنچ کر اپنی فتح کا جشن نہ منا لیں۔

جس کے نتیجہ میں وہ اور اُس کے بڑے بڑے ساتھی سب وہیں ڈھیر ہوئے اور ایک گڑھے میں ڈالے گئے۔ [۲]

اس آیت میں مسلمانوں کو ان کے طریقہ کار سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ

اور جس وقت خوشنما کر دیا شیطان نے اُن کی نظروں میں اُن کے عملوں کو اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن

مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ

لوگوں میں سے اور میں تمہارا حمایتی ہوں، پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ اُلٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر

---

[۱] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب كراهة تمني لقاء العدو إلخ ج:۲ ص:۸۴

[۲] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۷۲

وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ

اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں ڈرتا ہوں اللہ سے،

وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ ع اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ

اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔ جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں

مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ

بیماری ہے یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر، اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ

عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۹﴾

زبردست ہے حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہ وقت (بھی قابلِ ذکر ہے) جب شیطان نے ان (کافروں) کو یہ سمجھایا تھا کہ ان کے اعمال بڑے خوشنما ہیں، اور یہ کہا تھا کہ: ''آج انسانوں میں کوئی نہیں ہے جو تم پر غالب آسکے، اور میں تمہارا محافظ ہوں۔'' پھر جب دونوں گروہ آمنے سامنے آئے تو وہ ایڑیوں کے بل پیچھے ہٹا، اور کہنے لگا: ''میں تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا، مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے، وہ تمہیں نظر نہیں آرہا۔ مجھے اللہ سے ڈر لگ رہا ہے، اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔'' ﴿۴۸﴾ اور یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دِلوں میں روگ تھا، یہ کہہ رہے تھے کہ: ''ان (مسلمانوں) کو اِن کے دِین نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔'' حالانکہ جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ سب پر غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے ﴿۴۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جبکہ شیطان نے ان (کفار) کو (بذریعہ وسوسہ) ان کے اعمال (کفریہ عداوت ومخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) خوشنما کر کے دکھلائے (کہ انہوں نے ان باتوں کو اچھا سمجھا) اور (وسوسہ

سے بڑھ کر یہ کیا کہ بالمشافہ ان سے) کہا کہ (تم کو وہ قوت وشوکت ہے کہ تمہارے مخالف) لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں (نہ بیرونی دشمنوں سے ڈرو اور نہ اندرونی دشمنوں سے اندیشہ کرو) پھر جب دونوں جماعتیں (کفار و مسلمین کی) ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئیں (اور اس نے ملائکہ کا نزول دیکھا) تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں (میں حامی وامی کچھ نہیں بنتا کیونکہ) میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں (مراد فرشتے ہیں) میں تو خدا سے ڈرتا ہوں (کبھی کسی فرشتہ سے دنیا ہی میں میری خبر لوا دے) اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب منافقین (مدینہ والوں میں سے) اور جن کے دلوں میں (شک کی) بیماری تھی (مکہ والوں میں سے مسلمانوں کا بے سروسامانی کے ساتھ مقابلۂ کفار میں آجانا دیکھ کر) یوں کہتے تھے کہ ان (مسلمان) لوگوں کو ان کے دین نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ اپنے دین کے حق ہونے کے بھروسے ایسے خطرہ میں آپڑے۔ اللہ جواب دیتے ہیں) اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو (وہ اکثر غالب ہی آتا ہے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (اس لئے اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے کو غالب کر دیتے ہیں اور احیاناً ایسا شخص مغلوب ہو جائے تو اس میں کچھ مصلحت ہوتی ہے کیونکہ) وہ حکمت والے (بھی) ہیں (غرض ظاہری سامان و بے سامانی پر مدار نہیں قادر کوئی اور ہی ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انفال میں شروع سے غزوۂ بدر میں پیش آنے والے واقعات اور حالات کا اور اُن سے حاصل ہونی والی نصائح اور عبرتوں کا اور متعلقہ اَحکام کا بیان چل رہا ہے۔

اسی میں ایک واقعہ قریشِ مکہ کو شیطان کے فریب دے کر مسلمانوں کے مقابلہ پر اُبھارنے اور پھر عین میدانِ جنگ میں ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانے کا ہے جو آیاتِ مذکورہ کے شروع میں مذکور ہے۔

شیطان کا یہ فریب قریش کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی صورت سے تھا یا انسانی شکل میں آکر رو برو گفتگو سے۔ اس میں دونوں احتمال ہیں مگر الفاظ قرآن سے زیادہ تر تائید دوسری ہی صورت کی ہوتی ہے کہ بشکلِ انسانی سامنے آکر فریب دیا۔

امام ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب قریش مکہ کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکہ سے نکلا تو ان کے دلوں پر ایک خطرہ اس کا سوار تھا کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنو بکر بھی ہمارا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کے مقابلہ پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقع پا کر ہمارے گھروں اور عورتوں، بچوں پر چھاپہ

مار دے۔ امیر قافلہ ابوسفیان کی گھبرائی ہوئی فریاد پر تیار ہو کر نکل تو کھڑے ہوئے مگر یہ خطرہ ان کے لئے زنجیر پا بنا ہوا تھا کہ اچانک شیطان سراقہ بن مالک کی صورت میں اس طرح سامنے آیا کہ اُس کے ہاتھ میں جھنڈا اور اُس کے ساتھ ایک دستہ بہادر فوج کا ہے۔ سراقہ بن مالک اُس علاقہ اور قبیلہ کا بڑا سردار تھا جن سے حملہ کا خطرہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر قریشی جوانوں کے لشکر سے خطاب کیا اور دو طرح سے فریب میں مبتلا کیا۔ اوّل یہ کہ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ یعنی آج تمام لوگوں میں تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہارے مقابل فریق کی قوت کا بھی اندازہ ہے اور تمہاری قوت وکثرت کو بھی دیکھ رہا ہوں اس لئے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بے فکر ہو کر آگے بڑھو تم ہی غالب رہو گے کوئی تمہارے مقابلہ پر غالب آنے والا نہیں۔

دوسرے یہ کہ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ یعنی تمہیں جو بنی بکر وغیرہ سے خطرہ لگا ہوا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے مکہ پر چڑھ دوڑیں گے۔ اس کی میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا میں تمہارا حامی ہوں۔ قریش مکہ سراقہ بن مالک اور اُس کی بڑی شخصیت اور اثر ورسوخ سے پہلے سے واقف تھے، اُس کی بات سن کر ان کے دل جم گئے اور قبیلہ بنی بکر کے خطرہ سے بے فکر ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ [1]

اس دوگونہ فریب سے شیطان نے ان لوگوں کو اپنے مقتل کی طرف ہانک دیا۔ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ، جب مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کی دونوں جماعتیں (مقامِ بدر میں) آمنے سامنے ہوئیں تو شیطان پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔

غزوۂ بدر میں چونکہ مشرکین مکہ کی پیٹھ پر ایک شیطانی لشکر بھی آ گیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے مقابلہ میں فرشتوں کا لشکر جبرئیل ومیکائیل کی قیادت میں بھیج دیا۔ امام ابن جریرؒ وغیرہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ شیطان نے جو اُس وقت بشکل انسانی سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنے شیطانی لشکر کی قیادت کر رہا تھا، جب جبریل امین اور اُن کے ساتھ فرشتوں کا لشکر دیکھا تو گھبرا اُٹھا اُس وقت اُس کا ہاتھ ایک قریشی جوان حارث بن ہشام کے ہاتھ میں تھا فوراً اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ حارث نے ٹوکا کہ یہ کیا کرتے ہو تو اُس کے سینہ پر مار کر حارث کو گرا دیا۔ اور اپنے شیطانی لشکر کو لے کر بھاگ پڑا۔ حارث نے اُس کو سراقہ سمجھتے ہوئے کہا کہ اے عرب کے سردار سراقہ تو نے تو یہ کہا تھا کہ میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں اور عین میدانِ جنگ میں یہ حرکت کر رہے ہو۔ تو شیطان نے بشکل سراقہ جواب دیا۔ [2] اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ یعنی میں تمہارے معاہدہ سے بَری ہوتا

---

[1] تفسیر الطبری تحت هذه الآیة رقم الحدیث: ۱۶۱۸۳، ۱۶۱۸۵

[2] تفسیر الطبری تحت هذه الآیة رقم الحدیث: ۱۶۱۸۳

ہوں کیونکہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تمہاری آنکھیں نہیں دیکھتیں، مراد فرشتوں کا لشکر تھا۔ اور یہ کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اس لئے تمہارا ساتھ چھوڑتا ہوں۔

شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا تو اُن کی قوت سے وہ واقف تھا، سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں۔ اور یہ جو کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ امامِ تفسیر قتادہؒ نے کہا کہ یہ اس نے جھوٹ بولا، اگر وہ خدا سے ڈرا کرتا تو نافرمانی کیوں کرتا۔ مگر اکثر حضرات نے فرمایا کہ ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور عذابِ شدید کو پوری طرح جانتا ہے، اس لئے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ نرا خوف بغیر ایمان و اطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

ابوجہل نے جب سراقہ اور اُس کے لشکر کی پسپائی سے اپنے لشکر کی ہمت کو ٹوٹتے دیکھا تو بات بنائی اور کہا کہ سراقہ کے بھاگ جانے سے تم متاثر نہ ہو اس نے تو خفیہ طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سازش کر رکھی تھی۔ شیطان کی پسپائی کے بعد ان کا جو حشر ہونا تھا ہوگیا۔ پھر جب یہ لوگ مکہ واپس آئے اور ان میں سے کسی کی ملاقات سراقہ بن مالک کے ساتھ ہوئی تو اُس نے سراقہ کو ملامت کی کہ جنگِ بدر میں ہماری شکست اور سارے نقصان کی ذمہ داری تجھ پر ہے تو نے عین میدانِ جنگ میں پسپا ہو کر ہمارے جوانوں کی ہمت توڑ دی۔ اس نے کہا کہ میں نہ تمہارے ساتھ گیا نہ تمہارے کسی کام میں شریک ہوا۔ میں نے تو تمہاری شکست کی خبر بھی تمہارے مکہ پہنچنے کے بعد سنی۔

یہ سب روایات امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان لعین کی یہ عام عادت ہے کہ انسان کو بُرائی میں مبتلا کر کے عین موقع پر الگ ہو جاتا ہے قرآن کریم نے اس کی یہ عادت بار بار بیان فرمائی ہے، ایک آیت میں ہے كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْۤءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ (الحشر) [۱] [۲]

شیطانی دجل و فریب اور اس سے بچنے کا طریقہ

آیتِ متذکرہ کے اس واقعہ سے چند فوائد حاصل ہوئے:

اوّل یہ کہ شیطان انسان کا دشمن ہے اُس کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کے حیلے کرتا اور بہروپ بدلتا ہے۔ بعض اوقات محض دل میں وسوسہ ڈال کر پریشان کرتا ہے اور بعض اوقات سامنے آ کر دھوکا دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدرت دی ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایک مشہور حنفی فقیہ کی کتاب ''آکام المرجان فی اَحکام الجان'' میں اس کو بوضاحت ثابت کیا گیا ہے۔ اسی لئے محققین صوفیائے کرام جو اصحابِ کشف و شہود ہیں اُنہوں نے لوگوں کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ کسی شخص کو دیکھ کر یا اس کا کلام سن کر بغیر تحقیقِ حال کے

---

[۱] ترجمہ: شیطان کی سی مثال ہے کہ انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہو جا پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، میں تو اللہ رب العلمین سے ڈرتا ہوں۔

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۴ ص:۷۳، ۷۴

اس کے پیچھے چلنا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کشف والہام میں بھی شیطانی تلبیسات ہوسکتی ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ست ۔۔۔ پس بہر دستے نشاید داد دست [1]

اور حافظؒ نے فرمایا۔

در راہِ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست ۔۔۔ ہشدار وگوش را بہ پیامِ سروش دار [2]

پیامِ سروش سے مراد وحی الٰہی ہے۔

کامیابی کے لئے صرف اخلاصِ نیت ہی کافی نہیں اس سے پہلے راستہ سیدھا ہونا ضروری ہے

تیسرے یہ کہ جو لوگ کفر و شرک یا دوسرے ناجائز اعمال میں مبتلا ہوتے ہیں اُس کا بیشتر سبب یہی ہوتا ہے کہ شیطان ان کے اعمالِ بد کو خوبصورت مستحسن اور نفع بخش ظاہر کر کے ان کے دل و دماغ کو حق وصدق اور صحیح نتائج کی طرف سے پھیر دیتا ہے وہ اپنے باطل ہی کو حق اور بُرے کو بھلا سمجھنے لگتے ہیں اور اہلِ حق کی طرح اپنے باطل پر جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے قریشی لشکر اور اس کے سردار جب بیت اللہ سے رُخصت ہو رہے تھے تو بیت اللہ کے سامنے ان الفاظ سے دُعا کر کے چلے تھے کہ اَللّٰهُمَّ انْصُرْ اَهْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ یعنی اے اللہ ہم دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اس کی مدد فرمایئے اور فتح دیجئے۔ یہ بے خبر لوگ شیطانی فریب میں آ کر اپنے آپ ہی کو زیادہ ہدایت پر اور حق بجانب سمجھتے تھے، اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنے باطل کی حمایت ونصرت میں جان مال قربان کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ نرا اخلاص کافی نہیں جب تک کہ عمل کا رُخ درست نہ ہو۔

اس کے بعد کی دوسری آیت میں منافقینِ مدینہ اور مشرکینِ مکہ کا ایک مشترکہ مقولہ مسلمانوں کے بارہ میں نقل کیا جو گویا ان پر ترس کھا کر کہا گیا ہے کہ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۚ یعنی میدانِ بدر میں یہ مٹھی بھر مسلمان اتنے بھاری اور قوی لشکر سے ٹکرانے آگئے ان بے چاروں کو ان کے دین نے فریب میں ڈال کر موت کے منہ میں دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٩﴾ یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کر لیتا ہے تو یاد رکھو کہ وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اُس کی حکمت کے سامنے سب کی عقل و دانش رکھی رہ جاتی ہے۔

---

[1] ترجمہ: بہت سے شیطان انسانوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا چاہئے۔

[2] ترجمہ: عشق کے راستے میں باطل کے وسوسے بہت ہیں، خبردار، وحی کے پیغام کی طرف کان لگائے رکھ۔

مطلب یہ ہے کہ تم لوگ صرف مادہ اور مادیات کو جاننے والے اور اُسی پر بھروسہ کرنے والے ہو تمہیں اُس مخفی طاقت کی خبر نہیں جو اس مادہ کے پیدا کرنے والے کے خزانوں میں ہے اور جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتماد رکھتے ہیں۔

آج بھی دیندار اور بھولے بھالے مسلمانوں کو دیکھ کر بہت سے عقل و دانش کے مدعی یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

لیکن اگر ان میں اللہ پر ایمان اور اعتماد پورا ہو تو اُنہیں اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ

اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے مارتے ہیں اُن کے منہ پر

وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ

اور ان کے پیچھے، اور کہتے ہیں چکھو عذاب جلنے کا۔ یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ

اور اس واسطے کہ اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر۔ جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو

مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ

ان سے پہلے تھے، کہ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے سو پکڑا اُن کو اللہ نے ان کے گناہوں پر، بیشک اللہ زور آور ہے

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ

سخت عذاب کرنے والا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم کو

حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ۙ

جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے جیوں کی بات اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر تم دیکھتے (تو وہ عجیب منظر تھا) جب فرشتے ان کافروں کی روح قبض کر رہے تھے، اُن کے چہروں اور پشت پر مارتے جاتے تھے، (اور کہتے جاتے تھے کہ:) ''اب جلنے کے عذاب کا مزہ (بھی) چکھنا ﴿۵۰﴾ یہ سب کچھ اُن اعمال کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیج رکھے تھے، اور یہ بات طے ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔'' ﴿۵۱﴾ (ان لوگوں کا حال ایسا ہی ہوا) جیسا فرعون کی قوم اور ان سے پہلے لوگوں کا حال ہوا تھا۔ انہوں نے اللہ کی نشانیوں کو ماننے سے انکار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ یقیناً اللہ کی طاقت بڑی ہے (اور) عذاب بڑا سخت! ﴿۵۲﴾ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ اُس نے جو نعمت کسی قوم کو دی ہو، اُسے اُس وقت تک بدلنا گوارا نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت تبدیل نہ کرلیں، اور اللہ ہر بات سنتا، سب کچھ جانتا ہے ﴿۵۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اگر آپ (اس وقت کا واقعہ) دیکھیں (تو عجیب واقعہ نظر آئے) جبکہ فرشتے ان (موجودہ) کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہیں (اور) ان کے منہ پر اور ان کی پشتوں پر مارتے جاتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں کہ (ابھی کیا ہے آگے چل کر) آگ کی سزا جھیلنا (اور) یہ عذاب ان اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں (سو اللہ تعالیٰ نے بے جرم سزا نہیں دی پس) ان کی حالت (اس بارہ میں کہ کفر پر سزایاب ہوئے) ایسی ہے جیسی فرعون والوں کی اور ان سے پہلے (کافر) لوگوں کی حالت تھی کہ انہوں نے آیاتِ الٰہیہ کا انکار کیا سو خدا تعالیٰ نے ان کے (ان) گناہوں پر ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے سخت سزا دینے والے ہیں (کہ ان کے مقابلہ میں کوئی ایسی قوت نہیں کہ ان کے عذاب کو ہٹا سکے اور) یہ بات (کہ بلا جرم ہم سزا نہیں دیتے) اس سبب سے ہے (کہ ہمارا ایک قاعدہ کلیہ مقرر ہے اور بلا جرم سزا نہ دینا اسی قاعدہ کی ایک فرع ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہیں بدل ڈالتے اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے جاننے والے ہیں (پس وہ تغیر قولی کو سنتے ہیں تغیر فعلی کو جانتے ہیں۔ سو ان کفار موجودین نے اپنی یہ حالت بدلی کہ ان میں باوجود کفر کے اوّل ایمان لانے کی استعداد قریب تھی انکار و مخالفت کر کر کے اس کو بعید کر ڈالا پس ہم نے اپنی نعمت امہال کو جو پہلے سے ان کو حاصل تھی مبدل بدار و گیر کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے بطریقِ مذکور نعمت قرب استعداد کو بدل ڈالا)۔

معارف ومسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی دو آیتوں میں موت کے وقت کافروں کے عذاب اور فرشتوں کی تنبیہات کا ذکر ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کافروں کا حال اُس وقت دیکھتے جبکہ اللہ کے فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے وقت ان کے چہروں اور پشتوں پر مار رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ آگ میں جلنے کا عذاب چکھو۔ تو آپ ایک بڑا ہیبت ناک منظر دیکھتے۔

ائمۂ تفسیر میں سے بعض حضرات نے اس کو اُن کفارِ قریش کے متعلق قرار دیا ہے جو میدانِ بدر میں مسلمانوں کے مقابلہ پر آئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی امداد کے لئے فرشتوں کا لشکر بھیج دیا تھا اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ میدانِ بدر میں جو قریشی سردار مارے گئے اُن کے مارنے میں فرشتوں کا ہاتھ تھا جو اُن کے سامنے سے چہروں پر اور پیچھے سے اُن کی پشتوں پر مار کر اُن کو ہلاک کر رہے تھے اور ساتھ ہی آخرت میں جہنم کے عذاب کی خبر سنا رہے تھے۔

اور جن حضرات نے الفاظِ آیت کے عموم کی بنا پر اس کا مضمون عام رکھا ہے اُن کے مطابق معنی آیت کے یہ ہیں کہ جب کوئی کافر مرتا ہے فرشتۂ موت اُن کی روح قبض کرنے کے وقت اُن کے چہرہ اور پشت پر مارتا ہے بعض روایات میں ہے کہ آگ کے کوڑے اور لوہے کے گُرز اُن کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جن سے وہ مرنے والے کافر کو مارتے ہیں۔ مگر چونکہ اس عذاب کا تعلق اس عالمِ عناصر سے نہیں بلکہ عالمِ قبر سے ہے جس کو برزخ کہا جاتا ہے اس لئے یہ عذاب عام طور پر آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب کیا گیا کہ اگر آپ دیکھتے تو بڑا عبرتناک منظر دیکھتے اس سے معلوم ہوا کہ موت کے بعد عالمِ برزخ میں کفار کو عذاب ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اس لئے عام طور پر دیکھا نہیں جاتا۔ عذابِ قبر کا ذکر قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے اور روایاتِ حدیث تو اس معاملہ میں بے شمار ہیں۔

دوسری آیت میں کفار کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ عذابِ دنیا و آخرت تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے چونکہ عام کاروبار ہاتھوں ہی سے وجود میں آتے ہیں اس لئے ہاتھوں کا ذکر کر دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں کہ بلا وجہ کسی کو عذاب میں مبتلا کر دیں۔

تیسری آیت میں بتلایا گیا کہ ان مجرموں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عذاب کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اُن کو عقل وفہم دیتے ہیں۔ گرد و پیش میں اُن کے لئے بیشمار ایسی چیزیں موجود ہوتی ہیں جن میں غور وفکر کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت وعظمت کو پہچانیں اور عاجز مخلوق کو اُس کا شریک نہ بنائیں پھر

مزید تنبیہ کے لئے اپنی کتابیں اور رسول بھیجتے ہیں۔ اللہ کے رسول اُن کے افہام و تفہیم میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے وہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کے مظاہر بھی بشکلِ معجزات دکھلاتے ہیں۔ جب کوئی فرد یا قوم ان سب چیزوں سے بالکل آنکھیں بند کر لے اور خدائی تنبیہات میں سے کسی پر کان نہ دھرے تو پھر عادت اللہ تعالیٰ کی ایسی لوگوں کے بارہ میں یہی ہے کہ دنیا میں بھی اُن پر عذاب آتا ہے اور آخرت کے دائمی عذاب میں بھی گرفتار ہوتے ہیں۔ ارشاد فرمایا كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دأب کے معنی عادت کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جیسے اٰلِ فِرْعَوْنَ اور اُن سے پہلے کافروں سرکشوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی عادت دنیا کو معلوم ہو چکی ہے کہ فرعون کو اس کے سارے حشم و خدم سمیت دریا میں غرق کر دیا اور اُن سے پہلے عاد و ثمود کی قوموں کو مختلف قسم کے عذابوں سے ہلاک کر دیا۔

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے عذاب میں پکڑ لیا۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۲) وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوی ہے کوئی قوت و شجاعت والا اپنی قوت کے بل پر اُس کے عذاب سے نہیں چھوٹ سکتا اور اللہ تعالیٰ کی سزا بھی بڑی سخت ہے۔

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے انعام و عطاء کے قائم اور باقی رکھنے کا ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ یعنی اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتے ہیں اُس کو اُس وقت تک بدلتے نہیں جب تک یہ لوگ خود ہی اپنے حالات اور اعمال کو نہ بدل دیں۔

یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے عطاءِ نعمت کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بیان فرمایا، نہ اُس کے لئے کوئی قید و شرط لگائی نہ اُس کو کسی کے اچھے عمل پر موقوف رکھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلی نعمت جو خود ہمارا وجود ہے اور اُس میں قدرتِ حق جل شانہٗ کی عجیب صنعت گری سے ہزاروں حیرت انگیز نعمتیں ودیعت رکھی گئی ہیں یہ نعمتیں ظاہر ہے کہ اُس وقت عطا ہوئیں، جبکہ نہ ہم تھے نہ ہمارا کوئی عمل تھا۔

ما نبودیم وتقاضا ما نبود لطف تو نا گفتۂ ما می شنود [۱]

اگر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بندوں کے نیک اعمال کے منتظر رہا کرتے تو ہمارا وجود ہی قائم نہ ہوتا۔

حق تعالیٰ کی نعمت و رحمت تو اُس کے ربّ العالمین اور رحمٰن و رحیم ہونے کے نتیجہ میں خود بخود ہے، ہاں اس نعمت و رحمت کے قائم اور باقی رہنے کا ایک ضابطہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دیتے ہیں اُس سے اُس وقت تک واپس نہیں لیتے جب تک وہ اپنے حالات اور اعمال کو بدل کر خود ہی اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دے۔

حالات کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اچھے اعمال اور حالات کو بدل کر بُرے اعمال اور بُرے حالات اختیار

---

[۱] ترجمہ: نہ ہم تھے اور نہ ہمارا تقاضا تھا، تو نے اپنی مہربانی سے ہماری ان کہی سن لی تھی۔

کر لے یا یہ کہ اللہ کی نعمتیں مبذول ہونے کے وقت جن اعمالِ بد اور گناہوں میں مبتلا تھا نعمتوں کے ملنے کے بعد اُن سے زیادہ بُرے اعمال میں مبتلا ہو جائے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن قوموں کا ذکر پچھلی آیات میں آیا ہے یعنی کفار قریش اور آلِ فرعون ان کا تعلق اس آیت سے اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ملنے کے وقت بھی کچھ اچھے حالات میں نہیں تھے سب کے سب مشرک اور کافر ہی تھے۔ لیکن انعامات کے بعد یہ لوگ اپنی بدعملیوں اور شرارتوں میں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے۔

آلِ فرعون نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے مظالم کرنے شروع کر دیئے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے جو ان کے پچھلے جرائم میں ایک شدید اضافہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے اپنے حالات مزید بُرائی کی طرف بدل ڈالے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت کو نقمت اور عذاب سے بدل دیا۔ اسی طرح قریشِ مکہ اگرچہ مشرک اور بدعمل تھے لیکن اس کے ساتھ ان میں کچھ اچھے اعمال صلۂ رحمی، مہمان نوازی، حجاج کی خدمت، بیت اللہ کی تعظیم وغیرہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر دین و دنیا کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے۔ دنیا میں اُن کی تجارتوں کو فروغ دیا۔ اور ایسے ملک میں جہاں کسی کا تجارتی قافلہ سلامتی سے نہ گزر سکتا تھا ان لوگوں کے تجارتی قافلے ملک شام و یمن میں جاتے اور کامیاب آتے تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے سورہ لایلف میں رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝۲ [1] کے عنوان سے کیا ہے۔

اور دین کے اعتبار سے وہ عظیم نعمت ان کو عطا ہوئی جو پچھلی کسی قوم کو نہیں ملی تھی کہ سیّد الانبیاء خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم ان میں مبعوث ہوئے اللہ تعالیٰ کی آخری اور جامع کتاب قرآن ان میں بھیجی گئی۔

مگر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کی شکرگزاری اور قدر کرنے اور اس کے ذریعہ اپنے حالات کو درست کرنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ گندے کر دیئے کہ صلہ رحمی کو چھوڑ کر مسلمان ہو جانے والے بھائی بھتیجوں پر وحشیانہ مظالم کرنے لگے۔ مہمان نوازی کے بجائے ان مسلمانوں پر آب و دانہ بند کرنے کے عہدنامے لکھے گئے۔ حجاج کی خدمت کے بجائے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنے لگے۔ یہ وہ حالات تھے جن کو کفارِ قریش نے بدلا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو نقمتوں اور عذاب کی صورت میں تبدیل کر دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوئے اور جو ذات رحمۃ للعالمین بن کر آئی تھی اُسی کے ذریعہ انہوں نے اپنی موت و ہلاکت کو دعوت دے دی۔

اور تفسیر مظہری میں معتمد کتب تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کلاب بن مرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں تیسرے دادا کے دادا ہیں یہ ابتداء سے دین ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کے پابند اور اُس پر قائم تھے اور نسلاً بعد نسلٍ اس دین کی قیادت و سیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ قصی بن کلاب کے زمانہ میں ان لوگوں میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے کعب بن لوی ان کے دینی قائد تھے جمعہ کے روز جس کو ان کی زبان میں عروبہ کہا جاتا تھا سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا

[1] ترجمہ: یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں۔

کرتے اور بتلایا کرتے تھے کہ ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے۔ اُن کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ جو اُن پر ایمان نہ لائے گا اُس کا کوئی عمل قابلِ قبول نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اُن کے عربی اشعار شعراءِ جاہلیت میں مشہور و معروف ہیں۔ اور قصی بن کلاب تمام حجاج کے لئے کھانے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں آپ کے عہدِ مبارک تک قائم رہیں۔ [1] اس تاریخی تشریح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قریش کی تبدیلی حالات سے یہ مراد ہو کہ دینِ ابراہیمی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرلی۔

بہر حال مضمونِ آیت سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اوقات حق تعالیٰ اپنی نعمت بعض ایسے لوگوں کو بھی عطا فرماتے ہیں جو اپنے عمل سے اُس کے مستحق نہیں ہوتے لیکن عطاءِ نعمت کے بعد اگر وہ اپنے اعمال کا رخ اصلاح و درستی کی طرف پھیرنے کے بجائے اعمالِ بد میں اور زیادتی کرنے لگیں تو پھر یہ نعمت اُن سے چھین لی جاتی ہے اور وہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہوجاتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی ہر گفتگو کو سننے والے اور اُن کے تمام اعمال وافعال کو جاننے والے ہیں اس میں کسی غلطی یا غلط فہمی کا امکان نہیں۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے، کہ انہوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رَبّ کی پھر

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

ہلاک کردیا ہم نے ان کو اُن کے گناہوں پر اور ڈبودیا ہم نے فرعون والوں کو، اور سارے ظالم تھے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ ښ

بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں ایمان لاتے۔

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ

جن سے تو نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد ہر بار

[1] التفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۰۲

وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ

اور وہ ڈر نہیں رکھتے۔ سو اگر کبھی تو پائے اُن کو لڑائی میں تو اُن کو ایسی سزا دے کہ دیکھ کر بھاگ جائیں ان کے پچھلے

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى

تاکہ ان کو عبرت ہو۔ اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ

سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ ع

برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اس معاملے میں بھی ان کا حال) ایسا ہی ہوا جیسا فرعون کی قوم اور اُن سے پہلے لوگوں کا حال ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے رَبّ کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں ہلاک کر دیا، اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا، اور یہ سب ظالم لوگ تھے۔ ﴿٥٤﴾ یقین جانو کہ اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جان داروں میں بدترین لوگ وہ ہیں جنہوں نے کفر اَپنا لیا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے۔ ﴿٥٥﴾ یہ لوگ وہ ہیں جن سے تم نے عہد لے رکھا ہے، اس کے باوجود یہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں، اور ذرا نہیں ڈرتے۔ ﴿٥٦﴾ لہٰذا اگر کبھی یہ لوگ جنگ میں تمہارے ہاتھ لگ جائیں، تو ان کو سامانِ عبرت بنا کر اُن لوگوں کو بھی تتر بتر کر ڈالو جو ان کے پیچھے ہیں، تاکہ وہ یاد رکھیں۔ ﴿٥٧﴾ اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تم وہ معاہدہ اُن کی طرف صاف سیدھے طریقے سے پھینک دو۔ یاد رکھو کہ اللہ بدعہدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿٥٨﴾

خلاصہ تفسیر

(پس اس امر تغییر میں بھی) ان کی حالت فرعون والوں اور ان سے پہلے والوں کی سی حالت ہے کہ انہوں نے اپنے رَبّ کی آیات کو جھٹلایا اس پر ہم نے ان کو ان کے (ان) گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا اور (ان میں) فرعون والوں کو خاص طور پر ہلاک کیا کہ (ان کو) غرق کر دیا اور وہ (فرعون والے اور پہلے والے) سب ظالم تھے بلاشبہ بدترین خلائق اللہ

کے نزدیک یہ کافر لوگ ہیں (جب یہ علم الٰہی میں ایسے ہیں) تو یہ ایمان نہ لائیں گے جن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ ان سے (کئی بار) عہد لے چکے ہیں (مگر) پھر (بھی) وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں اور وہ (عہد شکنی سے) ڈرتے نہیں سو اگر آپ لڑائی میں ان لوگوں پر قابو پائیں (اور یہ آپ کے ہاتھ آئیں) تو ان پر حملہ کر کے (اُس) کے ذریعہ سے اور لوگوں کو جو کہ ان کے علاوہ ہیں منتشر کر دیجئے تا کہ وہ لوگ سمجھ جائیں (کہ نقضِ عہد کا یہ وبال ہوا ہم ایسا نہ کریں۔ یہ حکم تو اس وقت ہے جب ان لوگوں نے عہد علانیہ توڑ دیا ہو) اور اگر (ابھی تک علانیہ تو نہیں توڑا لیکن) آپ کو کسی قوم سے خیانت (یعنی عہد شکنی) کا اندیشہ ہو تو (اجازت ہے کہ) آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجئے (یعنی اس طرح اس عہد کے باقی نہ رہنے کی اطلاع کر دیجئے) کہ آپ اور وہ (اس اطلاع میں) برابر ہو جائیں (اور بدون ایسی صاف اطلاع کے لڑنا خیانت ہے اور) بلا شبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت کا مضمون بلکہ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو ایک آیت پہلے آچکے ہیں گَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ مگر مقصد بیان دونوں میں جدا جدا ہے پہلی آیت میں اس کا بیان مقصود تھا کہ ان لوگوں کا کفران کے عذاب کا سبب بنا اور اس آیت میں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مبذول ہوں اور وہ ان کی قدر نہ پہچانے اور اللہ کے سامنے نہ جھکے تو اُس کی نعمتیں نقمتوں اور مصیبتوں سے بدل دی جاتی ہیں۔ قوم فرعون اور اُن سے پہلی اقوام نے بھی جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی تو اُن سے نعمتیں چھین لی گئیں اور نعمتوں کے بجائے عذاب میں پکڑ لئے گئے۔ کچھ الفاظ میں بھی کہیں کہیں فرق کر کے خاص خاص اشارے فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً پہلی آیت میں كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ کے الفاظ تھے اور یہاں بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ کا لفظ ہے لفظ اللہ کے بجائے صفت ربّ ذکر کر کے اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ بڑے ہی ظالم ناحق شناس تھے کہ جو ذات ان کی رَبّ ہے ان کے ابتداء وجود سے لے کر موجودہ حالات تک اُس کی نعمتوں ہی میں ان کی پرورِش ہوئی ہے اُسی کی نشانیوں کو جھٹلانے لگے۔

نیز پہلی آیت فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ فرمایا تھا یہاں فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ارشاد فرمایا۔ اس میں اس اجمال کی تفصیل و تشریح ہو گئی کیونکہ پہلی آیت میں ان کا عذاب میں پکڑا جانا ذکر کیا گیا جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ زندہ اور باقی رہتے ہوئے مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں یا سرے سے ان کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔ اس آیت میں اَهْلَكْنٰهُمْ فرما کر واضح کر دیا کہ ان سب قوموں کی سزا سزائے موت تھی ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔ ہر قوم کی ہلاکت کی مختلف

صورتیں ظاہر ہوئیں ان میں سے فرعون چونکہ خدائی کا دعویدار تھا اور اس کی قوم اُس کی تصدیق کرتی تھی اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا گیا وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ یعنی ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔ دوسری قوموں کی ہلاکت کی صورتیں یہاں بیان نہیں کی گئیں، دوسری آیات میں اُس کی بھی تفصیل موجود ہے کہ کسی پر زلزلہ آیا، کوئی زمین کے اندر دھنسا دی گئی، کسی کی صورتیں مسخ ہوگئیں، کسی پر ہوا کا طوفان مسلط ہو گیا۔ اور آخر میں مشرکینِ مکہ پر غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب آیا۔

اس کے بعد کی آیت میں انہیں کافروں کے بارہ میں ارشاد فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس میں لفظ دوابّ دابّہ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی زمین پر چلنے والے کے ہیں اس لئے انسان اور جتنے جانور زمین پر چلتے ہیں سب کو یہ لفظ شامل ہے مگر عام محاورات میں یہ لفظ خاص چوپائے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا حال بے شعوری میں جانوروں سے بھی زیادہ گرا ہوا تھا اس لئے اس لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ معنی آیت کے واضح ہیں کہ تمام جانوروں اور انسانوں میں سب سے بدترین جانور یہ لوگ ہیں۔ آخر آیت میں فرمایا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ یعنی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خداداد استعداد و قابلیت کو ضائع کر دیا۔ چوپائے جانوروں کی طرح کھانے پینے سونے جاگنے کو مقصد زندگی بنالیا، اس لئے ان کی رسائی ایمان تک نہیں ہو سکتی۔

حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے چھ آدمیوں کے بارہ میں آئی ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے پیشگی خبر دے دی کہ یہ لوگ آخر تک ایمان نہیں لائیں گے۔ [1]

نیز اس لفظ میں اُن لوگوں کو عذاب سے مستثنیٰ کرنا منظور ہے جو اگرچہ اُس وقت کفار کے ساتھ لگے ہوئے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جدوجہد میں مشغول ہیں مگر آئندہ کسی وقت اسلام قبول کر کے اپنی سابق غلط کاریوں سے توبہ کر لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے بہت بڑی جماعت مسلمان ہو کر نہ صرف خود صالح و متقی بن گئی بلکہ دنیا کے لئے مصلح اور تقویٰ کی داعی بن کر کھڑی ہوئی۔

تیسری آیت اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ یہ آیت یہود مدینہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے متعلق ہے۔ پچھلی آیتوں میں مشرکینِ مکہ پر میدانِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذابِ الٰہی نازل ہونے کا ذکر اور پچھلی امتوں کے کفار سے اُن کی تمثیل کا بیان ہوا تھا۔ اس آیت میں اُس ظالم جماعت کا ذکر ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کے لئے مارِ آستین بنی اور جو ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ صلح و آشتی کی دعویدار تھی دوسری طرف مشرکینِ مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتی تھی۔ یہ لوگ مذہباً یہودی تھے اور جس طرح مشرکینِ مکہ میں اسلام

[1] الدر المنثور تحت ھٰذہ الآیۃ ج: ۴ ص: ۴۶۹

کے خلاف سب سے بڑا علم بردار ابوجہل تھا اسی طرح یہودِ مدینہ میں اس کا علم بردار کعب بن اشرف تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر یہ لوگ مرعوب تو ہوئے مگر دل میں اسلام دشمنی کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی تھی۔

اسلامی سیاست کا تقاضا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو یہود مدینہ کو کسی نہ کسی معاہدہ کے تحت ساتھ لگایا جائے۔ تاکہ وہ مکہ والوں کو مدد نہ پہنچائیں۔ یہود بھی اپنی مرعوبیت کی بنا پر اسی کے خواہش مند تھے۔

اسلامی سیاست کا پہلا قدم اسلامی قومیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر اسلامی سیاست کی سب سے پہلی بنیاد اس کو بنایا کہ مہاجرین وانصار کی وطنی اور قومی عصبیتوں کو ختم کر کے ایک نئی قومیت اسلام کے نام پر قائم فرمائی مہاجرین وانصار کے مختلف قبائل کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ اور آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انصار کے باہمی اختلافات جو صدیوں سے چلے آرہے تھے سب کو دور فرما کر آپس میں بھی اور مہاجرین کے ساتھ بھی بھائی بھائی بنا دیا۔

دوسرا قدم معاہدۂ یہود

اس سیاست کا دوسرا قدم یہ تھا کہ حریفِ مقابل دو تھے ایک مشرکینِ مکہ جن کی ایذاؤں نے مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے یہودِ مدینہ جو اَب مسلمانوں کے پڑوسی بن گئے تھے ان میں سے یہود کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا۔ جس کا عہد نامہ مفصل لکھا گیا اس معاہدہ کی پابندی اطرافِ مدینہ کے سب یہودیوں پر اور اس طرف تمام مہاجرین وانصار پر عائد تھی۔ معاہدہ کا پورا متن البدایہ والنہایہ ابن کثیر میں اور سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مفصل موجود ہے اس کا سب سے اہم جزء یہ تھا کہ باہمی اختلاف کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سب کے لئے واجب التعمیل ہوگا، دوسرا جزء یہ تھا کہ یہودِ مدینہ مسلمانوں کے خلاف کسی دشمن کو ظاہراً یا باطناً کوئی امداد نہیں دیں گے۔[1] لیکن ان لوگوں نے غزوۂ بدر کے وقت عہد شکنی کر کے مشرکینِ مکہ کو اسلحہ اور سامانِ جنگ سے مدد پہنچائی۔ مگر جب غزوۂ بدر کا انجام مسلمانوں کی فتح مبین اور کفار کی ہزیمت وشکست کی صورت میں سامنے آیا تو پھر ان لوگوں پر رعب غالب ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر عذر کیا کہ اس مرتبہ ہم سے غلطی ہوگئی اس کو معاف فرما دیں آئندہ عہد شکنی نہیں کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حلم وکرم جو آپ کا شعار تھا اُس کی بنا پر دوبارہ معاہدہ کی تجدید فرمالی۔ مگر یہ لوگ اپنی سرشت سے مجبور تھے غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست اور نقصان کا علم ہو کر ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج:۳ ص:۳۱، باب الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوادع الیهود إلخ، والبدایة والنهایة ج:۳ ص:۲۷۳، ۲۷۴

ان کا سردار کعب بن اشرف خود سفر کر کے مکہ پہنچا اور مشرکینِ مکہ کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ اب وہ پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کریں اور یہودِ مدینہ اُن کے ساتھ ہوں گے۔

یہ دوسری عہد شکنی تھی جو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف کی۔ آیتِ مذکورہ میں اس بار بار کی عہد شکنی کا ذکر فرما کر ان لوگوں کی شرارت بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے آپ نے معاہدہ کر لیا مگر یہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑتے رہے۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ یعنی یہ لوگ ڈرتے نہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بدنصیب لوگ چونکہ ہوس دنیا میں مست و بے ہوش ہیں آخرت کی فکر ہی نہیں اس لئے آخرت کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایسے بدکردار عہد شکن لوگوں کا جو انجامِ بد اس دنیا میں ہوا کرتا ہے یہ لوگ اپنی غفلت و نادانی کی وجہ سے اُس سے نہیں ڈرتے۔

پھر ساری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے اپنی اس بدکرداری کی سزا چکھی۔ ابوجہل کی طرح کعب بن اشرف مارا گیا، اور یہودِ مدینہ جلاوطن کئے گئے۔

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بدعہدوں کے بارہ میں ایک ہدایت نامہ دیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

اس میں لفظ تَثْقَفَنَّهُمْ کے معنی ہیں ان پر قابو پانے کے اور شرّد مصدر تشرید سے بنا ہے جس کے اصلی معنی بھگا دینے اور منتشر کر دینے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر آپ کسی جنگ میں ان لوگوں پر قابو پالیں تو ان کو ایسی سخت دردناک سزا دیں جو دوسروں کے لئے عبرت ہو جائے ان کے پیچھے جو لوگ ان کے سہارے پر اسلام دشمنی میں لگے ہوئے ہیں وہ یہ سمجھ لیں کہ اب خیر اسی میں ہے کہ یہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچائیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دی جائے جس کو دیکھ کر مشرکینِ مکہ اور دوسرے دشمن قبائل بھی متاثر ہوں اور آئندہ اُن کو مسلمانوں کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ رہے۔

آخر آیت میں لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ فرما کر ربّ العالمین کی رحمت عامہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس دردناک سزا کا اصلی مقصد بھی کوئی انتقام لینا یا اپنے غصہ کو فرو کرنا نہیں بلکہ انہیں کی یہ مصلحت ہے کہ شاید یہ صورت حال دیکھ کر یہ لوگ کچھ ہوش میں آجائیں اور اپنے کئے پر نادم ہو کر اپنی اصلاح کرلیں۔

معاہدۂ صلح کو ختم کرنے کی صورت

پانچویں آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ و صلح کے قانون کی ایک اہم دفعہ بتلائی گئی ہے جس میں

معاہدہ کی پابندی کی خاص اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے ہم اُن کے خلاف کوئی اقدام کریں بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ اُن کو اطمینان وفرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری بدنیتی یا خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ تمہارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں اس لئے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾ یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو اُن کا عہد اُن کی طرف ایسی صورت سے واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ صلح ہو چکا ہے اُس کے مقابلہ میں کوئی جنگی اقدام کرنا خیانت میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے اگرچہ یہ خیانت دشمن کافروں ہی کے حق میں کی جائے۔ وہ بھی جائز نہیں۔ البتہ اگر دوسری طرف سے عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے کہ کھلے طور پر ان کو اعلان کے ساتھ آگاہ کر دیں کہ ہم آئندہ معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے۔ مگر یہ اعلان ایسی طرح ہو کہ مسلمان اور دوسرا فریق اُس میں برابر ہوں۔ یعنی ایسی صورت نہ کی جائے کہ اس اعلان وتنبیہ سے پہلے اُن کے مقابلہ کی تیاری کر لی جائے اور وہ خالی الذہن ہونے کی بنا پر تیاری نہ کر سکیں بلکہ جو کچھ تیاری کرنا ہے وہ اس اعلان وتنبیہ کے بعد کریں۔

یہ ہے اسلام کا عدل وانصاف کہ خیانت کرنے والے دشمنوں کے بھی حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے اور مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ میں اس کا پابند کیا جاتا ہے کہ عہد کو واپس کرنے سے پیشتر کوئی تیاری بھی اُن کے خلاف نہ کریں۔ (مظہری وغیرہ) [1]

ایفائے عہد کا ایک واقعہ عجیبہ

ابوداؤد، ترمذی، نسائی، امام احمد بن حنبلؒ نے سلیم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لئے التواء جنگ کا معاہدہ تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامانِ جنگ اُس قوم کے قریب پہنچا دیں تا کہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔

---

[1] التفسير المظهری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۰۵

مگر عین اُس وقت جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اُس طرف روانہ ہو رہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَفَآءً لَا غَدْرًا۔ یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہئے اُس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہئے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر کی گئی۔ دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا تاکہ التواء جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔ (ابن کثیر) [1]

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۵۹

اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے، وہ ہرگز تھکا نہ سکیں گے ہم کو۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ

اور تیاری کرو اُن کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اُس سے دھاک پڑے

عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ

اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر اُن کے سوا، جن کو تم نہیں جانتے، اللہ اُن کو جانتا ہے،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ

اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں وہ پورا ملے گا تم کو

وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۶۰ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ

اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔ اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تو بھی جھک اُسی طرف اور بھروسہ کر

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۷۹، وسنن ابی داوٗد، کتاب الجهاد، باب فی الامام یکون بینه وبین العدو عهد إلخ ج:۱ ص:۳۷۹، وجامع الترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء فی الغدر ج:۱ ص:۲۸۷، ومسند احمد حدیث عمرو بن عبسه رضی الله تعالٰی عنه رقم الحدیث:۱۶۴۷۸

عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ

اللہ پر، بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں

فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ لا

تو تجھ کو کافی ہے اللہ، اُسی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور کافر لوگ ہرگز یہ خیال بھی دِل میں نہ لائیں کہ وہ بھاگ نکلے ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔ ﴿۵۹﴾ اور (مسلمانو!) جس قدر طاقت اور گھوڑوں کی جتنی چھاؤنیاں تم سے بن پڑیں، ان سے مقابلے کے لئے تیار کرو، جن کے ذریعے تم اللہ کے دُشمن اور اپنے (موجودہ) دُشمن پر بھی ہیبت طاری کر سکو، اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جنہیں ابھی تم نہیں جانتے، (مگر) اللہ انہیں جانتا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں تم جو کچھ خرچ کرو گے، وہ تمہیں پورا پورا دے دیا جائے گا، اور تمہارے لئے کوئی کمی نہیں کی جائے گی ﴿۶۰﴾ اور اگر وہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اُس کی طرف جھک جاؤ، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ یقین جانو وہی ہے جو ہر بات سنتا، سب کچھ جانتا ہے ﴿۶۱﴾ اور اگر وہ تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ کریں گے تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد کے ذریعے اور مؤمنوں کے ذریعے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے ﴿۶۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ اپنے کو یہ خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے یقیناً وہ لوگ (خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے ہاتھ نہ آئیں یا تو دنیا ہی میں مبتلائے عقوبت کر دے گا ورنہ آخرت میں تو یقینی ہے) اور ان کافروں سے (مقابلہ کرنے) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس (سامان) کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور (تمہاری فکر میں رہنے کی وجہ سے) تمہارے دشمن ہیں (جن سے شب و روز تم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے) اور ان کے علاوہ دوسر(ے کافر)وں پر بھی (رعب جمائے رکھو) جن کو تم (بالیقین) نہیں جانتے (بلکہ) ان کو اللہ ہی جانتا ہے (جیسے کفار فارس اور روم وغیرہم جن سے اس وقت سابقہ نہیں

پڑا مگر صحابہ کا ساز و سامان و فن سپہ گری اپنے وقت میں ان کے مقابلہ میں بھی کام آیا اور ان پر بھی رعب جما، بعض مقابل ہو کر مغلوب ہوئے بعض نے جزیہ قبول کیا کہ یہ بھی اثر رعب کا ہے) اور اللہ کی راہ میں (جس میں جہاد بھی آ گیا) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (جس میں وہ خرچ بھی آ گیا جو ساز و یراق درست کرنے میں کیا جائے) وہ (یعنی اس کا ثواب) تم کو (آخرت میں) پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارے لئے (اس میں) کچھ کمی نہ ہوگی اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو آپ (کو) بھی (اجازت ہے کہ اگر اس میں مصلحت دیکھیں تو) اس طرف جھک جایئے اور (اگر باوجود مصلحت کے یہ احتمال ہو کہ یہ ان کی چال نہ ہو تو) تو اللہ پر بھروسہ رکھئے (ایسے احتمالوں سے اندیشہ نہ کیجئے) بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (ان کے اقوال اور احوال کو سنتا جانتا ہے ان کا خود انتظام کر دے گا) اور اگر (واقع میں وہ احتمال صحیح ہو اور) وہ لوگ (سچ مچ صلح سے) آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ (کی مدد اور حفاظت کرنے) کے لئے کافی ہیں (جیسا کہ اس کے قبل بھی آپ کی کفایت فرماتے تھے چنانچہ) وہ وہی ہے جس نے آپ کو اپنی (غیبی) امداد (یعنی ملائکہ) سے اور (ظاہری امداد یعنی) مسلمانوں سے قوت دی۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں اُن کفار کا ذکر ہے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اس لئے بچ گئے یا شریک ہونے کے بعد بھاگ نکلے اس طرح اپنی جان بچالی۔ ان لوگوں کے متعلق اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ یوں نہ سمجھیں کہ ہم بچ نکلے۔ کیونکہ غزوۂ بدر کفار کے لئے ایک عذابِ الٰہی تھا اور اُس کی پکڑ سے بچنا کسی کے بس میں نہیں۔ اس لئے فرمایا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝۵۹ یعنی یہ لوگ اپنی چالاکی سے اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے وہ جب پکڑنا چاہیں گے یہ ایک قدم نہ سرک سکیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ دنیا ہی میں پکڑ لئے جائیں ورنہ آخرت میں تو ان کی گرفتاری ظاہر ہے۔

اس آیت نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ کوئی مجرم گناہگار اگر کبھی مصیبت اور تکلیف سے نجات پا جائے اور پھر بھی توبہ نہ کرے بلکہ اپنے جرم پر ڈٹا رہے تو یہ اس کی علامت نہ سمجھو کہ وہ کامیاب ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا بلکہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہے اور یہ ڈھیل اُس کے عذاب اور مصیبت کو اور بڑھا رہی ہے گو اُس کو محسوس نہ ہو۔

جہاد کے لئے اسلحہ اور سامانِ حرب کی تیاری فرض ہے

دوسری آیت میں اسلام سے دفاع اور کفار کے مقابلہ کے لئے تیاری کے احکام ہیں، ارشاد فرمایا وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ یعنی سامانِ جنگ کی تیاری کرو کفار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے۔ اس میں سامانِ جنگ کی تیاری کے ساتھ

مَا اسْتَطَعْتُمْ کی قید لگا کر یہ اشارہ فرمادیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا سامان ہے تم بھی اُتنا ہی حاصل کرلو۔ بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہو سکے وہ جمع کرلو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اس کے بعد اُس سامان کی کچھ تفصیل اس طرح فرمائی مِنْ قُوَّةٍ یعنی مقابلہ کی قوت جمع کرو۔ اس میں تمام جنگی سامانِ اسلحہ، سواری وغیرہ بھی داخل ہیں اور اپنے بدن کی ورزش، فنونِ جنگ کا سیکھنا بھی، قرآن کریم نے اس جگہ اُس زمانہ کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ قوت کا عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ یہ قوت ہر زمانہ اور ہر ملک ومقام کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہے اُس زمانہ کے اسلحہ تیر، تلوار، نیزے تھے اس کے بعد بندوق توپ کا زمانہ آیا۔ پھر اب بموں اور راکٹوں کا وقت آگیا۔ لفظ قوت ان سب کو شامل ہے اس لئے آج کے مسلمانوں کو بقدرِ استطاعت ایٹمی قوت، ٹینک اور لڑاکا طیارے، آب دوز کشتیاں جمع کرنا چاہئے کیونکہ یہ سب اسی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور اس کے لئے جس علم وفن کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کا اور کفار کے مقابلہ کا کام لیا جائے گا تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے۔

لفظ قوت عام ذکر کرنے کے بعد ایک خاص قوت کا صراحۃً بھی ذکر فرمادیا وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ لفظ رباط مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور مربوط کے معنی میں بھی، پہلی صورت میں اس کے معنی ہوں گے گھوڑے باندھنا اور دوسری صورت میں بندھے ہوئے گھوڑے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ جہاد کی نیت سے گھوڑے پالنا اور ان کو باندھنا یا پلے ہوئے گھوڑوں کو جمع کرنا۔ سامانِ جنگ میں سے خصوصیت کے ساتھ گھوڑوں کا ذکر اس لئے کردیا کہ اُس زمانہ میں کسی ملک وقوم کے فتح کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر ومفید گھوڑے ہی تھے۔ اور آج بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو گھوڑوں کے بغیر فتح نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھ دی ہے۔ [۱]

صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامانِ جنگ فراہم کرنے اور اُس کے استعمال کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور موجبِ ثوابِ عظیم قرار دیا ہے۔ تیر بنانے اور چلانے پر بڑے بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے۔ [۲]

اور چونکہ جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں سے دفاع ہے اور دفاع ہر زمانہ اور ہر قوم کا جدا ہوتا ہے اس لئے

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب الخيل معقود في نواصيها الخير ...إلخ ج:۱ ص:۳۹۹

[۲] جامع الترمذی، ابواب فضائل الجهاد، باب ما جاء في فضل الرمي في سبيل الله ج:۱ ص:۲۹۳، وسنن ابن ماجة، ابواب الجهاد، باب الرمي في سبيل الله ج:۱ ص:۲۰۲، ومسند احمد رقم الحديث:۱۷۸۰۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی عن انس رضی اللہ عنہ)[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح دفاع و جہاد ہتھیاروں سے ہوتا ہے بعض اوقات زبان سے بھی ہوتا ہے اور قلم بھی زبان ہی کے حکم میں ہے۔ اسلام اور قرآن سے کفر والحاد کے حملوں اور تحریفوں کی مدافعت زبان یا قلم سے یہ بھی اس صریح نص کی بنا پر جہاد میں داخل ہے۔

آیتِ مذکورہ میں سامانِ جنگ کی تیاری کا حکم دینے کے بعد اُس سامان کے جمع کرنے کی مصلحت اور اصل مقصد بھی ان الفاظ میں بیان فرمایا تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ یعنی سامانِ جنگ ودفاع جمع کرنے کا اصل مقصد قتل وقتال نہیں بلکہ کفر وشرک کو زیر کرنا اور مرعوب ومغلوب کر دینا ہے وہ کبھی صرف زبان یا قلم سے بھی ہوسکتا ہے اور بعض اوقات اُس کے لئے قتل وقتال ضروری ہوتا ہے۔ جیسی صورت حال ہو اُس کے مطابق دفاع کرنا فرض ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جنگ و جہاد کی تیاری سے جن لوگوں کو مرعوب کرنا مقصود ہے اُن میں سے بعض کو تو مسلمان جانتے ہیں اور وہ وہ لوگ ہیں جن سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری تھا یعنی کفار مکہ اور یہود مدینہ۔ اور کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کو ابھی تک مسلمان نہیں جانتے۔ مراد اس سے پوری دنیا کے کفار ومشرکین ہیں جو ابھی تک مسلمانوں کے مقابلہ پر نہیں آئے مگر آئندہ اُن سے بھی تصادم ہونے والا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت نے بتلا دیا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے موجودہ حریف کے مقابلہ کی تیاری کر لی تو اس کا رعب صرف انہیں پر نہیں بلکہ دور دور کے کفار کسریٰ وقیصر وغیرہ پر بھی پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور خلفائے راشدین کے عہد میں یہ سب مغلوب ومرعوب ہوگئے۔

جنگی سامان جمع کرنے اور جنگ کرنے میں ضرورت مال کی بھی پڑتی ہے بلکہ سامان جنگ بھی مال ہی کے ذریعہ تیار کیا جاسکتا ہے اس لئے آخر آیت میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت اور اُس کا اجر عظیم اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے اُس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دے دیا جائے گا۔ بعض اوقات تو دنیا میں بھی مالِ غنیمت کی صورت میں یہ بدلہ مل جاتا ہے ورنہ آخرت کا بدلہ تو متعین ہے اور ظاہر ہے کہ وہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔

تیسری آیت میں صلح کے اَحکام اور اس کے متعلقات کا بیان ہے ارشاد فرمایا وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا لفظ سَلْم بفتح السین اور سِلْم بکسر السین دونوں طرح صلح کے معنی میں آتا ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر کفار کسی وقت صلح کی طرف جھکیں تو آپ کو بھی جھک جانا چاہئے۔ یہاں صیغہ امر تخییر کے لئے استعمال فرمایا ہے مراد یہ ہے کہ جب کفار صلح کی

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی کراهية ترك الغزو ج:١ ص:٣٣٩، وسنن النسائی، کتاب الجهاد، باب وجوب الجهاد ج:٢ ص:٥١، وسنن الدارمی رقم الحدیث:٢٤٨٦

طرف مائل ہوں تو آپ کو بھی اختیار ہے اگر مسلمانوں کی مصلحت صلح میں محسوس کریں تو صلح کر سکتے ہیں۔

اور اِنْ جَنَحُوْا کی قید سے معلوم ہوا کہ صلح اُسی وقت کی جاسکتی ہے جب کفار کی طرف سے صلح کی خواہش ظاہر ہو۔ کیونکہ بغیر اُن کی خواہش کے اگر مسلمان خود ہی صلح کی تحریک کریں تو یہ اُن کی کمزوری سمجھی جائے گی۔

ہاں اگر کوئی موقع ایسا آپڑے کہ مسلمان کسی نرغہ میں گھر جائیں اور اپنی سلامتی کے لئے کوئی صورت بجز صلح کے نظر نہ آئے تو صلح میں پیش قدمی بھی بقولِ فقہاء جائز اور اشارات نصوص سے ثابت ہے۔

اور چونکہ دشمن کی جانب سے صلح کی خواہش ہونے میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر غفلت میں ڈال دیں اور پھر یکبارگی حملہ کر دیں اس لئے آخرِ آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۱ یعنی آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں کہ وہی خوب سننے والے جاننے والے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کو بھی سنتے ہیں اور اُن کے دلوں میں چھپے ہوئے ارادوں کو بھی جانتے ہیں وہ آپ کی مدد کے لئے کافی ہیں۔ آپ ایسے بے دلیل احتمالات پر اپنے کاموں کی بنیاد نہ رکھیں۔ اور ایسے خطرات کو اللہ کے حوالہ کر دیں۔

اس کے بعد چوتھی آیت میں اسی مضمون کو اور زیادہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۲

یعنی اگر یہی احتمال واقع ہو جائے کہ صلح کرنے سے اُن کی نیت خراب ہو آپ کو دھوکہ ہی دینا چاہیں تب بھی آپ کوئی پروانہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے کافی ہیں پہلے بھی اللہ تعالیٰ ہی کی امداد و تائید سے آپ کا کام چلا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مدد سے آپ کی تائید فرمائی جو آپ کی فتح و کامیابی کی اصل بنیاد اور حقیقت ہے اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت آپ کی امداد کے لئے کھڑی کر دی جو اسبابِ ظاہرہ میں سے ہیں۔ تو جس مالکِ حقیقی اور قادر مطلق نے تمام اسبابِ فتح و کامیابی کو وجود عطا فرمایا وہ آج بھی دشمنوں کے دھوکہ فریب کے معاملہ میں آپ کی مدد فرمائے گا۔ اسی وعدۂ خداوندی کے تحت اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر بھر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ دشمنوں کے دھوکہ فریب سے کوئی گزند پہنچی ہو۔ اسی لئے علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسا ہے جیسا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ (المائدۃ:۶۷) کا وعدہ کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی کرنے والے صحابہ کرام کو مطمئن اور سبکدوش فرما دیا تھا۔ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا (بیان القرآن)۔[1] دوسرے لوگوں کو ظاہری تدبیر اور گردوپیش کے حالات کے تابع کام کرنا چاہئے۔

---

[1] بیان القرآن تحت ھذہ الآیۃ ج:۲ ص:۹۹

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ

اور الفت ڈالی اُن کے دلوں میں، اگر تو خرچ کردیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ الفت ڈال سکتا

بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ

ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت ڈالی اُن میں، بیشک وہ زور آور ہے حکمت والا۔ اے نبی

حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾ ع يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ ع ٨

کافی ہے تجھ کو اللہ اور جتنے تیرے ساتھ ہیں مسلمان۔ اے نبی

حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ

شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا، اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے

يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا

تو غالب ہوں دو سو پر، اور اگر ہوں تم میں سو شخص تو غالب ہوں ہزار

مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ

کافروں پر اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اب بوجھ ہلکا کردیا اللہ نے تم پر سے

وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا

اور جانا کہ تم میں سستی ہے، سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں

مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ

دو سو پر، اور اگر ہوں تم میں ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے،

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور اللہ ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُن کے دِلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت پیدا کر دی۔ اگر تم زمین بھر کی ساری دولت بھی خرچ کر لیتے تو ان کے دِلوں میں یہ اُلفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے دِلوں کو جوڑ دیا۔ وہ یقیناً اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۶۳﴾ اے نبی! تمہارے لئے تو بس اللہ اور وہ مؤمن لوگ کافی ہیں جنہوں نے تمہاری پیروی کی ہے ﴿۶۴﴾ اے نبی! مؤمنوں کو جنگ پر اُبھارو۔ اگر تمہارے بیس آدمی ایسے ہوں گے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے۔ اور اگر تمہارے سو آدمی ہوں گے تو وہ کافروں کے ایک ہزار پر غالب آ جائیں گے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ ﴿۶۵﴾ لو اَب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا، اور اُس کے علم میں ہے کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری ہے۔ لہٰذا (اب حکم یہ ہے کہ) اگر تمہارے ثابت قدم رہنے والے سو آدمی ہوں تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے، اور اگر تمہارے ایک ہزار آدمی ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آ جائیں گے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ ﴿۶۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (مسلمانوں کو ذریعہ امداد بنانے کے لئے) ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر باہم اتفاق نہ ہو تو کوئی کام خصوص دین کی نصرت مل کر نہیں کر سکتے اور ان میں بوجہ حبِ ریاست اور غلبۂ بغض وعداوت اتفاق ایسا دشوار تھا کہ) اگر آپ (باوجودیکہ عقل وتدبیر بھی کامل رکھتے ہیں اور سامان بھی اس کے لئے آپ کے پاس کافی ہوتا یہاں تک کہ) دنیا بھر کا مال (اس کام کے لئے) خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے لیکن (یہ) اللہ ہی (کا کام تھا کہ اس) نے ان میں باہم اتفاق پیدا کر دیا بیشک وہ زبردست ہیں (کہ جو چاہیں اپنی قدرت سے کر دیں اور) حکمت والے ہیں (کہ جس طریق سے مناسب جانیں اس کام کو کر دیں اور جب اللہ تعالیٰ کا اپنی غیبی امداد اور مؤمنین سے آپ کی نصرت فرمانا معلوم ہو گیا تو) اے نبی (اس سے ثابت ہو گیا کہ) آپ کے لئے (حقیقت میں) اللہ کافی ہے اور جن مؤمنین نے آپ کا اتباع کیا ہے (ظاہراً) وہ کافی ہیں اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے (اور اس کے متعلق یہ قانون سنا دیجئے کہ) اگر تم میں کے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دس

گونہ عدد پر یعنی) دوسو پر غالب آجائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے سو آدمی ہوں گے تو ہزار کفار پر غالب آجائیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے (اور اس وجہ سے کفر پر مصر ہیں اور اس سبب سے ان کو غیبی امداد نہیں پہنچتی اس سبب سے وہ مغلوب ہو جاتے ہیں پس تم پر واجب ہے کہ اپنے سے دس گونہ کے مقابلہ سے بھی پسپا نہ ہو۔ اوّل یہ حکم نازل ہوا تھا جب صحابہؓ پر شاق ہوا تو عرض کیا۔ ایک مدت کے بعد یہ دوسری آیت جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا نازل ہوئی یعنی) اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے سو (یہ حکم دیا جاتا ہے کہ) اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دو گونہ عدد پر یعنی) دوسو پر غالب آجائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آجائیں گے اور (ہم نے جو صابر کی قید لگائی تو اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ صابرین (یعنی جو دل اور قدم سے ثابت رہیں ان) کے ساتھ ہیں (یعنی ان کی مدد کرتے ہیں)۔

معارف ومسائل

سورۂ انفال کی مذکورہ چار آیتوں میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی فتح وکامیابی کے اصلی سبب اور اُس کے حصول کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے اپنی خاص مدد سے اور مسلمانوں کی جماعت سے آپ کی تائید اور نصرت فرمائی ہے۔ اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت سے کسی کی امداد و نصرت ظاہر ہے کہ صرف اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ یہ جماعت باہم متفق اور متحد ہو۔ اور بقدر اتفاق واتحاد ہی اُس کی قوت اور وزن ہوتا ہے۔ باہمی اتحاد و یگانگت کے رشتے قوی ہیں تو پوری جماعت قوی ہے اور اگر یہ رشتے ڈھیلے ہیں تو پوری جماعت ڈھیلی اور کمزور ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اُس خاص انعام کا ذکر فرمایا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید ونصرت کے لئے عام مسلمانوں پر ہوا کہ اُن کے دلوں میں مکمل وحدت والفت پیدا کر دی گئی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ سے پہلے ان کے دو قبیلوں۔ اوس وخزرج کے آپس میں شدید جنگیں لڑی جا چکی تھیں اور جھگڑے چلتے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان جانی دشمنوں کو باہم شیر وشکر بھائی بھائی بنا دیا۔ مدینہ میں قائم ہونے والی نئی اسلامی ریاست کے قیام وبقاء اور دشمنوں پر غالب آنے کا حقیقی اور معنوی سبب تو اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد تھی اور ظاہری سبب مسلمانوں کی آپس میں مکمل الفت ومحبت اور اتفاق واتحاد تھا۔

اسی کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ مختلف لوگوں کے دلوں کو جوڑ کر اُن میں اُلفت ومحبت پیدا کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں صرف اُس ذات کا کام ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی انسان ساری دنیا کی

دولت بھی اس کام کے لئے خرچ کرڈالے کہ باہم منافرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں الفت پیدا کردے تو وہ کبھی اس پر قابو نہیں پاسکتا۔

مسلمانوں کا آپس میں حقیقی اور پائیدار اتفاق اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری پر موقوف ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کے قلوب میں باہمی الفت ومحبت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ اُس کے انعام کو حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ حصولِ انعام کے لئے اُس کی اطاعت ورضاجوئی شرط ہے۔

جماعتوں اور افراد کے درمیان وحدت واتفاق ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود اور مفید ہونے سے کسی مذہب وملت اور کسی فکر ونظر والے کو اختلاف نہیں ہوسکتا اور اسی لئے ہر شخص جو لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتا ہے وہ ان کو آپس میں متفق کرنے پر زور دیتا ہے لیکن عام دنیا اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ دلوں کا پورا اور پائیدار اتفاق ظاہری تدبیروں سے حاصل نہیں ہوتا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ورضاجوئی سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کی طرف کئی آیتوں میں اشارے فرمائے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا [1] (آل عمران: ۱۰۳) اس میں اختلاف وتفرقہ سے بچنے کی یہ تدبیر بتلائی گئی ہے کہ سب مل کر اللہ کی رسّی یعنی قرآن یا شریعتِ اسلام کو مضبوط تھام لیں تو سب آپس میں خود بخود متفق ہوجائیں گے اور باہمی تفرقے ختم ہوجائیں گے۔ رائے کا اختلاف دوسری چیز ہے اور وہ جب تک اپنی حد کے اندر رہے تفرقہ اور جھگڑے کا سبب کبھی نہیں بنتا۔ جھگڑا فساد جبھی ہوتا ہے جبکہ حدودِ شریعت سے تجاوز کیا جائے۔ آج اتفاق اتفاق تو سب پکارتے ہیں مگر اتفاق کے معنی ہر شخص کے نزدیک یہ ہوتے ہیں کہ لوگ میری بات مان لیں تو اتفاق ہوجائے۔ اور دوسرے بھی اتفاق کے لئے اسی فکر میں ہوتے ہیں کہ وہ ہماری بات مان لیں تو اتفاق ہوجائے۔ حالانکہ جب رایوں کا اختلاف اہلِ عقل ودیانت میں ناگزیر اور ضروری ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص دوسرے کے ساتھ متفق ہونے کو اس پر موقوف رکھے کہ دوسرا اس کی بات مان لے تو قیامت تک آپس میں اتفاق نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اتفاق کی صحیح اور فطری صورت وہ ہی ہے جو قرآن نے بتلائی کہ دونوں مل کر کسی تیسرے کی بات کو تسلیم کرلیں اور تیسرا وہی ہونا چاہئے جس کے فیصلے میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ وہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہی ہوسکتا ہے اس لئے آیت مذکورہ میں اس کی ہدایت فرمائی گئی کہ سب مل کر اللہ کی کتاب کو مضبوط تھام لو تو آپس کے جھگڑے ختم ہوکر اتفاقِ کامل پیدا ہوجائے گا۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم) یعنی جو

---

[1] ترجمہ: اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو۔

لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں محبت ومودّت پیدا فرما دیتے ہیں۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ دلوں میں حقیقی محبت ومودّت پیدا ہونے کا اصلی طریق ایمان اور عمل صالح کی پابندی ہے اس کے بغیر اگر کہیں کوئی اتفاق واتحاد مصنوعی طور پر قائم کر بھی لیا جائے تو وہ محض بے بنیاد اور کمزور ہوگا ذرا سی ٹھیس میں ختم ہو جائے گا۔ جس کا مشاہدہ تمام اقوامِ دنیا کے حالات وتجربات سے ہوتا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے اُس انعام کی وضاحت کی گئی ہے جو مدینہ کے تمام قبائل کے دلوں میں الفت پیدا کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد ونصرت کے لئے ان کو ایک آہنی دیوار کی طرح بنا کر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی یہی مضمون خلاصہ کے طور پر بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کے لئے حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اور ظاہر کے اعتبار سے مؤمنین کی جماعت کافی ہے آپ کسی بڑے سے بڑے دشمن کی تعداد یا سامان سے خوف زدہ نہ ہوں۔ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے میدان میں جنگ شروع ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی تاکہ قلیل التعداد، بے سامان مسلمان اپنے مقابل کی بھاری تعداد اور بھاری سامان سے مرعوب نہ ہو جائیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں مسلمانوں کے لئے ایک جنگی قانون کا ذکر ہے کہ اُن کو کس حد تک اپنے حریف کے مقابلہ پر جمنا فرض اور اس سے ہٹنا گناہ ہے۔ پچھلی آیات اور واقعات میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی امدادِ غیبی مسلمانوں کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے ان کا معاملہ عام اقوام دنیا کا سا معاملہ نہیں، یہ تھوڑے بھی بہت سوں پر غالب آسکتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً کَثِیۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (البقرہ: ۲۴۹) (یعنی بہت سی قلیل التعداد جماعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کثرت والے مقابل پر غالب آجاتی ہیں)۔

اس لئے اسلام کے سب سے پہلے جہاد غزوۂ بدر میں دس مسلمانوں کو سو آدمیوں کے برابر قرار دے کر یہ حکم دیا گیا کہ:

> ”اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو دشمنوں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم سو ہوگے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجاؤ گے۔“

عنوان تعبیر اس میں ایک خبر کا رکھا گیا ہے کہ سو مسلمان ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے مگر مقصد یہ حکم دینا ہے کہ سو مسلمانوں کو ایک ہزار کفار کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں۔ عنوان خبر کا رکھنے میں مصلحت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل اس خوشخبری سے مضبوط ہو جائیں کہ اللہ کا وعدہ ہماری حفاظت اور غلبہ کا ہے۔ اگر حکم کو بصیغۂ امر قانون کی صورت میں پیش کیا جاتا تو فطری طور پر وہ بھاری معلوم ہوتا۔

غزوۂ بدر پہلے پہل کی جنگ ایسی حالت میں تھی جبکہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد بہت ہی کم تھی اور وہ بھی سب کے سب محاذ جنگ پر گئے نہ تھے بلکہ فوری طور پر جو لوگ تیار ہو سکے وہی اس جنگ کی فوج بنے اس لئے اس جہاد میں سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا اور ایسے انداز میں دیا کہ فتح ونصرت کا وعدہ ساتھ تھا۔

چوتھی آیت میں اس حکم کو آئندہ کے لئے منسوخ کر کے دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ:

''اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے سو اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آ جائیں گے۔''

یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ سو مسلمانوں کو دو سو کافروں کے مقابلہ سے گریز کرنا جائز نہیں۔ پہلی آیت میں ایک مسلمان کو دس کے مقابلہ سے گریز ممنوع قرار دیا تھا اس آیت میں ایک کو دو کے مقابلہ سے گریز ممنوع رہ گیا۔ اور یہی آخری حکم ہے جو ہمیشہ کے لئے جاری اور باقی ہے۔

یہاں بھی حکم کو حکم کے عنوان سے نہیں بلکہ خبر اور خوشخبری کے انداز سے بیان فرمایا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ایک مسلمان کو دو کافروں کے مقابلہ پر جمنے کا حکم معاذ اللہ کوئی بے انصافی یا تشدد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان میں اُس کے ایمان کی وجہ سے وہ قوت رکھ دی ہے کہ ان میں کا ایک دو کے برابر رہتا ہے۔

مگر دونوں جگہ اس فتح ونصرت کی خوشخبری کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ یہ مسلمان ثابت قدم رہنے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ قتل وقتال کے میدان میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ثابت قدم رہنا اُسی کا کام ہو سکتا ہے جس کا ایمان کامل ہو۔ کیونکہ ایمانِ کامل انسان کو شوقِ شہادت کا جذبہ عطا کرتا ہے اور یہ جذبہ اُس کی طاقت کو بہت کچھ بڑھا دیتا ہے۔

آخر آیت میں عام قانون کی صورت سے بتلا دیا وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا ساتھی ہے۔ اس میں میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والے بھی شامل ہیں اور عام اَحکام شرعیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنے والے حضرات بھی۔ ان سب کے لئے معیت الٰہیہ کا وعدہ ہے اور یہ معیت ہی ان کی فتح وظفر کا اصلی راز ہے۔ کیونکہ جس کو قادرِ مطلق کی معیت نصیب ہوگئی اُس کو ساری دنیا مل کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خوب خونریزی نہ کر لے ملک میں،

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾

تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا، اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت، اور اللہ زور آور ہے حکمت والا۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾

اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾ ع

سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ بات کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اُس کے پاس قیدی رہیں، جب تک کہ وہ زمین میں (دُشمنوں کا) خون اچھی طرح نہ بہا چکا ہو (جس سے ان کا رُعب پوری طرح ٹوٹ جائے) تم دُنیا کا ساز و سامان چاہتے ہو، اور اللہ (تمہارے لئے) آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے، اور اللہ صاحبِ اقتدار بھی ہے، صاحبِ حکمت بھی ﴿٦٧﴾ اگر اللہ کی طرف سے ایک لکھا ہوا حکم پہلے نہ آچکا ہوتا تو جو راستہ تم نے اختیار کیا، اُس کی وجہ سے تم پر کوئی بڑی سزا آجاتی۔ ﴿٦٨﴾ لہٰذا اَب تم نے جو مال غنیمت میں حاصل کیا ہے، اُسے پاکیزہ حلال مال کے طور پر کھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿٦٩﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مسلمانو! تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جوان قیدیوں سے کچھ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا یہ بے جا تھا کیونکہ) نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کردیئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کرلیں (کیونکہ مشروعیتِ جہاد کی اصلی غرض دفع فساد ہے اور بدوں اس حد کے جس میں کہ بالکل شوکت کفار کی ٹوٹ جائے دفعِ فساد ممکن نہیں پس اس نوبت سے پہلے قیدیوں کا زندہ چھوڑ دینا آپ کی شان اصلاح کے مناسب نہیں البتہ جب ایسی قوت ہوجائے پھر قتل ضروری نہیں بلکہ اور صورتیں بھی مشروع ہیں پس ایسی نامناسب رائے تم

نے آپ کو کیوں دی) تم تو دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو (اس لئے فدیہ کی رائے دی) اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں (اور وہ اس میں ہے کہ کفار خوف سے مغلوب ہو جائیں جس میں آزادی سے اسلام کا نور و ہدایت پھیلے اور بے روک ٹوک لوگ بکثرت مسلمان ہوں اور نجات پاویں) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑی حکمت والے ہیں (وہ تم کو کفار پر غالب کرتے اور فتوحات کی کثرت سے تم کو مالدار کر دیتے گو کسی حکمت کے سبب اس میں دیر ہوتی جو فعل تم سے واقع ہوا ہے وہ ایسا ناپسندیدہ ہے کہ) اگر خدا تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا (وہ یہ کہ ان قیدیوں میں لوگ مسلمان ہو جائیں گے جس سے فساد محتمل واقع نہ ہوگا۔ اگر یہ ہوتا) تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی (لیکن چونکہ کوئی فساد نہ ہوا اور اتفاقاً تمہارا مشورہ صائب نکل آیا اس لئے تم سزا سے بچ گئے یعنی ہم نے اس فدیہ کو مباح کر دیا) سو جو کچھ تم نے (ان سے فدیہ میں) لیا ہے اس کو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ آئندہ ہر طرح کی احتیاط رکھو) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ تمہارا گناہ بھی معاف کر دیا یہ مغفرت ہے اور فدیہ بھی حلال کر دیا یہ رحمت ہے)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ کا تعلق غزوۂ بدر کے ایک خاص واقعہ سے ہے اس لئے ان کی تفسیر سے پہلے صحیح اور مستند روایاتِ حدیث کے ذریعہ اُس واقعہ کا بیان ضروری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر اسلام میں سب سے پہلا جہاد ہے اور اچانک پیش آیا ہے اُس وقت تک جہاد سے متعلقہ اَحکام کی تفصیل قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھی جہاد میں اگر مالِ غنیمت ہاتھ آ جاوے تو اُسے کیا کیا جائے۔ دشمن کے سپاہی اپنے قبضہ میں آ جائیں تو اُن کو گرفتار کرنا جائز ہے یا نہیں اور گرفتار کر لیا جائے تو پھر اُن کے ساتھ معاملہ کیا کرنا چاہئے۔

مالِ غنیمت کے متعلق پچھلے تمام انبیاء کی شریعتوں میں قانون یہ تھا کہ مسلمانوں کو اُس سے نفع اُٹھانا اور استعمال کرنا حلال نہیں تھا بلکہ حکم یہ تھا کہ پورا مالِ غنیمت جمع کر کے کسی میدان میں رکھ دیا جائے اور دستورِ الٰہی یہ تھا کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور اُس سارے مال کو جلا کر خاک کر دیتی۔ یہی علامت اُس جہاد کے مقبول ہونے کی سمجھی جاتی تھی۔ اگر مالِ غنیمت کو جلانے کے لئے آسمانی آگ نہ آئے تو یہ اس کی علامت ہوتی ہے کہ جہاد میں کوئی کوتاہی رہی ہے جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطاء کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کفار سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت

کسی کے لئے حلال نہیں تھا مگر اُمت مرحومہ کے لئے حلال کر دیا گیا۔ [۱] مالِ غنیمت کا اس امت کے لئے خصوصی طور پر حلال ہونا اللہ تعالیٰ کے تو علم میں تھا مگر غزوۂ بدر کے واقعہ تک اس کے متعلق کوئی وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے حلال ہونے کے متعلق نازل نہیں ہوئی تھی۔ اور غزوۂ بدر میں صورتِ حال یہ پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بالکل خلافِ قیاس غیر معمولی فتح عطا فرمائی۔ دشمن نے مال بھی چھوڑا جو بطورِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ان کے بڑے بڑے ستر سردار مسلمانوں نے گرفتار کر لئے۔ مگر ان دونوں چیزوں کے جائز ہونے کی صراحت کسی وحی الٰہی کے ذریعہ ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

اس لئے صحابہ کرام کے اس عاجلانہ اقدام پر عتاب نازل ہوا۔ اُسی عتاب وناراضی کا اظہار ایک وحی کے ذریعہ کیا گیا جس میں جنگی قیدیوں کے متعلق بظاہر تو مسلمانوں کو دو چیزوں کا اختیار دیا گیا تھا مگر اسی اختیار دینے میں ایک اشارہ اس کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ مسئلہ کے دونوں پہلوؤں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک پسندیدہ اور دوسرا ناپسندیدہ ہے۔ جامع ترمذی۔ سنن نسائی۔ صحیح ابن حبان میں بروایت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ اس موقع پر حضرت جبریلِ امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور یہ حکم سنایا کہ آپ صحابہ کرام کو دو چیزوں میں اختیار دے دیجئے ایک یہ کہ ان قیدیوں کو قتل کر کے دشمن کی شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کو فدیہ یعنی کچھ مال لے کر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اس دوسری صورت میں بامرِ الٰہی یہ طے شدہ ہے کہ اس کے بدلہ آئندہ سال مسلمانوں کے اتنے ہی آدمی شہید ہوں گے جتنے قیدی آج مال لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ [۲] یہ صورت اگرچہ تخییر کی تھی اور صحابہ کرام کو دونوں چیزوں کا اختیار دے دیا گیا تھا مگر دوسری صورت میں ستر مسلمانوں کی شہادت کا فیصلہ ذکر کرنے میں اس طرف ایک خفیف اشارہ ضرور موجود تھا کہ یہ صورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں کیونکہ اگر یہ پسند ہوتی تو ستر مسلمانوں کا خون اس کے نتیجہ میں لازم نہ ہوتا۔

صحابہ کرام کے سامنے جب یہ دونوں صورتیں بطورِ اختیار کے پیش ہوئیں تو بعض صحابہ کرام کا خیال یہ ہوا کہ اگر ان لوگوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ یہ سب یا بعض کسی وقت مسلمان ہو جائیں جو اصلی فائدہ اور مقصدِ جہاد ہے۔ دوسرا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان اس وقت افلاس کی حالت میں ہیں اگر ستر آدمیوں کا مالی فدیہ ان کو مل گیا تو ان کی تکلیف بھی دور ہوگی اور آئندہ کے لئے جہاد کی تیاری میں بھی مدد مل جائے گی۔ رہا ستر مسلمانوں کا شہید ہونا سو وہ مسلمانوں

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم جعلت لي الأرض مسجدًا وطهورًا ج:۱ ص:۶۲، وصحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة ج:۱ ص:۱۹۹

[۲] صحيح ابن حبان رقم الحديث:۴۷۹۵ وجامع الترمذي، ابواب السير، باب ما جاء في قتل الأسارى والفداء ج:۱ ص:۲۸۵

کے لئے خود ایک نعمت وسعادت ہے اُس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ ان خیالات کے پیشِ نظر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ کرام نے یہی رائے دی کہ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کردیا جائے۔ صرف حضرت عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ وغیرہ چند حضرات نے اس رائے سے اختلاف کر کے ان سب کو قتل کردینے کی رائے اس بنیاد پر دی کہ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں قوت وطاقت فراہم کرنے والے سارے قریشی سردار اس وقت قابو میں آگئے ہیں ان کا قبولِ اسلام تو موہوم خیال ہے مگر یہ گمان غالب ہے کہ یہ لوگ واپس ہوکر پہلے سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف سرگرمی کا سبب بنیں گے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہوکر تشریف لائے تھے اور رحمت مجسم تھے صحابہ کرام کی دو رائیں دیکھ کر آپ نے اُس رائے کو قبول کرلیا جس میں قیدیوں کے معاملہ میں رحمت اور سہولت تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ آپ نے صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کو خطاب کر کے فرمایا لَوِ اتَّفَقْتُمَا مَا خَالَفْتُكُمَا یعنی اگر تم دونوں کسی ایک رائے پر متفق ہوجاتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا (مظہری)۔[1] اختلاف رائے کے وقت آپ کی رحمت وشفقت علی الخلق کا تقاضا یہی ہوا کہ اُن کے معاملے میں آسانی اختیار کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اس کے نتیجہ میں آئندہ سال غزوۂ اُحد کے موقع پر اشارات ربانی کے مطابق ستر مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا میں اُن صحابہ کرام کو خطاب ہے جنہوں نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی تھی۔ اس آیت میں بتلایا گیا کہ آپ حضرات نے ہمارے رسول کو نامناسب مشورہ دیا۔ کیونکہ کسی نبی کے لئے یہ شایانِ شان نہیں ہے کہ اُس کو دشمنوں پر قابو مل جائے تو اُن کی قوت وشوکت کو نہ توڑے اور مفسد قسم کے دشمن کو باقی رکھ کر مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کی مصیبت قائم کردے۔

اس آیت میں حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ اثخان کے معنی لغت میں کسی کی قوت وشوکت کو توڑنے میں مبالغہ سے کام لینے کے ہیں۔ اسی معنی کی تاکید کے لئے لفظ فِي الْاَرْضِ لایا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ دشمن کی شوکت کو خاک میں ملادے۔

جن صحابہ کرام نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے دی تھی اگرچہ اُن کی رائے میں ایک جز خالص دینی تھا یعنی آزادی کے بعد ان لوگوں کے مسلمان ہوجانے کی امید۔ مگر ساتھ ہی دوسرا جز اپنی ذاتی منفعت کا بھی تھا کہ ان کو مال ہاتھ آجائے گا۔ اور ابھی تک کسی نصِ صریح سے اس مال کا جائز ہونا بھی ثابت نہ تھا۔ اس لئے انسانوں کا وہ معاشرہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت اس پیمانہ پر بنایا جا رہا تھا کہ اُن کا مرتبہ فرشتوں سے بھی آگے ہو اُن کے لئے یہ مال کی طرف دھیان بھی ایک قسم کی معصیت سمجھی گئی۔ اور جو کام جائز وناجائز کاموں سے مرکب ہو اُس کا مجموعہ ناجائز ہی کہلاتا ہے اس لئے صحابہ کرام کا یہ عمل قابلِ عتاب قرار دے کر یہ ارشاد نازل ہوا:

[1] التفسير المظهري تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۱۳

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۸﴾ یعنی تم لوگ دنیا کو چاہتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم آخرت کے طالب بنو۔ یہاں بطور عتاب کے اُن کے صرف اُس فعل کا ذکر کیا گیا جو وجہ ناراضی تھا دوسرا سبب یعنی قیدیوں کے مسلمان ہو جانے کی امید۔ اس کا یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام جیسی پاکباز مخلص جماعت کے لئے ایسی مشترک نیت جس میں کچھ دین کا جز ہو کچھ اپنے دنیوی نفع کا یہ بھی قابلِ قبول نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اُس آیت میں عتاب وتنبیہ کا خطاب صحابہ کرام کی طرف ہے اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی رائے کو قبول فرما کر ایک گونہ شرکت ان کے ساتھ کر لی تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل خالص آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا مظہر تھا کہ صحابہ میں اختلافِ رائے ہونے کی صورت میں اُس صورت کو اختیار فرمالیا جو قیدیوں کے حق میں سہولت وشفقت کی تھی۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ زبردست، حکمت والے ہیں اگر آپ لوگ جلد بازی نہ کرتے تو وہ اپنے فضل سے آئندہ فتوحات میں تمہارے لئے مال ودولت کا بھی سامان کر دیتے۔

دوسری آیت بھی اسی عتاب کا تتمہ ہے جس میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو کام تم نے اختیار کیا کہ مال لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اُس کے بارہ میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہو جاتی۔

اس نوشتہ تقدیر سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مالِ غنیمت تم سے پہلے کسی قوم کسی اُمت کے لئے حلال نہیں تھا۔ بدر کے موقع میں جب مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے حالانکہ ابھی تک ان کے لئے مالِ غنیمت حلال نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مالِ غنیمت کے حلال ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا یہ اقدام ایسا گناہ تھا کہ اس پر عذاب آجانا چاہئے تھا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا تھا کہ اس اُمت کے لئے مالِ غنیمت حلال کیا جائے گا اس لئے مسلمانوں کی اس خطاء پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔ (مظہری) [1]

بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عذابِ الٰہی بالکل سامنے آچکا تھا۔ اللہ نے اپنے فضل سے روک دیا اور اگر عذاب آجاتا تو بجز عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ کے کوئی اُس سے نہ بچتا۔ [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سببِ عتاب قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دینا تھا اور ترمذی کی روایتِ سابقہ سے اس کا سبب مالِ غنیمت جمع کرنا معلوم ہوتا ہے مگر دونوں میں کوئی تضاد نہیں قیدیوں سے فدیہ لینا بھی مالِ غنیمت ہی کا جز ہے۔

---

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة الأنفال ج:۲ ص:۱۳۹، والتفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۱۱۸

[2] تفسیر الطبری رقم الحدیث: ۱۶۳۲۰، والتفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۳۷۷

مسئلہ:- آیتِ مذکورہ میں قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کرنے یا مالِ غنیمت جمع کرنے پر جو عتاب نازل ہوا اور عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا مگر پھر معافی دے دی گئی۔ اس سے یہ بات نہ کھلی کہ آئندہ کے لئے ان معاملات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس لئے اگلی آیت میں مالِ غنیمت کا مسئلہ تو صاف کر دیا گیا فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ یعنی جو مالِ غنیمت تم کو ہاتھ آ گیا ہے وہ اب کھا سکتے ہو وہ آئندہ کے لئے تمہارے واسطے حلال کر دیا گیا۔ مگر اس میں بھی ایک شبہ یہ رہ جاتا ہے کہ مالِ غنیمت حلال کرنے کا حکم تو اب ملا ہے۔ اس حکم سے پہلے جو غلطی سے جمع کر لیا گیا تھا شاید اُس میں کسی قسم کی کراہت ہو اس لئے اس کے بعد حَلٰلًا طَيِّبًا فرما کر یہ شبہ بھی دور کر دیا گیا کہ اگرچہ نزولِ حکم سے پہلے جمع غنیمت کا اقدام درست نہ تھا مگر اب جبکہ مالِ غنیمت حلال ہونے کا حکم آ گیا تو پہلا جمع کیا ہوا بھی بغیر کسی کراہت کے حلال ہے۔

مسئلہ:- یہاں اصولِ فقہ کا ایک مسئلہ قابلِ نظر اور قابلِ یادداشت ہے کہ جب کسی ناجائز اقدام کے بعد مستقل آیت کے ذریعہ اُس مال کو حلال کرنے کا حکم نازل ہو جائے تو سابقہ اقدام کا اس میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ یہ مال حلال طیب ہو جاتا ہے جیسا کہ یہاں ہوا۔ لیکن اسی کی ایک دوسری نظیر یہ ہے کہ کسی معاملہ میں حکم تو پہلے سے نازل شدہ تھا مگر اُس کا ظہور عمل کرنے والوں پر نہیں تھا اس بنا پر اُس کی خلاف ورزی کر گزرے، بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا یہ عمل قرآن و سنت کے فلاں حکم کے خلاف تھا۔ تو اس صورت میں ظہورِ حکم کے بعد وہ مال حلال نہیں رہتا اگرچہ سابقہ غلطی کو معاف بھی کر دیا جائے (نور الانوار ملاجیون)۔[1] آیت مذکورہ میں مالِ غنیمت کو حلال طیب تو قرار دے دیا گیا مگر آخر آیت میں یہ قید لگا دی گئی وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ اس میں اشارہ کر دیا کہ مالِ غنیمت اگرچہ حلال کر دیا گیا ہے مگر وہ بھی ایک خاص قانون کے تحت حلال ہوا ہے اُس قانون کے خلاف یا اپنے حق سے زائد لیا جائے گا تو وہ جائز نہیں۔

یہاں دو معاملے تھے ایک مالِ غنیمت دوسرے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا۔ پہلے معاملے کے متعلق تو اس آیت نے بات صاف کر دی مگر دوسرا معاملہ ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ اس کے متعلق سورۂ محمد میں یہ آیت نازل ہوئی فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ (محمد: ۴) (یعنی جب جنگ میں کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو اُن کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم خوں ریزی کے ذریعہ ان کی قوت و شوکت توڑ چکو تو پھر اُن کو قید کر کے مضبوط باندھو۔ اس کے بعد یا تو اُن پر احسان کر کے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے)۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے پر عتاب نازل ہوا، یہ اسلام کا پہلا جہاد تھا اس وقت تک کافروں کی قوت و شوکت ٹوٹ نہیں چکی تھی اتفاقاً اُن پر ایک مصیبت پڑ گئی تھی

---

[1] نور الانوار مبحث افعال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص: ۲۱۵

پھر جب اسلام اور مسلمانوں کا مکمل غلبہ حاصل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ حکم منسوخ کرنے کے لئے سورۂ محمد کی آیت مذکورہ نازل فرمادی۔ جس میں نبی کریم اور مسلمانوں کو قیدیوں کے بارے میں چار اختیار دے دیئے گئے وہ ہیں۔

اِنْ شَاءُوْا قَتَلُوْهُمْ وَاِنْ شَاءُوْا اسْتَعْبَدُوْهُمْ وَاِنْ شَاءُوْا اَفَادُوْهُمْ وَاِنْ شَاءُوْا اَعْتَقُوْهُمْ۔ (مظهری) [۱]

''چاہیں تو سب کو قتل کردیں یا چاہیں تو غلام بنالیں یا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں یا چاہیں تو بغیر فدیہ کے آزاد کردیں۔''

مذکورہ چار اختیارات میں سے پہلے دو پر تو پوری اُمت کا اتفاق اور اجماع ہے کہ امیر مسلمین کے لئے قیدیوں کو قتل کردینے کا بھی اختیار ہے اور غلام بنالینے کا بھی۔ لیکن ان کو بلا معاوضہ چھوڑ دینے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینے میں فقہاء امت کا اختلاف ہے۔

امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ثوریؒ، اسحاقؒ اور تابعین میں سے حضرت حسن بصریؒ اور عطاءؒ کا قول یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں بھی امیر مسلمین کے لئے جائز ہیں کہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑ دے یا بلا معاوضہ آزاد کردے یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کرے۔

اور امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ، اوزاعیؒ اور قتادہؒ اور ضحاکؒ اور سُدّیؒ اور ابن جریجؒ فرماتے ہیں کہ بلا معاوضہ چھوڑنا تو بالکل جائز نہیں۔ فدیہ لے کر چھوڑنا بھی امام ابوحنیفہؒ کے مشہور مذہب میں جائز نہیں۔ البتہ سیر کبیر کی روایت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو تو فدیہ لے کر چھوڑ سکتے ہیں۔ [۲] البتہ مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں ان کو چھوڑ دینا امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہے۔ (کما هو اظهر الروایتین عنهم۔ مظہری) [۳]

جن حضرات نے فدیہ لے کر یا بلا فدیہ چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق سورۂ محمد کی آیت کو انفال کی آیت کا ناسخ اور آیت انفال کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ فقہاء حنفیہ نے آیت سورۂ محمد کو منسوخ قرار دیا ہے اور سورۂ انفال کی آیت فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (الانفال: ۵۷) اور آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبۃ: ۵) کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے اس لئے قیدیوں کو آزاد کردینا خواہ فدیہ لے کر ہو یا بلا فدیہ ان کے نزدیک جائز نہیں۔ (مظہری) [۴]

لیکن اگر سورۂ انفال کی آیت کے الفاظ اور سورۂ محمد کے الفاظ میں غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں

---

[۱] التفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۱۱۳ [۲] السیر الکبیر ج:۳ ص:۱۰۳۱

[۳] التفسیر المظهری ج:۴ ص:۱۱۴ [۴] التفسیر المظهری ج:۴ ص:۱۱۴، ۱۱۵

میں کوئی ناسخ ومنسوخ نہیں۔ بلکہ دو مختلف حالتوں کے دو حکم ہیں۔

سورۂ انفال کی آیت میں بھی اصل حکم اِثْخَانْ فِی الْاَرْضِ یعنی قتل کے ذریعہ کافروں کی قوت توڑ دینا۔ اور سورۂ محمد کی آیت میں بھی جو منّ وفداء (یعنی قیدیوں کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لے کر آزاد کرنے) کا اختیار دیا گیا ہے اُس سے پہلے اِثْخَانْ فِی الْاَرْضِ کا بیان ہو چکا ہے یعنی خون ریزی کے ذریعہ کفر کی قوت ٹوٹ جانے کے بعد یہ بھی اختیار ہے کہ قیدیوں کو فدیہ پر یا بلا فدیہ آزاد کر دیا جائے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کی روایت سیر کبیر کا بھی یہی منشاء ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کے حالات اور ضرورت پر نظر کر کے دونوں قسم کے اَحکام دیئے جاسکتے ہیں۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

اے نبی کہہ دے اُن سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں قیدی اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں

خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۰

کچھ نیکی تو دے گا تم کو بہتر اُس سے جو تم سے چھن گیا اور تم کو بخشے گا، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ

اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے پھر اُس نے اُن کو پکڑوا دیا،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے نبی! تم لوگوں کے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں، (اور جنہوں نے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے) اُن سے کہہ دو کہ: ''اگر اللہ تمہارے دِلوں میں بھلائی دیکھے گا تو جو مال تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے، اُس سے بہتر تمہیں دیدے گا، اور تمہاری بخشش کر دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔'' ۝۷۰ اور اگر ان لوگوں نے (اے نبی!) تم سے خیانت

کرنے کا ارادہ کیا، تو یہ اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں تمہارے قابو میں دے دیا، اور اللہ کا علم بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل ﴿۷۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اے پیغمبر آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں (ان میں جو مسلمان ہو گئے ہیں) آپ ان سے فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلب میں ایمان معلوم ہوگا (یعنی تم دل سے مسلمان ہوئے ہو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو مطابق واقع کے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ مسلمان اسی کو جانیں گے جو واقع میں مسلمان ہوگا اور جو شخص غیر مسلم ہوگا اس کو غیر مسلم ہی جانیں گے پس اگر تم دل سے مسلمان ہو گے) تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے (دنیا میں) اس سے بہتر تم کو دے دے گا اور (آخرت میں) تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے تم کو بخش دیں گے اور) بڑی رحمت والے ہیں (اس لئے تم کو نعم البدل دیں گے) اور اگر (بالفرض) یہ لوگ (صدقِ دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں بلکہ اظہارِ اسلام سے محض آپ کو دھوکا ہی دینا چاہیں اور دل میں) آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا (یعنی نقضِ عہد کر کے مخالفت و مقابلہ کا) ارادہ رکھتے ہوں تو (کچھ فکر نہ کیجئے اللہ تعالیٰ ان کو پھر آپ کے ہاتھوں میں گرفتار کرا دے گا جیسا) اس سے پہلے انہوں نے اللہ کے ساتھ خیانت کی تھی (اور آپ کی مخالفت اور مقابلہ کیا) پھر اللہ نے ان کو (آپ کے ہاتھوں میں) گرفتار کرا دیا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں (کہ کون خائن ہے اور) بڑی حکمت والے ہیں (ایسی صورتیں پیدا کر دیتا ہے جس سے خائن مغلوب ہو جائے)۔

معارف و مسائل

غزوۂ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وہ دشمن جنہوں نے ان کے ستانے، مارنے، قتل کرنے میں کسی وقت بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی اور جب موقع مل گیا انتہائی وحشیانہ مظالم ان پر کئے مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو جانے کے بعد ان کی جان بخشی کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی ان کے لئے بڑی غنیمت اور انتہائی لطف و کرم تھا فدیہ میں جو رقم ان سے لی گئی وہ بھی نہایت معمولی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم دیکھئے کہ اس معمولی رقم کے دینے سے جو ایک قسم کی تکلیف ان کو پیش آئی اُس کو بھی کس طرح رفع فرمایا جاتا ہے۔ آیت مذکورہ میں ارشاد ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کوئی خیر پائیں گے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اُس سے بہتر تمہیں دے دیں گے۔ اور اُس پر مزید یہ کہ تمہارے پچھلے گناہ بخش دیں گے۔ خیر سے مراد ایمان اور

اخلاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ان قیدیوں میں جو لوگ ایمان واسلام کو اخلاص کے ساتھ اختیار کر لیں گے تو جو کچھ فدیہ میں دیا ہے اُس سے زیادہ اور بہتر اُن کو مل جائے گا۔ قیدیوں کو آزاد و خود مختار کر دینے کے ساتھ اس طرح دعوت دی گئی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے نفع نقصان پر غور کریں۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ ان لوگوں میں سے جو مسلمان ہو گئے اللہ تعالیٰ نے اُن کی مغفرت اور جنت کے درجاتِ عالیہ کے علاوہ دنیا میں بھی اُن کو اتنا مال و دولت دے دیا جو اُن کے فدیہ سے بدرجہا زائد تھا۔

اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارہ میں نازل ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور اُن سے بھی فدیہ لیا گیا تھا۔ ان کی خصوصیت اس معاملہ میں یہ تھی کہ جنگِ بدر میں یہ مکہ سے اپنے ساتھ تقریباً سات سوگنی سونا لے کر چلے تھے تاکہ وہ لشکرِ کفار پر خرچ کیا جائے۔ اور ابھی یہ خرچ ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ مع اس سونے کے گرفتار کر لئے گئے۔

جب فدیہ دینے کا وقت آیا تو اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے ساتھ جو سونا تھا اُس کو میرے فدیہ کی رقم میں لگا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مال آپ کفر کی امداد کے لئے لائے تھے وہ تو مسلمانوں کا مالِ غنیمت بن گیا۔ فدیہ اُس کے علاوہ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی آپ ادا کریں۔ عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اگر اتنا مالی بار مجھ پر ڈالا گیا تو مجھے قریش سے بھیک مانگنا پڑے گی میں بالکل فقیر ہو جاؤں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیوں کیا آپ کے پاس وہ مال موجود نہیں جو مکہ سے روانگی کے وقت آپ نے اپنی زوجہ اُمّ الفضل کے حوالہ کیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا جبکہ وہ میں نے رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا اور کوئی تیسرا آدمی اس سے واقف نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رَبّ نے اُس کی پوری تفصیل بتلادی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے معتقد تھے مگر کچھ شبہات تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت رفع فرما دیئے اور وہ درحقیقت اسی وقت سے مسلمان ہو گئے۔ مگر ان کا بہت سا روپیہ قریشِ مکہ کے ذمہ قرض تھا۔ اگر یہ اسی وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ روپیہ مارا جاتا اس لئے اعلان نہیں کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ فتح مکہ سے پہلے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آجائیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی ہجرت نہ کریں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ میں آیا ہوا وعدہ بھی اُن کو بتلا دیا کہ اگر

آپ نے اسلام قبول کرلیا اور اخلاص کے ساتھ مؤمن ہو گئے تو جو کچھ مال فدیہ میں خرچ کیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمادیں گے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ اظہارِ اسلام کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھ سے بیس اوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا، اس وقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کا کاروبار کررہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے کم کا نہیں ہے۔ اور اُس پر مزید یہ انعام ہے کہ مجھے حجاج کو آبِ زمزم پلانے کی خدمت مل گئی ہے جو میرے نزدیک ایسا گراں قدر کام ہے کہ سارے اہلِ مکہ کے اموال بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہوں۔

غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کے بارہ میں یہ کھٹک لوگوں کے دل میں تھی کہ شاید یہ لوگ مکہ پہنچ کر اسلام سے پھر جائیں اور پھر ہمیں کوئی نقصان پہنچائیں۔ حق تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں اس خطرہ کو اس طرح دور فرمادیا وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۷۱﴾ یعنی اگر یہ لوگ آپ کے ساتھ خیانت ہی کا ارادہ کرلیں تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ یہ تو وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں یعنی میثاق ازل میں جو اللہ تعالیٰ کے ربّ العالمین ہونے کا اقرار کیا تھا اُس کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی یہ خیانت خود انہیں کے لئے مضر ثابت ہوئی کہ انجام کار ذلیل وخوار اور گرفتار ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ تو دلوں کے رازوں کو جاننے والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اب بھی آپ کی مخالفت کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ سے باہر کہاں چلے جائیں گے وہ پھر ان کو اسی طرح پکڑ لے گا۔ پچھلی آیت میں آزاد ہونے والے قیدیوں کو اسلام کی طرف دعوت ترغیبی انداز میں دی گئی تھی اس آیت میں ترہیب کے ذریعہ اُن کو آگاہ کردیا کہ تمہاری دنیا وآخرت کی بھلائی اسلام وایمان میں منحصر ہے۔

یہاں تک کفار کے ساتھ قتل وقتال اور اُن کے قید کرنے، آزاد کرنے کے اور اُن سے صلح ومصالحت کے اَحکام کا بیان ہورہا تھا۔ اگلی آیات میں آخر سورت تک اسی سلسلہ کے ایک خاص باب کا ذکر اور اُس کے اَحکام کی کچھ تفصیل مذکور ہے اور وہ اَحکامِ ہجرت ہیں کیونکہ کفار کے ساتھ مقابلہ میں کبھی ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں کہ نہ مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ پر قتل وقتال کی طاقت ہے اور نہ وہ صلح پر راضی ہیں۔ ایسی کمزوری کی حالت میں اسلام اور مسلمانوں کی نجات کی راہ ہجرت ہے کہ اس شہر اور ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری زمین میں جاکر قیام کریں جہاں اسلامی اَحکام پر آزادانہ عمل ہوسکے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں

وَالَّذِينَ آوَوْا وَّنَصَرُوْٓا أُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط وَالَّذِينَ آمَنُوْا

اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور جو ایمان لائے

وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ج

اور گھر نہیں چھوڑا تم کو اُن کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑ آئیں،

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ

اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں تو تم کو لازم ہے اُن کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اُن میں اور تم میں عہد ہو، اور اللہ جو تم کرتے ہو اُس کو دیکھتا ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط إِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ

وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم یوں نہ کروگے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں

وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور بڑی خرابی ہوگی۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں

وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْٓا أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ

اور جن لوگوں نے اُن کو جگہ دی اور اُن کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، اُن کے لئے بخشش ہے اور روزی

كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ

عزت کی۔ اور جو ایمان لائے اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے تمہارے ساتھ ہوکر

فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ

سو وہ لوگ بھی تمہیں میں ہیں، اور رشتہ دار آپس میں حق دار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں،

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٥﴾ ع

تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے ہجرت کی ہے، اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے، وہ اور جنہوں نے ان کو (مدینہ میں) آباد کیا، اور ان کی مدد کی، یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی وارث ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، (مگر) انہوں نے ہجرت نہیں کی، جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں، (اے مسلمانو!) تمہارا اُن سے وراثت کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہاں اگر دین کی وجہ سے وہ تم سے کوئی مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد واجب ہے، سوائے اس صورت کے جبکہ وہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف ہو جس کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے اچھی طرح دیکھتا ہے ﴿٧٢﴾ اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی وارث ہیں۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ ﴿٧٣﴾ اور جو لوگ ایمان لے آئے، اور انہوں نے ہجرت کی، اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، وہ اور جنہوں نے انہیں آباد کیا، اور ان کی مدد کی، وہ سب صحیح معنی میں مؤمن ہیں۔ ایسے لوگ مغفرت اور باعزّت رزق کے مستحق ہیں ﴿٧٤﴾ اور جنہوں نے بعد میں ایمان قبول کیا، اور ہجرت کی، اور تمہارے ساتھ جہاد کیا، تو وہ بھی تم میں شامل ہیں۔ اور (ان میں سے) جو لوگ (پُرانے مہاجرین کے) رشتہ دار ہیں، وہ اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے (کی میراث کے دوسروں سے) زیادہ حق دار ہیں۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔ ﴿٧٥﴾

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت بھی کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد بھی کیا (جس کا وقوع لوازم عادیہ ہجرت سے تھا گو مدار حکم توارث نہیں اور یہ جماعت مہاجرین سے ملقب ہے) اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) رہنے کو جگہ دی اور (ان کی) مدد کی (اور یہ جماعت انصار سے ملقب ہے) یہ (دونوں قسم کے) لوگ باہم ایک دوسرے کے وارث ہوں گے اور جو لوگ ایمان تو لائے اور ہجرت نہیں کی تمہارا (یعنی مہاجرین کا) ان سے میراث کا

کوئی تعلق نہیں (نہ یہ ان کے وارث نہ وہ ان کے) جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں (اور جب ہجرت کرلیں پھر وہ بھی اسی حکم میں داخل ہو جائیں گے) اور (گو ان سے تمہارا توارث نہ ہو لیکن) اگر وہ تم سے دین کے کام (یعنی قتال مع الکفار) میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمے (ان کی) مدد کرنا واجب ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں کہ تم میں اور ان میں باہم عہد (صلح کا) ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتے ہیں (پس ان کے مقررہ احکام میں خلل ڈال کر مستحق ناخوشی نہ ہونا) اور (جس طرح باہم تم میں علاقہ توارث کا ہے اسی طرح) جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں (نہ تم ان کے وارث نہ وہ تمہارے وارث) اگر اس (حکم مذکور) پر عمل نہ کرو گے (بلکہ باوجود تخالف دین محض قرابت کی بناء پر مؤمن وکافر میں علاقہ توارث قائم رکھو گے) تو دنیا میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا۔ (کیونکہ توارث سے سب ایک جماعت سمجھی جائے گی اور بدون جدا جماعت ہوئے اسلام کو قوت وشوکت حاصل نہیں ہوسکتی اور ضعف اسلام سرمایہ تمام تر فتنہ وفساد عالم کا ہے جیسا کہ ظاہر ہے) اور (اس حکم توارث بین المہاجرین والانصار میں ہر چند کہ سب مہاجرین برابر ہیں خواہ زمانہ ہجرت نبویہ میں انہوں نے ہجرت کی ہو یا بعد میں لیکن فضیلت ومرتبہ میں باہم متفاوت ہیں چنانچہ) جو لوگ (اوّل) مسلمان ہوئے اور انہوں نے (ہجرتِ نبویہ کے زمانہ میں) ہجرت کی اور (اوّل ہی سے) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہ لوگ (تو) ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں (کیونکہ اس کا حق یہی ہے کہ اس کے قبول کرنے میں سبقت کرے) ان کے لئے (آخرت میں) بڑی مغفرت اور (جنت میں) بڑی معزز روزی (مقرر) ہے اور جو لوگ (ہجرتِ نبویہ کے) بعد کے زمانہ میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد کیا (یعنی کام تو سب کئے مگر بعد میں) سو یہ لوگ (گو فضیلت میں تمہارے برابر نہیں لیکن تاہم) تمہارے ہی شمار میں ہیں (فضیلت میں تو من وجہ کیونکہ اعمال کے تفاضل سے اَحکام شرعیہ میں تفاوت نہیں ہوتا) اور (ان بعد والے مہاجرین میں) جو لوگ (باہم یا مہاجرینِ سابقین کے) رشتہ دار ہیں (گو فضل ورتبہ میں کم ہوں لیکن میراث کے اعتبار سے) کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی یا آیتِ میراث) میں ایک دوسرے (کی میراث) کے (بہ نسبت غیر رشتہ داروں کے) زیادہ حق دار ہیں (گو غیر رشتہ دار فضل ورتبہ میں زیادہ ہوں) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس لئے ہر وقت کی مصلحت کے مناسب حکم مقرر فرماتے ہیں)۔

معارف ومسائل

یہ سورۂ انفال کی آخری چار آیتیں ہیں۔ ان میں اصل مقصود ہجرت کے وہ اَحکام ہیں جن کا تعلق مہاجر مسلمانوں کی وراثت سے ہے۔ اُس کے بالمقابل غیر مہاجر مسلمان اور غیر مسلموں کی وراثت کا بھی ذکر آیا ہے۔

خلاصہ ان اَحکام کا یہ ہے کہ جن لوگوں پر شرعی اَحکام عائد ہوتے ہیں وہ اوّلاً دو قسم پر ہیں۔ مسلم، کافر۔ پھر مسلم اُس

وقت کے لحاظ سے دو قسم کے تھے ایک مہاجر جو مکہ سے ہجرت فرض ہونے پر مدینہ طیبہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ دوسرے غیر مہاجر جو کسی جائز عذر سے یا کسی دوسری وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔

باہمی رشتہ داری اور قرابت ان سب قسم کے افراد میں دائر تھی کیونکہ اوائل اسلام میں بکثرت ایسا تھا کہ بیٹا مسلمان ہے باپ کافر یا باپ مسلمان ہے بیٹا کافر۔ اسی طرح بھائی بھتیجوں اور نانے ماموں وغیرہ کا حال۔ اور مسلمان مہاجر اور غیر مہاجر میں رشتہ داریاں ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی وجہ سے مرنے والے انسان کے چھوڑے ہوئے مال کا مستحق اُسی کے قریبی عزیزوں، رشتہ داروں کو قرار دیا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ جس کو جو کچھ دنیا میں ملا وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کی ملک حقیقی تھا، اُسی کی طرف سے زندگی بھر استعمال کرنے، نفع اُٹھانے کے لئے انسان کو دے کر عارضی مالک بنا دیا گیا تھا اس لئے تقاضائے عقل وانصاف تو یہ تھا کہ ہر مرنے والے کا ترکہ اللہ تعالیٰ کی ملک کی طرف لوٹ جاتا جس کی عملی صورت اسلامی بیت المال میں داخل کرنا تھا جس کے ذریعہ ساری خلق خدا تعالیٰ کی پرورِش اور تربیت ہوتی ہے۔ مگر ایسا کرنے میں ایک تو ہر انسان کے طبعی جذبات کو ٹھیس لگتی جبکہ وہ جانتا کہ میرا مال میرے بعد نہ میری اولاد کو ملے گا نہ ماں باپ اور بیوی کو۔ اور پھر اس کا یہ نتیجہ بھی طبعی طور پر لازمی سا تھا کہ کوئی شخص اپنا مال بڑھانے اور اُس کو محفوظ رکھنے کی فکر نہ کرتا صرف اپنی زندگی کی حد تک ضروریات جمع رکھنے سے زائد کوئی شخص محنت وجانفشانی نہ کرتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ پورے انسانوں اور شہروں کے لئے تباہی وبربادی کی صورت اختیار کرتا۔

اس لئے حق تعالیٰ جل شانہٗ نے میراث کو انسان کے رشتہ داروں کا حق قرار دے دیا بالخصوص ایسے رشتہ داروں کا جن کے فائدہ ہی کے لئے وہ اپنی زندگی میں مال جمع کرتا اور طرح طرح کی محنت مشقت اُٹھاتا تھا۔

اس کے ساتھ اسلام نے اُس اہم مقصد کو بھی وراثت کی تقسیم میں سامنے رکھا جس کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت۔ اور اس کے لحاظ سے پورے عالم انسان کو دو الگ الگ قومیں قرار دے دیا۔ مؤمن اور کافر۔ آیت قرآن خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ [1] (التغابن: ۲) کا یہی مطلب ہے۔

اسی دو قومی نظریہ نے نسبی اور خاندانی رشتوں کو میراث کی حد تک قطع کر دیا کہ نہ کسی مسلمان کو کسی رشتہ دار کافر کی میراث سے کوئی حصہ ملے گا اور نہ کسی کافر کا کسی مسلمان رشتہ دار کی وراثت میں کوئی حق ہوگا۔ پہلی دو آیتوں میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اور یہ حکم دائمی اور غیر منسوخ حکم ہے کہ اوّل اسلام سے لے کر قیامت تک یہی اسلام کا اصولِ وراثت ہے۔

اس کے ساتھ ایک دوسرا حکم مسلمان مہاجر اور غیر مہاجر دونوں کے آپس میں وراثت کا ہے۔ جس کے متعلق پہلی

---

[1] ترجمہ: وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا سو تم میں بعضے کافر ہیں اور بعضے مؤمن ہیں۔

آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان جب تک مکہ سے ہجرت نہ کرے اُس وقت تک اس کا تعلق بھی ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے وراثت کے بارہ میں منقطع ہے۔ نہ مہاجر مسلمان اپنے غیر مہاجر مسلمان رشتہ دار کا وارث ہوگا اور نہ غیر مہاجر کسی مہاجر مسلمان کی وراثت سے کوئی حصہ پائے گا یہ حکم ظاہر ہے کہ اُس وقت تک تھا جب تک کہ مکہ مکرمہ فتح نہیں ہوا تھا فتح مکہ کے بعد تو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا تھا لَا ھِجْرَۃَ بَعْدَ الْفَتْحِ۔[1] یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم ختم ہوگیا اور جب ہجرت کا حکم ہی ختم ہوگیا تو ترک ہجرت کرنے والوں سے بے تعلقی کا سوال ختم ہوگیا۔

اسی لئے اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم فتح مکہ سے منسوخ ہو چکا ہے اور اہل تحقیق کے نزدیک یہ حکم بھی دائمی غیر منسوخ ہے مگر حالات کے تابع بدلا ہے۔ جن حالات میں نزولِ قرآن کے وقت یہ حکم آیا تھا اگر کسی زمانہ میں یا کسی ملک میں پھر ویسے ہی حالات پیدا ہو جائیں تو پھر یہی حکم جاری ہو جائے گا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہر مسلمان مرد و عورت پر مکہ سے ہجرت کو فرضِ عین قرار دیا گیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں بجز معدودے چند مسلمانوں کے سبھی مسلمان ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے تھے اور اُس وقت مکہ سے ہجرت نہ کرنا اس کی علامت بن گیا تھا کہ وہ مسلمان نہیں اس لئے اُس وقت غیر مہاجر کا اسلام بھی مشتبہ اور مشکوک تھا اس لئے مہاجر اور غیر مہاجر کی باہمی وراثت کو قطع کر دیا گیا تھا۔

اب اگر کسی ملک میں پھر بھی ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں کہ وہاں رہ کر اسلامی فرائض کی ادائیگی بالکل نہ ہو سکے تو اس ملک سے ہجرت کرنا پھر فرض ہو جائے گا اور ایسی حالت میں بلا عذر قوی ہجرت نہ کرنا اگر یقینی طور پر علامت کفر کی ہو جائے تو پھر بھی یہی حکم عائد ہوگا کہ مہاجر اور غیر مہاجر میں باہمی وراثت جاری نہ رہے گی۔ اس تقریر سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مہاجر اور غیر مہاجر میں قطعِ وراثت کا حکم درحقیقت کوئی جداگانہ حکم نہیں بلکہ وہ پہلا ہی حکم ہے جو مسلم اور غیر مسلم میں قطع وراثت کو بیان کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس علامتِ کفر کی وجہ سے وراثت سے تو محروم کر دیا گیا مگر محض اتنی علامت کی وجہ سے اُس کو کافر نہیں قرار دیا جب تک اُس سے صریح اور واضح طور پر کفر کا ثبوت نہ ہو جائے۔

اور غالباً اسی مصلحت سے اس جگہ ایک اور حکم غیر مہاجر مسلمانوں کا ذکر کر دیا گیا ہے کہ اگر وہ مہاجر مسلمانوں سے امداد و نصرت کے طالب ہوں تو مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کرنا ضروری ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ غیر مہاجر مسلمانوں کو بالکل کافروں کی صف میں نہیں رکھا بلکہ اُن کا یہ اسلامی حق باقی رکھا گیا کہ ضرورت کے وقت اُن کی امداد کی جائے۔

اور چونکہ اس آیت کا شانِ نزول ایک خاص ہجرت ہے مکہ سے مدینہ کی طرف اور غیر مہاجر مسلمان وہی تھے جو مکہ میں رہ گئے تھے اور کفارِ مکہ کے نرغہ میں تھے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کا امداد طلب کرنا انہیں کفارِ مکہ کے مقابلہ میں ہو سکتا تھا۔ اور جب قرآنِ کریم نے مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کا حکم دے دیا تو بظاہر اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ ہر حال میں اور ہر قوم

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب فضل الجهاد والسیر ج: ۱ ص: ۳۹۰

کے مقابلہ میں ان کی امداد کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اگر چہ وہ قوم جس کے مقابلہ پر اُن کو امداد مطلوب ہے اُس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ التواء جنگ کا بھی ہو چکا ہو۔ حالانکہ اصولِ اسلام میں عدل وانصاف اور معاہدہ کی پابندی ایک اہم فریضہ ہے۔ اس لئے اسی آیت میں ایک استثنائی حکم یہ بھی ذکر فرمادیا گیا کہ اگر غیر مہاجر مسلمان مہاجر مسلمانوں سے کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر مدد طلب کریں جس سے مسلمانوں نے ترکِ جنگ کا معاہدہ کر رکھا ہے تو پھر اپنے بھائی مسلمانوں کی امداد بھی معاہد کفار کے مقابلہ میں جائز نہیں۔

یہ خلاصۂ مضمون ہے پہلی دو آیتوں کا۔ اب الفاظ سے اس کو ملا کر دیکھئے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ

یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے وطن اور اعزاء واقرباء کو چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ مال خرچ کر کے ہتھیار اور سامانِ جنگ خریدا اور میدانِ جنگ کے لئے اپنی جانوں کو پیش کر دیا۔ اس سے مراد مہاجرینِ اوّلین ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے رہنے کو جگہ دی اور مدد کی۔ اس سے مراد انصارِ مدینہ ہیں۔ ان دونوں فریق کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔

اس جگہ قرآن کریم نے لفظ ولی اور ولایت استعمال فرمایا ہے جس کے اصلی معنی دوستی اور گہرے تعلق کے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ، حسنؒ، قتادہؒ، مجاہدؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس جگہ ولایت سے مراد وراثت اور ولی سے مراد وارث ہے اور بعض حضرات نے ولایت کے لغوی معنی یعنی دوستی اور امداد واعانت ہی مراد لئے۔

پہلی تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان مہاجر وانصار آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے ان کا تعلق وراثت نہ غیر مسلم کے ساتھ قائم رہے گا نہ اُن مسلمانوں کے ساتھ جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ پہلا حکم یعنی اختلافِ دین کی بنا پر قطع وراثت تو دائمی اور باقی رہا مگر دوسرا حکم فتح مکہ کے بعد جبکہ ہجرت ہی کی ضرورت نہ رہی تو مہاجر اور غیر مہاجر میں قطع وراثت کا حکم بھی باقی نہ رہا۔ اس سے بعض فقہاء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اختلافِ دین قطع وراثت کا سبب ہے اسی طرح اختلافِ دارین بھی قطع وراثت کا سبب ہے جس کی تفصیلی بحث کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰي قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ یعنی یہ لوگ جنہوں نے ہجرت نہیں کی اگر چہ ان سے تعلق وراثت منقطع کر دیا گیا ہے مگر وہ بہرحال مسلمان ہیں اگر وہ اپنے دین کی حفاظت کے لئے مہاجر مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کے ذمہ اُن کی امداد کرنا واجب ہے۔ مگر اس کے ساتھ اصول عدل وانصاف اور پابندیٔ معاہدہ کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے اگر وہ کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر تم سے امداد

طلب کریں جس قوم سے تمہارا معاہدہ ترکِ جنگ کا ہو چکا ہے تو اُن کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کی امداد بھی جائز نہیں۔

صلح حدیبیہ کے وقت ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے صلح کر لی اور شرائطِ صلح میں یہ بھی داخل تھا کہ مکہ سے جو شخص اب مدینہ جائے اُس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دیں۔ عین اسی معاملۂ صلح کے وقت ابو جندل رضی اللہ عنہ جن کو کفار مکہ نے قید کر کے طرح طرح کی تکلیفوں میں ڈالا ہوا تھا کسی طرح حاضرِ خدمت ہو گئے اور اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کے طالب ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمتِ عالم بن کر آئے تھے ایک مظلوم مسلمان کی فریاد سے کتنے متأثر ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لئے آسان نہیں مگر اس تأثر کے باوجود آیتِ مذکورہ کے حکم کے مطابق اُن کی امداد کرنے سے عذر فرما کر واپس کر دیا۔

ان کی یہ واپسی سبھی مسلمانوں کے لئے انتہائی دل آزار تھی مگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ارشاداتِ ربانی کے ماتحت گویا اس کا مشاہدہ فرما رہے تھے کہ اب ان مظالم کی عمر زیادہ نہیں رہی اور چند روز کے صبر کا ثواب ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اور ملنا ہے اس کے بعد بہت جلد مکہ فتح ہو کر یہ سارے قصے ختم ہونے والے ہیں۔ بہر حال اس وقت ارشادِ قرآنی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی پابندی کو ان کی شخصی مصیبت پر ترجیح دی۔ یہی شریعتِ اسلام کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اُن کو دنیا میں فتح و عزّت اور آخرت کی فلاح کا مالک بنایا ہے۔ ورنہ عام طور پر دنیا کی حکومتیں معاہدات کا ایک کھیل کھیلتی ہیں جس کے ذریعہ کمزور کو دبانا اور قوت والے کو فریب دینا مقصد ہوتا ہے۔ جس وقت اپنی ذرا سی مصلحت سامنے ہوتی ہے تو سو طرح کی تاویلیں کر کے معاہدہ کو ختم کر ڈالتے ہیں اور الزام دوسروں کے سر لگانے کی فکر کرتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ یعنی کافر لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ لفظ **ولی** جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ایک عام مفہوم رکھتا ہے جس میں وراثت بھی داخل ہے اور معاملات کی ولایت و سرپرستی بھی۔ اس لئے اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث سمجھے جائیں گے اور تقسیمِ وراثت کا جو قانون اُن کے اپنے مذہب میں رائج ہے اُن کی وراثت کے معاملہ میں اُسی قانون کو نافذ کیا جائے گا۔ نیز ان کے یتیم بچوں کا ولی لڑکیوں کے نکاح کا ولی بھی اُنہیں میں سے ہوگا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عائلی مسائل میں غیر مسلموں کا اپنا مذہبی قانون اسلامی حکومت میں محفوظ رکھا جائے گا۔

آخر آیت میں ارشاد ہے اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ یعنی اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پوری زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

اس جملہ کا تعلق اُن تمام اَحکام کے ساتھ ہے جو اس سے پہلے ذکر کئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ مہاجرین و انصار کو آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہونا چاہئے جس میں باہمی امداد و اعانت بھی داخل ہے اور وراثت بھی۔ دوسرے یہ کہ اس

وقت کے مہاجر اور غیر مہاجر مسلمانوں کے آپس میں وراثت کا تعلق نہ رہنا چاہیئے۔ مگر امداد و نصرت کا تعلق اپنی شرائط کے ساتھ باقی رہنا چاہیئے تیسرے یہ کہ کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اُن کے قانون ولایت اور وراثت میں کوئی دخل اندازی مسلمانوں کو نہیں چاہیئے۔

اگر ان اَحکام پر عمل نہ کیا گیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ یہ تنبیہ غالباً اس لئے کی گئی کہ جو اَحکام اس جگہ بیان ہوئے ہیں وہ عدل وانصاف اور امن عامہ کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان آیات نے یہ واضح کر دیا کہ باہمی امداد و اعانت اور وراثت کا تعلق جیسے رشتہ داری پر مبنی ہے ایسے ہی اس میں مذہبی اور دینی رشتہ بھی قابل لحاظ ہے بلکہ نسبی رشتہ پر دینی رشتہ کو ترجیح حاصل ہے اسی وجہ سے کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اگر چہ وہ آپس میں نسبی رشتہ سے باپ اور بیٹے یا بھائی بھائی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی تعصب اور عصبیتِ جاہلیت کی روک تھام کرنے کے لئے یہ بھی ہدایت دے دی گئی ہے کہ مذہبی رشتہ اگر چہ اتنا قوی اور مضبوط ہے مگر معاہدہ کی پابندی اس سے بھی زیادہ مقدم اور قابل ترجیح ہے۔ مذہبی تعصب کے جوش میں معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہدایت دے دی گئی کہ کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور وارث ہیں اُن کی شخصی ولایت و وراثت میں مداخلت نہ کی جائے۔ دیکھنے کو تو یہ چند فرعی اور جزئی اَحکام ہیں مگر درحقیقت امن عالم کے لئے عدل وانصاف کے بہترین اور جامع بنیادی اصول ہیں۔ اسی لئے اس جگہ ان اَحکام کو بیان فرمانے کے بعد ایسے الفاظ سے تنبیہ فرمائی گئی جو عام طور پر دوسرے اَحکام کے لئے نہیں کی گئی کہ اگر تم نے ان اَحکام پر عمل نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ ان الفاظ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اَحکام فتنہ وفساد کو روکنے میں خاص دخل اور اثر رکھتے ہیں۔

تیسری آیت میں مکہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ اور اُن کی مدد کرنے والے انصارِ مدینہ کی تعریف وثنا اور اُن کے سچا مسلمان ہونے کی شہادت اور اُن سے مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ مذکور ہے ارشاد فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یعنی یہی لوگ سچے پکے مسلمان ہیں اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ ہجرت نہ کرنے والے حضرات بھی اگر چہ مسلمان ہیں مگر اُن کا اسلام کامل بھی نہیں اور یقینی بھی نہیں کیونکہ یہ احتمال بھی ہے کہ در اصل منافق ہوں بظاہر اسلام کا دعویٰ رکھتے ہوں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ یعنی اُن کے لئے مقرر ہے مغفرت۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں ہے اَلْاِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ وَالْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا۔ [1] یعنی مسلمان ہو جانا پچھلے سب گناہوں کے انبار کو ڈھا دیتا ہے اسی طرح ہجرت کرنا پچھلے سب گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں مہاجرین کے مختلف طبقات کا حکم بیان فرمایا ہے کہ اگر چہ اُن میں بعض لوگ مہاجرین اوّلین ہیں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب کون الإسلام یھدم ما قبلہ وکذا الھجرۃ، ج: ۱ ص: ۷۶

جنہوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے ہجرت کی اور بعض دوسرے درجہ کے مہاجر ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی اور اس کی وجہ سے اُن کے اُخروی درجات میں فرق ہوگا مگر اَحکامِ دنیا میں اُن کا حکم بھی وہی ہے جو مہاجرین اوّلین کا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ اسی لئے مہاجرین کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ یعنی یہ دوسرے درجہ کے مہاجرین بھی تمہارے ہی زمرہ میں شامل ہیں اس لئے وراثت کے اَحکام میں بھی ان کا حکم عام مہاجرین کی طرح ہے۔

یہ سورۂ انفال کی بالکل آخری آیت ہے اس کے آخر میں قانونِ میراث کا ایک جامع ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے جس کے ذریعہ اُس عارضی حکم کو منسوخ کردیا گیا ہے جو اوائلِ ہجرت میں مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کے ذریعہ ایک دوسرے کا وارث بننے کے متعلق جاری ہوا تھا وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۔

لفظ اُولُو عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے جس کا ترجمہ اُردو میں والے سے کیا جاتا ہے، اُولوالعقل عقل والے، اُولوالامر اَمر والے، اس لئے اُولُوا الْاَرْحَامِ کے معنی ہوئے ارحام والے اَرحام رَحم کی جمع ہے، جو اصل میں اُس عضو کا نام ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لئے اُولوالارحام رشتہ داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ ایک ولایت عامہ سب مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے جس کے سبب بوقت ضرورت ایک دوسرے کی امداد واعانت بھی واجب ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں لیکن جو مسلمان آپس میں قرابت اور رشتہ کا تعلق رکھتے ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے مقدم ہیں۔ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ کے معنی اس جگہ فِي حُكْمِ اللهِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم خاص سے یہ قانون بنادیا ہے۔

اس آیت نے یہ ضابطہ بتادیا کہ تقسیمِ وراثت رشتہ داری کے معیار پر ہونا چاہئے۔ اور لفظ اُولُوا الْاَرْحَامِ مطلقاً اقرباء اور رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اُن میں سے خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے سورۂ نساء میں متعین فرمادیئے جن کو علمِ میراث کی اصطلاح میں اہلِ فرائض یا ذَوِی الْفُرُوْض کہا جاتا ہے، اُن کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی کا مال تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں کیونکہ دُور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلاشبہ موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی باپ اور ماں آدم وحوّاء علیہما السلام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔ جس کا تفصیلی بیان احادیث رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح موجود ہے کہ ذَوِی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میّت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔

اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علم میراث و فرائض کی خاص اصطلاح میں لفظ ذَوِی الارحام انہیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرّر کی گئی ہے قرآن کریم میں اُولُوا الْاَرْحَامِ کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے جس میں ذَوِی الفروض۔ اور عصبات اور ذَوِی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں۔

پھر اُس کی کچھ تفصیل سورۂ نساء کی آیات میں آ گئی جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیئے جن کو اصطلاحِ میراث میں ذَوِی الْفُرُوْض کہتے ہیں اور باقی کے متعلق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَكَرٍ۔ (بخاری)[1]

یعنی جن کے حصے قرآن نے مقرّر کر دیئے ہیں وہ پورے اُن کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میّت سے قریب تر مرد ہوں۔

ان کو اصطلاحِ میراث میں عصبات کہا جاتا ہے۔ اگر کسی میّت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذَوِی الارحام کہتے ہیں جیسے ماموں خالہ وغیرہ۔

سورۂ انفال کی اس آخری آیت کے آخری جملہ نے اسلامی وراثت کا وہ قانون منسوخ کر دیا جو اس سے پہلی آیات میں مذکور ہے جن کی رو سے مہاجرین و انصار میں باہمی وراثت جاری ہوتی تھی اگرچہ ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو کیونکہ یہ حکم ایک ہنگامی حکم ہے جو اوائلِ ہجرت کے وقت دیا گیا تھا۔

سورۂ انفال ختم ہوگئی اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُس کے سمجھنے اور پھر اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

تمت سورة الأنفال بعون الله تعالىٰ وحمده ليلة الخميس لثماني

وعشرين من جمادى الأُخرىٰ ١٣٨١ھ واسأل الله تعالىٰ التوفيق

والعون في تفسير سورة التوبة ولله الحمد اوله واٰخره۔

محمد شفیع عفی عنہ

وتم النظر الثاني عليه يوم الجمعة لتسعة عشر من

جمادى الاولىٰ ١٣٩٠ھ والحمد لله علىٰ ذٰلك۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه ج: ۲ ص: ۹۹۷

سُورَۃُ التَّوبَۃِ

اٰیاتھا ۱۲۹ ۹ سُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۳ رکوعاتھا ۱۶

سورۂ توبہ مدینہ میں اُتری اور اُس کی ایک سو اُنتیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی، ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ

سو پھر لو اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکوگے اللہ کو

وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ

اور یہ کہ اللہ رُسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔ اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی، لوگوں کو

يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ

دن بڑے حج کے کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے، اور اُس کا رسول،

فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر نہ مانو تو جان لو کہ تم ہرگز

غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۳

نہ تھکا سکو گے اللہ کو، اور خوش خبری سنادے کافروں کو عذاب دردناک کی۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔـا

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ

وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ

اور مدد نہ کی تمہارے مقابلہ میں کسی کی سو ان سے پورا کردو ان کا عہد ان کے وعدہ تک،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا

بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے۔ پھر جب گزر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو

الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ

مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو

وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں، پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ

فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵

تو چھوڑ دو ان کا رستہ، بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) یہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے دستبرداری کا اعلان ہے اُن تمام مشرکین کے خلاف جن سے تم نے معاہدہ کیا ہوا ہے۔ ① لہٰذا (اے مشرکو!) تمہیں چار مہینے تک اجازت ہے کہ تم (عرب کی) سرزمین میں آزادی سے گھومو پھرو، اور یہ بات جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور یہ بات بھی کہ اللہ اب کافروں کو رُسوا کرنے والا ہے ② اور حج اکبر کے دن اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے تمام انسانوں کے لئے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ بھی مشرکین سے دست بردار ہو چکا ہے، اور اُس کا رسول بھی۔ اب (اے مشرکو!) اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہوگا، اور اگر تم نے (اب بھی) منہ موڑے رکھا تو یاد رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور تمام کافروں کو ایک دُکھ دینے والے عذاب کی ''خوشخبری'' سنادو ③ البتہ (مسلمانو!) جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا، پھر ان لوگوں نے تمہارے ساتھ عہد میں کوئی کوتاہی نہیں کی، اور تمہارے خلاف کسی کی مدد بھی نہیں کی، تو اُن کے ساتھ کئے ہوئے معاہدے کی مدّت کو پورا کرو۔ بیشک اللہ احتیاط کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ④ چنانچہ جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو ان مشرکین کو (جنہوں نے تمہارے ساتھ بدعہدی کی تھی) جہاں بھی پاؤ، قتل کر ڈالو، اور انہیں پکڑو، انہیں گھیرو، اور انہیں پکڑنے کے لئے ہر گھات کی جگہ تاک لگا کر بیٹھو۔ ہاں اگر وہ توبہ کرلیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں تو اُن کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ⑤

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری ہے جن سے تم نے (بلا تعیین مدت) عہد کر رکھا تھا (یہ جماعت سوم کا حکم ہے ان جماعتوں کی تفصیل معارف ومسائل میں آرہی ہے) اور جماعت چہارم یعنی جن سے کچھ بھی عہد نہ تھا ان کا بھی حکم اس سے بدرجۂ اولیٰ مفہوم ہوگیا کہ جب معاہدین سے رفع امان کر دیا تو غیر معاہدین میں تو کوئی احتمال امن کا پہلے سے بھی نہیں ہے) سو (ان دونوں جماعتوں کو اطلاع کر دو کہ) تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو (اجازت ہے تاکہ اپنا موقع اور پناہ ڈھونڈھ لو) اور (اس کے ساتھ) یہ (بھی) جان رکھو کہ (اس مہلت کی بدولت صرف مسلمانوں کی دست برد سے بچ سکتے ہو لیکن) تم خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے قبضہ سے نکل سکو) اور یہ (بھی جان رکھو) کہ بے شک اللہ تعالیٰ (آخرت میں) کافروں کو رسوا کریں گے (یعنی عذاب دیں گے۔ تمہاری سیاحت اس سے نہیں بچا سکتی اور احتمالِ قتل دنیا میں الگ رہا۔ اس میں ترغیب ہے توبہ کی) اور (پہلی دوسری

جماعت کا حکم یہ ہے کہ) اللہ اور اس کا رسول دونوں (بدون مقرر کرنے کسی میعاد کے ابھی) دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین (کو امن دینے) سے (جنہوں نے خود نقضِ عہد کیا۔ مراد جماعت اول ہے مگر) پھر (بھی ان سے کہا جاتا ہے کہ) اگر تم (کفر سے) توبہ کرلو تو تمہارے لئے (دونوں جہان میں) بہتر ہے (دنیا میں تو اس لئے کہ تمہاری عہد شکنی معاف ہوجائے گی اور قتل سے بچ جاؤ گے اور آخرت میں ظاہر ہے کہ نجات ہوگی) اور اگر تم نے (اسلام سے) اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کرسکو گے (کہ کہیں نکل کر بھاگ جاؤ) اور (آگے خدا کو عاجز نہ کرسکنے کی تفسیر ہے کہ) ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے (جو آخرت میں واقع ہوگی یہ تو یقینی اور احتمال سزائے دنیا کا الگ، مطلب یہ ہوا کہ اگر اعراض کروگے تو سزا بھگتو گے) ہاں مگر وہ مشرکین (اس رفع امان و دست برداری سے) مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انہوں نے (عہد پورا کرنے میں) تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں (تمہارے) کسی (دشمن) کی مدد کی (مراد اس سے جماعت دوم ہے) سو ان کے معاہدہ کو ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کردو (اور بدعہدی نہ کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم احتیاط رکھو گے تو تم بھی پسندیدۂ حق ہوجاؤ گے۔ آگے جماعت اوّل کے حکم کا تتمہ ہے کہ جب ان کو کوئی مہلت نہیں تو گو ان سے ابھی قتال کی گنجائش ہوسکتی تھی لیکن ابھی محرم کے ختم تک اشہر حرم مانع قتال ہیں) سو (ان کے گزرنے کا انتظار کرلو اور) جب اشہر حرم گزر جائیں تو (اس وقت) ان مشرکین (جماعت اوّل) کو جہاں پاؤ مارو پکڑو باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو (یعنی لڑائی میں جو جو ہوتا ہے سب کی اجازت ہے) پھر اگر (کفر سے) توبہ کرلیں اور (اسلام کے کام کرنے لگیں یعنی مثلاً) نماز پڑھنے لگیں، زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو (یعنی قتل و قید مت کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں (اس واسطے ایسے شخص کا کفر بخش دیا اور اس کی جان بچالی اور یہی حکم بقیہ جماعت کا ہوگا ان کی میعادیں گزرنے کے بعد)۔

معارف و مسائل

سورۂ براءت شروع ہورہی ہے جس کو سورۂ توبہ بھی کہا جاتا ہے۔ براءت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُس میں کفار سے براءت کا ذکر ہے اور توبہ اس لئے کہ اُس میں مسلمانوں کی توبہ قبول ہونے کا بیان ہے (مظہری)[1]۔ اس سورت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصاحفِ قرآن میں اس سورت کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی اس کے سوا تمام قرآنی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید تئیس سال کے عرصہ

[1] التفسير المظهري في إبتداء سورة التوبة ج:۴ ص:۱۳۱

میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے ایک ہی سورت کی آیتیں مختلف اوقات میں نازل ہوئیں جبریلِ امین جب وحی لے کر آتے تو ساتھ ہی بحکمِ الٰہی یہ بھی بتلاتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھی جائے۔ اسی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاتبینِ وحی کو ہدایت فرما کر لکھوا دیتے تھے۔

اور جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری سورت شروع ہوتی تھی تو سورت شروع ہونے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ پہلی سورت ختم ہوگئی اب دوسری سورت شروع ہو رہی ہے۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں ایسا ہی ہوا۔ سورۂ توبہ نزول کے اعتبار سے بالکل آخری سورتوں میں سے ہے۔ اس کے شروع میں عام دستور کے مطابق نہ بسم اللہ نازل ہوئی اور نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبِ وحی کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اسی حال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

جامعِ قرآن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے عہد میں جب قرآن مجید کو کتابی صورت میں ترتیب دیا تو سب سورتوں کے خلاف سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ تھی اس لئے یہ شبہ ہوگیا کہ شاید یہ کوئی مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جز ہو۔ اب اس کی فکر ہوئی کہ اگر یہ کسی دوسری سورت کا جزء ہو تو وہ کونسی سورت ہو سکتی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے سورۂ انفال اس کے مناسب معلوم ہوئی۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان دونوں سورتوں کو قرینتین یعنی ملی ہوئی کہا جاتا تھا (مظہری)۔ [1] اس لئے سورۂ انفال کے بعد اس کو رکھ دیا گیا یہ احتیاط تو اس لئے کی گئی کہ دوسری سورت کا جز ہو تو اُس کے ساتھ رہنا چاہئے مگر احتمال یہ بھی تھا کہ علیحدہ مستقل سورت ہو اس لئے لکھنے میں یہ صورت اختیار کی گئی کہ سورۂ انفال کے ختم پر سورۂ توبہ کے شروع سے پہلے کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی جیسے عام سورتوں میں بسم اللہ کی جگہ ہوتی ہے۔

سورۂ براءت یا توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی یہ تحقیق خود جامع قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی میں مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک سوال کے جواب میں منقول ہے۔ اس سوال میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عثمان غنیؓ سے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ قرآن کی سورتوں کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے کہ سب سے پہلے بڑی سورتیں رکھی گئیں جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہوں جن کو اصطلاح میں مئین کہا جاتا ہے اُس کے بعد وہ بڑی سورتیں رکھی گئی ہیں جن میں سو سے کم آیات ہیں جن کو مثانی کہا جاتا ہے۔ اُس کے بعد چھوٹی سورتیں رکھی گئی ہیں جن کو مفصلات کہا جاتا ہے۔ اس ترتیب کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سورۂ توبہ کو سورۂ انفال سے پہلے رکھا جائے

---

[1] حاشية التفسير المظهري في إبتداء سورة التوبة ج:١ ص:١٣١، وكنز العمال رقم الحديث: ٤٧٧١

کیونکہ سورۂ توبہ کی آیتیں سو سے زائد اور انفال کی سو سے کم ہیں۔ شروع کی سات طویل سورتیں جن کو سبع طوال کہا جاتا ہے اُس میں بھی بجائے انفال کے سورۂ توبہ ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس کے خلاف کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن قرآن کے معاملہ میں احتیاط کا مقتضیٰ وہی ہے جو اختیار کیا گیا۔ کیونکہ اگر سورۂ توبہ مستقل سورت نہ ہو بلکہ سورۂ انفال کا جز ہو تو یہ ظاہر ہے کہ سورۂ انفال کی آیات پہلے نازل ہوئی ہیں اور توبہ کی اُس کے بعد، اس لئے اُن کو انفال کی آیات پر مقدم کرنا بغیر وحی کے جائز نہیں اور وحی میں ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملی اس لئے انفال کو مقدم اور توبہ کو مؤخر کیا گیا۔ [۱]

اس تحقیق سے یہ معلوم ہوگیا کہ سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا احتمال ہے کہ سورۂ توبہ علیحدہ سورت نہ ہو بلکہ انفال کا جز ہو اس احتمال پر یہاں بسم اللہ لکھنا ایسا نادرست ہوگا جیسے کوئی شخص کسی سورت کے درمیان بسم اللہ لکھ دے۔

اسی بناء پر حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۂ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۂ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے۔ لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے اُس کو چاہئے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کرے بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں، یہ غلط ہے اور اُس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجائے بسم اللہ کے یہ لوگ اس کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے نہیں ہے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ منقول ہے کہ سورۂ براءت کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان ہے اور سورۂ براءت میں کفار کے امان اور عہد و پیمان کو ختم کیا گیا ہے۔ [۲] سو یہ ایک نکتہ اور لطیفہ ہے جو اصلی سبب کے منافی نہیں۔ یعنی اصلی سبب تو یہی ہے کہ سورۂ انفال اور توبہ کے ایک ہونے کے احتمال کی بنا پر بسم اللہ نہیں لکھی گئی پھر اس نہ لکھے جانے کا ایک لطیفہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سورت میں کفار سے براءت اور رفع امان مذکور ہے جو بسم اللہ کے مناسب نہیں اس لئے تکوینی طور پر یہاں ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے کہ بسم اللہ یہاں نہ لکھی جائے۔

سورۂ توبہ کی آیاتِ مذکورہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے چند واقعات کا جاننا ضروری ہے جن کے سبب سے یہ

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من جهرها (البسملة) ج:۱ ص۱۱۴، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة التوبة ج:۲ ص:۱۳۹، ومسند احمد رقم الحديث: ۵۰۹، مسند عثمان بن عفان رضی الله عنه۔

[۲] المستدرك للحاكمؒ، باب تفسير سورة التوبة رقم الحديث: ۳۲۳۱

آیات نازل ہوئی ہیں اس لئے پہلے ان واقعات کی مختصر تفصیل لکھی جاتی ہے۔

۱- پوری سورۂ توبہ میں چند غزوات اور اُن سے متعلقہ واقعات کا اور اُن کے ضمن میں بہت سے اَحکام و مسائل کا بیان ہوا ہے۔ مثلاً تمام قبائل عرب سے معاہدات کا ختم کر دینا، فتح مکہ، غزوۂ حنین، غزوۂ تبوک۔ ان واقعات میں فتح مکہ سب سے پہلے ۸ھ ہجری میں پھر غزوۂ حنین اسی سال میں پھر غزوۂ تبوک رجب ۹ھ ہجری میں پھر تمام قبائلِ عرب سے معاہدات ختم کرنے کا اعلان ذی الحجہ ۹ھ ہجری میں ہوا۔

۲- نبذ عہد یعنی معاہدات ختم کر دینے کے متعلق جو مضامین ان آیات میں مذکور ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ۶ھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا قصد فرمایا اور قریش مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ اور مقامِ حدیبیہ میں ان سے صلح ہوئی۔ اس صلح کی میعاد روح المعانی کی نقل کے مطابق دس سال کی تھی۔[1] مکہ میں علاوہ قریش کے دوسرے قبائل بھی تھے معاہدہ صلح کی ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں جس کا جی چاہے وہ قریش کا حلیف اور ساتھی بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف ہو کر آپ کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ قبیلہ خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف بننا پسند کیا اور آپ کے ساتھ ہو گئے اور قبیلہ بنی بکر نے قریش کے ساتھ ہونا اختیار کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ لازمی تھا کہ دس سال کے اندر نہ باہمی جنگ ہوگی نہ کسی جنگ کرنے والے کو کسی جانب سے کوئی مدد دی جائے گی اور جو قبیلہ کسی فریق کا حلیف ہے وہ بھی اُسی کے حکم میں سمجھا جائے گا کہ اُس پر حملہ کرنا یا حملہ آور کو مدد دینا معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

یہ معاہدہ ۶ھ ہجری میں ہوا ۷ھ ہجری میں معاہدہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے فوت شدہ عمرہ کی قضاء کرنے کے لئے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے اور تین روز قیام کر کے حسبِ معاہدہ واپس تشریف لے آئے، اُس وقت تک کسی فریق کی طرف سے معاہدۂ صلح کی کوئی خلاف ورزی نہ تھی۔

اس کے بعد پانچ چھ ماہ گزرے تھے کہ قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ خزاعہ پر رات کے وقت چھاپہ مارا اور قریش نے بھی یہ سمجھ کر کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت دور ہیں اور رات کا وقت ہے آپ تک واقعہ کی تفصیلات پہنچنا مشکل ہے اس حملہ میں بنی بکر کو ہتھیاروں اور اپنے جوانوں سے امداد دی۔

ان واقعات اور حالات کے مطابق جن کو بالآخر قریش نے بھی تسلیم کر لیا وہ معاہدہ صلح ٹوٹ گیا جو حدیبیہ میں دس سال کے التواء جنگ کا ہوا تھا۔

قبیلہ خزاعہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے اُنہوں نے اس واقعہ کی اطلاع آپ کو دے دی۔

---

[1] روح المعاني، تفسير سورة الفتح ج:١٩ ص:٢٢٣

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی عہد شکنی کی خبر پا کر قریش کے خلاف جنگ کی خفیہ تیاری شروع کردی۔

قریش کو بدر و اُحد اور اَحزاب کے معرکوں میں مسلمانوں کی غیبی اور ربانی طاقت کا اندازہ ہوکر اپنی قوت وطاقت کا نشہ اُتر چکا تھا اس وقت عہد شکنی کرنے کے بعد مسلمانوں کی طرف سے جنگ کا خطرہ تو پیدا ہو ہی چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچنے کے بعد مکمل خاموشی سے یہ خطرہ اور زیادہ قوی ہوگیا۔ مجبور ہوکر ابوسفیان کو مدینہ بھیجا کہ وہ خود جا کر حالات کا اندازہ لگائیں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنگ کی تحریک کا اندازہ ہو تو پچھلے واقعہ پر عذر ومعذرت کرکے آئندہ کے لئے تجدید معاہدہ کرلیں۔

ابوسفیان کو مدینہ پہنچ کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی تیاریوں کا کچھ علم ہوا تو پریشان ہوکر اکابر صحابہ میں سے ایک ایک کے پاس گئے کہ وہ سفارش کرکے معاہدہ کی تجدید کرادیں مگر سب نے ان کے سابقہ اور لاحقہ تلخ معاملات کے سبب انکار کردیا۔ اور ابوسفیان ناکام واپس آئے۔ قریشِ مکہ پر خوف وہراس طاری ہوگیا۔

ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب روایت بدایۃ وابن کثیر ۱۰ ر رمضان ۸ھ کو مدینہ طیبہ سے صحابہ کرام کی بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ پر حملہ کرنے کے قصد سے کوچ فرمایا، اور بالآخر مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ [1]

فتح مکہ کے وقت مغلوب دشمنوں کے ساتھ بے نظیر کریمانہ سلوک

فتح کے وقت بہت سے رؤساء قریش جو پہلے سے اسلام کی حقانیت کا یقین رکھتے تھے مگر برادری کے خوف سے اظہار نہ کرسکتے تھے اب اُن کو موقع مل گیا وہ مشرف باسلام ہوگئے۔ اور جو اس وقت بھی اپنے قدیم مذہب کفر پر جمے رہے اُن کو بھی بجز معدودے چند افراد کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو جان ومال کا امان دے کر پیغمبرانہ اور معجزانہ اخلاق کا وہ ثبوت دیا جس کا دوسرے لوگوں سے تصوّر بھی نہیں ہوسکتا اُن کی تمام گزشتہ عداوتوں اور مظالم اور بے رحمی کے واقعات کو یکسر نظرانداز فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اُس وقت کہی تھی جبکہ وہ والدین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے پاس مصر پہنچے تھے۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (یوسف: ۹۲) یعنی تمہارے ظلم وجور کا انتقام لینا یا کوئی سزا دینا تو کیا ہم تم کو ملامت کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

فتح مکہ کے وقت مشرکین کی چار قسمیں اور اُن کے اَحکام

بہرحال اس وقت مکہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہوگیا مکہ اور اطرافِ مکہ میں رہنے والے غیر مسلموں کو جان ومال کا امان دے دیا گیا۔ لیکن اس وقت ان غیر مسلموں کے مختلف حالات تھے۔ ایک قسم تو وہ لوگ تھے جن سے حدیبیہ میں صلح کا

---

[1] البداية والنهاية ج:۴ ص:۳۲۶، والتفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۱۴

معاہدہ ہوا اور انہوں نے خود اس کو توڑ دیا اور وہی فتح مکہ کا سبب ہوا۔ دوسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے صلح کا معاہدہ کسی خاص میعاد کے لئے کیا گیا اور وہ اس معاہدہ پر قائم رہے جیسے بنی کنانہ کے دو قبیلہ بنی ضَمُرہ اور بنی مُدلِج جن سے ایک مدّت کے لئے صلح ہوئی تھی اور سورۂ براءت نازل ہونے کے وقت بقول خازنؒ ان کی میعاد صلح کے نو مہینے باقی تھے۔

تیسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے معاہدہ صلح بغیر تعیینِ مدّت کے ہوا تھا۔ چوتھے وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا۔

فتح مکہ سے پہلے جتنے مشرکین یا اہلِ کتاب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدات کئے اُن سب کا یہ تلخ تجربہ مسلسل ہوتا رہا کہ اُنہوں نے خفیہ اور علانیہ عہد شکنی کی اور دُشمنوں سے سازش کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی مقدور بھر پوری کوششیں کیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلسل تجربہ اور اشاراتِ الٰہیہ کے ماتحت یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ آئندہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاہدۂ صلح نہ کیا جائے گا۔ اور جزیرۃ العرب کو ایک اسلامی قلعہ کی حیثیت سے صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ مکہ اور جزیرۃ العرب پر اقتدار حاصل ہوتے ہی اعلان کر دیا جاتا کہ غیر مسلم یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ لیکن اسلام کے اصول عدل وانصاف اور رحیمانہ سلوک اور رحمۃ للعالمین کی رحمت عامہ کے ماتحت بلا مہلت کے ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ اس لئے سورۂ براءت کے شروع میں ان چاروں قسم کی غیر مسلم جماعتوں کے جدا جدا اَحکام نازل ہوئے۔

پہلی جماعت جو قریشِ مکہ کی تھی جنہوں نے میثاقِ حدیبیہ کو خود توڑ دیا تھا اب یہ کسی مزید مہلت کے مستحق نہ تھے مگر چونکہ یہ زمانہ اَشْھُر حُرُم کا زمانہ تھا جن میں جنگ وقتال منجانب اللہ ممنوع تھا اس لئے اُن کے متعلق تو وہ حکم آیا جو سورۂ توبہ کی پانچویں آیت میں مذکور ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ الآیۃ جس کا حاصل یہ تھا کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کر کے اپنا کوئی حق باقی نہیں چھوڑا مگر اَشْھُر حُرم کا احترام بہرحال ضروری ہے اس لئے اشھر حرم ختم ہوتے ہی یا وہ جزیرۃ العرب سے نکل جائیں یا مسلمان ہو جائیں ورنہ اُن سے جنگ کی جائے۔

اور دوسری جماعت جن سے کسی خاص میعاد کے لئے معاہدۂ صلح کیا گیا اور وہ اس پر قائم رہے ان کا حکم سورۂ توبہ کی چوتھی آیت میں یہ آیا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ یعنی وہ مشرک لوگ جن سے تم نے معاہدۂ صلح کرلیا پھر انہوں نے معاہدہ پر قائم رہنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں تمہارے کسی دشمن کی مدد کی۔ تو تم ان کے معاہدہ کو اُس کی مدت تک پورا کر دو کیونکہ اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ حکم بنو ضمرہ اور بنو مدلج کا تھا جس کی رو سے اُن کو نو مہینے کی مہلت مل گئی۔

اور تیسری اور چوتھی دونوں جماعتوں کا ایک ہی حکم آیا جو سورۂ توبہ کی پہلی اور دوسری آیت میں مذکور ہے بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝ یعنی اعلان دست برداری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی طرف سے ہے اُن مشرکین کے لئے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، سوتم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو۔ اور یہ جان رکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کریں گے۔

غرض پہلی دوسری آیتوں کی رو سے اُن سب لوگوں کو جن سے بلاتعیینِ مدت کوئی معاہدہ تھا یا جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا چار مہینے کی مہلت مل گئی۔

اور چوتھی آیت کی رو سے اُن لوگوں کو تا اختتامِ معاہدہ مہلت مل گئی جن کے ساتھ کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور پانچویں آیت سے مشرکینِ مکہ کو اشہر حرم ختم ہونے تک مہلت مل گئی۔

کفار سے معاہدات ختم ہو جانے پر بھی اُن کو مہلت دینے کا کریمانہ سلوک

ان اَحکام کا نفاذ اور مہلت کا شروع اُس وقت سے تجویز ہوا جبکہ ان اَحکام کا اعلان تمام عرب میں ہو جائے۔ اس اعلانِ عام کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ ۹ھ کے ایامِ حج میں منیٰ و عرفات کے عام اجتماعات میں اُس کا اعلان کیا جائے جس کا ذکر سورۂ توبہ کی تیسری آیت میں اس طرح آیا وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ یعنی اعلانِ عام ہے عام لوگوں کے سامنے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں اس بات کا کہ اللہ اور اُس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین سے۔ پھر اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اگر تم نے اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

کفار سے معاہدہ ختم کیا جائے تو اعلانِ عام اور سب کو ہشیار خبردار کئے بغیر اُن کے خلاف کوئی عمل درست نہیں

چنانچہ اس حکمِ ربانی کی تعمیل کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ ہجری کے حج میں حضرت صدیق اکبر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ بھیج کر میدانِ عرفات اور منیٰ میں جہاں تمام قبائل عرب کا اجتماع تھا یہ اعلان کرا دیا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ اس عظیم الشان مجمع کی معرفت پورے عرب میں اس حکم کا مشتہر ہو جانا لازمی تھا۔ پھر احتیاطاً حضرت علی رضی

اللہ عنہ کی معرفت یمن میں بالتخصیص اس کا اعلان کرا دیا۔

اس اعلانِ عام کے بعد صورت حال یہ ہوگئی کہ پہلی جماعت یعنی مشرکینِ مکہ کو اشہر حرم کے خاتمہ یعنی محرم ۱۰ھ ہجری کے ختم تک اور دوسری جماعت کو رمضان ۱۰ھ ہجری تک اور تیسری چوتھی جماعتوں کو ۱۰/ربیع الثانی ۱۰ھ ہجری تک حدود سے خارج ہو جانا چاہئے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے وہ مستحقِ قتال ہے۔ اس طرح اگلے سال کے زمانۂ حج تک کوئی کافر داخل حدود نہ رہنے پائے گا۔ جس کا ذکر سورۂ توبہ کی اٹھائیسویں آیت میں آئے گا جس میں ارشاد ہے فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ یعنی یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ جا سکیں گے۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ [1] کا یہی مطلب ہے سورۂ توبہ کی ابتدائی پانچ آیتوں کی تفسیر واقعات کی روشنی میں سامنے آ چکی۔

مذکورہ پانچ آیات سے متعلق چند مسائل اور فوائد

اوّل یہ کہ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ اور دوسرے دشمن قبائل کے ساتھ جو معاملہ عفو و درگزر اور رحم و کرم کا فرمایا اس نے عملی طور پر مسلمانوں کو یہ اخلاقی درس دیا کہ جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے قابو میں آ جائے اور تمہارے سامنے عاجز ہو جائے تو اُس سے گزشتہ عداوتوں اور ایذاؤں کا انتقام نہ لو بلکہ عفو و کرم سے کام لے کر اسلامی اخلاق کا ثبوت دو۔ اگرچہ ایسا کرنا اپنے طبعی جذبات کو کچلنا ہے لیکن اس میں چند عظیم فائدے ہیں اول خود اپنے لئے کہ انتقام لے کر اپنا غصہ اُتار لینے سے وقتی طور پر اگرچہ نفس کو کچھ راحت محسوس ہو لیکن یہ راحت فنا ہونے والی ہے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے درجاتِ عالیہ جو اس کو ملنے والے ہیں وہ اس سے ہر حیثیت میں زیادہ بھی ہیں اور دائمی بھی اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ دائمی کو فانی پر ترجیح دے۔

دوسرے یہ کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد اپنے غصہ کے جذبات کو دبا دینا اس کا ثبوت ہے کہ ان کی لڑائی اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے تھی اور یہی وہ اعلیٰ مقصد ہے کہ جو اسلامی جہاد اور عام بادشاہوں کی جنگ میں امتیاز اور جہاد و فساد میں فرق کرنے والا ہے کہ جو لڑائی اللہ کے لئے اور اُس کے اَحکام جاری کرنے کے لئے ہو وہ جہاد ہے ورنہ فساد۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ دشمن جب مقہور و مغلوب ہونے کے بعد ان اخلاقِ فاضلہ کا مشاہدہ کرے گا تو شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کو اسلام اور مسلمانوں سے محبت پیدا ہوگی جو اُس کے لئے کلیدِ کامیابی ہے اور یہی جہاد کا اصل مقصد ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير سورة التوبة، باب قوله تعالى "إِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" ج:۲ ص:۶۷۱

کفار سے عفو و درگزر کے یہ معنی نہیں کہ اُن کے ضرر سے بچنے کا اہتمام بھی نہ کیا جائے

۲- دوسرا مسئلہ جو آیاتِ مذکورہ سے سمجھا گیا یہ ہے کہ عفو و کرم کے یہ معنی نہیں کہ دشمنوں کے شر سے اپنی حفاظت نہ کرے اور اُن کو ایسا آزاد چھوڑ دے کہ وہ پھر ان کو نقصان اور ایذاء پہنچاتے رہیں۔ بلکہ عفو و کرم کے ساتھ تقاضائے عقل یہ ہے کہ پچھلے تجربوں سے آئندہ زندگی کے لئے سبق حاصل کرے اور اُن تمام رخنوں کو بند کرے جہاں سے یہ خود دشمنوں کی زد میں آسکے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ ارشاد ہے لَا يُلۡدَغُ الۡمَرۡءُ مِنۡ جُحۡرٍ وَّاحِدٍ مَرَّتَيۡنِ۔ [1] یعنی عقل مند آدمی ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ جس سوراخ سے ایک مرتبہ کسی زہریلے جانور نے اس کو کاٹا ہے اُس میں دوبارہ ہاتھ نہیں دیتا۔

۹ھ ہجری کے قرآنی اعلانِ براءت اور مشرکین کو مہلت واطمینان کے ساتھ حدودِ حرم خالی کر دینے کی ہدایات اسی حکمتِ عملی کا ثبوت ہیں۔

۳- تیسرا فائدہ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات سے یہ معلوم ہوا کہ کمزور قوموں کو بلا مہلت کسی جگہ سے نکل جانے کا حکم یا ان پر یکبارگی حملہ بزدلی اور غیر شریفانہ فعل ہے۔ جب ایسا کرنا ہو تو پہلے سے اعلانِ عام کر دیا جائے اور ان کو اس کی پوری مہلت دی جائے کہ وہ اگر ہمارے قانون کو تسلیم نہیں کرتے تو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں بسہولت جاسکیں۔ جیسا کہ مذکورہ آیتوں میں ۹ھ ہجری کے اعلانِ عام اور اُس کے بعد تمام جماعتوں کو مہلت دینے کے اَحکام سے واضح ہوا۔

۴- چوتھا مسئلہ آیاتِ مذکورہ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدۂ صلح کر لینے کے بعد اگر میعاد سے پہلے اُس معاہدہ کو ختم کر دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اگرچہ چند شرائط کے ساتھ اس کی اجازت ہے مگر بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کو اس کی میعاد تک پورا کر دیا جائے جیسا کہ سورۂ توبہ کی چوتھی آیت میں بنوضمرہ اور بنومُدۡلج کا معاہدہ نومہینہ تک پورا کرنے کا حکم آیا ہے۔

۵- پانچواں مسئلہ ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کے ساتھ ہر معاملہ میں اس کا خیال رہنا چاہئے کہ مسلمانوں کی دشمنی اُن کی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے کافرانہ عقائد وخیالات کے ساتھ ہے جو اُنہیں کے لئے دنیا وآخرت کی بربادی کے اسباب ہیں۔ اور مسلمانوں کی اُن سے مخالفت بھی درحقیقت اُن کی ہمدردی اور خیر خواہی پر مبنی ہے۔ اسی لئے جنگ وصلح کے ہر مقام پر اُن کو نصیحت وخیر خواہانہ فہمائش کسی وقت نہ چھوڑنا چاہئے۔ جیسا کہ ان آیتوں میں جا بجا اس

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب لا يُلدغ المؤمن ...إلخ ج:٢ ص:٩٠٥

کا ذکر ہے کہ اگر تم اپنے خیالات سے تائب ہو گئے تو یہ تمہارے لئے فلاحِ دنیا و آخرت ہے اور اُس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ اگر تائب نہ ہوئے تو صرف یہی نہیں کہ تم دنیا میں قتل و غارت کئے جاؤ گے جس کو بہت سے کافر اپنا قومی کارنامہ سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں بلکہ یہ بھی سمجھ رکھو کہ مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہ پاؤ گے۔ مذکورہ آیتوں میں اعلانِ براءت کے ساتھ ہمدردانہ فہمائش کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

۶- چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ چوتھی آیت میں جہاں مسلمانوں کو میعادِ صلح کے ختم ہونے تک عہد کو پورا کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اُسی کے ساتھ آیت کو اس جملہ پر ختم کیا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ معاہدہ پورا کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیں۔ عام قوموں کی طرح اُس میں حیلے اور تاویلیں نکال کر خلاف ورزی کی راہ نہ ڈھونڈیں۔

۷- ساتواں مسئلہ پانچویں آیت کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ جب صحیح مقصد کے لئے کسی قوم سے جنگ چھڑ جائے تو پھر اُن کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی قوت پورے طور پر استعمال کرنا چاہئے اُس وقت رحم دلی یا نرمی درحقیقت رحم دلی نہیں بلکہ بزدلی ہوتی ہے۔

۸- آٹھواں مسئلہ مذکورہ پانچویں آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کسی غیر مسلم کے مسلمان ہو جانے پر اعتماد تین چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک توبہ دوسرے اقامتِ صلوٰۃ تیسرے ادائے زکوٰۃ، جب تک اس پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھ لینے سے اُن کے ساتھ جنگ بند نہ کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اُن کے مقابلہ پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جہاد کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال فرما کر تمام صحابہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

۹- نواں مسئلہ ان آیات میں یہ ہے کہ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ سے کیا مراد ہے۔ اس میں حضراتِ مفسرین کے مختلف اقوال ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، فاروق اعظمؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ نے فرمایا کہ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ سے مراد یومِ عرفہ ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلْحَجُّ عَرَفَةٌ۔ (ابوداؤد، ترمذی)[1]

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یوم النحر یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے ان سب اقوال کو جمع کرنے کے لئے فرمایا کہ حج کے پانچوں دن یوم الحج الاکبر کا مصداق ہیں جن میں عرفہ اور یوم النحر دونوں داخل ہیں اور لفظ یوم مفرد لانا اس محاورہ کے مطابق ہے جیسے غزوۂ بدر کے چند ایام کو قرآنِ کریم میں يَوْمُ الْفُرْقَان کے مفرد نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور عرب کی عام جنگوں کو لفظ یوم ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے اگرچہ اُن میں

[1] جامع الترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فیمن ادرك الإمام ...إلخ ج:۱ ص:۱۷۸، وسنن ابی داوٗد، کتاب المناسك، باب یوم الحج الأکبر ج:۱ ص:۲۶۸

کتنے ہی ایام صرف ہوئے ہوں جیسے یَوْمِ بُعَاث، یَوْمِ اُحُدْ وغیرہ۔ اور چونکہ عمرہ کو حج اصغر یعنی چھوٹا حج کہا جاتا ہے اُس سے ممتاز کرنے کے لئے حج کو حجِ اکبر کہا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی اصطلاح میں ہر سال کا حج حجِ اکبر ہی ہے۔ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ جس سال عرفہ بروز جمعہ واقع ہو صرف وہی حجِ اکبر ہے اس کی اصلیت اس کے سوا نہیں ہے کہ اتفاقی طور پر جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع ہوا ہے اُس میں عرفہ بروز جمعہ ہوا تھا۔ یہ اپنی جگہ ایک فضیلت ضرور ہے مگر آیت مذکورہ کے مفہوم سے اس کا تعلق نہیں۔

امام جصّاصؒ نے اَحکام القرآن میں فرمایا کہ ایام حج کو حجِ اکبر فرمانے سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ ایامِ حج میں عمرہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان ایام کو قرآنِ کریم نے حجِ اکبر کے لئے مخصوص فرمادیا ہے۔ [1]

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اُس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا

ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ؑ كَيْفَ يَكُوْنُ

ع ۷

پھر پہنچاوے اُس کو اُس کی امن کی جگہ، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ کیونکر ہووے

لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ

مشرکوں کے لئے عہد اللہ کے نزدیک اور اُس کے رسول کے نزدیک مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

مسجد حرام کے پاس، سو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم اُن سے سیدھے رہو، بیشک اللہ کو

يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا

پسند ہیں احتیاط والے۔ کیونکر رہے صلح اور اگر وہ تم پر قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا

[1] احکام القرآن للجصاصؒ سورۃ البراءۃ ج:۶ ص:۴۴۷

وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸

اور نہ عہد کا، تم کو راضی کر دیتے ہیں اپنے منہ کی بات سے اور اُن کے دِل نہیں مانتے، اور اکثر اُن میں بدعہد ہیں۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ

بیچ ڈالے اُنہوں نے اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر پھر روکا اُس کے رستہ سے، بُرے کام ہیں

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

جو وُہ لوگ کر رہے ہیں۔ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا، اور وہی ہیں

الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ

زیادتی پر۔ سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں

فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۱۱

حکم شریعت میں، اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے لوگوں کے واسطے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اُسے اُس وقت تک پناہ دو جب تک وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اُسے اُس کی امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں علم نہیں ہے۔ ۶ ان مشرکین سے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کوئی معاہدہ کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ البتہ جن لوگوں سے تم نے مسجدِ حرام کے قریب معاہدہ کیا ہے، جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں، تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو۔ بیشک اللہ متقی لوگوں کو پسند کرتا ہے ۷ (لیکن دوسرے مشرکین کے ساتھ) کیسے معاہدہ برقرار رہ سکتا ہے جبکہ اُن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی تم پر غالب آ جائیں تو تمہارے معاملے میں نہ کسی رشتہ داری کا خیال کریں، اور نہ کسی معاہدے کا؟ یہ تمہیں اپنی زبانی باتوں سے راضی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اُن کے دِل انکار کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ ۸ انہوں نے اللہ کی آیتوں کے بدلے (دُنیا کی)

تھوڑی سی قیمت لے لینا پسند کرلیا ہے، اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کرتوت بہت بُرے ہیں ⑨ یہ کسی بھی مؤمن کے معاملے میں کسی رشتہ داری یا معاہدے کا پاس نہیں کرتے، اور یہی ہیں جو حدیں توڑنے والے ہیں ⑩ لہٰذا اگر یہ توبہ کرلیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، تو یہ تمہارے دِینی بھائی بن جائیں گے۔ اور ہم اَحکام کی یہ تفصیل اُن لوگوں کے لئے بیان کررہے ہیں جو جاننا چاہیں ⑪

خلاصۂ تفسیر

اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے (زمانۂ اباحت قتل میں بعد ختم میعادِ امن کے توبہ واسلام کے فوائد و برکات سن کر اس طرف راغب ہو اور حقیقت وحقیتِ اسلام کی تلاش کی غرض سے آپ کے پاس آکر) آپ سے پناہ کا طالب ہو (تا کہ اطمینان سے سن سکے اور سمجھ سکے) تو (ایسی حالت میں) آپ اس کو پناہ دیجئے تا کہ وہ کلامِ الٰہی (مراد مطلق دلائل دین حق کے ہیں) سن لے پھر (اس کے بعد) اس کو اس کی امن کی جگہ میں پہنچا دیجئے (یعنی پہنچنے دیجئے تا کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کرلے) یہ حکم (اتنی پناہ دینے کا) اس سبب سے (دیا جاتا) ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے (اس لئے قدرے مہلت دینا ضروری ہے۔ جماعت اول نے جو نقضِ عہد کیا تھا ان کے نقضِ عہد سے پہلے بطور پیشین گوئی کے فرماتے ہیں کہ) ان مشرکین (قریش) کا عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے (قابلِ رعایت) رہے گا (کیونکہ رعایت تو اس عہد کی ہوتی ہے جس کو دوسرا شخص خود نہ توڑے ورنہ رعایت نہیں باقی رہتی۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ عہد کو توڑ دیں گے اس وقت اس طرف سے بھی رعایت نہ ہوگی) مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام (یعنی حرم) کے نزدیک عہد لیا ہے (مراد دوسری جماعت ہے جن کا استثناء اوپر بھی اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ اِلـــخ میں آچکا ہے یعنی ان سے امید ہے کہ یہ عہد کو قائم رکھیں گے) سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں (یعنی عہد نہ توڑیں) تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو (اور مدت عہد کی ان سے پوری کردو چنانچہ زمانہ نزولِ براءت میں اس مدت میں نو ماہ باقی رہے اور بوجہ ان کی عہد شکنی نہ کرنے کے ان کی یہ مدت پوری کی گئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم بھی احتیاط رکھنے سے پسندیدۂ حق ہوجاؤ گے یہ استثناء کرکے پھر عود ہے مضمون متعلق جماعت اول کی طرف کہ) کیسے (ان کا عہد قابلِ رعایت رہے گا یعنی وہ لوگ عہد پر کب قائم رہیں گے) حالانکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پاجائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا (کیونکہ ان کی یہ صلح مجبوری اور خوفِ جہاد سے ہے دل سے نہیں پس) یہ لوگ تم کو (صرف) اپنی زبانی باتوں سے راضی کررہے ہیں اور ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے (پس جب دل سے اس عہد کے پورا کرنے کا عزم نہیں ہے تو کیا پورا ہوگا) اور ان میں زیادہ آدمی شریر

ہیں (کہ عہد پورا کرنا نہیں چاہتے اور اگر ایک آدھ پورا کرنا بھی چاہتا ہو تو زیادہ کے سامنے ایک دو کی کب چلتی ہے اور وجہ ان کے شریر ہونے کی یہ ہے کہ) انہوں نے اَحکامِ الٰہیہ کے عوض (دنیا کی) متاع ناپائیدار کو اختیار کر رکھا ہے (جیسا کہ کفار کی حالت ہوتی ہے کہ دین کو چھوڑ کر دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہیں جب دنیا زیادہ محبوب ہوگی تو جب عہد شکنی میں دنیوی غرض حاصل ہوتی نظر آئے گی اس میں کچھ باک نہ ہوگا بخلاف اس شخص کے جو دین کو ترجیح دیتا ہے وہ اَحکامِ الٰہیہ اور وفائے عہد وغیرہ کا پابند ہوگا) سو (اس ترجیحِ دُنیا عَلَی الدِّین کی وجہ سے) یہ لوگ اللہ کے (سیدھے) رستہ سے (جس میں وفائے عہد بھی داخل ہے) ہٹے ہوئے ہیں (اور) یقیناً یہ ان کا عمل بہت ہی برا ہے (اور ہم نے جو اوپر کہا ہے لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ الخ سو اس میں تمہاری کچھ تخصیص نہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ) یہ لوگ کسی مسلمان کے بارے میں (بھی) نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا اور یہ لوگ (خصوص اس باب میں) بہت ہی زیادتی کر رہے ہیں سو (جب ان کے عہد پر اعتماد واطمینان نہیں بلکہ احتمال عہد شکنی کا بھی ہے جیسا کہ اس کی جانب مخالف کا بھی احتمال ہے اس لئے ہم ان کے بارے میں مفصل حکم سناتے ہیں کہ) اگر یہ لوگ (کفر سے) توبہ کرلیں (یعنی مسلمان ہو جائیں) اور (اس اسلام کو ظاہر بھی کردیں مثلاً) نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو (پھر ان کی عہد شکنی وغیرہ پر اصلاً نظر نہ ہوگی خواہ انہوں نے کچھ ہی کیا ہو، اسلام لانے سے) وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے (اور پچھلا کیا ہوا سب معاف ہو جائے گا) اور ہم سمجھ دار لوگوں (کو بتلانے) کے لئے اَحکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں (چنانچہ اس مقام پر بھی ایسا ہی کیا گیا)۔

معارف ومسائل

سورۂ توبہ کی ابتدائی پانچ آیتوں میں اس کا ذکر تھا کہ فتح مکہ کے بعد مکہ اور اُس کے اطراف کے تمام مشرکین وکفار کو جان ومال کا عام امان دے دیا گیا مگر ان کی سابقہ غداری اور عہد شکنی کے تجربہ کی بنا پر آئندہ کے لئے ان سے کوئی معاہدہ نہ کیا جانا طے ہو گیا۔ اس قرارداد کے باوجود جن لوگوں سے کوئی معاہدہ اس سے پہلے ہو چکا تھا اور اُنہوں نے عہد شکنی نہیں کی تو اُن کا معاہدہ ختم میعاد تک پورا کرنے کے اَحکام ان آیات میں نازل ہوئے۔ اور جن سے کوئی معاہدہ نہیں تھا یا کسی معین میعاد کا معاہدہ نہیں تھا اُن کے ساتھ بھی یہ رعایت کی گئی کہ اُن کو فوری طور پر مکہ چھوڑ دینے کے حکم کے بجائے چار مہینہ کی وسیع مہلت دے دی گئی کہ اس عرصہ میں وہ مکہ چھوڑ کر جہاں مناسب سمجھیں سہولت واطمینان کے ساتھ چلے جائیں۔ یا اگر اسلام کی حقانیت اُن پر روشن ہو چکی ہے تو مسلمان ہو جائیں۔ ان اَحکام کا نتیجہ یہ تھا کہ سال آئندہ تک مکہ مکرمہ سہولت کے ساتھ ان سب غدار مشرکین سے خالی ہو جائے اور چونکہ یہ خالی کرنا بھی کسی انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ مسلسل تجربوں کے بعد اپنی حفاظت کے پیش نظر عمل میں لایا گیا تھا اس لئے ان کی اصلاح وخیر خواہی کا دروازہ اب بھی کھلا رکھا گیا۔ جس کا ذکر چھٹی

آیت میں ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو آپ کو پناہ دینی چاہئے تا کہ وہ آپ کے قریب آکر اللہ کا کلام سن سکے اور اسلام کی حقانیت کو سمجھ سکے۔ اور صرف یہی نہیں کہ وقتی طور پر اُس کو پناہ دے دی جائے بلکہ جب وہ اپنے اس کام سے فارغ ہو جائے تو اپنی حفاظت اور نگرانی میں اُس کو اُس مقام تک پہنچانا بھی مسلمانوں کے ذمہ ہے جہاں یہ اپنے آپ کو محفوظ و مطمئن سمجھتا ہے۔ آخرِ آیت میں فرمایا کہ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ لوگ پوری خبر نہیں رکھتے قریب آکر باخبر ہو سکتے ہیں۔

اس آیت سے بھی چند مسائل اور فوائد حاصل ہوئے جن کو امام ابوبکر جصاص نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ [۱]

حقانیتِ اسلام کو دلائل کے ساتھ سمجھانا علماء دین کا فرض ہے

اوّل یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کافر مسلمانوں سے اس کا مطالبہ کرے کہ مجھے اسلام کی حقانیت دلیل سے سمجھاؤ تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کریں۔

دوسرے یہ کہ جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اُس کو اجازت دیں اور اُس کی حفاظت کریں۔ اُس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ اُس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ ہو تو وہ مسلمانوں کے مصالح اور حاکم مسلمین کی صوابدید پر موقوف ہے مناسب سمجھے تو اجازت دے ورنہ اختیار رہے۔ [۲]

غیر مسلم جو دار الاسلام کے باشندے نہ ہوں اُن کو ضرورت سے زائد دار الاسلام میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے

تیسرے یہ کہ غیر مسلم حربی جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہ ہو اُس کو ضرورت سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ کیونکہ آیت مذکورہ میں پناہ دینے اور ٹھہرانے کی یہ حد مقرر کر دی گئی ہے حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ۔ یعنی اُس کو اپنے یہاں اتنا ٹھہراؤ کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔

چوتھے یہ کہ مسلمان حاکم و امیر کے فرائض میں سے ہے کہ جب کوئی حربی غیر مسلم کسی ضرورت کی بنا پر ہم سے اجازت (ویزا) لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو تو اُس کے حالات پر نظر رکھے اور جب وہ اپنا کام پورا کر چکے اُس کو حفاظت کے ساتھ واپس کر دے۔

---

[۱] احکام القرآن للجصاصؒ سورة براءة ج:۴ ص:۲۵۶ [۲] التفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۷۵، ۷۶

ساتویں آٹھویں نویں دسویں چار آیتوں میں اُس اعلانِ براءت کی حکمت کا بیان ہے جو سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کیا گیا ہے اس آیت میں عہد شکنی کرنے والے مشرکین کی طبعی خسّت اور مسلمانوں سے بغض وعناد کی شدت کا ذکر کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ اِن سے وفاء عہد کی امید رکھنا ہی غلط ہے۔ ارشاد فرمایا کہ بجز چند لوگوں کے جن سے مسجد حرام کے پاس تمہارا معاہدہ ہوا تھا ان مشرکین کا کوئی عہد اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک قابلِ رعایت کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اُن کا یہ حال ہے کہ اگر اُن کو کسی وقت بھی ذرا موقع مل جائے تو وہ تمہارے بارہ میں نہ کسی قرابت داری کی رعایت کریں نہ عہد و پیمان کی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ معاہدہ کرنے کے وقت بھی دل میں اس کے پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بلکہ صرف الفاظ سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں اور اُن میں سے اکثر لوگ فاسق یعنی عہد شکن غدار ہیں۔

کفار کے مقابلہ میں بھی سچائی پر قائم رہنے اور اُن کے متعلق مبالغہ آمیزی سے پرہیز کرنے کی تعلیم

قرآن کریم کے اس بیان نے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ اپنے دشمن مخالفین کے معاملہ میں بھی جب کوئی گفتگو آئے تو سچائی اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لیں جیسا کہ ان آیات میں مشرکینِ مکہ کے بارہ میں اس کی پوری رعایت کی گئی ہے کہ اگرچہ معدودے چند لوگوں کے سوا سبھی نے عذر وعہد شکنی کی تھی اور ایسے حالات میں عام طور پر کہنے والے سبھی کو بُرا کہا کرتے ہیں مگر قرآن کریم نے اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرما کر اُن لوگوں کا استثناء کر دیا جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی اور یہ حکم دیا کہ جب تک وہ استقامت اور وفاء عہد پر قائم رہیں تم بھی عہد پر قائم رہو، دوسرے لوگوں کی خیانت سے متأثر ہو کر ان کے عہد کو نہ توڑو۔

اس کے بعد عہد شکنی کرنے والوں کا جہاں یہ حال بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے دلوں میں شروع ہی سے خیانت تھی وفائے عہد کا ارادہ ہی نہ تھا یہاں بھی وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ⑧ فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان میں بھی سب کا یہ حال نہیں بعض شریف لوگ ایسے بھی ہیں جو عہد پر قائم رہنا چاہتے تھے مگر دوسروں کے سامنے اُن کی بات نہ چلی۔

یہ وہی مضمون ہے جس کی ہدایت قرآن کریم نے دوسری جگہ صاف لفظوں میں اس طرح دی ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ: ۸) یعنی کسی قوم کی عداوت تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ بیٹھو۔

اس کے بعد نویں آیت میں ان غدار مشرکین کی غداری کی علت اور ان کے مرض کا سبب بیان فرما کر ان کو بھی ایک ہدایت نامہ دے دیا کہ اگر یہ غور کریں تو اپنی اصلاح کر لیں اور عام مسلمانوں کو بھی متنبہ کر دیا کہ جس سبب سے یہ لوگ غدر و خیانت میں مبتلا ہوئے اُس سبب سے پورے طور پر پرہیز کو اپنا شعار بنالیں۔ اور وہ سبب ہے حبِ دنیا کہ دنیا کے مال

ومتاع کی محبت نے ان کو اندھا کر دیا ہے تھوڑے سے پیسوں کے بدلہ میں اللہ کی آیات اور اپنے ایمان کو بیچ ڈالتے ہیں۔ اور ان کا یہ کردار نہایت بُرا ہے۔

دسویں آیت میں انہیں لوگوں کی انتہائی کجروی کا یہ بیان ہے لَا یَرۡقُبُوۡنَ فِیۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً یعنی صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے عہد کرنے والے مسلمانوں سے غداری کی اور اُن کی قرابت اور عہد و پیمان کو پیچھے ڈال دیا بلکہ ان کا حال یہ ہے کہ کسی مسلمان کے بارہ میں نہ یہ قرابت کی رعایت کرنے والے ہیں نہ کسی عہد و پیمان کی۔

مشرکین کے مذکورہ حالات کا طبعی تقاضا یہ ہوسکتا تھا کہ مسلمان ان سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جائیں۔ اور کسی حالت میں بھی ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اسی لئے قرآنی عدل وانصاف نے گیارھویں آیت میں یہ ہدایت دے دی۔

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ یعنی اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اب یہ بھی تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اس میں بتلا دیا کہ کوئی کیسا ہی دشمن ہو اور کتنی ہی ایذاء اُس نے پہنچائی ہو جب وہ مسلمان ہوگیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ اُس کے سب پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں، مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ پچھلے سب معاملات کو دل سے بھلا دیں اور آج سے اُن کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ تعلق کے حقوق ادا کریں۔

اسلامی برادری میں داخل ہونے کی تین شرطیں

اس آیت نے واضح کر دیا کہ اسلامی برادری میں داخل ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں اول کفر وشرک سے توبہ دوسرے نماز تیسرے زکوٰۃ۔ کیونکہ ایمان و توبہ تو ایک امر مخفی ہے جس کی حقیقت کا عام مسلمانوں کو علم نہیں ہوسکتا اس لئے اس کی دو ظاہری علامتوں کو بیان کر دیا گیا، یعنی نماز اور زکوٰۃ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت نے اہل قبلہ مسلمانوں کے خون کو حرام کر دیا، یعنی جو لوگ نماز، زکوٰۃ کے پابند ہوں اور اسلام کے خلاف کوئی قول وفعل ان کا ثابت نہ ہو وہ تمام احکام میں مسلمان سمجھے جائیں گے، اگرچہ ان کے دل میں صحیح ایمان نہ ہو، یا نفاق ہو۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں پر جہاد کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال فرما کر صحابہ کرامؓ کو مطمئن کیا تھا۔ (ابن کثیر) [1]

[1] ھٰکذا فی احکام القرآن للجصاصؒ سورۃ براءۃ ج:۲ ص:۴۵۰

آخر آیت میں معاہدین اور تائبین سے متعلقہ اَحکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید کرنے کے لئے ارشاد فرمایا وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ یعنی ہم سمجھدار لوگوں کے لئے اَحکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا

اور اگر وہ توڑ دیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد اور عیب لگاویں تمہارے دین میں تو لڑو

اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ

کفر کے سرداروں سے بے شک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آویں، کیا نہیں لڑتے

قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ

ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے،

اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ

کیا ان سے ڈرتے ہو سو اللہ کا ڈر چاہئے تم کو زیادہ اگر تم ایمان رکھتے ہو، لڑو ان سے

يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ

تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرے اور ٹھنڈے کرے دل

قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ ۙ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ

مسلمان لوگوں کے، اور نکالے ان کے دل کی جلن، اور اللہ توبہ نصیب کرے گا

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا

جس کو چاہے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے، کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہے اور نہیں پکڑا انہوں نے سوا اللہ کے

وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ ع

اور اس کے رسول کے اور مسلمانوں کے کسی کو بھیدی، اور اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر ان لوگوں نے اپنا عہد دے دینے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالی ہوں، اور تمہارے دِین کو طعنے دیئے ہوں، تو ایسے کفر کے سربراہوں سے اس نیت سے جنگ کرو کہ وہ باز آ جائیں، کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی قسموں کی کوئی حقیقت نہیں ﴿۱۲﴾ کیا تم اُن لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا، اور رسول کو (وطن سے) نکالنے کا ارادہ کیا، اور وہی ہیں جنہوں نے تمہارے خلاف (چھیڑ چھاڑ کرنے میں) پہل کی؟ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ (اگر ایسا ہے) تو اللہ اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ تم اُس سے ڈرو، اگر تم مؤمن ہو ﴿۱۳﴾ ان سے جنگ کرو، تاکہ اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دِلوائے، اُنہیں رُسوا کرے، اُن کے خلاف تمہاری مدد کرے، اور مؤمنوں کے دِل ٹھنڈے کردے، ﴿۱۴﴾ اور اُن کے دِل کی کڑھن دُور کردے، اور جس پر منظور ہوگا اللہ تعالیٰ توجہ فرماوے گا۔ اور اللہ کا علم بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل ﴿۱۵﴾ بھلا کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ جہاد کرتے ہیں، اور اللہ، اُس کے رسول اور مؤمنوں کے سوا کسی اور کو خصوصی راز دار نہیں بناتے؟ اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۱۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں (عہدوں) کو توڑ ڈالیں (جیسا کہ ان کی حالت سے غالب ہے) اور (عہد توڑ کر ایمان بھی نہ لائیں بلکہ اپنے کفر پر قائم رہیں جس کا ایک اثر یہ ہے کہ) تمہارے دین (اسلام) پر طعن (واعتراض) کریں تو (اس حالت میں) تم لوگ اس قصد سے کہ یہ (اپنے کفر سے) باز آ جائیں، ان پیشوایانِ کفر سے (خوب) لڑو (کیونکہ اس صورت میں) ان کی قسمیں (باقی) نہیں رہیں (یہاں تک قبل نقض پیشین گوئی ہو چکی، آگے بعد

وقوع نقض کے قتال کی ترغیب ہے کہ) تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا (اور بنی بکر کی بمقابلہ خزاعہ کے مدد کی) اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جلاوطن کر دینے کی تجویز کی، اور انہوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی (کہ تمہاری طرف سے وفائے عہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، انہوں نے بیٹھے بٹھائے خود ایک شوشہ چھوڑا، پس ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو) کیا ان سے (لڑنے میں) ڈرتے ہو (کہ ان کے پاس جمعیت زیادہ ہے) سو (اگر یہ بات ہے تو ہرگز ان سے مت ڈرو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو (اور ان سے ڈرنے کا یہ مقتضا ہے کہ ان کے حکم کے خلاف مت کرو اور وہ حکم دیتے ہیں قتال کا پس) ان سے لڑو، اللہ تعالیٰ (کا وعدہ ہے کہ) ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دے گا اور ان کو ذلیل (وخوار) کرے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور (ان کی اس تعذیب اور تمہاری نفرت سے) بہت سے (ایسے) مسلمانوں کے قلوب کو شفاء دے گا اور ان کے قلوب کے غیظ (وغضب) دور کر دے گا (جو خود تاب مقابلہ کی نہیں رکھتے اور ان کی حرکات کو دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹتے ہیں) اور (ان ہی کفار میں سے) جس پر (توجہ وفضل کرنا) منظور ہو گا اللہ تعالیٰ توجہ (بھی) فرمائے گا (یعنی مسلمان ہونے کی توفیق دے گا، چنانچہ فتح مکہ میں بعضے لڑے اور ذلیل ومقتول ہوئے اور بعضے مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (کہ علم سے ہر ایک کا انجام کہ اسلام ہے یا کفر جانتے ہیں، اور اسی لئے اپنی حکمت سے احکام مناسبہ مقرر فرماتے ہیں اور تم جو لڑنے سے جی چُراتے ہو گو بعضے ہی سہی تو) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی (اسی حالت پر) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے (ایسے موقع پر) جہاد کیا ہو اور اللہ ورسول اور مؤمنین کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو (جس کے ظاہر ہونے کا اچھا ذریعہ ایسے مواقع کا جہاد ہے جہاں مقابلہ اعزّہ واقارب سے ہو کہ پورا امتحان ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کو چاہتا ہے اور کون برادری کو) اور اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے تمہارے سب کاموں کی (پس اگر جہاد میں چستی کرو گے یا سستی کرو گے اسی کے موافق تم کو جزا دے گا)۔

معارف ومسائل

قریش مکہ جن سے ۶ھ میں بمقام حدیبیہ ایک معاہدہ التواء جنگ کا ہوا تھا ان کے متعلق سورۂ توبہ کی ابتدائی آیتوں میں بطور پیش گوئی کے یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ یہ لوگ اپنے معاہدہ پر قائم نہ رہیں گے، جس کا ذکر سورۂ توبہ کی ساتویں آیت میں کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَھْدٌ کے الفاظ میں گزر چکا ہے، اور پھر آٹھویں نویں دسویں آیتوں میں ان کی عہد شکنی کے اسباب کا بیان ہوا، گیارہویں آیت میں اس کا بیان آیا کہ عہد شکنی کے اس جرم عظیم کے بعد بھی اگر یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور اپنے اسلام کا اظہار نماز روزہ کے ذریعہ کرنے لگیں تو پھر مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے پچھلے جرائم کا

کوئی اثر اپنے معاملات میں باقی نہ رکھیں، بلکہ ان کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ معاملات کریں، مذکورہ بارہویں آیت میں اس کا بیان ہے کہ پیش گوئی کے مطابق جب یہ لوگ عہد شکنی کر ہی ڈالیں تو پھر ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔

اس میں ارشاد فرمایا وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ”یعنی اگر یہ لوگ اپنے معاہدہ اور قسموں کو توڑ ڈالیں اور مسلمان بھی نہ ہوں، بلکہ بدستور تمہارے دین اسلام پر طعن و تشنیع کرتے رہیں تو ان کفر کے پیشواؤں کے ساتھ جنگ کرو۔“

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تقاضائے مقام اس جگہ بظاہر یہ تھا کہ فَقَاتِلُوْهُمْ فرمایا جاتا یعنی ان لوگوں سے قتال کرو، قرآن کریم نے اس جگہ مختصر ضمیر استعمال کرنے کے بجائے فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ فرمایا، ائمہ، امام کی جمع ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنی عہد شکنی کی وجہ سے کفر کے امام اور قائد ہو کر اس کے مستحق ہوگئے کہ ان سے جنگ کی جائے، اس میں حکمِ قتال کی علت اور وجہ کا بھی بیان ہوگیا، اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ائمۃ الکفر سے مراد قریشِ مکہ کے وہ سردار ہیں جو لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارنے اور جنگی تیاریوں میں لگے رہتے تھے، ان سے جنگ کرنے کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کہ اہلِ مکہ کی اصل طاقت کا سرچشمہ یہی لوگ تھے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی قریبی رشتہ داری بھی انہی لوگوں سے تھی، جس کی وجہ سے اس کا خطرہ ہوسکتا تھا کہ ان کے معاملہ میں کوئی رعایت برتی جائے۔ (مظہری) [1]

دارالاسلام میں غیر مسلم ذمیوں کو اِسلام پر علمی تنقید کی تو اِجازت ہے مگر طعن و تشنیع کی نہیں

وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ کے لفظ سے بعض حضرات نے اس پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کے دین پر طعن و تشنیع کرنا عہد شکنی کرنے میں داخل ہے، جو شخص اسلام اور شریعتِ اسلام پر طعنہ زنی کرے وہ مسلمانوں کا معاہد نہیں رہ سکتا، مگر باتفاقِ فقہاء اس سے مراد وہ طعن و تشنیع ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی اہانت اور تحقیر کے طور پر اعلاناً کی جائے، اَحکام و مسائل کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا اس سے مستثنیٰ ہے اور لغت میں اس کو طعن و تشنیع کہتے بھی نہیں۔

اس لئے دارالاسلام کے غیر مسلم باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جاسکتی ہے، مگر اسلام پر طعنہ زنی اور تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اسی آیت میں فرمایا اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی قسم کوئی قابلِ اعتبار قسم نہیں، کیونکہ یہ لوگ قسم توڑنے اور عہد شکنی کرنے کے عادی ہیں، اور اس جمع کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنی قسم توڑ دی تو اب

---

[1] التفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۴۳

مسلمانوں پر بھی ان کی قسم اور عہد کی کوئی ذمہ داری نہیں رہی۔

آخر آیت میں ہے لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ تاکہ وہ باز آجائیں، اس آخری جملہ میں بتلادیا کہ مسلمانوں کی جنگ وجہاد کا مقصد عام دنیا کے لوگوں کی طرح دشمن کو ستانا اور جوشِ انتقام کو فرو کرنا یا عام بادشاہوں کی طرح ملک گیری نہ ہونا چاہئے، بلکہ ان کی جنگ کا مقصد دشمنوں کی خیر خواہی اور ہمدردی اور یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگ اپنی غلط روش سے باز آجائیں۔

اس کے بعد تیرہویں آیت میں مسلمانوں کو جہاد وقتال کی ترغیب کے لئے فرمایا کہ تم ایسی قوم کے ساتھ جنگ کے لئے کیوں تیار نہ ہوگے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے کا منصوبہ بنایا، مراد اس سے یہودِ مدینہ ہیں، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور کہا تھا لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ (المنافقون: ۸) یعنی ایسا ضرور ہوگا کہ عزّت والا کمزور ذلیل کو مدینہ سے نکال دے گا۔ ان کے نزدیک عزّت والے وہ لوگ تھے اور مسلمانوں کو کمزور و ذلیل سمجھتے تھے، جس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ان کے ہی قول کو اس طرح پورا کر دکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ان کو مدینہ سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ عزّت والے مسلمان ہی ہیں اور کمزور و ذلیل یہود تھے۔

دوسری وجہ اُن سے جنگ کرنے کی یہ ارشاد فرمائی: وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ یعنی جنگ وقتال کی پہل انہی لوگوں کی طرف سے ہوئی، اب تو صرف مدافعانہ کارروائی ہے، جو ہر فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے۔

پھر مسلمانوں کے دلوں سے ان لوگوں کا رعب دور کرنے کے لئے فرمایا اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ ''یعنی کیا تم لوگ ان سے خوف کھاتے ہو، حالانکہ خوف اور ڈرنا صرف اللہ تعالیٰ سے چاہئے۔'' جس کے عذاب کو کوئی طاقت ٹلا نہیں سکتی، آخر میں اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ فرما کر بتلادیا کہ غیر اللہ سے ایسا خوف کھانا جو اَحکامِ شرعیہ کی ادائیگی میں حائل ہوسکے کسی مؤمن مسلمان کا کام نہیں۔

چودھویں اور پندرہویں آیت میں بھی مسلمانوں کو جنگ وجہاد کی ترغیب ایک دوسرے عنوان سے دی گئی ہے، جس میں چند چیزیں بتلائی گئیں:

اوّل یہ کہ اگر تم ان سے جنگ کے لئے تیار ہوگئے تو اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے شاملِ حال ہوگی، اور یہ قوم اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی مستحق تو ہو ہی چکی ہے، مگر ان پر اللہ کا عذاب پچھلی قوموں کی طرح آسمان یا زمین سے نہیں آئے گا، بلکہ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ''یعنی ان کو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیں گے۔''

دوسرے یہ کہ اس جنگ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں کو اُس رنج وغم سے شفا عطا فرمائیں گے جو کفار کی طرف سے ان کو مسلسل پہنچتا رہا ہے۔

تیسرے یہ کہ ان کی غداری اور عہد شکنی کے سبب جو غیظ وغضب مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوا تھا، انہی کے ہاتھوں ان کو عذاب دے کر ان کے غیظ کو دور فرما دیں گے۔

پچھلی آیت میں لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ⑫ فرما کر مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی قوم سے اپنا غصہ اتارنے کے لئے نہ لڑیں، بلکہ ان کی اصلاح وہدایت کو مقصد بنائیں، اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ جب وہ اپنی نیت کو اللہ کے لئے صاف کرلیں اور محض اللہ کے لئے لڑیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسی صورتیں بھی پیدا فرما دیں گے کہ ان کے غم وغصہ کا انتقام بھی خود بخود ہو جائے۔

چوتھی چیز یہ ارشاد فرمائی وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ ''یعنی ان میں سے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اس جہاد کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دشمن کی جماعت میں سے بہت سے لوگوں کو اسلام کی توفیق ہو جائے گی، وہ مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ فتح مکہ میں بہت سے سرکش ذلیل وخوار ہوئے اور بہت سے لوگ مشرف باسلام ہو گئے۔

ان آیات میں جن حالات وواقعات کی خبر بطور پیش گوئی دی گئی ہے تاریخ شاہد ہے کہ وہ سب ایک ایک کر کے اسی طرح مشاہدہ میں آئے جس طرح قرآن حکیم نے خبر دی تھی، اس لئے یہ آیات بہت سے معجزات پر مشتمل ہیں۔

سولھویں آیت میں بھی یہی مضمون جہاد کی تاکید کا ہے مگر ایک تیسرے عنوان سے جس میں ترک جہاد پر وعید اور یہ ذکر ہے کہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ مسلمان صرف نام کے مسلمان نہ ہوں بلکہ جہاد وقتال کے میدان میں اللہ کے لئے اپنے جان ومال کو پیش کر دیں اور کسی خدا کے دشمن کو اپنا دوست نہ سمجھیں۔ ارشاد ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑯ یعنی کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم فقط کلمۂ اسلام زبانی پڑھ کر آزاد چھوڑ دیئے جاؤ گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ظاہری طور بھی ان لوگوں کے اعمال کو نہ دیکھ لیں جنہوں نے تم میں سے ایسے موقع پر جہاد کیا ہو اور رسول اور مؤمنین کے سوا کسی کو اپنا دوست اور بھیدی نہ بنایا ہو۔ (یہ امتحان اس جہاد میں ہو سکتا ہے جہاں مقابلہ پر اپنے ہی بھائی بند اور عزیز واقارب ہوں)۔ اور اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے تمہارے کاموں کی۔

اس آیت میں کفار کے مقابلہ پر جہاد کی تاکید بھی ہے اور یہ بھی کہ کفار میں کسی سے کتنے ہی قریبی رشتے ناتے اور تعلقات ہوں مگر جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں تو پھر ان کے سارے رشتے منقطع سمجھے جائیں۔ ان سے جہاد کے معاملہ میں کسی رورعایت سے کام نہ لیا جائے اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ سمجھا جائے۔ اور ان سے دوستانہ معاملات نہ رکھے جائیں۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اوپر

بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۱۷ اِنَّمَا يَعْمُرُ

کفر کو وہ لوگ خراب گئے اُن کے عمل اور آگ میں رہیں گے وہ ہمیشہ، وہی آباد کرتا ہے

مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ

مسجدیں اللہ کی جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور قائم کیا نماز کو اور دیتا رہا زکوٰۃ

وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۸

اور نہ ڈرا سوائے اللہ کے کسی سے سو امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہوویں ہدایت والوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

مشرکین اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، حالانکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ بنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے تو اعمال ہی غارت ہو چکے ہیں، اور دوزخ ہی میں اُن کو ہمیشہ رہنا ہے ۝۱۷ اللہ کی مسجدوں کو تو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہوں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ صحیح راستہ اختیار کرنے والوں میں شامل ہوں گے ۝۱۸

خلاصۂ تفسیر

مشرکین کی یہ لیاقت ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو (جن میں مسجد حرام بھی آگئی) آباد کریں جس حالت میں وہ خود اپنے کفر (کی باتوں) کا اقرار کر رہے ہیں (چنانچہ وہ خود اپنا مشرب بتلانے کے وقت ایسے عقائد کا اقرار کرتے تھے جو واقع میں کفر ہیں، مطلب یہ کہ عمارتِ مساجد گو عمل محمود ہے لیکن باوجود شرک کے کہ اس کے منافی ہے اس عمل کی اہلیت ہی مفقود ہے اور اس لئے وہ محض غیر معتد بہ ہے، پھر فخر کی کیا گنجائش ہے) ان لوگوں کے (جو مشرک ہیں) سب اعمال (نیک

مثل عمارتِ مسجد وغیرہ) اکارت (اور ضائع) ہیں (بوجہ اس کے کہ ان کی قبولیت کی شرط نہیں پائی جاتی اور ضائع عمل پر فخر ہی کیا) اور دوزخ میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے (کیونکہ وہ عمل جو کہ اسباب نجات سے ہے وہ تو ضائع ہی ہوگیا تھا) ہاں اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے (یعنی علیٰ وجہ الکمال ان سے مقبول ہوتا ہے) جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (دل سے) ایمان لائیں (اور جوارح سے اس کا اظہار بھی کریں مثلاً اس طرح کہ) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (اللہ پر ایسا توکل رکھتے ہوں کہ) بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں سو ایسے لوگوں کی نسبت توقع (یعنی وعدہ) ہے کہ اپنے مقصود (یعنی جنت ونجات) تک پہنچ جائیں گے (کیونکہ ان کے اعمال بوجہ ایمان کے مقبول ہوں گے، اس لئے آخرت میں نفع ہوگا اور مشرکین اس شرط سے محروم ہیں اور عمل بے ثمر پر فخر لاحاصل)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیات میں مشرکینِ مکہ کی کج روی، عہد شکنی اور اپنے دین باطل کے لئے ہر طرح کی کوشش کا اور اس کے مقابلہ پر مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب کا بیان آیا تھا، آیاتِ مذکورہ میں مسلمانوں کو جہاد کی تاکید کے ساتھ یہ بتلایا گیا ہے کہ جنگ وجہاد ہی وہ چیز ہے جس میں مسلمان کا امتحان ہوتا ہے، مخلص مسلمان اور منافق یا ضعیف الایمان کا امتیاز ہوتا ہے، اور یہ امتحان ضروری ہے۔

سولہویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف کلمۂ اسلام زبان سے کہہ لینے اور اسلام کا دعویٰ کر لینے پر آزاد چھوڑ دیئے جاؤ گے، جب تک اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر بھی ان سچے اور پکے مسلمانوں کو نہ دیکھ لیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں، اور جو اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا رازدار دوست نہیں بناتے۔

اسی آیت میں اُن عام لوگوں کو خطاب ہے جو مسلمان سمجھے جاتے تھے، اگرچہ ان میں سے بعض منافق بھی تھے اور بعض ضعیف الایمان اور مذبذب تھے، ایسے ہی لوگوں کا یہ حال تھا کہ اپنے غیر مسلم دوستوں کو مسلمانوں کے راز اور اسرار پر مطلع کر دیا کرتے تھے، اس لئے اس آیت میں مخلص مسلمان کی دو علامتیں بتلادی گئیں:

مخلص مسلمان کی دو علامتیں

اوّل یہ کہ اللہ کے واسطے کفار سے جہاد کریں، دوسرے یہ کہ کسی غیر مسلم کو اپنا رازدار، دوست نہ بنائیں آخر آیت میں فرمایا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾ یعنی تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہیں، ان کے آگے کسی کا حیلہ وتاویل نہیں چل سکتی۔

یہی مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ (العنکبوت) "یعنی کیا لوگوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف زبانی اپنے آپ کو مؤمن کہنے پر آزاد چھوڑ دیئے جائیں گے، اور ان کا کوئی امتحان نہ لیا جائے گا۔"

کسی غیر مسلم کو ہمراز دوست بنانا درست نہیں

آیت مذکورہ میں جو لفظ وَلِيْجَةً آیا ہے اس کے معنی دخیل اور بھیدی کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اسی معنی کے لئے لفظ بِطَانَة استعمال کیا گیا ہے، بطانہ کے اصل معنی اس کپڑے کے ہیں جو دوسرے کپڑوں کے نیچے بطن اور بدن کے ساتھ متصل ہو، مراد اس سے ایسا آدمی ہے جو اندر کے رازوں سے واقف ہو، اس آیت کے الفاظ یہ ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ (آل عمران:۱۱۸) "اے ایمان والو! اپنے مسلمانوں کے سوا کسی کو ہمراز اور بھیدی دوست نہ بناؤ وہ تمہیں دھوکہ دے کر برباد کرنے میں کوئی کسر نہ رکھیں گے۔"

اس کے بعد سترہویں اور اٹھارہویں آیتوں میں مسجد حرام اور دوسری مساجد کو عباداتِ باطلہ سے پاک کرنے اور صحیح و مقبول طریقہ پر عبادت کرنے کی ہدایات ہیں۔

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ اور مسجدِ حرام سے ان تمام بتوں کو نکال ڈالا جن کی مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، اس طرح حسی طور پر تو مسجد حرام بتوں سے پاک ہوگئی، لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدیم دشمنوں پر غالب آنے کے بعد سب کو معافی اور امان دے دیا تھا، اور وہ مشرکین اب بھی بیت اللہ اور حرم محترم میں عبادت وطواف وغیرہ اپنے باطل طریقوں پر کیا کرتے تھے۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جس طرح مسجد حرام کو بتوں سے پاک کر دیا گیا، اسی طرح بت پرستی اور اس کے تمام باطل طریقوں سے بھی اس مقدس زمین کو پاک کیا جائے، اور اس سے پاک کرنے کی ظاہری صورت یہی تھی کہ مشرکین کا داخلہ مسجد حرام میں ممنوع قرار دے دیا جائے، لیکن یہ اس دیئے ہوئے امان کے خلاف ہوتا، اور معاہدہ کی پابندی اسلام میں ان سب چیزوں سے مقدم اور اہم تھی، اس لئے فوری طور پر ایسے احکام نہیں دیئے گئے بلکہ فتح مکہ سے اگلے ہی سال میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر اور علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما کے ذریعہ منیٰ اور عرفات کے عام اجتماع میں یہ اعلان کرا دیا کہ آئندہ کوئی مشرکانہ طرز کی عبادت اور حج وطواف وغیرہ حرم میں نہ ہوسکے گی، اور جاہلیت میں جو ننگے ہو کر طواف کرنے کی رسم بد چل پڑی تھی آئندہ اس حرکت کی اجازت نہ دی جائے گی، چنانچہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے منیٰ کے اجتماعِ عام میں اس کا اعلان کر دیا کہ:-

لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوْفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ۔ [1]

''یعنی اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا، اور کوئی ننگا آدمی بیت اللہ کا طواف نہ کر سکے گا۔''

اور یہ سال بھر کی مہلت اس لئے دے دی گئی کہ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور وہ ابھی تک معاہدہ پر قائم تھے، میعادِ معاہدہ پورا ہونے سے پہلے ان کو کسی نئے قانون کا پابند کرنا اسلامی رواداری کے خلاف تھا، اس لئے ایک سال پہلے سے یہ اعلان جاری کر دیا گیا کہ حرم محترم کو مشرکانہ عبادات اور رسوم سے پاک کرنا طے کر دیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی عبادت درحقیقت عبادت اور مسجد کی آبادی نہیں بلکہ ویرانی ہے۔

یہ مشرکین مکہ اپنی مشرکانہ رسوم کو عبادات اور مسجد حرام کی عمارت و آبادی کا نام دیتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے، کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کے متولّی اور اس کی عمارت کے ذمہ دار ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ جب اسلام لانے سے پہلے غزوۂ بدر میں گرفتار ہوئے اور مسلمانوں نے ان کو کفر و شرک پر قائم رہنے سے عار دلائی، تو انہوں نے جواب دیا کہ تم لوگ صرف ہماری بُرائیاں یاد رکھتے ہو اور بھلائیوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کو آباد رکھنے اور اس کا انتظام کرنے اور حجاج کو پانی پلانے وغیرہ کی خدمات کے متولّی بھی ہیں، اس پر قرآنِ کریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ یعنی مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کی تعمیر کریں، کیونکہ مسجد صرف وہی جگہ ہے جو ایک اللہ وحدہٗ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہے، شرک و کفر اس کی ضد ہے، وہ عمارتِ مسجد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

عمارتِ مسجد کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے کئی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک ظاہری در و دیوار کی تعمیر، دوسرے مسجد کی حفاظت اور صفائی اور ضروریات کا انتظام، تیسرے عبادت کے لئے مسجد میں حاضر ہونا، عمرہ کو عمرہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ کی زیارت اور عبادت کے لئے حاضری ہوتی ہے۔

مشرکین مکہ تینوں معنی کے اعتبار سے اپنے آپ کو معمارِ بیت اللہ اور عمارتِ مسجد حرام کا ذمہ دار سمجھتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ مشرکین کو اللہ کی مساجد کی عمارت کا کوئی حق نہیں جبکہ وہ خود اپنے کفر و شرک کے گواہ ہیں، ان لوگوں کے اعمال حبط اور ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

خود اپنے کفر و شرک کی گواہی کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اپنے مشرکانہ افعال و اعمال کے سبب گویا خود اپنے کفر و شرک کی گواہی دے رہے ہیں، اور یا یہ کہ عادۃً جب کسی نصرانی یا یہودی سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو؟ تو وہ اپنے آپ کو نصرانی یا

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التفسير، سورة التوبة، باب قوله تعالى "اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" ج:۲ ص:۶۷۱

یہودی کہتا ہے، اسی طرح مجوس اور بت پرست اپنے کافرانہ ناموں ہی سے اپنا تعارف کراتے ہیں، یہی ان کے کفر وشرک کا اعتراف اور شہادت ہے۔ (ابن کثیر) [۱]

اس آیت میں عمارتِ مسجد کا منفی پہلو بیان کیا گیا تھا کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں۔ دوسری آیت میں عمارتِ مسجد کا مثبت پہلو اس طرح ارشاد فرمایا اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ ''یعنی مسجدوں کو آباد کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاویں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور بجز اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈریں سو ایسے لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔''

مطلب یہ ہے کہ مساجد کی اصلی عمارت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اَحکامِ الٰہی کے پابند ہوں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز زکوٰۃ کے پابند ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان کا ذکر کیا گیا رسول پر ایمان کے ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہ سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی کوئی صورت بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ رسول پر ایمان لائے، اور اس کے ذریعہ جو اَحکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں ان کو دل سے قبول کرے، اس لئے ایمان باللہ میں ایمان بالرسول فطری طور پر داخل ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں، اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس حدیث نے بتلا دیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے۔ (مظہری بحوالہ صحیحین) [۲]

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے، ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا اور دہشت کھانا تو تقاضائے عقل وفطرت ہے، درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے، فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾ (طٰهٰ) اس لئے ایذاء اور نقصان پہنچانے والوں سے طبعی خوف نہ حکم قرآنی کے خلاف ہے نہ رسالت اور ولایت کے، ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے اَحکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا یہ مؤمن کی شان نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۱۹

[۲] التفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۴۷، وصحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب اداء الخمس من الإیمان ج:۱ ص:۱۳

بعض مسائل متعلقہ آیت

اور عمارتِ مسجد جس کے متعلق ان آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ مشرک کافر نہیں کر سکتے بلکہ وہ صرف نیک صالح مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے مراد مساجد کی تولیت اور انتظامی ذمہ داری ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی کافر کو کسی اسلامی وقف کا متولّی اور منتظم بنانا جائز نہیں، باقی رہا ظاہری درو دیوار وغیرہ کی تعمیر سو اس میں کسی غیر مسلم سے بھی کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں (تفسیر مراغی) اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنادے یا مسجد بنانے کے لئے مسلمانوں کو چندہ دیدے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو۔ (الدر المختار، شامی، مراغی)

اور اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کی عمارت اور آبادی صرف نیک مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص مساجد کی حفاظت، صفائی اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا ہے، اور جو عبادت اور ذکر اللہ کے لئے یا علم دین اور قرآن پڑھنے پڑھانے کے لئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مؤمن کامل ہونے کی شہادت ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ [۱]

اور صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک درجہ تیار فرما دیتے ہیں۔ [۲]

اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا مہمان ہے، اور میزبان پر حق ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔ (مظہری بحوالہ طبرانی، ابن جریر، بیہقی وغیرہ) [۳]

مفسر القرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمارت مسجد میں یہ بھی داخل ہے کہ مسجد کو ایسی

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة التوبة ج:۲ ص:۱۴۰

[۲] صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب فضل من خرج إلی المسجد ومن راح ج:۱ ص:۹۱، وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل الصلاة المكتوبة ...إلخ ج:۱ ص:۲۳۴

[۳] المعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث:۶۰۱۶، وشعب الإيمان للبيهقیؒ رقم الحديث:۲۸۱۲ والمظهری ج:۴ ص:۱۴۸

چیزوں سے پاک کرے جن کے لئے مسجدیں نہیں بنائی گئیں، مثلاً خرید وفروخت، دنیا کی باتیں، کسی گم شدہ چیز کی تلاش، یا دنیا کی چیزوں کا لوگوں سے سوال، یا فضول قسم کے اشعار، جھگڑا، لڑائی اور شور وشغب وغیرہ۔ (مظہری) [1]

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

کیا تم نے کردیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد الحرام کا بسانا برابر اس کے جو یقین لایا اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ

اور آخرت کے دن پر، اور لڑا اللہ کی راہ میں یہ برابر نہیں ہیں اللہ کے نزدیک

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا (وقف لازم)

اور اللہ رستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو، جو ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۗ

اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے، ان کے لئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ

اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں، خوش خبری دیتا ہے ان کو پروردگار ان کا اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی

وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ

اور باغوں کی کہ جن میں ان کو آرام ہے ہمیشہ کا، رہا کریں ان میں مدام، بے شک اللہ کے پاس

اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ

بڑا ثواب ہے، اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو اور بھائیوں کو

---

[1] التفسیر المظہری تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۴۸، ۱۴۹

أَوْلِيَآءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ

رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو ایمان سے، اور جو تم میں ان کی رفاقت کرے

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾

سو وہی لوگ ہیں گنہگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کے آباد رکھنے کو اُس شخص کے (اعمال کے) برابر سمجھ رکھا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر اِیمان لایا ہے، اور جس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ سب برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا ﴿۱۹﴾ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور انہوں نے اللہ کے راستے میں ہجرت کی ہے، اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا ہے، وہ اللہ کے نزدیک درجے میں کہیں زیادہ ہیں، اور وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۲۰﴾ اُن کا پروردگار انہیں اپنی طرف سے رحمت اور خوشنودی کی، اور ایسے باغات کی خوشخبری دیتا ہے جن میں اُن کے لئے دائمی نعمتیں ہیں ﴿۲۱﴾ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی ہے جس کے پاس عظمت والا اجر موجود ہے ﴿۲۲﴾ اے ایمان والو! اگر تمہارے باپ بھائی کفر کو ایمان کے مقابلے میں ترجیح دیں تو اُن کو اپنا سرپرست نہ بناؤ، اور تم میں سے جو لوگ اُن کو سرپرست بنائیں گے، وہ ظالم ہوں گے ﴿۲۳﴾

خلاصۂ تفسیر

کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص (کے عمل) کے برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو (وہ عمل ایمان اور جہاد ہے، یعنی یہ عمل برابر نہیں اور جب اعمال برابر نہیں تو) یہ (عامل) لوگ (بھی باہم) برابر نہیں اللہ کے نزدیک (غرض عمل عمل باہم اور عامل عامل باہم برابر نہیں مقصود بقرینہ سیاق یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر واحد افضل ہے، سقایہ اور عمارت کے ہر واحد سے یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے، اور اس سے جواب ہو گیا مشرکین کا کہ ان میں ایمان نہ تھا، اور جہاد بھی دونوں سے افضل ہے، اس سے جواب ہو گیا بعض مؤمنین کا جو کہ بعد ایمان کے سقایہ اور عمارت کو جہاد پر تفضیل دیتے تھے) اور (یہ امر

مذکور بہت ہی ظاہر ہے لیکن) جو لوگ بے انصاف ہیں (مراد مشرک ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ نہیں دیتا (اس لئے وہ نہیں مانتے بخلاف اہلِ ایمان کے کہ وہ اس تحقیق کو فوراً مان گئے، آگے اس مضمون کی تصریح ہے جو اوپر لَا یَسْتَوٗنَ سے مقصود تھا یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور (اللہ کے واسطے) انہوں نے ترکِ وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجہ میں اللہ کے نزدیک (بمقابلہ اہلِ سقایہ واہلِ عمارت کے) بہت بڑے ہیں (کیونکہ اگر اہلِ سقایہ واہل عمارت میں ایمان نہ ہوتب تو یہ بڑائی انہی مؤمنین مہاجرین مجاہدین میں منحصر ہے اور اگر ان میں ایمان ہوتو گو وہ بھی بڑے ہیں مگر یہ زیادہ بڑے ہیں) اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں (کیونکہ اگر ان کے مقابلین میں ایمان نہ ہوتب تو کامیابی کا حصر انہی میں ہے، اور اگر ایمان ہوتو کامیابی مشترک ہے، لیکن ان کی کامیابی ان سے اعلیٰ ہے، آگے اس درجہ اور فوز کا بیان ہے کہ) ان کا رَبّ ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور (جنت کے) ایسے باغوں کی ان کے لئے کہ ان (باغوں) میں دائمی نعمت ہوگی (اور) ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے، (اس میں سے ان کو دیا جائے گا) اے ایمان والو اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو (اپنا) رفیق مت بناؤ اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے (ایسا) عزیز رکھیں (کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہے) اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں (مطلب یہ کہ بڑا مانع ہجرت سے ان لوگوں کا تعلق ہے اور خود وہی جائز نہیں پھر ہجرت میں کیا دشواری ہے)۔

معارف و مسائل

شروع کی چار آیتیں ۱۹ سے ۲۲ تک ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، وہ یہ کہ بہت سے مشرکینِ مکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم مسجدِ حرام کی آبادی اور حجاج کو پانی پلانے کا انتظام کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر کسی کا کوئی عمل نہیں ہوسکتا، اسلام لانے سے پہلے جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں گرفتار ہوکر مسلمانوں کی قید میں آئے، اور ان کے مسلم عزیزوں نے ان کو اس پر ملامت کی، کہ آپ نعمتِ ایمان سے محروم ہیں تو انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آپ لوگ ایمان و ہجرت کو اپنا بڑا سرمایۂ فضیلت سمجھتے ہیں، مگر ہم بھی تو مسجد حرام کی عمارت اور حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمات کے متولّی ہیں جن کے برابر کسی کا عمل نہیں ہوسکتا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ (ابن کثیر بروایت علیؓ بن ابی طلحہؒ عن ابن عباسؓ)[1]

اور مسند عبدالرزاق کی بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباسؓ کے مسلمان ہوجانے کے بعد طلحہ بن شیبہؓ اور

[1] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۲، وتفسير الطبري تحت هٰذه الآية ج:۱۴ ص:۱۷۰

حضرت عباسؓ اور علی کرّم اللہ وجہہ کے آپس میں گفتگو ہورہی تھی، طلحہؓ نے کہا کہ مجھے وہ فضیلت حاصل ہے جو تم میں سے کسی کو حاصل نہیں، کہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں ہے میں اگر چاہوں تو بیت اللہ کے اندر جا کر رات گزار سکتا ہوں، حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ میں حجاج کو پانی پلانے کا متولّی اور منتظم ہوں، اور مسجدِ حرام میں میرے اختیارات ہیں، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ حضرات کس چیز پر فخر کر رہے ہیں، میرا حال تو یہ ہے کہ میں نے سب لوگوں سے چھ مہینہ پہلے بیت اللہ کی طرف نمازیں پڑھی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہوں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، [۱] جن میں واضح کر دیا گیا کہ کوئی عمل کتنا ہی اعلیٰ و افضل ہو ایمان کے بغیر اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں، اور نہ حالتِ شرک میں ایسے اعمال کا کرنے والا اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک روز جمعہ کے دن مسجد نبوی میں چند حضرات صحابہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس جمع تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسلام و ایمان کے بعد میرے نزدیک حجاج کو پانی پلانے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں، اور مجھے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے عمل کی پروا نہیں، ایک دوسرے صاحب نے ان کے جواب میں کہا کہ نہیں، اللہ کی راہ میں جہاد سب سے بڑا عمل ہے، ان دونوں میں بحث ہونے لگی، تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے دونوں کو ڈانٹ کر کہا کہ منبرِ نبوی کے پاس شور وشغب نہ کرو، مناسب بات یہ ہے کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد یہ بات خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلو، اس تجویز کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، [۲] جن میں جہاد کو عمارتِ مسجدِ حرام اور سقایۃ حجاج سے افضل عمل بتلایا گیا۔

اور اس میں کوئی بُعد نہیں کہ اصل آیات کا نزول تو مشرکین کے فخر وتکبر کے جواب میں ہوا ہو، پھر اس کے بعد جو واقعات مسلمانوں کے باہم پیش آئے ان میں بھی انہی آیات کو استدلال کے لئے پیش کیا گیا ہو جس سے سننے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آیات اس واقعہ میں نازل ہوئیں۔

بہرحال آیات مذکورہ میں دونوں قسم کے واقعات کا یہ جواب ہے کہ شرک کے ساتھ تو کوئی عمل کتنا ہی بڑا ہو مقبول اور قابلِ ذکر ہی نہیں، اس لئے کسی مشرک کو عمارتِ مسجد، یا سقایۃ حجاج کی وجہ سے کوئی فضیلت و بزرگی مسلمانوں کے مقابلہ میں حاصل نہیں ہوسکتی، اور ایمان کے بعد بھی ایمان و جہاد کا درجہ بہ نسبت عمارتِ مسجدِ حرام اور سقایۃ الحجاج کے بہت زیادہ ہے، جو مسلمان ایمان و جہاد میں مقدم رہے وہ ان مسلمانوں سے افضل ہیں جنہوں نے جہاد میں شرکت نہیں کی، صرف

---

[۱] تفسیر الطبری رقم الحدیث: ۱۶۵۶۳ وتفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج: ۱ ص: ۲۲

[۲] صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضل الشهادة فی سبیل الله ج: ۲ ص: ۱۳۴

مسجد حرام کی تعمیر اور حجاج کے پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس تمہید کے بعد آیات مذکورہ کے الفاظ اور ترجمہ پر پھر ایک نظر ڈالئے، ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے حجاج کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو، یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک۔

بقرینۂ سیاق مقصود یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر ایک افضل ہے، سقایۃ الحجاج اور عمارتِ مسجد سے، یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے، اور جہاد بھی، ایمان کے افضل ہونے سے مشرکین کی بات کا جواب ہوگیا، اور جہاد کے افضل ہونے سے ان مسلمانوں کی بات کا جواب ہوگیا جو عمارتِ مسجد اور سقایۂ حجاج کو جہاد سے افضل کہتے تھے۔

ذکر اللہ جہاد سے افضل ہے

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں جو عمارتِ مسجد پر جہاد کو فضیلت اور ترجیح دی گئی ہے یہ عمارت کے ظاہری معنی کی رُو سے ہے یعنی مسجد کی تعمیر اور ضروری انتظامات کہ جہاد کا ان کے مقابلہ میں افضل ہونا مُسلّم ہے۔

لیکن عمارتِ مسجد کے ایک دوسرے معنی عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مسجد میں حاضری کے بھی آتے ہیں، اور درحقیقت مسجد کی اصلی عمارت و آبادی اسی سے ہے، اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات کی بناء پر عمارتِ مسجد جہاد سے افضل و اعلیٰ ہے [۱] جیسا کہ مسند احمد اور ترمذی، ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل بتلاؤں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو، اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو، اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم جہاد میں دشمن سے سخت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کرو وہ تمہیں قتل کریں، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عمل ضرور بتلایئے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔ [۲] اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے، اور عمارتِ مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے، مگر اس جگہ مشرکین کا فخر و غرور ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور عبادت کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر تھا، اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا۔

---

[۱] التفسیر المظہری تحت ہذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۵۰

[۲] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب منہ ج:۲ ص:۱۷۵، وسنن ابن ماجۃ، کتاب الأدب، باب فضل الذکر ج:۲ ص:۲۶۸، ومسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۷۳۱، حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔

اور قرآن وسنت کے مجموعی ارشادات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کا دوسرے عمل سے افضل واعلیٰ ہونا حالات وواقعات کے تابع ہوتا ہے، بعض حالات میں ایک عمل دوسرے سے افضل ہوتا ہے، اور حالات بدلنے کے بعد معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے، جس وقت اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کی ضرورت شدید ہو اُس وقت یقیناً جہاد تمام عبادات سے افضل ہوگا، جیسا کہ غزوۂ خندق میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں قضا ہوجانے کے واقعہ سے ظاہر ہے، اور جس وقت ایسی شدید ضرورت نہ ہو تو ذکر اللہ اور عبادت بمقابلہ جہاد کے افضل ہوگا۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ فرما کر یہ بتلا دیا کہ یہ کوئی دقیق اور باریک بات نہیں بلکہ بالکل واضح ہے کہ ایمان سارے اعمال کی بنیاد اور ان سب سے افضل ہے، اور یہ کہ جہاد بہ نسبت عمارتِ مسجد اور سقایۃ الحجاج کے افضل ہے، مگر اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو سمجھ نہیں دیتا، اس لئے وہ ایسی کھلی اور ظاہری باتوں میں بھی کج بحثی کرتے رہتے ہیں۔

بیسویں آیت میں اس مضمون کی تفصیل ہے جو پہلی آیت میں لَا يَسْتَوٗنَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، یعنی ایمان لانے والے مجاہد اور صرف عمارتِ مسجد اور سقایۂ حجاج کرنے والے اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں، اس میں ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿٢٠﴾ ”یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جان ومال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک درجہ میں بڑے ہیں، اور پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔“

کیونکہ ان کے مقابلہ میں جو مشرک ہیں ان کو تو کامیابی کا کوئی درجہ ہی حاصل نہیں، اور جو مسلمان ہیں اگرچہ نفسِ کامیابی میں وہ بھی شریک ہیں، مگر ان کی کامیابی ان سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں ان کامیاب لوگوں کے اجرِ عظیم اور درجاتِ آخرت کا بیان ہے يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ ”یعنی ان لوگوں کو ان کا پروردگار خوش خبری سناتا ہے اپنی رحمت اور رضا کی اور ایسی جنتوں کی جن میں ان کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں ہوں گی اور یہ لوگ بھی ان نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے، ان کو یہاں سے کبھی نہ نکالا جائے گا، بیشک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔“

آیاتِ مذکورہ میں ہجرت اور جہاد کے فضائل کا بیان آیا ہے، جن میں وطن اور اعزّاء واقارب اور احباب واصحاب اور اموال واملاک سب کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت پر یہ کام سب سے زیادہ شاق اور دشوار ہیں، اس لئے اگلی آیات میں ان چیزوں کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق اور محبت کی مذمت فرما کر مسلمانوں کے ذہنوں کو ہجرت وجہاد

کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾

''یعنی اے ایمان والوتم اپنے باپ دادا اور بھائیوں کو رفیق مت بناؤ، اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے عزیز رکھیں، اور تم میں سے جو شخص ان کے ساتھ باوجود ان کے کفر کے رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں۔''

ماں باپ بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق کو مضبوط رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، مگر اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے، ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو، یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ اور اس کے رسول کے تعلق کے مقابلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں، تو پھر رشتہ و تعلق اللہ و رسول کا ہی قائم رکھنا ہے، اس کے مقابلہ میں سارے تعلقات سے قطع نظر کرنا ہے۔

آیاتِ مذکورہ کے متعلق چند فوائد اور مسائل

مذکورہ پانچ آیتوں سے چند فوائد اور مسائل حاصل ہوئے:

اوّل یہ کہ ایمان رُوحِ عمل ہے، اُس کے بغیر کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ صرف صورت بے جان اور نا قابلِ قبول ہے، نجاتِ آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ کے یہاں بے انصافی نہیں، کافروں کے ایسے بے رُوح اعمالِ حسنہ بھی بالکل ضائع نہیں کئے جاتے، ان کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں آرام و عیش اور دولت و راحت دے کر بیباق کر دیا جاتا ہے، جس کا بیان قرآن کریم کی متعدّد آیات میں آیا ہے۔

دوسرا فائدہ ان آیات سے یہ حاصل ہوا کہ معصیت و نافرمانی سے انسان کی عقل بھی خراب ہو جاتی ہے اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اُنیسویں آیت کے آخر میں وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٩﴾ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ جیسا کہ اس کے بالمقابل ایک آیت میں إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (الانفال:۲۹) فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اطاعت و تقویٰ سے انسان کی عقل کو جلا ہوتی ہے، سلامتِ فکر نصیب ہوتی ہے، وہ اچھے بُرے کی تمیز میں غلطی نہیں کرتا۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ نیک اعمال میں بھی باہمی تفاضل ہے، اور اسی کی مناسبت سے عمل کرنے والوں کے درجات میں تفاضل قائم ہوتا ہے، سب عمل کرنے والے ایک درجہ میں نہیں رکھے جا سکتے، اور مدار کثرتِ عمل پر نہیں بلکہ حسنِ عمل پر ہے، سورۂ ملک میں آیا ہے: لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ (الملک:۲) ''یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کریں

گے، کہ کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے۔''

چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ راحت ونعمت کے دائمی رہنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ نعمتیں کسی وقت ختم نہ ہو جائیں، دوسرے یہ کہ کسی وقت ان لوگوں کو ان نعمتوں سے جدا نہ کیا جائے، اس لئے اللہ کے مقبول بندوں کے لئے دونوں چیزوں کی ضمانت دے دی گئی، نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ فرما کر نعمتوں کا دائمی ہونا بیان فرمادیا، اور خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا فرما کر ان لوگوں کو کبھی ان نعمتوں سے الگ نہ کرنے کا اطمینان دلا دیا۔

اصل رشتہ اسلام وایمان کا رشتہ ہے، نسبی ووطنی تعلقات سب اس پر قربان کرنے ہیں

پانچواں مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مقدم ہے، جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کے قابل ہے، صحابہ کرام کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری اُمت سے افضل واعلیٰ قرار پائے یہی چیز تھی کہ انہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان ومال اور ہر رشتہ وتعلق کو قربان کر کے زبانِ حال سے کہا۔

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو وسمن ہمہ زخویش بریدند وبا تو پیوستند [1]

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور قریشِ مکہ انصارِ مدینہ تو سب آپس میں بھائی بھائی ہوگئے، اور بدر واُحد کے میدانوں میں باپ بیٹے، بھائی بھائی کی تلواریں آپس میں ٹکرا کر اس کی شہادت دی کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تنِ بیگانہ کاشنا باشد [2]

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُمْ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَيْنَا وَخَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدَنَا [3]

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری

[1] ترجمہ: تم کیسے اچھے پھلدار درخت ہو کہ سرو اور چنبیلی جیسے درخت بھی اپنوں سے ہٹ کٹ کر تجھ سے وابستہ ہوگئے ہیں۔

[2] ترجمہ: ہزار قریب رشتہ دار جو خدا تعالیٰ سے بے گانہ ہوں، اس ایک شخص پر فدا ہیں جو آشنائے حق ہو۔

[3] ترجمہ: اے اللہ ہمیں ان کی اتباع کی توفیق عطا فرما اور اپنی محبت کو میرے لئے تمام چیزوں سے محبوب تر اور اپنے ڈر کو میرے لئے تمام چیزوں سے خوفناک تر بنادے۔

وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ

اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو

اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ

تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے

اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ع

۳ ع ۸ ۹

اللہ اپنا حکم، اور اللہ راستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر! مسلمانوں سے) کہہ دو کہ: ''اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، اور تمہارا خاندان، اور وہ مال و دولت جو تم نے کمایا ہے، اور وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے، اور وہ رہائشی مکان جو تمہیں پسند ہیں، تمہیں اللہ اور اُس کے رسول سے، اور اُس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو منزل تک نہیں پہنچاتا۔ ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(آگے اسی مضمون کی زیادہ تفصیل ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن میں (رہنے) کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (سزائے ترکِ ہجرت کا) بھیج دیں (جیسا دوسری آیت میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ الیٰ قولہ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ النساء: ۹۷) اور اللہ تعالیٰ بےحکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا (یعنی ان کا مقصود تھا ان چیزوں سے تمتع وہ بہت جلد خلاف اُن کی توقع کے موت سے منقطع ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ کی یہ آیت دراصل ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مکہ سے ہجرت فرض ہونے کے وقت ہجرت نہیں کی، ماں، باپ، بھائی، بہن، اولاد اور بیوی اور مال و جائیداد کی محبت نے ان کو فریضۂ ہجرت ادا کرنے سے روک دیا، ان کے بارے میں حق تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ آپ اُن لوگوں سے کہہ دیں کہ:

''اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں، اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا۔''

اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ ''منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں۔'' اِمامِ تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ حکم سے مراد جہاد وقتال اور فتح مکہ کا حکم ہے، [1] اور مطلب یہ ہے کہ اس وقت دنیاوی تعلقات پر اللہ ورسول کے تعلقات قربان کرنے والوں کا انجامِ بد عنقریب سامنے آنے والا ہے، جبکہ مکہ فتح ہوگا، اور نافرمانی کرنے والے ذلیل وخوار ہوں گے، اور ان کے یہ تعلقات اس وقت ان کے کام نہ آئیں گے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جگہ حکم سے مراد حکمِ عذاب ہے، کہ دنیوی تعلقات پر اُخروی تعلقات کو قربان کر کے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا حکمِ عذاب عنقریب آنے والا ہے یا تو دنیا ہی میں اُن پر عذاب آئے گا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے، آیت میں اس جگہ مقصود تو ترکِ ہجرت پر وعید ہے، مگر ذکر بجائے ہجرت کے جہاد کا کیا گیا، جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے، اس میں اشارہ کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت اور ترکِ وطن ہی کا حکم ہوا ہے، اس میں کچھ لوگ ہمت ہار بیٹھے، آگے جہاد کا حکم آنے والا ہے، جس میں اللہ اور رسول کی محبت پر ساری محبتوں کو اور خود اپنی جان کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ ہجرت ہی کو جہاد سے تعبیر کر دیا ہو کیونکہ وہ بھی حقیقت میں جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے۔

اور آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾ فرما کر یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ حکمِ ہجرت کے باوجود اپنے دنیوی تعلقات کو ترجیح دے کر اپنے خویش وعزیز اور مال ومکان سے چمٹے رہے، ان کا یہ عمل دنیا میں بھی اُن کے لئے مفید

---

[1] تفسیر البغوی تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۵، والقرطبی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۹۶

نہیں ہوگا، اور اُن کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا کہ ہمیشہ اپنے اہل و عیال اور مال و مکان میں امن و چین سے بیٹھیں رہیں، بلکہ حکمِ جہاد شروع ہوتے ہی یہ سب چیزیں اُن کے لئے وبالِ جان بن جائیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتے۔

مسائل متعلقہ ہجرت

اوّل: جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کردی گئی تو وہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا، یہ حکم فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگیا، اور اصل حکم یہ باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ کے اَحکام نماز روزہ وغیرہ کی تعمیل ممکن نہ ہو اس سے ہجرت کرنا ہمیشہ کے لئے فرض ہے، بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ہر ایسی جگہ کو چھوڑ دے جہاں فسق و فجور کا غلبہ ہو یہ ہمیشہ کے لئے مستحب ہے۔ (تفصیل فتح الباری میں ہے) [۱]

آیت مذکورہ میں براہِ راست تو خطاب ان لوگوں سے ہے جنہوں نے ہجرت فرض ہونے کے وقت دنیوی تعلقات کی محبت سے مغلوب ہوکر ہجرت نہیں کی، لیکن الفاظِ آیت کا عموم تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجہ ہونا لازم و واجب ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اُس پر غالب نہ آئے، اور جس نے اس درجے کی محبت پیدا نہ کی وہ مستحقِ عذاب ہوگیا، اس کو عذابِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

سچا ایمان اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ اللہ اور رسول کی محبت ساری دنیا اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ ہو

اسی لئے ایک صحیح حدیث میں جو صحیحین میں بروایت انس رضی اللہ عنہ منقول ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ [۲]

اور ابوداؤد، ترمذی میں بروایت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری، کتاب الجهاد والسیر، باب وجوب وما یجب من الجهاد والنیة ج:۸ ص:۴۳۲

[۲] صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی الله علیه وسلم من الإیمان ج:۱ ص:۶، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب وجوب محبة الرسول صلی الله علیه وسلم إلخ ج:۱ ص:۴۹

کسی سے دوستی کی تو اللہ کے لئے کی اور دشمنی کی تو وہ بھی اللہ ہی کے لئے کی اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رُکا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ [۱]

ان روایاتِ حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو، اور انسان کی دوستی دشمنی، دینا یا نہ دینا سب حکمِ خدا اور رسول کے تابع ہو۔

امام تفسیر قاضی بیضاویؒ وغیرہ نے فرمایا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آیت کی وعید سے مستثنیٰ ہوں، کیونکہ عام طور پر بڑے سے بڑے عابد و زاہد اور عالم و متقی بھی اہل و عیال اور مال و متاع کی محبت سے مغلوب نظر آتے ہیں، اِلّا ماشاء اللہ، مگر ساتھ ہی قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے، غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت و اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، [۲] اس لئے اگر کسی شخص کا دل ان دنیوی تعلقات کی طبعی محبت سے لبریز ہو مگر ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ و رسول کے اَحکام کی خلاف ورزی کی پروا نہ کرے، تو وہ بھی اس وعید سے خارج اور اللہ و رسول کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے، جیسے کوئی بیمار دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے، مگر عقلاً اس کو اپنی نجات و سلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو وہ کسی کے نزدیک قابلِ ملامت نہیں، اور نہ کوئی عقلِ سلیم اس کو اس پر مجبور کرتی ہے، کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے، اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض اَحکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس تکلیف کو برداشت کرکے اَحکامِ الٰہیہ بجالائے تو وہ بھی قابلِ ملامت نہیں، بلکہ قابلِ تحسین ہے، اور اللہ و رسول کی محبت کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ محبت کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ محبت طبیعت پر بھی غالب آجائے، اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذت ہر تلخی و تکلیف کو بھی لذیذ بنادے، جیسا دنیا کی فانی لذت و راحت کے طلب گاروں کو رات دن دیکھا جاتا ہے، کہ بڑی سے بڑی محنت و مشقت کو ہنس کھیل کر اختیار کرلیتے ہیں، کسی دفتر کی ملازمت میں مہینہ کے ختم پر ملنے والے چند سکوں کی محبت انسان کی نیند، آرام اور سارے تعلقات پر ایسی غالب آجاتی ہے کہ اس کے پیچھے ہزاروں مشقتوں کو بڑی کوششوں، سفارشوں، اور رشتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔

رنج و راحت شد چو مطلب شد بزرگ　　گرد گلہ تو تیائے چشمِ گرگ [۳]

---

[۱] سنن ابی داوٗد، کتاب السنة، باب الدليل على الزيادة والنقصان ج:۲ ص:۶۴۳، وجامع الترمذی، ابواب صفة القيامة والرقائق والورع باب منه۔

[۲] تفسير البيضاوی تحت هذه الآية ج:۲ ص:۴۳۱

[۳] ترجمہ: جب مقصد بڑا ہو تو اس کے راستے میں رنج بھی راحت ہوجاتا ہے، ریوڑ کا گرد و غبار بھیڑیے کی آنکھ کا توتیا (تِلّی) ہوجاتا ہے۔

اللہ والوں کو یہ مقام اللہ ورسول اور نعمائے آخرت کی محبت میں ایسا ہی حاصل ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تکلیف تکلیف نظر نہیں آتی، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاویں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہو جاتی ہے، وہ تین خصلتیں یہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت رکھے، تیسرے یہ کہ کفر وشرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو۔ [۱]

اس حدیث میں حلاوتِ ایمان سے مراد محبت کا یہی مقام ہے جو انسان کے لئے مشقت ومحنت کو لذیذ بنا دیتا ہے ۔ از محبت تلخہا شیریں شود، [۲] اسی مقام کے متعلق بعض علماء نے فرمایا ہے ۔

وَاِذَا حَلَّتِ الْحَلَاوَةُ قَلْبًا نَشَطَتْ فِي الْعِبَادَةِ الْاَعْضَاءُ

''یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جاتی ہے، تو عبادت واطاعت میں اس کے اعضاء لذت پانے لگتے ہیں۔''

اسی کو بعض روایات میں بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ [۳]

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ محبت خدا اور رسول کا یہ مقام ایک نعمتِ کبریٰ ہے، مگر وہ صرف اللہ والوں کی صحبت ومعیت ہی سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے صوفیائے کرام اس کو خدمتِ مشائخ سے حاصل کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، [۴] صاحب روح البیان نے فرمایا کہ یہ مقامِ خُلّت اسی کو حاصل ہوتا ہے جو خلیل اللہ کی طرح اپنے مال، اولاد اور جان کو اللہ کی محبت میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو [۵] ۔

خلیل عصا درِ ملک یقین زن نوائے لا احب الآفلین زن [۶]

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وشریعت کی حفاظت اور اس میں رخنے ڈالنے والوں کی مدافعت بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک کھلا نشان ہے، [۷] رَزَقَنَا اللّٰهُ تَعَالٰى وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ حُبَّهٗ وَحُبَّ رَسُوْلِهٖ كَمَا يُحِبُّ وَيَرْضَاهُ۔ [۸]

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب حلاوۃ الإیمان، ج:۱ ص:۷، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان خصال إلخ ج:۱ ص:۴۹

[۲] ترجمہ: بہت سی کڑوی چیزیں محبت کے سبب میٹھی ہو جاتی ہیں۔

[۳] سنن النسائی، عشرة النساء، باب حب النساء ج:۲ ص:۹۲

[۴] التفسیر المظہری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۵۳

[۵] روح البیان تحت هذه الآية ج:۱ ص:۸۸۲

[۶] ترجمہ: ابراہیم! یقین کی سلطنت میں لاٹھی مارو، لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ کی آواز لگاؤ۔ "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ ''میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا'' یہ جملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ ہے جو سورۂ انعام کی آیت نمبر ۷۶ میں مذکور ہے۔

[۷] روح البیان بحوالۂ قاضیؒ ج:۱ ص:۸۸۲

[۸] ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی ایسی محبت عطا فرمائے جو اُسے محبوب اور پسندیدہ ہو۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ

مدد کرچکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن، جب خوش ہوئے تم

كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

اپنی کثرت پر پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے

ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۲۵ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر، پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر

وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ

اور ایمان والوں پر اور اُتاریں فوجیں کہ جن کو تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا کافروں کو

وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۲۶ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

اور یہی سزا ہے منکروں کی پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ اس کے بعد جس کو چاہے،

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۲۷

اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہت سے مقامات پر مدد کی ہے، اور (خاص طور پر) حنین کے دن جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تمہیں مگن کر دیا تھا، مگر وہ کثرتِ تعداد تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم نے پیٹھ دِکھا کر میدان سے رُخ موڑ لیا (۲۵) پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مؤمنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی، اور ایسے لشکر اُتارے جو تمہیں نظر نہیں آئے، اور جن لوگوں نے کفر اَپنا رکھا تھا، اللہ نے اُن کو

سزا دی، اور ایسے کافروں کا یہی بدلہ ہے (۲۶) پھر اللہ جس کو چاہے اس کے بعد توبہ نصیب کردے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے (۲۷)

خلاصۂ تفسیر

تم کو خدا تعالیٰ نے (لڑائی کے) بہت موقعوں میں (کفار پر) غلبہ دیا (جیسے بدر وغیرہ) اور حُنین کے دن بھی (جس کا قصہ عجیب وغریب ہے تم کو غلبہ دیا) جبکہ (یہ واقعہ ہوا تھا کہ) تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرّہ ہو گیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کار آمد نہ ہوئی اور (کفار کے تیر برسانے سے ایسی پریشانی ہوئی کہ) تم پر زمین باوجود اپنی (اس) فراخی کے تنگی کرنے لگی پھر (آخر) تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (کے قلب) پر اور دوسرے مؤمنین (کے قلوب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی، اور (مدد کے لئے) ایسے لشکر (آسمان سے) نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا (مراد فرشتے ہیں جس کے بعد تم پھر مستعد قتال ہوئے اور غالب آئے) اور (اللہ تعالیٰ نے) کافروں کو سزا دی (کہ ان پر ہزیمت اور قتل وقید واقع ہوئی) اور یہ کافروں کی (دنیا میں) سزا ہے، پھر اللہ تعالیٰ (ان کافروں میں سے) جس کو چاہیں توبہ نصیب کردیں (چنانچہ بہت سے مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں، (کہ جو شخص ان میں مسلمان ہوا اس کے سب پچھلے گناہ معاف کرکے مستحق جنت کا بنا دیا)۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں غزوۂ حُنین کے واقعات شکست وفتح کا اور ان کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل اور فوائد کا بیان ہے، جیسا کہ اس سے پہلی سورت میں فتحِ مکہ اور اس کے متعلقات کا ذکر تھا، شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اس انعام واحسان کا ذکر فرمایا ہے، جو مسلمانوں پر ہر موقع اور ہر حالت میں مبذول رہا ہے، ارشاد فرمایا:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی بہت سے مقامات میں'' اور اس تمہید کے بعد خصوصیت کے ساتھ فرمایا وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ''یعنی غزوۂ حُنین کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی۔''

غزوۂ حُنین کی خصوصیت اس وجہ سے فرمائی ہے کہ اس میں بہت سے واقعات اور حالات خلافِ توقع عجیب انداز سے ظاہر ہوئے، جن میں غور کرنے سے انسان کے ایمان میں قوت اور عمل میں ہمت پیدا ہوتی ہے، اس لئے آیاتِ مذکورہ کی لفظی تفسیر سے پہلے اس غزوہ کے ضروری واقعات جو حدیث وتاریخ کی مستند کتابوں میں مذکور ہیں

کسی قدر تفصیل سے بیان کردینا مناسب ہے، تاکہ آیات مذکورہ کے سمجھنے میں آسانی ہو اور جن فوائد کے لئے یہ واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ سامنے آجائیں، ان واقعات کا بیشتر حصہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے، جس میں بحوالۂ کتبِ حدیث وتاریخ واقعات کا ذکر ہے۔ [1]

حُنین، مکہ مکرّمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریش مکہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلۂ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنوثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انہوں نے جمع ہوکر یہ کہنا شروع کیا، کہ مکہ فتح ہوجانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوّت حاصل ہوگئی ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رُخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کردیں، اس کام کے لئے قبیلۂ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کرلیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہوگئے۔

اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے، جو بعد میں مسلمان ہوگئے، اور اسلام کے بڑے علَم بردار ثابت ہوئے، اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا، قبیلہ کی عظیم اکثریت نے ان کی رائے سے اتفاق کرکے جنگ کی تیاریاں شروع کردیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دو شاخیں بنوکعب اور بنوکلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ بصیرت دے دی تھی، انہوں نے کہا اگر مشرق سے مغرب تک ساری دنیا بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جمع ہوجائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آئیں گے، ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کرسکتے، باقی سب کے سب نے معاہدے کئے، اور مالک بن عوف نے ان سب کو پوری قوّت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے تمام اہل وعیال بھی ساتھ چلیں، اور اپنا اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچے اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، میدان سے گریز کا ان کے لئے موقع نہ رہے، ان کی تعداد کے بارے میں اہلِ تاریخ کے مختلف اقوال ہیں، حافظ حدیث علامہ ابن حجرؒ وغیرہ نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا، [2] اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے، یہ ممکن ہے کہ سب اہل وعیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس یا اٹھائیس ہزار ہو، اور لڑنے والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: التفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۵۴ تا ۱۵۹

[2] التفسیر المظهری بحواله حافظؒ ج:۴ ص:۱۵۴، وفتح الباری ج:۱۲ ص:۱۲۶

بہر حال رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو آپ نے ان کے مقابلہ پر جانے کا عزم فرمالیا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اَسِید رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا، اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا، اور قریشِ مکہ سے اسلحہ اور سامانِ جنگ عاریت کے طور پر مانگا، صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا بول اٹھا کہ کیا آپ یہ سامانِ جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریت کے طور پر لیتے ہیں، جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہوگی یہ سن کر اس نے سو زر ہیں مستعار دیں [۱] اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح پیش کر دیئے امام زہریؒ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف متوجہ ہوئے، جن میں بارہ ہزار انصار مدینہ تھے، جو فتح مکہ کے لئے آپ کے ساتھ آئے تھے، اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطرافِ مکہ کے لوگوں میں سے بوقت فتح مسلمان ہو گئے تھے، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے، شوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ کے دن آپ اس غزوہ کے لئے نکلے، اور فرمایا کہ کل اِن شاء اللہ ہمارا قیام خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہوگا، جہاں جمع ہو کر قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا۔

یہ چودہ ہزار مجاہدین کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا، ان کے ساتھ مکہ کے بیشمار لوگ مرد وعورت تماشائی بن کر نکلے، جن کے دلوں میں عموماً یہ تھا کہ اگر موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا، اور یہ کامیاب ہوں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

اسی قسم کے لوگوں میں ایک شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے، جنہوں نے بعد میں مسلمان ہو کر خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میرا باپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے اور چچا حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا جس کا جوشِ انتقام اور انتہائی غیظ میرے دل میں تھا، میں اس موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے ساتھ ہولیا کہ جب کہیں موقع پاؤں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دوں، میں اِن کے ساتھ ہو کر ہر وقت موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑے اور وہ بھاگنے لگے تو میں موقع پا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچا، مگر دیکھا کہ داہنی طرف حضرت عباسؓ آپ کی حفاظت کر رہے ہیں، اور بائیں طرف ابوسفیان ابن حارث، اس لئے میں پیچھے کی طرف پہنچ کر ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یکبارگی تلوار سے آپ پر حملہ کر دوں کہ یکایک آپ کی نظر مجھ پر پڑی، اور آپ نے مجھے آواز دی کہ شیبہ یہاں آؤ، اپنے قریب بلا کر دستِ مبارک میرے سینہ پر رکھ دیا، اور دُعا کی کہ یا اللہ! اس سے شیطان کو دُور کر دے، اب جو میں نظر اُٹھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل میں اپنے آنکھ،

---

[۱] مستدرك للحاكمؒ رقم الحديث: ۴۳۴۰

کان اور جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ کفار کا مقابلہ کرو، [1] اب تو میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جان آپ پر قربان کر رہا تھا، اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو میں خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی کر دی، کہ تم مکہ سے اس نیت سے چلے تھے، اور میرے گرد میرے قتل کے لئے گھوم رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ تم سے نیک کام لینے کا تھا جو ہو کر رہا۔

اسی طرح کا واقعہ نضر بن حارث رضی اللہ عنہ کو پیش آیا کہ وہ بھی اسی نیت سے حُنین گئے تھے، وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت اور محبت ڈال دی، اور ایک مردِ مجاہد بن کر دشمنوں کی صفوں سے ٹکرا گئے۔

اسی سفر میں ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ مقام اوطاس پر پہنچ کر دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے ہیں، اور ایک اور شخص آپ کے پاس بیٹھا ہے آپ نے ذکر فرمایا کہ میں سو گیا تھا، یہ شخص آیا اور میری تلوار اپنے قبضہ میں لے کر میرے سر پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے محمد! اب بتلاؤ تمہیں کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ بچا سکتا ہے، یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، ابو بردہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ میں اس دشمنِ خدا کی گردن ماردوں، یہ دشمن قوم کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بردہ خاموش رہو اللہ تعالیٰ میری حفاظت کرنے والا ہے، جب تک کہ میرا دین سارے دینوں پر غالب نہ آجائے، اور آپ نے اس شخص کو کوئی ملامت بھی نہ فرمائی، اور آزاد چھوڑ دیا۔

مقامِ حُنین پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلۂ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آ گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ پروا نہ کرو یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حداد کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلائیں، وہ ان کی قوم میں جا کر دو دن رہے، سب حالات دیکھتے سنتے رہے، ان کے لیڈر اور کمانڈر مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اب تک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے سابقہ نہیں پڑا، مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کر کے انہیں اپنی طاقت کا زعم ہو گیا، اب ان کو پتہ لگے گا، تم سب لوگ صبح ہوتے ہی اس

---

[1] دلائل النبوة للبیهقیؒ رقم الحدیث: ۱۹۰۳

طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے اس کے بیوی بچے اور مال ہو، اور اپنی تلواروں کی میانوں کو توڑ ڈالو، اور سب مل کر یکبارگی ہلّہ بولو، یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ کار تھے، اپنی فوج کے چند دستوں کو مختلف گھاٹیوں میں چھپا دیا تھا۔

اس طرف کفار کے لشکر کی یہ تیاریاں تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا، جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے نکلے تھے، اور سامانِ جنگ بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا، اور یہ لوگ بدر واُحد کے میدانوں میں دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ بے سامان لوگوں نے ایک ہزار کے لشکرِ جرار پر فتح پائی، تو آج اپنی کثرت اور تیاری پر نظر کر کے حاکم اور بزار کی روایت کے مطابق ان میں سے بعض کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی سے مغلوب ہو جائیں آج تو مقابلہ کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

مالک الملک والملکوت کو یہی چیز ناپسند تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلۂ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی ہلّہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چارطرف سے گھیرا ڈال دیا، گرد وغبار نے دن کو رات بنادیا تو صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے، اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرام جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپ آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی، اور سورۂ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں، اور وہ انصار کہاں ہیں جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہئے کہ واپس آئیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ایک آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی، اور یکا یک سب بھاگنے والوں کو پشیمانی ہوئی، اور بڑی دلیری کے ساتھ لوٹ کر دشمن کا پورا مقابلہ کیا، اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیج دی، ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے اہل وعیال اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا، اور طائف کے قلعہ میں جاچھپا، اور پھر باقی پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی، ان کے ستر سردار مارے گئے، بعض مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا، ان کا سب مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، چھ ہزار جنگی قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، چار ہزار اوقیہ چاندی ہاتھ آئی۔

پہلی اور دوسری آیت میں اسی مضمون کا بیان ہے، ارشاد فرمایا کہ جب تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہوگیا تھا

پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسلی نازل فرمائی اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اور ایسے لشکر فرشتوں کے نازل کردیئے، جن کو تم نے نہیں دیکھا، اور کافروں کو تمہارے ہاتھ سے سزا دلوادی۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ''یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور سب مسلمانوں پر اپنی تسلی نازل فرمادی۔''

معنی اس کے یہ ہیں کہ غزوۂ حنین کے ابتدائی ہلّہ میں جن صحابہ کرام کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر اپنی تسلی نازل فرمادی، جس سے ان کے اُکھڑے ہوئے قدم جم گئے، اور بھاگنے والے پھر لوٹ آئے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان صحابہ پر جو مضبوطی کے ساتھ محاذ پر جمے رہے تسلی نازل فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی فتح قریب نظر آنے لگی، اور چونکہ تسلی کی یہ دو قسمیں تھیں ایک بھاگنے والوں کے لئے دوسری رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہنے والوں کے لئے، اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کو علیحدہ علیحدہ تکرار عَلٰی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا یعنی ایسے لشکر نازل فرمادیئے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اس سے مراد عام طور پر لوگوں کا نہ دیکھنا ہے، احاد وافراد سے جو بعض روایتوں میں اس لشکر کا دیکھنا منقول ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

پھر فرمایا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶ ''یعنی کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سزا دے دی، اور کافروں کی یہی سزا ہے۔'' اس سزا سے مراد ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح اور مغلوب ہونا ہے، جو واضح طور پر مشاہدہ میں آیا، مطلب یہ ہے کہ یہ دنیاوی سزا تھی، جو فوری طور پر مل گئی، آگے آخرت کے معاملہ کا ذکر بعد کی آیت میں اس طرح آیا ہے:

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۷ ''یعنی پھر خدا تعالیٰ جس کو چاہیں توبہ نصیب کردیں، اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں۔''

اس میں اشارہ ہے کہ اس جہاد میں جن لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب اور مفتوح ہونے کی سزا مل چکی ہے، اور ابھی تک وہ اپنے کفر پر قائم ہیں، ان میں سے بھی کچھ لوگوں کو توفیق ایمان نصیب ہوگی، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے:

حُنین کی فتح، اور ہوازن وثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہوکر حاضر ہونا قیدیوں کی واپسی

حُنین میں قبیلۂ ہوازن وثقیف کے کچھ سردار مارے گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ جوان کے اہل وعیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مالِ غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے، جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی، جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو اموالِ غنیمت کا نگراں مقرر فرمایا۔

پھر شکست خوردہ ہوازن اور ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر مقام پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہوکر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہوگئے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا، یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے، سامنے آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان لوگوں کے لئے بددُعا فرمایئے، مگر آپ نے ان کے لئے ہدایت کی دُعا فرمائی اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ فرما کر واپسی کا قصد فرمایا، اور مقام جعرانہ پر پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ معظمہ جا کر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح وشکست کا امتحان کرنے آئی تھی، اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت سے لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اسی مقام پر پہنچ کر مالِ غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا، ابھی اموالِ غنیمت تقسیم ہو ہی رہے تھے، کہ دفعۃً ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابوبُرقانؓ بھی تھے، انہوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل وعیال اور اموال ہمیں واپس دے دیئے جائیں، اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم بسلسلۂ رضاعت آپ کے خویش وعزیز ہیں، اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں، آپ ہم پر احسان فرمائیں، رئیسِ وفد ایک شاعر آدمی تھا، اس نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر ہم بادشاہِ روم یا شاہِ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیش نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے، آپ سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔

رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ موقع دوہری مشکل کا تھا، کہ ایک طرف ان لوگوں پر رحم وکرم کا تقاضا یہ کہ اُن کے سب قیدی اور اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں، دوسری طرف یہ کہ اموالِ غنیمت میں تمام مجاہدین کا

حق ہوتا ہے، ان سب کو ان کے حق سے محروم کر دینا از روئے انصاف درست نہیں، اس لئے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں فرمایا:

میرے ساتھ کس قدر مسلمانوں کا لشکر ہے، جو اِن اموال کے حق دار ہیں، میں سچی اور صاف بات کو پسند کرتا ہوں، اس لئے آپ لوگوں کو اختیار دیتا ہوں کہ یا تو اپنے قیدی واپس لے لو، یا اموالِ غنیمت، ان دونوں میں جس کو تم انتخاب کرو وہ تمہیں دے دیئے جائیں گے، سب نے قیدیوں کی واپسی کو اختیار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا جس میں حمد وثناء کے بعد فرمایا کہ:

"یہ تمہارے بھائی تائب ہو کر آ گئے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو واپس دے دیئے جائیں تم میں سے جو لوگ خوش دلی کے ساتھ اپنا حصہ واپس دینے کے لئے تیار ہوں وہ احسان کریں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم ان کو آئندہ اموال فیئ میں سے اس کا بدلہ دے دیں گے۔"

حقوق کے معاملہ میں رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے عوامی جلسوں کی آوازیں کافی نہیں، ہر ایک سے علیحدہ رائے معلوم کرنی چاہئے

مختلف اطراف سے یہ آواز اٹھی کہ ہم خوش دلی کے ساتھ سب قیدی واپس کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر عدل وانصاف اور حقوق کے معاملہ میں احتیاط کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی مختلف آوازوں کو کافی نہ سمجھا، اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ کون لوگ اپنا حق چھوڑنے کے لئے خوش دلی سے تیار ہوئے اور کون ایسے ہیں جو شرما شرمی خاموش رہے، معاملہ لوگوں کے حقوق کا ہے، اس لئے ایسا کیا جائے کہ ہر جماعت اور خاندان کے سردار اپنی اپنی جماعت کے لوگوں سے الگ الگ صحیح بات معلوم کر کے مجھے بتائیں۔

اس کے مطابق سرداروں نے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ اجازت حاصل کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ سب لوگ خوش دلی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب قیدی ان کو واپس کر دیئے۔ [1]

یہی وہ لوگ تھے جن کے تائب ہونے کی طرف مذکورہ تیسری آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنۢ بَعْدِ

[1] صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب قول الله تعالىٰ ويوم حنين إلخ ج: ۲ ص: ۶۱۷

ذٰلِكَ الآیۃ، غزوۂ حنین میں پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کا کچھ حصہ تو خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے اور باقی مستند روایاتِ حدیث سے لیا گیا ہے۔ (مظہری وابن کثیر) [1]

اَحکام ومسائل

ان واقعات کے ضمن میں بہت سے اَحکام و ہدایت اور ضمنی فوائد آئے ہیں، وہی ان واقعات کے بیان کرنے کا اصل مقصد ہیں:

آیاتِ مذکورہ میں سب سے پہلی ہدایت تو یہ دی گئی کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی اپنی جمعیت اور طاقت پر غرّہ نہ ہونا چاہئے، جس طرح کمزوری اور بے سامانی کے وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد پر رہتی ہے اسی طرح قوت وطاقت کے وقت بھی ان کا مکمل اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی امداد ہی پر ہونا چاہئے۔

غزوۂ حُنین میں مسلمانوں کی تعدادی کثرت اور سامانِ حرب کے کافی ہونے کی وجہ سے بعض صحابہ کرام کی زبان پر جو بڑا بول آ گیا تھا کہ آج تو کسی کی مجال نہیں جو ہم سے بازی لے جاسکے، اللہ تعالیٰ کو اپنی اس محبوب جماعت کی زبان سے ایسے کلمات پسند نہ آئے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی ہلّہ کے وقت مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے، اور بھاگنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ ہی کی غیبی امداد سے یہ میدان فتح ہوا۔

مفتوح ومغلوب کفار کے اموال میں عدل وانصاف اور احتیاط

دوسری ہدایت اس واقعہ سے یہ حاصل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حُنین کے لئے مکہ کے مفتوح غیر مسلموں سے جو سامانِ جنگ زرہیں اور نیزے لئے تھے یہ ایسا موقع تھا کہ ان سے زبردستی بھی یہ چیزیں لی جاسکتی تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاریت کہہ کر لیا اور پھر سب کو ان کی مستعار چیزیں واپس کردیں۔

اس واقعہ نے مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ بھی پورے عدل وانصاف اور رحم وکرم کے معاملہ کا سبق دیا۔

تیسری ہدایت اس ارشادِ نبوی سے حاصل ہوئی جس میں حُنین کی طرف جاتے ہوئے خیف بنی کنانہ میں قیام کے وقت فرمایا کہ کل ہم ایسے مقام پر قیام کریں گے جس میں بیٹھ کر ہمارے دشمن قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کی قرارداد پر معاہدہ کیا تھا، اس میں اشارہ ہے کہ جب مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے فتح وقوت عطا فرمادی تو اپنے پچھلے مصیبت کے دور کو نہ بھلادیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہوسکے، ہوازن کے شکست خوردہ لوگوں کے بار بار حملہ آور ہونے اور تیر برسانے کے جواب میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بددعا کے بجائے ان کے لئے ہدایت کی دُعا مسلمانوں کو

[1] التفسیر المظہری ج:۴ ص:۱۵۴ تا ۱۷۰ وتفسیر ابن کثیر ج:۴ ص:۱۲۵ تا ۱۳۰

یہ سبق دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی جنگ و جہاد کا مقصد صرف دشمن کو زیر کرنا نہیں، بلکہ ان کو ہدایت پر لانا ہے، اس لئے اس کی کوشش سے کسی وقت غفلت نہ ہونی چاہئے۔

تیسری آیت نے یہ ہدایت کردی کہ جو کفار مقابلہ میں مغلوب ہو جائیں ان سے بھی مایوس نہ ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو پھر اسلام وایمان کی ہدایت دے دیں، جیسا کہ وفد ہوازن کے واقعہ اسلام سے ثابت ہوا۔

وفد ہوازن کی درخواست پر ان کے جنگی قیدیوں کی واپسی کے وقت جب صحابہ کرام کے مجمع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا اور مجمع کی طرف سے یہ آوازیں آئیں کہ ہم سب ان کی واپسی کے لئے خوش دلی سے رضامند ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کافی نہ سمجھا بلکہ جدا جدا ہر ایک کی اجازت معلوم کرنے کا اہتمام فرمایا۔

اس سے ثابت ہوا کہ حقوق کے معاملہ میں جب تک خوش دلی کا اطمینان نہ ہو جائے کسی کا حق لینا جائز نہیں، مجمع کے رُعب یا لوگوں کی شرم سے کسی کا خاموش رہنا رضامندی کے لئے کافی نہیں، اسی سے حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص پر اپنی وجاہت کا رعب ڈال کر کسی دینی مقصد کے لئے چندہ کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ ایسے حالات میں بہت سے شریف آدمی محض شرما شرمی کچھ دے دیتے ہیں، پوری رضامندی نہیں ہوتی، اس طرح کے مال میں برکت بھی نہیں ہوتی۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا

اے ایمان والو مشرک جو ہیں سو پلید ہیں سو نزدیک نہ آنے پاویں

الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ

مسجد الحرام کے اس برس کے بعد اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کردے گا تم کو

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ إِنْ شَآءَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۲۸﴾

اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے، بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! مشرک لوگ تو سراپا ناپاکی ہیں، لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب بھی نہ آنے

پائیں۔ اور (مسلمانو!) اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو اگر اللہ چاہے گا تو تمہیں اپنے فضل سے (مشرکین سے) بے نیاز کر دے گا۔ بیشک اللہ کا علم بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔ (۲۸)

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو مشرک لوگ (بوجہ عقائد خبیثہ کے) نرے ناپاک ہیں سو (اس ناپاکی پر جو اَحکام متفرّع ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ) یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام (یعنی حرم) کے پاس (بھی) نہ آنے پائیں (یعنی حرم کے اندر داخل نہ ہوں) اور اگر تم کو (اس حکم کے جاری کرنے میں بدیں وجہ) مفلسی کا اندیشہ ہو (کہ لین دین انہی سے زیادہ متعلق ہے جب یہ نہ رہیں گے تو کام کیسے چلے گا) تو (تم خدا پر توکل رکھو) خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا (ان کا) محتاج نہ رکھے گا، بیشک اللہ تعالیٰ (اَحکام کی مصلحتوں کو) خوب جاننے والا ہے (اور ان مصلحتوں کی تکمیل کے باب میں) بڑا حکمت والا ہے (اس لئے یہ حکم مقرر کیا اور تمہارے افلاس کے انسداد کا سامان بھی کر دے گا)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ کے شروع میں کفار و مشرکین سے اعلانِ براءت کیا گیا تھا، مذکورۃ الصدر آیت میں اس اعلانِ براءت سے متعلقہ اَحکام کا ذکر ہے، اعلانِ براءت کا حاصل یہ تھا کہ سال بھر کے عرصہ میں تمام کفار کے معاہدات ختم یا پورے کر دیئے جائیں، اور اعلان کے ایک سال بعد کوئی مشرک حدودِ حرام میں نہ رہنے پائے۔

اس آیت میں اسی کا بیان ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے، جس میں اس حکم کی حکمت و مصلحت بھی بتلا دی اور اس کی تعمیل میں جو بعض مسلمانوں کو خطرات تھے ان کا بھی جواب دے دیا، اس میں لفظ نَجَسٌ بفتح جیم استعمال فرمایا ہے، جو نجاست کے معنی میں ہے، اور نجاست کہا جاتا ہے ہر گندگی کو جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرے، امام راغب اصفہانیؒ نے فرمایا کہ اس میں وہ نجاست بھی داخل ہے جو آنکھ، ناک یا ہاتھ وغیرہ سے محسوس ہو، اور وہ بھی جو علم و عقل کے ذریعہ معلوم ہو، اس لئے لفظ نجس اس غلاظت اور گندگی کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر سب محسوس کرتے ہیں، اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بناء پر شرعاً وضو یا غسل واجب ہوتا ہے، جیسے جنابت یا حیض و نفاس کے ختم ہونے کے بعد کی حالت، اور وہ باطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، جیسے عقائد فاسدہ اور اخلاق رذیلہ۔

آیت مذکورہ میں کلمۂ اِنَّمَا لایا گیا ہے جو حصر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ کے معنی یہ ہوگئے کہ مشرکین نری نجاست ہی ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ عام طور پر مشرکین میں تینوں قسم کی نجاستیں ہوتی ہیں،

کیونکہ بہت سی ظاہری ناپاک چیزوں کو وہ ناپاک نہیں سمجھتے، اس لئے ان ظاہری نجاستوں سے بھی نہیں بچتے جیسے شراب اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، اور معنوی نجاست سے غسلِ جنابت وغیرہ کے تو وہ معتقد ہی نہیں، اس طرح عقائدِ فاسدہ اور اخلاقِ رذیلہ کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں مشرکین کو نری نجاست قرار دے کر یہ حکم دیا گیا فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ ''یعنی ایسا کرنا چاہئے کہ اس سال کے بعد یہ مشرکین مسجد حرام کے پاس نہ جاسکیں۔''

مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو اس جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کے گرد چہار دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرمِ مکہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کئی میل مربع کا رقبہ اور چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے، جیسا کہ واقعۂ معراج میں مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بنی اسرائیل:۱) سے باتفاق یہی معنی مراد لئے گئے ہیں، کیونکہ واقعۂ معراج معروف مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان سے ہوا ہے، اسی طرح آیت کریمہ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ (التوبہ:۷) میں مسجد حرام سے پورا حرم ہی مراد ہے، کیونکہ جس واقعۂ صلح کا اس میں ذکر ہے، وہ مقامِ حدیبیہ پر ہوا ہے، جو حدودِ حرم سے باہر اس کے متصل واقع ہے۔ (جصاص) [1]

اس لئے معنے آیت کے یہ ہوگئے کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدودِ حرم میں ممنوع ہے، اس سال سے مراد کونسا سال ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ ۱۰ھ ہجری مراد ہے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک ۹ھ ہجری راجح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ براءت حضرت صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ موسمِ حج میں اسی ۹ھ میں کرایا ہے، اس لئے ۹ھ سے ۱۰ھ تک مہلت کا سال ہے، ۱۰ھ ہجری کے بعد یہ قانون نافذ ہوا۔

مشرکین کے مسجد حرام میں داخلے کی ممانعت کا مطلب اور یہ کہ مسجدِ حرام کی خصوصیت ہے یا سب مساجد کے لئے عام ہے

آیت مذکورہ میں جو حکم دیا گیا ہے کہ ۱۰ھ کے بعد سے کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائے اس کے متعلق تین باتیں غور طلب ہیں، کہ یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے یا دنیا کی دوسری مسجدیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں، اور اگر مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے تو کسی مشرک کا داخلہ مسجدِ حرام میں مطلقاً ممنوع ہے، یا صرف حج وعمرہ کے لئے داخلہ کی

[1] احکام القرآن للجصاصؒ تفسیر سورۃ البراءۃ ج:۶ ص:۲۷۳،۲۷۴

ممانعت ہے، ویسے جاسکتا ہے، تیسرے یہ کہ آیت میں یہ حکم مشرکین کا بیان کیا گیا ہے، کفار اہلِ کتاب بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں۔

اِن تفصیلات کے متعلق چونکہ الفاظ قرآن ساکت ہیں اس لئے اشاراتِ قرآن اور روایاتِ حدیث کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدینؒ نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق اَحکام بیان فرمائے، اس سلسلہ میں پہلی بحث اس میں ہے کہ قرآنِ کریم نے مشرکین کو نجَس کس اعتبار سے قرار دیا ہے، اگر ظاہری نجاست یا معنوی جنابت وغیرہ مراد ہے تو ظاہر ہے کہ کسی مسجد میں نجاست کا داخل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جنابت والے شخص یا حیض ونفاس والی عورت کا داخلہ کسی مسجد میں جائز نہیں، اور اگر اس میں نجاست سے مراد کفر وشرک کی باطنی نجاست ہے تو ممکن ہے کہ اس کا حکم ظاہری نجاست سے مختلف ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ فقہائے مدینہ امام مالک وغیرہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ مشرکین ہر معنی کے اعتبار سے نجس ہیں، ظاہری نجاست سے بھی عموماً اجتناب نہیں کرتے، اور جنابت وغیرہ کے بعد غسل کا بھی اہتمام نہیں کرتے، اور کفر وشرک کی باطنی نجاست تو ان میں ہے ہی، اس لئے یہ حکم تمام مشرکین اور تمام مساجد کے لئے عام ہے، اور اس کی دلیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ فرمان پیش کیا جس میں انہوں نے امراءِ بلاد کو ہدایت کی تھی کہ کفار کو مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اس فرمان میں اسی آیتِ مذکورہ کو تحریر فرمایا تھا۔ [۱]

نیز یہ کہ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا اُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ۔ [۲]

”یعنی مسجد میں داخل ہونا کسی حائضہ عورت یا جنبی شخص کے لئے میں حلال نہیں سمجھتا۔“

اور مشرکین وکفار عموماً حالتِ جنابت میں غسل کا اہتمام نہیں کرتے، اس لئے ان کا داخلہ مساجد میں ممنوع ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ حکم مشرکین اور کفار اہلِ کتاب سب کے لئے عام ہے، مگر مسجد حرام کے لئے مخصوص ہے، دوسری مساجد میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں (قرطبی) اور دلیل میں ثمامہ ابن اُثال کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے جب یہ گرفتار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔ [۳]

امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجدِ حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسمِ حج میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ اعلانِ براءت کردیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ لَا يَحُجَّنَ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، جس میں ظاہر کردیا

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۱۰۳، ۱۰۴ [۲] سنن ابی داوٗد، کتاب الطهارة، باب فی الجنب يدخل المسجد ج:۱ ص:۳۰

[۳] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۱۰۵

گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا، اس لئے اس آیت میں فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ کے معنی بھی اس اعلان کے مطابق یہی ہیں کہ ان کو حج وعمرہ کی ممانعت کر دی گئی، اور کسی ضرورت سے باجازت امیر المؤمنین داخل ہو سکتے ہیں، وفد ثقیف کا واقعہ اس کا شاہد ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے، صحابہ کرام نے عرض بھی کیا، یا رسول اللہ یہ نجس قوم ہے، تو آپ نے فرمایا کہ مسجد کی زمین پر ان لوگوں کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (جصاص) [1]

اس روایت نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ قرآن کریم میں مشرکین کو نجس کہنے سے ان کی نجاستِ کفر وشرک مراد ہے، جیسا کہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، اسی طرح حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مشرک مسجد کے پاس نہ جائے، بجز اس کے کہ وہ کسی مسلمان کا غلام یا کنیز ہو تو بضرورت اس کو داخل کر سکتے ہیں۔ (قرطبی) [2]

یہ حدیث بھی اسی کی شاہد ہے کہ نجاست ظاہری کو سبب قرار دے کر مشرکین کو مسجد حرام سے نہیں روکا گیا ورنہ اس میں غلام اور جاریہ کی کوئی تخصیص نہ تھی، بلکہ بنیاد اصل کفر وشرک اور ان کے غلبہ کا خطرہ ہے، غلام وکنیز میں یہ خطرہ نہیں، ان کو اجازت دے دی گئی، اس کے علاوہ ظاہری نجاست کے اعتبار سے تو مسلمان بھی اس میں داخل ہیں کہ نجاست یا حدث اکبر کی حالت میں ان کے لئے بھی مسجد حرام کا داخلہ ممنوع ہے۔

نیز جمہور کی تفسیر کے مطابق مسجد حرام سے اس جگہ جب پورا حرم مراد ہے تو وہ بھی اسی کا مقتضی ہے کہ یہ ممانعت ظاہری نجاست کی بنیاد پر نہیں، بلکہ کفر وشرک کی نجاست کی بناء پر ہے، اسی لئے صرف مسجد حرام میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں کیا گیا، بلکہ پورے حرم محترم میں ممنوع قرار دیا گیا، کیونکہ وہ اسلام کا حمی اور ایک قلعہ ہے، اس میں کسی غیر مسلم کو رکھنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ نجاسات سے مسجد کی تطہیر بھی ایک مستقل مسئلہ ہے، جو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے، لیکن اس آیت کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں بلکہ اسلام کے اس سیاسی حکم سے ہے جس کا اعلان سورۂ براءت کے شروع میں کیا گیا ہے، کہ جتنے مشرکین مکہ میں موجود تھے، ان سب سے حرم محترم کو خالی کرانا مقصود تھا، لیکن بتقاضائے عدل وانصاف ورحم وکرم مکہ فتح ہوتے ہی سب کو یک قلم خارج کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ جن لوگوں سے کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور وہ لوگ اس معاہدہ پر قائم رہے تو ان کی میعاد معاہدہ پوری کر کے اور باقیوں کو کچھ کچھ

[1] احکام القرآن للجصاصؒ تفسیر سورة براءة ج:۲ ص: ۴۷۱، ۴۷۲ [2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۱۰۶

مہلت دے کر سال بھر کے اندر اس تجویز کی تکمیل پیش نظر تھی، اسی کا بیان اس آیت مذکورہ میں آیا کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدودِ حرم میں ممنوع ہو جائے گا وہ مشرکانہ حج وعمرہ نہ کرنے پائیں گے۔

اور جس طرح سورۂ توبہ کی آیات میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ ۹ھ ہجری کے بعد کوئی مشرک حدودِ حرم میں داخل نہ ہو سکے گا، روایات حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائرہ کو اور وسیع فرما کر پورے جزیرۃ العرب کے لئے بھی حکم دے دیا تھا، [۱] مگر عہدِ رسالت میں اس کی تکمیل نہ ہونے پائی، پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی دوسرے ہنگامی مسائل کی وجہ سے اس پر توجہ نہ دے سکے فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانہ میں اس حکم کو نافذ فرمایا۔ [۲]

اب رہا کفار کی نجاست اور مساجد کی نجاسات سے تطہیر کا مسئلہ وہ اپنی جگہ ہے، جس کے مسائل کتبِ فقہ میں تفصیل سے مذکور ہیں، کوئی مسلمان بھی ظاہری نجاست یا حالتِ جنابت میں کسی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا، اور عام کفار ومشرکین ہوں یا اہلِ کتاب وہ بھی عموماً ان نجاسات سے پاک نہیں ہوتے، اس لئے بلاضرورتِ شدیدہ ان کا داخلہ بھی کسی مسجد میں جائز نہیں۔

اس آیت کی رُو سے جب کفار ومشرکین کا داخلہ حرم میں ممنوع کر دیا گیا تو مسلمانوں کے سامنے ایک معاشی مسئلہ یہ پیش آیا کہ مکہ میں کوئی پیداوار نہیں، باہر کے آنے والے ہی اپنے ساتھ ضروریات لاتے تھے، اور موسمِ حج میں اہلِ مکہ کے لئے سب ضروریات جمع ہو جاتی تھیں، اب ان کا داخلہ ممنوع ہو جانے کے بعد کام کیسے چلے گا، اس کا جواب قرآن میں یہ دیا گیا کہ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ''یعنی اگر تمہیں معاشی مشکلات کا اندیشہ ہو تو سمجھ لو کہ نظامِ معاش تمام مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے، اگر وہ چاہیں گے تو تمہیں ان سب کفار سے مستغنی کر دیں گے، اور یہاں ''اگر چاہیں گے'' کی قید لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں کوئی شک وتردّد ہے، بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ صرف مادی اسباب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ بات بہت بعید اور مشکل نظر آتی ہے کہ ظاہری ذریعہ معاش یہی غیر مسلم تھے، ان کا داخلہ ممنوع کرنا اپنے لئے اسبابِ معاش منقطع کرنے کے مترادف ہے، مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان مادی اسباب کا محتاج نہیں، جب ان کا ارادہ کسی کام سے متعلق ہو جائے تو سب اسباب مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، بس چاہنے کی دیر ہے اور کچھ نہیں، اس لئے اِنْ شَاۗءَ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

---

[۱] صحيح البخارى، كتاب الجهاد، باب هل يستشفع إلى اهل الذمة إلخ ج:۱ ص:۴۲۹، وصحيح مسلم، كتاب الوصية، باب ترك الوصية لمن ليس له شيء إلخ ج:۲ ص:۴۲

[۲] سنن ابى داوٗد، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إخراج اليهود من جزيرة العرب ج:۲ ص:۴۲۹

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ

لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر، اور نہ حرام جانتے ہیں اس کو

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ

جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا ان لوگوں میں سے

ع اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ع ۲۹

جو اہلِ کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہوکر،

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ط

اور یہود نے کہا کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے،

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ج يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ط

یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے رِیس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی،

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ نج اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۳۰

ہلاک کرے ان کو اللہ، کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

وہ اہلِ کتاب جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ یومِ آخرت پر، اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے، اور نہ دینِ حق کو اپنا دِین مانتے ہیں، اُن سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خوار ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔ (۲۹) یہودی تو یہ کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصرانی یہ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ سب اُن کی منہ کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ یہ اُن لوگوں کی سی باتیں کر رہے ہیں جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں۔ اللہ کی مار ہو اِن پر! یہ

کہاں اوندھے بہکے جارہے ہیں؟ (۳۰)

خلاصہ تفسیر

اہلِ کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر (پورا ایمان رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہوکر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں، اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کہ (نعوذ باللہ) عُزیر (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ (میں سے اکثر) نے کہا کہ مسیح (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا (جس کا واقع میں کہیں نام ونشان نہیں) یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں (مراد مشرکین عرب جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مطلب یہ کہ ان کو تو یہ بھی کافر سمجھتے ہیں، پھر انہی کی سی کفریات بکتے ہیں، اور پہلے ہونا اس معنی پر ہے کہ مشرکین کی گمراہی قدیم تھی) خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر اُلٹے جارہے ہیں (کہ خدا پر ایسے افتراء باندھتے رہتے ہیں یہ تو ان کے اقوالِ کفریہ تھے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں مشرکینِ مکہ سے جہاد و قتال کا ذکر تھا، ان آیات میں اہلِ کتاب سے جہاد کا بیان ہے، یہ گویا غزوۂ تبوک کی تمہید ہے جو اہلِ کتاب کے مقابلہ میں پیش آیا ہے، تفسیر درمنثور میں مفسر القرآن حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیات غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہیں،[1] اور لفظ اہلِ کتاب اگرچہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے ہر اُس کافر جماعت پر حاوی ہے جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتی ہو، لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ لفظ صرف یہود و نصاریٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، کیونکہ عرب کے قرب و جوار میں یہی دو فرقے اہلِ کتاب کے معروف تھے، اسی لئے قرآنِ کریم نے مشرکینِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ (۱۵۶) (الانعام)

اور جہاد و قتال کا جو حکم اس آیت میں بمقابلۂ اہلِ کتاب دیا گیا ہے وہ درحقیقت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام طوائفِ کفار کا یہی حکم ہے، کیونکہ اس آیت میں حکمِ قتال کی جو وجوہ آگے بیان کی گئی ہیں وہ سب کفار میں مشترک ہیں، تو حکم بھی مشترک ہونا چاہئے، مگر ذکر میں اہلِ کتاب کی خصوصیت اس لئے کی گئی کہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ان کے

[1] الدر المنثور تحت ھذہ الآیۃ ج:۵ ص:۴۸

مقابلہ میں جہاد وقتال کرنے سے اس بناء پر جھجک ہو کہ یہ لوگ کسی درجہ میں ایمان رکھتے ہیں، تورات وانجیل اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام پر ان کا ایمان ہے تو ممکن تھا کہ انبیاء سابقین اور ان کی کتابوں کے ساتھ ان کا منسوب ہونا مسلمانوں کے لئے جہاد سے رکاوٹ کا سبب بن جائے، اس لئے بالتخصیص ان کے ساتھ قتال کا ذکر کر دیا گیا۔

دوسرے اس جگہ ذکر میں اہلِ کتاب کے ساتھ تخصیص کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ایک حیثیت سے یہ لوگ زیادہ سزا کے مستحق ہیں، کیونکہ یہ اہلِ علم تھے، ان کے پاس توریت وانجیل کا علم تھا، جن میں خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک اور حلیہ تک تفصیل سے مذکور ہے، اس علم کے باوجود ان کا کفر وانکار اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں تو ایک حیثیت سے ان کا جرم زیادہ شدید ہو گیا، اس لئے خصوصی طور پر ان سے جنگ کا ذکر کیا گیا۔

جنگ کے حکم کی چار وجوہ اس آیت میں بتلائی گئی ہیں، اوّل لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ یعنی وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، دوسرے وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تیسرے وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ یعنی ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ نے حرام بتلایا ہے، چوتھے وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ یعنی سچے دین کو قبول نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ تو بظاہر خدا تعالیٰ پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اور آخرت وقیامت کے بھی قائل ہیں، پھر ان چیزوں پر ان کے ایمان کی نفی کیوں کی گئی وجہ یہ ہے کہ محض ایمان لانے کے الفاظ تو کافی نہیں، جس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطلوب ہے، جب اس طرح کا ایمان نہ ہو تو وہ نہ ہونے کے حکم میں ہے، یہود ونصاریٰ نے اگرچہ علانیہ طور پر توحید کا انکار نہیں کیا، مگر جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر اس کی خدائی میں شریک ٹھہرا دیا، اس لئے ان کا اقرارِ توحید لغو اور ایمان کا دعویٰ غلط ہو گیا۔

اسی طرح آخرت پر جس طرح کا ایمان مطلوب ہے وہ بھی اکثر اہلِ کتاب میں نہیں رہا تھا، ان میں سے بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قیامت میں حشر اجساد یعنی مادّی اجسام کی دوبارہ زندگی نہ ہوگی، بلکہ ایک قسم کی روحانی زندگی ہوگی، اور جنت ودوزخ بھی کوئی خاص مقامات نہیں، رُوح کی خوشی کا نام جنت اور رنج کا نام جہنم ہے، جو ارشاداتِ ربانی کے سراسر خلاف ہے، اس لئے یومِ آخر پر بھی ان کا ایمان درحقیقت ایمان نہ ہوا۔

تیسری چیز جو یہ فرمائی کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے یہ ان کو حرام نہیں سمجھتے اس سے مراد یہ ہے کہ بہت سی چیزیں جن کو تورات یا انجیل نے حرام قرار دیا تھا یہ اس کی حرمت کے قائل نہیں، جیسے ربا (سود) اسی طرح اور بہت سی کھانے پینے کی چیزیں جو تورات وانجیل میں حرام قرار دی گئی تھیں انہوں نے ان کو حرام نہ سمجھا، اور ان میں مبتلا ہو گئے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو حلال سمجھنا صرف ایک گناہ ہی کا

ارتکاب نہیں بلکہ کفر ہے، اسی طرح کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا بھی کفر ہے، ہاں اگر حرام کو حرام سمجھتے ہوئے عملی کوتاہی غلطی سے ہو جائے تو وہ کفر نہیں، فسق اور گناہ ہے۔

آیت مذکورہ میں ان لوگوں سے جہاد و قتال کرتے رہنے کی ایک حد اور انتہاء بھی بتلائی ہے حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ یعنی یہ حکم قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ ماتحت ہو کر، رعیت بن کر جزیہ دینا منظور نہ کرلیں۔

جزیہ کے لفظی معنی بدلے اور جزاء کے ہیں، اصطلاحِ شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ کفر و شرک اللہ اور رسول کی بغاوت ہے، جس کی اصلی سزا قتل ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے ان کی سزا میں یہ تخفیف کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے ایک معمولی رقم جزیہ کی لے کر چھوڑ دیا جائے، اور اسلامی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے اُن کی جان و مال، آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگی، ان کی مذہبی رسوم میں کوئی مزاحمت نہ کی جائے، اسی رقم کو جزیہ کہا جاتا ہے۔

جزیہ کا تعین اگر باہمی مصالحت اور رضامندی سے ہو تو شرعاً اس کی کوئی تحدید نہیں، جتنی مقدار اور جس چیز پر باہمی معاہدہ صلح کا ہو جائے وہی ان سے لیا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سے سالانہ دو ہزار حُلّے دینے پر معاہدہ ہوگیا، حُلّہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہتے ہیں، ایک تہبند ایک چادر، ہر حُلّہ کی قیمت کا اندازہ بھی یہ طے کر دیا گیا تھا کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا،[1] اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔

اسی طرح نصاریٰ بنی تغلب سے حضرت فاروق اعظمؓ کا اس پر معاہدہ ہوا کہ ان کا جزیہ اسلامی زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جائے مگر زکوٰۃ سے دُوگنا۔

اور اگر مسلمانوں نے کسی ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا، پھر وہاں کے باشندوں کی جائیدادوں کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا، اور وہ رعیت بن کر رہنے پر رضامند ہوگئے، تو ان کے جزیہ کی مقدار شرح یہ ہوگی جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں نافذ فرمائی کہ سرمایہ دار متموّل سے چار درہم اور متوسط الحال سے اس کا نصف صرف دو درہم اور غریب سے جو تندرست اور محنت مزدوری یا صنعت و تجارت وغیرہ کے ذریعہ کماتا ہے اس سے اس کا بھی آدھا صرف ایک درہم ماہوار یعنی ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت لی جائے، اور جو بالکل مفلس یا اپاہج یا معذور ہیں ان سے کچھ نہ لیا

---

[1] دلائل النبوة للبیهقی رقم الحدیث: ۲۱۲۶ وسنن ابی داوٗد، کتاب الخراج والفیء إلخ باب فی أخذ الجزیة ج: ۲ ص: ۴۳۰

جائے، اسی طرح عورتوں، بچوں، بوڑھوں سے اور ان کے تارک الدنیا مذہبی پیشواؤں سے کچھ نہ لیا جائے۔

اتنی قلیل مقدار کے لینے کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ تھیں کہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے، اور جو شخص کسی غیر مسلم باشندہ پر ظلم کرے گا تو میں قیامت کے روز ظالم کے مقابلہ میں اس غیر مسلم کی حمایت کروں گا۔ (مظہری) [1]

اسی طرح کی روایات سے بعض ائمہ فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ دراصل جزیہ کی کوئی خاص شرح شرعاً مقرر نہیں ہے، بلکہ حاکم وقت کی صوابدید پر ہے کہ ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب تجویز کریں۔

اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ جزیہ کفار سے سزائے قتل رفع کرنے کا معاوضہ ہے اسلام کا بدلہ نہیں، اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ تھوڑے سے دام لے کر اسلام سے اعراض اور کفر پر قائم رہنے کی اجازت کیسے دے دی گئی، اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی پیشوا، اپاہج معذور، اگر جزیہ اسلام کا بدلہ ہوتا تو ان سے بھی لیا جانا چاہئے تھا۔

آیت مذکورہ میں عطاء جزیہ کے ساتھ جو عَنْ يَّدٍ فرمایا ہے اس میں حرف عَنْ بمعنی سبب اور يَدْ بمعنی قوت وغلبہ ہے، اور معنی یہ ہیں کہ یہ جزیہ کا دینا بطور اختیاری چندہ یا خیرات کے نہ ہو، بلکہ اسلامی غلبہ کو تسلیم کرنے اور اس کے ماتحت رہنے کی حیثیت سے ہو (کذا فی الروح) [2] اور وَهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ کے معنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ وہ لوگ اسلام کے عام (جنرل) قانون کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم قرار دیں۔ (روح المعانی ومظہری) [3]

اور اس آیت میں جو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب یہ لوگ جزیہ ادا کرنا منظور کرلیں تو جنگ بند کردی جائے، اس میں جمہور فقہاء کے نزدیک تمام کفار شامل ہیں خواہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، البتہ مشرکین عرب اس سے مستثنیٰ ہیں، کہ ان سے جزیہ قبول نہیں کیا گیا۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے، جس کا ذکر پہلی آیت میں اجمالاً آیا ہے کہ یہ اہل کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اس دوسری آیت میں فرمایا کہ یہود تو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اس لئے ان کا دعویٰ توحید اور ایمان کا غلط ہوا۔

---

[1] التفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۸۷، و سنن ابی داوٗد، کتاب الخراج، باب فی أھل الذمۃ ج:۲ ص:۴۳۲

[2] روح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۰ ص:۷۸

[3] التفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۷۹، وروح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱۰ ص:۷۸

پھر فرمایا ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ''یعنی یہ اُن کا قول ہے ان کے منہ سے'' اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ صاف طور پر اپنی زبانوں سے اس کا اقرار کرتے ہیں کوئی مخفی چیز نہیں، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ کلمۂ کفر صرف ان کی زبانوں پر ہے نہ اس کی کوئی وجہ بتا سکتے ہیں نہ دلیل۔

پھر ارشاد فرمایا يُضَاهِـُٔونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُونَ ۝٣٠ ''یعنی یہ اُن لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو اُن سے پہلے کافر ہو چکے ہیں، خدا ان کو غارت کرے، یہ کدھر اُلٹے جا رہے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ انبیاء کو خدا کا بیٹا کہنے میں ایسے ہی ہو گئے جیسے پچھلے کفار و مشرکین تھے، کہ فرشتوں کو اور لات و منات کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ

ٹھہرالیا انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح

ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ

مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝٣١ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ

وہ پاک ہے ان کے شریک بتلانے سے، چاہتے ہیں کہ بجھادیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے

وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝٣٢ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ

اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے بُرا مانیں کافر، اسی نے بھیجا

رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ

اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر

النصف

وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا

اور پڑے برا مانیں مشرک، اے ایمان والو بہت سے

مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ

عالم اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق اور روکتے ہیں

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ

اللہ کی راہ سے، اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی

وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾

اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سو ان کو خوش خبری سنادے عذاب دردناک کی،

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ

جس دن کہ آگ دہکائیں گے اس مال پر دوزخ کی، پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں

وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور پیٹھیں (کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے گاڑھ رکھا تھا اپنے واسطے اب مزہ چکھو اپنے گاڑھنے کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

انہوں نے اللہ کے بجائے اپنے اَحبار (یعنی یہودی علماء) اور راہبوں (یعنی عیسائی درویشوں) کو خدا بنالیا ہے، اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ اُن کو ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ اُن کی مشرکانہ باتوں سے بالکل پاک ہے۔ ﴿۳۱﴾ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھادیں، حالانکہ اللہ کو اپنے نور کی تکمیل کے سوا ہر بات نامنظور ہے، چاہے کافروں کو یہ بات کتنی بُری لگے ﴿۳۲﴾ وہ اللہ ہی تو ہے جس

نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دِین دے کر بھیجا ہے، تا کہ اُسے ہر دوسرے دِین پر غالب کردے، چاہے مشرک لوگوں کو یہ بات کتنی ناپسند ہو۔ ۳۳ اے ایمان والو! (یہودی) اَحبار اور (عیسائی) راہبوں میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں، اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کر کے رکھتے ہیں، اور اُس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، اُن کو ایک دردناک عذاب کی ''خوشخبری'' سنا دو۔ ۳۴ جس دن اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اُس سے ان لوگوں کی پیشانیاں اور ان کی کروٹیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ:) ''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا! اب چکھو اُس خزانے کا مزہ جو تم جوڑ جوڑ کر رکھا کرتے تھے۔'' ۳۵

خلاصۂ تفسیر

(آگے افعال کفریہ کا بیان ہے کہ) انہوں نے (یعنی یہود ونصاریٰ نے) خدا (کی توحید فی الطاعۃ) کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو (باعتبار طاعت کے) رَبّ بنا رکھا ہے (کہ ان کی اطاعت تحلیل اور تحریم میں مثل اطاعتِ خدا کے کرتے ہیں کہ نص پر ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور ایسی طاعت بالکل عبادت ہے پس اس حساب سے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں) اور مسیح بن مریم (علیہ السلام) کو بھی (ایک اعتبار سے رَبّ بنا رکھا ہے کہ ان کو ابن اللہ کہتے ہیں کہ الوہیت اس کے لوازم سے ہے) حالانکہ ان کو (کتبِ الٰہیہ میں) صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود (برحق) کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور یہ تو بیان تھا اتباعِ باطل کا آگے بیان ہے اس کا کہ وہ دینِ حق کو رَد کرتے ہیں کہ یہ بھی کفر ہے یعنی) وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دینِ اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار مار کر) بجھا دیں (یعنی منہ سے رد واعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دینِ حق کو فروغ نہ ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا دے مانے گا نہیں، گو کافر لوگ (جن میں یہ بھی آگئے) کیسے ہی ناخوش ہوں، (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے کہ (اسی اتمامِ نور کے لئے) اس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تا کہ اس (دین) کو (کہ وہی نور مذکور ہے) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کردے (کہ یہی اتمام ہے) گو مشرک (جن میں یہ بھی داخل ہو گئے) کیسے ہی ناخوش ہوں، اے ایمان والو! اکثر احبار ورہبان (یعنی یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ عوام) لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے (اڑاتے) ہیں (یعنی اَحکامِ حقہ کو پوشیدہ رکھ کر موافقِ مرضی عام کے فتوے دے کر ان سے نذرانے لیتے ہیں) اور (اس کی وجہ سے وہ) اللہ کی راہ (یعنی دینِ اسلام) سے (لوگوں کو) باز رکھتے ہیں (کیونکہ ان کے جھوٹے فتووں کے دھوکہ میں آکر

گمراہی میں پھنسے رہتے ہیں اور حق کو قبول بلکہ طلب بھی نہیں کرتے) اور (غایت حرص سے مال بھی جمع کرتے ہیں جس کی نسبت یہ وعید ہے کہ) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی زکوٰۃ نہیں نکالتے) سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے، جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں (اوّل) تپایا جائے گا، پھر ان سے لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا (اور یہ جتلایا جائے گا کہ) یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر کر کے رکھا تھا، سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

معارف و مسائل

ان چاروں آیتوں میں یہود و نصاریٰ کے علماء اور عُبّاد وزُہّاد کی گمراہی اور ان کے کفریات قولی و عملی کا ذکر ہے، اَحْبَارٌ، حِبْر کی جمع ہے اور رُهْبَانٌ، رَاهِبٌ کی جمع ہے، حِبْر یہود و نصاریٰ کے عالم کو اور رَاهِب عابد وزاہد کو کہا جاتا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے علماء اور عبادت گزاروں کو اللہ کے سوا اپنا رَبّ اور معبود بنا رکھا ہے، اسی طرح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو اپنا رَبّ بنالیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رَبّ و معبود بنانا تو اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان کو خدا تعالیٰ کا بیٹا مانتے اور کہتے تھے، اور علماء و عُبّاد کو معبود بنانے کا جو الزام ان پر عائد کیا گیا ہے اگرچہ وہ صراحۃً ان کو اپنا رَبّ نہ کہتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اطاعت مطلقہ جو خالص اللہ جل شانہ کا حق ہے اس حق کو ان کے حوالے کر دیا تھا، کہ ہر حال میں ان کے کہنے کی پیروی کرتے تھے، اگرچہ ان کا قول اللہ اور رسول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تو یہ ظاہر ہے کہ کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ اللہ و رسول کے فرمان کے خلاف بھی کہے تو اس کی اطاعت نہ چھوڑے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اپنا رَبّ اور معبود کہے، جو کھلا ہوا کفر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسائلِ دین سے ناواقف عوام کے لئے علماء کے فتویٰ کا اتباع یا اجتہادی مسائل میں ائمۂ مجتہدین کا اتباع اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ اتباع درحقیقت خدا اور رسول ہی کے اَحکام کا اتباع ہوتا ہے، اہلِ علم و نظر براہِ راست اللہ و رسول کے کلام کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، اور ناواقف عوام اہلِ علم سے پوچھ کر انہی اَحکام پر عمل کرتے ہیں، اور اہلِ علم جو درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ بھی اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، یہ اتباع خود قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے اور حق تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ ارشاد ہے فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (النحل) ”یعنی اگر تم خود اَحکامِ خدا اور سول سے واقف نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ کر عمل کیا کرو۔“

یہود و نصاریٰ کے عوام نے کتاب اللہ اور اَحکامِ خدا و رسول کو بالکل نظر انداز کر کے خود غرض پیشہ ور علماء یا جاہل عبادت گزاروں کے قول و عمل ہی کو اپنا دین بنالیا تھا، اس کی مذمت اس آیت میں فرمائی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں نے یہ گمراہی اختیار کر لی حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جو اُن تمام چیزوں کے شرک سے پاک ہے جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس آیت میں تو ان کے اتباع باطل اور غیر اللہ کی ناجائز اطاعت کا ذکر تھا، اس کے بعد کی آیت میں ان کی ایک اور گمراہی کا ذکر ہے کہ یہ لوگ صرف اسی پر بس نہیں کرتے کہ خود گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، بلکہ ہدایت اور دینِ حق کے مٹانے اور رَدّ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی مضمون کو بطور مثال کے اس طرح فرمایا ہے کہ یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ ان کے بس کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ اپنے نور یعنی دینِ اسلام کو مکمل اور پورا ہی کریں گے خواہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اس کے بعد تیسری آیت کے مضمون کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت کا سامان یعنی قرآن اور دینِ حق یعنی اسلام دے کر اسی لئے بھیجا ہے تاکہ اس کو دنیا کے تمام بقیہ دینوں پر غالب کردے، تقریباً انہی لفظوں کے ساتھ قرآن کریم میں متعدّد آیات آئی ہیں، جن میں یہ وعدہ ہے کہ دین اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کیا جائے گا۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ دین اسلام کو تمام دوسرے دینوں پر غالب کرنے کی یہ خوشخبری اکثر زمانوں اور اکثر حالات کے اعتبار سے ہے جیسا کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رُوئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان باقی نہ رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے، عزت داروں کی عزت کے ساتھ اور ذلیل لوگوں کی ذلت کے ساتھ جن کو اللہ تعالیٰ عزت دیں گے وہ مسلمان ہو جائیں گے اور جن کو ذلیل کرنا ہو گا وہ اسلام کو قبول تو نہ کریں گے مگر اسلامی حکومت کے تابع ہو جائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا، ایک ہزار سال کے قریب اسلام کی شان وشوکت پوری دنیا پر چھائی رہی۔ [1]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے عہد مبارک میں تو اس نور کی تکمیل واتمام کا مشاہدہ ساری دنیا کر ہی چکی ہے، اور آئندہ بھی دلائل اور حقائق کے اعتبار سے ہر زمانہ میں دینِ اسلام ایسا مکمل دین ہے کہ کسی معقول پسند انسان کو اس پر حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا، اس لئے کفار کی مخالفتوں کے باوجود یہ دینِ حق اپنی حجت ودلیل کے اعتبار سے ہمیشہ غالب ہے، اور جب مسلمان اس دین کی پوری پیروی کریں تو ان کا ظاہری غلبہ اور حکومت وسلطنت بھی اس کے لوازم میں سے ہے، جیسا کہ تاریخ اسلام کا تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے قرآن وسنت پر پوری طرح عمل کیا

---

[1] التفسیر المظہری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۹۵، ومسند احمد، حديث المقداد بن الأسود رضی الله عنه رقم الحديث:۲۴۵۴۳

تو کوئی کوہ ودریا ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکا، اور یہ پوری دنیا پر غالب آ کر رہے، اور جب کبھی جہاں کہیں ان کو مغلوب یا مقہور ہونے کی نوبت آئی ہے تو وہ قرآن وسنت کے اَحکام سے غفلت اور خلاف ورزی کا نتیجۂ بد تھا، جو اُن کے سامنے آیا، دینِ حق پھر بھی اپنی جگہ مظفر ومنصور ہی رہا۔

چوتھی آیت میں مسلمانوں کو مخاطب بنا کر یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ کے ایسے حالات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے عوام میں گمراہی پھیلی، مسلمانوں کو مخاطب کرنے سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ حالات یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ کے بیان ہورہے ہیں لیکن ان کو بھی اس سے متنبہ رہنا چاہئے کہ ان کے ایسے حالات نہ ہوجائیں۔

اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہود ونصاریٰ کے بہت سے علماء ومشائخ کا یہ حال ہے کہ باطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور اللہ کے سیدھے راستہ سے ان کو روکتے ہیں۔

یہود ونصاریٰ کے اکثر علماء ومشائخ کا یہی حال تھا اور ایسے حالات میں عام طور پر کہنے والے سبھی کو بُرا کہا کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اس جگہ لفظ كَثِيْرًا کا اضافہ کرکے مسلمانوں کو دشمنوں کے معاملہ میں بھی احتیاطِ کلام کی تلقین فرمادی، کہ یہ حال سب لوگوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان میں بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں، ان کی گمراہی یہ بتلائی گئی کہ وہ لوگوں کے اموال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں، باطل طریقہ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ بعض اوقات ان لوگوں سے پیسے لے کر حکمِ تورات کے خلاف فتویٰ دے دیتے تھے، اور بعض اوقات اَحکامِ الٰہی میں اخفاء اور تلبیس سے کام لیتے تھے، اس پر مزید ان کی یہ گمراہی بتلائی گئی کہ یہ کم بخت صرف خود ہی گمراہ نہیں بلکہ دوسرے طالبانِ رشد وہدایت کو اللہ کے راستہ سے روکنے کا سبب بھی ہیں، کیونکہ جب لوگ اپنے مقتداؤں کو ایسے کام کرتے دیکھیں تو ان میں بھی جذبۂ حق پرستی مرجاتا ہے، اس کے علاوہ ان کے غلط فتووں کی بنیاد پر وہ گمراہی اور غلطی ہی کو صواب وصحیح سمجھنے لگتے ہیں۔

یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ کی یہ بیماری کہ پیسوں کے لالچ میں غلط فتویٰ دے دیں چونکہ حُبِّ مال اور حرصِ دنیا کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، اس لئے آیت مذکورہ میں حُبّ مال کے اندر غلو کے نتائج بد اور عذابِ الیم کا بیان اور اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (۳۴) ''یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب دردناک کی خوش خبری سنادیجئے۔''

وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا کے لفظوں سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جو لوگ بقدرِ ضروری اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو باقی ماندہ جمع کیا ہوا مال ان کے حق میں مضر نہیں۔

حدیث میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے وہ كَنَزْتُمْ میں

داخل نہیں۔ (ابوداؤد، احمد وغیرہ) [1]

جس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ نکالنے کے بعد جو مال باقی رہے اس کا جمع رکھنا کوئی گناہ نہیں۔ جمہور فقہاء وائمہ کا یہی مسلک ہے وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا کی ضمیر فِضَّة کی طرف راجع ہے، جس کے معنی چاندی کے ہیں، اوپر سونے اور چاندی دو چیزوں کا ذکر تھا مگر ضمیر صرف چاندی کی طرف راجع کی گئی، تفسیر مظہری میں اس کو اشارہ اس بات کا قرار دیا ہے کہ جب کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی تھوڑا تھوڑا موجود ہو تو اعتبار چاندی کا کیا جائے گا، سونے کی قیمت بھی چاندی کے حساب میں لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ [2]

پانچویں آیت میں اس عذاب الیم کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے: يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵ ''یعنی زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو یہ عذاب الیم اس دن ہوگا جبکہ ان کے جمع کئے ہوئے سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں پر داغ دیئے جائیں گے، اور ان سے زبانی سزا کے طور پر کہا جائے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو اپنے جمع کئے ہوئے سرمایہ کو چکھو، اس سے معلوم ہوا کہ جزاءِ عمل عین عمل ہے، جو سرمایہ ناجائز طور پر جمع کیا تھا، یا اصل سرمایہ تو جائز تھا مگر اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو خود وہ سرمایہ ہی ان لوگوں کا عذاب بن گیا۔

اس آیت میں داغ لگانے کے لئے پیشانیوں، پہلوؤں، پشتوں کا ذکر کیا گیا ہے، یا تو اس سے مراد پورا بدن ہے، اور یا پھر ان تین چیزوں کی تخصیص اس بناء پر ہے کہ بخیل آدمی جو اپنا سرمایہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا نہیں چاہتا، جب کوئی سائل یا زکوٰۃ کا طلب گار اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو دیکھ کر سب سے پہلے اس کی پیشانی پر بل آتے ہیں، پھر اس سے نظر بچانے کے لئے یہ داہنے بائیں مڑنا چاہتا ہے، اور اس سے بھی سائل نہ چھوڑے تو اس کی طرف پشت کر لیتا ہے، اس لئے پیشانی، پہلو، پشت اس عذاب کے لئے مخصوص کئے گئے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جس دن اس نے پیدا کئے تھے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۥۙ

آسمان اور زمین ان میں چار مہینے ہیں ادب کے، یہی ہے سیدھا دین

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب الکنز ما هو؟ ج:۱ ص:۲۱۸ [2] التفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۹۶، ۱۹۷

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً

سو ان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر اور لڑو سب مشرکوں سے ہر حال میں

كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

جیسے وہ لڑتے ہیں تم سے سب ہر حال میں اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے ڈرنے والوں کے،

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ

یہ جو مہینہ ہٹا دینا ہے سو بڑھائی ہوئی بات ہے کفر کے عہد میں گمراہی میں پڑتے ہیں اس سے کافر، حلال کر لیتے ہیں اس مہینہ کو

عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

ایک برس اور حرام رکھتے ہیں دوسرے برس تا کہ پوری کرلیں گنتی ان مہینوں کی جو اللہ نے ادب کے لئے رکھے ہیں،

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي

پھر حلال کر لیتے ہیں جو مہینہ کہ اللہ نے حرام کیا ہے بھلے کر دیئے گئے ان کی نظر میں ان کے بُرے کام اور اللہ راستہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع

کافر لوگوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ مہینے ہے، جو اللہ کی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) کے مطابق اُس دن سے نافذ چلی آتی ہے جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ ان (بارہ مہینوں) میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں۔ یہی دِین (کا) سیدھا سادہ (تقاضا) ہے، لہٰذا ان مہینوں کے معاملے میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، اور تم سب مل کر مشرکوں سے اُسی طرح لڑو جیسے وہ سب تم سے لڑتے ہیں، اور یقین رکھو کہ اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔ ﴿۳۶﴾ اور

یہ نسیئ (یعنی مہینوں کو آگے پیچھے کر دینا) تو کفر میں ایک مزید اضافہ ہے جس کے ذریعے کافروں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس عمل کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں، اور ایک سال حرام قرار دے دیتے ہیں، تاکہ اللہ نے جو مہینے حرام کئے ہیں، اُن کی بس گنتی پوری کر لیں، اور (اس طرح) جو بات اللہ نے حرام قرار دی تھی، اُسے حلال سمجھ لیں۔ ان کی بدعملی ان کی نگاہ میں خوشنما بنادی گئی ہے، اور اللہ ایسے کافر لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ﴿۳۷﴾

خلاصۂ تفسیر

یقیناً شمار مہینوں کا (جو کہ) کتاب الٰہی (یعنی اَحکام شرعیہ) میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری) ہیں (اور کچھ آج سے نہیں بلکہ) جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے تھے (اسی روز سے اور) ان میں چار خاص مہینے ادب کے ہیں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب) یہی (امر مذکور) دین مستقیم ہے (یعنی ان مہینوں کا بارہ ہونا اور چار کا بالتخصیص اشہر حرم ہونا اور بخلاف عادت جاہلیت کے کبھی سال کے مہینوں کا عدد بڑھا دیتے، اور کبھی اشہر حرم کی تخصیص چھوڑ دیتے کہ یہ بد دینی ہے) سو تم ان سب مہینوں کے بارے میں (دین کے خلاف کر کے جو کہ موجب گناہ ہے) اپنا نقصان مت کرنا (یعنی اس عادتِ جاہلیت کے موافق مت کرنا) اور ان مشرکین سے (جبکہ یہ اپنی کفریات کو جن میں یہ خاص عادت بھی آگئی نہ چھوڑیں) سب سے لڑنا جیسا جیسا کہ وہ تم سب (مسلمانوں) سے لڑ (نے کو ہر وقت تیار رہا کر) تے ہیں، اور (اگر ان کے جمعیت اور سامان سے اندیشہ ہو تو) یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ساتھی ہے (پس ایمان وتقویٰ کو اپنا شعار رکھو اور کسی سے مت ڈرو، آگے اُن کی عادتِ جاہلیت کا بیان ہے کہ) یہ (مہینوں کا یا اُن کی حرمت کا آگے کو) ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے جس سے (اور عام) کفار گمراہ کئے جاتے ہیں، (اس طور پر) کہ وہ اس حرام مہینہ کو کسی سال (نفسانی غرض سے) حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال (جب کوئی غرض نہ ہو) حرام سمجھتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں (صرف) ان کی گنتی (بلالحاظ تخصیص وتعیین) پوری کر لیں پھر (جب تخصیص وتعیین نہ رہی تو) اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بداعمالیاں ان کو مستحسن معلوم ہوتی ہیں، اور (ان کے اصرار علی الکفر پر غم کرنا بے سود ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا (کیونکہ یہ خود راہ پر آنا نہیں چاہتے)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیات میں کفار ومشرکین کے کفر وشرک، گمراہی اور بداعمالیوں کا ذکر تھا، ان دو آیتوں میں بھی اسی سلسلہ کا ایک مضمون اور عرب جاہلیت کی ایک جاہلانہ رسم بد کا بیان اور مسلمانوں کو اس سے اجتناب کی ہدایت ہے، وہ رسمِ بد ایک

واقعہ سے متعلق ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد قدیم سے تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں سال کے بارہ مہینے مانے جاتے تھے اوران میں سے چار مہینے بڑے متبرک اور ادب واحترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے، تین مہینے مسلسل ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور ایک رجب کا۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، سابق شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر قتل وقتال بھی ممنوع تھا۔

مکہ مکرمہ کے عرب چونکہ اسماعیل علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں، اس لئے یہ سب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوّت ورسالت کے قائل اور ان کی شریعت کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، اور چونکہ ملتِ ابراہیم میں بھی ان چار مہینوں (یعنی اشہرِ حرم) میں قتل وقتال اور شکار ممنوع تھا، عرب جاہلیت پر اس حکم کی تعمیل اس لئے سخت دشوار تھی، کہ دورِ جاہلیت میں قتل وقتال ہی ان کا پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نفسانی اغراض کے لئے طرح طرح کے حیلے نکالے کبھی اشہر حرم کے کسی مہینہ میں جنگ کی ضرورت پیش آتی یا لڑتے لڑتے شہر حرام آجاتا تو کہہ دیتے کہ اب کے سال یہ مہینہ حرام نہیں ہوا اگلا مہینہ حرام ہوگا، مثلاً محرم آگیا تو کہتے کہ اس سال محرم کا مہینہ حرام نہیں بلکہ صفر کا مہینہ حرام ہوگا، اور مزید ضرورت پڑتی تو کہتے کہ ربیع الاوّل حرام ہوگا، یا یہ کہتے کہ اس سال صفر کا مہینہ پہلے آگیا، محرم بعد میں آئے گا اس طرح محرم کو صفر بنا دیا، غرض سال بھر میں چار مہینے تو پورے کرلیتے تھے لیکن اللہ کی متعین کردہ ترتیب اور تعیین کا لحاظ نہ کرتے تھے، جس مہینہ کو چاہیں ذی الحجہ کہہ دیں اور جس کو چاہیں رمضان کہہ دیں، جس کو چاہیں مقدم کردیں جس کو چاہیں مؤخر کردیں، اور کبھی زیادہ ضرورت پڑتی مثلاً لڑتے لڑتے دس مہینے گزر گئے اور سال کے صرف دو ہی مہینے باقی رہ گئے، تو ایسے موقع پر سال کے مہینوں کی تعداد بڑھا دیتے، اور کہتے کہ اب کے برس سال چودہ مہینوں کا ہوگا، اسی طرح باقی ماندہ چار مہینوں کو اشہر حرم بنا لیتے تھے۔

غرض دین ابراہیمی کا اتنا تو احترام کرتے تھے کہ سال میں چار مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں قتل وقتال سے باز رہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو ترتیب مہینوں کی متعین فرمائی اور اسی ترتیب سے چار مہینوں کو اشہر حرم قرار دیا، اس میں طرح طرح کی تاویلیں کرکے اپنی اغراض نفسانی کو پورا کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں اس کا امتیاز ہی دشوار ہوگیا تھا کہ کونسا مہینہ رمضان یا شوال کا ہے اور کونسا ذی القعدہ،، ذی الحجہ یا رجب کا ہے، ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور نویں سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو موسمِ حج میں تمام کفار ومشرکین سے براءت کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے اگرچہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، مگر جاہلیت کے اسی پُرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذی القعدہ کا قرار پایا تھا، اور اس

سال ان کے نزدیک حج کا مہینہ بجائے ذی الحجہ کے ذی القعدہ مقرر تھا، پھر ۱۰ھ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو قدرتی طور پر ایسا نظام بن گیا کہ مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا، اہلِ جاہلیت کے حساب میں بھی وہ ذی الحجہ ہی قرار پایا، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منیٰ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، [۱] یعنی زمانہ پھر پھرا کر پھر اپنی اسی ہیئت پر آ گیا جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی پیدائش کے وقت رکھا تھا، یعنی جو مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ تھی وہ رسمِ جاہلیت جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعیین میں کمی بیشی اور رَدّ وبدل کر کے کی جاتی تھی، جس کے نتیجہ میں ان تمام اَحکامِ شرعیہ میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کی کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں، یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں، مثلاً عشرۂ ذی الحجہ میں اَحکامِ حج اور عشرۂ محرم کے روزے اور ختم سال پر زکوٰۃ وغیرہ کے اَحکام۔

بات تو مختصر سی تھی کہ مہینہ کا نام بدل کر مقدم ومؤخر کر دیا، کہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنا دیا لیکن اس کے نتیجہ میں سینکڑوں اَحکامِ شرعیہ کی تحریف ہو کر عمل برباد ہوا، قرآن مجید کی ان دو آیتوں میں اس رسمِ جاہلیت کی خرابی اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا اس میں لفظ عِـدَّة تعداد کے معنی میں ہے، اور شہور شہر کی جمع ہے، شہر کے معنی مہینہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ متعین ہے، اس میں کسی کو کمی بیشی کا کوئی اختیار نہیں۔

اس کے بعد فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ کا لفظ بڑھا کر بتلا دیا کہ یہ بات ازل سے لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی تھی، پھر يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فرما کر اشارہ کر دیا کہ قضاء خداوندی اس معاملہ میں اگرچہ ازل میں جاری ہو چکی تھی، لیکن یہ مہینوں کی ترتیب اور تعیین اس وقت عمل میں آئی جب آسمان وزمین پیدا کئے گئے۔

پھر ارشاد فرمایا مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ یعنی ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، ان کو حرمت والا دو معنی کے اعتبار سے کہا گیا، ایک تو اس لئے کہ ان میں قتل وقتال حرام ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ مہینے متبرّک اور واجب الاحترام ہیں، ان میں عبادات کا ثواب زیادہ ملتا ہے، ان میں سے پہلا حکم تو شریعتِ اسلام میں منسوخ ہو گیا، مگر دوسرا حکم احترام وادب اور ان میں عبادت گزاری کا اہتمام اسلام میں بھی باقی ہے۔

---

[۱] سنن ابی داوٗد، کتاب المناسك، باب الأشهر الحرم ج:۱ ص:۲۶۸، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة التوبة، باب قوله "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ" الآية ج:۱ ص:۶۷۲

حجۃ الوداع کے خطبۂ یوم النحر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مہینوں کی تشریح یہ فرمائی کہ تین مہینے مسلسل ہیں، ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور ایک مہینہ رجب کا ہے،[1] مگر ماہِ رجب کے معاملہ میں عرب کے دو قول مشہور تھے، بعض قبائل اس مہینہ کو رجب کہتے تھے جس کو ہم رمضان کہتے ہیں، اور قبیلۂ مُضر کے نزدیک رجب وہ مہینہ تھا جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجب مضر فرما کر یہ وضاحت بھی فرما دی کہ جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے وہ ماہِ رجب مراد ہے۔

ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ یہ ہے دین مستقیم یعنی مہینوں کی تعیین اور ترتیب اور ان میں ہر مہینہ خصوصاً اشہر حرم کے متعلق جو اَحکام ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے حکمِ ازلی کے مطابق رکھنا ہی دین مستقیم ہے، اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی اور تغیر و تبدل کرنا کج فہمی اور کج طبعی کی علامت ہے۔

فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِيۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ یعنی ان مقدس مہینوں میں تم اپنا نقصان نہ کر بیٹھنا کہ ان کے معینہ اَحکام و احترام کی خلاف ورزی کر و یا ان میں عبادت گزاری میں کوتاہی کرو۔

امام بصاصؒ نے اَحکام القرآن میں فرمایا کہ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان متبرک مہینوں کا خاصہ یہ ہے کہ ان میں جو شخص کوئی عبادت کرتا ہے اس کو بقیہ مہینوں میں بھی عبادت کی توفیق اور ہمت ہوتی ہے، اسی طرح جو شخص کوشش کر کے ان مہینوں میں اپنے آپ کو گناہوں اور بُرے کاموں سے بچالے تو باقی سال کے مہینوں میں اس کو ان برائیوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اس لئے ان مہینوں سے فائدہ نہ اٹھانا ایک عظیم نقصان ہے۔[2]

یہاں تک مشرکینِ مکہ کی ایک خاص رسمِ جاہلیت کا ذکر اس طرح فرمایا اِنَّمَا النَّسِيۡٓءُ زِيَادَةٌ فِى الۡكُفۡرِ، لفظ نَسِیٓ مصدر ہے، جس کے معنی پیچھے ہٹا دینے اور مؤخر کر دینے کے ہیں، اور بمعنی مؤخر بھی استعمال ہوتا ہے۔

مشرکینِ عرب نے ان مہینوں کے آگے پیچھے کرنے کو یہ سمجھا تھا کہ اس طرح ہماری اغراضِ نفسانی بھی فوت نہ ہوں گی، اور حکمِ خداوندی کی تعمیل بھی ہو جائے گی، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہارا مہینوں کو مؤخر کرنا اور اپنی جگہ سے ہٹا دینا کفر میں اور زیادتی ہے، جس سے ان کفار کی گمراہی اور بڑھتی ہے، کہ وہ شہر حرام کو کسی سال تو حرام قرار دیں اور کسی سال حلال کر لیں۔ لِّيُوَاطِـُٔوۡا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، یعنی تاکہ وہ پوری کر لیں گنتی ان مہینوں کی جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض گنتی پوری کر لینے سے تعمیل حکم نہیں ہوتی، بلکہ جو حکم جس مہینہ کے لئے دیا گیا ہے اسی مہینہ میں اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ التوبۃ، باب قولہ "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ" الآیۃ ج:۱ ص:۶۷۲

[2] احکام القرآن للجصاصؒ ج:۷ ص:۲۳، تفسیر سورۃ البراءۃ۔

اَحکام و مسائل

مذکورہ آیتوں سے ثابت ہوا کہ مہینوں کی جو ترتیب اور ان مہینوں کے جو نام اسلام میں معروف ہیں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی اصطلاح نہیں، بلکہ ربّ العالمین نے جس دن آسمان و زمین پیدا کئے اسی دن یہ ترتیب اور یہ نام اور ان کے ساتھ خاص خاص مہینوں کے خاص خاص اَحکام متعین فرما دیئے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اَحکامِ شرعیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہے، اسی قمری حساب پر تمام اَحکامِ شرعیہ، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دائر ہیں، لیکن قرآنِ حکیم نے تاریخ و سال معلوم کرنے کے لئے جیسے قمر کو علامت قرار دیا ہے اسی طرح آفتاب کو بھی اس کی علامت فرمایا ہے، لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ (یونس:۵) اس لئے تاریخ و سال کا حساب چاند اور سورج دونوں سے جائز ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اَحکام کے لئے چاند کے حساب کو پسند فرمایا، اور اَحکامِ شرعیہ اس پر دائر فرمائے، اس لئے قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرضِ کفایہ ہے، اگر ساری اُمت قمری حساب ترک کر کے اس کو بھلا دے تو سب گنہگار ہوں گے، اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی جائز ہے، لیکن سنت اللہ اور سنت سلف کے خلاف ضرور ہے، اس لئے بلا ضرورت اس کو اختیار کرنا اچھا نہیں۔

حساب کو پورا کرنے کے لئے جو لوند کا مہینہ بڑھایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے اس کو بھی اسی آیت کے تحت ناجائز سمجھا ہے، مگر وہ صحیح نہیں، کیونکہ جس حساب میں لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں اس سے اَحکامِ شرعیہ کا تعلق نہیں، اہلِ جاہلیت قمری اور شرعی مہینوں میں زیادتی کر کے شرعی اَحکام کو بدلتے تھے، اس لئے منع کیا گیا لوند کا کوئی اثر شرعی اَحکام پر نہیں پڑتا اس لئے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اے ایمان والو تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں

اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ

تو گرے جاتے ہو زمین پر کیا خوش ہوگئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا

سو کچھ نہیں نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت تھوڑا، اگر تم نہ نکلوگے

يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ

تو دے گا تم کو عذاب دردناک اور بدلہ میں لاوے گا اور لوگ تمہارے سوا اور کچھ نہ بگاڑ سکوگے تم اس کا،

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ

اور اللہ سب چیز پر قادر ہے، اگر تم مدد نہ کروگے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت اس کو نکالا تھا

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ

کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق سے تو غم نہ کھا،

اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا

بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے اس پر تسکین اور اس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں،

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ

اور نیچے ڈالی بات کافروں کی، اور اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے،

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ

اور اللہ زبردست ہے حکمت والا، نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اپنے مال سے

وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور جان سے اللہ کی راہ میں، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے،

لَوۡ كَانَ عَرَضًا قَرِيۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡكَ وَ لٰكِنۡۢ

اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر ہلکا تو وہ لوگ ضرور تیرے ساتھ ہولیتے لیکن

بَعُدَتۡ عَلَيۡهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا

لمبی نظر آئی ان کو مسافت اور اب قسمیں کھاویں گے اللہ کی کہ اگر ہم سے ہوسکتا تو ہم ضرور چلتے

مَعَكُمۡ ۚ يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾ ع

تمہارے ساتھ، وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو، اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ اللہ کے راستے میں (جہاد کے لئے) کوچ کرو تو تم بوجھل ہو کر زمین سے لگ گئے؟ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی پر راضی ہو چکے ہو؟ (اگر ایسا ہے) تو (یاد رکھو کہ) دُنیوی زندگی کا مزہ آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، مگر بہت تھوڑا ﴿۳۸﴾ اگر تم کوچ نہیں کرو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا، اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا، اور تم اُسے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ﴿۳۹﴾ اگر تم اِن کی (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہیں کرو گے، تو (ان کا کچھ نقصان نہیں، کیونکہ) اللہ اِن کی مدد اُس وقت کر چکا ہے، جب ان کو کافر لوگوں نے ایسے وقت (مکہ سے) نکالا تھا جب وہ دو آدمیوں میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ: ''غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' چنانچہ اللہ نے ان پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی، اور اُن کی ایسے لشکروں سے مدد کی جو تمہیں نظر نہیں آئے، اور کافر لوگوں کا بول نیچا کر دِکھایا، اور بول تو اللہ ہی کا بالا ہے۔ اور اللہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۴۰﴾ (جہاد کے لئے) نکل کھڑے ہو، چاہے تم ہلکے ہو یا بوجھل، اور اپنے مال و جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے ﴿۴۱﴾ اگر دُنیا کا سامان کہیں قریب ملنے والا ہوتا، اور سفر درمیانہ قسم کا ہوتا، تو یہ (منافق لوگ) ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے، لیکن یہ کٹھن فاصلہ اِن کے لئے بہت دُور پڑ گیا۔ اور اَب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم میں استطاعت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ نکل جاتے۔ یہ لوگ اپنی جانوں کو ہلاک

کر رہے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں ﴿۴۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (یعنی اٹھتے اور چلتے نہیں) کیا تم نے آخرت کے عوض دنیاوی زندگی پر قناعت کر لی سو دنیوی زندگی کی تمتع تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل ہے، اگر تم (اس جہاد کے لئے) نہ نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو سخت سزا دے گا، (یعنی تم کو ہلاک کر دے گا) اور تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اللہ (کے دین) کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے، اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے اگر تم لوگ رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہ کرو گے تو (اللہ آپ کی مدد کرے گا، جیسا کہ) اللہ تعالیٰ آپ کی مدد اس وقت کر چکا ہے جبکہ (اس سے زیادہ مصیبت و پریشانی کا وقت تھا جبکہ) آپ کو کافروں نے (تنگ کر کر کے مکہ سے) جلاوطن کر دیا تھا جبکہ دو آدمیوں میں ایک آپ تھے (اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے ہمراہ تھے) جس وقت کہ دونوں (صاحب) غار (ثور) میں (موجود) تھے جبکہ آپ اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم (کچھ) غم نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ (کی مدد) ہمارے ہمراہ ہے سو (وہ مدد یہ ہوئی کہ) اللہ تعالیٰ نے آپ (کے قلب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی اور آپ کو (ملائکہ کے) ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات (اور تدبیر) نیچی کر دی (کہ وہ ناکام رہے) اور اللہ ہی کا بول بالا رہا (کہ ان کی تدبیر اور حفاظت غالب رہی) اور اللہ زبردست حکمت والا ہے (اسی لئے اسی کی بات اور حکمت غالب رہی جہاد کے لئے) نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سامان سے (ہو) اور (خواہ) زیادہ سامان سے (ہو) اور اللہ ہی کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو (تو دیر مت کرو) اگر کچھ لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی ہوتا تو یہ (منافق) لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے لیکن ان کو تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے، یہ لوگ (جھوٹ بول بول کر) اپنے آپ کو تباہ (یعنی مستحق عذاب) کر رہے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں (بلاشبہ ان کو استطاعت تھی اور پھر یہ نہیں گئے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک اہم غزوہ کا بیان اور اس کے ضمن

میں بہت سے اَحکام اور ہدایات ہیں، یہ غزوہ غزوۂ تبوک کے نام سے موسوم ہے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تقریباً آخری غزوہ ہے۔

تبوک، مدینہ کے شمال میں سرحدِ شام پر ایک مقام کا نام ہے، شام اس وقت رومی مسیحیوں کی حکومت کا ایک صوبہ تھا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۸ ھ ہجری میں جب فتح مکہ اور غزوۂ حنین سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ پہنچے تو اُس وقت جزیرۃ العرب کے اہم حصے اسلامی حکومت کے زیرنگیں آچکے تھے، اور مشرکینِ مکہ کی ہشت سالہ مسلسل جنگوں کے بعد اب مسلمانوں کو ذرا سکون کا وقت ملا تھا۔

مگر جس ذات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ نازل فرما کر پورے عالم کی فتوحات اور اس میں اپنے دین حق کو غالب کرنے کی بشارت دے دی تھی اس کو اور اس کے رفقاءِ کار کو فرصت کہاں، مدینہ پہنچتے ہی ملکِ شام سے آنے والے تجارت پیشہ لوگ جو شام سے زیتون کا تیل لاکر مدینہ وغیرہ میں فروخت کیا کرتے تھے، ان لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ شاہِ روم ہرقل نے اپنی فوجیں مقامِ تبوک میں سرحد شام پر جمع کردی ہیں، اور فوجیوں کو پورے ایک سال کی تنخواہیں پیشگی دے کر مطمئن اور خوش کردیا ہے، اور عرب کے بعض قبائل سے بھی ان کی سازباز ہے، ان کا تہیہ یہ ہے کہ مدینہ پر یکبارگی حملہ کریں۔

جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے یہ ارادہ فرمالیا کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے پیش قدمی کرکے وہیں مقابلہ کیا جائے جہاں ان کی فوجیں جمع ہیں۔ (تفسیر مظہری بحوالۂ محمد بن یوسف صالحی) [1]

یہ زمانہ اتفاق سے سخت گرمی کا زمانہ تھا، اور مدینہ کے حضرات عموماً زراعت پیشہ لوگ تھے، ان کی کھیتیاں اور باغات کے پھل پک رہے تھے جس پر ان کی ساری معیشت اور پورے سال کے گزارہ کا مدار تھا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح ملازمت پیشہ لوگوں کی جیبیں مہینہ کے آخری دنوں میں خالی ہوجاتی ہیں اسی طرح زراعت پیشہ لوگ فصل کے ختم پر خالی ہاتھ ہوتے ہیں، ایک طرف افلاس دوسری طرف قریب آمدنی کی امید، اس پر مزید موسمِ گرما کی شدّت اس قوم کے لئے جس کو ابھی ابھی ایک حریف کے ساتھ آٹھ سال مسلسل جنگوں کے بعد ذرا دم لینے کا موقع ملا تھا، ایک انتہائی صبر آزما امتحان تھا۔

مگر وقت کا تقاضا تھا، اور یہ جہاد اپنی نوعیت میں پہلی سب جنگوں سے اس لئے بھی ممتاز تھا کہ پہلے تو اپنی ہی طرح کے عوام سے جنگ تھی، اور یہاں ہرقل شاہ روم کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ تھا، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے پورے مسلمانوں کو اس جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دے دیا، اور کچھ آس پاس کے دوسرے قبائل کو بھی شرکتِ جہاد کے لئے دعوت دی تھی۔

---

[1] التفسير المظهري تحت هذه الآية ج: ۴ ص: ۲۰۵

یہ اعلانِ عام اسلام کے فداکاروں کا ایک سخت امتحان تھا، اور منافق دعویداروں کا امتیاز بھی، اس کے علاوہ لازمی نتیجہ کے طور پر اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کے مختلف حالات ہوگئے، قرآن کریم نے ان میں سے ہر حالت کے متعلق جدا جدا ارشادات فرمائے ہیں۔

ایک حالت ان کامل مکمل حضرات کی تھی جو بلا تردّد جہاد کے لئے تیار ہوگئے، دوسرے وہ لوگ جو ابتداءً کچھ تردّد کے بعد ساتھ ہوگئے، ان دونوں طبقوں کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ (التوبۃ: ۱۱۷) ''یعنی وہ لوگ قابلِ مدح ہیں جنہوں نے سخت تنگی کے وقت رسولِ کریم کا اتباع کیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک فریق کے قلوب لغزش کرنے لگے تھے۔''

تیسری حالت ان لوگوں کی تھی جو کسی صحیح عذر کی بناء پر اس جہاد میں نہ جاسکے، اس کے متعلق قرآن کریم نے آیت لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى [1] (التوبۃ: ۹۱) میں ان کے عذر کی قبولیت کا اظہار فرمادیا۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جو باوجود کوئی عذر نہ ہونے کے کاہلی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے، ان کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئیں، وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ (التوبۃ: ۱۰۲) اور وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ (التوبۃ: ۱۰۶) اور وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ الآیۃ (التوبۃ: ۱۱۸) یہ تینوں آیتیں ایسے ہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں، جن میں ان کی کاہلی پر زجر و تنبیہ بھی ہے اور بالآخر ان کی توبہ کے قبول ہونے کی بشارت بھی۔

پانچواں طبقہ منافقین کا تھا جو اپنے نفاق کی وجہ سے اس سخت امتحان میں اپنے نفاق کو چھپا نہ سکا، اور شرکتِ جہاد سے الگ رہا، اس طبقہ کا ذکر بہت سی آیات میں آیا ہے۔

چھٹا طبقہ ان منافقین کا تھا جو جاسوسی اور شرارت کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ہولیا تھا ان کی حالت کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں ہے: وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ (التوبۃ: ۴۷) وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ (التوبۃ: ۶۵) وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ (التوبۃ: ۷۴)

لیکن اس ساری سختی اور تکلیف کے باوجود شرکتِ جہاد سے باز رہنے والوں کی مجموعی تعداد پھر بھی برائے نام تھی، بھاری اکثریت انہی مسلمانوں کی تھی جو اپنے سارے منافع اور راحت کو قربان کرکے اللہ کی راہ میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگئے، اسی لئے اس جہاد میں نکلنے والے اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی، جو اس سے پہلے کسی جہاد میں نظر نہیں آئی۔

نتیجہ اس جہاد کا یہ ہوا کہ جب ہرقل شاہِ روم کو مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کے مقابلہ پر آنے کی خبر پہنچی تو اس پر

---

[1] اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسر نہیں جب کہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ خلوص رکھیں، ان نکوکاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

رعب طاری ہوگیا، مقابلہ پر نہیں آیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فرشتہ خصلت صحابہ کرام کے لشکر کے ساتھ چند روز محاذِ جنگ پر قیام کر کے جب مخالف کے مقابلہ پر آنے سے مایوس ہوگئے تو واپس تشریف لے آئے۔

جو آیتیں اوپر لکھی گئی ہیں بظاہر ان کا تعلق اس چوتھی جماعت سے ہے جو بغیر کسی صحیح عذر کے اپنی سستی اور کاہلی کی بناء پر شریکِ جہاد نہیں ہوئے، پہلی آیت میں ان کو اس کاہلی اور غفلت پر تنبیہ کی گئی اور اس کے ساتھ ان کے اس مرض غفلت وکاہلی کا سبب اور پھر اس کا علاج بھی ارشاد فرمایا گیا، جس کے ضمن میں یہ بھی واضح ہوگیا کہ:

دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت تمام جرائم کی بنیاد ہے

کیونکہ مرض کا جو سبب اور علاج اس جگہ بیان فرمایا گیا ہے اگرچہ اس جگہ اس کا تعلق ایک خاص واقعہ سے تھا، لیکن اگر غور کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی، سستی اور غفلت اور تمام جرائم اور گناہوں کا اصلی سبب یہی دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت ہے، اسی لئے حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ، [1] یعنی دنیا کی محبت ہر خطاء وگناہ کی بنیاد ہے، اسی لئے آیت مذکورہ میں فرمایا گیا کہ:

''اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا کہ جب تمہیں اللہ کے راستہ میں نکلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (حرکت نہیں کرنا چاہتے) کیا تم آخرت کے بدلے صرف دنیا کی زندگی پر مگن ہوگئے۔''

تشخیص مرض کے بعد اس کا علاج اگلے جملہ میں اس طرح ارشاد ہوا کہ:

''دنیوی زندگی سے نفع اٹھانا تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل وحقیر ہے''

جس کا حاصل یہ ہے کہ بڑی فکر آخرت کی دائمی زندگی کی چاہئے، اور یہ فکر آخرت ہی درحقیقت سارے امراض کا واحد اور مکمل علاج ہے اور انسداد جرائم کے لئے بے نظیر نسخۂ اکسیر ہے۔

عقائد اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں، توحید، رسالت اور آخرت، ان میں عقیدۂ آخرت درحقیقت اصلاحِ عمل کی رُوح اور جرائم اور گناہوں کے آگے ایک آہنی دیوار ہے، اگر غور کیا جائے تو بدیہی طور پر معلوم ہوگا کہ دنیا میں امن وسکون اس عقیدہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا آج کی دنیا میں مادی ترقیات اپنے شباب کو پہنچی ہوئی ہیں، جرائم کے انسداد کے لئے بھی کسی ملک وقوم میں مادی تدبیروں کی کوئی کمی نہیں، قانون کی جکڑ بندی اور اس کے لئے انتظامی مشینری روز بروز ترقی پر ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی آنکھوں دیکھا حال ہے کہ جرائم ہر جگہ اور ہر قوم میں روز بروز ترقی ہی پر ہیں، ہماری نظر میں اس

[1] کنز العمال رقم الحدیث: ۶۱۱۴

کی وجہ اس کے سوا نہیں کہ مرض کی تشخیص اور علاج کا رُخ صحیح نہیں، مرض کا سرچشمہ مادّہ پرستی اور مادیات میں انہماک اور آخرت سے غفلت واعراض ہے، اور اس کا واحد علاج ذکر اللہ اور آخرت کی فکر ہے، جس وقت اور جس جگہ بھی دنیا میں اس اکسیری نسخہ کو استعمال کیا گیا پوری قوم اور اس کا معاشرہ صحیح انسانیت کی تصویر بن کر فرشتوں کے لئے قابلِ رشک ہو گیا، عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کرام کا مشاہدہ اس کے لئے کافی دلیل ہے۔

آج کی دنیا جرائم کا انسداد تو چاہتی ہے، مگر خدا و آخرت سے غافل ہو کر چاہتی ہے اور قدم قدم پر ایسے سامان جمع کرتی ہے جس میں رہ کر خدا و آخرت کی طرف دھیان بھی نہ آئے، تو اس کا لازمی نتیجہ وہی تھا جو آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے، کہ بہتر سے بہتر قانون اور قانونی مشینریاں سب فیل نظر آتی ہیں، جرائم اپنی جگہ نہ صرف موجود بلکہ روز بروز طوفانی رفتار سے بڑھ رہے ہیں، کاش ایک مرتبہ عقلاء دنیا اس قرآنی نسخہ کو اِستعمال کر کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ کس قدر آسانی کے ساتھ جرائم پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

دوسری آیت میں سستی اور کاہلی برتنے والوں کو ان کے مرض اور علاج پر متنبہ کرنے کے بعد آخری فیصلہ یہ بھی سنا دیا کہ:

> ''اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیں گے اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیں گے، اور دین پر عمل نہ کرنے سے تم اللہ کو یا اللہ کے رسول کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

تیسری آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ پیش کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول کسی انسان کی نصرت وامداد کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو براہِ راست غیب سے امداد پہنچا سکتے ہیں، جیسا کہ ہجرت کے وقت پیش آیا، جب آپ کو آپ کی برادری اور اہلِ وطن نے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، سفر میں آپ کا رفیق بھی ایک صدیقؓ کے سوا کوئی نہ تھا، دشمنوں کے پیادے اور سوار تعاقب کر رہے تھے، آپ کی جائے پناہ بھی کوئی مستحکم قلعہ نہ تھا بلکہ ایک غار تھا، جس کے کنارے تک تلاش کرنے والے دشمن پہنچ چکے تھے، اور رفیقِ غار ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کا تو غم نہ تھا، مگر اس لئے سہم رہے تھے کہ یہ دشمن سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو جائیں گے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ ثابت بنے ہوئے نہ صرف خود مطمئن تھے، بلکہ اپنے رفیق صدیقؓ کو فرما رہے تھے لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ''تم غمگین نہ ہو کیونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

یہ بات کہنے کو تو دو لفظ ہیں جن کا بولنا کچھ مشکل نہیں، مگر سننے والے حالات کا پورا نقشہ سامنے رکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ محض مادّیات پر نظر رکھنے والے سے یہ اطمینان ممکن ہی نہیں، اس کا سبب اس کے سوا نہ تھا جس کو قرآن نے

اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلبِ مبارک پر تسلّی نازل فرمادی، اور ایسے لشکروں سے آپ کی امداد فرمائی، جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا۔"

یہ لشکر فرشتوں کے لشکر بھی ہوسکتے ہیں اور پورے عالم کی قوتیں خود بھی خدائی لشکر ہیں وہ بھی ہوسکتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر کفر کا کلمہ پست ہوکر رہا اور اللہ ہی کا بول بالا ہوا۔

چوتھی آیت میں پھر تاکید کے طور پر اس حکم کا اعادہ فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دے دیا تو تم پر نکلنا ہر حال میں فرض ہوگیا، اور اس حکم کی تعمیل ہی میں تمہاری ہر بھلائی کا انحصار ہے۔

پانچویں آیت میں جہاد میں بوجہ غفلت وسستی شریک نہ ہونے والوں کے ایک عذر کا بیان کرکے اس کی تردید کی گئی ہے کہ یہ عذر قابلِ قبول نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اختیار اور قدرت عطا فرمائی تھی انہوں نے اس کو اللہ کی راہ میں مقدور بھر استعمال نہیں کیا، اس لئے عدمِ استطاعت کا عذر صحیح نہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا

اللہ بخشے تجھ کو کیوں رخصت دے دی تو نے ان کو یہاں تک کہ ظاہر ہوجاتے تجھ پر سچ کہنے والے

وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

اور جان لیتا تو جھوٹوں کو، نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

اور آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال اور جان سے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

ڈر والوں کو، رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر

وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ

اور شک میں پڑے ہیں دل اُن کے سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں، اور اگر وہ چاہتے نکلنا

لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا

تو ضرور تیار کرتے کچھ سامان اس کا لیکن پسند نہ کیا اللہ نے ان کا اٹھنا سو روک دیا ان کو اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو

مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا

ساتھ بیٹھنے والوں کے، اگر نکلتے تم میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لئے مگر خرابی

وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ

اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر بگاڑ کروانے کی تلاش میں اور تم میں بعضے جاسوس ہیں ان کے

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا

اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو، وہ تلاش کرتے رہے ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور الٹتے رہے ہیں

لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

تیرے کام یہاں تک کہ آپہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا اور وہ ناخوش ہی رہے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ

اور بعضے ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے اور گمراہی میں نہ ڈال، سنتا ہے! وہ تو گمراہی میں پڑ چکے ہیں

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ

اور بیشک دوزخ گھیر رہی ہے کافروں کو، اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بری لگتی ہے ان کو

وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ

اور اگر پہنچے کوئی سختی تو کہتے ہیں ہم نے تو سنبھال لیا تھا اپنا کام پہلے ہی

وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج

اور پھر کر جائیں خوشیاں کرتے، تو کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے

هُوَ مَوْلٰىنَا ج وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ

وہی ہے کارساز ہمارا، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ کریں مسلمان، تو کہہ دے تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں

اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ط وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ

مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم امیدوار ہیں تمہارے حق میں کہ ڈالے تم پر اللہ

بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا صلے فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں، سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے، (مگر) تم نے اِن کو (جہاد میں شریک نہ ہونے کی) اجازت اس
سے پہلے ہی کیوں دے دی کہ تم پر یہ بات کھل جاتی کہ کون ہیں جنہوں نے سچ بولا ہے، اور تم جھوٹوں کو بھی اچھی طرح جان
لیتے ﴿۴۳﴾ جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر اِیمان رکھتے ہیں، وہ اپنے مال و جان سے جہاد نہ کرنے کے لئے تم سے اجازت نہیں
مانگتے، اور اللہ متقی لوگوں کو خوب جانتا ہے ﴿۴۴﴾ تم سے اجازت تو وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر اِیمان نہیں
رکھتے، اور ان کے دِل شک میں پڑے ہوئے ہیں، اور وہ اپنے شک کی وجہ سے ڈانوا ڈول ہیں ﴿۴۵﴾ اگر ان کا ارادہ نکلنے کا
ہوتا تو اُس کے لئے انہوں نے کچھ نہ کچھ تیاری کی ہوتی۔ لیکن اللہ نے اِن کا اُٹھنا پسند ہی نہیں کیا، اس لئے انہیں سست پڑا
رہنے دیا، اور کہہ دیا گیا کہ جو (اپاہج ہونے کی وجہ سے) بیٹھے ہیں، اُن کے ساتھ تم بھی بیٹھ رہو۔ ﴿۴۶﴾ اگر یہ لوگ تمہارے

ساتھ نکل کھڑے ہوتے تو سوائے فساد پھیلانے کے تمہارے درمیان کوئی اور اِضافہ نہ کرتے، اور تمہارے لئے فتنہ پیدا کرنے کی کوشش میں تمہاری صفوں کے درمیان دوڑے دوڑے پھرتے۔ اور خود تمہارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کے مطلب کی باتیں خوب سنتے ہیں، اور اللہ ان ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے ﴿۴۷﴾ ان لوگوں نے اس سے پہلے بھی فتنہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے معاملات کی اُلٹ پھیر کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ حق آیا، اللہ کا حکم غالب ہوا، اور یہ کڑھتے رہ گئے۔ ﴿۴۸﴾ اور انہی میں وہ صاحب بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ: ''مجھے اجازت دے دیجئے، اور مجھے فتنے میں نہ ڈالئے۔'' ارے فتنے ہی میں تو یہ خود پڑے ہوئے ہیں! اور یقین رکھو کہ جہنم سارے کافروں کو گھیرے میں لینے والی ہے۔ ﴿۴۹﴾ اگر تمہیں کوئی بھلائی مل جائے تو انہیں دکھ ہوتا ہے، اور اگر تم پر کوئی مصیبت آپڑے تو کہتے ہیں کہ: ''ہم نے تو پہلے ہی اپنا بچاؤ کرلیا تھا'' اور (یہ کہہ کر) بڑے خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں ﴿۵۰﴾ کہہ دو کہ: ''اللہ نے ہمارے مقدر میں جو تکلیف لکھ دی ہے، ہمیں اُس کے سوا کوئی اور تکلیف ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ وہ ہمارا رکھوالا ہے، اور اللہ ہی پر مؤمنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔'' ﴿۵۱﴾ کہہ دو کہ: ''تم ہمارے لئے جس چیز کے منتظر ہو، وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ (آخرکار) دو بھلائیوں میں سے ایک نہ ایک بھلائی ہمیں ملے۔ اور ہمیں تمہارے بارے میں انتظار اس کا ہے کہ اللہ تمہیں اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سزا دے۔ بس اب انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں'' ﴿۵۲﴾

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف (تو) کردیا (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہوجاتے، اور (جب تک کہ) جھوٹوں کو معلوم نہ کرلیتے (تاکہ وہ خوش تو نہ ہونے پاتے، کہ ہم نے آپ کو دھوکہ دے دیا اور) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے کے بارے میں (اس میں شریک نہ ہونے کی کبھی) آپ سے رخصت نہ مانگیں گے (بلکہ وہ حکم کے ساتھ دوڑ پڑیں گے) اور اللہ تعالیٰ ان متقیوں کو خوب جانتا ہے (ان کو اجر و ثواب دے گا) البتہ وہ لوگ (جہاد میں نہ جانے کی) آپ سے رخصت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل (اسلام سے) شک میں پڑے ہیں سو وہ اپنے شکوک میں پڑے ہوئے حیران ہیں (کبھی موافقت کا خیال ہوتا ہے کبھی مخالفت کا) اور اگر وہ لوگ (غزوہ میں) چلنے کا ارادہ کرتے (جیسا کہ وہ اپنے عذر کے وقت ظاہر کرتے ہیں کہ چلنے کا تو ارادہ تھا، لیکن کیا کیا جائے فلاں ضرورت پیش آگئی سو اگر ایسا ہوتا) تو اس (چلنے) کا کچھ سامان تو درست کرتے (جیسا کہ سفر کے لوازم عادیہ سے ہے) لیکن (انہوں نے تو شروع سے ارادہ ہی نہیں کیا اور اس میں خیر ہوئی جیسا آگے آتا ہے لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ اور اس کے خیر ہونے کی

وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکم تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو (اور ان کے جانے میں خیر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ) اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سوا اس کے کہ اور دُونا فساد کرتے اور کیا ہوتا (وہ فساد یہ ہوتا کہ) تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے (یعنی لگائی بجھائی کر کے آپس میں تفریق ڈلواتے ، اور جھوٹی خبریں اڑا کر پریشان کرتے ، دشمن کا رعب تمہارے قلوب میں ڈالنے کی کوشش کرتے ، اس لئے ان کا نہ جانا ہی اچھا ہوا) اور (اب بھی) تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں (جن کو اس سے زیادہ فساد کی تدبیر میں مہارت نہیں) اور ان ظالموں کو اللہ خوب سمجھے گا (اور ان لوگوں کی مفسدہ سازی وفتنہ پردازی کچھ آج نئی نہیں) انہوں نے تو پہلے (جنگِ اُحد وغیرہ میں) بھی فتنہ پردازی کی فکر کی تھی (کہ ساتھ ہو کر ہٹ گئے کہ مسلمان دل شکستہ ہو جائیں) اور (اس کے علاوہ بھی) آپ کی (ضرر رسانی کے) لئے کارروائیوں کی الٹ پھیر کرتے ہی رہے ، یہاں تک کہ سچا وعدہ آ گیا اور (اس کا آنا یہ ہے کہ) اللہ کا حکم غالب رہا اور ان کو ناگوار ہی گزرتا رہا ، (اسی طرح آئندہ بھی بالکل تسلی رکھئے کچھ فکر نہ کیجئے) اور ان (منافقین متخلفین میں بعضا شخص وہ ہے جو (آپ سے) کہتا ہے کہ مجھ کو (غزوہ میں نہ جانے کی اور گھر رہنے کی) اجازت دے دیجئے ، اور مجھ کو خرابی میں نہ ڈالئے ، خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ خرابی میں تو پڑ ہی چکے ہیں ، (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور کفر سے بڑھ کر اور کونسی خرابی ہوگی) اور یقیناً دوزخ (آخرت میں) ان کافروں کو گھیرے گی اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو وہ ان کے لئے موجبِ غم ہوتی ہے ، اور اگر آپ پر کوئی حادثہ آ پڑتا ہے تو (خوش ہو کر) کہتے ہیں کہ ہم نے تو (اسی واسطے) پہلے سے اپنا احتیاط کا پہلو اختیار کر لیا تھا (کہ ان کے ساتھ لڑائی وغیرہ میں نہیں گئے تھے) اور (یہ کہہ کر) وہ خوش ہوئے چلے جاتے ہیں آپ (جواب میں ان سے دو باتیں) فرما دیجئے ، (ایک تو یہ کہ) ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرمایا ہے ، وہ ہمارا مالک ہے (پس مالک حقیقی جو تجویز کرے مملوک کو اس پر راضی رہنا واجب ہے) اور (ہماری کیا تخصیص ہے) اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں (دوسری بات یہ) فرما دیجئے کہ (ہمارے لئے جیسی اچھی حالت بہتر ہے ویسے ہی حوادث بھی باعتبار انجام کے کہ اس میں رفع درجات وقطع سیئات ہونا بہتر ہے ، پس) تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے ایک بہتری کے منتظر رہتے ہو (یعنی تم جو ہماری حالت کے منتظر رہتے ہو کہ دیکھئے کیا ہو تو خواہ وہ حسنہ ہو یا مصیبت ہمارے لئے دونوں ہی میں بہتری ہے) اور ہم تمہارے حق میں اس کے منتظر رہا کرتے ہیں ، کہ خدا تعالیٰ تم پر کوئی عذاب واقع کرے گا (خواہ) اپنی طرف سے (دنیا میں یا آخرت میں) یا ہمارے ہاتھوں سے (جبکہ تم اپنے کفر کو ظاہر کر دو ، تو مثل دوسرے کفار کے قتل کئے جاؤ) سو تم (اپنے طور پر) انتظار کرو (اور) ہم تمہارے ساتھ (اپنے طور پر) انتظار میں ہیں ۔

معارف ومسائل

اس پورے رکوع کی سترہ آیتوں میں بیشتر ان منافقین کا ذکر ہے، جنہوں نے جھوٹے عذر پیش کر کے غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی اجازت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر لی تھی، اس کے ضمن میں بہت سے احکام ومسائل اور ہدایات ہیں۔

پہلی آیت میں ایک لطیف انداز سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی شکایت ہے کہ ان منافقین نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو معذور ظاہر کیا اور آپ نے قبل اس کے کہ ان کے حال کی تحقیق کر کے جھوٹ سچ کا پتہ لگاتے ان کو رخصت دے دی، جس کی بنا پر یہ لوگ خوشیاں مناتے رہے اور یہ کہتے پھرے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب دھوکہ دیا، اگرچہ اگلی آیتوں میں حق تعالیٰ نے اس کا بھی اظہار فرما دیا کہ یہ لوگ محض حیلہ جوئی کے لئے عذر پیش کر رہے تھے، ورنہ اگر ان کو اجازت نہ دی جاتی جب بھی یہ لوگ جانے والے نہ تھے اور ایک آیت میں اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اگر بالفرض یہ لوگ اس جہاد میں جاتے بھی تو ان سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، بلکہ ان کی سازش اور فتنہ پردازی سے اور خطرہ ہوتا۔

لیکن منشاء یہ ہے کہ ان کو اگر اجازت نہ دی جاتی تو پھر بھی یہ جانے والے تو نہ تھے، مگر ان کا نفاق کھل جاتا، اور ان کو مسلمانوں پر یہ طعنے کسنے کا موقع نہ ملتا کہ ہم نے ان کو خوب بیوقوف بنایا، اور مقصد درحقیقت عتاب نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ آئندہ ان لوگوں کی چالوں سے باخبر رہیں، اور صورۃً جو ایک قسم کا عتاب بھی ہے تو کس لطف وعنایت کے ساتھ کہ عتاب کی بات جو لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ سے شروع ہوئی ہے، یعنی آپ نے ان لوگوں کو کیوں اجازت دے دی اس کے ذکر کرنے سے پہلے ہی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ذکر فرما دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرما دیا۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب ومقام اور آپ کے تعلق مع اللہ پر نظر رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غایت تعلق حضرت حق جل شانہ کے ساتھ تھا اس کے پیش نظر آپ کا قلبِ مبارک اس کا تحمل ہی نہ کر سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کسی معاملہ میں آپ سے جواب طلب کیا جائے، اگر شروع میں لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کے الفاظ ذکر فرما دیئے جاتے جن میں صورۃً جواب طلبی کا عنوان ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ مبارک اس کا تحمل نہ کر سکتا، اس لئے اس سے پہلے عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ فرما کر ایک طرف تو اس پر مطلع کر دیا کہ کوئی ایسا کام ہو گیا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا، دوسری طرف اس کی معافی کی اطلاع پہلے دے دی تا کہ اگلا کلام قلب مبارک پر زیادہ شاق نہ ہو۔

اور لفظ معافی سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ معافی تو جرم وگناہ کی ہوا کرتی ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گناہ سے

معصوم ہیں تو پھر معافی کے یہاں کیا معنی ہو سکتے ہیں وجہ یہ ہے کہ معافی جیسے گناہ کی ہوتی ہے ایسے ہی خلافِ اَولیٰ اور ناپسندیدہ چیز کے لئے بھی معافی کا استعمال کیا جا سکتا ہے، اور وہ عصمت کے منافی نہیں۔

دوسری اور تیسری آیت میں مؤمنین اور منافقین کا یہ فرق بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان رکھنے والے ایسے موقع پر کبھی اپنی جان و مال کی محبت میں جہاد سے جان چُرانے کے لئے آپ سے رخصت نہیں مانگا کرتے، بلکہ یہ کام صرف انہی لوگوں کا ہے جن کا اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان صحیح نہیں، اور اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔

چوتھی آیت میں ان کا عذر غلط ہونے کا ایک قرینہ یہ بتلایا گیا ہے کہ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً یعنی اگر واقعی یہ لوگ جہاد کے لئے نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ کچھ تیاری بھی تو کرتے، لیکن انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی، جس سے معلوم ہوا کہ عذر کا بہانہ غلط تھا، درحقیقت ان کا ارادہ ہی جہاد کے لئے نکلنے کا نہیں تھا۔

عذر معقول اور نامعقول میں امتیاز

اس آیت سے ایک اہم اصول مستفاد ہوا، جس سے معقول اور نامعقول عذر میں امتیاز کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ عذر انہی لوگوں کا قابلِ قبول ہو سکتا ہے جو تعمیلِ حکم کے لئے تیار ہوں، پھر کسی اتفاقی حادثہ کے سبب معذور ہو گئے، معذوروں کے تمام معاملات کا یہی حکم ہے، جس نے تعمیلِ حکم کے لئے کوئی تیاری ہی نہیں کی اور ارادہ ہی نہیں کیا، پھر کوئی عذر بھی پیش آ گیا تو یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی ایک مثال ہوگی، صحیح عذر نہ سمجھا جائے گا، جو شخص نمازِ جمعہ کی حاضری کے لئے تیاری مکمل کر چکا ہے، اور جانے کا ارادہ کر رہا ہے کہ دفعۃً کوئی ایسا عذر پیش آ گیا جس کی وجہ سے نہ جا سکا تو اس کا عذر معقول ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس کی عبادت کا پورا اجر عطا فرماتے ہیں، اور جس نے کوئی تیاری کی ہی نہیں، پھر اتفاقاً کوئی عذر بھی سامنے آ گیا تو وہ محض ایک بہانہ ہے۔

صبح کو سویرے نماز کے لئے اُٹھنے کی تیاری پوری کی، گھڑی میں الارم لگایا، یا کسی کو مقرر کیا جو وقت پر جگائے، پھر اتفاق سے یہ تدبیریں غلط ہو گئیں جس کی وجہ سے نماز قضا ہو گئی، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ التعریس میں پیش آیا، کہ وقت پر جاگنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بٹھا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی سب کو جگا دیں، مگر اتفاق سے اُن پر بھی نیند غالب آ گئی، اور آفتاب نکل آنے کے بعد سب کی آنکھ کھلی، تو یہ عذر صحیح اور معقول ہے، جس کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: لَا تَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ اِنَّمَا التَّفْرِيْطُ فِي الْيَقْظَةِ، یعنی نیند میں آدمی معذور ہے، کوتاہی وہ ہے جو جاگتے ہوئے کوتاہی کرے۔"[1] وجہ یہ تھی کہ اپنی طرف سے وقت پر جاگنے کا انتظام مکمل کر لیا گیا تھا۔

---

[1] سنن ابی داوٗد، كتاب الصلاة، باب في من نام عن الصلاة أو نسيها ج:۱ ص:۶۲

خلاصہ یہ ہے کہ تعمیل حکم کے لئے تیاری کرنے یا نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے معقول یا نامعقول ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔

پانچویں آیت میں دھوکہ سے اجازت لینے والے منافقین کا یہ حال بھی بتلا دیا گیا، کہ ان کا جہاد میں نہ جانا ہی بہتر تھا، اگر یہ جاتے تو سازشوں اور جھوٹی خبروں سے فساد ہی پھیلاتے، وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ''یعنی تم میں کچھ بھولے بھالے مسلمان ایسے بھی ہیں جو اُن کی جھوٹی افواہوں سے متاثر ہوسکتے تھے۔''

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ ''یعنی یہ لوگ اس سے پہلے بھی ایسا فتنہ وفساد پھیلا چکے ہیں'' جیسے غزوۂ اُحد میں پیش آیا تھا۔

وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ یعنی'' غالب آیا حکم اللہ کا حالانکہ منافقین اس سے بہت پیچ وتاب میں تھے۔'' اس سے اشارہ فرمادیا کہ غلبہ اور فتح حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، جیسا پہلے واقعات میں آپ کو فتح دی گئی، اس جہاد میں بھی ایسا ہی ہوگا اور منافقین کی سب چالیں ناکام ہوجائیں گی۔

چھٹی آیت میں ایک خاص منافق جد بن قیس کا ایک خاص بہانہ ذکر کرکے اس کی گمراہی بیان فرمائی ہے، اس نے جہاد میں جانے سے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں نوجوان آدمی ہوں، رومیوں کے مقابلہ پر جاؤں گا تو ان کی حسین عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہے،[1] قرآن کریم نے اس کے جواب میں فرمایا اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا کہ یہ بیوقوف ایک موہوم فتنہ کا بہانہ کرکے ایک یقینی فتنہ یعنی امر رسول کی خلاف ورزی اور ترکِ جہاد کے گناہ میں فی الحال مبتلا ہوگئے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ یعنی جہنم ان سب کافروں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جس سے نکل نہیں سکتے، اس کی مراد یا تو یہ ہے کہ آخرت میں جہنم ان کو گھیرے میں لے لے گی اور یا یہ کہ جہنم میں پہنچنے کے اسباب جو اس وقت ان کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں، انہی کو جہنم سے تعبیر فرمادیا، اس معنی کے اعتبار سے گویا فی الحال بھی یہ لوگ جہنم ہی کے دائرہ میں ہیں۔

ساتویں آیت میں ان کی ایک اور کم ظرفی کا بیان ہے، کہ یہ لوگ اگرچہ ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں، لیکن حال یہ ہے کہ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ یعنی اگر آپ کو کوئی فتح اور کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو سخت ناگوار ہوتا ہے، وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ ''یعنی اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں، اسی لئے ہم نے اپنی مصلحت کو اختیار کیا، ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور یہ کہہ کر وہ خوشی خوشی واپس ہوجاتے ہیں۔

---

[1] المعجم الأوسط للطبراني رقم الحديث: ۵۷۲۲

آٹھویں آیت میں حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو منافقین کے مذکورہ اقوال سے متاثر نہ ہونے اور اصل حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی: قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ”یعنی آپ ان مادی اسباب کی پرستش کرنے والوں کو بتلا دیجئے کہ تم دھوکہ میں ہو یہ مادی اسباب محض ایک پردہ ہیں، ان کے اندر کام کرنے والی قوت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، ہمیں جو حال پیش آتا ہے وہ سب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے، اور وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے، اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی پر اصل بھروسہ رکھیں، مادی اسباب کو صرف اسباب و علامات ہی کی حیثیت سے دیکھیں، ان پر کسی بھلائی یا برائی کا مدار نہ جانیں۔

اعتقادِ تقدیر استعمالِ تدبیر کے ساتھ ہونا چاہئے، بے تدبیری کا نام توکل رکھنا غلط ہے

اس آیت نے مسئلہ تقدیر اور مسئلہ توکل کی اصل حقیقت بھی واضح کر دی، کہ تقدیر و توکل پر یقین رکھنے کا یہ حاصل نہ ہونا چاہئے، کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، اور یہ کہے کہ جو کچھ قسمت میں ہوگا وہ ہو جائے گا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اسباب اختیاریہ کے لئے اپنی پوری توانائی اور ہمت صَرف کی جائے اور بحدِ قدرت اسباب جمع کرنے کے بعد معاملہ کو تقدیر و توکل کے حوالہ کریں، نظر صرف اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ نتائج ہر کام کے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

مسئلہ تقدیر و توکل میں عام دنیا کے لوگ بڑی افراتفری میں پائے جاتے ہیں، کچھ بے دین لوگ تو وہ ہیں جو سرے سے تقدیر و توکل کے قائل ہی نہیں انہوں نے مادی اسباب ہی کو خدا بنایا ہوا ہے، اور کچھ ناواقف ایسے بھی ہیں جنہوں نے تقدیر و توکل کو اپنی کم ہمتی اور بیکاری کا بہانہ بنا لیا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاد کے لئے پوری پوری تیاری اور اس کے بعد اس آیت کے نزول نے اس افراط و تفریط کو ختم کر کے صحیح راہ دکھلا دی کہ ”بر توکل زانوئے اشتر بہ بند“ [1] یعنی اسباب اختیاریہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی نعمت ہیں، ان سے فائدہ نہ اٹھانا ناشکری اور بیوقوفی ہے، البتہ اسباب کو اسباب کے درجہ سے آگے نہ بڑھاؤ، اور عقیدہ یہ رکھو کہ نتائج و ثمرات ان اسباب کے تابع نہیں، بلکہ فرمانِ حق جل شانہٗ کے تابع ہیں۔

نویں آیت نے مردِ مؤمن کی ایک البیلی شان کا ذکر کر کے اُن کی مصیبت پر خوش ہونے والے منافقین کو یہ جواب دے دیا کہ تم جس چیز کو ہمارے لئے مصیبت سمجھ کر خوش ہوتے ہو ہمارے نزدیک وہ مصیبت بھی مصیبت نہیں، بلکہ راحت و کامیابی ہی کی ایک دوسری صورت ہے، کیونکہ مردِ مؤمن اپنے عزم میں ناکام ہو کر بھی دائمی اجر و صلہ کا مستحق بنتا ہے، جو ساری کامیابیوں کا مقصودِ اصلی ہے، اس لئے وہ ناکام ہو کر بھی کامیاب رہتا ہے، اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے۔

---

[1] ترجمہ: توکل کے ساتھ اونٹ کے گھٹنے باندھ دو۔

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

مذکورہ آیت میں قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ کا یہی مطلب ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ کفار کا حال اس کے بالکل برعکس ہے، کہ ان کو کسی حال عذاب و مصیبت سے چھٹکارا نہیں، یا تو دنیا ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں اُن پر خدا کا عذاب آجائے گا، اور اس طرح دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب چکھیں گے، اور اگر دنیا میں کسی طرح اس سے بچ گئے تو آخرت کے عذاب سے خلاصی کا کوئی امکان نہیں۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ

کہہ دے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے بیشک تم

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ

نافرمان لوگ ہو، اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا

اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى

مگر اسی بات پر کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی سے

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ

اور خرچ نہیں کرتے مگر بُرے دل سے، سو تو تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے،

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ

یہی چاہتا ہے اللہ کہ ان کو عذاب میں رکھے ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں اور نکلے ان کی جان

وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ

اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بیشک تم میں ہیں اور وہ تم میں نہیں

وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝٥٦ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا

ولیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں تم سے، اگر وہ پاویں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ

لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝٥٧ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ

تو اُلٹے بھاگیں اسی طرف رسیاں تڑاتے، اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے ہیں خیرات بانٹنے میں

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝٥٨

سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو جب ہی وہ ناخوش ہوجاویں،

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ

اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہوجاتے اسی پر جو دیا ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہم کو اللہ

سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝٥٩ ع

اور وہ دے گا ہم کو اپنے فضل سے اور اس کا رسول ہم کو تو اللہ ہی چاہئے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کہہ دو کہ: ”تم اپنا مال چاہے خوشی خوشی چندے میں دو، یا بددلی سے، وہ تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ تم ایسے لوگ ہو جو مسلسل نافرمانی کرتے رہے ہو“ ۝٥٣ اور ان کے چندے قبول کئے جانے میں رُکاوٹ کی کوئی اور وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کفر کا معاملہ کیا ہے، اور یہ نماز میں آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں، اور (کسی نیکی میں) خرچ کرتے ہیں تو بُرا مانتے ہوئے خرچ کرتے ہیں ۝٥٤ تمہیں ان کے مال اور اولاد (کی کثرت) سے تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں سے ان کو دُنیوی زندگی میں عذاب دے، اور ان کی جان بھی کفر ہی کی حالت میں نکلے ۝٥٥ یہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں، بلکہ وہ ڈرپوک لوگ ہیں ۝٥٦ اگر ان کو کوئی پناہ گاہ مل جاتی، یا کسی قسم کے غار مل جاتے، یا گھس بیٹھنے کی اور کوئی جگہ، تو یہ

بے لگام بھاگ کر اُدھر ہی کا رُخ کر لیتے۔ ۵۷ اور انہی (منافقین) میں وہ بھی ہیں جو صدقات (کی تقسیم) کے بارے میں آپ کو طعنہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر اُنہیں صدقات میں سے (ان کی مرضی کے مطابق) دے دیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں، اور اگر اُن میں سے انہیں نہ دیا جائے تو ذرا سی دیر میں ناراض ہو جاتے ہیں ۵۸ جو کچھ بھی انہیں اللہ اور اس کے رسول نے دے دیا تھا، کیا اچھا ہوتا کہ یہ اُس پر راضی رہتے، اور یہ کہتے کہ: "اللہ ہمارے لئے کافی ہے، آئندہ اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا، اور اُس کا رسول بھی! ہم تو اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔" ۵۹

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان منافقین سے) فرما دیجئے کہ تم (جہاد وغیرہ میں) خواہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے (خرچ کرو) تم سے کسی طرح (خدا کے نزدیک) مقبول نہیں (کیونکہ) بلاشبہ تم نافرمانی کرنے والے لوگ ہو، (مراد اس سے کفر ہے جیسا کہ آگے آتا ہے) اور ان کی خیرات قبول ہونے سے اس کے سوا کوئی مانع نہیں کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا (اسی کو اوپر نافرمانی کہا تھا اور کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں) اور (اس کفر باطنی کی علامت ظاہر میں یہ ہے کہ) وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور (نیک کام میں) خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ (کیونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں جس سے امید ثواب ہو اور اس امید سے رغبت ہو محض بدنامی سے بچنے کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اور جب وہ ایسے مردود ہیں) تو ان کے اموال اور اولاد آپ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں (کہ ایسے غیر مقبول مردود لوگوں کو اتنے انعامات کس طرح عطا ہوئے، کیونکہ واقع میں ان کے لئے نعمت نہیں ایک قسم کا عذاب ہی ہے کیونکہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں (بھی) ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جاوے (جس سے آخرت میں بھی گرفتارِ عذاب ہوں تو جس مال و اولاد کا یہ انجام ہو اس کو انعام سمجھنا ہی غلطی ہے) اور یہ (منافق) لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں (یعنی مسلمان ہیں) حالانکہ (واقع میں) وہ تم میں سے نہیں، لیکن (بات یہ ہے کہ) وہ ڈرپوک لوگ ہیں (ڈر کے مارے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کفر کو چھپاتے ہیں کہ ہمارے ساتھ دوسرے کفار کا سا معاملہ مسلمانوں کی طرف سے نہ ہونے لگے، اور کسی دوسری جگہ ان کا ٹھکانا نہیں جہاں آزادی سے جا رہیں ورنہ) ان لوگوں کو اگر کوئی پناہ کی جگہ مل جاتی یا (کہیں پہاڑ وغیرہ میں) غار (مل جاتے) یا کوئی گھس بیٹھنے کی ذرا جگہ (مل جاتی) تو یہ ضرور منہ اٹھا کر ادھر ہی چل دیتے (مگر یہ صورت ہے نہیں، اس لئے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے آپ کو مسلمان بتاتے ہیں) اور اُن میں بعض لوگ وہ ہیں جو صدقات (تقسیم کرنے) کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں (کہ اس تقسیم میں نعوذ باللہ انصاف نہیں کیا گیا) تو اگر صدقات میں سے ان کو (ان کی خواہش کے مطابق) مل جاتا ہے تو وہ راضی

ہوجاتے ہیں اور اگر ان صدقات میں سے ان کو (اپنی خواہش کے مطابق) نہیں ملتا تو وہ ناراض ہوجاتے ہیں (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا منشاء دراصل کوئی اصول نہیں، بلکہ حرصِ دنیا اور خودغرضی ہے) اور ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی رہتے جو کچھ اللہ نے ان کو (دلوایا تھا) اور اس کے رسول نے دیا تھا اور (اس کے متعلق) یوں کہتے کہ ہم کو اللہ (کا دیا) کافی ہے (ہم کو اتنا ہی قاعدہ سے مل سکتا تھا اسی میں خیر وبرکت ہوگی، اور پھر اگر حاجت پیش آئے گی اور مصلحت ہوگی تو) آئندہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو اور دے گا، اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) دیں گے ہم (دل سے) اللہ ہی کی طرف راغب ہیں (اسی سے سب امیدیں رکھتے ہیں)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں منافقین کی بداخلاقی اور بداعمالی کا ذکر تھا، مذکورہ تمام آیات میں بھی یہی مضمون ہے: اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ منافقین کے مال واولاد ان کے لئے نعمت نہیں عذاب ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں انہماک انسان کے لئے اس دنیا ہی میں ایک عذاب ومصیبت بن جاتا ہے، اوّل مال دنیا کے حاصل کرنے کی تمناؤں اور پھر تدبیروں میں کیسی کیسی محنت، مشقت اور کوفت جسمانی اور روحانی اٹھانی پڑتی ہے، نہ دن کا چین نہ رات کی نیند، نہ اپنے تن بدن کی خبر، نہ اہل وعیال ہی میں دل بہلانے کی فرصت، پھر اگر وہ حاصل ہوگیا تو اس کی حفاظت اور اس کے بڑھانے کی فکر دن رات کا عذاب ہے، اور اگر ذرا سا نقصان ہوگیا یا کوئی بیماری پیش آگئی، تو غموں کا پہاڑ آپڑا، اور اگر ساری چیزیں اتفاق سے طبیعت اور خواہش کے مطابق حاصل بھی ہوجائیں تو اس کے گھٹ جانے کا اندیشہ اور بڑھاتے چلے جانے کی فکر کسی وقت چین نہیں لینے دیتی۔

پھر جب آخرکار یہ چیزیں موت کے وقت یا پہلے ہی اس کے ہاتھ سے جاتی ہیں تو اس پر حسرت ویاس مسلط ہوجاتی ہے، یہ سب عذاب ہی عذاب ہے، جس کو بیوقوف انسان جس نے سامانِ راحت کا نام راحت رکھ لیا ہے، اور حقیقی راحت یعنی قلب کا سکون واطمینان کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی، اس لئے سامانِ راحت ہی کو راحت سمجھ کر اس پر مگن رہتا ہے، جو حقیقت میں اس کے لئے دنیا کے چین وآرام کا بھی دشمن ہے اور آخرت کے عذاب کا مقدمہ بھی۔

کیا صدقات کا مال کافر کو دیا جاسکتا ہے

آخری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال صدقات میں سے منافقین کو بھی حصہ ملا کرتا تھا، مگر وہ خواہش کے مطابق نہ ملنے پر ناراض ہوجاتے اور طعن وتشنیع کرنے لگتے تھے، یہاں اگر صدقات سے مراد عام معنی لئے جائیں جس میں

صدقاتِ واجبہ اور نافلہ سب شامل ہیں، تو کوئی اِشکال ہی نہیں کیونکہ نفلی صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینا باتفاقِ اُمت جائز اور سنت سے ثابت ہے، اور اگر صدقات سے مراد اس جگہ صدقات فرض، زکوٰۃ، عشر وغیرہ ہی ہوں، تو منافقین کو اس میں سے حصہ دینا اس بناء پر تھا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، اور ظاہری کوئی حجت ان کے کفر پر قائم نہ ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے بمصلحت حکم یہی دے رکھا تھا کہ منافقین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ (بیان القرآن ملخصاً)

وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى اس آیت میں منافقین کی دو علامتیں بتلائی گئی ہیں، ایک یہ کہ نماز کو آویں تو سستی کاہلی اور ہارے جی سے آویں دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو ناگواری کے ساتھ خرچ کریں۔

اس میں مسلمانوں کو بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نماز میں سستی، کاہلی اور زکوٰۃ وصدقات سے دلی ناگواری پیدا ہونا علامتِ نفاق ہے، مسلمانوں کو کوشش کر کے ان علامات سے بچنا چاہئے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا

زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِى الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے رستہ میں

وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اور راہ کے مسافر کو، ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

صدقات تو دراصل حق ہے فقیروں کا، مسکینوں کا، اور اُن اہلکاروں کا جو صدقات کی وصولی پر مقرر ہوتے ہیں، اور اُن کا جن کی دِلداری مقصود ہے۔ نیز اُنہیں غلاموں کو آزاد کرنے میں، اور قرض داروں کے قرضے ادا کرنے میں، اور اللہ کے راستے میں، اور مسافروں کی مدد میں خرچ کیا جائے۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے! اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۶۰﴾

خلاصۂ تفسیر

(فرض) صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات (کی تحصیل وصول کرنے) پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا (منظور) ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (صرف کیا جائے) اور قرض داروں کے قرضہ (ادا کرنے) میں اور جہاد کرنے (والوں کے سامان) میں اور مسافروں کی (امداد) میں یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

معارف ومسائل

مصارفُ الصدقات

اس سے پہلی آیتوں میں صدقات کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض منافقین کے اعتراضات اور جواب کا ذکر تھا، جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا آپ (معاذ اللہ) صدقات کی تقسیم میں انصاف نہیں کرتے، جس کو چاہتے ہیں جو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصارفِ صدقات کو متعین فرما کر ان کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات خود متعین فرمادی ہے کہ صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیمِ صدقات میں اسی ارشادِ ربانی کی تعمیل فرماتے ہیں، اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتے۔

اس کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت زیاد بن حارث صدائی کی ایک روایت سے نقل کی ہے، یہ فرماتے ہیں کہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو معلوم ہوا کہ آپ ان کی قوم کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر مسلمانوں کا روانہ فرما رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ لشکر نہ بھیجیں، میں اس کا ذمہ لیتا ہوں، کہ وہ سب مطیع وفرمانبردار ہوکر آجائیں گے، پھر میں نے اپنی قوم کو خط لکھا تو سب کے سب مسلمان ہوگئے، اس پر آپ نے فرمایا یَا اَخَا صُدَاءَ الْمُطَاعَ فِیْ قَوْمِہٖ، جس میں گویا ان کو یہ خطاب دیا گیا کہ یہ اپنی قوم کے محبوب اور مقتدا ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ان کو ہدایت ہوگئی اور وہ مسلمان ہوگئے، یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سوال کرنے کے لئے حاضر ہوا، آپ نے اس کو یہ جواب دیا کہ:

صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصارف متعین فرما دیئے، اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں، انتہیٰ۔ (تفسیر قرطبی ج:۸ ص:۱۶۸) [۱]

آیت کا شانِ نزول معلوم کرنے کے بعد آیت کی مکمل تفسیر اور تشریح سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ جل شانہٗ نے تمام مخلوقات انسان وحیوان وغیرہ کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے، وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ہود:۶) اور ساتھ ہی اپنی حکمتِ بالغہ سے ایسا نہیں کیا کہ سب کو رزق میں برابر کر دیتے، غنی وفقیر کا فرق نہ رہتا، اس میں انسان کی اخلاقی تربیت اور نظامِ عالم سے متعلق سینکڑوں حکمتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اس حکمت کے ماتحت کسی کو مالدار بنا دیا، کسی کو غریب فقیر، پھر مالداروں کے مال میں غریب فقیر کا حصہ لگا دیا، ارشاد فرمایا وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹ (الذاریات) جس میں بتلا دیا کہ مالداروں کے مال میں اللہ تعالیٰ نے ایک معین مقدار کا حصہ فقراء کے لئے رکھ دیا ہے، جو اُن فقراء کا حق ہے۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ مالداروں کے مال میں سے جو صدقہ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے یہ کوئی ان کا احسان نہیں، بلکہ فقراء کا ایک حق ہے، جس کی ادائیگی ان کے ذمہ ضروری ہے، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حق اللہ تعالیٰ کے نزدیک متعین ہے، یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے جب چاہے اس میں کمی بیشی کر دے، اللہ تعالیٰ نے اس معین حق کی مقدار بھی بتلانے کا کام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا، اور اسی لئے آپ نے اس کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ صحابہ کرام کو صرف زبانی بتلا دینے پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ اس معاملہ کے متعلق مفصل فرمان لکھوا کر حضرت فاروق اعظم اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہما کو سپرد فرمائے، [۲] جس سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور ہر نصاب میں سے مقدارِ زکوٰۃ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے واسطہ سے متعین کر کے بتلا دیئے ہیں، اس میں کسی زمانہ اور کسی ملک میں کسی کو کمی بیشی یا تغیر وتبدل کا کوئی حق نہیں۔

صدقہ، زکوٰۃ کی فرضیت صحیح یہ ہے کہ اوائلِ اسلام ہی میں مکہ مکرمہ کے اندر نازل ہو چکی تھی، جیسا کہ امام تفسیر ابن کثیرؒ نے سورۂ مزمل کی آیت وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (المزّمّل:۲۰) سے استدلال فرمایا ہے، [۳] کیونکہ یہ سورۃ بالکل ابتداءِ وحی کے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے، اس میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی ہے، البتہ روایاتِ حدیث سے ایسا معلوم

---

[۱] سنن ابی داوٗد، کتاب الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقۃ ... إلخ ج:۱ ص:۲۲۹، وسنن الدارقطنی رقم الحدیث:۲۰۸۶

[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے: سنن ابی داوٗد، کتاب الزکاۃ، باب فی زکاۃ السائمۃ ج:۱ ص:۲۱۸، وسنن الدارقطنی رقم الحدیث:۲۰۱۰

[۳] تفسیر ابن کثیر تحت سورۃ المزمل ج:۸ ص:۲۵۹

ہوتا ہے کہ ابتداءِ اسلام میں زکوٰۃ کے لئے کوئی خاص نصاب یا خاص مقدار مقرر نہ تھی، بلکہ جو کچھ ایک مسلمان کی اپنی ضرورتوں سے بچ رہے وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا تھا، نصابوں کا تعین اور مقدار زکوٰۃ کا بیان بعد از ہجرت مدینہ طیبہ میں ہوا ہے، اور پھر زکوٰۃ وصدقات کی وصول یابی کا نظام حکمانہ انداز کا تو فتح مکہ کے بعد عمل میں آیا ہے۔

اس آیت میں باجماع صحابہ وتابعین اسی صدقۂ واجبہ کے مصارف کا بیان ہے جو نماز کی طرح مسلمانوں پر فرض ہے، کیونکہ جو مصارف اس آیت میں متعین کئے گئے ہیں وہ صدقات فرض کے مصارف ہیں، نفلی صدقات میں روایات کی تصریحات کی بنا پر بہت وسعت ہے، وہ اُن آٹھ مصارف میں منحصر نہیں ہیں۔

اگرچہ اوپر کی آیات میں صدقات کا لفظ عام صدقات کے لئے استعمال ہوا ہے، جس میں واجب اور نفلی دونوں داخل ہیں، مگر اس آیت میں باجماعِ اُمت صدقاتِ فرض ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے، اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً بولا گیا ہے اور کوئی قرینہ نفلی صدقہ کا نہیں ہے تو وہاں صدقۂ فرض ہی مراد ہوتا ہے۔ [۱]

اس آیت کو لفظ اِنَّمَا سے شروع کیا گیا ہے، یہ لفظ حصر وانحصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس شروع ہی کے کلمہ نے بتلا دیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں تمام صدقاتِ واجبہ صرف انہیں میں خرچ ہونے چاہئیں، ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرفِ خیر میں صدقاتِ واجبہ صَرف نہیں ہو سکتے، جیسے جہاد کی تیاری یا بناءِ مسجد ومدارس یا دوسرے رفاہِ عام کے ادارے، یہ سب چیزیں بھی اگرچہ ضروری ہیں، اور ان میں خرچ کرنے کا بہت بڑا ثواب ہے، مگر صدقاتِ فرض جن کی مقداریں متعین کر دی گئی ہیں، ان کو ان میں نہیں لگایا جا سکتا۔

آیت کا دوسرا لفظ صَدَقَات، صدقہ کی جمع ہے، صدقہ لغت میں اس مال کے جزء کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لئے خرچ کیا جائے (قاموس) [۲] امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے قول وفعل میں صادق ہوں، اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہوں، [۳] اسی لئے جس صدقہ میں کوئی نام ونمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآنِ کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔

لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رُو سے عام ہے، نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے، فرض زکوٰۃ کو بھی، نفل کے لئے اس کا استعمال عام ہے ہی، فرض کے لئے بھی قرآنِ کریم میں بہت جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے، جیسے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبۃ: ۱۰۳) اور آیت زیرِ بحث اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ وغیرہ، بلکہ قرطبی کی تحقیق تو یہ ہے کہ قرآن میں جب مطلق لفظ صدقہ بولا

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۱۶۸ [۲] القاموس المحیط ج:۲ ص:۴۸۲

[۳] مفردات القرآن للأصفهانیؒ ج:۱ ص:۲۷۸

جاتا ہے تو اس سے صدقۂ فرض ہی مراد ہوتا ہے، اور روایاتِ حدیث میں لفظ صدقہ ہر نیک کام کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان سے خوش ہو کر ملنا بھی صدقہ ہے، کسی بوجھ اٹھانے والے کا بوجھ اُٹھوا دینا بھی صدقہ ہے، کنویں سے پانی کا ڈول اپنے لئے نکالا اس میں سے کسی دوسرے کو دے دینا بھی صدقہ ہے، [۱] اس حدیث میں لفظ صدقہ مجازی طور پر عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

تیسرا لفظ اس کے بعد لِلْفُقَرَآءِ سے شروع ہوا ہے، اس کے شروع میں حرف لام ہے جو تخصیص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے معنی جملہ کے یہ ہوں گے کہ تمام صدقات صرف انہی لوگوں کا حق ہے جن کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔

اب ان آٹھ مصارف کی تفصیل سنئے جو اس کے بعد مذکور ہیں:-

ان میں پہلا مصرف فقراء ہیں، دوسرا مساکین، فقیر اور مسکین کے اصلی معنی میں اگرچہ اختلاف ہے، ایک کے معنے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنی ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو، لیکن حکمِ زکوٰۃ میں دونوں یکساں ہیں، کوئی اختلاف نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اس کی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال نہ ہو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے، ضروریات میں رہنے کا مکان، استعمالی برتن اور کپڑے اور فرنیچر وغیرہ سب داخل ہیں، نصاب یعنی سونا ساڑھے سات تولہ یا چاندی ساڑھے باون تولہ یا اس کی قیمت جس کے پاس ہو اور وہ قرض دار بھی نہ ہو نہ اس کو زکوٰۃ لینا جائز ہے نہ دینا، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس کچھ چاندی یا کچھ پیسے نقد ہیں اور تھوڑا سا سونا ہے تو سب کی قیمت لگا کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ بھی صاحبِ نصاب ہے، اس کو زکوٰۃ دینا اور لینا جائز نہیں۔ اور جو شخص صاحبِ نصاب نہیں مگر تندرست، قوی اور کمانے کے قابل ہے اور ایک دن کا گزارہ اس کے پاس موجود ہے اس کو اگرچہ زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے، اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں، سوال کرنا ایسے لوگوں کے لئے حرام ہے، ایسا شخص جو کچھ سوال کر کے حاصل کرتا ہے اس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا انگارہ فرمایا ہے۔ [۲] (ابوداؤد بروایت علیؓ، قرطبی)

حاصل یہ ہے کہ فقیر اور مسکین میں زکوٰۃ کے باب میں کوئی فرق نہیں، البتہ وصیت کے حکم میں فرق پڑتا ہے کہ مساکین کے لئے وصیت کی ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، اور فقراء کے لئے ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، جس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں، فقیر اور مسکین کے دونوں مصرفوں میں یہ بات قدرِ مشترک ہے کہ جس کو مالِ زکوٰۃ دیا جائے وہ مسلمان ہو اور حاجاتِ اصلیہ سے زائد بقدرِ نصاب مال کا مالک نہ ہو۔

---

[۱] شعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث: ۹۲۸۴

[۲] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۳ ص:۳۴۶، وصحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب النهي عن المسئلة ج:۱ ص:۳۳۳

اگر چہ عام صدقات غیر مسلموں کو بھی دیئے جا سکتے ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تَصَدَّقُوْا عَلٰی اَھْلِ الْاَدْیَانِ کُلِّھَا [۱] "یعنی ہر مذہب والے پر صدقہ کرو" لیکن صدقۂ زکوٰۃ کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنے کے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مالِ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے، اور انہی کے فقراء پر صَرف کیا جائے [۲] اس لئے مالِ زکوٰۃ کو صرف مسلم فقراء ومساکین ہی پر صَرف کیا جا سکتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات یہاں تک کہ صدقۃ الفطر بھی غیر مسلم فقیر کو دینا جائز ہے۔ (ہدایہ) [۳]

اور دوسری شرط مالکِ نصاب نہ ہونے کی خود فقیر ومسکین کے معنی سے واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ یا تو اس کے پاس کچھ نہ ہوگا، یا کم از کم مالِ نصاب کی مقدار سے کم ہوگا، اس لئے فقیر اور مسکین دونوں اتنی بات میں مشترک ہیں کہ ان کے پاس بقدر نصاب مال موجود نہیں، ان دونوں مصرفوں کے بعد اور چھ مصارف کا بیان آیا ہے، ان میں پہلا مصرف عاملینِ صدقہ ہیں۔

تیسرا مصرف اَلْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا یہاں عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات زکوٰۃ وعشر وغیرہ لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں، یہ لوگ چونکہ اپنے تمام اوقات اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے مصارفِ زکوٰۃ میں ان کا حصہ رکھ کر یہ متعین کر دیا کہ ان کا حق الخدمت اسی مدِ زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

اس میں اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے کا فریضہ براہِ راست رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا ہے، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے آنے والی اس آیت میں ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَةً (التوبۃ: ۱۰۳) "یعنی وصول کریں آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ۔" اس آیت کا مفصل بیان تو آئندہ آئے گا، یہاں یہ بتلانا منظور ہے کہ اس آیت کی رُو سے مسلمانوں کے امیر پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ وصدقات وصول کرے، اور یہ ظاہر ہے کہ امیر خود اس کام کو پورے ملک میں بغیر اعوان اور مددگاروں کے نہیں کر سکتا، انہی اعوان اور مددگاروں کا ذکر مذکورالصدر آیت میں وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

انہی آیات کی تعمیل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام کو صدقات وصول کرنے کے لئے عامل بنا کر مختلف خطوں میں بھیجا ہے، اور آیتِ مذکورہ کی ہدایت کے موافق زکوٰۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث: ۱۰۳۹۸، ونصب الرایة ج:۴ ص:۲۸۶

[۲] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدعاء إلی الشھادتین إلخ ج:۱ ص:۳۶

[۳] الھدایة، کتاب الزکاة، فصل فی العروض ج:۱ ص:۱۱۲

حق الخدمت دیا ہے، ان میں وہ حضرات صحابہ بھی شامل ہیں جو اغنیاء تھے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مال دار کے لئے حلال نہیں، بجز پانچ شخصوں کے، ایک وہ شخص جو جہاد کے لئے نکلا ہے اور وہاں اس کے پاس بقدرِ ضرورت مال نہیں، اگر چہ گھر میں مال دار ہو، دوسرے عاملِ صدقہ جو صدقہ وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، تیسرے وہ شخص کہ اگر چہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجودہ مال سے زیادہ کا مقروض ہے، چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا مال کسی غریب مسکین سے پیسے دے کر خرید لے، پانچویں وہ شخص جس کو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کر دیا ہو۔ [1]

رہا یہ مسئلہ کہ عاملینِ صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کی محنت وعمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی۔ (اَحکام القرآن بصاص، قرطبی) [2]

البتہ یہ ضروری ہوگا کہ عاملین کی تنخواہیں نصف زکوٰۃ سے بڑھنے نہ پائیں، اگر زکوٰۃ کی وصول یابی اتنی کم ہو کہ عاملین کی تنخواہیں دے کر نصف بھی باقی نہیں رہتی تو پھر تنخواہوں میں کمی کی جائے گی، نصف سے زائد صَرف نہیں کیا جائے گا۔ (تفسیر مظہری، ظہیریہ) [3]

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ عاملینِ صدقہ کو جو رقم مدّ زکوٰۃ سے دی جاتی ہے وہ بحیثیت صدقہ نہیں بلکہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے، اسی لئے باوجود غنی اور مال دار ہونے کے بھی وہ اس رقم کے مستحق ہیں، اور زکوٰۃ سے اُن کو دینا جائز ہے، اور مصارف زکوٰۃ کی آٹھ مدات میں سے صرف ایک یہی مد ایسی ہے جس میں زکوٰۃ بطور معاوضۂ خدمت دی جاتی ہے، ورنہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضۂ خدمت کے دیا جائے، اور اگر کسی غریب فقیر کو کوئی خدمت لے کر مالِ زکوٰۃ دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

اسی لئے یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ مالِ زکوٰۃ کو معاوضۂ خدمت میں کیسے دیا گیا، دوسرے یہ کہ مال دار کے لئے یہ مالِ زکوٰۃ حلال کیسے ہوا، ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے، کہ عاملینِ صدقہ کی اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل مؤکل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لئے کسی کو وکیل مختار بنا دے، اور قرض دار یہ قرض وکیل کو سپرد کر دے تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی قرض دار بَری ہو جاتا ہے، تو جب رقم زکوٰۃ عاملینِ صدقہ نے فقراء کے وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کر لی تو ان کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے جن کی طرف سے بطور وکیل انہوں

---

[1] سنن ابی داوٗد، کتاب الزکاۃ، باب من یجوز له اخذ الصدقة ...إلخ ج:۱ ص:۲۳۱

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۱۷۷ واحکام القرآن للجصاصؒ، تفسیر سورۃ براءۃ، فصل فی وجوب الزکاۃ ج:۷ ص:۶۰

[3] التفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۲۳۴

نے وصول کی ہے اب جو رقم بطور حق الخدمت کے اُن کو دی جاتی ہے وہ مال داروں کی طرف سے نہیں بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی، اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضۂ خدمت دے دیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو وکیل مختار بنایا نہیں، یہ اُن کے وکیل کیسے بن گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جس کو امیر کہا جاتا ہے وہ قدرتی طور پر منجانب اللہ پورے ملک کے فقراء غرباء کا وکیل ہوتا ہے، کیونکہ ان سب کی ضروریات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے، امیرِ مملکت جس جس کو صدقات کی وصول یابی پر عامل بنا دے وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء کے وکیل ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ عاملینِ صدقہ کو جو کچھ دیا گیا وہ درحقیقت زکوٰۃ نہیں دی گئی، بلکہ زکوٰۃ جن فقراء کا حق ہے ان کی طرف سے معاوضۂ خدمت دیا گیا، جیسے کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنا دے اور اس کا حق الخدمت زکوٰۃ کے حاصل شدہ مال سے ادا کر دے، تو یہاں نہ تو دینے والا بطور زکوٰۃ کے دے رہا ہے اور نہ لینے والا زکوٰۃ کی حیثیت سے لے رہا ہے۔

فائدہ

تفصیلِ مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم، یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لئے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملینِ صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے، کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جا سکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جا سکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحابِ زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مالِ زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لئے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المؤمنین کی ولایت عامہ کی بناء پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لئے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحابِ زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔ [1]

---

[1] یہ حضرت مصنف قدس اللہ سرہٗ کی پہلی رائے تھی، بعد میں حضرتؒ نے اس سے رجوع فرمالیا تھا، جس کی مفصل تحقیق امداد المفتین (كتاب المتفرّقات، رسالہ إماطة التشكيك فی إناطة الزكوٰة بالتمليك ص: ۸۸۳ تا ۸۹۶) میں موجود ہے، جس میں بعض اکابر کے فتاویٰ کی روشنی میں اس کو صحیح قرار دیا گیا ہے کہ مہتممین فقراء کے بھی وکیل ہوتے ہیں اور ان کو زکوٰۃ حوالہ کرنے سے دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (محمد تقی عثمانی) ۱۳/ ۳/ ۱۴۳۴ھ

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کر کے اس کو سالہا سال رکھے رہتے ہیں، اور اصحابِ زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی رقم مصارفِ زکوٰۃ میں صَرف ہوجائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملینِ صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لئے جائز ہے نہ لینے والوں کے لئے۔

ایک اور سوال، عبادت پر اجرت

یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے اشارات اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ کسی عبادت پر اُجرت ومعاوضہ لینا حرام ہے، مسند احمد کی حدیث میں بروایت عبدالرحمٰن بن شبل منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِقْرَءُوا الْقُرْاٰنَ وَلَا تَاْكُلُوْا بِهٖ [۱] ''یعنی قرآن پڑھو، مگر اس کو کھانے کا ذریعہ نہ بناؤ''۔ اور بعض روایات میں اس معاوضہ کو قطعہ جہنم فرمایا ہے جو قرآن پر لیا جائے، [۲] اس کی بناء پر فقہاءِ اُمت کا اتفاق ہے کہ طاعات وعبادات پر اجرت لینا جائز نہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صدقات وصول کرنے کا کام ایک دینی خدمت اور عبادت ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک قسم کا جہاد فرمایا ہے، [۳] اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس پر بھی کوئی اجرت ومعاوضہ لینا حرام ہوتا، حالانکہ قرآن کریم کی اس آیت نے صراحۃً اس کو جائز قرار دیا، اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں اس کو داخل فرمایا۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا کہ جو عبادات فرض یا واجب عین ہیں اُن پر اجرت لینا مطلقاً حرام ہے، لیکن جو فرض کفایہ ہیں ان پر کوئی معاوضہ لینا اسی آیت کی رُو سے جائز ہے، [۴] فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام پوری اُمت یا پورے شہر کے ذمہ فرض کیا گیا ہے، مگر یہ لازم نہیں کہ سب ہی اس کو کریں، اگر بعض لوگ ادا کرلیں تو سب سبکدوش ہوجاتے ہیں، البتہ اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اسی آیت سے ثابت ہوا کہ امامت وخطابت کا معاوضہ لینا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی واجب علی العین نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہیں انتہی، [۵] اسی طرح تعلیم قرآن وحدیث اور دوسرے دینی علوم کا بھی یہی حال ہے، کہ یہ سب کام پوری اُمت کے ذمہ فرض کفایہ ہیں، اگر بعض لوگ کرلیں تو سب سبکدوش ہوجاتے ہیں، اس لئے اگر اس

---

[۱] مسند احمد رقم الحدیث: ۱۴۹۸۶ [۲] کنز العمال رقم الحدیث: ۲۸۶۸

[۳] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارة والفیء، باب فی السعایة علی الصدقة ج: ۲ ص: ۴۰۷

[۴] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج: ۸ ص: ۱۷۸ [۵] بحوالہ بالا۔

پر کوئی معاوضہ اور تنخواہ لی جائے تو وہ بھی جائز ہے۔

چوتھا مصرف مصارفِ زکوٰۃ میں سے مؤلّفۃ القلوب ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان کو صدقات دیئے جاتے تھے، عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں تین چار قسم کے لوگ شامل تھے، کچھ مسلمان کچھ غیر مسلم، پھر مسلمانوں میں بعض تو وہ لوگ تھے جو غریب حاجت مند بھی تھے، اور نو مسلم بھی، ان کی دل جوئی اس لئے کی جاتی تھی کہ اسلام پر پختہ ہو جائیں، اور بعض وہ تھے جو مال دار بھی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے، مگر ابھی تک ایمان کا رنگ ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا، اور بعض وہ لوگ تھے جو خود تو پکے مسلمان تھے مگر ان کی قوم کو ان کے ذریعہ ہدایت پر لانا اور پختہ کرنا مقصود تھا، اور غیر مسلموں میں بھی کچھ وہ لوگ تھے جن کے شر سے بچنے کے لئے ان کی دل جوئی کی جاتی تھی، اور بعض وہ تھے جن کے بارے میں یہ تجربہ تھا کہ نہ تبلیغ و تعلیم سے اثر پذیر ہوتے ہیں، نہ جنگ و تشدد سے، بلکہ احسان و حسن سلوک سے متأثر ہوتے ہیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ چاہتے تھے کہ خلقِ خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نورِ ایمان میں لے آئیں، اس کے لئے ہر وہ جائز تدبیر کرتے تھے جس سے یہ لوگ متأثر ہو سکیں، یہ سب قسمیں عام طور پر "مؤلّفة القلوب" میں داخل سمجھی جاتی ہیں، جن کو صدقات کا چوتھا مصرف اس آیت میں قرار دیا ہے۔

چوتھا مصرف مؤلَّفۃالقلوب ہیں، ان کے متعلق گزشتہ صفحات میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان کو صدقات سے حصہ دیا جاتا تھا، عام خیال کے مطابق ان میں مسلم و غیر مسلم دونوں طرح کے لوگ تھے، غیر مسلموں کی دل جوئی اسلام کی ترغیب کے لئے اور نو مسلموں کی دل جوئی اسلام پر پختہ کرنے کے لئے کی جاتی تھی، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ان کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص علّت اور مصلحت کے لئے جس کا ذکر ابھی آچکا ہے، صدقات دیئے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جبکہ اسلام کو مادی قوت بھی حاصل ہوگئی اور کفار کے شر سے بچنے یا نو مسلموں کو اسلام پر پختہ کرنے کے لئے اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی تو وہ علّت اور مصلحت ختم ہوگئی، اس لئے ان کا حصہ بھی ختم ہو گیا، جس کو بعض فقہاء نے منسوخ ہو جانے سے تعبیر فرمایا ہے، فاروق اعظمؓ حسن بصریؒ، شعبیؒ، ابو حنیفہؒ، مالکؒ بن انس کی طرف یہی قول منسوب ہے۔

اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ مؤلَّفۃالقلوب کا حصہ منسوخ نہیں، بلکہ صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ کے زمانہ میں اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے ان کا حصہ ساقط کر دیا گیا، آئندہ کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آجائے تو پھر دیا جا سکتا ہے، امام زہریؒ، قاضی عبد الوہابؒ، ابن عربی، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی مذہب ہے، لیکن تحقیق اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو صدقات وغیرہ سے کسی وقت کسی زمانہ میں حصہ نہیں دیا گیا، اور نہ وہ مؤلَّفۃالقلوب میں داخل ہیں، جن کا ذکر مصارفِ صدقات میں آیا ہے۔

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں جن کی دل جوئی کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدّ صدقات سے حصہ دیا ہے، اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا ہے: وَبِالْجُمْلَةِ فَكُلُّهُمْ مُؤْمِنٌ وَلَمْ يَكُنْ فِيهِمْ كَافِرٌ، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ مؤلّفۃ القلوب سب کے سب مسلمان ہی تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔[۱]

اسی طرح تفسیر مظہری میں ہے: لَمْ يَثْبُتْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى اَحَدًا مِنَ الْكُفَّارِ لِلْاِيْلَافِ شَيْئًا مِنَ الزَّكٰوةِ، ”یعنی یہ بات کسی روایت سے ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کو مالِ زکوٰۃ میں سے اس کی دلجوئی کے لئے حصہ دیا ہو،[۲] اس کی تائید تفسیر کشاف کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصارفِ صدقات کا بیان یہاں ان کفار و منافقین کے جواب میں آیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تقسیم صدقات کے بارے میں اعتراض کیا کرتے تھے کہ ہم کو صدقات نہیں دیتے، اس آیت میں مصارف صدقات کی تفصیل بیان فرمانے سے مقصد یہ ہے کہ ان کو بتلا دیا جائے کہ کافر کا کوئی حق مالِ صدقات میں نہیں ہے،[۳] اگر مؤلّفۃ القلوب میں کافر بھی داخل ہوں تو اس جواب کی ضرورت نہ تھی۔

تفسیر مظہری میں اس مغالطہ کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے جو بعض روایاتِ حدیث کے سبب لوگوں کو پیش آیا ہے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غیر مسلموں کو کچھ عطیات دیئے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم اور ترمذی کی روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن اُمیہ کو کافر ہونے کے زمانے میں کچھ عطیات دیئے،[۴] اس کے متعلق امام نوویؒ کے حوالہ سے تحریر فرمایا کہ یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، بلکہ غزوۂ حنین کے مالِ غنیمت کا جو خمس بیت المال میں داخل ہوا اس میں سے دیئے گئے، اور یہ ظاہر ہے کہ بیت المال کی اس مد سے مسلم وغیر مسلم دونوں پر خرچ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے، پھر فرمایا کہ امام بیہقیؒ، ابن سیّد الناسؒ، امام ابن کثیرؒ وغیرہم سب نے یہی قرار دیا ہے کہ یہ عطاء مالِ زکوٰۃ سے نہیں، بلکہ خمسِ غنیمت سے تھی۔[۵]

ایک عظیم فائدہ

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اموال صدقات اگرچہ بیت المال میں جمع کئے جاتے تھے مگر ان کا حساب بالکل جدا تھا، اور بیت المال کی دوسری مدّات جیسے خمسِ غنیمت یا خمس معادن وغیرہ

---

۱ تفسیر القرطبی تحت هذه الآيات ج:۸ ص:۱۷۸ تا ۱۸۱　۲ التفسير المظهری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۳۵۔

۳ الكشاف تحت هذه الآية ج:۲ ص:۴۳۸

۴ صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فی سخاوته صلى الله عليه وسلم إلخ ج:۱ ص:۲۵۳، وجامع الترمذی، ابواب الزكاة، باب ما جاء فی اعطائه ...إلخ ج:۱ ص:۱۴۴　۵ التفسير المظهری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۳۵، ۲۳۶

ان کا حساب جدا، اور ہر ایک کے مصارف جدا تھے، جیسا کہ حضرات فقہاء نے تصریح فرمائی ہے، کہ اسلامی حکومت کے بیت المال میں چار مد علیحدہ علیحدہ رہنی چاہئیں، اور اصل حکم یہ ہے کہ صرف حساب علیحدہ رکھنا نہیں بلکہ ہر ایک مد کا بیت المال الگ ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک کو اس کے مصرف میں خرچ کرنے کی پوری احتیاط قائم رہے، البتہ اگر کسی وقت کسی خاص مد میں کمی ہو تو دوسری مد سے بطور قرض لے کر اس پر خرچ کیا جاسکتا ہے یہ مدات بیت المال یہ ہیں:-

اوّل خمس غنائم: یعنی جو مال کفار سے بذریعہ جنگ حاصل ہو اس کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر کے باقی پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، اور خمس معادن یعنی مختلف قسم کی کانوں سے نکلنے والی اشیاء میں سے پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، خمس رکاز، یعنی جو قدیم خزانہ کسی زمین سے برآمد ہو اس کا بھی پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، یہ تینوں قسم کے خمس بیت المال کی ایک ہی مد میں داخل ہیں۔

دوسری مد صدقات ہیں، جس میں مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، اور ان کی زمینوں کا عشر داخل ہے۔

تیسری مد خراج اور مال فئی ہے، جس میں غیر مسلموں کی زمینوں سے حاصل شدہ خراج اور ان کا جزیہ اور ان سے حاصل شدہ تجارتی ٹیکس اور وہ تمام اموال داخل ہیں جو غیر مسلموں سے ان کی رضامندی کے ساتھ مصالحانہ طور پر حاصل ہوں۔

چوتھی مد ضوائع کی ہے، جس میں لاوارث مال، لاوارث شخص کی میراث وغیرہ داخل ہیں، ان چار مدّات کے مصارف اگرچہ الگ الگ ہیں، لیکن فقراء و مساکین کا حق ان چاروں مدّات میں رکھا گیا ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت میں قوم کے اس ضعیف عنصر کو قوی کرنے کا کس قدر اہتمام کیا گیا ہے، جو درحقیقت اسلامی حکومت کا طغرئ امتیاز ہے، ورنہ دنیا کے عام نظاموں میں ایک مخصوص طبقہ ہی بڑھتا رہتا ہے، غریب کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا، جس کے رَدِّعمل نے اشتراکیت اور کمیونزم کو جنم دیا، مگر وہ بالکل ایک غیر فطری اصول اور بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہو جانے کے مرادف اور انسانی اخلاق کے لئے سمِ قاتل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں چار بیت المال چار مدّات کے لئے الگ الگ مقرر ہیں اور فقراء و مساکین کا حق چاروں میں رکھا گیا ہے، ان میں سے پہلی تین مدّوں کے مصارف خود قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ متعین فرما کر واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں، پہلی مد یعنی صدقات کے مصارف کا بیان سورۂ توبہ کی مذکور الصدر ساٹھویں آیات میں آیا ہے، جس کی تفصیل اس وقت زیر بحث ہے، اور تیسری مد جس کو اصطلاح میں مالِ فئی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا بیان سورۂ حشر میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اسلامی حکومت کی اکثر مدّات فوجی اخراجات اور عمالِ حکومت کی تنخواہیں وغیرہ اسی مد سے خرچ کی جاتی ہیں، چوتھی مد یعنی لاوارث مال رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اپاہج

محتاجوں اور لاوارث بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ (شامی، کتاب الزکوٰۃ) [۱]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرات فقہاء نے بیت المال کی چاروں مدّات بالکل الگ الگ رکھنے اور اپنے اپنے معینہ مصارف میں خرچ کرنے کی جو ہدایات دی ہیں، یہ سب قرآنی ارشادات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پھر خلفائے راشدین کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہیں۔

اس ضمنی فائدہ کے بعد پھر اصل مسئلہ مؤلفۃ القلوب کو سمجھئے کہ مذکور الصدر بیان میں محققین، محدثین وفقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ کسی کافر کو کسی وقت بھی نہیں دیا گیا، نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور نہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں، اور جن غیر مسلموں کو دینا ثابت ہے وہ مد صدقات وزکوٰۃ سے نہیں بلکہ خمسِ غنیمت میں سے دیا گیا ہے، جس میں سے ہر حاجت مند مسلم وغیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے، تو مؤلفۃ القلوب صرف مسلم رہ گئے، اور ان میں جو فقراء ہیں ان کا حصہ بدستور باقی ہونے پر پوری اُمت کا اتفاق ہے، اختلاف صرف اس صورت میں رہ گیا کہ یہ لوگ غنی صاحبِ نصاب ہوں تو امام شافعیؒ امام احمدؒ کے نزدیک چونکہ تمام مصارفِ زکوٰۃ میں فقر وحاجت مندی شرط نہیں، اس لئے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحبِ نصاب ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک عاملینِ صدقہ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر وحاجت مندی شرط ہے، اس لئے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو اسی شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ وہ فقیر وحاجت مند ہوں، جیسے غارمین اور رقاب، ابن سبیل وغیرہ سب میں اسی شرط کے ساتھ ان کو زکوٰۃ دی جاتی ہے کہ وہ اس جگہ حاجت مند ہوں، گو وہ اپنے مقام میں مال دار ہوں۔

اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤلَّفة القلوب کا حصہ ائمہ اربعہ کے نزدیک منسوخ نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض حضرات نے فقراء ومساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں فقر وحاجت مندی کے ساتھ مشروط نہیں کیا، اور بعض نے یہ شرط کی ہے، جن حضرات نے یہ شرط رکھی ہے وہ مؤلَّفة القلوب میں بھی صرف انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو حاجت مند اور غریب ہوں، بہر حال یہ حصہ قائم اور باقی ہے۔ (تفسیر مظہری) [۲]

یہاں تک صدقات کے آٹھ مصارف میں سے چار کا بیان آیا ہے، ان چاروں کا حق حرف لام کے تحت بیان ہوا، لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ آگے جن چار مصارف کا ذکر ہے ان میں عنوان بدل کر لام کی جگہ حرف فِيْ استعمال فرمایا وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ زمخشری نے کشاف میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ آخری

---

[۱] الشامية، كتاب الزكاة، باب قبيل المصرف، مطلب فى بيان بيوت المال ومصارفها ج:۳ ص:۳۳۲

[۲] التفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۳۵

چار مصارف بہ نسبت پہلے چار کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ حرف فِيْ ظرفیت کے لئے بولا جاتا ہے، جس کی وجہ سے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ صدقات کو ان لوگوں کے اندر رکھ دینا چاہئے، اور ان کے زیادہ مستحق ہونے کی وجہ ان کا زیادہ ضرورت مند ہونا ہے، کیونکہ جو شخص کسی کا مملوک غلام ہے وہ بہ نسبت عام فقراء کے زیادہ تکلیف میں ہے، اسی طرح جو کسی کا قرض دار ہے اور قرض خواہوں کا اس پر تقاضا ہے وہ عام غربا فقراء سے زیادہ تنگی میں ہے کہ اپنے اخراجات کے فکر سے بھی زیادہ قرض داروں کے قرض کی فکر اس کے ذمہ ہے۔

ان باقی ماندہ چار مصارف میں سب سے پہلے وَفِي الرِّقَابِ کا ذکر فرمایا ہے، رقاب رَقَبَۃ کی جمع ہے، اصل میں گردن کو رَقَبَہ کہتے ہیں، عرف میں اس شخص کو رَقَبَہ کہہ دیا جاتا ہے جس کی گردن کسی دوسرے کی غلامی میں مقید ہو۔

اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ رقاب سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟ جمہور فقہاء و محدثین اس پر ہیں کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جن کے آقاؤں نے کوئی مقدار مال کی متعین کر کے کہہ دیا ہے کہ اتنا مال کما کر ہمیں دے دو تو تم آزاد ہو جس کو قرآن وسنت کی اصطلاح میں مُکَاتَبْ کہا جاتا ہے، ایسے شخص کو آقا اس کی اجازت دے دیتا ہے کہ وہ تجارت یا مزدوری کے ذریعہ مال کمائے، اور آقا کو لاکر دے، آیتِ مذکورہ میں رقاب سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کو رقم زکوٰۃ میں سے حصہ دے کر اس کی گلوخلاصی میں امداد کی جائے۔

یہ قسم غلاموں کی باتفاق مفسرین وفقہاء لفظ وَفِي الرِّقَابِ کی مراد ہے، کہ رقمِ زکوٰۃ ان کو دے کر ان کی گلوخلاصی میں امداد کی جائے، ان کے علاوہ دوسرے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا یا ان کے آقاؤں کو رقمِ زکوٰۃ دے کر یہ معاہدہ کر لینا کہ وہ ان کو آزاد کر دیں گے، اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے، جمہور ائمہ ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ اس کو جائز نہیں سمجھتے، اور حضرت امام مالکؒ بھی ایک روایت میں جمہور کے ساتھ متفق ہیں کہ فِي الرِّقَابِ کو صرف مکاتب غلاموں کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں، اور ایک روایت میں امام مالکؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ فِي الرِّقَابِ میں عام غلاموں کو داخل کر کے اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ رقمِ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں۔ (احکام القرآن ابن عربی مالکی)[1]

جمہور ائمہ وفقہاء جو اس کو جائز نہیں رکھتے، ان کے پیش نظر ایک فقہی اشکال ہے کہ اگر رقمِ زکوٰۃ سے غلام کو خرید کر آزاد کیا گیا تو اس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہیں آتی، کیونکہ صدقہ وہ مال ہے جو کسی مستحق کو بلا معاوضہ دیا جائے، رقمِ زکوٰۃ اگر آقا کو دی جائے تو ظاہر ہے کہ نہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے اور نہ اس کو یہ رقم بلا معاوضہ دی جارہی ہے، اور غلام جو مستحقِ زکوٰۃ ہے اس کو یہ رقم دی نہیں گئی، یہ الگ بات ہے کہ اس رقم کے دینے کا فائدہ غلام کو پہنچ گیا کہ اس نے خرید کر آزاد کر دیا، مگر آزاد کرنا صدقہ کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا، اور حقیقی معنی کو بلا وجہ چھوڑ کر صدقہ کے مجازی معنی یعنی عام مراد لینے

---

۱ احکام القرآن لابن العربیؒ تفسیر سورۃ التوبۃ ج: ۲ ص: ۳۳۱

کا بلاضرورت کوئی جواز نہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ میں مصارف صدقات کے بیان کئے جارہے ہیں، اس لئے فِي الرِّقَابِ کا مصداق کوئی ایسی چیز نہیں بن سکتی جس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہ آئے، اور اگر یہ رقم زکوٰۃ خود غلام کو دی جائے تو غلام کی کوئی مِلک نہیں ہوتی وہ خود بخود آقا کا مال بن جائے گا، پھر آزاد کرنا نہ کرنا بھی اس کے اختیار میں رہے گا۔

اس فقہی اشکال کی وجہ سے جمہور ائمہ اور فقہاء نے فرمایا کہ فِي الرِّقَابِ سے مراد صرف غلام مکاتَب ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صدقہ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ کسی مستحق کو مالک بنا کر اس کے قبضہ میں دے دیا جائے جب تک مستحق کا مالکانہ قبضہ اس پر نہیں ہوگا زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

چھٹا مصرف اَلْغٰرِمِيْنَ، غارم کی جمع ہے، جس کے معنی مدیون یعنی قرض دار کے ہیں یہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ پانچواں اور چھٹا مصرف جو حرف فِيْ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے استحقاق میں پہلے چاروں مصارف سے زیادہ ہیں، اس لئے غلام کی گلوخلاصی کے لئے یا قرض دار کو اَدائے قرض کے لئے دینا عام فقراء و مساکین کو دینے سے زیادہ افضل ہے، شرط یہ ہے کہ اس قرض دار کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ قرض ادا کر سکے، کیونکہ غارم لغت میں ایسے ہی قرض دار کو کہا جاتا ہے، اور بعض ائمہ فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ یہ قرض اس نے کسی ناجائز کام کے لئے نہ لیا ہو، اور اگر کسی گناہ کے لئے قرض کرلیا جیسے شراب وغیرہ یا شادی غمی کی ناجائز رسمیں وغیرہ تو ایسے قرض دار کو مدز کوٰۃ سے نہ دیا جائے گا، تاکہ اس کی معصیت اور اسراف بے جا کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

ساتواں مصرف فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ہے، یہاں پھر حرف فِيْ کا اعادہ کیا گیا۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ مصرف پہلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے،[1] وجہ یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک تو غریب مفلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیونکہ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لئے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں، اسی لئے مالِ زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی، اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کے لئے لیتے ہیں۔ (روح بحوالہ مظہری)[2]

اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں داخل ہے، بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے،[3] جیسے

[1] تفسیر الکشاف تحت هذه الآية ج:۲ ص:۴۳۸ [2] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۷ ص:۱۲۱

[3] بدائع الصنائع، کتاب الزکاة، فصل واما الذی یرجع الی المودی الیه الخ ج:۲ ص:۴۵

دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کے لئے نشر و اشاعت، کہ اگر کوئی مستحقِ زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مالِ زکوٰۃ سے کردی جائے مگر مالدار صاحبِ نصاب کو نہیں دیا جاسکتا۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کی تفسیریں مذکور ہیں فقر و حاجت مندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحبِ نصاب کا اس مد میں بھی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کرسکتا ہو، جو جہاد یا حج کے لئے درپیش ہے، تو اگرچہ بقدر نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے، مگر وہ بھی اس اعتبار سے فقیر و حاجت مند ہی ہوگیا، کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لئے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں، فتح القدیر میں شیخ ابن ہمامؒ نے فرمایا کہ آیت صدقات میں جتنے مصرف ذکر کئے گئے ہیں ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقر و حاجت مندی کی بناء پر مستحق ہیں،[1] لفظ فقیر، مسکین میں تو یہ ظاہر ہی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روائی کی بناء پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عاملین کو بطور معاوضۂ خدمت دیا جاتا ہے، اسی لئے اس میں غنی و فقیر برابر ہیں، جیسے غارمین کے مصرف میں بیان کیا جاچکا ہے کہ جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، کیونکہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

تنبیہ

لفظ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے لفظی معنی بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضاجوئی کے لئے کئے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور ائمۂ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کردیا جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفاخانوں، مسافرخانوں وغیرہ کی تعمیر، کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا، اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات ان سب کو انہوں نے فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں داخل کر کے مصرفِ زکوٰۃ قرار دے دیا، جو سراسر غلط ہے، اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے، صحابہ کرامؓ جنہوں نے قرآن کو براہِ راست رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمۂ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر، کتاب الزکاۃ، باب من یجوز دفع الصدقة إلیه ومن لا یجوز ج:۲ ص:۲۶۱ تا ۲۶۴

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو۔ (مبسوط سرخسی ج:۳ ص:۱۰)

امام ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ، قرآن کی تفسیر روایات حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ ''فِیْ سَبِیْلِ اللہِ'' کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لئے مخصوص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو،[۱] اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و حاجت مند ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و حاجت مند تو خود ہی مصارفِ زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحقِ زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ اور فقہاءِ اُمت میں سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ رفاہِ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارفِ زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مالِ زکوٰۃ اِن چیزوں میں صَرف کرنا جائز نہیں، فقہاء حنفیہ میں سے شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط[۲] اور شرح سیر[۳] میں اور فقہاء شافعیہ میں ابوعبیدؒ نے کتابُ الاموال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے دردیرؒ نے شرح مختصر خلیل[۴] میں اور فقہاء حنابلہ میں سے موفقؒ نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔

ائمۂ تفسیر اور فقہاءِ اُمت کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے تو اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات و عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارفِ صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصارف متعین فرما دیئے۔[۵]

تو اگر فِیْ سَبِیْلِ اللہِ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جا سکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشادِ نبوی بالکل غلط ٹھہرتا ہے، معلوم ہوا کہ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ مراد وہ ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے۔

آٹھواں مصرف ابن السبیل ہے، سبیل کے معنی راستہ، اور ابن کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لئے بولا جاتا ہے،

---

[۱] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر الطبری رقم الحدیث:۱۶۸۶۱ تا ۱۶۸۷۸ وتفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۶۹

[۲] مبسوط ج:۲ ص:۲۰۲　[۳] شرح سیر ج:۴ ص:۲۴۴　[۴] شرح مختصر الخلیل ج:۱ ص:۱۶۱

[۵] سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقۃ إلخ ج:۱ ص:۲۲۹

لیکن عربی محاورات میں اِبن اور اَبْ اور اَخ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جن کا گہرا تعلق کسی سے ہو، اسی محاورہ کے مطابق ابن السبیل، راہ گیر و مسافر کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کا گہرا تعلق راستہ قطع کرنے اور منزلِ مقصود پر پہنچنے سے ہے، اور مصارفِ زکوٰۃ میں اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس سفر میں بقدرِ ضرورت مال نہ ہو، اگرچہ اس کے وطن میں اس کے پاس کتنا ہی مال ہو، ایسے مسافر کو مالِ زکوٰۃ دیا جاسکتا ہے، جس سے وہ اپنے سفر کی ضروریات پوری کرلے، اور وطن واپس جاسکے۔

یہاں تک اُن آٹھ مصارف کا بیان پورا ہوگیا جو آیتِ مذکورہ میں صدقات و زکوٰۃ کے لئے بیان فرمائے گئے ہیں، اب کچھ ایسے مسائل بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق ان تمام مصارف سے یکساں ہے۔

مسئلۂ تملیک

جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مالِ زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کردیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاءِ اُمت اس پر متفق ہیں کہ رقمِ زکوٰۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صَرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرفِ زکوٰۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوٰۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقمِ زکوٰۃ صَرف ہوسکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دَوا حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقمِ زکوٰۃ میں محسوب ہوسکتی ہے، اسی طرح فقہاءِ اُمت کی تصریحات ہیں کہ لاوارث میّت کا کفن رقمِ زکوٰۃ نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ میّت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ رقمِ زکوٰۃ کسی غریب مستحق کو دیدی جائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میّت کے کفن پر خرچ کردے، اسی طرح اگر اس میّت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو رقمِ زکوٰۃ سے براہِ راست ادا نہیں کیا جاسکتا، ہاں اس کے وارث غریب مستحقِ زکوٰۃ ہوں، تو ان کو مالکانہ طور سے دیا جاسکتا ہے، وہ اس رقم کے مالک ہوکر اپنی رضامندی کے ساتھ اس رقم سے میّت کا قرض ادا کرسکتے ہیں، اسی طرح رفاہِ عام کے سب کام جیسے کنواں یا پُل یا سڑک وغیرہ کی تعمیر، اگرچہ ان کا فائدہ مستحقینِ زکوٰۃ کو بھی پہنچتا ہے، مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

ان مسائل میں چاروں ائمۂ مجتہدین ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور جمہور فقہاء اُمت متفق ہیں، شمس الائمہ سرخسیؒ نے اس مسئلہ کو امام محمدؒ کی کتابوں کی شرح مبسوط اور شرح سیر میں پوری تحقیق اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، [۱] اور فقہاء شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ کی عام کتابوں میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

فقیہ شافعی امام ابوعبیدؒ نے کتاب الاموال میں فرمایا کہ میّت کی طرف سے اس کے قرض کی ادائیگی یا اس کے دفن کے اخراجات میں اور مساجد کی تعمیر میں، نہر کھودنے وغیرہ میں مالِ زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، کیونکہ سفیان ثوریؒ اور تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ اس میں خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اُن آٹھ مصارف میں سے نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

اسی طرح فقیہ حنبلی موفقؒ نے مغنی میں لکھا ہے کہ بجز اُن مصارف کے جن کا بیان قرآن کریم میں مذکور ہے اور کسی نیک کام میں مالِ زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں جیسے مساجد یا پلوں اور پانی کی سبیلوں کی تعمیر، یا سڑکوں کی درستی یا مُردوں کو کفن دینا یا مہمانوں کو کھانا کھلانا وغیرہ جو بلاشبہ موجب ثواب ہیں، مگر مصارفِ صدقات میں داخل نہیں۔ [۲]

ملکُ العلماء نے بدائع میں ادائیگی زکوٰۃ کے لئے شرط تملیک کی یہ دلیل دی ہے کہ قرآن میں عموماً زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا لفظ اِیْتَاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (الحج:۴۱)، وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرۃ:۴۳)، وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ (الانبیاء:۷۳)، وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام:۱۴۱) وغیرہ [۳] اور لفظ اِیْتَاء لغت میں عطاء کرنے کے معنی میں آتا ہے، امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا وَالْاِيْتَاءُ الْاِعْطَاءُ وَخُصَّ وَضْعُ الصَّدَقَةِ فِي الْقُرْاٰنِ بِالْاِيْتَاءِ، "یعنی ایتاء کے معنی عطاء فرمانے کے ہیں، اور قرآن میں صدقہ واجبہ اداء کرنے کو ایتاء کے لفظ کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔" [۴] اور ظاہر ہے کہ کسی کو کوئی چیز عطاء کرنے کا مفہوم حقیقی یہی ہے کہ اس کو اس چیز کا مالک بنادیا جائے۔

اور علاوہ زکوٰۃ وصدقات کے بھی لفظ ایتاء قرآن کریم میں مالک بنادینے ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، مثلاً وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ (النساء:۴) یعنی دے دو عورتوں کو ان کے مہر، ظاہر ہے مہر کی ادائیگی جب ہی تسلیم ہوتی ہے جب رقم مہر پر عورت کو مالکانہ قبضہ دیدے۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں زکوٰۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور صدقہ کے

---

[۱] مبسوط للإمام سرخسیؒ، کتاب الزکاة، ج:۳ ص:۳۲۷

[۲] المغنی، کتاب الزکاة، مسئالة وفصل تحدید مصرف الزکاة إلخ ج:۲ ص:۵۲۵

[۳] بدائع الصنائع، کتاب الکفارات، فصل وأما شرائط جواز کل نوع إلخ ج:۵ ص:۱۰۱

[۴] مفردات القرآن للأصفهانیؒ ج:۱۰ ص:۹

معنی حقیقی یہی ہیں کہ کسی فقیر حاجت مند کو اس کا مالک بنادیا جائے۔

کسی کو کھانا کھلا دینا یا رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کر دینا حقیقی معنی کے اعتبار سے صدقہ نہیں کہلاتا، شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں فرمایا کہ حقیقت صدقہ کی بھی یہی ہے کہ کسی فقیر کو اس مال کا مالک بنادیا جائے [۱] اسی طرح امام جصاص نے اَحکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ صدقہ تملیک کا نام ہے۔ (جصاص ج:۲ ص:۱۵۲)

ادائے زکوٰۃ کے متعلق بعض اہم مسائل

مسئلہ:- صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو صدقات وصول کرنے کے بارے میں یہ ہدایت دی تھی کہ خُذْهَا مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَرُدَّهَا فِيْ فُقَرَائِهِم، یعنی صدقات مسلمانوں کے اغنیاء سے لے کر انہی کے فقراء میں صَرف کردو، [۲] اس کی بناء پر فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ بلاضرورت ایک شہر یا بستی کی زکوٰۃ دوسرے شہر یا بستی میں نہ بھیجی جائے، بلکہ اسی شہر اور بستی کے فقراء اس کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اگر کسی شخص کے عزیز قریب غریب ہیں اور وہ کسی دوسرے شہر میں ہیں تو اپنی زکوٰۃ ان کو بھیج سکتا ہے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں دوہرے اجر وثواب کی بشارت دی ہے۔ [۳]

اسی طرح اگر کسی دوسری بستی کے لوگوں کا فقر وفاقہ اور اپنے شہر سے زیادہ ضرورت معلوم ہو تو بھی وہاں بھیجا جاسکتا ہے، کیونکہ مقصد صدقات دینے کا فقراء کی حاجت کو رفع کرنا ہے، اسی وجہ سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن کے صدقات میں اکثر کپڑے لیا کرتے تھے تاکہ فقراء مہاجرین کے لئے مدینہ طیبہ بھیج دیں۔ (قرطبی بحوالۂ دارقطنی) [۴]

اگر ایک شخص خود کسی شہر میں رہتا ہے، مگر اُس کا مال دوسرے شہر میں ہے تو جس شہر میں خود رہتا ہے اس کا اعتبار ہوگا، کیونکہ اداءِ زکوٰۃ کا مخاطب یہی شخص ہے۔ (قرطبی) [۵]

مسئلہ:- جس مال کی زکوٰۃ واجب ہے اس کی ادائیگی کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اسی مال کا چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو دیدے، جیسے تجارتی کپڑا، برتن، فرنیچر وغیرہ اور یہ بھی ہے کہ مقدارِ زکوٰۃ مال کی قیمت نکال کر وہ مستحقین میں تقسیم کرے، احادیث صحیحہ سے ایسا کرنا ثابت ہے (قرطبی)۔ [۶] اور بعض ائمۂ فقہاء نے فرمایا کہ اس زمانہ میں نقد قیمت ہی دینا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ فقراء کی ضرورتیں مختلف اور کثیر ہیں، نقد پیسوں کو کسی بھی ضرورت کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔

---

[۱] فتح القدیر، کتاب الزکاۃ، باب من یجوز دفع الصدقة ج:۴ ص:۱۹۵

[۲] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشهادتین ج:۱ ص:۳۶ [۳] السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۹۲۰۲

[۴] سنن الدارقطنی رقم الحدیث:۱۹۵۳، وتفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۱۷۵

[۵] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیات ج:۸ ص:۱۷۶ [۶] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیات ج:۸ ص:۱۷۵

مسئلہ:- اگر اپنے عزیز غریب لوگ مستحقِ زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ وصدقات دینا زیادہ بہتر اور دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا دوسرا صلۂ رحمی کا، اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو یہ جتلا کر دے کہ صدقہ یا زکوٰۃ دے رہا ہوں، کسی تحفہ یا ہدیہ کے عنوان سے بھی دیا جا سکتا ہے، تا کہ لینے والے شریف آدمی کو اپنی خفت محسوس نہ ہو۔

مسئلہ:- جو شخص اپنے آپ کو اپنے قول یا عمل سے مستحقِ زکوٰۃ حاجت مند ظاہر کرے اور صدقات وغیرہ کا سوال کرے، کیا دینے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے حقیقی حالات کی تحقیق کریں، اور بغیر اس کے صدقہ نہ دیں، اس کے متعلق روایاتِ حدیث اور اقوالِ فقہاء یہ ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے ظاہری حال سے اگر یہ گمان غالب ہو کہ یہ شخص حقیقت میں فقیر حاجت مند ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ نہایت شکستہ حال آئے، آپ نے ان کے لئے لوگوں سے صدقات جمع کرنے کے لئے فرمایا کافی مقدار جمع ہوگئی تو وہ ان کو دے دی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان لوگوں کے اندرونی حالات کی تحقیق فرماتے۔ (قرطبی) [1]

البتہ قرطبی نے اَحکام القرآن میں فرمایا کہ مصارف صدقات میں سے ایک مدیون بھی ہے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے ذمہ اتنا قرض ہے اس کی ادائیگی کے لئے مجھے زکوٰۃ کی رقم دے دی جائے تو اس قرض کا ثبوت اس سے طلب کرنا چاہئے (قرطبی)۔ [2] اور ظاہر یہ ہے کہ غارم، فی سبیل اللہ، ابن السبیل وغیرہ میں بھی ایسی تحقیق کر لینا دشوار نہیں، ان مصارف میں حسبِ موقع تحقیق کر لینا چاہئے۔

مسئلہ:- مال زکوٰۃ اپنے عزیز رشتہ داروں کو دینا زیادہ ثواب ہے، مگر میاں بی بی اور والدین و اولاد آپس میں ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے، وجہ یہ ہے کہ ان کو دینا ایک حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھنا ہے، کیونکہ ان لوگوں کے مصارف عموماً مشترک ہوتے ہیں، شوہر نے اگر بیوی کو یا بیوی نے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دے دی، تو درحقیقت وہ اپنے ہی استعمال میں رہی، اسی طرح والدین اور اولاد کا معاملہ ہے، اولاد کی اولاد اور دادا پردادا کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ:- اگر کسی شخص نے کسی شخص کو اپنے گمان کے مطابق مستحق اور مصرفِ زکوٰۃ سمجھ کر زکوٰۃ دے دی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسی کا غلام یا کافر تھا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، دوبارہ دینی چاہئے کیونکہ غلام کی ملکیت تو آقا ہی کی ملکیت ہوتی ہے، وہ اس کی مِلک سے نکلا ہی نہیں، اس لئے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اور کافر زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے۔

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیات ج:۸ ص:۱۸۷ [2] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

اس کے علاوہ اگر بعد میں یہ ثابت ہو کہ جس کو زکوٰۃ دی گئی ہے وہ مال دار یا سیّد ہاشمی یا اپنا باپ یا بیٹا یا بیوی یا شوہر ہے تو زکوٰۃ کے اعادہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ رقمِ زکوٰۃ اس کی مِلک سے نکل کر محلِ ثواب میں پہنچ چکی ہے، اور تعینِ مصرف میں جو غلطی کسی اندھیرے یا مغالطہ کی وجہ سے ہوگئی وہ معاف ہے (درمختار)[1]۔ آیتِ صدقات کی تفسیر اور اس کے متعلقہ مسائل کی تفصیل بقدرِ ضرورت پوری ہوگئی۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ

اور بعضے ان میں بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں یہ شخص تو کان ہے تو کہہ کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ

یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مسلمانوں کی بات کا اور رحمت ہے ایمان والوں کے حق میں تم میں سے

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ

اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسول کی ان کے لئے عذاب ہے دردناک، قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے آگے

لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

تاکہ تم کو راضی کریں، اور اللہ کو اور اس کے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا اگر وہ ایمان رکھتے ہیں،

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے اور اس کے رسول سے تو اس کے واسطے ہے دوزخ کی آگ

خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ

سدا رہے اس میں، یہی ہے بڑی رسوائی، ڈرا کرتے ہیں منافق اس بات سے کہ نازل ہو

[1] الدر المختار، كتاب الزكاة، باب المصرف ج:۳ ص:۳۵۴ (طبع رشيديه كوئٹه)

عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ

مسلمانوں پر ایسی سورت کہ جتاوے ان کو جو اُن کے دل میں ہے، تو کہہ دے ٹھٹھے کرتے رہو اللہ کھول کر رہے گا

مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۗ

اس چیز کو جس کا تم کو ڈر ہے، اور اگر تو ان سے پوچھے تو وہ کہیں گے ہم تو بات چیت کرتے تھے اور دل لگی،

قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا

تو کہہ کیا اللہ سے اور اس کے حکموں سے اور اس کے رسول سے تم ٹھٹھے کرتے تھے، بہانے مت بناؤ

قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۗ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ

تم تو کافر ہوگئے اظہار ایمان کے پیچھے، اگر ہم معاف کردیں گے تم میں سے بعضوں کو

ع ۸ ۱۴

نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾ ع

تو البتہ عذاب بھی دیں گے بعضوں کو اس سبب سے کہ وہ گنہگار تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور انہی (منافقین) میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو دُکھ پہنچاتے ہیں، اور (اُن کے بارے میں) یہ کہتے ہیں کہ: "وہ تو سراپا کان ہیں۔" کہہ دو کہ: "وہ کان ہیں اُس چیز کے لئے جو تمہارے لئے بھلائی ہے۔ وہ اللہ پر اِیمان رکھتے ہیں، اور مؤمنوں کی بات کا یقین کرتے ہیں، اور تم میں سے جو (ظاہری طور پر) ایمان لے آئے ہیں، اُن کے لئے وہ رحمت (کا معاملہ کرنے والے) ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دُکھ پہنچاتے ہیں، اُن کے لئے دُکھ دینے والا عذاب تیار ہے" ﴿۶۱﴾ (مسلمانو!) یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں اس لئے کھاتے ہیں تا کہ تمہیں راضی کریں، حالانکہ اگر یہ واقعی مؤمن ہوں تو اللہ اور اُس کے رسول اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ اُن کو راضی کریں ﴿۶۲﴾ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ جو شخص اللہ اور اُس کے رسول سے ٹکر لے تو یہ بات طے ہے کہ اُس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا؟ یہ بڑی بھاری

رُسوائی ہے! (۶۳) منافق لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر کہیں کوئی ایسی سورت نازل نہ کر دی جائے جو اُنہیں ان (منافقین) کے دِلوں کی باتیں بتلادے۔ کہہ دو کہ: ''(اچھا!) تم مذاق اُڑاتے رہو؛ اللہ وہ بات ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈرتے تھے۔'' (۶۴) اور اگر تم ان سے پوچھو تو یہ یقیناً یوں کہیں گے کہ: ''ہم تو ہنسی مذاق اور دِل لگی کر رہے تھے۔'' کہو کہ: ''کیا تم اللہ اور اُس کی آیتوں اور اُس کے رسول کے ساتھ دِل لگی کر رہے تھے؟ (۶۵) بہانے نہ بناؤ، تم ایمان کا اظہار کرنے کے بعد کفر کے مرتکب ہو چکے ہو۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معافی دے بھی دیں، تو دوسرے گروہ کو ضرور سزا دیں گے، کیونکہ وہ مجرم لوگ ہیں۔'' (۶۶)

خلاصۂ تفسیر

اور ان (منافقین) میں بعضے ایسے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذائیں پہنچاتے ہیں (یعنی آپ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ سن کر آپ کو ایذاء ہو) اور (جب کوئی روکتا ہے تو) کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں (آپ کو جھوٹ بول کر دھوکہ دیدینا آسان ہے، اس لئے کچھ فکر نہیں) آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ (تم کو خود دھوکہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بات کو سن لینا دو طور پر ہے، ایک تصدیق کے طور پر کہ دل سے بھی اس کو صحیح سمجھیں، دوسرا خوش خلقی اور کریم النفسی کے طور پر کہ باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ بات محض غلط ہے شرافتِ نفس اور حسنِ خلق کی بناء پر اُس کو ٹال دیں، اور کہنے والے پر دار و گیر یا اس کی صریح تکذیب نہ کریں سو) وہ نبی کان دے کر تو وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں خیر (ہی خیر) ہے، (جس کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے) کہ وہ اللہ (کی باتیں وحی سے معلوم کر کے ان) پر ایمان لاتے ہیں (جن کی تصدیق کا خیر ہونا تمام عالم کے لئے ظاہر ہے، کیونکہ تعلیم اور عدل اسی تصدیق پر موقوف ہے) اور مؤمنین (مخلصین کی باتوں) کا (جو بحیثیت ایمان واخلاص ہوں) یقین کرتے ہیں (اس کا خیر ہونا بھی ظاہر ہے کہ عدلِ عام موقوف ہے احوال کی صحیح اطلاع پر اور اس کا ذریعہ یہی مؤمنین مخلصین ہیں، غرض کان دے کر اور سچا سمجھ کر تو صرف سچے اور مخلصین کی باتیں سنتے ہیں) اور (باقی تمہاری شرارت آمیز باتیں جو سن لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ ان لوگوں کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں (گو دل میں ایمان نہ ہو، پس اس مہربانی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے تمہاری باتیں سن لیتے ہیں اور باوجود اس کی حقیقت سمجھ جانے کے درگزر اور خاموشی برتتے ہیں، پس ان باتوں کا سننا دوسرے طور کا ہے، تم نے اپنی حماقت سے اس کو بھی اوّل طور پر محمول کر لیا، خلاصہ یہ کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ حقیقت کو حضرت نہیں سمجھتے اور واقع میں حقیقت کو تم ہی نہیں سمجھتے) اور جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذائیں پہنچاتے ہیں (خواہ ان باتوں سے جن کے کہنے کے بعد اُذُنٌ کہا تھا یا خود اسی هُوَ اُذُنٌ کے کہنے سے کیونکہ ان کا آپ کو اُذُنٌ کہنا آپ کی تنقیص

کے لئے تھا کہ معاذ اللہ آپ کو سمجھ نہیں جو کچھ سن لیتے ہیں اس کو مان لیتے ہیں) ان لوگوں کے لئے دردناک سزا ہوگی ، یہ لوگ تمہارے (مسلمانوں کے) سامنے (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں (کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی ، یا ہم غزوہ میں فلاں عذر سے نہ جا سکے) تا کہ تم کو راضی کر لیں (جس سے ان کا جان و مال محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں (جو کہ موقوف ہے اخلاص اور ایمان پر) کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا (جیسا یہ لوگ کر رہے ہیں) تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہوگی کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا ، (اور) یہ بڑی رسوائی (کی بات) ہے ، منافق لوگ (طبعاً) اس سے اندیشہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر (بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی ایسی سورت (مثلاً یا آیت) نازل نہ ہو جاوے جو اُن کو ان منافقین کے مافی الضمیر پر اطلاع دیدے (یعنی انہوں نے جو استہزاء کی باتیں خفیہ کی ہیں کہ مسلمانوں کے اعتبار سے وہ مثل ان اسرار کے ہیں جو دلوں میں پوشیدہ ہیں ان کی خبر نہ ہو جاوے) آپ فرما دیجئے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو (اس میں ان کے استہزاء پر مطلع ہو جانے کو جتلا دیا ، چنانچہ آگے خود ارشاد ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس کے (اظہار) سے تم اندیشہ کرتے تھے (چنانچہ اِسْتَهْزِءُوْا میں ظاہر کر دیا کہ تم استہزاء کر رہے تھے) اور (ظاہر ہو جانے کے بعد) اگر آپ ان سے (اس استہزاء کی وجہ) پوچھیں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض ہنسی اور خوش طبعی کر رہے تھے (اس کلام کے حقیقی معنی مقصود نہ تھے ، محض جی خوش کرنے کو جس سے سفر آسانی سے قطع ہو ایسی باتیں زبانی کر رہے تھے) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے (یعنی خواہ غرض کچھ بھی ہو مگر یہ تو دیکھو کہ تم استہزاء کس کا کر رہے ہو جن کے ساتھ استہزاء کسی غرض سے بھی درست نہیں) تم اب (یہ بیہودہ) عذر مت کرو (مطلب یہ ہے کہ یہ عذر مقبول نہیں ، اور اس عذر سے استہزاء جائز نہیں ہو جاتا) تم تو اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے (کیونکہ دین کے ساتھ استہزاء مطلقاً کفر ہے ، گو دل میں تو پہلے بھی ایمان نہ تھا ، البتہ اگر کوئی دل سے توبہ کر لے اور مؤمن مخلص بن جائے تو البتہ کفر اور عذابِ کفر سے چھوٹ جاوے ، لیکن اس کی بھی سب کو توفیق نہ ہوگی ، ہاں بعض البتہ مسلمان ہو جاویں گے ، اور وہ معاف کر دیئے جائیں گے ، پس حاصل یہ ٹھہرا کہ) اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں (اس لئے کہ وہ مسلمان ہو گئے) تو ہم بعض کو (ضرور ہی) سزا دیں گے بسبب اس کے کہ وہ (علم ازلی میں) مجرم تھے (یعنی وہ مسلمان نہیں ہوئے) ۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں بھی سابقہ آیات کی طرح منافقین کے بیہودہ اعتراضات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

ایذارسانی اور پھر جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے کے واقعات اور ان پر تنبیہ ہے۔

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بطور استہزاء یہ کہتے ہیں کہ ''وہ تو بس کان ہیں۔'' یعنی جو کچھ کسی سے سن لیتے ہیں اسی پر یقین کر لیتے ہیں، اس لئے ہمیں کچھ فکر نہیں، اگر ہماری سازش کھل بھی گئی تو ہم پھر قسم کھا کر آپ کو اپنی براءت کا یقین دلا دیں گے، جس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ان کی حماقت کو واضح فرما دیا، کہ وہ جو منافقین اور مخالفین کی غلط باتوں کو سن کر اپنے مکارمِ اخلاق کی بناء پر خاموش ہو رہتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھو کہ آپ کو حقیقتِ حال کی سمجھ نہیں، صرف تمہارے کہنے پر یقین کرتے ہیں، بلکہ وہ سب کی پوری پوری حقیقت سے باخبر ہیں، تمہاری غلط باتیں سن کر وہ تمہاری سچائی کے قائل نہیں ہو جاتے، البتہ اپنی شرافتِ نفس اور کرم کی بنا پر تمہارے منہ پر تمہاری تردید نہیں کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ اس آیت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ حق تعالیٰ منافقین کی خفیہ سازشوں اور شرارتوں کو ظاہر فرما دیں گے، جس کا ایک واقعہ غزوۂ تبوک سے واپسی کا ہے جبکہ کچھ منافقین نے آپ کے قتل کی سازش کی تھی، حق تعالیٰ نے آپ کو اس پر بذریعہ جبرئیل مطلع کر کے اس راستہ سے ہٹا دیا جہاں یہ منافقین اس کام کے لئے جمع ہوئے تھے۔ (مظہری عن البغوی) [۱]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ستر منافقین کے نام مع ان کی ولدیت اور پورے نشان پتے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیئے تھے، مگر رحمۃ للعالمین نے ان کو لوگوں پر ظاہر نہیں فرمایا۔ (مظہری) [۲]

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ (وقف لازم)

منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی ایک چال ہے سکھائیں بات بری،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ

اور چھڑائیں بات بھلی اور بند رکھیں اپنی مٹھی، بھول گئے اللہ کو، سو وہ بھول گیا ان کو

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ

تحقیق منافق وہی ہیں نافرمان، وعدہ دیا ہے اللہ نے منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو

---

[۱] تفسیر البغوی تحت هذه الآية ج:۴ ص:۶۸ [۲] التفسير المظهری تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۵۶

نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

دوزخ کی آگ کا پڑے رہیں گے اس میں وہی بس ہے ان کو اور اللہ تعالیٰ نے ان کو پھٹکار دیا، اور ان کے لئے عذاب ہے

مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا

برقرار رہنے والا، جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال

وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ

اور اولاد پھر فائدہ اٹھاگئے اپنے حصہ سے پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھاگئے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

تم سے اگلے اپنے حصہ سے اور تم بھی چلتے ہو انہی کی سی چال، وہ لوگ مٹ گئے

اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ

اُن کے عمل دنیا میں اور آخرت میں اور وہی لوگ پڑے نقصان میں، کیا پہنچی نہیں ان کو خبر

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ

ان لوگوں کی جو اُن سے پہلے تھے قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی، اور قوم ابراہیم کی

وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ

اور مدین والوں کی اور ان بستیوں کی خبر جو اُلٹ دی گئی تھیں، پہنچے ان کے پاس ان کے رسول صاف حکم لے کر

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

سو اللہ تو ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ وہ برائی کی تلقین کرتے ہیں، اور بھلائی سے روکتے ہیں، اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے، تو اللہ نے بھی اُن کو بھلا دیا۔ بلاشبہ یہ منافق بڑے نافرمان ہیں ﴿۶۷﴾ اللہ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور تمام کافروں سے دوزخ کی آگ کا عہد کر رکھا ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہی اُن کو راس آئے گی۔ اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال دی ہے، اور ان کے لئے اٹل عذاب ہے۔ ﴿۶۸﴾ (منافقو!) تم اُنہی لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ وہ طاقت میں تم سے مضبوط تر اور مال اور اولاد میں تم سے کہیں زیادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حصے کے مزے اُڑا لئے، پھر تم نے اُسی طرح اپنے حصے کے مزے اُڑائے، جیسے تم سے پہلے لوگوں نے اپنے حصے کے مزے اُڑائے تھے، اور تم بھی ویسی ہی بے ہودہ باتوں میں پڑے جیسے وہ پڑے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اعمال دُنیا اور آخرت میں غارت ہوگئے، اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے خسارے کا سودا کیا۔ ﴿۶۹﴾ کیا ان (منافقوں) کو اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گذرے ہیں؟ نوح کی قوم، اور عاد و ثمود، ابراہیم کی قوم، مدین کے باشندے، اور وہ بستیاں جنہیں اُلٹ ڈالا گیا! اِن سب کے پاس اِن کے رسول روشن دلائل لے کر آئے تھے۔ پھر اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ ﴿۷۰﴾

خلاصۂ تفسیر

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بُری بات کی (یعنی کفر و مخالفتِ اسلام کی) تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات سے (یعنی ایمان اور اتباعِ نبوی سے) منع کرتے ہیں اور (خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے) اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں انہوں نے خدا کا خیال نہ کیا، (یعنی اطاعت نہ کی) پس خدا نے ان کا خیال نہ کیا (یعنی ان پر رحمتِ خاصہ نہ کی) بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں، اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں عورتوں اور (علانیہ) کفر کرنے والوں سے دوزخ کی آگ کا عہد کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہ ان کے لئے (سزائے) کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دُور کر دے گا اور ان کو (حسبِ وعدۂ مذکور) عذاب دائمی ہوگا (اے منافقو!) تمہاری حالت (کفر اور استحقاقِ جزائے کفر میں) ان لوگوں کی سی ہے جو تم سے پہلے (زمانہ میں) ہو چکے ہیں جو شدّتِ قوّت میں اور کثرتِ اولاد و اموال میں تم سے بھی زیادہ تھے تو انہوں نے اپنے (دنیوی) حصے سے خوب فائدہ حاصل کیا سو تم نے بھی اپنے (دنیوی) حصہ سے خوب فائدہ

حاصل کیا جیسا تم سے پہلے لوگوں نے اپنے (دنیوی) حصہ سے فائدہ حاصل کیا تھا، اور تم بھی (بری باتوں میں) ایسے ہی گھسے جیسے وہ لوگ (بری باتوں میں) گھسے تھے، ان لوگوں کے اعمال (حسنہ) دنیا اور آخرت (سب) میں ضائع ہوگئے (کہ دنیا میں ان اعمال پر بشارتِ ثواب نہیں، اور آخرت میں ثواب نہیں) اور (اسی حبط فی الدنیا والآخرۃ کی وجہ سے) وہ لوگ بڑے نقصان میں ہیں (کہ دارین میں مسرّت اور راحت سے محروم ہیں، پس اسی طرح تم بھی ان کی طرح کفر کرتے ہو تو انہی کی طرح خائب و خاسر ہوگے، اور جیسا ان کے اموال و اولاد ان کے کام نہ آئے تم تو ان چیزوں میں ان سے کم ہو، تمہارے بدرجۂ اَولیٰ کام نہ آویں گے، یہ تو ضررِ آخرت کی وعید ہوئی، آگے احتمالِ ضررِ دنیا کے ذکر سے متنبہ فرماتے ہیں کہ) کیا ان لوگوں کو ان (کے عذاب و ہلاک) کی خبر نہیں پہنچی جو اُن سے پہلے ہوئے ہیں، جیسے قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم اور اہلِ مدین اور اُلٹی ہوئی بستیاں (یعنی قریٰ قومِ لوط) کہ ان کے پاس ان کے پیغمبر صاف نشانیاں (حق کی) لے کر آئے (لیکن نہ ماننے سے برباد ہوئے) سو (اس بربادی میں) اللہ تعالیٰ نے تو ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (اسی طرح ان منافقین کو بھی ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا کہ وہ اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں، وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ تفسیر قرطبی میں ہے کہ ہاتھ بند رکھنے سے مراد ترکِ جہاد اور حقوقِ واجبہ کا ادا نہ کرنا ہے، نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو بھلا دیا، اللہ تعالیٰ تو نسیان اور بھول سے پاک ہیں، مراد اس جگہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے اَحکام کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے بھول گئے ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی ثواب آخرت کے معاملہ میں ان کو ایسا ہی کر چھوڑا کہ نیکی اور ثواب میں کہیں ان کا نام نہ رہا۔

آیت (۶۹) كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ خطاب منافقین کو ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں آچکا، اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ خطاب مسلمانوں کو ہے یعنی (اَنْتُمْ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ) مراد یہ ہے کہ تم لوگ بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی طرح ہو جس طرح وہ لوگ دنیا کی لذائذ میں منہمک ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے اور طرح طرح کے معاصی اور بداخلاقیوں میں مبتلا ہوگئے تم بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی وہی طریقے اختیار کرو گے جو تم سے پہلی اُمتیں کر چکی ہیں، ہاتھ در ہاتھ اور بالشت در بالشت یعنی ہو بہو ان کی نقل اُتارو گے،

یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی گھسو گے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث کی تصدیق کے لئے تمہارا جی چاہے تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، [۱] كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ سن کر فرمایا: مَا اَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ، یعنی آج کی رات گزشتہ شب سے کیسی ملتی جلتی اور مشابہ ہے، یہ بنی اسرائیل ہیں ہمیں ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (قرطبی) [۲]

حدیث کا مقصد واضح ہے کہ آخر زمانے میں مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر چلنے لگیں گے اور منافقین کا عذاب بیان کرنے کے بعد اس کا بیان کرنا اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے طریقوں کا اتباع کرنے والے مسلمان وہی ہوں گے جن کے دلوں میں مکمل ایمان نہیں، نفاق کے جراثیم ان میں پائے جاتے ہیں، صلحاءِ اُمت کو اس سے بچنے اور بچانے کی ہدایت اس آیت میں دی گئی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (وقف لازم)

اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں سکھلاتے ہیں نیک بات

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

اور منع کرتے ہیں بُری بات سے اور قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوۃ

وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ

اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے وہی لوگ ہیں جن پر رحم کرے گا اللہ بیشک اللہ زبردست ہے

حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

حکمت والا، وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں کا کہ بہتی ہیں نیچے ان کے

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ

نہریں رہا کریں انہی میں اور ستھرے مکانوں کا رہنے کے باغوں میں اور رضامندی

[۱] مسند ابی یعلی الموصلی رقم الحدیث: ۶۱۶۲ [۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۲۰۱

مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ ع يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ ۹ ع ۱۵

اللہ کی ان سب سے بڑی ہے یہی ہے بڑی کامیابی، اے نبی لڑائی کر کافروں سے

وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

اور منافقوں سے اور تند خوئی کر اُن پر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کی تلقین کرتے ہیں، اور برائی سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ اپنی رحمت سے نوازے گا۔ یقیناً اللہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک! ﴿۷۱﴾ اللہ نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے وعدہ کیا ہے اُن باغات کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن پاکیزہ مکانات کا جو سدا بہار باغات میں ہوں گے۔ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے (جو جنت والوں کو نصیب ہوگی) یہی تو زبردست کامیابی ہے ﴿۷۲﴾ اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو، اور اُن پر سختی کرو۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ﴿۷۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانتے ہیں ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا (جس کی تفصیل وَعَدَ اللّٰهُ میں عنقریب آتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر (مطلق) ہے (جزائے تام دے سکتا ہے) حکمت والا ہے (جزائے مناسب دیتا ہے، اب اس رحمت کا بیان ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانوں کا (وعدہ کر رکھا ہے) جو کہ ان ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گے اور (ان سب نعمتوں کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی رضامندی (جو اہلِ جنت سے ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، ان) سب (نعمتوں) سے بڑی چیز ہے یہ (جزائے

مذکور) بڑی کامیابی ہے، اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار (سے بالسنان) اور منافقین سے (باللسان) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے (دنیا میں تو یہ اس کے مستحق ہیں) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منافقین کے حالات، ان کی سازشوں اور ایذاؤں اور ان کے عذاب کا بیان تھا، قرآنی اُسلوب کے مطابق مناسب تھا کہ اس جگہ مؤمنین مخلصین کے حالات اور ان کے ثواب اور درجات کا بھی بیان آجائے، آیاتِ مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس موقع پر منافقین اور مؤمنین مخلصین کے حالات کا تقابل ذکر کیا گیا، مگر ایک جگہ منافقین کے بارے میں تو یہ فرمایا کہ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ اور اس کے مقابل مؤمنین کا ذکر آیا تو اس میں فرمایا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ اس میں اشارہ ہے کہ منافقین کے باہمی تعلقات اور روابط تو محض خاندانی اشتراک یا اغراض پر مبنی ہوتے ہیں نہ اُن کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور نہ اُن پر وہ ثمرات مرتب ہوتے ہیں جو دلی دوستی اور قلبی ہمدردی کے تعلق پر مرتب ہوتے ہیں، بخلاف مؤمنین کے کہ وہ ایک دوسرے کے مخلص دوست اور سچے ہمدرد ہوتے ہیں۔ (قرطبی) [۱]

اور چونکہ یہ دوستی اور ہمدردی خالص اللہ کے لئے ہوتی ہے، وہ ظاہراً و باطناً اور حاضر و غائب یکساں ہوتی ہے، اور ہمیشہ پائیدار رہتی ہے، مؤمن مخلص کی یہی علامت ہے، ایمان اور عمل صالح کا خاصہ ہی یہ ہے کہ باہم دوستی اور محبت پیدا کرتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد اسی کے متعلق ہے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کے پابند ہوئے اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں قلبی اور گہری دوستی پیدا فرما دیتے ہیں، آج کل ہمارے ایمان و عمل صالح ہی کی کوتاہی ہے کہ مسلمانوں کے باہم تعلقات کبھی ایسے نظر نہیں آتے، بلکہ اغراض کے تابع ہیں۔

جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ اس آیت میں کفار اور منافقین دونوں سے جہاد اور ان کے معاملہ میں شدّت اختیار کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، ظاہری کفار سے جہاد کا معاملہ تو واضح ہے، لیکن منافقین سے جہاد کا مطلب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے ساتھ جہاد سے مراد زبانی جہاد ہے، کہ ان کو اسلام کی حقانیت سمجھنے کی طرف دعوت دیں تاکہ وہ اپنے دعوئ اسلام میں مخلص ہو جائیں (قرطبی و مظہری)۔ [۲] وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ لفظ غِلْظٌ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ مخاطب جس طرزِ عمل کا مستحق ہے اس میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، یہ لفظ

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۲۰۳.

[۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۲۰۴، والتفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۶۶

رأفت کے مقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی رحمت اور نرم دلی کے ہیں۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس جگہ غلظت استعمال کرنے سے عملی غلظت مراد ہے کہ ان پر احکامِ شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں، کیونکہ وہ سنتِ انبیاء کے خلاف ہے، وہ کسی سے سخت کلامی اور سب وشتم نہیں کرتے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِذَا زَنَتْ اَمَۃُ اَحَدِکُمْ فَلْیَجْلِدْھَا الْحَدَّ وَلَا یُثَرِّبْ عَلَیْھَا۔ (قرطبی) [1]

''اگر تمہاری کوئی کنیز زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا حدِ شرعی اس پر جاری کردو مگر زبانی ملامت اور طعن وتشنیع نہ کرو۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹) ''یعنی اگر آپ سخت کلام سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے'' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل میں بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار ومنافقین سے گفتگو اور خطاب میں کبھی غلظت اختیار فرمائی ہو۔

تنبیہ

افسوس کہ خطاب اور کلام میں غلظت جس کو کفار کے مقابلہ میں بھی اسلام نے اختیار نہیں کیا آج کل کے مسلمان دوسرے مسلمانوں کے بارے میں بے دھڑک استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کو دین کی خدمت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں، اِنَّا لِلّٰہ۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا

قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی ہم نے نہیں کہا اور بیشک کہا ہے انہوں نے لفظ کفر کا اور منکر ہوگئے

بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ

مسلمان ہوکر اور قصد کیا تھا اس چیز کا جو اُن کو نہ ملی، اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولت مند کردیا ان کو اللہ نے

وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ

اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے سو اگر توبہ کرلیں تو بھلا ہے ان کے حق میں اور اگر نہ مانیں گے تو عذاب دے گا ان کو

[1] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۲۰۵

اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ وَّلِىٍّ

اللہ عذاب دردناک، دنیا اور آخرت میں اور نہیں ان کا روئے زمین پر کوئی حمایتی

وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۷۴﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَـئِنۡ اٰتٰٮنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ

اور نہ مددگار، اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ عہد کیا تھا اللہ سے اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں

وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰٮهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ

اور ہو رہیں ہم نیکی والوں میں، پھر جب دیا ان کو اپنے فضل سے تو اس میں بخل کیا

وَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ

اور پھر گئے ٹلاکر، پھر اس کا اثر رکھ دیا نفاق ان کے دلوں میں جس دن تک کہ

يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾

وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ اس سے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ

اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰٮهُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ۚ ﴿۷۸﴾

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے ان کا بھید اور ان کا مشورہ اور یہ کہ اللہ خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو

آسان ترجمۂ قرآن

یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھا جاتے ہیں کہ انہوں نے فلاں بات نہیں کہی، حالانکہ انہوں نے کفر کی بات کہی ہے، اور اپنے اسلام لانے کے بعد انہوں نے کفر اختیار کیا ہے۔ انہوں نے وہ کام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس میں یہ کامیابی حاصل نہ کر سکے، اور انہوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا کہ اللہ اور اُس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے مال دار بنا دیا ہے۔ اب اگر یہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا، اور اگر یہ منہ موڑیں گے تو اللہ ان کو دُنیا اور آخرت میں دردناک عذاب

دے گا، اور روئے زمین پر ان کا نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار۔ ﴿۷۴﴾ اور انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے، اور یقیناً نیک لوگوں میں شامل ہو جائیں گے ﴿۷۵﴾ لیکن جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے نوازا تو اس میں بخل کرنے لگے، اور منہ موڑ کر چل دیئے۔ ﴿۷۶﴾ نتیجہ یہ کہ اللہ نے سزا کے طور پر نفاق ان کے دِلوں میں اُس دن تک کے لئے جما دیا ہے جس دن وہ اللہ سے جا کر ملیں گے، کیونکہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اُس کی خلاف ورزی کی، اور کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ﴿۷۷﴾ کیا اُنہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ اللہ اُن کی تمام پوشیدہ باتوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے، اور یہ کہ اُس کو غیب کی ساری باتوں کا پورا پورا علم ہے؟ ﴿۷۸﴾

خلاصۂ تفسیر

وہ لوگ قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلانی بات (مثلاً یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں) نہیں کہی حالانکہ یقیناً انہوں نے کفر کی بات کہی تھی، (کیونکہ آپ کے قتل کے بارے میں گفتگو کرنے کا کفر ہونا ظاہر ہے) اور (وہ بات کہہ کر) اپنے اسلامِ (ظاہری) کے بعد (ظاہر میں بھی) کافر ہوگئے (گو اپنے ہی مجمع میں سہی جس کی خبر مسلمانوں کو بھی ہوگئی اور اس سے عام طور پر کفر کھل گیا) اور انہوں نے ایسی بات کا ارادہ کیا تھا جو اُن کے ہاتھ نہ لگی (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا مگر ناکام رہے) اور یہ انہوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا ہے کہ ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے رزقِ خداوندی سے مالدار کر دیا (اس احسان کا بدلہ ان کے نزدیک یہی ہوگا کہ بُرائی کریں) سو اگر (اسؐ کے بعد بھی) توبہ کریں تو ان کے لئے (دونوں جہان میں) بہتر (اور نافع) ہوگا (چنانچہ جلاسؓ کو توبہ کی توفیق ہوگئی) اور اگر (توبہ سے) رُوگردانی کی (اور کفر و نفاق ہی پر جمے رہے) تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت (دونوں جگہ) میں دردناک سزا دے گا (چنانچہ عمر بھر بدنام اور پریشان اور خائف رہنا اور مرتے وقت مصیبت کا مشاہدہ کرنا یہ دنیوی عذاب ہے اور آخرت میں دوزخ میں جانا ظاہر ہی ہے) اور ان کا دنیا میں نہ کوئی یار ہے اور نہ مددگار (کہ عذاب سے بچالے اور جب دنیا ہی میں کوئی یار مددگار نہیں جہاں اکثر مدد ہو جاتی ہے تو آخرت میں تو بدرجۂ اَولیٰ منفی ہوگا) اور ان (منافقین) میں بعضے آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کرنا اور خدا سے عہد کرنا برابر ہے، اور وہ عہد یہ تھا کہ) اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل سے (بہت سا مال) عطا فرما دے تو ہم (اس میں سے) خوب خیرات کریں اور ہم (اس کے ذریعہ سے) خوب نیک نیک کام کیا کریں، سو جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے (بہت سا) دے دیا تو اس میں بخل کرنے لگے (کہ زکوٰۃ نہ دی) اور (اطاعت سے) روگردانی کرنے لگے اور وہ تو روگردانی کے (پہلے ہی سے) عادی ہیں سو اللہ تعالیٰ نے ان (کے اس فعل) کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق (قائم) کر دیا، جو خدا کے پاس جانے کے دن تک

(یعنی دمِ مرگ تک) رہے گا اس سبب سے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے وعدہ میں خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ (اس وعدہ میں شروع ہی میں) جھوٹ بولتے تھے (یعنی نیت ایفاء کی اُس وقت بھی نہ تھی پس نفاق تو اس وقت بھی دل میں تھا جس کی فرع یہ کذب و اخلاف ہے، پھر اس کذب و اخلاف کے وقوع سے اور زیادہ مستحق غضب ہوئے، اور اس زیادہ غضب کا اثر یہ ہوا کہ وہ نفاقِ سابق اب دائمی اور غیر زائل ہو گیا کہ توبہ بھی نصیب نہ ہوگی، اسی حالت پر مر کر ابدالآباد جہنم میں رہنا نصیب ہوگا، اور باوجود کفر مضمر کے جو اسلام اور طاعت کا اظہار کرتے ہیں تو) کیا ان (منافقین) کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کا راز اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام غیب کی باتوں کو خوب جانتے ہیں (اور اس لئے وہ ظاہری اسلام اور اطاعت ان کے کام نہیں آسکتے بالخصوص آخرت میں، پس سزائے جہنم ضروری ہے۔)

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ میں پھر منافقین کا تذکرہ ہے کہ وہ اپنی مجلسوں میں کلماتِ کفر کہتے رہتے ہیں، پھر اگر مسلمانوں کو اطلاع ہوگئی تو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی براءت ثابت کرتے ہیں، اس آیت کے شانِ نزول میں بغویؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک خطبہ دیا، جس میں منافقین کی بدحالی اور انجامِ بد کا ذکر فرمایا، حاضرین میں ایک منافق جُلاّس بھی موجود تھا، اس نے اپنی مجلس میں جا کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ سچ ہے تو ہم گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہیں، اس کا یہ کلمہ ایک صحابی عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نے سن لیا تو کہا بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے اور تم واقعی گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہو۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر تبوک سے واپس مدینہ طیبہ پہنچے تو عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، اور جُلاّس اپنے کہے سے مُکر گیا، اور کہنے لگا کہ عامر بن قیسؓ نے مجھ پر تہمت باندھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ منبرِ نبوی کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائیں، جُلاّس نے بے دھڑک جھوٹی قسم کھالی کہ میں نے ایسا نہیں کہا، عامر جھوٹ بول رہے ہیں، حضرت عامر رضی اللہ عنہ کا نمبر آیا تو انہوں نے بھی قسم کھائی، اور پھر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے کہ یا اللہ! آپ اپنے رسول پر بذریعہ وحی اس معاملہ کی حقیقت روشن فرمادیں، ان کی دُعا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں نے آمین کہی، ابھی یہ لوگ اس جگہ سے ہٹے بھی نہیں تھے، کہ جبرئیل امین وحی لے کر حاضر ہو گئے، جس میں آیت مذکورہ تھی۔

جُلاّس نے جب آیت سنی تو فوراً کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ اب میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی، اور عامر بن قیس نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا، مگر اسی آیت میں حق تعالیٰ نے مجھے توبہ کا بھی حق دے دیا ہے، میں اب اللہ

سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول فرمالی، اور بعد میں یہ اپنی توبہ پر قائم رہے، ان کے حالات درست ہوگئے۔ (مظہری) [1]

بعض حضرات مفسرین نے اسی طرح کے دوسرے واقعات اس کے شانِ نزول میں بیان فرمائے ہیں، خصوصاً اس لئے کہ اس آیت کا ایک جملہ یہ بھی ہے وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا یعنی انہوں نے ارادہ کیا ایک ایسے کام کا جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کسی ایسے واقعہ سے متعلق ہے جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کی تھی، جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے، جیسے اسی غزوۂ تبوک سے واپسی کا واقعہ معروف ہے کہ بارہ آدمی منافقین میں سے پہاڑ کی ایک گھاٹی میں اس غرض سے چھپ کر بیٹھے تھے کہ جب آپ یہاں پہنچیں تو یکبارگی حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں، جبرئیل امین نے آپ کو خبر دے دی تو آپ اس راستہ سے ہٹ گئے، اور ان کی سازش خاک میں مل گئی۔

اور بعض دوسرے واقعات بھی منافقین کی طرف سے ایسے پیش آئے ہیں، مگر اس میں تضاد یا بُعد نہیں کہ وہ سب ہی واقعات اس آیت میں مراد ہوں۔

دُوسری آیت وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ بھی ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے، جو ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص ثعلبہ ابن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی کہ آپ دُعا کریں کہ میں مال دار ہو جاؤں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو میرا طریقہ پسند نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں چاہتا تو مدینہ کے پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ پھرا کرتے، مگر مجھے ایسی مال داری پسند نہیں، یہ شخص چلا گیا، مگر دوبارہ پھر آیا اور پھر یہی درخواست اس معاہدہ کے ساتھ پیش کی کہ اگر مجھے مال مل گیا تو میں ہر حق والے کو اس کا حق پہنچاؤں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کر دی، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ اس کی بکریوں میں بے پناہ زیادتی شروع ہوئی، یہاں تک کہ مدینہ کی جگہ اس پر تنگ ہوگئی، تو باہر چلا گیا، اور ظہر عصر کی دو نمازیں مدینہ میں آکر آپ کے ساتھ پڑھتا تھا، باقی نمازیں بھی جنگل میں جہاں اس کا یہ مال تھا وہیں ادا کرتا تھا۔

پھر انہی بکریوں میں اور زیادتی اتنی ہوگئی کہ یہ جگہ بھی تنگ ہوگئی، اور شہرِ مدینہ سے دور جا کر کوئی جگہ لی، وہاں سے صرف جمعہ کی نماز کے لئے مدینہ میں آتا اور پنج گانہ نمازیں وہیں پڑھنے لگا، پھر اس مال کی فراوانی اور بڑھی تو یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی، اور مدینہ سے بہت دور چلا گیا، جہاں جمعہ اور جماعت سب سے محروم ہوگیا۔

---

[1] تفسیر البغوی تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۷۵، والتفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۶۶، ۲۶۷

کچھ عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ اس کا مال اتنا زیادہ ہوگیا کہ شہر کے قریب میں اس کی گنجائش ہی نہیں، اس لئے کسی دور جگہ پر جا کر اس نے قیام کیا ہے، اور اب یہاں نظر نہیں پڑتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تین مرتبہ فرمایا یَا وَیْحَ ثَعْلَبَةُ، یعنی ثعلبہ پر افسوس ہے ثعلبہ پر افسوس ہے، ثعلبہ پر افسوس ہے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں آیت صدقات نازل ہوگئی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے صدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً) آپ نے مویشی کے صدقات کا مکمل قانون لکھوا کر دو شخصوں کو عاملِ صدقہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مویشی کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھیج دیا، اور ان کو حکم دیا کہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس بھی پہنچیں، اور بنی سُلَیم کے ایک اور شخص کے پاس جانے کا بھی حکم دیا۔

یہ دونوں جب ثعلبہ کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دکھایا، تو ثعلبہ کہنے لگا کہ یہ تو جزیہ ہوگیا، جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، اور پھر کہا کہ اچھا اب تو آپ جائیں جب واپس ہوں تو یہاں آجائیں، یہ دونوں چلے گئے۔

اور دوسرے شخص سُلَیمی نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا تو اپنے مویشی اونٹ اور بکریوں میں سے جو سب سے بہتر جانور تھے، نصابِ صدقہ کے مطابق وہ جانور لے کر خود ان دونوں قاصدانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے کہا کہ ہمیں تو حکم یہ ہے کہ جانوروں میں اعلیٰ چھانٹ کر نہ لیں، بلکہ متوسط وصول کریں، اس لئے ہم تو یہ نہیں لے سکتے، سُلَیمی نے اصرار کیا کہ میں اپنی خوشی سے یہی پیش کرنا چاہتا ہوں، یہی جانور قبول کر لیجئے۔

پھر یہ دونوں حضرات دوسرے مسلمانوں سے صدقات وصول کرتے ہوئے واپس آئے تو پھر ثعلبہ کے پاس پہنچے، تو اس نے کہا کہ لاؤ وہ قانونِ صدقات مجھے دکھلاؤ، پھر اس کو دیکھ کر یہی کہنے لگا کہ یہ تو ایک قسم کا جزیہ ہوگیا، جو مسلمانوں سے نہیں لینا چاہئے، اچھا اب تو آپ جائیں میں غور کروں گا پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔

جب یہ دونوں حضرات واپس مدینہ طیبہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے حالات پوچھنے سے پہلے ہی پھر وہ کلمہ دُہرایا جو پہلے فرمایا تھا یَا وَیْحَ ثَعْلَبَةُ یَا وَیْحَ ثَعْلَبَةُ یَا وَیْحَ ثَعْلَبَةُ (یعنی ثعلبہ پر سخت افسوس ہے) یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا، پھر سُلَیمی کے معاملہ پر خوش ہو کر اس کے لئے دُعا فرمائی، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ یعنی ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اُن کو مال عطا فرمادیں گے تو وہ صدقہ خیرات کریں گے، اور صالحینِ اُمت کی طرح سب اہلِ حقوق، رشتہ داروں اور غریبوں کے حقوق ادا کریں گے، پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے مال دیا تو بخل کرنے لگے، اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے پھر گئے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدعملی اور بدعہدی کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں نفاق کو اور پختہ کر دیا، کہ اب ان کو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوگی۔

فائدہ:- اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمالِ بد کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، نعوذ بالله منه۔

ابن جریر نے حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ کی تفصیلی روایت جو ابھی ذکر کی گئی ہے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ کے لئے يَا وَيْحَ ثَعْلَبَةُ تین مرتبہ فرمایا تو اس مجلس میں ثعلبہ کے کچھ عزیز و اقارب بھی موجود تھے، یہ سن کر ان میں سے ایک آدمی فوراً سفر کر کے ثعلبہ کے پاس پہنچا، اور اس کو ملامت کی، اور بتلایا کہ تمہارے بارے میں قرآن کی آیت نازل ہوگئی ہے، یہ سن کر ثعلبہ گھبرا گیا، اور مدینہ حاضر ہو کر درخواست کی کہ میرا صدقہ قبول کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے، یہ سن کر ثعلبہ اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو تمہارا اپنا عمل ہے، میں نے تمہیں حکم دیا تم نے اطاعت نہ کی، اب تمہارا صدقہ قبول نہیں ہو سکتا، ثعلبہ ناکام واپس ہو گیا، اور اس کے کچھ دن بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ثعلبہ، صدیق اکبرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میرا صدقہ قبول کر لیجئے، صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں کیا تو میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔

پھر صدیقِ اکبرؓ کی وفات کے بعد ثعلبہ، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور وہی درخواست کی اور وہی جواب ملا جو صدیقِ اکبرؓ نے دیا تھا، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اُن سے درخواست کی، انہوں نے بھی انکار کر دیا، اور خلافتِ عثمانؓ کے زمانہ میں ثعلبہ مر گیا۔ (نعوذ بالله من سيّئات الأعمال) (مظہری) [1]

مسئلہ:- یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ تائب ہو کر حاضر ہو گیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی، وجہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اب بھی اخلاص کے ساتھ توبہ نہیں کر رہا ہے، اس کے دل میں نفاق موجود ہے، محض وقتی مصلحت سے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے، اس لئے قبول نہیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منافق قرار دے دیا تو بعد کے خلفاء کو اس کا صدقہ قبول کرنے کا حق نہیں رہا، کیونکہ زکوٰۃ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ کسی شخص کے دل کا نفاق قطعی طور پر کسی کو

---

[1] التفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۶۹، ۲۷۰۔ وتفسير الطبرى تحت هذه الآية رقم الحديث:۱۶۹۸۷، ودلائل النبوة للبيهقیؒ رقم الحديث: ۲۰۳۹

معلوم نہیں ہوسکتا، اس لئے آئندہ کا حکم یہی ہے کہ جو شخص توبہ کرلے اور اسلام وایمان کا اعتراف کرلے اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے خواہ اس کے دل میں کچھ بھی ہو۔ (بیان القرآن) [۱]

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ

وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں

وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ

اور اُن پر جو نہیں رکھتے مگر اپنی محنت کا پھر اُن پر ٹھٹھے کرتے ہیں،

سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ز وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ

اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے، اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے، تو ان کے لئے بخشش مانگ

اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ

یا نہ مانگ، اگر تو ان کے لئے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ بخشے گا ان کو اللہ

ع ۱۰ ۸ ۱۲ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۸۰﴾ ع

یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ رستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(یہ منافق وہی ہیں) جو خوشی سے صدقہ کرنے والے مؤمنوں کو بھی طعنے دیتے ہیں، اور اُن لوگوں کو بھی جنہیں اپنی محنت (کی آمدنی) کے سوا کچھ اور میسر نہیں ہے، اس لئے وہ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اللہ ان کا مذاق اُڑاتا ہے، اور ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے ﴿۷۹﴾ (اے نبی!) تم ان کے لئے اِستغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ان کے لئے ستر مرتبہ اِستغفار کروگے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کفر کا رویہ اپنایا

---

[۱] بیان القرآن تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۴۴

ہے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ﴿۸۰﴾

خلاصۂ تفسیر

یہ (منافقین ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں (تھوڑا ہونے پر) طعن کرتے ہیں اور (بالخصوص) ان لوگوں پر (اور زیادہ) جن کو بجز محنت مزدوری (کی آمدنی) کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا (اور وہ بیچارے اسی مزدوری میں سے ہمت کر کے کچھ صدقہ نکال دیتے ہیں) یعنی اُن سے تمسخر کرتے ہیں (یعنی مطلق طعن تو سب ہی پر کرتے ہیں کہ کیا تھوڑی سی چیز صدقہ میں لائے، اور ان محنت کش غریبوں سے تمسخر بھی کرتے ہیں کہ لو یہ بھی صدقہ دینے کے قابل ہو گئے) اللہ تعالیٰ ان کو تمسخر کا (تو خاص) بدلہ دے گا اور (ویسے مطلق طعن کا یہ بدلہ ملے گا کہ) ان کے لئے (آخرت میں) دردناک سزا ہوگی، آپ خواہ ان منافقین کے لئے استغفار کریں، یا ان کے لئے استغفار نہ کریں (دونوں حال برابر ہیں کہ ان کو اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا، ان کی مغفرت نہیں کی جائے گی) اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ (یعنی بکثرت) بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا، یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ تعالیٰ ایسے سرکش لوگوں کو (جو کبھی ایمان اور حق کی طلب ہی نہ کریں) ہدایت نہیں کیا کرتا (اس وجہ سے یہ عمر بھر کفر ہی پر قائم رہے، اسی پر مر گئے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں نفلی صدقات دینے والے مسلمانوں پر منافقین کے طعن و تشنیع کا ذکر ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں صدقہ کا حکم دیا گیا، اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم محنت مزدوری کرتے تھے (کوئی مال ہمارے پاس نہ تھا، اسی مزدوری سے جو کچھ ہمیں ملتا تھا اسی میں سے صدقہ بھی نکالتے تھے) چنانچہ ابوعقیل نے آدھا صاع (تقریباً پونے دوسیر) صدقہ پیش کیا، دوسرا آدمی آیا اس نے اس سے کچھ زیادہ صدقہ کیا، منافقین ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے کہ کیا حقیر اور ذرا سی چیز صدقہ میں لائے، اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کی ضرورت نہیں، اور جس نے کچھ زیادہ صدقہ کیا اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ریاءً لوگوں کو دکھلانے کے لئے صدقہ کیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ میں جزاءِ تمسخر کو تمسخر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ۔

دوسری آیت میں جو منافقین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا گیا کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے، اور کتنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہیں ہوگی، اس کا پورا بیان آگے آنے والی آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ (التوبہ: ۸۴) کے تحت آئے گا۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا

خوش ہوگئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہوکر رسول اللہ سے اور گھبرائے اس سے کہ لڑیں

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ

اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں اور بولے کہ مت کوچ کرو گرمی میں،

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝۸۱ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا

تو کہہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے، اگر ان کو سمجھ ہوتی، سو وہ ہنس لیویں تھوڑا

وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۲ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ

اور رووں بہت سا، بدلہ اس کا جو وہ کماتے تھے، سو اگر پھر لے جائے تجھ کو اللہ

اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا

کسی فرقہ کی طرف ان میں سے پھر اجازت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تُو کہہ دینا کہ تم ہرگز نہ نکلو گے میرے ساتھ کبھی

وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا

اور نہ لڑوگے میرے ساتھ ہوکر کسی دشمن سے، تم کو پسند آیا بیٹھ رہنا پہلی بار سو بیٹھے رہو

مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝۸۳

پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں کو (غزوۂ تبوک سے) پیچھے رہنے دیا گیا تھا، وہ رسول اللہ کے جانے کے بعد اپنے (گھروں میں) بیٹھے رہنے سے بڑے خوش ہوئے، اور ان کو یہ بات ناگوار تھی کہ وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال و جان سے جہاد کریں، اور انہوں نے کہا تھا کہ: ''اس گرمی میں نہ نکلو!'' کہو کہ: ''جہنم کی آگ گرمی میں کہیں زیادہ سخت ہے!'' کاش! اِن کو سمجھ ہوتی! ﴿۸۱﴾ اب یہ لوگ (دُنیا میں) تھوڑا بہت ہنس لیں، اور پھر (آخرت میں) خوب روتے رہیں، کیونکہ جو کچھ کمائی یہ کرتے رہے ہیں، اُس کا یہی بدلہ ہے۔ ﴿۸۲﴾ (اے پیغمبر!) اس کے بعد اگر اللہ تمہیں ان میں سے کسی گروہ کے پاس واپس لے آئے، اور یہ (کسی اور جہاد میں) نکلنے کے لئے تم سے اجازت مانگیں تو ان سے کہہ دینا کہ: ''اب تم میرے ساتھ کبھی نہیں چل سکو گے، اور میرے ساتھ مل کر کسی دُشمن سے کبھی نہیں لڑسکو گے۔ تم نے پہلی بار بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا، لہٰذا اب بھی انہی کے ساتھ بیٹھ رہو جن کو (کسی معذوری کی وجہ سے) پیچھے رہنا ہے۔'' ﴿۸۳﴾

خلاصۂ تفسیر

یہ پیچھے رہ جانے والے خوش ہوگئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے (جانے کے) بعد اپنے بیٹھے رہنے پر اور ان کو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنا ناگوار ہوا (دو وجہ سے اوّل کفر دوسرے آرام طلبی) اور (دوسروں کو بھی) کہنے لگے کہ تم (ایسی تیز) گرمی میں (گھر سے) مت نکلو آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ (اس سے بھی) زیادہ (تیز اور) گرم ہے (سو تعجب ہے کہ اس گرمی سے تو بچتے ہو اور جہنم میں جانے کا خود سامان کر رہے ہو، کہ کفر ومخالفت کو نہیں چھوڑتے) کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے، سو (ان امور مذکورہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں) تھوڑے دنوں ہنس (کھیل) لیں اور (پھر آخرت میں) بہت دنوں (یعنی ہمیشہ) روتے رہیں (یعنی ہنسنا تھوڑے دنوں کا ہے پھر رونا ہمیشہ ہمیشہ کا) ان کاموں کے بدلہ میں جو کچھ (کفر و نفاق وخلاف وغیرہ) کیا کرتے تھے (جب ان کا حال معلوم ہوگیا) تو اگر خدا تعالیٰ آپ کو (اس سفر سے مدینہ کو صحیح وسالم) ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے (گروہ اس لئے کہا کہ ممکن ہے کہ بعض اس وقت تک مر جائیں، یا کوئی کہیں چلا جاوے اور) پھر یہ لوگ (براہِ خوشامد و دفعِ الزامِ سابق کسی جہاد میں آپ کے ساتھ) چلنے کی اجازت مانگیں (اور دل میں اس وقت بھی یہی ہوگا کہ عین وقت پر کچھ بہانہ کر دیں گے) تو آپ یوں کہہ دیجئے کہ (اگرچہ اس وقت دنیا سازی کے طور پر باتیں بنا رہے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارا مافی الضمیر بتلا دیا ہے، اس لئے نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ) تم کبھی بھی میرے ساتھ (جہاد میں) نہ چلو گے اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمنِ (دین) سے

لڑو گے (جو کہ اصلی مقصود ہے چلنے سے کیونکہ) تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا (اور اب بھی عزم وہی ہے) تو (خواہ مخواہ جھوٹی باتیں کیوں بناتے ہو، بلکہ مثل سابق اب بھی) ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو (جو واقعی) پیچھے رہ جانے کے لائق ہی ہیں (بوجہ عذر کے جیسے بوڑھے اور بچے اور عورتیں)۔

معارف و مسائل

اوپر سے سلسلہ منافقین کے حالات کا چل رہا ہے، جو غزوۂ تبوک میں حکم عام کے باوجود شریک نہیں ہوئے، مذکور الصدر آیات میں بھی انہی کا ایک حال اور پھر اس کی سزائے آخرت کی وعید اور دنیا میں آئندہ کے لئے ان کا نام مجاہدینِ اسلام کی فہرست سے خارج کر دینا اور آئندہ ان کو کسی جہاد میں شرکت کی اجازت نہ ہونا مذکور ہے۔

مُخَلَّفُوْنَ، مُخَلَّفٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں متروک، یعنی جس کو چھوڑ دیا گیا ہو، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ تو یہ سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے اپنی جان کو مصیبت میں ڈالنے سے بچایا، اور جہاد میں شرکت نہیں کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ اس فضیلت کو پا سکیں، اس لئے وہ تارکِ جہاد نہیں، بلکہ متروک ہیں، کہ اللہ و رسول نے ہی ان کو چھوڑ دینے کے قابل سمجھا۔

خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ، لفظ ''خلاف'' کے معنی یہاں ''پیچھے'' اور ''بعد'' کے بھی ہو سکتے ہیں، ابوعبید نے یہی معنی لئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد پر چلے جانے کے بعد آپ کے پیچھے رہ جانے پر خوش ہو رہے ہیں، جو در حقیقت خوشی کی چیز نہیں، بِمَقْعَدِهِمْ یہ لفظ یہاں مصدری معنی میں بمعنے قعود ہے۔

دوسرے معنی خلاف کے اس جگہ مخالفت کے بھی ہو سکتے ہیں، کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کر کے گھر میں بیٹھے رہے، اور صرف خود ہی نہیں بیٹھے، بلکہ دوسروں کو بھی یہ تلقین کی کہ لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ یعنی گرمی کے زمانہ میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ غزوۂ تبوک کا حکم اس وقت ہوا تھا جبکہ گرمی سخت پڑ رہی تھی حق تعالیٰ نے ان کی بات کا جواب یہ دیا قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا یعنی یہ بدنصیب اِس وقت کی گرمی کو تو دیکھ رہے ہیں اور اس سے بچنے کی فکر کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں حکم خدا اور رسول کی نافرمانی پر جو جہنم کی آگ سے سابقہ پڑنے والا ہے، اس کی فکر نہیں کرتے، کیا یہ موسم کی گرمی جہنم کی گرمی سے زیادہ ہے، اس کے بعد فرمایا:

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا الآیۃ جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ، یہ لفظ اگرچہ بصیغۂ امر لایا گیا مگر حضرات مفسرین نے اس کو خبر کے معنی میں قرار دیا ہے، اور بصیغۂ امر ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے،

یعنی یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی و ہنسی صرف چندروز کی ہے، اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کے لئے رونا ہی رونا ہوگا، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ:

اَلدُّنْیَا قَلِیْلٌ فَلْیَضْحَکُوْا فِیْھَا مَا شَآؤُا فَاِذَا انْقَطَعَتِ الدُّنْیَا وَصَارُوْا اِلَی اللہِ فَلْیَسْتَاْنِفُوا الْبُکَاءَ بُکَاءً لَّا یَنْقَطِعُ اَبَدًا۔ (مظھری) [۱]

"دنیا چندروزہ ہے اس میں جتنا چاہو ہنس لو، پھر جب دنیا ختم ہوگی اور اللہ کے پاس حاضر ہوگے تو رونا شروع ہوگا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔"

دوسری آیت میں لَنْ تَخْرُجُوْا کا ارشاد ہے، اس کا مفہوم مذکور الصدر خلاصۂ تفسیر میں تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر آئندہ کسی جہاد میں شرکت کا ارادہ بھی کریں تو چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں وہ ارادہ بھی اخلاص سے نہ ہوگا، جب نکلنے کا وقت آئے گا اس وقت پہلے کی طرح حیلے بہانے کر کے ٹل جائیں گے، اس لئے آپ کو حکم ہوا کہ جب وہ کسی جہاد میں شریک ہونے کو خود بھی کہیں تو آپ یہ حقیقتِ حال ان کو بتلادیں کہ تمہارے کسی قول و فعل پر اعتماد نہیں، تم نہ جہاد کو نکلو گے نہ کسی دشمن اسلام سے میرے ساتھ قتال کرو گے۔

اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم ان کے لئے بطور دنیاوی سزا کے نافذ کیا گیا کہ اگر وہ سچ مچ کسی جہاد میں شرکت کو کہیں تو بھی انہیں شریک نہ کیا جائے۔ [۲]

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۭ اِنَّھُمْ كَفَرُوْا

اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مرجائے کبھی اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، وہ منکر ہوئے

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۴

اللہ سے اور اس کے رسول سے اور وہ مرگئے نافرمان۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) ان (منافقین) میں سے جو کوئی مرجائے، تو تم اُس پر کبھی نماز (جنازہ) مت پڑھنا، اور نہ اُس

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم تحت ھذہ الآیۃ رقم الحدیث:۱۰۶۵۳، والتفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۷۴

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۹۲، وتفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۲۱۷، وروح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۷ ص:۳۱۸

کی قبر پر کھڑے ہونا۔ یقین جانو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ کفر کا رویہ اپنایا، اور اِس حالت میں مرے ہیں کہ وہ نافرمان تھے۔ (۸۴)

خلاصۂ تفسیر

اور ان میں کوئی مر جاوے تو اس (کے جنازہ) پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ (دفن وغیرہ کے واسطے) اس کی قبر پر کھڑے ہوجئے (کیونکہ) انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور وہ حالتِ کفر ہی میں مرے ہیں۔

معارف و مسائل

احادیث صحیحہ سے باتفاقِ اُمت ثابت ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبیّ منافق کی موت اور اس پر نمازِ جنازہ کے متعلق نازل ہوئی، اور صحیحین کی روایت سے ثابت ہے کہ اس کے جنازہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، پڑھنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، اور اس کے بعد آپ نے کبھی کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے واقعۂ نزول کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جب عبداللہ بن اُبیّ ابن سلول مر گیا تو اس کے صاحبزادے عبداللہ جو مخلص مسلمان اور صحابی تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور درخواست کی کہ آپ اپنا قمیص عطا فرمائیں تاکہ میں اپنے باپ کو اس کا کفن پہناؤں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک عطا فرما دیا، پھر حضرت عبداللہ نے یہ بھی درخواست کی کہ آپ اس کے جنازے کی نماز بھی پڑھائیں، آپ نے قبول فرما لیا، اور نمازِ جنازہ کے لئے کھڑے ہوگئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ کا کپڑا پکڑ کر عرض کیا کہ آپ اس منافق کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی نمازِ جنازہ سے منع فرما دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ میں دُعاءِ مغفرت کروں یا نہ کروں، اور آیت میں جو ستر مرتبہ استغفار پر بھی مغفرت نہ ہونے کا ذکر ہے تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کر سکتا ہوں، آیت سے مراد سورۂ توبہ کی وہی آیت ہے جو ابھی گزر چکی ہے، یعنی اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۚ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی، نماز کے بعد ہی یہ آیت نازل ہوئی، وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ الخ (چنانچہ اس کے بعد آپ نے کبھی کسی منافق کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی)۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل عمر رضی اللہ عنہ ج:۲ ص:۲۷۶، وصحیح البخاری، کتاب اللباس، باب لبس القمیص ج:۲ ص:۸۶۲

واقعہ مذکور پر چند اشکالات اور اُن کے جواب

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن اُبیّ ایک ایسا منافق تھا جس کا نفاق مختلف اوقات میں ظاہر بھی ہو چکا تھا، اور سب منافقوں کا سردار مانا جاتا تھا، اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امتیازی سلوک کیسے ہوا کہ اس کے کفن کے لئے اپنا قمیص مبارک عطا فرما دیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، اوّل اس کے صاحبزادے جو مخلص صحابی تھے، ان کی درخواست کہ محض ان کی دلجوئی کے لئے ایسا کیا گیا، دوسرا سبب ایک اور بھی ہوسکتا ہے جو بخاری کی حدیث میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب کچھ قریشی سردار گرفتار کئے گئے، تو ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بھی تھے، آپ نے دیکھا کہ ان کے بدن پر کُرتہ نہیں، تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ان کو قمیص پہنا دیا جائے، حضرت عباسؓ دراز قد تھے، عبداللہ بن اُبیّ کے سوا کسی کا قمیص ان کے بدن پر درست نہ آیا، تو عبداللہ بن اُبیّ کا قمیص لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباس کو پہنا دیا تھا، اس کے اسی احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص اُن کو عطا فرما دیا۔ (قرطبی)[1]

دُوسرا سوال یہاں یہ ہے کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق کے جنازہ کی نماز سے منع فرمایا ہے، یہ کس بناء پر کہا، کیونکہ اس سے پہلے کسی آیت میں صراحۃً آپ کو منافق کی نمازِ جنازہ سے منع نہیں فرمایا گیا، اس سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ممانعت کا مضمون اِسی سورۂ توبہ کی سابقہ آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ الآیۃ سے سمجھا ہوگا، تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت ممانعت نمازِ جنازہ پر دلالت کرتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت کیوں نہ قرار دی، بلکہ یہ فرمایا کہ اس آیت میں مجھے اختیار دیا گیا ہے۔

جواب یہ ہے کہ درحقیقت الفاظِ آیت کا ظاہری مفہوم اختیار ہی دینا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ستر مرتبہ کا ذکر بھی اس جگہ تحدید کے لئے نہیں بلکہ کثرت بیان کرنے کے لئے ہے، تو اس آیت کا حاصل اس کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ ہوگا کہ منافق کی مغفرت تو نہ ہوگی، خواہ آپ کتنی ہی مرتبہ استغفار کرلیں، لیکن اس میں صراحۃً آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا، اور قرآن کریم کی ایک دُوسری آیت سورۂ یٰسٓ کی اس کی نظیر ہے، جس میں فرمایا گیا ہے وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝۱۰ جیسا اس آیت نے آپ کو اِنذار اور تبلیغ سے منع نہیں کیا بلکہ دوسری آیات سے تبلیغ

[1] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۲۲۰

ودعوت کا سلسلہ ان کے لئے بھی جاری رکھنا ثابت ہے، بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدۃ:۶۷) اور اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد) وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ آیت ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ سے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار ہی دینا ثابت ہوا تھا، پھر مستقل دلیل سے انذار کو جاری رکھنا ثابت ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ سے بھی یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر کسی دوسری آیت کے ذریعہ اب تک آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا تھا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے قمیص سے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو مغفرت نہیں ہوگی، مگر اس سے دوسری مصالحِ اسلامیہ حاصل ہونے کی توقع تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کفار جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے قریب آجائیں گے، اور مسلمان ہوجائیں گے، اور ممانعت صریح نماز پڑھنے کی اس وقت تک موجود نہ تھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھ لی۔

اس جواب کا شاہد ایک تو وہ جملہ ہے جو صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے منقول ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ دُعائے مغفرت کرنے سے اس کی مغفرت ہوجائے گی تو میں یہ بھی کرتا۔ (قرطبی) [1]

دوسرا شاہد وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا کُرتہ اس کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا، مگر میں نے یہ کام اس لئے کیا کہ مجھے امید ہے کہ اس عمل سے اس کی قوم کے ہزار آدمی مسلمان ہوجائیں گے، چنانچہ مغازیِ ابن اسحاق اور بعض کتبِ تفسیر میں ہے کہ اس واقعہ کو دیکھ کر خزرج قبیلہ کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہوگئے۔ [2]

خلاصہ یہ ہے کہ آیت سابقہ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ تو یقین ہوگیا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے اس منافق کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر چونکہ ظاہر الفاظ آیت میں اختیار دیا گیا تھا، اور کسی دوسری آیت سے بھی اس کی ممانعت اب تک نہیں آئی تھی، دوسری طرف ایک کافر کے احسان سے دنیا میں نجات حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا، اور اس معاملہ میں دوسرے کافروں کے مسلمان ہونے کی توقع بھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھنے کو ترجیح دی، اور فاروق اعظمؓ نے یہ سمجھا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ مغفرت نہیں ہوگی تو اس کے لئے نمازِ جنازہ پڑھ کر دُعائے مغفرت کرنا ایک فعل عبث اور بے کار ہے، جو شانِ نبوّت کے خلاف ہے، اسی کو انہوں نے ممانعت سے تعبیر فرمایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۱۹، وصحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب سورۃ التوبۃ، قوله "استغفر لهم او لا تستغفر لهم" الآیة ج:۲ ص:۶۷۳

[2] دیکھئے: تفسیر قرطبی ج:۸ ص:۲۲۱

اس فعل کو فی نفسہٖ مفید نہ سمجھتے تھے مگر دوسروں کے اسلام لانے کا فائدہ پیشِ نظر تھا، اس لئے فعلِ عبث نہ رہا، اس طرح نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر کوئی اشکال رہتا ہے نہ فاروقِ اعظمؓ کے قول پر۔ (بیان القرآن) [۱]

البتہ جب صراحۃً یہ آیت نازل ہوگئی وَلَا تُصَلِّ تو معلوم ہوا کہ اگرچہ نماز پڑھنے میں ایک دینی مصلحت آپ کے پیشِ نظر تھی، مگر اس میں ایک خرابی اور مفسدہ بھی تھا، جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دھیان نہیں ہوا، وہ یہ کہ خود مخلص مسلمانوں میں اس عمل سے ایک بے دِلی پیدا ہونے کا خطرہ تھا کہ اِن کے یہاں مخلص مسلمان اور منافق سب ایک پلّے میں تولے جاتے ہیں، اس خطرہ کے پیشِ نظر قرآن میں یہ ممانعت نازل ہوگئی، اور پھر کبھی آپ نے کسی منافق کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کے جنازہ کی نماز اور اس کے لئے دُعائے مغفرت جائز نہیں۔

مسئلہ:- اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاز واکرام کے لئے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کے لئے جانا حرام ہے، عبرت حاصل کرنے کے لئے ہو یا کسی مجبوری کے لئے تو وہ اِس کے منافی نہیں، جیسا کہ ہدایہ [۲] میں ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہیں تو مسلمان رشتہ دار اس کو اسی طرح بغیر رعایت طریق مسنون کے گڑھے میں دبا سکتا ہے۔ (بیان القرآن) [۳]

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا

اور تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب میں رکھے ان کو ان چیزوں کے باعث

فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

دنیا میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں، اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت

اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ

کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو اس کے رسول کے ساتھ ہوکر تو تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور والے ان کے

---

[۱] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۴۷، ۱۴۸ [۲] الهداية، كتاب الجنائز، قبيل فصل في حمل الجنازة ج:۱ ص:۹۳

[۳] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۴۸

وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ

اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دے کہ رہ جاویں ساتھ بیٹھنے والوں کے، خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ،

وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

اور مہر کردی گئی ان کے دلوں پر سو وہ نہیں سمجھتے، لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ساتھ اس کے

جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ

وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے اور انہی کے لئے ہیں خوبیاں، اور وہی ہیں

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

مراد کو پہنچنے والے، تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے واسطے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ ع

رہا کریں اُن میں، یہی ہے بڑی کامیابی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تمہیں ان کے مال اور اولاد (کی کثرت) سے تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں سے ان کو دُنیا میں عذاب دے، اور ان کی جان بھی کفر ہی کی حالت میں نکلے۔ ﴿۸۵﴾ اور جب کوئی سورت یہ حکم لے کر نازل ہوتی ہے کہ: ''اللہ پر اِیمان لاؤ، اور اُس کے رسول کی رفاقت میں جہاد کرو'' تو ان (منافقوں) میں سے وہ لوگ جو صاحبِ استطاعت ہیں، تم سے اجازت مانگتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہمیں بھی اُن لوگوں میں شامل ہونے دیجئے جو (گھر میں) بیٹھے رہیں گے۔ ﴿۸۶﴾ یہ اس بات سے خوش ہیں کہ پیچھے رہنے والی عورتوں میں شامل ہو جائیں، اور ان کے دِلوں پر مہر لگادی گئی ہے، چنانچہ وہ نہیں سمجھتے (کہ وہ کیا کر رہے ہیں) ﴿۸۷﴾ لیکن رسول اور جو لوگ اُن کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اُنہوں نے اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا ہے۔ اُنہی کے لئے ساری بھلائیاں ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو فلاح

پانے والے ہیں۔ ⦗۸۸⦘ اللہ نے ان کے لئے وہ باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں یہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی زبردست کامیابی ہے۔ ⦗۸۹⦘

خلاصۂ تفسیر

اور ان کے اموال اور اولاد آپ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں (کہ ایسے مبغوضین پر یہ نعمتیں کیسے ہوئیں، سو یہ واقع میں اُن کے لئے نعمتیں نہیں بلکہ آلاتِ عذاب ہیں کیونکہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان (مذکورہ) چیزوں کی وجہ سے دنیا میں (بھی) ان کو گرفتارِ عذاب رکھے اور ان کا دم حالتِ کفر ہی میں نکل جائے (جس سے آخرت میں بھی مبتلائے عذاب رہیں) اور جب کبھی کوئی ٹکڑا قرآن کا اس مضمون میں نازل کیا جاتا ہے کہ تم (خلوص دل سے) اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ہمراہ ہوکر جہاد کرو تو ان میں کے مقدور والے آپ سے رخصت مانگتے ہیں اور (رخصت کا یہ مضمون ہوتا ہے کہ) کہتے ہیں کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں (البتہ ایمان واخلاص کے دعوے میں کچھ کرنا نہیں پڑتا اس کو کہہ دیا کہ ہم تو مخلص ہیں) وہ لوگ (غایت بے حمیتی سے) خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہوگئے، اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس سے وہ (حمیت و بے حمیتی کو) سمجھتے ہی نہیں، ہاں لیکن رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی ہمراہی میں جو مسلمان ہیں انہوں نے (البتہ اس حکم کو مانا اور) اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور انہی کے لئے ساری خوبیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں، (اور وہ خوبی اور کامیابی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں (اور) وہ ان میں ہمیشہ کو رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں بھی انہی منافقین کا حال بیان کیا گیا جو غزوۂ تبوک میں شریک ہونے سے حیلے بہانے کر کے رُک گئے تھے، ان منافقین میں بعض مال دار خوش حال لوگ بھی تھے، ان کے حال سے مسلمانوں کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہیں تو ان کو دنیا میں ایسی نعمتیں کیوں ملیں۔

اس کے جواب میں پہلی آیت میں فرمایا کہ اگر غور کرو گے تو ان کے اموال و اولاد ان کے لئے رحمت و نعمت نہیں بلکہ دنیا میں بھی عذاب ہی ہیں، آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، دنیا میں عذاب ہونا اس طرح ہے کہ مال کی محبت، اس کی حفاظت کی اور پھر اس کے بڑھانے کی فکریں ان کو ایسی لگی رہتی ہیں کہ کسی وقت کسی حال چین نہیں لینے دیتیں،

ساز و سامان راحت کا ان کے پاس کتنا ہی ہو مگر راحت نہیں ہوتی، جو قلب کے سکون و اطمینان کا نام ہے، اس کے علاوہ یہ دنیا کا مال و متاع چونکہ ان کو آخرت سے غافل کر کے کفر و معاصی میں انہماک کا سبب بھی بن رہا ہے اس لئے سببِ عذاب ہونے کی وجہ سے بھی اس کو عذاب کہا جا سکتا ہے، اسی لئے الفاظ قرآن میں اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان اموال ہی کے ذریعہ ان کو سزا دینا چاہتا ہے۔

أُولُوا الطَّوْلِ کا لفظ تخصیص کے لئے نہیں، بلکہ اس سے غیر اولی الطول یعنی غیر مستطیع لوگوں کا حال بدرجۂ اولیٰ معلوم ہو گیا، کہ ان کے پاس تو ایک ظاہری عذر بھی تھا۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا

اور آئے بہانہ کرنے والے گنوار تاکہ ان کو رخصت مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ (۹۰)

اللہ سے اور اس کے رسول سے اب پہنچے گا ان کو جو کافر ہیں ان میں عذاب دردناک۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور دیہاتیوں میں سے بھی بہانہ باز لوگ آئے کہ اُن کو (جہاد سے) چھٹی دی جائے، اور (اس طرح) جن لوگوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا، وہ سب بیٹھ رہے۔ ان میں سے جنہوں نے کفر (مستقل طور پر) اپنا لیا ہے، اُن کو دردناک عذاب ہوگا۔ (۹۰)

خلاصۂ تفسیر

اور کچھ بہانہ باز لوگ دیہاتیوں میں سے آئے تاکہ ان کو (گھر رہنے کی) اجازت مل جائے اور (ان دیہاتیوں میں سے) جنہوں نے خدا سے اور اس کے رسول سے (دعوائے ایمان میں) بالکل ہی جھوٹ بولا تھا وہ بالکل ہی بیٹھ رہے (جھوٹے عذر کرنے بھی نہ آئے) ان میں جو (آخر تک) کافر رہیں گے اُن کو (آخرت میں) دردناک عذاب ہوگا (اور جو توبہ کر لیں تو عذاب سے بچ جائیں گے)۔

معارف ومسائل

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دیہاتیوں میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک تو وہ جو حیلے بہانے پیش کرنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان کو جہاد میں چلنے سے رخصت دیدی جائے، اور کچھ ایسے سرکش بھی تھے جنہوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ رخصت لے لیں اور وہ از خود ہی اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جُدّ بن قیس کو جہاد میں نہ جانے کی اجازت دیدی تو چند منافقین بھی خدمت میں حاضرِ خدمت ہوئے، اور کچھ حیلے بہانے پیش کر کے ترکِ جہاد کی اجازت مانگی، آپ نے اجازت تو دیدی، مگر یہ سمجھ لیا کہ یہ جھوٹے عذر کر رہے ہیں، [1] اس لئے ان سے اعراض فرمایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے بتلا دیا کہ ان کا عذر قابلِ قبول نہیں، اس لئے ان کو عذابِ الیم کی وعید سنائی گئی، البتہ اس کے ساتھ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْهُمْ فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان میں سے بعض کا عذر کفر و نفاق کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ طبعی سستی کے سبب تھا، وہ ان کفار کے عذاب میں شامل نہیں۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ

نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر

لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ

جن کے پاس نہیں ہے خرچ کرنے کو کچھ گناہ جبکہ دل سے صاف ہوں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ

مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ لا

نہیں ہے نیکی والوں پر الزام کی کوئی راہ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ

اور نہ ان لوگوں پر کہ جب تیرے پاس آئے تا کہ تو اُن کو سواری دے تو نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں

---

[1] التفسیر المظہری تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۷۸

مَآ اَحۡمِلُكُمۡ عَلَيۡهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّ اَعۡيُنُهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوۡا

کہ تم کو اس پر سوار کردوں تو اُلٹے پھرے اور ان کی آنکھوں سے بہتے تھے آنسو اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ چیز

مَا يُنۡفِقُوۡنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَسۡتَاۡذِنُوۡنَكَ وَهُمۡ اَغۡنِيَآءُ ۚ

جو خرچ کریں، راہ الزام کی تو اُن پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے اور وہ مالدار ہیں

رَضُوۡا بِاَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ

خوش ہوئے اس بات سے کہ وہ رہ جائیں ساتھ پیچھے رہنے والیوں کے اور مُہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر

فَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۳﴾

سو وہ نہیں جانتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کمزور لوگوں پر (جہاد میں نہ جانے کا) کوئی گناہ نہیں، نہ بیماروں پر، اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں ہے، جبکہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کے لئے مخلص ہوں۔ نیک لوگوں پر کوئی الزام نہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۹۱﴾ اور نہ اُن لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس اس غرض سے آئے کہ تم اُنہیں کوئی سواری مہیا کردو، اور تم نے کہا کہ: ''میرے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کرسکوں''، تو وہ اس حالت میں واپس گئے کہ اُن کی آنکھیں اس غم میں آنسوؤں سے بہ رہی تھیں کہ اُن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ ﴿۹۲﴾ اِلزام تو اُن لوگوں پر ہے جو مال دار ہونے کے باوجود تم سے اِجازت مانگتے ہیں۔ وہ اس بات پر خوش ہیں کہ وہ پیچھے رہنے والی عورتوں میں شامل ہوگئے۔ اور اللہ نے ان کے دِلوں پر مہر لگادی ہے، اس لئے انہیں حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔ ﴿۹۳﴾

خلاصۂ تفسیر

کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کو (سامانِ جہاد کی تیاری میں) خرچ

کرنے کو میسر نہیں جبکہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ (اور احکام میں) خلوص رکھیں (اور دل سے اطاعت کرتے رہیں تو) ان نکوکاروں پر کسی قسم کا الزام (عائد) نہیں (کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ اگر یہ لوگ اپنے علم میں معذور ہوں اور اپنی طرف سے خلوص واطاعت میں کوشش کریں اور واقع میں کچھ کمی رہ جائے تو معاف کردیں گے) اور نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ اور الزام ہے) کہ جس وقت وہ آپ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ ان کو کوئی سواری دے دیں اور آپ (ان سے) کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کردوں تو وہ (ناکام) اس حالت سے واپس چلے جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اس غم میں کہ (افسوس) ان کو (سامان جہاد کی تیاری میں) خرچ کرنے کو کچھ میسر نہیں (نہ خود ہے اور نہ دوسری جگہ سے ملا، غرض ان معذورین مذکورین پر کوئی مؤاخذہ نہیں) بس الزام (اور مؤاخذہ) تو صرف ان لوگوں پر ہے جو باوجود اہل سامان (قوت) ہونے کے (گھر پر رہنے کی) اجازت چاہتے ہیں وہ لوگ (غایت بے حمیتی سے) خانہ نشیں عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہوگئے، اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی جس سے وہ (گناہ وثواب کو) جانتے ہی نہیں۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں ایسے لوگوں کے حالات کا بیان تھا جو درحقیقت جہاد میں شرکت سے معذور نہ تھے مگر سستی کے سبب عذر کر کے بیٹھ رہے، یا ایسے منافق جنہوں نے اپنے کفر ونفاق کی وجہ سے حیلے بہانے تراش کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لی تھی، اور کچھ وہ سرکش بھی تھے جنہوں نے عذر کرنے اور اجازت لینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی، ویسے ہی بیٹھ رہے، ان کا غیر معذور ہونا اور ان میں جو کفر ونفاق کے مرتکب تھے ان کے لئے عذابِ الیم کا ہونا سابقہ آیات میں بیان ہوا ہے۔

مذکور الصدر آیات میں ان مخلص مسلمانوں کا ذکر ہے جو حقیقۃً معذور ہونے کے سبب شرکتِ جہاد سے قاصر رہے، ان میں کچھ تو نابینا یا بیمار معذور تھے جن کا عذر کھلا ہوا تھا، اور کچھ وہ لوگ بھی تھے جو جہاد میں شرکت کے لئے تیار تھے، بلکہ جہاد میں جانے کے لئے بے قرار تھے، مگر ان کے پاس سفر کے لئے سواری کا جانور نہ تھا، سفر طویل اور موسم گرمی کا تھا، انہوں نے اپنے جذبۂ جہاد اور سواری نہ ہونے کی مجبوری کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لئے سواری کا کوئی انتظام ہوجائے۔

کتب تفسیر وتاریخ میں اس قسم کے متعدّد واقعات لکھے ہیں، بعض کا معاملہ تو یہ ہوا کہ شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عذر کردیا کہ ہمارے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں، مگر یہ لوگ روتے ہوئے واپس ہوئے اور روتے

رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان کر دیا کہ چھ اونٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اُسی وقت آ گئے، آپ نے یہ اُن کو دے دیئے، (مظہری) [1] اور ان میں سے تین آدمیوں کے لئے سواری کا انتظام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کر دیا حالانکہ وہ اس سے پہلے بہت بڑی تعداد کا انتظام اپنے خرچ سے کر چکے تھے۔

بعض وہ بھی رہے کہ جن کو آخر تک سواری نہ ملی، اور مجبور ہو کر رہ گئے، آیات مذکورہ میں انہی سب حضرات کا ذکر آیا ہے، جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا، آخر میں پھر اس پر تنبیہ فرما دی کہ وبال تو صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے قدرت کے باوجود جہاد سے غیر حاضر رہنا عورتوں کی طرح پسند کیا، اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ کا یہی مطلب ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے اُن کی طرف، تو کہہ بہانے مت بناؤ

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ

ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری بات ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے احوال، اور ابھی دیکھے گا اللہ تمہارے کام

وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ

اور اس کا رسول پھر تم لوٹائے جاؤ گے طرف اس جاننے والے چھپے اور کھلے کی سو وہ بتلائے گا تم کو

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ

جو تم کر رہے تھے، اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف

لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ

تاکہ تم ان سے درگزر کرو سو تم درگزر کرو ان سے بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے،

---

[1] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۸۱

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا

بدلہ ان کے کاموں کا، وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ سو اگر راضی ہو گئے

عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

اُن سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) جب تم لوگ (تبوک سے) واپس ان (منافقوں) کے پاس جاؤ گے، تو یہ تمہارے سامنے (طرح طرح کے) عذر پیش کریں گے۔ (اے پیغمبر!) ان سے کہہ دینا کہ: ''تم عذر پیش نہ کرو ہم ہرگز تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اللہ نے ہمیں تمہارے حالات سے اچھی طرح باخبر کر دیا ہے۔ اور آئندہ اللہ بھی تمہارا طرزِ عمل دیکھے گا، اور اُس کا رسول بھی۔ پھر تمہیں لوٹا کر اُس ذات کے سامنے پیش کیا جائے گا جس کو چھپی اور کھلی تمام باتوں کا پورا علم ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔'' ﴿۹۴﴾ جب تم اِن کے پاس واپس جاؤ گے تو یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم اِن سے درگذر کرو۔ لہٰذا تم بھی اِن سے درگذر کر لینا۔ یقین جانو یہ سراپا گندگی ہیں، اور جو کمائی یہ کرتے رہے ہیں، اس کے نتیجے میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ﴿۹۵﴾ یہ تمہارے سامنے اس لئے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ تو ایسے نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔ ﴿۹۶﴾

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ تمہارے (سب کے) سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے، (سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (سب کی طرف سے صاف) کہہ دیجئے کہ (بس رہنے دو) یہ عذر پیش مت کرو ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری (واقعی حالت کی) خبر دے چکے ہیں (کہ تم کو کوئی عذر صحیح نہ تھا) اور (خیر) آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہاری کارگزاری دیکھ لیں گے (معلوم ہو جائے گا کہ حسبِ زعم خود کتنے مطیع اور مخلص ہو) پھر ایسے کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے (جس سے تمہارا کوئی اعتقاد کوئی عمل مخفی نہیں) پھر وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے (اور اس کا بدلہ دے گا) ہاں وہ اب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جاویں گے (کہ ہم معذور تھے)

جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تا کہ تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اور ملامت وغیرہ نہ کرو) سوتم (ان کا مطلب پورا کردو اور) ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اس غرض فانی کے حاصل ہونے سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا، کیونکہ) وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور (اخیر میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کے بدلہ میں جو کچھ وہ (نفاق وخلاف وغیرہ) کیا کرتے تھے (نیز اس کا بھی مقتضا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاوے، کیونکہ تعرض سے مقصود ہے اصلاح اور اس کی ان کے خبث سے امید نہیں اور نیز) یہ اس لئے قسمیں کھاویں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ سو (اوّل تو تم دشمنانِ خدا سے راضی ہی کیوں ہونے لگے لیکن بالفرض) اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو (ان کو کیا نفع کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو ایسے شریر لوگوں سے راضی نہیں ہوتا (اور بدون رضائے خالق کے رضائے خلق محض بے سود ہے)۔

معارف ومسائل

پہلی آیات میں اُن منافقین کا ذکر تھا جنہوں نے غزوۂ تبوک میں نکلنے سے پہلے جھوٹے حیلے بہانے کر کے جہاد میں جانے سے عذر کر دیا تھا، مذکور الصدر آیات میں ان کا ذکر ہے، جنہوں نے جہاد سے واپسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی جہاد سے غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کئے، یہ آیات مدینہ طیبہ واپس آنے سے پہلے نازل ہو چکی تھیں جن میں اس آئندہ پیش آنے والے واقعہ کی خبر تھی کہ جب آپ مدینہ واپس پہنچیں گے تو منافقین عذر کرنے کے لئے آپ کے پاس آئیں گے، چنانچہ اسی طرح واقعہ پیش آیا۔

آیاتِ مذکورہ میں ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین حکم دیئے گئے، اوّل یہ کہ جب یہ عذر کرنے کے لئے آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ فضول جھوٹے عذر نہ کرو، ہم تمہاری بات کی تصدیق نہ کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمیں تمہارے سب حالات اور خیالات اور تمہاری شرارت اور دلوں میں چھپے ہوئے خفیہ ارادے سب بتلا دیئے ہیں، جس سے تمہارا جھوٹا ہونا ہم پر واضح ہو گیا، اس لئے عذر بیان کرنا فضول ہے، اس کے بعد فرمایا وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ الآیۃ، اس میں ان کو مہلت دی گئی کہ اب بھی توبہ کریں نفاق چھوڑ کر سچے مسلمان ہو جائیں، کیونکہ اس میں یہ فرمایا کہ آئندہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول تمہارا عمل دیکھیں گے کہ وہ کیا اور کیسا رہتا ہے، اس کے مطابق عمل ہوگا، اگر تم توبہ کر کے سچے مسلمان ہو گئے، تو تمہارے گناہ معاف ہو جاویں گے ورنہ یہ جھوٹے حیلے بہانے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیں گے۔

دوسرا حکم دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ آپ کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر آپ کو مطمئن کرنا چاہیں گے، اور مقصد اس سے یہ ہوگا کہ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ یعنی آپ ان کی اس غیر حاضریِ جہاد کو نظر انداز کر دیں، اس پر ملامت نہ کریں، اس پر یہ ارشاد ہوا کہ ان کی یہ خواہش آپ پوری کر دیں فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ یعنی آپ ان سے اعراض کریں

نہ تو ان پر ملامت و سرزنش کریں اور نہ شگفتہ تعلقات ان سے رکھیں، کیونکہ ملامت سے تو کوئی فائدہ نہیں، جب اُن کے دل میں ایمان ہی نہیں اور اس کی طلب بھی نہیں تو ملامت کرنے سے کیا ہوگا، فضول اپنا وقت ضائع کیوں کیا جائے۔

تیسرا حکم تیسری آیت میں یہ ہے کہ یہ لوگ قسمیں کھا کر آپ کو اور مسلمانوں کو راضی کرنا چاہیں گے اس کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمادی کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ کی جائے، آپ ان سے راضی نہ ہوں، اور یہ بھی فرمادیا کہ بالفرض اگر آپ راضی بھی ہوگئے تو ان کو کوئی فائدہ اس لئے نہیں پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی نہیں ہے، اور اللہ کیسے راضی ہو جبکہ یہ اپنے کفر و منافقت پر قائم ہیں۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ

گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کئے

اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ

اللہ نے اپنے رسول پر اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور بعضے گنوار ایسے ہیں کہ شمار کرتے ہیں

مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ

اپنے خرچ کرنے کو تاوان اور انتظار کرتے ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا اُن ہی پر آئے گردش بُری،

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے، اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر

وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ

اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے اور دعاء لینی رسول کی سنتا ہے!

اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع ۱۲

وہ ان کے حق میں نزدیکی ہے، داخل کرے گا ان کو اللہ اپنی رحمت میں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

آسان ترجمۂ قرآن

جو دیہاتی (منافق) ہیں، وہ کفر اور منافقت میں زیادہ سخت ہیں، اور دوسروں سے زیادہ اِسی لائق ہیں کہ اُس دِین کے اَحکام سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر اُتارا ہے۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ ﴿۹۷﴾ انہی دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو (اللہ کے نام پر) خرچ کئے ہوئے مال کو ایک تاوان سمجھتے ہیں، اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تم مسلمانوں پر مصیبتوں کے چکر آپڑیں، (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ) بدترین مصیبت کا چکر تو خود اُن پر پڑا ہوا ہے۔ اور اللہ ہر بات سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔ ﴿۹۸﴾ اور انہی دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر اِیمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ (اللہ کے نام پر) خرچ کرتے ہیں، اُس کو اللہ کے پاس قرب کے درجے حاصل کرنے اور رسول کی دُعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہاں! یہ اُن کے لئے یقیناً تقرّب کا ذریعہ ہے۔ اللہ اُن کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۹۹﴾

خلاصۂ تفسیر

(ان منافقین میں جو) دیہاتی (ہیں وہ) لوگ (بوجہ سخت مزاجی کے) کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور (بوجہ بُعد علماء وعقلاء کے) ان کو ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو ان اَحکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائے ہیں (کیونکہ جب جاننے والوں سے دور دور رہیں گے تو ان کا جاہل رہنا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور اسی وجہ سے مزاج میں سختی اور مجموعہ سے کفر ونفاق میں شدّت ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں، (وہ ان سب امور پر مطلع ہیں اور حکمت سے مناسب سزا دیں گے) اور ان (مذکورہ منافقین) دیہاتیوں میں سے بعض بعض ایسا ہے کہ (کفر ونفاق وجہل کے علاوہ بخل وعداوت کے ساتھ بھی موصوف ہے، حتیٰ کہ) جو کچھ (جہاد وزکوٰۃ وغیرہ کے مواقع میں مسلمانوں کی شرما شرمی) خرچ کرتا ہے اس کو (مثل) جرمانہ سمجھتا ہے (یہ تو بخل ہوا) اور (عداوت یہ ہے کہ) تم مسلمانوں کے واسطے (زمانہ کی) گردشوں کا منتظر رہتا ہے (کہ کہیں اُن پر کوئی حادثہ پڑ جائے تو ان کا خاتمہ ہو سو) بُرا وقت انہی (منافقین) پر پڑنے والا ہے (چنانچہ فتوحات کی وسعت ہوئی، کفار ذلیل ہوئے ان کی ساری حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں، اور تمام عمر رنج وخوف میں کٹی) اور اللہ تعالیٰ (ان کے کفر ونفاق کی باتیں) سنتے ہیں (اور ان کے دلی خیالات اتخاذِ مغرم وتربصِ دوائر کو) جانتے ہیں (پس ان سب کی سزا دیں گے) اور بعضے اہلِ دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل

ہونے کا ذریعہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاء (لینے) کا ذریعہ بناتے ہیں (کیونکہ آپ کی عادتِ شریفہ تھی کہ ایسے مواقع پر خرچ کرنے والے کو دعاء دیتے تھے جیسا کہ احادیث میں ہے) یاد رکھو! کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان لوگوں کے لئے موجبِ قربت (عند اللہ) ہے (اور دعاء کا ہونا تو یہ خود دیکھ سن لیتے ہیں، اس کی خبر دینے کی ضرورت نہ تھی اور وہ قرب یہ ہے کہ) ضرور اُن کو اللہ تعالیٰ اپنی (خاص) رحمت میں داخل کرلیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے رحمت والے ہیں (پس ان کی لغزشیں معاف کر کے اپنی رحمت میں لے لیں گے)۔

معارف ومسائل

آیاتِ سابقہ میں منافقینِ مدینہ کا ذکر تھا ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو مدینہ کے مضافات ودیہات کے رہنے والے تھے۔

اَعْرَابُ، یہ لفظ عَرَبُ کی جمع نہیں، بلکہ اسمِ جمع ہے، جو دیہات کے باشندوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس کا مفرد بنانا ہوتا ہے تو اَعْرَابِی کہتے ہیں، جیسے اَنْصَار کا مفرد اَنْصَارِی آتا ہے۔

ان کا حال آیتِ مذکورہ میں یہ بتلایا کہ یہ کفر ونفاق میں شہر والوں سے بھی زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ علم اور علماء سے دور رہنے کے سبب عموماً جہالت اور قساوت میں مبتلا ہوتے ہیں، سخت دل ہوتے ہیں (وَاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) یعنی ان لوگوں کا ماحول ہی ایسا ہے کہ وہ اللہ کی نازل کی ہوئی حدود سے بے خبر رہیں، کیونکہ نہ قرآن ان کے سامنے آتا ہے، نہ اس کے معانی ومطالب اور اَحکام سے ان کو واقفیت ہوتی ہے۔

دوسری آیت میں بھی انہی اَعراب کا ایک حال یہ بیان کیا گیا کہ یہ لوگ جو زکوٰۃ وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو ایک تاوان سمجھ کر دیتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ دل میں ایمان تو ہے نہیں محض اپنے کفر کو چھپانے کے لئے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، اور زکوٰۃ فرض بھی دیدیتے ہیں، مگر دل میں کُڑھتے ہیں، کہ یہ مال فضول گیا، اسی لئے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑے اور ان کو شکست ہوجائے تو اس تاوان سے ہماری نجات ہو۔ اَلدَّوَائِر، دائرہ کی جمع ہے، عربی لغت کے اعتبار سے دَائِرَۃ اُس بدلی ہوئی حالت کو کہتے ہیں جو پہلی اچھی حالت کے بعد بُری ہوجائے، اسی لئے قرآن کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ یعنی انہی پر بُری حالت آنے والی ہے، اور یہ اپنے ان افعال واقوال کی بناء پر اور زیادہ ذلیل ہوں گے۔

دیہاتی منافقین کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد قرآنی اسلوب کے مطابق تیسری آیت میں ان دیہاتیوں کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھا گیا جو سچے اور پکے مسلمان ہیں، تاکہ معلوم ہوجائے کہ دیہات کے باشندے بھی سب ایک سے نہیں

ہوتے، ان میں مخلص مسلمان اور سمجھ دار لوگ بھی ہوتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ وہ جو زکوٰۃ وصدقات دیتے ہیں تو اس کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کی امید پر دیتے ہیں۔

صدقات کا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہونا تو ظاہر ہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی امید اس بنا پر ہے کہ قرآن حکیم نے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں سے اموالِ زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا ہے وہیں یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے آپ دعاء بھی کیا کریں جیسے آگے آنے والی آیت میں ارشاد ہے، خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدقات وصول کرنے کے ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ ان کے لئے دُعاء کیا کریں، یہ حکم لفظ صلوٰۃ کے ساتھ آیا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اسی لئے مذکورہ آیت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو لفظ صَلَوٰت سے تعبیر کیا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو اُن کے پیرو ہوئے

بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے اُن کے باغ کہ بہتی ہیں

تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰

نیچے ان کے نہریں رہا کریں ان میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی کامیابی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ پہلے ایمان لائے، اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ اُن کی پیروی کی، اللہ اُن سب سے راضی ہوگیا ہے، اور وہ اُس سے راضی ہیں، اور اللہ نے اُن کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی زبردست کامیابی ہے ۝۱۰۰

خلاصۂ تفسیر

اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب اُمت سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ اُمت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ (ایمان لانے میں) اُن کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا (کہ ان کا ایمان قبول فرمایا جس پر ان کو جزا ملے گی) اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے (کہ اطاعت اختیار کی جس کی جزاء سے یہ رضا اور زیادہ ہوگی) اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں دیہاتی مؤمنین مخلصین کا ذکر تھا، اس آیت میں تمام مؤمنین مخلصین کا ذکر ہے، جن میں ان کے درجاتِ فضیلت کا بھی بیان ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ اس جملہ میں اکثر حضرات مفسرین نے حرف مِنْ کو تبعیض کے لئے قرار دے کر مہاجرین و انصار، صحابہ کرام کے دو طبقے قائم کئے ہیں، ایک سابقین اوّلین کا دوسرا دوسرے درجے کے حضرات صحابہ کرام کا۔

پھر اس میں اقوال مختلفہ ہیں، بعض حضرات نے صحابہ کرام میں سے سابقین اوّلین ان کو قرار دیا ہے جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے، یعنی تحویلِ قبلہ سے پہلے جو مسلمان ہو چکے تھے، وہ سابقین اوّلین ہیں، یہ قول سعید بن مسیّبؒ اور قتادہؒ کا ہے، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے فرمایا کہ سابقین اوّلین وہ صحابہ ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، اور شعبیؒ نے فرمایا کہ جو صحابہ حدیبیہ کی بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے وہ سابقین اوّلین ہیں، اور ہر قول کے مطابق باقی صحابہ کرام مہاجر ہوں یا انصار سابقین اوّلین کے بعد دوسرے درجے میں ہیں۔ (مظہری، قرطبی) [1]

اور تفسیر مظہری میں ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ حرف مِنْ کو اس آیت میں تبعیض کے لئے نہ لیا جائے بلکہ بیان کے معنی میں ہو تو مفہوم اس جملے کا یہ ہوگا کہ تمام صحابہ کرام بہ نسبت باقی امت کے سابقین اوّلین ہیں، اور مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ اس کا بیان ہے، [2] بیان القرآن کا خلاصۂ تفسیر جو اوپر نقل کیا گیا اس میں اسی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:٨ ص:٢٣٦ والتفسير المظهري ج:٤ ص:٢٨٥

[2] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:٤ ص:٢٨٧

پہلی تفسیر کے مطابق صحابہ کرام میں دو طبقے ہو جاتے ہیں، ایک سابقین اوّلین کا، دوسرا وہ جو تحویلِ قبلہ یا غزوۂ بدر یا بیعتِ رضوان کے بعد مسلمان ہوئے، اور آخری تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ صحابہ کرام سب کے سب سابقین اوّلین ہی ہیں کیونکہ ان کا ایمان باقی اُمت سے اوّل اور سابق ہے۔

وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ''یعنی جن لوگوں نے اعمال و اخلاق میں سابقین اوّلین کا اتباع مکمل طریقہ پر کیا۔''
پہلے جملے کی پہلی تفسیر کے مطابق ان لوگوں میں درجہ اوّل ان مہاجرین و انصار صحابہ کا ہے جو تحویلِ قبلہ یا غزوۂ بدر یا بیعتِ حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو کر صحابہ کرام میں داخل ہوئے، دوسرا درجہ ان کے بعد کے سب مسلمانوں کا ہے، جو قیامت تک ایمان اور اعمالِ صالحہ اور اخلاق فاضلہ میں صحابہ کرام کے اُسوہ پر چلے، اور ان کا مکمل اتباع کیا۔

اور دوسری تفسیر کے مطابق اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا میں صحابہ کرام کے بعد کے حضرات داخل ہیں جن کو اصطلاح میں تابعی کہا جاتا ہے، اور پھر ان اصطلاحی تابعین کے بعد قیامت تک آنے والے وہ سب مسلمان بھی اس میں شامل ہیں جو ایمان و عمل صالح میں صحابہ کرام کا مکمل اتباع کریں۔

صحابہ کرام سب کے سب بلا استثناء جنتی اور اللہ تعالیٰ کی رضاء سے مشرف ہیں

محمد بن کعب قرظیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، انہوں نے کہا کہ صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں اگرچہ وہ لوگ ہوں جن سے دنیا میں غلطیاں اور گناہ بھی ہوئے ہیں، اس شخص نے دریافت کیا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی، (اس کی کیا دلیل ہے) انہوں نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھو وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اس میں تمام صحابہ کرام کے متعلق بلا کسی شرط کے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ارشاد فرمایا ہے، البتہ تابعین کے معاملہ میں اِتِّبَاعُ بِاِحْسَانٍ کی شرط لگائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید و شرط کے سب کے سب بلا استثناء رضوانِ الٰہی سے سرفراز ہیں۔

تفسیر مظہری میں یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک سب صحابہ کرام کے جنتی ہونے پر اس سے بھی زیادہ واضح استدلال اس آیت سے ہے لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ (الحدید:۱۰) اس آیت میں پوری صراحت سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام اوّلین ہوں یا آخرین سب سے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ [1]

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اُس مسلمان کو نہیں چھو سکتی جس نے مجھے

---

[1] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۸۷

دیکھا ہے یا میرے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے۔ (ترمذی عن جابرؓ) [1]

تنبیہ:- جو لوگ صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات اور ان میں پیش آنے والے واقعات کی بناء پر بعض صحابہ کرام کے متعلق ایسی تنقیدات کرتے ہیں جن کو پڑھنے والوں کے قلوب اُن کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو سکیں، وہ اپنے آپ کو ایک خطرناک راستہ پر ڈال رہے ہیں، نعوذ بالله منه۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛؔ

اور بعضے تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں، اور بعضے لوگ مدینہ والے

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ

اڑ رہے ہیں نفاق پر تو ان کو نہیں جانتا ہم کو وہ معلوم ہیں ان کو ہم عذاب دیں گے دوبار

ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ ﴿۱۰۱﴾

پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تمہارے اِردگرد جو دیہاتی ہیں، ان میں بھی منافق لوگ موجود ہیں، اور مدینہ کے باشندوں میں بھی۔ یہ لوگ منافقت میں (اتنے) ماہر ہوگئے ہیں (کہ) تم اُنہیں نہیں جانتے، اُنہیں ہم جانتے ہیں۔ اِن کو ہم دو مرتبہ سزا دیں گے، پھر اُن کو ایک زبردست عذاب کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ ﴿۱۰۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینہ والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق کی حدِّ کمال پر (ایسے) پہنچے ہوئے ہیں (کہ) آپ (بھی) ان کو نہیں جانتے (کہ یہ منافق ہیں بس) ان کو ہم ہی جانتے ہیں ہم ان کو (دوسرے منافقین کی نسبت آخرت سے پہلے بھی) دوہری سزا دیں گے (ایک نفاق کی دوسرے کمال نفاق کی اور) پھر (آخرت میں

[1] جامع الترمذي، ابواب المناقب، باب ما جاء في فضل من رای النبي صلى الله عليه وسلم وصحبه ج: ٢ ص: ٢٢٥

بھی) وہ بڑے بھاری عذاب (یعنی جہنم مع خلود دائمی) کی طرف بھیجے جاویں گے۔

معارف و مسائل

سابقہ بہت سی آیات میں ان منافقین کا ذکر آیا ہے جن کا نفاق ان کے اقوال وافعال سے ظاہر ہو چکا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے کہ یہ منافق ہیں، اس آیت میں ایسے منافقین کا ذکر ہے جن کا نفاق انتہائی کمال پر ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اب تک مخفی رہا، اس آیت میں ایسے شدید منافقین پر آخرت سے پہلے ہی دو عذاب ہونے کا ذکر آیا ہے، ایک دنیا ہی میں کہ ہر وقت اپنے نفاق کو چھپانے کی فکر اور ظاہر ہونے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی بغض وعداوت رکھنے کے باوجود ظاہر میں ان کی تعظیم وتکریم اور ان کے اتباع پر مجبور ہونا بھی کچھ کم عذاب نہیں، اور دوسرا عذاب قبر و برزخ کا عذاب ہے، جو قیامت وآخرت سے پہلے ہی ان کو پہنچے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا، ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

قریب ہے کہ اللہ معاف کرے ان کو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ پاک کرے تو اُن کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے اور دُعاء دے ان کو

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

بیشک تیری دعاء ان کے لئے تسکین ہے اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ

هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ

آپ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے زکوتیں اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے

الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط

والا مہربان ہے، اور کہہ کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول اور مسلمان،

وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ج ﴿۱۰۵﴾

اور تم جلد لوٹائے جاؤ گے اس کے پاس جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں سے واقف ہے، پھر وہ جتادے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے،

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ط

اور بعضے وہ لوگ ہیں کہ ان کا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا وہ ان کو عذاب دے اور یا ان کو معاف کرے

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے عمل کئے ہیں، کچھ نیک کام، اور کچھ بُرے۔ اُمید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرلے گا۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۰۲﴾ (اے پیغمبر!) ان لوگوں کے اَموال میں سے صدقہ وصول کرلو جس کے ذریعے تم انہیں پاک کردو گے اور اُن کے لئے باعثِ برکت بنو گے، اور اُن کے لئے دُعا کرو۔ یقیناً تمہاری دُعا اُن کے لئے سراپا تسکین ہے، اور اللہ ہر بات سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ ﴿۱۰۳﴾ کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ بھی قبول کرتا ہے، اور صدقات بھی قبول کرتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے؟ ﴿۱۰۴﴾ اور (ان سے) کہو کہ: "تم عمل کرتے رہو۔ اب اللہ بھی تمہارا طرزِ عمل دیکھے گا، اور اُس کا رسول بھی اور مؤمن لوگ بھی۔ پھر تمہیں لوٹا کر اُس ذات کے سامنے پیش کیا جائے گا جس کو چھپی اور کھلی تمام باتوں کا پورا علم ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔" ﴿۱۰۵﴾ اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا فیصلہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی کردیا گیا ہے۔ یا اللہ اُن کو سزا دے گا، یا معاف کردے گا، اور اللہ کامل علم والا بھی ہے، کامل حکمت والا بھی۔ ﴿۱۰۶﴾

خلاصہ تفسیر

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے (جیسے اعتراف جس کا منشاء ندامت ہے اور یہی توبہ ہے، اور جیسے اور غزوات جو پہلے ہو چکے ہیں، غرض یہ کام تو اچھے کئے) اور کچھ بُرے (کئے جیسے تخلف بلا عذر سو) اللہ سے امید (یعنی ان کا وعدہ) ہے کہ ان (کے حال) پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرماویں (یعنی توبہ قبول کرلیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (جب اس آیت سے توبہ قبول ہوچکی اور وہ حضرات ستونوں سے کھل چکے تو اپنا مال آپ کی خدمت میں لے کر آئے اور درخواست کی کہ اس کو اللہ کی راہ میں صَرف کیا جائے تو ارشاد ہوا کہ) آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے (لینے کے) ذریعہ سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کر دیں گے اور (جب آپ لیں تو) ان کے لئے دُعا کیجئے، بلاشبہ آپ کی دُعا ان کے لئے موجب اطمینانِ (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اعتراف کو) خوب سنتے ہیں (اور ان کی ندامت کو) خوب جانتے ہیں (اس لئے ان کے اخلاص کو دیکھ کر آپ کو یہ اَحکام دیئے گئے، ان اعمالِ صالحہ مذکورہ یعنی توبہ وندامت وانفاق فی الخیر کی ترغیب اور اعمالِ سیئہ مثل تخلّف وغیرہ سے آئندہ کے لئے ترہیب ہے، پس اوّل ترغیب ہے یعنی) کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے اور (کیا ان کو) یہ (خبر نہیں) کہ اللہ ہی (اس) توبہ قبول کرنے (کی صفت) میں اور رحمت کرنے (کی صفت) میں کامل ہے (اسی لئے ان کی توبہ قبول کی، اور اپنی رحمت سے مال قبول کرنے کا حکم اور ان کے لئے دُعا کرنے کا حکم فرمایا، پس آئندہ بھی خطایا وذنوب کے صدور پر توبہ کرلیا کریں، اور اگر توفیق ہو تو خیر خیرات کیا کریں) اور (ترغیب کے بعد آگے ترہیب ہے یعنی) آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جو چاہو) عمل کئے جاؤ سو (اوّل تو دنیا ہی میں) ابھی دیکھے لیتا ہے تمہارے عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور اہلِ ایمان (پس بُرے عمل پر دنیا ہی میں ذلت وخواری ہو جاتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ضرور تم کو ایسے (اللہ) کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے، سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلا دے گا (پس بُرے عمل سے مثل تخلف وغیرہ کے آئندہ سے احتیاط رکھو، یہ قسم اوّل کا بیان تھا، آگے قسم دوم کا ذکر ہے) اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم کے آنے تک ملتوی ہے کہ (عدم اخلاصِ توبہ کی وجہ سے) ان کو سزا دے گا یا (اخلاص کی وجہ سے) ان کی توبہ قبول کرے گا اور اللہ تعالیٰ (خلوص وعدمِ خلوص کا حال) خوب جاننے والا ہے (اور) بڑا حکمت والا ہے (پس بمقتضائے حکمت خلوص کی توبہ کو قبول کرتا ہے، اور بغیر خلوص کے قبول نہیں کرتا اور اگر کبھی بلا توبہ معاف کرنے میں حکمت ہو تو ایسا بھی کر دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

غزوۂ تبوک کے لئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ عام اور سب مسلمانوں کو چلنے کا حکم ہوا تو زمانہ سخت گرمی کا تھا، مسافت دور دراز کی تھی، اور ایک باقاعدہ بڑی حکومت کی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ تھا، جو اسلام کی تاریخ میں پہلا ہی واقعہ تھا، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے اس حکم کے متعلق لوگوں کے حالات مختلف ہوگئے، اور ان کی جماعتوں کی کئی قسمیں ہوگئیں۔

ایک قسم ان حضرات مخلصین کی تھی جو اوّل حکم سنتے ہی بلا تردّد جہاد کے لئے تیار ہوگئے، دوسری قسم وہ لوگ تھے جو ابتداءً کچھ تردّد میں رہے پھر ساتھ ہو لئے، آیت اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ (التوبۃ: ۱۱۷) میں انہی حضرات کا ذکر ہے۔

تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو واقعی طور پر معذور تھے، اس لئے نہ جا سکے، ان کا ذکر آیت لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ میں آیا ہے، چوتھی قسم ان مؤمنین مخلصین کی ہے جو عذر نہ ہونے کے باوجود سستی کاہلی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے، ان کا ذکر مذکور الصدر آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا اور وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ میں آیا ہے، پانچویں قسم منافقین کی تھی جو نفاق کے سبب شریکِ جہاد نہیں ہوئے، ان کا ذکر گزشتہ بہت سی آیات میں آچکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیات سابقہ میں بیشتر ذکر پانچویں قسم منافقین کا ہوا ہے، آیات مذکور الصدر میں چوتھی قسم کے حضرات کا ذکر ہے جو مؤمن ہونے کے باوجود سستی و کاہلی سے شریکِ جہاد نہیں ہوئے۔

پہلی آیت میں فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا، ان لوگوں کے اعمال ملے جُلے ہیں، کچھ اچھے کچھ بُرے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دس حضرات تھے جو بلا کسی صحیح عذر کے غزوۂ تبوک میں نہ گئے تھے پھر ان کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی، ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول کر کے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نہ کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے ہوئے قیدی رہیں گے، ان حضرات میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے نام پر سب روایتیں متفق ہیں، دوسرے اسماء میں مختلف روایتیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن کو بندھا ہوا دیکھا، اور معلوم ہوا کہ انہوں نے عہد یہ کیا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو نہ کھولیں گے اس وقت تک بندھے رہیں گے، تو آپ نے فرمایا کہ میں بھی اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اُس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہ دے گا، کیونکہ جرم بڑا ہے، اس پر

آیت مذکورہ نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کھولنے کا حکم دے دیا، اور وہ کھول دیئے گئے۔ (قرطبی) [1]

سعید بن مسیّبؒ کی روایت میں ہے کہ جب ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو کھولنے کا ارادہ کیا گیا تو انہوں نے انکار کیا، اور کہا کہ جب تک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپ تشریف لائے تو دستِ مبارک سے ان کو کھولا۔

نیک و بد ملے جلے عمل کیا تھے؟

آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے کچھ عمل نیک تھے، کچھ بُرے، اُن کے نیک اعمال تو ان کا ایمان، نماز، روزہ کی پابندی اور اس جہاد سے پہلے غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت اور خود اس واقعہ تبوک میں اپنے جرم کا اعتراف کر لینا اور نادم ہو کر توبہ کرنا وغیرہ ہیں، اور بُرے عمل غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونا اور اپنے عمل سے منافقین کی موافقت کرنا ہے۔

جن مسلمانوں کے اعمال اچھے بُرے ملے جلے ہوں قیامت تک وہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ یہ آیت ایک خاص جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر حکم اس کا قیامت تک عام ہے، ان مسلمانوں کے لئے جن کے اعمال نیک و بد ملے جلے ہوں اگر وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں تو ان کے لئے معافی اور مغفرت کی امید ہے۔

ابوعثمانؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اس اُمت کے لئے بڑی امید دلانے والی ہے [2] اور صحیح بخاری میں بروایت سمرہ بن جندبؓ معراجِ نبوی کی ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ساتویں آسمان پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوئی تو ان کے پاس کچھ لوگ دیکھے جن کے چہرے سفید تھے، اور کچھ ایسے کہ ان کے چہروں میں کچھ داغ دھبّے تھے یہ دوسری قسم کے لوگ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کر کے واپس آئے تو ان کے چہرے بھی بالکل صاف سفید ہو گئے تھے، جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو بتلایا کہ یہ سفید چہرے والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر گناہوں سے پاک صاف رہے، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ (الانعام: ۸۲) اور دوسرے وہ

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیات ج:۸ ص:۲۴۲

[2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۴۳

لوگ ہیں جنہوں نے ملے جلے اچھے بُرے سب طرح کے کام کئے پھر توبہ کرلی، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور گناہ معاف ہوگئے۔ (قرطبی) [۱]

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً، واقعہ اس آیت کا یہ ہے کہ جن حضرات کا اوپر ذکر ہوا کہ بلا عذر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے، پھر نادم ہوکر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا پھر آیت مذکورہ سابقہ میں ان کی توبہ کی قبولیت نازل ہوئی اور قید سے کھولے گئے تو ان حضرات نے بطور شکرانہ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے پیش کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کرنے سے انکار فرمایا کہ مجھے مال لینے کا حکم نہیں ہے، اس پر یہ آیت مذکورہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ نازل ہوئی، اور آپ نے پورے مال کے بجائے ایک تہائی مال کا صدقہ کرنا قبول فرمالیا کیونکہ آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ پورا مال نہ لیا جائے بلکہ اس کا کوئی حصہ لیا جائے، حرف مِنْ اس پر شاہد ہے۔

مسلمانوں کے صدقات زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنا اور ان کے مصرف پر خرچ کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے

اس آیت میں اگرچہ شانِ نزول کے اعتبار سے ایک خاص جماعت سے صدقہ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے۔

تفسیر قرطبی، اَحکام القرآن جصاص، مظہری وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے، اور قرطبی اور جصاص نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اگر اس آیت میں شانِ نزول وہی خاص واقعہ قرار دیا جائے جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو پھر بھی اصولِ قرآنی کی رُو سے یہ حکم عام ہی رہے گا، اور قیامت تک کے مسلمانوں پر حاوی ہوگا، [۲] کیونکہ قرآنِ کریم کے بیشتر اَحکام خاص خاص واقعات میں نازل ہوئے، مگر ان کا دائرۂ عمل کسی کے نزدیک اس خاص واقعہ تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جب تک کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو یہ حکم تمام مسلمانوں کے لئے عام اور شامل ہی قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ پوری اُمتِ محمدیہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، مگر یہ حکم نہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ آپ کے زمانہ تک محدود بلکہ ہر وہ شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام مسلمانوں کا امیر ہوگا وہ اس حکم کا مخاطب اور مامور ہوگا، اس کے فرائض میں داخل ہوگا کہ مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقات کے وصول کرنے اور مصرف پر خرچ کرنے کا انتظام کرے۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب سورة التوبة، قوله یحلفون لکم الآیة، ج:۱ ص:۲۴، وتفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۴۳

[۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۴۳، واحکام القرآن للجصاص، تفسیر سورة التوبة ج:۷ ص:۱۳۱

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں جو مانعینِ زکوٰۃ پر جہاد کرنے کا واقعہ پیش آیا اس میں بھی زکوٰۃ نہ دینے والے کچھ تو وہ لوگ تھے جو کھلّم کھلاّ اسلام سے باغی اور مرتد ہو گئے تھے، اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے مگر زکوٰۃ نہ دینے کا یہ بہانہ کرتے تھے کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے کا حکم آپ کی حیات تک تھا، ہم نے اس کی تعمیل کی، آپ کی وفات کے بعد ابو بکرؓ کو کیا حق ہے کہ ہم سے زکوٰۃ وصدقات طلب کریں، اور شروع شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر جہاد کرنے سے اسی لئے تردّد پیش آیا کہ یہ مسلمان ہیں ایک آیت کی آڑ لے کر زکوٰۃ سے بچنا چاہتے ہیں، اس لئے اُن کے ساتھ وہ معاملہ نہ کیا جائے جو عام مرتدین کے ساتھ کیا جاتا ہے، مگر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے پورے عزم اور جزم کے ساتھ فرمایا کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اس پر جہاد کریں گے۔

اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ جو لوگ حکم زکوٰۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے اور آپ کے بعد اس کے ساقط ہو جانے کے قائل ہوئے وہ کل کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی، کیونکہ قرآن کریم میں یہ آیت بھی آئی ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل:۷۸) جس میں اقامتِ صلوٰۃ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر جس طرح آیتِ نماز کا حکم پوری اُمت کے لئے عام ہے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہونے کی غلط تاویل کرنے والوں کو کفر سے نہیں بچا سکتی، اسی طرح آیت خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ میں یہ تاویل ان کو کفر وارتداد سے نہیں بچائے گی، اس پر فاروقِ اعظمؓ کو بھی اطمینان ہو گیا اور باجماعِ صحابہ ان لوگوں کے خلاف جہاد کیا گیا۔ [1]

زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے

قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ کے بعد جو ارشاد فرمایا صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کوئی حکومت کا ٹیکس نہیں، جو عام حکومتیں نظامِ حکومت چلانے کے لئے وصول کرتی ہیں، بلکہ اس کا مقصد خود اصحابِ اموال کو گناہوں سے پاک صاف کرنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کو وصول کرنے سے درحقیقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک فائدہ خود صاحبِ مال کا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ گناہوں سے اور مال کی حرص ومحبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے پاک وصاف ہو جاتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قوم کے اس ضعیف عنصر کی پرورش

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: تفسیر القرطبی تحت هذه الآيات ج:۸ ص:۲۴۴، ۲۴۵

ہوتی ہے جو خود اپنی ضروریات مہیا کرنے سے مجبور یا قاصر ہے جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، اپاہج ومعذور مرد وعورتیں اور عام فقراء ومساکین وغیرہ۔

لیکن قرآن حکیم نے اس جگہ صرف پہلا فائدہ بیان کرنے پر اقتصار کر کے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ وصدقات کا اصل مقصد پہلا ہی فائدہ ہے، دوسرا فائدہ اس سے ضمنی طور پر حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے اگر بالفرض کسی جگہ یا کسی وقت کوئی یتیم، بیوہ، فقیر، مسکین موجود نہ ہو جب بھی اصحابِ اموال سے زکوٰۃ کا حکم ساقط نہ ہوگا۔

اس مضمون کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ پچھلی امتوں میں جو مال اللہ تعالیٰ کے لئے نکالا جاتا تھا اس کا استعمال کسی کے لئے جائز نہ تھا، بلکہ دستور یہ تھا کہ اس کو کسی علیحدہ جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا اور آسمانی بجلی آکر اس کو جلا دیتی تھی، یہی علامت تھی اس بات کی کہ صدقہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اور جہاں یہ آسمانی آگ نہ آتی تو صدقہ کے غیر مقبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی، پھر اس منحوس مال کو کوئی ہاتھ نہ لگاتا تھا۔

اس سے واضح ہو گیا کہ زکوٰۃ وصدقات کی اصل مشروعیت کسی کی حاجت روائی کے لئے نہیں، بلکہ وہ ایک مالی حق اور عبادت ہے، جیسے نماز روزہ جسمانی عبادات ہیں، یہ اُمتِ مرحومہ کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ مال جو فی سبیل اللہ نکالا گیا ہے اس اُمت کے فقراء ومساکین کے لئے اس کا استعمال جائز کر دیا گیا، جیسا کہ مسلم کی حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح منقول ہے۔

ایک سوال اور جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ میں جب ان حضرات کی توبہ قبول کر لی گئی تو گناہ کی معافی اور تطہیر توبہ ہی کے ذریعہ ہو چکی، پھر مال لینے کو ذریعۂ تطہیر قرار دینے کے معنی کیا ہوں گے؟

جواب یہ ہے کہ اگرچہ توبہ سے گناہ معاف ہو گیا مگر گناہ معاف ہونے کے بعد اس کی کچھ ظلمت وکدورت باقی رہ سکتی ہے جو آئندہ ارتکابِ گناہ کا سبب بن سکتی ہے، صدقہ کرنے سے وہ کدورت دور ہو کر تطہیر کامل ہو جائے گی۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اس میں لفظ صلوٰۃ سے مراد ان کے لئے دُعائے رحمت کرنا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یہی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے آپ نے لفظ صلوٰۃ ہی سے دُعا فرمائی جیسے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِیْ اَوْفٰی حدیث میں آیا ہے، [1] لیکن بعد میں لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کی مخصوص علامت بن گئی، اس لئے اکثر فقہاء رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ اب کسی شخص کے لئے دُعا بہ لفظ صلوٰۃ نہ کی جائے، بلکہ اس لفظ کو صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص رکھا جائے، تا کہ

[1] صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب صلاۃ الإمام ودعائه لصاحب الصدقة ج:٦ ص:٢٠٣

تلبیس اور اشتباہ نہ ہو۔ (بیان القرآن وغیرہ)[1]

یہاں آپ کو صدقہ دینے والوں کے لئے دُعا کرنے کا حکم ہے، اس وجہ سے بعض حضرات فقہاء نے فرمایا کہ امام وامیر کو صدقہ ادا کرنے والوں کے لئے دعا کرنا واجب ہے، اور بعض حضرات نے اس کو امرِ استحباب قرار دیا ہے۔ (قرطبی)[2]

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ، دس حضرات مؤمنین جو بلا عذر کے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے ان میں سے سات نے تو اپنی ندامت وافسوس کا پورا اظہار اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ کر کر دیا تھا اُن کا حکم پہلی آیت میں آچکا، وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا، اس آیت سے باقی وہ تین حضرات مراد ہیں جنہوں نے یہ عمل مسجد میں قید ہونے کا نہیں کیا تھا، اور اس طرح کھلے طور پر اعتراف نہیں کیا، اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دے دیا کہ مسلمان ان کا مقاطعہ کریں، ان سے سلام کلام بند کر دیں، یہ معاملہ ہونے کے بعد ان کی حالت درست ہوگئی، اور اخلاص کے ساتھ اعترافِ جرم کر کے تائب ہوگئے، تو ان کے لئے بھی معافی کے اَحکام دے دیئے گئے۔ (صحیح بخاری ومسلم)[3]

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

اور جنہوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضد پر اور کفر پر اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں میں

وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ

اور گھات لگانے کو اس شخص کی جو لڑ رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے پہلے سے اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ

اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ

ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، تو نہ کھڑا ہو اس میں

اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ

کبھی البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی پرہیزگاری پر اوّل دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو

---

[1] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۵۵ [2] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۸ ص:۲۴۹

[3] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب سورة التوبة، باب قوله "وعلى الثلاثة الذين خلّفوا" الآية، وصحيح مسلم، كتاب التوبة، باب حديث توبة كعب بن مالك وصاحبيه ج:۲ ص:۳۶۰

فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ١٠٨

اس میں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو، اور اللہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو،

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ

بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے پر اور اس کی رضامندی پر وہ بہتر

اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۭ

یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر ایک کھائی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا دوزخ کی آگ میں،

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ١٠٩ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً

اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انہوں نے بنائی تھی شبہ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ١١٠ ع

اُن کے دلوں میں مگر جب ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل اور اللہ ہی سب کچھ سننے والا حکمت والا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

اور کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد اس کام کے لئے بنائی ہے کہ (مسلمانوں کو) نقصان پہنچائیں، کافرانہ باتیں کریں، مؤمنوں میں پھوٹ ڈالیں اور اُس شخص کو ایک اڈّہ فراہم کریں جس کی پہلے سے اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ جنگ ہے۔ اور یہ قسمیں ضرور کھالیں گے کہ بھلائی کے سوا ہماری کوئی اور نیت نہیں ہے، لیکن اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ ١٠٧ (اے پیغمبر!) تم اُس (نام نہاد مسجد) میں کبھی (نماز کے لئے) کھڑے مت ہونا۔ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس میں کھڑے ہو۔ اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک صاف ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ پاک صاف لوگوں کو پسند کرتا ہے ١٠٨ بھلا کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اُس کی خوشنودی پر اُٹھائی ہو، یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک ڈھانگ

کے کسی گرتے ہوئے کنارے پر رکھی ہو، پھر وہ اُسے لے کر جہنم کی آگ میں جا گرے؟ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ (۱۰۹) جو عمارت ان لوگوں نے بنائی تھی، وہ ان کے دِلوں میں اُس وقت تک برابر شک پیدا کرتی رہے گی جب تک ان کے دِل ہی ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جاتے۔ اور اللہ کامل علم والا بھی ہے، کامل حکمت والا بھی۔ (۱۱۰)

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے ایسے ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ (اسلام کو) ضرر پہنچاویں اور (اس میں بیٹھ بیٹھ کر) کفر (یعنی عداوتِ رسول) کی باتیں کریں اور (اس کی وجہ سے) ایمان داروں (کے مجمع) میں تفریق ڈالیں (کیونکہ جب دوسری مسجد بنائی جائے اور ظاہر کیا جائے کہ خوش نیتی سے بنی ہے تو ضرور ہے کہ پہلی مسجد کا مجمع کچھ نہ کچھ منتشر ہو ہی جاتا ہے) اور (یہ بھی غرض ہے کہ) اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس (مسجد بنانے) کے قبل سے خدا ورسول کا مخالف ہے (مراد ابو عامر راہب ہے) اور (پوچھو تو) قسمیں کھاویں گے (جیسا ایک دفعہ پہلے بھی پوچھنے پر کھا چکے ہیں) کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں (بھلائی سے مراد آسائش اور گنجائش ہے) اور اللہ گواہ ہے کہ وہ (اس دعوے میں) بالکل جھوٹے ہیں (جب اس مسجد کی یہ حالت ہے کہ وہ واقع میں مسجد ہی نہیں بلکہ مضرِ اسلام ہے تو) آپ اس میں کبھی (نماز کے لئے) کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد اوّل دن سے (یعنی روزِ تجویز سے) تقویٰ (اور اخلاص) پر رکھی گئی ہے (مراد مسجد قبا ہے) وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں (نماز کے لئے) کھڑے ہوں (چنانچہ گاہ بگاہ آپ وہاں تشریف لے جاتے اور نماز پڑھتے) اس (مسجدِ قبا) میں ایسے (اچھے) آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے (جب دونوں مسجدوں کے بانیوں کا حال معلوم ہو گیا تو) پھر (سمجھ لو) آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد خدا سے ڈرنے پر اور خدا کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص (بہتر ہوگا) جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد کسی گھاٹی (یعنی غار) کے کنارہ پر جو کہ گرنے ہی کو (ہو) رکھی ہو (مراد اس سے اغراض باطلہ کفریہ ہیں ناپائیداری میں اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی) پھر وہ (عمارت) اِس (بانی) کو لے کر آتشِ دوزخ میں گر پڑے (یعنی وہ عمارت تو گری بوجہ اس کے کہ کنارہ پر ہے، جب وہ کنارہ پانی سے کٹ کر گرے گا، وہ عمارت بھی گرے گی، اور بانی گرا اس لئے کہ اس عمارت میں رہتا تھا اور چونکہ مراد اس سے اغراضِ کفریہ ہیں جو موصل الی النار ہیں اس لئے یہ فرمایا کہ وہ اس کو لے کر جہنم میں جا گری) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (دین کی) سمجھ ہی نہیں دیتا (کہ بنائی تو مسجد کے نام سے جو کہ دین کے شعائر میں سے ہے، اور غرضیں اس میں کیسی کیسی فاسد کر لیں) اُن کی یہ عمارت (یعنی مسجد) جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (کانٹا سا) کھٹکتی

رہے گی، (کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور قلعی کھل گئی سوالگ، اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی، غرض کوئی ارمان نہ نکلا، اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا) ہاں مگر ان کے (وہ) دل ہی (جن میں وہ ارمان ہے) فنا ہو جاویں تو خیر (وہ ارمان بھی اس وقت ختم ہو جاوے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (ان کی حالت کو جانتے ہیں اور اسی کے مناسب سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

منافقین کے حالات اور خلافِ اسلام ان کی حرکتوں کا ذکر اوپر بہت سی آیات میں آچکا ہے، مذکورۃ الصدر آیات میں بھی ان کی ایک سازش کا ذکر ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک شخص ابو عامر نامی زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا، اور ابو عامر راہب کے نام سے مشہور تھا، یہ وہی شخص ہے جن کے لڑکے حنظلہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں جن کی لاش کو فرشتوں نے غسل دیا اس لئے غَسیل ملائکہ کے نام سے معروف ہوئے، مگر باپ اپنی گمراہی اور نصرانیت پر قائم رہا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابو عامر راہب حاضرِ خدمت ہوا اور اسلام پر اعتراضات کئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر بھی اس بدنصیب کا اطمینان نہ ہوا، بلکہ یہ کہا کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہو وہ مردود اور احباب و اقارب سے دور ہو کر مسافرت میں مرے، اور کہا کہ آپ کے مقابلہ میں جو بھی دشمن آئے گا میں اس کی مدد کروں گا، چنانچہ غزوۂ حنین تک تمام غزوات میں مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ قتال میں شرکت کی، جب ہوازن کا بڑا اور قوی قبیلہ بھی شکست کھا گیا تو یہ مایوس ہو کر ملکِ شام بھاگ گیا، کیونکہ یہی ملک نصرانیوں کا مرکز تھا وہیں جا کر اپنے احباب و اقارب سے دور مر گیا، جو دُعا کی تھی وہ اس کے سامنے آگئی، جب کسی شخص کی رسوائی مقدر ہوتی ہے تو وہ ایسے ہی کام کیا کرتا ہے، خود ہی اپنی دُعا سے ذلیل و خوار ہوا۔

مگر جب تک زندہ رہا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگا رہا، چنانچہ قیصر ملکِ روم کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے لشکر سے مدینہ پر چڑھائی کر دے، اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دے۔

اسی سازش کا ایک معاملہ یہ پیش آیا کہ اس نے منافقینِ مدینہ کو جن کے ساتھ اس کا ساز باز تھا خط لکھا کہ میں اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ قیصر مدینہ پر چڑھائی کرے، مگر تم لوگوں کی کوئی اجتماعی طاقت ہونی چاہئے جو اس وقت قیصر کی مدد کرے، اس کی صورت یہ ہے کہ تم مدینہ ہی میں ایک مکان بناؤ، اور یہ ظاہر کرو کہ ہم مسجد بنا رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کو شبہ نہ ہو پھر اس مکان میں تم اپنے لوگوں کو جمع کرو، اور جس قدر اسلحہ اور سامان جمع کر سکتے ہو وہ بھی کرو، یہاں مسلمانوں کے خلاف آپس کے مشورہ سے معاملات طے کیا کرو۔

اس کے مشورہ پر بارہ منافقین نے مدینہ طیبہ کے محلّہ قباء میں جہاں اوّل ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور ایک مسجد بنائی تھی وہیں ایک دوسری مسجد کی بنیاد رکھی، ان منافقین کے نام بھی ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کئے ہیں، پھر مسلمانوں کو فریب دینے اور دھوکے میں رکھنے کے لئے یہ ارادہ کیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نماز اس جگہ پڑھوادیں، تاکہ سب مسلمان مطمئن ہوجائیں کہ یہ بھی ایک مسجد ہے جیسا کہ اس سے پہلے ایک مسجد یہاں بن چکی ہے۔

ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ قباء کی موجودہ مسجد بہت سے لوگوں سے دور ہے، ضعیف بیمار آدمیوں کو وہاں تک پہنچنا مشکل ہے، اور خود مسجد قباء اتنی وسیع بھی نہیں کہ پوری بستی کے لوگ اس میں سما سکیں، اس لئے ہم نے ایک دوسری مسجد اس کام کے لئے بنائی ہے تاکہ ضعیف مسلمانوں کو فائدہ پہنچے، آپ اس مسجد میں ایک نماز پڑھ لیں تاکہ برکت ہوجائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت غزوۂ تبوک کی تیاری میں مشغول تھے، آپ نے یہ وعدہ کرلیا کہ اس وقت تو ہمیں سفر درپیش ہے، واپسی کے بعد ہم اس میں نماز پڑھ لیں گے۔

لیکن غزوۂ تبوک سے واپسی کے وقت جب آپ مدینہ طیبہ کے قریب ایک مقام پر فروکش ہوئے تو آیاتِ مذکورہ آپ پر نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کی سازش کھول دی گئی تھی، آیات کے نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند اصحاب جس میں عامر بن سکن اور وحشی قاتل حمزہؓ وغیرہ شریک تھے، ان کو حکم دیا کہ ابھی جا کر اس مسجد کو ڈھادو، اور اس میں آگ لگادو، یہ سب حضرات اُسی وقت گئے اور حکم کی تعمیل کرکے اس کی عمارت کو ڈھا کر زمین برابر کردی، یہ تمام واقعہ تفسیر قرطبی اور مظہری کی بیان کی ہوئی روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ [1]

تفسیر مظہری میں محمد بن یوسف صالحیؒ کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قباء سے مدینہ منوّرہ میں پہنچ گئے تو مسجد ضرار کی جگہ خالی پڑی تھی، آپ نے عاصم ابن عدی کو اس کی اجازت دی کہ اس جگہ میں اپنا گھر بنالیں، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ جس جگہ کے متعلق قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوچکی ہیں میں تو اس منحوس جگہ میں گھر بنانا پسند نہیں کرتا، البتہ ثابت بن اقرم ضرورت مند ہیں ان کے پاس کوئی گھر نہیں، اُن کو اجازت دے دیجئے، کہ وہ یہاں مکان بنالیں، ان کے مشورہ کے مطابق آپ نے یہ جگہ ثابت بن اقرم کو دے دی، مگر ہوا یہ کہ جب سے ثابتؓ اس مکان میں مقیم ہوئے ان کے کوئی بچہ نہیں ہوا یا زندہ نہیں رہا۔ [2]

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیات ج:۸ ص:۲۵۳، والتفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیات ج:۴ ص:۲۹۵ تا ۲۹۷

[2] التفسیر المظھری ج:۴ ص:۲۹۷

اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ انسان تو کیا اس جگہ میں کوئی مرغی بھی انڈے بچے دینے کے قابل نہ رہی کوئی کبوتر اور جانور بھی اس میں پھلا پھولا نہیں، چنانچہ اس کے بعد سے یہ جگہ آج تک مسجدِ قبا کے کچھ فاصلہ پر ویران پڑی ہے۔

واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد آیاتِ مذکورہ کے متن کو دیکھئے، پہلی آیت میں فرمایا وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا، یعنی جس طرح اوپر دوسرے منافقین کے عذاب اور ذلت ورسوائی کا ذکر ہوا ہے یہ منافقین بھی ان میں شامل ہیں جنہوں نے مسجد کا نام رکھ کر ایک ایسی عمارت بنائی جس کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس آیت میں مسجد مذکور کے بنانے کی تین غرضیں ذکر کی گئی ہیں، اوّل ضِرَارًا یعنی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے، لفظ ''ضرر'' اور ''ضرار'' دونوں عربی زبان میں نقصان پہنچانے کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، بعض حضرات نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ ''ضـــرر'' تو اس نقصان کو کہا جاتا ہے جس میں اس کے کرنے والے کا اپنا تو فائدہ ہو دوسروں کو نقصان پہنچے، اور ''ضرار'' دوسروں کو وہ نقصان پہنچانا ہے جس میں اس پہنچانے والے کا اپنا کوئی فائدہ بھی نہیں، چونکہ اس مسجد کا انجام یہی ہونے والا تھا کہ بنانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس لئے یہاں لفظ ضرار استعمال کیا گیا۔

دوسری غرض اس مسجد کی تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ بتلائی گئی ہے، یعنی ان کا مقصد اس مسجد کے بنانے سے یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے دو ٹکڑے ہو جاویں، ایک ٹکڑا اس مسجد میں نماز پڑھنے والوں کا الگ ہو جائے، اور یہ کہ قدیم مسجد قباء کے نمازی گھٹ جائیں اور کچھ لوگ یہاں نماز پڑھیں۔

تیسری غرض اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ بتلائی گئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس مسجد سے یہ کام بھی لینا تھا کہ یہاں اللہ اور رسول کے دشمنوں کو پناہ ملے اور وہ یہاں مسلمانوں کے خلاف سازش کیا کریں۔

اس مجموعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس مسجد کو قرآن کریم نے مسجد ضرار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ڈھا دیا گیا اور آگ لگائی گئی، درحقیقت نہ وہ مسجد تھی نہ اس کا مقصد نماز پڑھنے کے لئے تھا بلکہ مقاصد وہ تین تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ آج کل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں، اور بنانے کا مقصد یہی باہمی تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراضِ فاسدہ ہوں، تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب تو نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گناہگار ہوگا، لیکن بایں ہمہ اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا، اور تمام آداب اور اَحکام مساجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا، آگ لگانا جائز نہیں ہوگا، اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی، اگرچہ ایسا کرنا فی نفسہٖ گناہ رہے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس طرح رِیا و نمود کے لئے یا ضد و عناد کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنالے اگرچہ بنانے والے کو مسجد کا ثواب نہ ملے گا بلکہ گناہ ہوگا، مگر اس کو اصطلاحِ قرآن والی مسجدِ ضرار نہیں کہا جائے گا، بعض لوگ جو اس

طرح کی مسجد کو مسجدِ ضرار کہہ دیتے ہیں، یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجدِ ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس لئے اس کے بنانے کو روکا بھی جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی جماعت اور رونق متأثر ہو۔ (تفسیر کشاف)[1]

اس مسجد ضرار کے متعلق دوسری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے، "لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا" اس میں قیام سے مراد نماز کے لئے قیام ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ اس نام کی مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

مسئلہ:- اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل بلا کسی ضرورت کے محض ریاء ونمود کے لئے یا ضد وعناد کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں، اگرچہ نماز ہو جاتی ہے۔

اسی آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی ہدایت دی گئی کہ آپ کا نماز پڑھنا اسی مسجد میں درست ہے جس کی بنیاد اوّل سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور اس میں ایسے لوگ نماز پڑھتے ہیں جن کو پاکی اور طہارت میں پوری احتیاط محبوب ہے، اور اللہ بھی ایسے مُطّہّرین کو پسند کرتا ہے۔

سیاق آیت سے ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے مسجدِ قباء ہے، جس میں اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے، اور بعض روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (کما رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس وعمرو بن شیبة عن سهل الأنصاری وابن خزیمة فی صحیحه عن عویمر بن ساعدة، ازمظہری)[2]

اور بعض روایات میں جو یہ آیا ہے کہ اس سے مراد مسجدِ نبوی ہے وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ مسجدِ نبوی کی بنیاد وحی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مطہّر کون ہو سکتا ہے، اس لئے وہ بھی اس کی مصداق ضرور ہے۔ (کما رواہ الترمذی وصححه عن ابی سعید الخدریؓ مرفوعًا، ازقرطبی)[3]

"فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا" آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے لئے اس مسجد کو اَحق قرار دیا، جس کی بنیاد اوّل سے تقویٰ پر رکھی گئی جس کے مفہوم میں مسجدِ قباء اور مسجدِ نبوی دونوں داخل ہیں، اس مسجد کی ایک فضیلت یہ بھی بتلائی گئی کہ اس مسجد کے نمازی ایسے لوگ ہیں جو طہارت کا بہت زیادہ خیال اور اہتمام کرتے ہیں، طہارت کے مفہوم میں اس جگہ عام نجاسات اور گندگیوں سے پاکی بھی داخل ہے، اور معاصی اور اخلاقِ رذیلہ سے پاکی بھی،

---

۱ تفسیر الکشاف تحت هذه الآیات ج:۲ ص:۴۷۳

۲ تفسیر المظهری تحت هذه الآیات ج:۴ ص:۲۹۸

۳ جامع الترمذی، ابواب الصلاة، باب ما جاء فی المسجد الذی اسس علی التقویٰ ج:۱ ص:۷۳

مسجدِ قباء اور مسجدِ نبوی کے نمازی عموماً ان سب اوصاف کے ساتھ متصف تھے۔

فائدہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد کی فضیلت کا اصل مدار تو اس پر ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے بنائی گئی ہو، اس میں کسی ریاء اور نام و نمود کا یا کسی اور غرض فاسد کا کوئی دخل نہ ہو، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیوں کے نیک، صالح، عالم عابد ہونے سے بھی مسجد کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، جس مسجد کے نمازی عام طور پر علماء، صلحاء، تقویٰ شعار ہوں اس میں نماز ادا کرنے کی فضیلت زیادہ ہے۔

تیسری اور چوتھی آیت میں اس مسجد مقبول کے مقابلہ میں منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار کی مذمت بیان کی گئی ہے، کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دریا کے کنارے بعض اوقات پانی زمین کے حصہ کو اندر سے کھالیتا ہو اور اوپر زمین کی سطح ہموار نظر آتی ہے، اس پر اگر کوئی تعمیر کرے تو ظاہر ہے کہ وہ فوراً گر جائے گی، اسی طرح اس مسجد ضرار کی بنیاد ناپائیدار تھی، اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ گر پڑی، اور جہنم کی آگ میں گئی، جہنم کی آگ میں جانا مجازی معنی کے لئے بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے بنانے والوں کے لئے اس نے جہنم کا راستہ ہموار کر دیا، اور بعض حضرات نے اس کو حقیقت پر بھی محمول کیا ہے کہ حقیقۃً جب یہ مسجد گرائی گئی ہے تو جہنم میں گئی، واللہ اعلم۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ تعمیر ہمیشہ ان کے شک اور نفاق کو بڑھاتی ہی رہے گی، جب تک کہ ان کے قلوب قطع نہ ہو جائیں یعنی جب تک ان کی زندگی ختم نہ ہو جائے ان کا شک و نفاق اور حسد و غیظ بڑھتا ہی رہے گا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ

اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے،

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا

لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں وعدہ ہوچکا اس کے ذمہ پر سچا

فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ

توریت اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے قول کا پورا اللہ سے زیادہ

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۱﴾

سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اس سے اور یہی ہے بڑی کامیابی،

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ

وہ توبہ کرنے والے ہیں بندگی کرنے والے شکر کرنے والے بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ

حکم کرنے والے نیک بات کا اور منع کرنے والے بُری بات سے اور حفاظت کرنے والے اُن حدود کی جو باندھی اللہ نے،

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور خوش خبری سنادے ایمان والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال اس بات کے بدلے خرید لئے ہیں کہ جنت اُنہی کی ہے۔ وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں مارتے بھی ہیں، اور مرتے بھی ہیں۔ یہ ایک سچا وعدہ ہے جس کی ذمہ داری اللہ نے تورات اور انجیل میں بھی لی ہے، اور قرآن میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟ لہٰذا اپنے اُس سودے پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے کرلیا ہے۔ اور یہی بڑی زبردست کامیابی ہے۔ ﴿۱۱۱﴾ (جنہوں نے یہ کامیاب سودا کیا ہے، وہ کون ہیں؟) توبہ کرنے والے! اللہ کی بندگی کرنے والے! اُس کی حمد کرنے والے! روزے رکھنے والے! رُکوع میں جھکنے والے! سجدے گذارنے والے! نیکی کی تلقین کرنے والے، اور بُرائی سے روکنے والے! اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کی حفاظت کرنے والے! (اے پیغمبر!) ایسے مؤمنوں کو خوشخبری دے دو۔ ﴿۱۱۲﴾

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے، کہ ان کو

جنت ملے گی (اور خدا کے ہاتھ مال و جان بیچنے کا مطلب یہ ہے کہ) وہ لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) لڑتے ہیں جس میں (کبھی) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) قتل کئے جاتے ہیں (یعنی وہ بیع جہاد کرنا ہے خواہ اس میں قاتل ہونے کی نوبت آئے یا مقتول ہونے کی) اس (قتال) پر (ان سے جنت کا) سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں (بھی) اور انجیل میں (بھی) اور قرآن میں (بھی) اور (یہ مسلّم ہے کہ) اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے (اور اس نے اس بیع پر وعدہ جنت کا کیا ہے) تو (اس حالت میں) تم لوگ (جو کہ جہاد کر رہے ہو) اپنی اس بیع (مذکور) پر جس کا تم نے (اللہ تعالیٰ سے) معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ (کیونکہ اس بیع پر تم کو حسب وعدۂ مذکورہ جنت ملے گی) اور یہ (جنت ملنا) بڑی کامیابی ہے (تو ضرور تم کو یہ سودا کرنا چاہئے) وہ (مجاہدین ایسے ہیں جو علاوہ جہاد کے ان اوصافِ کمال کے ساتھ بھی موصوف ہیں کہ گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں (اور اللہ کی) عبادت کرنے والے (ہیں اور اللہ کی) حمد کرنے والے (ہیں اور) روزہ رکھنے والے (ہیں اور) رکوع اور سجدہ کرنے والے (ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں اور) نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے (ہیں) اور بُری باتوں سے باز رکھنے والے (ہیں) اور اللہ کی حدود کا (یعنی اَحکام کا) خیال رکھنے والے (ہیں) اور ایسے مؤمنین کو (جن میں جہاد اور یہ صفات ہوں) آپ خوش خبری سنا دیجئے (کہ ان سے جنت کا وعدۂ مذکورہ ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں جہاد سے بلا عذر رُکنے کی مذمت کا بیان تھا، ان آیات میں مجاہدین کی فضیلت کا بیان ہے۔

شانِ نزول

حسب تصریح اکثر حضرات مفسرین، یہ آیات بیعتِ عَقَبہ کے شرکاء کے متعلق نازل ہوئی ہیں جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں انصارِ مدینہ سے لی گئی تھی اسی لئے پوری سورت کے مدنی ہونے کے باوجود ان آیات کو مکّی کہا گیا ہے۔

عقبہ، پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرۂ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہے، (آج کل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصہ صاف کر کے میدان بنا دیا گیا ہے صرف جمرہ رہ گیا ہے) اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے، پہلی بیعت بعثتِ نبوی سے گیارہویں سال میں ہوئی، جس میں چھ حضرات مسلمان ہو کر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے، تو مدینہ کے گھر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہونے لگا، اگلے سال موسمِ حج میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے، جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے، سب نے بیعت کی،

اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوگئی، جو چالیس نفر سے زائد تھی، انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کے لئے کسی کو بھیج دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا، انہوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا، اور اسلام کی تبلیغ بھی کی، جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئیں۔

اس کے بعد بعثتِ نبوی کے تیرہویں سال میں ستر مرد، دو عورتیں اسی جگہ جمع ہوئے، یہ تیسری بیعت عقبہ ہے جو آخری ہے، اور عموماً بیعت عقبہ سے یہی بیعت مراد ہوتی ہے، یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد و اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفار سے جہاد اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ پہنچیں تو آپ کی حفاظت وحمایت پر لی گئی، اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے، آپ جو شرائط اپنے ربّ کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کردی جائیں، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ سب اس کی عبادت کریں گے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اپنے لئے یہ شرط ہے کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے اموال واولاد کی حفاظت کرتے ہو، ان لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کردیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہوکر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں، اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، نہ اس کے فسخ کرنے کو پسند کریں گے۔

اس جگہ چونکہ اس بیعت میں ظاہراً صورت ایک لین دین کے معاملے کی بن گئی تو اس پر یہ آیت بہ لفظ بیع وشراء نازل ہوئی، اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یہ آیت سن کر سب سے پہلے حضرت براء بن معرور اور ابوالہیثم اور اسعد رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، کہ ہم اس معاملہ پر تیار ہیں، آپ کی حفاظت اپنی عورتوں بچوں کی طرح کریں گے، اور آپ کے مقابلہ پر اگر دنیا کے کالے اور گورے سب جمع ہوجائیں تو ہم سب کا مقابلہ کریں گے۔

جہاد کی سب سے پہلی یہی آیت ہے

مکہ معظّمہ میں جہاد وقتال کے اَحکام نہیں تھے، یہ سب سے پہلی آیت ہے جو مکہ مکرمہ ہی میں قتال کے متعلق نازل ہوئی، اور اس کا عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا، اس کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی، اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ (الحج:۳۹)، جب یہ بیعت عقبہ کفارِ قریش مکہ سے خفیہ مکمل ہوگئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مکہ مکرمہ سے مدینہ کی ہجرت

کا حکم دے دیا، اور تدریجاً صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے کے منتظر رہے، صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا قصد کیا تو آپ نے ان کو اپنے ساتھ کے لئے روک لیا۔ (یہ پورا واقعہ تفسیر مظہری میں حوالہ کے ساتھ مذکور ہے) [۱]

یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (الی) فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد و قتال کا حکم تمام پچھلی اُمتوں کے لئے بھی سب کتابوں میں نازل کیا گیا، اور یہ جو مشہور ہے کہ انجیل میں جہاد کا حکم نہیں، ممکن ہے کہ بعد کے لوگوں نے جو تحریفات اس میں کی ہیں اس میں اَحکامِ جہاد کو خارج کر دیا گیا ہو، واللہ اعلم۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ، اس واقعہ بیعتِ عقبہ میں جو معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اس کی ظاہری صورت بیع و شراء کی بن گئی، اس لئے شروع آیت میں شراء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، اس جملہ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ معاملۂ بیع تمہارے لئے نفع کا سودا اور مبارک ہے، کیونکہ ایک فانی چیز جان و مال دے کر ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کے بدلے میں مل گئی اور غور کیا جائے تو خرچ صرف مال ہوا، جان تو یعنی رُوح تو مرنے کے بعد بھی باقی رہے گی اور ہمیشہ رہے گی، اور مال پر غور کیا جائے تو وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، انسان تو اپنی پیدائش کے وقت خالی ہاتھ آیا تھا، اسی نے سب سامان اور مال و دولت کا اس کو مالک بنایا ہے، اپنے ہی عطیہ کو آخرت کی نعمتوں اور جنت کا معاوضہ بنا کر جنت دے دی، اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ عجیب بیع ہے کہ مال اور قیمت دونوں تمہیں ہی دیدیئے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سنو! یہ کیسی نفع کی تجارت ہے جو اللہ نے ہر مؤمن کے لئے کھول دی ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں مال بخشا ہے تم اس میں سے تھوڑا خرچ کر کے جنت خرید لو۔ (مظہری) [۲]

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الآیۃ، یہ صفات انہی مؤمنین کی ہیں جن کے بارے میں اوپر یہ فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کی جان اور مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے، نزول اس کا ایک خاص جماعت شرکاءِ بیعتِ عقبہ کے لئے ہوا، مگر مفہوم آیت تمام مجاہدین فی سبیل اللہ کو شامل ہے، اور جو اوصاف ان کے اَلتَّآئِبُوْنَ اِلـــخ سے بیان کئے گئے، یہ شرط کے طور پر نہیں، کیونکہ جنت کا وعدہ مطلقاً جہاد فی سبیل اللہ پر آیا ہے، ان اوصاف کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جو لوگ جنت کے اہل ہوتے ہیں ان کے ایسے اوصاف ہوا کرتے ہیں، خصوصاً بیعتِ عقبہ میں شریک ہونے والے صحابہؓ کا یہی حال تھا۔

اَلسَّآئِحُوْنَ کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک صَـآئِمُوْن یعنی روزہ داروں کے ہیں، اصل میں یہ لفظ سیاحت سے ماخوذ ہے، اسلام سے پہلے دینِ نصرانیت میں سیاحت ایک عبادت سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنے گھر بار کو چھوڑ کر عبادت کے لئے نکل کھڑا ہو، اسلام میں اس کو رہبانیت قرار دیا گیا، اور اس سے منع کیا گیا اس کے قائم مقام روزہ کی عبادت مقرر کی

---

[۱] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیات ج:۴ ص:۲۰۲، ۲۰۳ [۲] التفسیر المظہری بحوالۂ بالا۔

گئی، کیونکہ سیاحت کا مقصد ترکِ دنیا تھا، روزہ ایسی چیز ہے کہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے ایک معین وقت میں دنیا کی تمام خواہشات کو ترک کر دینا ہوتا ہے، اور اسی بناء پر بعض روایات میں جہاد کو بھی سیاحت قرار دیا گیا ہے، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سِيَاحَةُ أُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ، [1] ''یعنی اس اُمت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں سَائِحِین کا لفظ آیا ہے اس سے مراد صَائِمِین ہیں، حضرت عکرمہؒ نے سَائِحِین کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ طالب علم ہیں جو طلب علم کے لئے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکلتے ہیں۔ (مظہری) [2]

اس جگہ مؤمنین مجاہدین کے اوصاف **تائبون، عابدون، حامدون، سائحون، راکعون، ساجدون، آمرون بالمعروف والناھون عن المنکر** سات چیزیں بیان فرمانے کے بعد آٹھواں وصف اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ فرمایا، یہ درحقیقت تمام اوصافِ مذکورۂ سابقہ کا ایک جامع لفظ ہے، گویا سات اوصاف میں جو تفصیل بتلائی گئی اس کا اجمال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ہر کام اور کلام میں حدود اللہ یعنی اَحکامِ شرعیہ کے پابند ہیں، ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ یعنی جن مؤمنین کے یہ اوصاف ہوں جو اوپر بیان کئے گئے ان کو ایسی نعمتوں کی خوش خبری سنا دیجئے جن کو کسی کا وہم وخیال بھی نہیں پا سکتا، اور نہ کسی عبارت سے اس کو سمجھایا جا سکتا ہے، اور نہ کسی کے کانوں نے ان کا تذکرہ سنا ہے، مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ

لائق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی

وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾

اگرچہ وہ ہوں قرابت والے جبکہ کھل چکا اُن پر کہ وہ ہیں دوزخ والے،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ج

اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے سو نہ تھا مگر وعدہ کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے،

---

[1] السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ج: ۹ ص: ۱۶۱ [2] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج: ۴ ص: ۳۰۴

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

پھر جب کھل گیا ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہے اللہ کا تو اس سے بیزار ہوگیا بیشک ابراہیم بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا

آسان ترجمۂ قرآن

یہ بات نہ تو نبی کو زیب دیتی ہے، اور نہ دوسرے مؤمنوں کو کہ وہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دُعا کریں، چاہے وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ اُن پر یہ بات پوری طرح واضح ہوچکی ہے کہ وہ دوزخی لوگ ہیں۔ ﴿۱۱۳﴾ اور ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے جو مغفرت کی دُعا مانگی تھی، اُس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اُنہوں نے اُس (باپ) سے ایک وعدہ کرلیا تھا۔ پھر جب اُن پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اللہ کا دُشمن ہے، تو وہ اُس سے دستبردار ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑی آہیں بھرنے والے، بڑے بُردبار تھے ﴿۱۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دُعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی (کیوں نہ) ہوں اس امر کے ظاہر ہوجانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں (اس وجہ سے کہ کافر ہوکر مرے ہیں) اور (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے شبہ ہو کہ انہوں نے اپنے باپ کے لئے دُعائے مغفرت کی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ) ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (وہ اس کے قبل تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر ہوجاوے اور) وہ (بھی) صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ کرلیا تھا (اس قول میں سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ [1] (مریم: ۴۷) غرض جواز تو اس لئے تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر نہ ہوا تھا، اور وقوع کو اس سے ترجیح ہوگئی تھی کہ وعدہ کرلیا تھا، ورنہ باوجود جواز کے بھی وقوع نہ ہوتا) پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن (یعنی کافر ہوکر مرا) ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہوگئے (کہ استغفار بھی چھوڑ دیا، کیونکہ اس وقت دعائے مغفرت کرنا بے معنی ہے، کیونکہ کافر میں احتمال مغفرت کا ہے ہی نہیں، بخلاف حالتِ حیات کے کہ دعائے مغفرت کے معنی اس وقت طلبِ توفیقِ ہدایت ہوسکتے ہیں کہ توفیقِ ہدایت کے لئے مغفرت لازم ہے، اور رہا یہ کہ وعدہ کیوں کرلیا تھا وجہ اس کی یہ ہے کہ) واقعی ابراہیم (علیہ السلام) بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے (کہ باوجودیکہ باپ نے ان کو کیسی کیسی سخت باتیں کہیں، مگر حلم سے کام لیا، اور مزید براں یہ کہ شفقت کے جوش سے وعدہ کرلیا اور احتمالِ نفع تک اس وعدہ کو پورا فرمایا، جب یاس ہوگیا ہار کر چھوڑ دیا، بخلاف تمہارے

[1] ترجمہ: اب میں تمہارے لئے اپنے ربّ سے مغفرت کی درخواست کروں گا۔

استغفار کے کہ مشرکین کے مرنے کے بعد ہو رہا ہے، جن کا حالتِ شرک پر مرنا ظاہر مشاہد سے معلوم ہے اور اَحکامِ شرعیہ میں ایسا ظاہر کافی ہے، پھر قیاس کب صحیح ہے، اور اس قیاس پر شبہ کب مبنی ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ پوری کفار و مشرکین سے تبری اور علیحدگی کے اَحکام پر مشتمل ہے، سورۃ کا شروع ہی بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ سے ہوا ہے، اور اسی لئے اس سورۃ کا ایک نام سورۂ براءت بھی معروف ہے اوپر جس قدر اَحکام آئے وہ دنیوی زندگی میں کفار و مشرکین سے براءت اور قطع تعلق کے متعلق ہیں، اس آیت میں یہی حکم براءت اور قطعِ تعلق کا اُخروی زندگی کے لئے آیا ہے، کہ مرنے کے بعد کافر و مشرک کے لئے دُعائے مغفرت کرنا بھی جائز نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ایک آیت میں منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا گیا ہے۔

واقعہ نزول اس آیت کا صحیح بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے مگر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت وحفاظت کرتے رہے، اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کسی طرح یہ کلمۂ اسلام پڑھ لیں، اور ایمان لے آئیں تو شفاعت کا موقع مل جائے گا اور جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے، مرضِ وفات میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمۂ شریف پڑھ لیں تو کام ہو جائے، چنانچہ اس حالت میں آپ ان کے پاس پہنچے، مگر ابوجہل، عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے، آپ نے فرمایا کہ میرے چچا! کلمۂ لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ پڑھ لیں تو میں آپ کی بخشش کے لئے کوشش کروں گا، مگر ابوجہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ پھر اپنا کلام دُہرایا، مگر ہر مرتبہ ابوجہل یہی کہہ دیتا، یہاں تک کہ آخری کلام میں ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں، اسی حالت میں وفات ہوگئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لئے برابر استغفار کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے، اس پر یہ آیت ممانعت کی نازل ہوئی،[1] جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے لئے دعاءِ مغفرت کرنے سے منع فرما دیا، اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہوں۔

اس پر بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے کافر باپ کے لئے دُعا کی تھی، اس

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت لا إله إلّا الله ج: ۱ ص: ۱۸۱، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی صحة إسلام من حضره الموت إلخ ج: ۱ ص: ۴۰

کے جواب میں دوسری آیت نازل ہوئی، وَمَا كَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰهِيۡمَ الآیہ، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے والد کے لئے دُعا کی تھی اس کا معاملہ یہ ہے کہ شروع میں جب تک ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر تک کفر ہی پر قائم رہے گا، اسی پر مرے گا، تو اس کا دوزخی ہونا یقینی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ میں آپ کے لئے دُعائے مغفرت کروں گا، سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ (مریم: ۴۷) پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے یعنی کفر ہی پر اس کا خاتم ہوا ہے تو اس سے بے تعلقی اختیار کرلی اور استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

قرآن مجید کے مختلف مواقع میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لئے دعاء مغفرت کرنا منقول ہے وہ سب اسی پر محمول ہونا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو ایمان واسلام کی توفیق دے تاکہ ان کی مغفرت ہوسکے۔

غزوۂ اُحد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو کفار نے زخمی کردیا تو آپ چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے یہ دُعا فرمارہے تھے: اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِقَوۡمِيۡ اِنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ، [1] ''یعنی یا اللہ میری قوم کی مغفرت فرمادے وہ نادان ہیں'' کفار کے لئے اس دُعائے مغفرت کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان کو ایمان واسلام کی توفیق عطا فرمادے کہ یہ مغفرت کے قابل ہوجائیں۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے ثابت ہوا کہ زندہ کافر کے لئے اس نیت سے دُعائے مغفرت کرنا جائز ہے کہ اس کو ایمان کی توفیق ہو اور یہ مستحق مغفرت ہوجائے۔ [2]

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۱۴﴾ لفظ اَوَّاهٌ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرطبیؒ نے اس میں پندرہ قول نقل کئے ہیں، مگر سب معانی متقاربہ ہیں، کوئی اختلاف حقیقی نہیں، ان میں سے چند معانی یہ ہیں، بکثرت آہ کرنے والا، یا بکثرت دُعا کرنے والا، اللہ کے بندوں پر رحم کرنے والا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی معنی منقول ہیں۔ [3]

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوۡمًاۢ بَعۡدَ اِذۡ هَدٰٮهُمۡ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمۡ مَّا يَتَّقُوۡنَ ؕ

اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جبکہ ان کو راہ پر لاچکا جب تک کھول نہ دے ان پر جس سے ان کو بچنا چاہئے

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ

بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے، اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں

---

[1] المعجم الكبير للطبرانيؒ رقم الحديث: ۵۵۶۲ [2] تفسير القرطبي تحت هذه الآيات ج:۸ ص:۲۷۳، ۲۷۴

[3] تفسير القرطبي تحت هذه الآيات ج:۸ ص:۲۷۵، ۲۷۶

يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

جلاتا ہے اور مارتا ہے اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے سوا حمایتی اور نہ مددگار

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کردے جب تک اُس نے اُن پر یہ بات واضح نہ کردی ہو کہ اُنہیں کن باتوں سے بچنا ہے۔ یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾ یقیناً اللہ ہی ہے جس کے قبضے میں سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔ وہ زندگی بھی دیتا ہے، اور موت بھی، اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی رکھوالا ہے نہ مددگار۔ ﴿۱۱۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کئے پیچھے گمراہ کردے جب تک کہ اُن چیزوں کو صاف صاف نہ بتلا دے جن سے وہ بچتے رہیں (پس جب ہم نے تم کو [مسلمانوں کو] ہدایت کی اور اس کے قبل استغفار للمشرکین کی ممانعت نہ بتلائی تھی تو اس کے کرنے سے تم کو یہ سزا نہیں دی جائے گی کہ تم میں گمراہی کا مادہ پیدا کردیا جاوے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (سو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بدون ہمارے بتلائے ہوئے ایسے اَحکام کو کوئی نہیں جان سکتا، اس لئے ان افعال سے مضرت بھی نہیں پہنچنے دیتے اور) بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں وہی جلاتا اور مارتا ہے، (یعنی ہر طرح کی حکومت اور قدرت اسی کے لئے خاص ہے اس لئے جو چاہے حکم دے سکتا ہے، اور جس ضرر سے چاہے بچا سکتا ہے) اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار ہے (بلکہ وہی یار و مددگار ہے، اس لئے قبل نہی تم کو ضرر سے بچاتا ہے، اور اگر تم نے بعد نہی اطاعت نہ کی تو اور کوئی بچانے والا نہیں)۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ

اللہ مہربان ہوا نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے

فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ

مشکل کی گھڑی میں بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿117﴾ وَّعَلَي الثَّلٰثَةِ

پھر مہربان ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا اور ان تین شخصوں پر

الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

جن کو پیچھے رکھا تھا، یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود کشادہ ہونے کے

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ

اور تنگ ہوگئیں اُن پر ان کی جانیں اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف،

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿118﴾ ع

پھر مہربان ہوا اُن پر تاکہ وہ پھر آئیں، بیشک اللہ ہی ہے مہربان رحم والا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿119﴾

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو ساتھ سچوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی ہے نبی پر اور اُن مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے ایسی مشکل کی گھڑی میں نبی کا ساتھ دیا، جبکہ قریب تھا کہ اُن میں سے ایک گروہ کے دِل ڈگمگا جائیں، پھر اللہ نے اُن کے حال پر توجہ فرمائی۔ یقیناً وہ ان کے لئے بہت شفیق، بڑا مہربان ہے۔ ﴿117﴾ اور اُن تینوں پر بھی (اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی ہے) جن کا فیصلہ ملتوی کردیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب اُن پر یہ زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی، اُن کی زندگیاں اُن پر

دوبھر ہو گئیں، اور اُنہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ (کی پکڑ) سے خود اُسی کی پناہ میں آئے بغیر کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی، تو پھر اللہ نے اُن پر رحم فرمایا، تاکہ وہ آئندہ اللہ ہی سے رُجوع کیا کریں۔ یقین جانو اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۱۸﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔ ﴿۱۱۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حال پر توجہ فرمائی (کہ آپ کو نبوّت اور امامتِ جہاد اور تمام خوبیاں عطا فرمائیں) اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی (توجہ فرمائی کہ ان کو ایسی مشقت کے جہاد میں مستقیم رکھا) جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہو چلا تھا (اور جہاد میں جانے سے ہمت ہارنے کو تھے مگر) پھر اللہ نے ان (گروہ) کے حال پر توجہ فرمائی (کہ ان کو سنبھال لیا اور آخر ساتھ ہو ہی لئے پس) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے (کہ اپنی مہربانی سے ہر ایک کے حال پر کس کس طرح توجہ فرمائی) اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ) زمین باوجود اپنی (اتنی بڑی) فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے) پھر ان کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی (ایسے مواقع مصیبت ومعصیت میں اللہ کی طرف) رجوع رہا کریں بے شک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے بڑے رحم کرنے والے ہیں، اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو (یعنی جو نیت اور بات میں سچے ہیں ان کی راہ چلو کہ تم بھی صدق اختیار کرو)۔

معارف ومسائل

یہاں سے چند آیات پہلے آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا کے بیان میں یہ لکھا گیا تھا کہ غزوۂ تبوک کے لئے سب مسلمانوں کو نکلنے کا حکم عام ہونے کے وقت اہلِ مدینہ کے لوگوں کی پانچ قسمیں ہوگئی تھیں، دو قسمیں متخلفین بغیر عذر کی تھیں جن کا بیان سابقہ آیات میں تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے، مذکورۃ الصدر آیات میں مؤمنینِ مخلصین کی تین قسموں کا ذکر ہے، اوّل وہ لوگ جو حکم جہاد پاتے ہی فوراً تیار ہو گئے، ان کا بیان آیتِ مذکورہ کے ابتدائی جملے میں اِتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ میں ہوا ہے، دوسرے وہ لوگ جو ابتداءً کچھ تردّد میں رہے، مگر پھر سنبھل گئے اور جہاد کے لئے سب کے ساتھ ہو گئے ان کا بیان

اسی آیت کے اس جملے میں ہے، مِنۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ۔

تیسرے وہ مؤمنین تھے جو اگرچہ وقتی کاہلی وسستی کی وجہ سے جہاد میں نہ گئے، مگر بعد میں نادم اور تائب ہوئے، اور بالآخران سب کی توبہ قبول ہوگئی، مگر ان میں پھر دو قسم ہوگئی تھیں یہ کل دس آدمی تھے، جن میں سے سات آدمیوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت وتوبہ کا اظہار اس شان سے کیا کہ اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا، کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی بندھے رہیں گے، اُن کی آیتِ توبہ تو اُسی وقت نازل ہوگئی جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے، تین آدمی وہ تھے جنہوں نے یہ عمل نہیں کیا، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مقاطعہ کا حکم دے دیا کہ کوئی ان کے ساتھ سلام وکلام نہ کرے، جس سے یہ حضرات سخت پریشان ہوگئے، ان کا ذکر دوسری آیت وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا میں ہوا ہے، جس میں بالآخران کی توبہ کے قبول ہونے کا بیان ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان سے مقاطعہ کا حکم ختم کر دیا گیا، لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن مہاجرین وانصار کی جنہوں نے تنگی اور تکلیف کے وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ تو گناہ ومعصیت کی وجہ سے ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے معصوم ہیں، ان کی توبہ قبول کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے علاوہ جو صحابہ مہاجرین وانصار اوّل ہی جہاد کے لئے تیار ہوگئے انہوں نے بھی کوئی قصور نہیں کیا تھا ان کی توبہ کس جرم کی تھی جو قبول کی گئی۔

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو گناہ سے بچا دیا، اسی کو توبہ کے نام سے تعبیر کیا گیا یا یہ کہ ان سب حضرات کو حق تعالیٰ نے توّاب بنا دیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ توبہ کی حاجت وضرورت سے کوئی شخص مستغنی نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخصوص صحابہ بھی، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا (النور: ۳۱) ''یعنی توبہ کرو اللہ سے سب کے سب'' وجہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ کے درجات غیر متناہی ہیں، جو شخص جس مقام پر پہنچا ہے اس سے آگے بھی اس سے بلند مقام ہے، جس کے مقابلہ میں موجودہ مقام پر رُک جانا ایک نقص وکوتاہی ہے، مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو ایک شعر میں اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہی ست ہر چہ بروے می رسی بروئے مایست [1]

اس لحاظ سے موجودہ مقام پر ہونے سے توبہ کی ضرورت ہے، تاکہ اگلا مقام حاصل ہو۔

سَاعَةِ الْعُسْرَةِ اسی جہاد کے موقع کو قرآنِ کریم نے سَاعَةِ الْعُسْرَةِ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ مسلمان اس وقت

---

[1] ترجمہ: اے بھائی اس درگاہ کی کوئی انتہا نہیں ہے تم جس مقام پر بھی پہنچ جاؤ اس کو آخری سمجھ کر وہیں نہ رک جاؤ۔

افلاس اور تنگی میں تھے، حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ دس آدمیوں کے لئے ایک سواری تھی جس پر باری باری سوار ہوتے تھے، توشۂ سفر بھی بہت کم اور معمولی تھا، دوسری طرف گرمی سخت وشدید تھی، پانی بھی راستہ میں کہیں کہیں اور تھوڑا تھا۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ، اس میں جو بعض لوگوں کے قلوب کا زَیغ بیان کیا گیا ہے اس سے مراد دین سے انحراف نہیں، بلکہ سختیِ موسم اور قلّتِ سامان کے سبب ہمت ہار دینا اور جہاد سے جان چرانا مراد ہے، روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں، اسی قصور سے ان کی توبہ قبول کی گئی۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ اس میں خُلِّفُوْا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، مراد یہ ہے کہ جن کی توبہ کا معاملہ مؤخر کیا گیا، یہ تین حضرات حضرت کعب بن مالکؓ شاعر، اور مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ ہیں، تینوں انصاری بزرگ تھے، جو اس سے پہلے بیعتِ عقبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے غزوات میں شریک رہ چکے تھے، مگر اس وقت اتفاقی طور سے اس لغزش میں مبتلا ہوگئے، اور منافقین جو اس جہاد میں اپنے نفاق کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے انہوں نے بھی ان کو ایسے ہی مشورے دیئے جس سے اُن کی ہمت ٹوٹ گئی، مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو ان سب منافقین نے حاضر ہوکر جھوٹے اعذار پیش کرکے اور جھوٹی قسمیں کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی باطنی حالت کو اللہ کے سپرد کردیا، اور ظاہری قسموں کو قبول کرلیا، یہ لوگ آرام سے رہنے لگے، کچھ لوگوں نے ان تینوں انصاری بزرگوں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ تم بھی جھوٹے عذر کرکے اپنی صفائی پیش کردو، مگر ان کے دلوں نے ملامت کی کہ ایک گناہ تو جہاد سے تخلّف کا کرچکے ہیں، اب دوسرا گناہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹ بولنے کا کریں، اس لئے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کرلیا، جس کی سزا میں ان سے مقاطعہ سلام وکلام جاری کیا گیا، انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان سب کی حقیقت کھول دی، جھوٹی قسمیں کھا کر عذر کرنے والوں کا پردہ فاش کردیا، جس کا ذکر اور ان کے انجام بد کا حال اس سے پہلی کئی آیات میں يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ سے عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ (سورۂ توبہ ۹۴ تا ۹۸) تک بیان ہوا ہے، اور ان تین بزرگوں نے جو سچ بولا اور اعتراف کیا اُن کی توبہ اس آیت میں نازل ہوئی، اور پچاس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض اور صحابہ کرام کے مقاطعۂ سلام وکلام کی انتہائی سخت مصیبت جھیلنے کے بعد بڑی سرخروئی اور مبارک بادوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں میں مقبول ہوئے۔

ان تینوں انصاری بزرگوں کے واقعہ کی تفصیل احادیثِ صحیحہ سے

صحیحین بخاری ومسلم اور اکثر کتبِ حدیث میں اس واقعہ کے متعلق حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک

طویل حدیث لکھی گئی ہے، [۱] جو بہت سے فوائد اور مسائل اور حقائق پر مشتمل ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا پورا ترجمہ یہاں نقل کر دیا جائے، ان تین بزرگوں میں سے ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے انہوں نے اپنے واقعہ کی تفصیل اس طرح بتلائی ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے غزوات میں شرکت کی اُن سب میں بجز غزوۂ تبوک کے آپ کے ساتھ شریک رہا، البتہ غزوۂ بدر کا واقعہ چونکہ اچانک پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو اس میں شریک ہونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا، اور شریک نہ ہونے والوں پر کوئی عتاب بھی نہیں فرمایا تھا اس میں بھی شریک نہ ہوسکا تھا، اور میں لیلۃ العقبہ کی بیعت میں بھی حاضر تھا، جس میں ہم نے اسلام کی حمایت وحفاظت کا معاہدہ کیا تھا، اور مجھے یہ بیعت عقبہ کی حاضری غزوۂ بدر کی حاضری سے بھی زیادہ محبوب ہے، اگرچہ غزوۂ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے، اور میرا واقعہ غزوۂ تبوک میں غیر حاضری کا یہ ہے کہ میں کسی وقت بھی اُس وقت سے زیادہ خوش حال اور مال دار نہ تھا بخدا میرے پاس کبھی اس سے پہلے دو سواریاں جمع نہیں ہوئی تھیں، جو اس وقت موجود تھیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ غزوات کے معاملہ میں یہ تھی کہ مدینہ سے نکلنے کے وقت اپنے ارادے کے اخفاء کے لئے ایسا کرتے تھے کہ جس سمت میں جا کر جہاد کرنا ہوتا مدینہ سے اس کے خلاف سمت کو نکلتے تھے، تاکہ منافقین مخبری کر کے فریقِ مقابل کو آگاہ نہ کر دیں، اور فرمایا کرتے تھے کہ جنگ میں (اس طرح کا) خِدَاع (دھوکہ) جائز ہے۔

یہاں تک کہ یہ غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا، (یہ جہاد کئی وجہ سے ممتاز تھا) آپ نے سخت گرمی اور تنگدستی کی حالت میں اس جہاد کا قصد فرمایا، اور سفر بھی بڑی دُور کا تھا، مقابلہ پر دشمن کی قوت اور تعداد بہت زیادہ تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا کھل کر اعلان کر دیا تاکہ مسلمان اس جہاد کے لئے پوری تیاری کر سکیں۔

اس جہاد میں شریک ہونے والوں کی تعداد صحیح مسلم کی روایت کے مطابق دس ہزار سے زائد تھی، [۲] اور حاکم کی روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ ہم اس جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو ہماری تعداد تیس ہزار سے زائد تھی۔

اور اس جہاد میں نکلنے والوں کی کوئی فہرست نہیں لکھی گئی تھی اس لئے جو لوگ جہاد میں جانا نہیں چاہتے تھے ان کو یہ

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک ج:۲ ص:۶۳۴، وصحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب حدیث توبۃ کعب بن مالک وصاحبیہ ج:۲ ص:۳۶۰، ومسند احمد، حدیث کعب بن مالک رقم الحدیث:۱۵۲۲۹

[۲] صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب حدیث توبۃ کعب بن مالک وصاحبیہ ج:۲ ص:۳۶۳

موقع مل گیا کہ ہم نہ گئے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد کے لئے نکلے تو وہ وقت تھا کہ کھجوریں پک رہی تھیں، باغات والے ان میں مشغول تھے، اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں نے سفر کی تیاری شروع کردی، اور جمعرات کے روز آپ نے اس سفر کا آغاز کیا، اور سفر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا، خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسرے مقصد کا۔

میرا حال یہ تھا کہ میں روز صبح کو ارادہ کرتا کہ جہاد کی تیاری کروں مگر بغیر کسی تیاری کے واپس آجاتا، میں دل میں کہتا تھا کہ میں جہاد پر قادر ہوں مجھے نکلنا چاہئے، مگر یوں ہی امروز وفردا میں میرا ارادہ ٹلتا رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمان جہاد کے لئے روانہ ہوگئے، پھر بھی میرے دل میں یہ آتا رہا کہ میں بھی روانہ ہوجاؤں اور کہیں راستہ میں مل جاؤں، اور کاش! کہ میں ایسا کر لیتا، مگر یہ کام (افسوس ہے کہ) نہ ہوسکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں مدینہ میں کہیں جاتا تو یہ بات مجھے غمگین کرتی تھی کہ اس وقت پورے مدینہ میں یا تو وہ لوگ نظر پڑتے تھے جو نفاق میں ڈوبے ہوئے تھے، یا پھر ایسے بیمار معذور جو قطعاً سفر کے قابل نہ تھے دوسری طرف پورے راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال کہیں نہیں آیا یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے، اس وقت آپ نے ایک مجلس میں ذکر کیا کہ کعب بن مالک کو کیا ہوا (وہ کہاں ہیں)؟

بنوسلمہ کے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا، یارسول اللہ ان کو جہاد سے ان کے عمدہ لباس اور اس پر نظر کرتے رہنے نے روکا ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا کہ تم نے یہ بری بات کہی ہے، یارسول اللہ بخدا میں نے ان میں خیر کے سوا کچھ نہیں پایا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب مجھے یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور قریب تھا کہ میں اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر گھبرا کر تیار کر لیتا اور ایسی باتیں پیش کر دیتا جس کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی سے نکل جاتا اور اس کے لئے اپنے اہل اور دوستوں سے بھی مدد لے لیتا (میرے دل میں یہ خیالات و وساوس گھومتے رہے) یہاں تک کہ جب یہ خبر ملی کہ حضور تشریف لے آئے ہیں تو خیالاتِ فاسدہ میرے دل سے مٹ گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ میں آپ کی ناراضی سے کسی ایسی بنیاد پر نہیں نکل سکتا جس میں جھوٹ ہو، اس لئے میں نے بالکل سچ بولنے کا عزم کر لیا کہ مجھے صرف سچ ہی نجات دلا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو (حسبِ عادت) چاشت کے وقت یعنی صبح کو آفتاب کچھ بلند ہونے کے وقت مدینہ میں داخل ہوئے اور عادتِ شریفہ یہی تھی کہ سفر سے واپسی کا عموماً یہی وقت ہوا کرتا تھا، اور عادت یہ تھی کہ پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے، دو رکعتیں پڑھتے، پھر حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے، اس کے بعد

ازواجِ مطہرات ؓ سے ملتے تھے۔

اسی عادت کے مطابق آپ اوّل مسجد میں تشریف لے گئے، دو رکعت ادا کی، پھر مسجد میں بیٹھ گئے، جب لوگوں نے یہ دیکھا تو غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے منافقین جن کی تعداد اسّی سے کچھ اوپر تھی خدمت میں حاضر ہو کر جھوٹے عذر پیش کر کے اس پر جھوٹی قسمیں کھانے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہری قول و قرار اور قسموں کو قبول کر لیا، اور ان کو بیعت کر لیا، ان کے لئے دُعائے مغفرت فرمائی اور ان کے باطنی حالات کو اللہ کے سپرد کیا۔

اسی حال میں، میں بھی حاضرِ خدمت ہو گیا، اور چلتے چلتے سامنے جا کر بیٹھ گیا، جب میں نے سلام کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا تبسم فرمایا جیسے ناراض آدمی کبھی کیا کرتا ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رُخ پھیر لیا، تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مجھ سے چہرۂ مبارک کیوں پھیرتے ہیں، خدا کی قسم! میں نے نفاق نہیں کیا، نہ دین کے معاملہ میں کسی شبہ و شک میں مبتلا ہوا، نہ اس میں کوئی تبدیلی کی، آپ نے فرمایا کہ پھر جہاد میں کیوں نہیں گئے؟ کیا تم نے سواری نہیں خرید لی تھی؟

میں نے عرض کیا بیشک یا رسول اللہ اگر میں آپ کے سوا دنیا کے کسی دوسرے آدمی کے سامنے بیٹھتا تو مجھے یقین ہے کہ میں کوئی عذر گھڑ کر اس کی ناراضی سے بچ جاتا، کیونکہ مجھے جدال اور بات بنانے میں مہارت حاصل ہے، لیکن قسم ہے اللہ کی کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر میں نے آپ سے کوئی جھوٹی بات کہی جس سے آپ وقتی طور پر راضی ہو جائیں تو کچھ دُور نہیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقتِ حال آپ پر کھول کر مجھ سے ناراض کر دیں گے، اور اگر میں نے سچی بات بتلا دی جس سے بالفعل آپ مجھ پر ناراض ہوں تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دیں گے، صحیح بات یہ ہے کہ جہاد سے غائب رہنے میں میرا کوئی عذر نہیں تھا، میں کسی وقت بھی مالی اور جسمانی طور پر اتنا قوی اور پیسے والا نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے تو سچ بولا ہے، پھر فرمایا کہ اچھا جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ فرما دیں، میں یہاں سے اُٹھ کر چلا تو بنی سلمہ کے چند آدمی میرے پیچھے لگے، اور کہنے لگے کہ اس سے پہلے تو ہمارے علم میں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا یہ تم نے کیا بے وقوفی کی کہ اِس وقت کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا دوسرے متخلفین نے پیش کیا، اور تمہارے گناہ کی معافی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا کافی ہو جاتا، بخدا یہ لوگ مجھے بار بار ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں لوٹ جاؤں، اور پھر جا کر عرض کروں کہ میں نے جو بات پہلے کہی تھی وہ غلط تھی، میرا عذر صحیح موجود تھا۔

مگر پھر میں نے دل میں کہا کہ میں ایک گناہ کے دو گناہ نہ بناؤں، ایک گناہ تو تخلّف کا سرزد ہو چکا ہے، دوسرا گناہ جھوٹ بولنے کا کر گزروں، پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ متخلّفین میں کوئی اور بھی میرے ساتھ ہے، جس نے اپنے

جرم کا اعتراف کرلیا ہو، ان لوگوں نے بتلایا کہ دو آدمی اور ہیں جنہوں نے تمہاری طرح اقرار جرم کرلیا، اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تمہیں کہا گیا ہے، (کہ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو) میں نے پوچھا کہ وہ دو کون ہیں، انہوں نے بتلایا کہ ایک مرارہ بن ربیع العمری دوسرے ہلال بن امیہ واقفی ہیں۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ ان میں سے پہلے (یعنی مرارہؓ) کے تخلّف کا تو سبب یہ ہوا کہ ان کا ایک باغ تھا جس کا پھل اس وقت پک رہا تھا، تو انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے اس سے پہلے بہت سے غزوات میں حصہ لیا ہے، اگر اس سال جہاد میں نہ جاؤ تو کیا جرم ہے، اس کے بعد جب انہیں اپنے گناہ پر تنبہ ہوا تو انہوں نے اللہ سے عہد کرلیا کہ یہ باغ میں نے اللہ کی راہ میں صدقہ کردیا۔

اور دوسرے بزرگ حضرت ہلال بن اُمیہ کا یہ واقعہ ہوا کہ اُن کے اہل عیال عرصہ سے متفرق تھے، اس موقع پر سب جمع ہوگئے تو یہ خیال کیا کہ اس سال میں جہاد میں نہ جاؤں اپنے اہل وعیال میں بسر کروں، ان کو بھی جب اپنے گناہ کا خیال آیا تو انہوں نے یہ عہد کیا کہ اب میں اپنے اہل وعیال سے علیحدگی اختیار کرلوں گا۔ [1]

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے ایسے دو بزرگوں کا ذکر کیا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین میں سے ہیں، تو میں نے کہا کہ بس میرے لئے انہی دو بزرگوں کا عمل قابلِ تقلید ہے، یہ کہہ کر میں اپنے گھر چلا گیا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ہم تینوں کے ساتھ سلام کلام کرنے سے منع فرمادیا، اس وقت ہم تو سب مسلمانوں سے بدستور محبت کرتے تھے مگر اُن سب کا رُخ ہم سے پھر گیا تھا۔

ابن ابی شیبہؒ کی روایت میں ہے کہ اب ہمارا حال یہ ہوگیا کہ ہم لوگوں کے پاس جاتے تو کوئی ہم سے کلام نہ کرتا نہ سلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا۔ [2]

مسند عبدالرزاق [3] میں ہے کہ اس وقت ہماری دنیا بالکل بدل گئی ایسا معلوم ہونے لگا کہ نہ وہ لوگ ہیں جو پہلے تھے نہ ہمارے باغ اور مکان وہ ہیں جو پہلے تھے، سب اجنبی نظر آنے لگے، مجھے سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر میں اس حال میں مرگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں گے، یا خدانخواستہ اس عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں عمر بھر اسی طرح سب لوگوں میں ذلیل وخوار پھرتا رہوں گا، اس کی وجہ سے میرے لئے ساری زمین بیگانہ وویرانہ نظر آنے لگی، اسی حال میں ہم پر پچاس راتیں گزر گئیں، اس زمانہ میں میرے دونوں ساتھی (مرارہ اور ہلال) تو شکستہ دل ہوکر گھر میں بیٹھ رہے، اور رات دن روتے تھے، لیکن میں جوان آدمی تھا، باہر نکلتا اور چلتا پھرتا تھا اور نماز میں سب مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور بازاروں میں پھرتا تھا مگر نہ کوئی مجھ سے کلام کرتا نہ میرے سلام کا جواب دیتا،

[1] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۰۹۱۸ [2] مصنف ابن ابی شیبۃ ج:۸ ص:۵۵۹، ۵۶۰ [3] مسند عبدالرزاق ج:۵ ص:۴۰۲، ۴۰۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں نماز کے بعد حاضر ہوتا اور سلام کرتا تو یہ دیکھا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک کو جوابِ سلام کے لئے حرکت ہوئی یا نہیں، پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا تو نظر چُرا کر آپ کی طرف دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جب میں نماز میں مشغول ہو جاتا ہوں تو آپ میری طرف دیکھتے ہیں اور جب میں آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو رُخ پھیر لیتے ہیں۔

جب لوگوں کی یہ بیوفائی دراز ہوئی تو ایک روز میں اپنے چچازاد بھائی قتادہؓ کے پاس گیا جو میرے سب سے زیادہ دوست تھے میں اُن کے باغ میں دیوار پھاند کر داخل ہوا اور ان کو سلام کیا، خدا کی قسم! انہوں نے بھی میرے سلام کا جواب نہ دیا، میں نے پوچھا کہ اے قتادہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں، اس پر بھی قتادہ نے سکوت کیا، کوئی جواب نہیں دیا، جب میں نے بار بار یہ سوال دُہرایا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ میں انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اللہ جانتا ہے اور اس کا رسول، میں رو پڑا اور اسی طرح دیوار پھاند کر باغ سے باہر آ گیا، اسی زمانہ میں ایک روز میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ اچانک ملکِ شام کا ایک نبطی شخص جو غلہ فروخت کرنے کے لئے شام سے مدینہ میں آیا تھا اس کو دیکھا کہ لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کیا کوئی مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتا سکتا ہے؟ لوگوں نے مجھے دیکھ کر میری طرف اشارہ کیا، وہ آدمی میرے پاس آ گیا اور مجھے شاہِ غسان کا ایک خط دیا جو ایک ریشمی رومال پر لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے نبی نے آپ سے بیوفائی کی اور آپ کو دور کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت اور ہلاکت کی جگہ میں نہیں رکھا ہے، تم اگر ہمارے یہاں آنا پسند کرو تو آ جاؤ ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

میں نے جب یہ خط پڑھا تو کہا کہ یہ اور ایک میرا امتحان اور آزمائش آئی کہ اہلِ کفر کو مجھ سے اس کی طمع اور توقع ہوگئی (کہ میں ان کے ساتھ مل جاؤں) میں یہ خط لے کر آگے بڑھا ایک دُکان پر تنور لگا ہوا تھا اس میں جھونک دیا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب پچاس میں سے چالیس راتیں گزر چکی تھیں تو اچانک دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قاصد خزیمہ بن ثابت میرے پاس آ رہے ہیں، آ کر یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنی بیوی سے بھی علیحدگی اختیار کر لو، میں نے پوچھا کہ کیا طلاق دیدوں یا کیا کروں، انہوں نے بتلایا کہ نہیں عملاً اس سے الگ رہو قریب نہ جاؤ، اسی طرح کا حکم میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا، میں نے بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکہ میں چلی جاؤ، اور وہیں رہو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ فرما دیں۔

ہلال بن اُمیہؓ کی اہلیہ خولہ بنت عاصم یہ حکم سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا

کہ ہلال بن اُمیہ ایک بوڑھے ضعیف آدمی ہیں اور کوئی ان کا خادم نہیں، ابن ابی شیبہؒ [۱] کی روایت یہ بھی ہے کہ وہ ضعیف البصر بھی ہیں کیا آپ یہ پسند نہیں فرمائیں گے کہ میں ان کی خدمت کرتی رہوں، فرمایا کہ خدمت کرنے کی ممانعت نہیں البتہ وہ تمہارے پاس نہ جائیں، انہوں نے عرض کیا کہ وہ تو بڑھاپے کی وجہ سے ایسے ہوگئے ہیں کہ ان میں کوئی حرکت ہی نہیں، اور واللہ اُن پر تو مسلسل گریہ طاری ہے رات دن روتے رہتے ہیں۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے بھی میرے بعض متعلقین نے مشورہ دیا کہ تم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیوی کو ساتھ رکھنے کی اجازت لے لو جیسا کہ آپ نے ہلالؓ کو اجازت دے دی ہے، میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کروں گا، معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیں اس کے علاوہ میں جوان آدمی ہوں (بیوی کو ساتھ رکھنا احتیاط کے خلاف ہے) چنانچہ اسی حال پر میں نے دس راتیں اور گزاریں، یہاں تک کہ پچاس راتیں مکمل ہوگئیں، مسند عبدالرزاق [۲] کی روایت میں ہے کہ اس وقت ہماری توبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تہائی رات گزرنے کے وقت نازل ہوئی، اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا جو اُس وقت حاضر تھیں انہوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو کعب بن مالکؓ کو اسی وقت اس کی خبر کر دی جائے، آپ نے فرمایا کہ ایسا ہوا تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہو جائے گا، رات کی نیند مشکل ہو جائے گی۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پچاسویں رات کے بعد صبح کی نماز پڑھ کر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور حالت وہ تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے کہ مجھ پر میری جان اور زمین باوجود وسعت کے تنگ ہو چکی تھی، اچانک میں نے سلع پہاڑ کے اوپر کسی چلّانے والے کی آواز سنی جو بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ اے کعب بن مالک بشارت ہو۔

محمد بن عمرو کی روایت میں ہے کہ یہ بلند آواز سے کہنے والے ابوبکر تھے جنہوں نے جبل سلع پر چڑھ کر یہ آواز دی کہ اللہ تعالیٰ نے کعبؓ کی توبہ قبول فرمالی بشارت ہو، اور عقبہ کی روایت میں ہے کہ یہ خوشخبری حضرت کعبؓ کو سنانے کے لئے دو آدمی دوڑے ان میں سے ایک آگے بڑھ گیا تو جو پیچھے رہ گیا تھا اس نے یہ کیا کہ سلع پہاڑ پر چڑھ کر آواز دے دی اور کہا جاتا ہے کہ یہ دوڑنے والے دو بزرگ حضرت صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما تھے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آواز سن کر میں سجدے میں گر گیا اور انتہائی فرحت سے رونے لگا، اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اب کشادگی آ گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو ہماری توبہ قبول ہونے کی خبر دی تھی، اب سب طرف سے لوگ ہم تینوں کو مبارک باد دینے کے لئے دوڑ پڑے، بعض لوگ گھوڑے پر سوار

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبۃ ج:۸ ص:۵۶۱ [۲] مسند عبدالرزاق ج:۵ ص:۴۰۴

ہو کر میرے پاس پہنچے مگر پہاڑ سے آواز دینے والے کی آواز سب سے پہلے پہنچ گئی۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلا تو لوگ جوق در جوق مجھے مبارک باد دینے کے لئے آرہے تھے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں مسجدِ نبوی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، آپ کے گرد صحابہ کرام کا مجمع ہے، مجھے دیکھ کر سب سے پہلے طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہو کر میری طرف لپکے اور مجھ سے مصافحہ کر کے قبولِ توبہ پر مبارک باد دی، طلحہؓ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولتا، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ کا چہرۂ مبارک خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ اے کعب! بشارت ہو تمہیں ایسے مبارک دن کی جو تمہاری عمر میں پیدائش سے لے کر آج تک سب سے زیادہ بہتر دن ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ حکم آپ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، تم نے سچ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی کو ظاہر فرمادیا۔

جب میں آپ کے سامنے بیٹھا تو عرض کیا یا رسول اللہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنے سب مال ومتاع سے نکل جاؤں کہ سب کو اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں، آپ نے فرمایا نہیں کچھ مال اپنی ضرورت کے لئے رہنے دو یہ بہتر ہے، میں نے عرض کیا کہ اچھا آدھا مال صدقہ کردوں، آپ نے اس سے بھی انکار فرمایا، میں نے پھر ایک تہائی مال کی اجازت مانگی، تو آپ نے اس کو قبول فرمالیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اللہ نے سچ بولنے کی وجہ سے نجات دی ہے اس لئے میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں کبھی سچ کے سوا کوئی کلمہ نہیں بولوں گا، پھر فرمایا کہ جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سچ بولنے کا عہد کیا تھا الحمد للہ کہ آج تک کوئی کلمہ جھوٹ کا میری زبان پر نہیں آیا، اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی زندگی میں بھی مجھے اس سے محفوظ رکھیں گے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اسلام کے بعد اس سے بڑی نعمت مجھے نہیں ملی، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ بولا، جھوٹ سے پرہیز کیا، کیونکہ اگر میں جھوٹ بولتا تو اسی طرح ہلاکت میں پڑجاتا جس طرح دوسرے جھوٹی قسمیں کھانے والے ہلاک ہوئے، جن کے بارے میں قرآن میں یہ نازل ہوا: سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ سے فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۹۶﴾ (التوبۃ) تک بعض حضرات نے فرمایا کہ ان تینوں حضرات سے مقاطعہ کا پچاس دن تک جاری رہنا شاید اس حکمت پر مبنی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ تبوک میں پچاس دن ہی صرف ہوئے تھے۔ (یہ پوری روایت اور تفصیلی واقعہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے) [1]

---

[1] التفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۴ ص:۳۱۳ تا ۳۱۹

فوائد متعلقہ حدیث مذکور کعب بن مالک رضی اللہ عنہ

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے واقعہ کو جس شرح وبسط اور تفصیل سے بیان فرمایا ہے اس میں مسلمانوں کے لئے بہت سے فوائد اور ہدایات ہیں، اسی لئے اس جگہ اس حدیث کو پورا لکھا گیا ہے وہ فوائد یہ ہیں:

۱- اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ عام غزوات میں یہ تھی کہ جس طرف جانا ہوتا اس کی مخالف سمت سے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے تاکہ مخالفینِ اسلام کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ کس قوم یا قبیلہ کے جہاد کے لئے جا رہے ہیں، اسی کو آپ نے فرمایا اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ [1] یعنی جنگ میں دھوکہ دینا جائز ہے، اس سے بعض لوگ اس مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں کہ جنگ و جہاد میں جھوٹ بول کر مخالف کو دھوکہ دینا جائز ہے یہ صحیح نہیں بلکہ مراد اس دھوکہ سے یہ ہے کہ اپنا عمل ایسا کرے جس سے مخالفین دھوکہ میں پڑ جائیں، جیسے جہاد کے لئے مخالف سمت سے نکلنا، صریح جھوٹ بول کر دھوکہ دینا مراد نہیں وہ جنگ میں بھی جائز نہیں، اسی طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ عملی دھوکہ جس کو جائز قرار دیا ہے اس کا کوئی تعلق عہد و معاہدہ سے نہیں، اور عہد شکنی صلح ہو یا جنگ کسی حال میں جائز نہیں۔

۲- سفر کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا، خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسری ضرورت کا۔

۳- اپنے کسی بزرگ، مرشد یا استاد یا باپ کو راضی کرنے کے لئے جھوٹ بولنا جائز بھی نہیں اور اس کا انجام بھی اچھا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حقیقتِ حال کا علم بذریعہ وحی ہو جاتا تھا، اس لئے جھوٹ بولنے کا انجام بُرا تھا جیسا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور دوسرے متخلّفین کے واقعہ مذکورہ سے واضح ہوا، آپ کے بعد دوسرے بزرگوں کو وحی تو ہو نہیں سکتی الہام و کشف سے علم ہو جانا بھی ضروری نہیں، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ جھوٹ بولنے کی ایک نحوست ہوتی ہے کہ قدرتی طور پر ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ بالآخر یہ بزرگ اس سے ناراض ہو ہی جاتا ہے۔

۴- اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ بھی حق ہے کہ کسی شخص سے سلام و کلام قطع کر دینے کا حکم دیدے جیسے اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔

۵- اس واقعہ سے صحابہ کرام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت معلوم ہوئی کہ اس ناراضی اور مقاطعہ سلام و کلام کے زمانہ میں بھی غایت محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری بھی نہیں چھوڑی اور کن انکھیوں سے دیکھ کر آپ کی توجہ اور تعلق کا حال معلوم کرنے کی فکر رہی۔

۶- کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے گہرے دوست قتادہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ، کہ ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الحرب خدعة ج:۱ ص:۴۲۵

کوئی کلام نہ کیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ کسی دشمنی یا مخالفت یا بغض سے نہیں بلکہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی وجہ سے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا قانون صرف لوگوں کے ظاہر پر نافذ نہ ہوتا تھا بلکہ دلوں پر بھی اس کی حکومت ہوتی تھی اور حاضر و غائب کسی حال میں اس کے خلاف نہ کرتے تھے اگرچہ اس میں کسی بڑے سے بڑے دوست عزیز کے خلاف ہی ہو۔

۷- حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے پاس بادشاہِ غسّان کا خط آنے اور اس کو تنور میں ڈالنے کے واقعہ سے صحابہ کرام کے ایمان کی انتہائی پختگی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے مقاطعہ سے سخت پریشان ہونے کے عالم میں بھی ایک بڑے بادشاہ کے لالچ دلانے سے ان کے دل میں کوئی میلان پیدا نہیں ہوا۔

۸- قبولِ توبہ نازل ہونے کے بعد صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ اور عام صحابہ کرامؓ کا کعب بن مالکؓ کو بشارت دینے کے لئے دوڑنا اور اس سے پہلے سب کا سلام و کلام تک سے سخت پرہیز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقاطعہ کے زمانے میں بھی ان سب کے دلوں میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے محبت اور تعلق تھا، مگر حکمِ رسول کے سامنے سب کچھ چھوڑا ہوا تھا، جب آیتِ توبہ نازل ہوئی تو اُن کے گہرے تعلق کا اندازہ ہوا۔

۹- صحابہ کرام کا حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو خوشخبری دینے اور مبارک باد کے لئے جانے سے معلوم ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر اپنے دوست احباب کو مبارک باد دینا سنت سے ثابت ہے۔

۱۰- کسی گناہ سے توبہ کے وقت مال کا صدقہ کرنا گناہ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے بہتر ہے مگر تمام مال خیرات کر دینا اچھا نہیں، ایک تہائی مال سے زائد صدقہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ سابقہ آیات میں جو واقعہ تخلُّف عن الجہاد کا بعض مخلصین سے پیش آیا پھر ان کی توبہ قبول ہوئی یہ سب نتیجہ ان کے تقویٰ اور خوفِ خدا کا تھا، اس لئے اس آیت میں عام مسلمانوں کو تقویٰ کے لئے ہدایت فرمائی گئی، اور كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ صفتِ تقویٰ حاصل ہونے کا طریقہ صالحین و صادقین کی صحبت اور عمل میں ان کی موافقت ہے، اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ جن حضرات سے یہ لغزش ہوئی اس میں منافقین کی صحبت و مجالست اور ان کے مشورہ کو بھی دخل تھا، اللہ کے نافرمانوں کی صحبت سے بچنا چاہئے اور صادقین کی صحبت اختیار کرنا چاہئے، اس جگہ قرآن کریم نے علماء صلحاء کے بجائے صٰدِقِیْنَ کا لفظ اختیار فرما کر عالم وصالح کی پہچان بھی بتلادی ہے کہ صالح صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، نیت و ارادے کا بھی سچا ہو، قول کا بھی سچا ہو، عمل کا بھی سچا ہو۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا

نہ چاہئے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد کے گنواروں کو کہ پیچھے رہ جائیں

عَنْ رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

رسول اللہ کے ساتھ سے اور نہ یہ کہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسول کی جان سے، یہ اس واسطے کہ جہاد کرنے والے

لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا

نہیں پہنچتی ان کو پیاس اور نہ محنت اور نہ بھوک اللہ کی راہ میں اور نہیں قدم رکھتے کہیں

يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ

جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے واسطے اس کے بدلے نیک عمل

إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً

بیشک اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکی کرنے والوں کا، اور نہ خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا

وَّلَا كَبِيرَةً وَّلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ

اور نہ بڑا، اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان مگر لکھ لیا جاتا ہے اُن کے واسطے تاکہ بدلہ دے ان کو اللہ بہتر

مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾

اس کام کا جو کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

مدینہ کے باشندوں اور ان کے اردگرد کے دیہات میں رہنے والوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اللہ کے رسول

(کا ساتھ دینے سے) پیچھے رہیں، اور نہ یہ جائز تھا کہ وہ بس اپنی جان پیاری سمجھ کر اُن کی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) جان سے بے فکر ہو بیٹھیں۔ یہ اس لئے کہ اِن (مجاہدین) کو جب کبھی اللہ کے راستے میں پیاس لگتی ہے، یا تھکن ہوتی ہے، یا بھوک ستاتی ہے، یا وہ کوئی ایسا قدم اُٹھاتے ہیں جو کافروں کو گھٹن میں ڈالے، یا دُشمن کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں تو اُن کے اعمال نامے میں (ہر ایسے کام کے وقت) ایک نیک عمل ضرور لکھا جاتا ہے۔ یقین جانو کہ اللہ نیک لوگوں کے کسی عمل کو بیکار جانے نہیں دیتا۔ ﴿۱۲۰﴾ نیز وہ جو کچھ (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں، چاہے وہ خرچ چھوٹا ہو یا بڑا، اور جس کسی وادی کو وہ پار کرتے ہیں، اس سب کو (اُن کے اعمال نامے میں نیکی کے طور پر) لکھا جاتا ہے، تاکہ اللہ اُنہیں (ہر ایسے عمل پر) وہ جزا دے جو اُن کے بہترین اعمال کے لئے مقرر ہے۔ ﴿۱۲۱﴾

خلاصۂ تفسیر

مدینہ کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی ان کے گردوپیش میں (رہتے) ہیں ان کو یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہ دیں اور نہ یہ (زیبا تھا) کہ اپنی جان کو ان کی جان سے عزیز سمجھیں (کہ آپ تو تکلیفیں سہیں اور یہ آرام سے بیٹھے رہیں، بلکہ آپ کے ہمراہ جانا ضروری تھا اور) یہ (ساتھ جانے کا ضروری ہونا) اس سبب سے ہے کہ (علاوہ ادائے حق محبتِ رسول کے اُن مجاہدین کو بات بات پر ثواب حاصل ہوا ہے اگر یہ اخلاص کے ساتھ جاتے ان کو بھی یہ ملتا چنانچہ) ان کو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں جو پیاس لگی اور جو ماندگی پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو چلنا چلے جو کفار کے لئے موجب غیظ ہوا ہو اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا (باوجودیکہ بعض امور افعالِ اختیاریہ نہیں، مگر یہ مقتضائے مقبولیت ومحبوبیت ہے کہ امور اضطراریہ بھی مثل اعمالِ اختیاریہ کے موجب ثواب قرار دیئے گئے، اور اس وعدہ میں احتمال تخلّف کا نہیں کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے (پس وعدہ کرلیا تو ضائع نہ ہوگا) اور (نیز) جو کچھ چھوٹا یا بڑا انہوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان ان کو طے کرنے پڑے یہ سب بھی ان کے نام (نیکیوں میں) لکھا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے (ان سب) کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے (کیونکہ جب ثواب لکھا گیا تو بدلہ ملے گا)۔

معارف ومسائل

اِن دونوں آیتوں میں متخلّفین کو تخلّف پر ملامت اور فہمائش اور شرکاءِ جہاد کے فضائل اور بسلسلۂ جہاد قدم قدم پر ہر قول وفعل اور ہر محنت ومشقت پر اجر عظیم کا ذکر ہے جس میں بوقتِ جہاد دشمن کو کوئی تکلیف پہنچادینا اور ایسی چال چلنا جس

سے ان کو غیظ ہو یہ سب اعمالِ صالحہ موجبِ ثواب ہیں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ

اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا

طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ

ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جبکہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف

لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع ۱۵

تاکہ وہ بچتے رہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور مسلمانوں کے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ (ہمیشہ) سب کے سب (جہاد کے لئے) نکل کھڑے ہوں، لہٰذا ایسا کیوں نہ ہو کہ اُن کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ (جہاد کے لئے) نکلا کرے، تاکہ (جو لوگ جہاد میں نہ گئے ہوں) وہ دِین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لئے محنت کریں، اور جب اِن کی قوم کے لوگ (جو جہاد میں گئے ہیں) اِن کے پاس واپس آئیں تو یہ اُن کو متنبہ کریں، تاکہ وہ (گناہوں سے) بچ کر رہیں۔ ﴿۱۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (ہمیشہ کے لئے) مسلمانوں کو یہ (بھی) نہ چاہئے کہ (جہاد کے واسطے) سب کے سب (ہی) نکل کھڑے ہوں (کہ اس میں دوسری اسلامی ضروریات معطل ہوتی ہیں) سوایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے (اور کچھ اپنے وطن میں رہ جایا کریں) تاکہ باقی ماندہ لوگ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ سے اور آپ کے بعد علماءِ شہر سے) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو (جو کہ جہاد میں گئے ہوئے ہیں) جبکہ وہ ان کے پاس واپس آویں (دین کی باتیں سنا کر خدا کی نافرمانی سے) ڈراویں تاکہ وہ (اُن سے دین کی باتیں سن کر بُرے کاموں سے) احتیاط رکھیں۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ میں بڑی اہمیت کے ساتھ غزوۂ تبوک کا ذکر مسلسل چلا آیا ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نفیرِ عام کا اعلان کیا گیا تھا کہ سب مسلمان اس میں شریک ہوں، اس حکم کی خلاف ورزی بلا عذر صحیح جائز نہ تھی، جو لوگ خلاف ورزی میں مبتلا ہوئے ان میں زیادہ تو منافقین تھے جن کا ذکر بہت سی آیات میں اوپر آیا ہے، کچھ مخلص مؤمن بھی تھے جو وقتی کاہلی اور سُستی کے سبب رہ گئے تھے، ان کی توبہ حق تعالیٰ نے قبول فرمالی، ان سب واقعات سے بظاہر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر جہاد اور غزوہ میں سبھی مسلمانوں کو نکلنا فرض اور تخلّف حرام ہے، حالانکہ حکمِ شرعی یہ نہیں، بلکہ جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کی کچھ جماعت جو جہاد کے لئے کافی ہو جہاد میں مشغول رہے تو باقی مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، ہاں اگر جہاد میں شریک ہونے والی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی تقویت کے لئے نکلنا اور جہاد میں شریک ہونا فرض ہوجاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے متصل جو مسلمان ہیں اُن پر یہاں تک کہ سارے عالم کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہوجاتا ہے جس سے تخلّف حرام ہے، اسی طرح فرض ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر نفیرِ عام کرے اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد کی شرکت فرض اور تخلّف حرام ہوجاتا ہے جیسا واقعہ غزوۂ تبوک میں نفیرِ عام کی وجہ سے پیش آیا، مذکور الصدر آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ غزوۂ تبوک میں نفیرِ عام کی وجہ سے خصوصی حکم تھا، عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں کہ سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو، کیونکہ جہاد کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور مہمات بھی ہیں جو جہاد ہی کی طرح فرض کفایہ ہیں، ان کے لئے بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تقسیمِ کار کے اصول پر کام کرنا ہے اس لئے سب مسلمانوں کو ہر جہاد میں نکلنا نہیں چاہئے، اسی مضمون سے فرض کفایہ کی حقیقت بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو کام شخصی نہیں اجتماعی ہیں اور سب مسلمانوں پر ان کے پورا کرنے کی ذمہ داری ہے ان کو شریعت میں فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے، تاکہ تقسیمِ کار کے اصول پر سب کام اپنی اپنی جگہ چلتے رہیں اور یہ اجتماعی فرائض سب ادا ہوتے رہیں، مسلمان مردوں پر نمازِ جنازہ اور اس کی تکفین، مساجد کی تعمیر و نگرانی، جہاد، اسلامی سرحدوں کی حفاظت یہ سب اسی فرضِ کفایہ کے افراد ہیں کہ ان کی ذمہ داری تو پورے عالم کے مسلمانوں پر ہے مگر بقدرِ کفایت کچھ لوگ کرلیں تو دوسرے مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، اسی فرضِ کفایہ کے سلسلہ کا ایک اہم کام دینی تعلیم ہے، اس آیت میں خصوصیت سے اس کے فرض ہونے کا اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ جہاد جیسے اہم فرض میں بھی اس فرض کو چھوڑنا نہیں، جس کی صورت یہ ہے کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت

جہاد کے لئے نکلے، اور باقی لوگ علمِ دین حاصل کرنے میں لگیں، پھر یہ علمِ دین حاصل کر کے جہاد میں جانے والے مسلمانوں کو اور دوسرے لوگوں کو علم دین سکھائیں۔

طلبِ علمِ دین کا فرض ہونا اور اُس کے آداب و فرائض

امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت طلب علم دین کی اصل اور بنیاد ہے، [۱] اور غور کیا جائے تو اسی آیت میں علم دین کا اجمالی نصاب بھی بتلا دیا گیا ہے اور علم حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض بھی، اس لئے اس مضمون کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے:

علمِ دین کے فضائل

علمِ دین کے فضائل اور ثوابِ عظیم اور اس کے متعلقات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس جگہ چند مختصر روایات نقل کی جاتی ہیں، ترمذی نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''جو شخص کسی راستے پر چلے جس کا مقصد علم حاصل کرنا ہو اللہ تعالیٰ اس چلنے کے ثواب میں اس کا راستہ جنگ کی طرف کر دیں گے، اور یہ کہ اللہ کے فرشتے طالب علم کے لئے اپنے پَر بچھاتے ہیں اور یہ کہ عالم کے لئے تمام آسمانوں اور زمین کی مخلوقات اور پانی کی مچھلیاں دُعا و استغفار کرتی ہیں، اور یہ کہ عالم کی فضیلت کثرت سے نفلی عبادت کرنے والے پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی سب ستاروں پر، اور یہ کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام سونے چاندی کی کوئی میراث نہیں چھوڑتے لیکن علم کی وراثت چھوڑتے ہیں، تو جس شخص نے یہ وراثت علمِ حاصل کر لی اس نے بڑی دولت حاصل کر لی۔'' (از قرطبی) [۲]

اور دارمی نے اپنے مسند میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے، ایک عالم تھا جو صرف نماز پڑھ لیتا اور پھر لوگوں کو دین کی تعلیم دینے میں مشغول ہو جاتا تھا، دوسرا دن بھر روزہ رکھتا، اور رات کو عبادت میں کھڑا رہتا تھا، ان دونوں میں کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر'' [۳] (یہ روایت امام عبدالبر

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۲۹۳

[۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۲۹۵، وجامع الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة ج:۲ ص:۹۷

[۳] مسند دارمی رقم الحدیث: ۳۴۹

نے کتاب جامع بیان العلم [۱] میں سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے) (قرطبی) [۲]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عبادت گزاروں سے زیادہ قوی ہے اور بھاری ہے، (ترمذی عن ابن عباسؓ، ازمظہری) [۳] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب انسان کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے، ایک صدقۂ جاریہ، جیسے مسجد یا دینی تعلیم کی عمارت یا رفاہِ عام کے ادارے، دوسرے وہ علم جس سے اس کے بعد بھی لوگ نفع اٹھاتے رہیں (مثلاً شاگرد عالم ہوگئے، ان سے آگے لوگوں کو علم دین سکھانے کا سلسلہ چلتا رہا، یا کوئی کتاب تصنیف کی جس سے اس کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہے، تیسرے اولاد صالح جو اس کے لئے دعاء اور ایصالِ ثواب کرتی رہے۔ (ازقرطبی) [۴]

علمِ دین کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی تفصیل

ابن عدی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ازمظہری) [۵] "یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلمان پر" یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ سابقہ احادیث میں عِلم سے مراد علمِ دین ہی ہے، دنیوی علوم وفنون عام دنیا کے کاروبار کی طرح انسان کے لئے ضروری سہی، مگر ان کے وہ فضائل نہیں جو احادیث مذکورہ میں آئے ہیں، پھر علم دین ایک علم نہیں، بہت سے علوم پر مشتمل ایک جامع نظام ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر مسلمان مرد وعورت اس پر قادر نہیں، کہ ان سب علوم کو پورا حاصل کرسکے، اس لئے حدیث مذکور میں جو ہر مسلمان پر فرض فرمایا ہے اس سے مراد علمِ دین کا صرف وہ حصہ ہے جس کے بغیر آدمی نہ فرائض ادا کرسکتا ہے نہ حرام چیزوں سے بچ سکتا ہے، جو ایمان واسلام کے لئے ضروری ہے، باقی علوم کی تفصیلات قرآن وحدیث کے تمام معارف ومسائل پھر اُن سے نکالے ہوئے اَحکام وشرائع کی پوری تفصیل یہ نہ ہر مسلمان کی قدرت میں ہے نہ ہر ایک پر فرضِ عین ہے، البتہ پورے عالمِ اسلام کے ذمہ فرضِ کفایہ ہے، ہر شہر میں ایک عالم ان تمام علوم وشرائع کا ماہر موجود ہو تو باقی مسلمان اس فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، اور جس شہر یا قصبہ میں ایک بھی عالم نہ ہو تو شہر والوں پر فرض ہے کہ اپنے میں سے کسی کو عالم بنائیں، یا باہر سے کسی عالم کو بلا کر اپنے شہر میں رکھیں تاکہ

---

[۱] جامع بیان العلم وفضلہ، باب فضل العالم علی العابد کفضلی علی امتی رقم الحدیث:۷۴ (بالإختصار)

[۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۹۶

[۳] جامع الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة، ج:۲ ص:۹۷، والتفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۳۲۴

[۴] تفسیر القرطبی فی آخر تفسیر سورة آل عمران ج:۴ ص:۳۲۵، وصحیح مسلم، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته ج:۲ ص:۴۱

[۵] سنن ابن ماجة المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج:۱ ص:۲۰، وشعب الإیمان للبیهقیؒ رقم الحدیث:۱۶۱۴، والتفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۳۲۳

ضرورت پیش آنے پر باریک مسائل کو اس عالم سے فتویٰ لے کر سمجھ سکیں، اور عمل کر سکیں، اس لئے علم دین میں فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی تفصیل یہ ہے کہ:-

فرضِ عین

ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے کہ اسلام کے عقائدِ صحیحہ کا علم حاصل کرے اور طہارت، نجاست کے اَحکام سیکھے، نماز روزہ اور تمام عبادات جو شریعت نے فرض وواجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرے، جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان کا علم حاصل کرے، جس شخص کے پاس بقدرِ نصاب مال ہو اس پر فرض ہے کہ زکوٰۃ کے مسائل واَحکام معلوم کرے، جس کو حج پر قدرت ہے اس کے لئے فرضِ عین ہے کہ حج کے اَحکام ومسائل معلوم کرے، جس کو بیع وشراء کرنا پڑے یا تجارت وصنعت یا مزدوری واجرت کے کام کرنے پڑیں اس پر فرض عین ہے کہ بیع واجارہ وغیرہ کے مسائل واَحکام سیکھے، جب نکاح کرے تو نکاح کے اَحکام ومسائل اور طلاق کے اَحکام ومسائل معلوم کرے، غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض وواجب کئے ہیں ان کے اَحکام ومسائل کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔

علمِ تصوّف بھی فرضِ عین میں داخل ہے

اَحکامِ ظاہرہ نماز، روزے کو تو سبھی جانتے ہیں کہ فرضِ عین ہیں، اور ان کا علم حاصل کرنا بھی فرضِ عین ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری [۱] میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اعمالِ باطنہ اور محرّماتِ باطنہ کا علم جس کو عرف میں علمِ تصوّف کہا جاتا ہے چونکہ یہ باطنی اعمال بھی ہر شخص پر فرضِ عین ہیں تو ان کا علم بھی سب پر فرضِ عین ہے۔

آج کل جس کو علمِ تصوّف کہا جاتا ہے وہ بھی بہت سے علوم ومعارف اور مکاشفات وواردات کا مجموعہ بن گیا ہے اس جگہ فرضِ عین سے مراد اس کا صرف وہ حصہ ہے جس میں اعمالِ باطنہ فرض وواجب کی تفصیل ہے، مثلاً عقائدِ صحیحہ جس کا تعلق باطن سے ہے یا صبر، شکر، توکل، قناعت وغیرہ ایک خاص درجے میں فرض ہیں، یا غرور وتکبر، حسد وبغض، بخل وحرصِ دنیا وغیرہ جو از روئے قرآن وسنت حرام ہیں، ان کی حقیقت اور اس کے حاصل کرنے یا حرام چیزوں سے بچنے کے طریقے معلوم کرنا بھی ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، علمِ تصوّف کی اصل بنیاد اتنی ہی ہے جو فرضِ عین ہے۔

فرضِ کفایہ

پورے قرآن مجید کے معانی ومسائل کو سمجھنا، تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا،

---

[۱] التفسير المظهری ج:۴ ص:۳۲۴

قرآن وسنت سے جو احکام ومسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، اس میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال وآثار سے واقف ہونا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کرکے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں، اس لئے شریعت نے اس علم کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے، کہ بقدرِ ضرورت کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کرلیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

علمِ دین کا نصاب

قرآنِ حکیم نے اس جگہ علم دین کی حقیقت اور اس کا نصاب بھی ایک ہی لفظ میں بتلا دیا ہے، وہ ہے لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ، یہ موقع بظاہر اس کا تھا کہ یہاں يَتَعَلَّمُوْنَ الدِّيْنَ کہا جاتا، یعنی علم دین حاصل کریں، مگر قرآن نے اس جگہ تَعَلُّم کا لفظ چھوڑ کر تَفَقُّه کا لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ علمِ دین کا محض پڑھ لینا کافی نہیں، وہ تو بہت سے کافر یہودی نصرانی بھی پڑھتے ہیں، اور شیطان کو سب سے زیادہ حاصل ہے، بلکہ علمِ دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے، یہی لفظ تَفَقُّه کا ترجمہ ہے، اور یہ فقہ سے مشتق ہے، فقہ کے معنی سمجھ بوجھ ہی کے ہیں، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ مجرد کے صیغے سے لِيَفْقَهُوا الدِّيْنَ "یعنی تا کہ وہ دین کو سمجھ لیں" نہیں فرمایا بلکہ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ فرمایا، جو باب تَفَعُّل سے ہے اس کے معنی میں محنت ومشقت کا مفہوم شامل ہے مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری محنت ومشقت اُٹھا کر مہارت حاصل کریں، یہ بھی ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ صرف اتنی بات سے پیدا نہیں ہوتی کہ طہارت، نجاست یا نماز، روزے، زکوٰۃ، حج کے مسائل معلوم کرے، بلکہ دین کی سمجھ بوجھ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے ہر قول وفعل اور حرکت وسکون کا آخرت میں اس سے حساب لیا جائے گا، اس کو اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے، در اصل اسی فکر کا نام دین کی سمجھ بوجھ ہے، اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان ان تمام کاموں کو سمجھ لے جن کا کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور ان تمام کاموں کو بھی سمجھ لے جن سے بچنا اس کے لئے ضروری ہے، [1] آج کل جو علمِ فقہ مسائلِ جزئیہ کے علم کو کہا جاتا ہے یہ بعد کی اصطلاح ہے، قرآن وسنت میں فقہ کی حقیقت وہی ہے جو امام اعظمؒ نے بیان فرمائی ہے کہ جس شخص نے دین کی کتابیں سب پڑھ ڈالیں مگر یہ سمجھ بوجھ پیدا نہ کی وہ قرآن وسنت کی اصطلاح میں عالم نہیں، اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ علمِ دین حاصل کرنے کا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے وہ جن ذرائع سے حاصل ہو، وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت، سب اس نصاب کے اجزاء ہیں۔

---

[1] البحر الرائق، مقدمة الكتاب ج:۱ ص:۹، والشامي، مقدمة ج:۱ ص:۱۵۳

علمِ دین حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض

اس جگہ قرآنِ کریم نے اس کو بھی ایک ہی جملہ میں پورا بیان فرما دیا ہے، وہ ہے لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ ''یعنی تاکہ وہ اپنی قوم کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں۔'' یہاں بھی یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس جملہ میں عالم کا فرض انذارِ قوم بتلایا ہے، انذار کا لفظی ترجمہ ہم اردو میں ڈرانے سے کرتے ہیں مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمہ کو ادا نہیں کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا دشمن، چور، ڈاکو یا کسی درندے، زہریلے جانور سے ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت سے اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور مضر غذاء سے ڈراتا ہے جس کا منشاء شفقت ومحبت ہوتی ہے، اس کا لب ولہجہ بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے، انذار اسی قسم کے ڈرانے کا نام ہے اسی لئے پیغمبروں اور رسولوں کو نذیر کا لقب دیا گیا ہے اور عالم کا یہ فریضہ انذار درحقیقت وراثتِ نبوّت ہی کا جز ہے جو بنصِ حدیث عالم کو حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دو لقب ہیں، بشیر اور نذیر، نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں، بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوشخبری سنانے والا، انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت سنائیں، اس جگہ بھی اگرچہ صراحۃً ذکر انذار کا کیا گیا ہے، مگر دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنے والوں کو بشارت بھی سنائے، لیکن اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفاء کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمہ دو کام ہیں ایک یہ کہ جو عمل اس کے لئے دنیا وآخرت میں مفید ہیں ان کو اختیار کرے، دوسرے یہ کہ جو عمل اس کے لئے مضر ہیں ان سے بچے، باتفاق علماء وعقلاء ان دونوں کاموں میں سے دوسرا کام سب سے مقدم اور اہم ہے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں جلبِ منفعت اور دفعِ مضرّت کے دو لفظوں سے تعبیر کر کے دفعِ مضرّت کو جلبِ منفعت سے مقدم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ دفعِ مضرّت میں ایک حیثیت سے جلبِ منفعت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے، کیونکہ جو کام انسان کے لئے مفید اور ضروری ہیں ان کا ترک بڑی مضرّت ہے تو جو شخص مضرّتِ اعمال سے بچنے کا اہتمام کرے گا وہ اعمالِ ضروریہ کے ترک سے بچنے کا بھی اہتمام کرے گا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو عموماً وعظ وتبلیغ بہت کم مؤثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے، جس کے طرزِ بیان اور لب ولہجے سے شفقت ورحمت اور خیر خواہی مترشح ہو، مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رسوا کرنا ہے نہ بدنام کرنا نہ اپنے دل کا غبار نکالنا، بلکہ یہ جس چیز کو میرے لئے مفید اور

ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے مجھے بتلا رہا ہے، اگر آج ہماری تبلیغ اور خلاف شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی، وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اس کو قبول بھی کرے گا اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم از کم اس سے باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا، جس میں آج کل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

آخر میں لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس کی تبلیغ و دعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا، ایک دفعہ مؤثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا رہے، تا کہ اس کا نتیجہ يَحْذَرُونَ برآمد ہو سکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ

اے ایمان والو لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے کافروں سے اور چاہئے کہ اُن پر معلوم ہو تمہارے اندر

غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۳﴾ وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ

سختی اور جانو کہ اللہ ساتھ ہے ڈرنے والوں کے، اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت

فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا

تو بعضے ان میں کہتے ہیں کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں

فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۱۲۴﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ

ان کا زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان اور وہ خوش وقت ہوتے ہیں، اور جن کے دل میں مرض ہے

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۲۵﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ

سو اُن کے لئے بڑھا دی گندگی پر گندگی اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے، کیا نہیں دیکھتے کہ

اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ

وہ آزمائے جاتے ہیں ہر برس میں ایک بار یا دو بار پھر بھی توبہ نہیں کرتے

وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ

اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں، اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو دیکھنے لگتا ہے ان میں ایک دوسرے کی طرف

هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

کہ کیا دیکھتا ہے تم کو کوئی مسلمان پھر چل دیتے ہیں، پھیر دیئے ہیں اللہ نے دل اُن کے

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اس واسطے کہ وہ لوگ ہیں کہ سمجھ نہیں رکھتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اُن کافروں سے لڑو جو تم سے قریب ہیں، اور ہونا یہ چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں۔ اور یقین رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ ﴿۱۲۳﴾ اور جب کبھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو انہی (منافقین) میں وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ: ''اس (سورت) نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟'' اب جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو (واقعی) ایمان لائے ہیں، اُن کے ایمان میں تو اس سورت نے واقعی اضافہ کیا ہے، اور وہ (اس پر) خوش ہوتے ہیں۔ ﴿۱۲۴﴾ رہے وہ لوگ جن کے دِلوں میں روگ ہے، تو اس سورت نے اُن کی گندگی میں کچھ اور گندگی کا اضافہ کر دیا ہے، اور اُن کو موت بھی کفر ہی کی حالت میں آتی ہے ﴿۱۲۵﴾ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال ایک دو مرتبہ کسی آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں، پھر بھی نہ وہ توبہ کرتے ہیں، اور نہ کوئی سبق حاصل کرتے ہیں؟ ﴿۱۲۶﴾ اور جب کبھی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں (اور اشاروں میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں) کہ کیا کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا؟ پھر وہاں سے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اللہ نے اُن کا دِل پھیر دیا ہے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ ﴿۱۲۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس (رہتے) ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہئے (یعنی جہاد کے وقت بھی مضبوط رہنا چاہئے اور ویسے بھی غیر زمانۂ صلح میں ان سے ڈھیلا پن نہ برتنا چاہئے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (کی امداد) متقی لوگوں کے ساتھ ہے (پس ان سے ڈرو دبومت) اور جب کوئی سورت (جدید) نازل کی جاتی ہے تو بعض منافقین (غرباء مسلمین سے بطور تمسخر) کہتے ہیں کہ (کہو) اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں ترقی دی (آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جواب چاہتے ہو) سو (سنو) جو لوگ ایمان دار ہیں اس سورت نے ان کے (تو) ایمان میں ترقی دی ہے اور وہ (اس ترقی کے ادراک سے) خوش ہو رہے ہیں (مگر چونکہ وہ امر قلبی ہے اور تم کو نصیب نہیں اس لئے اس کا ادراک بھی نصیب نہیں اور تمسخر کرتے ہو) اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) آزار ہے اس سورت نے ان میں ان کی (پہلی) گندگی کے ساتھ اور (نئی) گندگی بڑھادی (کیونکہ پہلے ایک حصۂ قرآن کا انکار تھا اب اس جدید حصہ کا انکار مزید ہوا) اور وہ حالتِ کفر ہی میں مر گئے (یعنی جو اُن میں مر چکے ہیں وہ کافر مرے اور جو اسی اصرار پر رہیں گے وہ کافر مریں گے، حاصل جواب یہ ہوا کہ قرآن میں ایمان کو ترقی دینے کی بیشک خاصیت ہے لیکن محل میں قابلیت بھی تو ہو اور اگر پہلے سے خباثتِ مستحکمہ ہے تو اور بھی اس کو استحکام ہو جائے گا "در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس") [1] اور کیا ان کو نہیں دکھائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں (مگر) پھر بھی (اپنی حرکاتِ شنیعہ سے) باز نہیں آتے اور نہ وہ کچھ سمجھتے ہیں (جس سے باز آنے کی آئندہ امید ہو، یعنی ان حوادث سے ان کو عبرت پکڑنا اور عبرت پکڑ کر اپنی اصلاح کر لینا چاہئے تھا، یہ تو اُن کے تمسخر کا بیان ہوا جو اپنی مجالس میں کرتے تھے، آگے تنفر کا بیان ہے جو مجلسِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان سے صادر ہوتا تھا، چنانچہ ارشاد ہے) اور جب کوئی سورت (جدید) نازل کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں (اور اشارہ سے باتیں کرتے ہیں) کہ تم کو کوئی (مسلمان) دیکھتا تو نہیں (کہ اٹھتا ہوا دیکھ لے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا لگائے) پھر (اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کر کے وہاں سے اُٹھ کر) چل دیتے ہیں (یہ لوگ مسجدِ نبوی سے کیا پھرے) خدا تعالیٰ نے ان کا دل (ہی ایمان سے) پھیر دیا ہے اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں (کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں جہاد کی ترغیب تھی، آیت مذکورہ بالا يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوْا الآیہ میں یہ تفصیل بتلائی گئی ہے

[1] ترجمہ: باغ میں پھول اُگتے ہیں اور شوریلی زمین میں جھاڑ جھنکاڑ۔

کہ کفار تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان سے جہاد و قتال میں ترتیب کیا ہونا چاہئے، اس آیت میں ارشاد یہ ہے کہ کفار میں سے جو لوگ تم سے قریب ہوں پہلے جہاد ان سے کیا جائے، قریب ہونا مقام کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے، کہ جائے سکونت سے جو قریب رہنے والے کفار ہیں وہ جہاد میں مقدم کئے جاویں، اور رشتہ نسب اور تعلقات کے اعتبار سے بھی جو قریب ہوں وہ دوسروں سے مقدم کئے جاویں کیونکہ اسلامی جہاد درحقیقت انہی کی خیر خواہی کے تقاضہ سے ہے، اور خیر خواہی و ہمدردی میں رشتہ دار و تعلقات والے مقدم ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ (الشعراء) "یعنی اپنے قریبی عزیزوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعمیل فرمائی، اور سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے کلمہ حق پہنچایا، اسی طرح مقامی قرب و بُعد کا اعتبار کر کے مدینہ کے قرب و جوار کے کفار بنو قریظہ، بنو نضیر، اہلِ خیبر کو دوسروں پر مقدم کیا گیا، اس کے بعد باقی عرب سے قتال ہوا، اس سے فارغ ہونے کے بعد سب سے آخر میں کفار روم سے قتال کا حکم ہوا جس کے نتیجہ میں غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا۔

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً غلظت کے معنی شدّت و قوّت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ کفار کے ساتھ برتاؤ میں ایسی صورت اختیار کرو کہ وہ کسی حیثیت سے تمہاری کمزوری محسوس نہ کریں۔ فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت، ان میں غور و فکر اور مقتضٰی پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی اور زیادتی پیدا ہوتی ہے، یہ زیادتی نورِ ایمان اور حلاوتِ ایمان کی ہوتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ و رسول کی اطاعت آسان نظر آنے لگتی ہے، عبادت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے، گناہوں سے طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے کلفت محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ایمان جب قلب میں آتا ہے تو ایک سفید نورانی نقطہ جیسا ہوتا ہے، پھر جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے تو یہ سفیدی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ سارا قلب نورانی ہو جاتا ہے، اسی طرح کفر و نفاق شروع میں ایک سیاہ داغ کی طرح قلب پر لگتا ہے، پھر جوں جوں معاصی کا ارتکاب اور کفر کی شدّت بڑھتی جاتی ہے یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ (مظہری) [1]

اسی لئے صحابہ کرام ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے کہ کچھ دیر مل کر بیٹھو، دین اور آخرت کی باتوں کا مذاکرہ کرو تا کہ ہمارا ایمان بڑھے۔ [2]

---

[1] التفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۴ ص:۳۲۶

[2] شعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث:۳۶، ومصنف ابن ابى شيبة ج:۷ ص:۲۲۷ ورقم الحديث:۷۵

یُفۡتَنُوۡنَ فِیۡ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوۡ مَرَّتَیۡنِ، اس میں منافقین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے نفاق اور عہد شکنی وغیرہ معاصی کی وجہ سے ہر سال مختلف قسم کی مصیبتوں میں کبھی ایک بار کبھی دو بار مبتلا ہوتے رہتے ہیں، کبھی ان کے دوست کفارِ مکہ مغلوب ہوگئے، کبھی ان کے نفاق کی باتیں کھل گئیں، اس سے پریشانی میں مبتلا رہے، یہاں ایک دو کا عدد خاص مراد نہیں، بلکہ یہ بتلانا ہے کہ اس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، کیا ان چیزوں کو دیکھ کر بھی انہیں عبرت نہیں ہوتی۔

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ

آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا بھاری ہے اُس پر جو تم کو تکلیف پہنچے حریص ہے تمہاری بھلائی پر

بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ ۖ

ایمان والوں پر نہایت شفیق، مہربان ہے، پھر بھی اگر منہ پھیریں تو کہہ دے کافی ہے مجھ کو اللہ

ع ۱۶/۵ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾ ع

کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے عرشِ عظیم کا

آسان ترجمۂ قرآن

(لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تمہی میں سے ہے، جس کو تمہاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمہاری بھلائی کی دُھن لگی ہوئی ہے، جو مومنوں کے لئے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہے! ﴿۱۲۸﴾ پھر بھی اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو (اے رسول! ان سے) کہہ دو کہ: "میرے لئے اللہ کافی ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔" ﴿۱۲۹﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں (کہ تم کو نفع حاصل

کرنا آسان ہو) جن کو تمہاری مضرّت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی ضرر نہ پہنچے) جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے پھر بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ (تو) بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (ایسے رسول سے مستفید نہ ہونا بڑی محرومی ہے) پھر اگر (اس پر بھی آپ کو رسول ماننے سے اور آپ کے اتباع کرنے سے) رُوگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے (میرا کیا نقصان ہے) میرے لئے (تو) اللہ تعالیٰ (حافظ وناصر) کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں (پس معبودیت اس کے ساتھ مختص ہے تو لامحالہ سارے کمالاتِ علم وقدرت اس میں بیمثل ہوں گے، پھر مجھ کو کسی کی مخالفت سے کیا اندیشہ) میں نے اسی پر بھروسہ کرلیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے (تو اور چیزیں تو بدرجۂ اَولیٰ اس کی مملوک ہوں گی، پس اس پر بھروسہ کرنے کے بعد مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں البتہ تم اپنی فکر کرلو، حق کا انکار کرکے کہاں رہو گے)۔

معارف ومسائل

یہ سورۂ توبہ کی آخری آیتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پوری خلقِ خدا پر خصوصاً مسلمانوں پر بیحد مہربان اور شفیق وہمدرد ہونا بیان فرمایا ہے اور آخری آیت میں آپ کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود اگر پھر بھی کچھ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔

سورۂ توبہ کے آخر میں یہ مضمون اس لئے لانا مناسب ہوا کہ اس پوری سورت میں کفار سے براءت، قطعِ تعلق، قتال وجہاد کا ذکر تھا جو دعوت الی اللہ کی آخری صورت ہے، جبکہ زبانی دعوت وتبلیغ سے اصلاح کی توقع نہ رہے، لیکن اصل کام انبیاء علیہم السلام کا یہی ہے کہ شفقت ورحمت اور ہمدردی وخیر خواہی کے جذبے سے خلقِ خدا کو خدا کی طرف آنے کی دعوت دیں، اور ان کی طرف سے اعراض یا کوئی تکلیف پیش آئے تو اس کو اللہ کے سپرد کردیں اس پر توکل کریں، کیونکہ وہ رَبّ العرش العظیم ہے، یہاں عرشِ عظیم کا رَبّ کہہ کر یہ بتلانا منظور ہے کہ وہ کُل کائناتِ عالم پر محیط ہے۔

آخری دو آیتیں حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں، ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ (قرطبی)[1]

---

[1] تفسیر القرطبی تحت آیۃ "واتقوا یومًا ترجعون" الآیۃ ج:۳ ص:۳۷۵

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں مذکور ہیں، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح و شام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان فرما دیتے ہیں۔ (قرطبی) [1] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ لِتَكْمِيْلِهٖ
كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى وَالْطُفْ بِنَا فِيْ تَيْسِيْرِ كُلِّ عَسِيْرٍ فَاِنَّ
تَيْسِيْرَ كُلِّ عَسِيْرٍ عَلَيْكَ يَسِيْرٌ

سورۂ توبہ تمام شد

[1] سنن ابی داوٗد، کتاب الأدب، باب ما یقول إذا اصبح، وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:٨ ص:٣٠٣

سُوْرَةُ يُوْنُسَ

أٰيَاتُهَا ١٠٩ | ١٠ سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ ٥١ | رُكُوْعَاتُهَا ١١

سورۂ یونس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو نو آیتیں ہیں اور گیارہ رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ

یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی، کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی ہم نے

اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ

ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنا دے لوگوں کو اور خوشخبری سنا دے ایمان لانے والوں کو کہ ان کے لئے

قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ② وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

پایہ سچا ہے اپنے رَبّ کے یہاں، کہنے لگے منکر بیشک یہ تو جادوگر ہے صریح،

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ

تحقیق تمہارا ربّ اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر

اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ

قائم ہوا عرش پر تدبیر کرتا ہے کام کی کوئی سفارش نہیں کرسکتا مگر اس کی اجازت کے بعد،

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ

وہ اللہ ہے ربّ تمہارا سو اس کی بندگی کرو کیا تم دھیان نہیں کرتے، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو،

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

وعدہ ہے اللہ کا سچا، وہی پیدا کرتا ہے اوّل بار پھر دوبارہ کرے گا اس کو تا کہ بدلہ دے ان کو جو ایمان لائے تھے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ

اور کئے تھے کام نیک انصاف کے ساتھ، اور جو کافر ہوئے ان کو پینا ہے کھولتا پانی

وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴

اور عذاب ہے دردناک اس لئے کہ کفر کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الٓرٰ۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو حکمت سے بھری ہوئی ہے ۝۱ کیا لوگوں کے لئے یہ تعجب کی بات ہے کہ ہم نے خود اُنہی میں کے ایک شخص پر وحی نازل کی ہے کہ: "لوگوں کو (اللہ کی خلاف ورزی سے) ڈراؤ، اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اُن کو خوش خبری دو کہ اُن کے ربّ کے نزدیک اُن کا صحیح معنی میں بڑا پایہ ہے۔" (مگر جب اُس نے لوگوں کو یہ

پیغام دیا تو) کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے ② حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے سارے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اُس نے عرش پر اس طرح استواء فرمایا کہ وہ ہر چیز کا انتظام کرتا ہے۔ کوئی اُس کی اجازت کے بغیر (اُس کے سامنے) کسی کی سفارش کرنے والا نہیں۔ وہی اللہ ہے تمہارا پروردگار! لہٰذا اُس کی عبادت کرو۔ کیا تم پھر بھی دھیان نہیں دیتے؟ ③ اُسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ یقیناً ساری مخلوق کو شروع میں بھی وہی پیدا کرتا ہے، اور دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا، تا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں اُن کو انصاف کے ساتھ اُس کا صلہ دے۔ اور جنہوں نے کفر اپنالیا ہے، ان کے لئے کھولتے ہوئے پانی کا مشروب ہے، اور دُکھ دینے والا عذاب ہے، کیونکہ وہ حق کا انکار کرتے تھے۔ ④

خلاصۂ تفسیر

(الٓرٰ کا مطلب تو اللہ کو معلوم ہے) یہ (جو آگے آتی ہے) پُرحکمت کتاب (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جو بوجہ حق ہونے کے قابل جاننے کے اور ماننے کے ہیں اور چونکہ جن پر اس کا نزول ہوا ہے ان کی نبوّت کا کفار انکار کرتے تھے اس لئے جواب فرماتے ہیں کہ) کیا ان (مکہ کے) لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس (جو کہ مثل انْ کے بشر ہے) وحی بھیج دی (جس کا خلاصہ یہ ہے) کہ (عام طور پر) سب آدمیوں کو (اَحکامِ خداوندی کے خلاف کرنے پر) ڈرائیے اور جو ایمان لے آئے ان کو یہ خوشخبری سنائیے کہ ان کے رَبّ کے پاس (پہنچ کر) ان کو پورا مرتبہ ملے گا (یعنی اگر ایسا مضمون کسی بشر پر وحی کے ذریعہ سے نازل ہو جاوے تو کوئی تعجب کی وجہ نہیں مگر) کافر (اس قدر متعجب ہوئے کہ آپ کی نسبت) کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص تو بلاشبہ صریح جادوگر ہے (نبی نہیں ہے کیونکہ نبوّت بشر کے لئے نہیں ہوسکتی) بلاشبہ تمہارا رَبّ (حقیقی) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کر دیا (پس اعلیٰ درجہ کا قادر ہے) پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تختِ سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (کہ جو اس کی شان کے لائق ہے تا کہ عرش سے زمین و آسمان میں اَحکام جاری فرمائے، جیسا آگے ارشاد ہے کہ) وہ ہر کام کی (مناسب) تدبیر کرتا ہے، (پس حکیم بھی ہے، اس کے سامنے) کوئی سفارش کرنے والا (سفارش) نہیں (کرسکتا) بدون اس کی اجازت کے (پس عظیم بھی ہوا، پس) ایسا اللہ تمہارا رَبّ (حقیقی) ہے سو تم اس کی عبادت کرو (اور شرک مت کرو) کیا تم (ان دلائل کے سننے کے بعد) پھر بھی نہیں سمجھتے، تم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اللہ نے (اس کا) سچا وعدہ کر رکھا ہے، بیشک وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی (قیامت کو) پیدا کرے گا تا کہ ایسے لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اِنصاف کے ساتھ (پوری پوری) جزا دے (اور اس میں ذرا کمی نہ کرے بلکہ بہت کچھ زیادہ دے

دے) اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے واسطے (آخرت میں) کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا، اور دردناک عذاب ہوگا اُن کے کفر کی وجہ سے۔

معارف ومسائل

سورۂ یونس مکی سورتوں میں سے ہے، بعض حضرات نے اِس کی صرف تین آیتوں کو مدنی کہا ہے جو ہجرتِ مدینہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

اس سورت میں بھی قرآن اور اسلام کے بنیادی مقاصد توحید، رسالت، آخرت وغیرہ کو کائناتِ عالم اور اس میں ہونے والے تغیرات ومشاہدات سے استدلال کرکے ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کے ساتھ کچھ عبرت خیز تاریخی واقعات وقصص کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان کھلی نشانیوں پر نظر نہیں کرتے اور اس کے ضمن میں شرک کا ابطال اور اس سے متعلق بعض شبہات کا جواب ارشاد ہوا ہے، یہ خلاصہ ہے مضامینِ سورت کا، سورت کے ان مضامین پر غور کرنے سے یہ بھی بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ پچھلی سورت یعنی توبہ اور اس سورت میں باہمی کیا ربط ہے، سورۂ توبہ میں انہی مقاصد کے لئے منکرین وکفار کے ساتھ جہاد اور کفر وشرک کی طاقت کو مادّی اسباب کے ذریعہ توڑنے کا بیان تھا، اور یہ سورت چونکہ اَحکامِ جہاد کے نازل ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس میں مذکورہ مقاصد کو مکی دور کے قانون کے مطابق صرف دلائل وبراہین کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔

الۤرٰ، یہ حروفِ مقطعہ کہلاتے ہیں جو قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ الۤمّ، حٰمۤ، عۤسۤقۤ وغیرہ ان کے معانی کی تحقیق میں مفسرین کی بحثیں طویل ہیں، صحابہ وتابعین اور جمہور سلف کی تحقیق اس قسم کے تمام حروفِ مقطعہ کے متعلق یہ ہے کہ یہ خاص رموز ہیں ان کے معنی غالباً رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائے گئے ہیں مگر آپ نے عام اُمت کو صرف ان علوم ومعارف سے آگاہ فرمایا جن کو ان کے ذہن برداشت کرسکیں اور جن کے معلوم نہ ہونے سے اُمت کے کاموں میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے، حروفِ مقطعہ کے رُموز ایسے نہیں جن پر اُمت کا کوئی کام موقوف ہو یا ان کے نہ جاننے سے ان کا کوئی حرج ہو، اِس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے معانی کو اُمت کے لئے غیر ضروری سمجھ کر بیان نہیں فرمایا اس لئے ہمیں بھی اس کی تفتیش میں نہ پڑنا چاہئے، کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر ان کے معانی جاننے میں ہماری مصلحت ہوتی تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ فرماتے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① میں لفظ تِلْكَ سے اِشارہ اس سورت کی آیات کی طرف ہے جن کا ذکر آگے آتا ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے اس کی صفت اس جگہ حَكِيْم کے لفظ سے بیان فرمائی ہے جس کے معنٰی اِس جگہ حکمت

والی کتاب کے ہیں۔

دوسری آیت میں مشرکین کے ایک شبہ اور اعتراض کا جواب ہے، شبہ کا حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی جہالت سے یہ قرار دے رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسول یا پیغمبر آئے وہ بشر یعنی اِنسان نہیں ہونا چاہئے بلکہ کوئی فرشتہ ہونا چاہئے، قرآن کریم نے ان کے اس لغو خیال کا جواب کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا ہے، ایک آیت میں اِرشاد فرمایا قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ (بنی اسرائیل) یعنی اگر زمین پر بسنے والے فرشتے ہوتے تو ہم ان کے لئے رسول بھی کسی فرشتہ ہی کو بناتے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسالت کا مقصد بغیر اس کے پورا نہیں ہوسکتا کہ جن لوگوں کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے ان لوگوں میں اور اس رسول میں باہمی مناسبت ہو، فرشتوں کی مناسبت فرشتوں سے اور انسان کی انسان سے ہوتی ہے، جب انسانوں کے لئے رسول بھیجنا مقصد ہے تو کسی بشر ہی کو رسول بنانا چاہئے۔

اِس آیت میں ایک دوسرے انداز سے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا اس بات پر تعجب کرنا کہ بشر کو کیوں رسول بنایا گیا اور اس کو نافرمان انسانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور فرماں برداروں کو اس کے ثواب کی خوشخبری سنانے کا کام کیوں سپرد کیا گیا، یہ تعجب خود قابلِ تعجب ہے کیونکہ جنس بشر کی طرف بشر کو رسول بنا کر بھیجنا عین مقتضائے عقل ہے۔

اِس آیت میں ایمان والوں کو خوش خبری ان الفاظ میں دی گئی اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ اس لفظ قدم کے اصل معنی تو وہی ہیں جو اردو میں سمجھے جاتے ہیں یعنی پاؤں، چونکہ انسان کی سعی و عمل اور اس کے سبب ترقی کا ذریعہ قدم ہوتا ہے، اس لئے مجازاً بلند مرتبہ کو قدم کہہ دیا جاتا ہے، اور لفظ قدم کی اضافت صدق کی طرف کر کے یہ بتلا دیا کہ یہ بلند مرتبہ جو ان کو ملنے والا ہے وہ حق اور یقینی بھی ہے اور قائم و باقی رہنے والا لازوال بھی، دنیا کے منصبوں اور عہدوں کی طرح نہیں کہ کسی عمل کے نتیجہ میں اوّل تو ان کا حاصل ہونا ہی یقینی نہیں ہوتا اور حاصل بھی ہو جائے تو ان کا باقی رہنا یقینی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا فانی اور زائل ہونا یقینی ہے، کبھی تو زندگی ہی میں زائل ہو جاتا ہے اور موت کے وقت تو دنیا کے ہر منصب و عہدہ اور دولت و نعمت سے اِنسان خالی ہاتھ ہو جاتا ہے، غرض لفظ صدق کے مفہوم میں اس کا یقینی ہونا بھی شامل ہے اور کامل مکمل لازوال ہونا بھی، اس لئے معنی جملہ کے یہ ہوئے کہ ایمان والوں کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے ان کے رَبّ کے پاس بڑا درجہ ہے جو یقینی ملے گا اور لازوال دولت ہوگی۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ لفظ صدق لانے میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت کے یہ درجاتِ عالیہ صرف صدق و سچائی اور اخلاص ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتے ہیں نرا زبانی جمع خرچ اور صرف زبان سے

کلمۂ ایمان پڑھ لینا کافی نہیں جب تک دِل اور زبان دونوں سے سچائی کے ساتھ ایمان اختیار نہ کرلیا جائے جس کا لازمی نتیجہ اعمالِ صالحہ کی پابندی اور بُرے اعمال سے پرہیز ہے۔

تیسری آیت میں توحید کو اس ناقابلِ انکار حقیقت کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کو پیدا کرنے میں اور پھر پورے عالم کے کاموں کی تدبیر کرنے اور چلانے میں جب اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں تو پھر عبادت وطاعت میں کوئی دُوسرا کیسے شریک ہوسکتا ہے، بلکہ کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنا بڑی بے انصافی اور ظلمِ عظیم ہے۔

اس آیت میں یہ اِرشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا ہے، لیکن ہمارے عرف میں دِن اس وقت کو کہا جاتا ہے جو آفتاب کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آسمان وزمین اور ستاروں کے پیدا ہونے سے پہلے آفتاب ہی کا وجود نہیں تو طلوع، غروب کا حساب کیسے ہو اِس لئے مراد یہاں وہ مقدارِ وقت ہے جو آفتاب کے طلوع وغروب کے درمیان اس جہان میں ہونے والی تھی۔

چھ دن کے تھوڑے سے وقت میں اتنے بڑے جہان کو جو آسمانوں اور زمین اور سیارات اور تمام کائناتِ عالم پر مشتمل ہے، بنا کر تیار کردینا اسی ذات قدوس کا مقام ہے جو قادرِ مطلق ہے اس کی تخلیق کے لئے نہ پہلے سے خام اجناس کا موجود ہونا ضروری ہے اور نہ بنانے کے لئے کسی عملہ اور خدام کی ضرورت ہے بلکہ اس کی قدرتِ کاملہ کا یہ مقام ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہیں تو بغیر کسی سامان اور کسی کی امداد کے ایک آن میں پیدا فرمادیں، یہ چھ دن کی مہلت بھی خاص حکمت ومصلحت کی بناء پر اختیار کی گئی ہے ورنہ ان کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ تمام آسمان وزمین اور اس کی کائنات کو ایک آن میں پیدا فرمادیتے۔

اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی پھر قائم ہوا عرش پر۔ اتنی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ عرشِ رحمٰن کوئی ایسی مخلوق ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائناتِ عالم پر محیط ہے سارا جہاں اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا اِنسان کے بس کی بات نہیں، جو انسان اپنی سائنس کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں بھی صرف نیچے کے سیاروں تک پہنچنے کی تیاری میں ہے اور وہ بھی ابھی نصیب نہیں اور اس کا یہ اقرار ہے کہ اوپر کے سیارے ہم سے اتنے دور ہیں کہ آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ بھی ان کی معلومات تخمینہ اور اندازہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بہت سے ستارے ایسے بھی ہیں جن کی شعاعیں ابھی تک زمین پر نہیں پہنچیں، حالانکہ شعاعِ نوری کی حرکت ایک منٹ میں لاکھوں میل بتائی جاتی ہے، جب سیاروں اور ستاروں تک انسان کی رسائی کا یہ حال ہے تو آسمان جو ان سب ستاروں اور سیاروں سے اوپر ہے اس کا یہ مسکین اِنسان کیا حال معلوم کرسکتا ہے، اور پھر جو ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر اور سب پر حاوی اور محیط عرشِ رحمٰن ہے اس کی حقیقت تک انسان کی رسائی معلوم!

آیتِ مذکورہ سے اتنا معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے چھ دن میں آسمان وزمین اور تمام کائنات بنائی اور اس کے بعد عرش پر قیام فرمایا۔

یہ یقینی اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسمانیت اور اس کی تمام صفات وخصوصیات سے بالا وبرتر ہے نہ اس کا وجود کسی خاص سمت اور جہت سے تعلق رکھتا ہے نہ اس کا کسی مکان میں قیام اس طرح کا ہے جس طرح دنیا کی چیزوں کا قیام اپنی اپنی جگہ میں ہوتا ہے، پھر عرش پر قیام فرمانا کس طرح اور کس کیفیت کے ساتھ ہے، یہ ان متشابہات میں سے ہے جن کو انسان کی عقل وفہم نہیں پاسکتی اسی لئے قرآنِ حکیم کا ارشاد ان کے بارے میں یہ ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۘ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ۙ (آل عمران: ۷) یعنی ان کو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اور مضبوط اور صحیح علم والے اس پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت جاننے کی فکر میں نہیں پڑتے۔ اس لئے اس قسم کے تمام معاملات میں جن میں حق تعالیٰ کی نسبت کسی مکان یا جہت کی طرف کی گئی ہے یا جن میں حق تعالیٰ کے لئے اعضاء ید، وَجہ، ساق وغیرہ کے الفاظ قرآن میں وارد ہوئے، عقیدہ جمہور علمائے اُمت کا یہ ہے کہ اِس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ کلمات اپنی جگہ پر حق ہیں اور ان سے جو مراد حق تعالیٰ کی ہے وہ صحیح ہے اور اس کی کیفیت وحقیقت کے جاننے کی فکر کو اپنی عقل سے بالاتر ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا جائے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن که جاہا سپر باید انداختن [1]

اور جن متأخرین علماء نے ان چیزوں کے کوئی معنی بیان فرمائے ہیں ان کے نزدیک بھی وہ محض ایک احتمال کے درجہ میں ہیں کہ شاید یہ معنی ہوں، اس معنی کو یقینی وہ نہیں فرماتے اور نرے احتمالات ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کرسکتے، اس لئے صاف اور سیدھا مسلک سلف صالحین اور صحابہ وتابعین کا ہے جنہوں نے ان چیزوں کی حقیقت کو علمِ الٰہی کے سپرد کرنے پر قناعت فرمائی، اس کے بعد فرمایا يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ یعنی عرش پر مستوی ہوکر وہ تمام عالموں کا انتظام خود دستِ قدرت سے انجام دیتا ہے۔

مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ یعنی کسی نبی ورسول کو بھی اس کی بارگاہ میں سفارش کرنے کی بذاتِ خود کوئی مجال نہیں، جب تک حق تعالیٰ ہی ان کو سفارش کرنے کی اجازت عطا نہ فرماویں وہ بھی کسی کی سفارش نہیں کرسکتے۔

چوتھی آیت میں عقیدۂ آخرت کا بیان ہے إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ یعنی اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب کو، وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ یہ وعدہ ہے اللہ کا حق اور صحیح إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ یعنی وہ اوّل پیدا کرتا ہے تمام مخلوق کو اور وہی اس کو قیامت میں دوبارہ زندہ فرمائے گا، اس جملہ میں بتلادیا کہ اس پر کوئی تعجب کرنے کی جگہ نہیں کہ یہ ساری کائنات فنا ہوجانے کے بعد

---

[1] ترجمہ: ہر جگہ (عقل کے) گھوڑے نہیں دوڑائے جاسکتے، بہت سی جگہوں پر تلوار ڈالنی پڑتی ہے۔

پھر کیسے زندہ ہوگی کیونکہ جس ذاتِ اقدس کے قبضہ میں یہ ہے کہ اوّل کسی چیز کو بغیر کسی مادّہ کے اور بغیر کسی سابقہ شکل وصورت کے پیدا کردے اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ پیدا شدہ مخلوق کو فنا کرنے کے بعد پھر دوبارہ پیدا کردے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ

وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمک اور چاند کو چاندنا اور مقرر کیں اس کے لئے منزلیں

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ

تاکہ پہچانو گنتی برسوں کی اور حساب، یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے یہ سب کچھ مگر تدبیر سے،

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

ظاہر کرتا ہے نشانیاں ان لوگوں کے لئے جن کو سمجھ ہے، البتہ بدلنے میں رات اور دن کے

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝۶

اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو ڈرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ وہی ہے جس نے سورج کو سراپا روشنی بنایا، اور چاند کو سراپا نور، اور اُس کے (سفر) کے لئے منزلیں مقرر کردیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں کا) حساب معلوم کرسکو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بغیر کسی صحیح مقصد کے پیدا نہیں کردیا۔ وہ یہ نشانیاں اُن لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ ⑤ حقیقت یہ ہے کہ رات دن کے آگے پیچھے آنے میں اور اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اُس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جن کے دِل میں خدا کا خوف ہو۔ ⑥

خلاصۂ تفسیر

وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو (بھی) نورانی بنایا اور اس (کی چال) کے لئے منزلیں

مقرر کیں (کہ ہر روز ایک منزل قطع کرتا ہے) تا کہ (ان اجرام کے ذریعہ سے) تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں، وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف صاف بتلا رہے ہیں جو دانش رکھتے ہیں، بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے (توحید کے) دلائل ہیں جو (خدا کا) ڈر مانتے ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں کائناتِ عالم کی بہت سی نشانیاں مذکور ہیں جو اللہ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ پر شاہد اور اس کے دلائل ہیں کہ رَبّ العزّت اس پر پوری طرح قادر ہے کہ اس عالم کو فنا کرنے اور ذرہ ذرہ کر دینے کے بعد پھر ان ذرات کو جمع کر دے اور از سرِ نو ان سب کو زندہ کر دے اور حساب و کتاب کے بعد جزا و سزا کا قانون نافذ کر دے اور یہ کہ یہی عقل و حکمت کا مقتضیٰ ہے، اس طرح یہ آیتیں اُس اجمال کی تفصیل ہیں جو گزشتہ تیسری آیت میں آسمان و زمین کی چھ دن میں پیدائش اور پھر استواء علی العرش کے بعد یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے الفاظ میں بیان کیا تھا کہ اس نے عالم کو صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہر وقت ہر آن میں ہر چیز کا نظام و انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی نظام و انتظام کا ایک جزء یہ ہے **هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا، ضِیَاء** اور **نُور** دونوں کے معنی چمک اور روشنی کے ہیں اسی لئے بہت سے ائمہ لغت نے ان دونوں لفظوں کو مرادف کہا ہے، علامہ زمخشری اور طیبی وغیرہ نے فرمایا کہ اگرچہ روشنی کے معنی ان دونوں لفظوں میں مشترک ہیں مگر لفظ نور عام ہے، ہر قوی و ضعیف ہلکی اور تیز روشنی کو نور کہا جاتا ہے اور ضوء و ضیاء قوی اور تیز روشنی کو کہتے ہیں، [1] انسان کو دونوں قسم کی روشنیوں کی ضرورت پڑتی ہے، عام کاروبار کے لئے دن کی تیز روشنی درکار ہے اور معمولی کاموں کے لئے رات کی ہلکی روشنی محبوب ہے، اگر دن کو بھی صرف چاند کی پھیکی روشنی رہے تو کاروبار میں خلل آئے اور رات کو بھی آفتاب چمکتا رہے تو نیند اور رات کے مناسب کاموں میں خلل آئے، اس لئے قدرت نے دونوں طرح کی روشنی کا انتظام اس طرح فرمایا کہ آفتاب کی روشنی کو ضوء و ضیاء کا درجہ دیا اور کاروبار کے وقت اس کا ظہور فرمایا اور چاند کی روشنی کو ہلکی اور پھیکی روشنی بنایا اور رات کو اس کا محل ظہور بنایا۔

قرآنِ کریم نے شمس و قمر کی روشنیوں میں فرق و امتیاز کو متعدد جگہ مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے، سورۂ نوح میں ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۱۶) سورۂ فرقان میں فرمایا وَجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا (۶۱) سراج کے معنی چراغ کے ہیں اور چونکہ چراغ کا نور ذاتی ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے حاصل کردہ نہیں ہوتا اس لئے بعض

---

[1] كشاف تحت هذه الآية ج:٢ ص:٤٩٤، وفي تفسير سورة النوح آيت:٥ ج:٧ ص:١٤٧

حضرات نے یہ کہا ہے کہ ضیاء کسی چیز کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس کو جو دوسرے سے مستفاد اور حاصل کردہ ہو، مگر یہ بظاہر یونانی فلسفہ سے متأثر ہو کر کہا گیا ہے ورنہ لغت میں اس کی کوئی اصل نہیں، اور قرآنِ کریم نے بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔

زجّاج نے لفظ ضیاء کو ضوء کی جمع قرار دیا ہے، اس کی رو سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ روشنی کے سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوس قزح میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (منار)

نظامِ شمس و قمر میں آیاتِ قدرت کا ایک دوسرا مظاہرہ یہ ہے وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ؕ قَدَّرَ لفظ تقدیر سے بنا ہے، تقدیر کے معنیٰ کسی چیز کو زمانہ یا مکان یا صفات کے اعتبار سے ایک مخصوص مقدار اور پیمانہ پر رکھنے کے ہیں، رات اور دن کے اوقات کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے قرآنِ کریم نے فرمایا وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ؕ (المزمل: ۲۰)، مکانی فاصلے اور مسافت کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے دوسری جگہ ملکِ شام اور سباء کی درمیانی بستیوں کے متعلق فرمایا وَقَدَّرۡنَا فِيۡهَا السَّيۡرَ ؕ (سبا: ۱۸)، اور عام مقادیر کے متعلق فرمایا وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا ۝ (الفرقان)

لفظ مَنَازِلَ مَنۡزِل کی جمع ہے جس کے اصلی معنیٰ جائے نزول کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے شمس و قمر دونوں کی رفتار کے لئے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے، چاند چونکہ اپنا دورہ ہر مہینہ میں پورا کر لیتا ہے اس لئے اس کی منزلیں تیس یا انتیس ہوتی ہیں مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے اس لئے عموماً چاند کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں، اور آفتاب کا دورہ سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کی منزلیں تین سو ساٹھ یا پینسٹھ ہوتی ہیں، قدیم جاہلیت عرب میں بھی اور اہلِ ہیئت و ریاضی کے نزدیک بھی ان منزلوں کے خاص خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے گئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں، قرآنِ کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو شمس و قمر خاص خاص دنوں میں طے کرتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ بضمیرِ مفرد استعمال کیا ہے، حالانکہ منزلیں شمس و قمر دونوں کی ہیں، اس لئے بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ ذکر مفرد کا ہے مگر مراد ہر ہر واحد کے اعتبار سے دونوں ہیں جس کی نظائر قرآن اور عربی محاورات میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگرچہ منزلیں اللہ تعالیٰ نے شمس و قمر دونوں ہی کے لئے قائم فرما دی ہیں مگر اس جگہ بیان صرف چاند کی منازل کا مقصود ہے اس لئے قَدَّرَهٗ کی ضمیر قمر کی طرف راجع ہے، وجہ تخصیص کی یہ ہے کہ آفتاب کی

منزلیں تو آلاتِ رصدیہ اور حسابات کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتیں اس کا طلوع وغروب ایک ہی ہیئت میں سال کے تمام ایام میں ہوتا رہتا ہے، مشاہدہ سے کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ آج آفتاب کونسی منزل میں ہے، بخلاف چاند کے کہ اس کے حالات ہر روز مختلف ہوتے ہیں آخر ماہ میں بالکل نظر نہیں آتا، اس طرح کے تغیرات کے مشاہدہ سے بے علم لوگ بھی تاریخوں کا پتہ چلا سکتے ہیں، مثلاً آج مارچ کی آٹھ تاریخ ہے کوئی شخص آفتاب کو دیکھ کر یہ معلوم نہیں کرسکتا کہ آٹھ ہے یا اکیس بخلاف چاند کے کہ اس کو دیکھ کر بھی تاریخ کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں چونکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان عظیم الشان نشانیوں سے انسان کا یہ فائدہ بھی وابستہ ہے کہ ان کے ذریعہ وہ سال اور مہینہ اور اس کی تاریخوں کا حساب معلوم کرے اور یہ حساب بھی اگرچہ شمس وقمر دونوں ہی سے معلوم ہوسکتا ہے اور دُنیا میں دونوں طرح کے سال اور مہینے شمسی اور قمری قدیم زمانہ سے معروف بھی ہیں اور قرآن کریم نے بھی سورۂ اسراء کی آیت: ۱۲ میں فرمایا وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ اس میں اٰيَةَ الَّيْلِ سے مراد چاند اور اٰيَةَ النَّهَارِ سے مراد آفتاب ہے، اور دونوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ان سے تم سالوں کا عدد اور مہینوں کی تاریخوں کا حساب معلوم کرسکتے ہو، اور سورۂ رحمٰن میں فرمایا اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ جس میں بتلایا گیا ہے کہ شمس وقمر دونوں کے ذریعہ تاریخ، مہینہ اور سال کا حساب معلوم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن قمر کے ذریعہ مہینہ اور تاریخ کا حساب مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہے بخلاف شمس کے کہ اس کے حسابات سوائے ریاضی والوں کے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا، اس لئے اس آیت میں شمس وقمر دونوں کا ذکر کرنے کے بعد جب ان کی منازل مقرر کرنے کا ذکر فرمایا تو بضمیر مفرد قَدَّرَهٗ ارشاد فرما کر منازِل صرف قمر کی بیان فرمائی گئیں۔

اور چونکہ اَحکامِ اسلام میں ہر جگہ ہر موقع پر اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ ان کی ادائیگی ہر شخص کے لئے آسان ہو خواہ وہ کوئی لکھا پڑھا آدمی ہو یا اَن پڑھ، شہری ہو یا دیہاتی، اسی لئے عموماً اَحکامِ اسلامیہ میں قمری سن اور مہینہ اور تاریخوں کا اعتبار کیا گیا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عدّت وغیرہ اسلامی فرائض واَحکام میں قمری حساب ہی رکھا گیا ہے۔

اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ شمسی حساب رکھنا یا استعمال کرنا ناجائز ہے بلکہ اس کا اختیار ہے کہ کوئی شخص نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عدّت کے معاملہ میں تو قمری حساب شریعت کے مطابق استعمال کرے مگر اپنے کاروبار، تجارت وغیرہ میں شمسی استعمال کرے، شرط یہ ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں قمری حساب جاری رہے تاکہ رمضان اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ اسے جنوری فروری وغیرہ کے سوا کوئی مہینے ہی معلوم نہ ہوں، فقہاء رحمہم اللہ نے قمری حساب باقی رکھنے کو مسلمانوں کے ذمہ فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔

اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ سنت انبیاء اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین میں قمری ہی حساب استعمال کیا گیا ہے اس کا اتباع موجب برکت اور ثواب ہے۔

غرض آیت مذکورہ میں اللہ جل شانہ کی قدرت اور حکمت کاملہ کا بیان ہے کہ اس نے روشنی کے دو عظیم الشان خزانے مناسب حال پیدا فرمائے اور پھر ہر ایک کی رفتار کے لئے ایسے پیمانے مقرر فرما دیئے جن سے سال مہینہ، تاریخ اور اوقات کے ایک ایک منٹ کا حساب معلوم کیا جا سکتا ہے، نہ کبھی ان کی رفتار میں فرق آتا ہے نہ کبھی آگے پیچھے ہوتے ہیں، نہ ان خدا ساز مشینوں میں کبھی مرمت کا وقفہ ہوتا ہے نہ ان کو گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ وہ کبھی گھستی ٹوٹتی ہیں، جس شان سے ازل میں چلا دیا تھا چل رہی ہیں۔

اس کے بعد آخر آیت میں اسی پر مزید تنبیہ کے لئے فرمایا مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ یعنی ان سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے بے فائدہ پیدا نہیں کیا بلکہ ان میں بڑی بڑی حکمتیں اور انسان کے لئے بے شمار فوائد مضمر ہیں، وہ یہ دلائل اُن لوگوں کو صاف صاف بتلا رہے ہیں جو عقل و دانش رکھتے ہیں۔

اسی طرح دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ رات دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے اُن سب میں اُن لوگوں کے واسطے (توحید و آخرت کے) دلائل ہیں جو خدا تعالیٰ کا ڈر مانتے ہیں۔

توحید کے دلائل تو قدرت و صنعت کی یکتائی اور بغیر کسی امداد کے ان تمام چیزوں کو پیدا کرنا اور ایسے نظام کے ساتھ چلانا ہے جو نہ کبھی ٹوٹتا ہے نہ بدلتا ہے۔

اور آخرت کے دلائل اس لئے ہیں کہ جس ذات حکیم نے ان تمام چیزوں کو انسانوں کے فائدہ کے لئے بنایا اور ایک محکم نظام کا پابند کیا، اُس سے یہ ممکن نہیں کہ اس مخدوم کائنات کو اس نے بے فائدہ محض کھانے پینے کے لئے پیدا کیا ہو، اس کے ذمہ کچھ فرائض نہ لگائے ہوں، اور جب یہ لازم ہوا کہ اس مخدوم کائنات پر بھی کچھ پابندیاں ہونا ضروری ہے تو یہ بھی لازم ہوا کہ ان پابندیوں کو پورا کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کا کبھی کہیں حساب ہو، کرنے والوں کو اچھا بدلہ ملے اور نہ کرنے والوں کو سزا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں تو جزاء و سزا کا یہ دستور نہیں، یہاں تو مجرم بسا اوقات متقی پارسا سے زیادہ اچھی زندگی گزارتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ حساب اور جزاء و سزا کا کوئی دن مقرر ہو، اسی کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا

البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن ہوگئے

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝٧ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ

اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں، ایسوں کا ٹھکانہ ہے آگ

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٨ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ

بدلہ اس کا جو کماتے تھے، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے ہدایت کرے گا ان کو

رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝٩

ربّ ان کا ان کے ایمان سے، بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں باغوں میں آرام کے،

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ

ان کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ اور ملاقات ان کی سلام، اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر

اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١٠ ع

کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار ہے سارے جہان کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ ہم سے (آخرت میں) آ ملنے کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے، اور دُنیوی زندگی میں مگن اور اُسی پر مطمئن ہوگئے ہیں، اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ۝٧ اُن کا ٹھکانا اپنے کرتوت کی وجہ سے دوزخ ہے ۝٨ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن کے ایمان کی وجہ سے اُن کا پروردگار اُنہیں اِس منزل تک پہنچائے گا کہ نعمتوں سے بھرے باغات میں اُن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ ۝٩ اُس میں (داخلے کے وقت) اُن کی پکار یہ ہوگی کہ: ''یا اللہ! تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے۔'' اور ایک دوسرے کے خیر مقدم کے لئے جو لفظ وہ بولیں گے، وہ سلام ہوگا، اور اُن کی آخری پکار یہ ہوگی کہ: ''تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔'' ۝١٠

خلاصۂ تفسیر

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے (جو کہ بعث پر دلالت کرتی ہیں) بالکل غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے (ان) اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کا رَبّ ان کو بوجہ ان کے مؤمن ہونے کے ان کے مقصد (یعنی جنت) تک پہنچا دے گا، ان کے (مسکن کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی چین کے باغوں میں (اور جس وقت وہ جنت میں جاویں گے اور عجائبات کا دفعۃً معائنہ کریں گے تو اس وقت) ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ اور (پھر جب ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو) اُن کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام علیکم اور (جب اطمینان سے وہاں جا بیٹھیں گے اور اپنے پرانے مصائب اور متاعب اور اس وقت کے غیر مکدر دائمی عیش کا موازنہ کریں گے تو) ان کی (اس وقت کی باتوں میں) اخیر بات یہ ہوگی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (جیسا دوسری آیت میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ [1] فاطر: ۳۴)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ، کی قدرتِ کاملہ اور حکمت کے خاص خاص مظاہر آسمان اور زمین، شمس وقمر وغیرہ کی تخلیق کا ذکر کر کے عقیدۂ توحید وآخرت کو ایک بلیغ انداز میں ثابت کیا گیا تھا، مذکور الصدر آیات میں سے پہلی تین آیتوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کائناتِ عالم کی ایسی کھلی کھلی نشانیوں اور شہادتوں کے باوجود، انسانوں کے دو طبقے ہوگئے، ایک وہ جس نے ان آیاتِ قدرت کی طرف ذرا دھیان نہ دیا، نہ اپنے پیدا کرنے والے مالک کو پہچانا اور نہ اس پر غور کیا کہ ہم دنیا کے عام جانوروں کی طرح ایک جانور نہیں، رَبّ العزّت نے ہمیں اِدراک وشعور عقل وہوش تمام جانوروں سے زیادہ دیا ہے اور ساری مخلوقات کو ہمارا خادم بنادیا ہے تو ہمارے ذمہ بھی کوئی کام لگایا ہوگا اور اس کا ہمیں بھی حساب دینا ہوگا جس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی روزِ حساب اور روزِ جزاء مقرر ہو جس کو قرآن کی اِصطلاح میں قیامت اور حشر ونشر سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کو عام جانوروں کی سطح پر رکھا، پہلی دو آیتوں میں اُن لوگوں کی خاص علامات بتلا کر ان کی سزائے آخرت کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا کہ "جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی اور اس کی راحت وتکلیف کو بھلا کر صرف دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے۔"

دوسرے یہ کہ "اِس دنیا میں ایسے مطمئن ہو کر بیٹھے ہیں کہ گویا یہاں سے کہیں جانا ہی نہیں ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہنا

[1] ترجمہ: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جس نے ہم سے غم دور کیا۔

ہے، ان کو کبھی یہ دھیان نہیں آتا کہ اس دنیا سے ہر شخص کو رخصت ہونا تو ایسا بدیہی مسئلہ ہے جس میں کبھی کسی کو شبہ ہی نہیں ہوسکتا، اور جب یہاں سے جانا یقینی ہے تو جہاں جانا ہے وہاں کی کچھ تیاری ہونا چاہئے۔"

تیسرے یہ کہ "یہ لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے مسلسل غفلت ہی غفلت میں ہیں، اگر وہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی عام مخلوقات میں اور خود اپنے نفس میں ذرا بھی غور کرتے تو حقیقتِ حال کا سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوتا اور وہ اس احمقانہ غفلت سے نکل سکتے تھے۔

ایسے لوگ جن کی یہ علامات بتلائی گئیں ان کی سزا آخرت میں یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے اور یہ سزا خود ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔

افسوس ہے کہ قرآنِ کریم نے جو علامات کفار و منکرین کی بتلائی ہیں آج ہم مسلمانوں کا حال ان سے کچھ ممتاز نہیں، ہماری زندگی اور ہمارے شب و روز کے اشغال وافکار کو دیکھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ ہمیں اس دنیا کے سوا اور بھی کوئی فکر لگی ہوئی ہے اور اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو پکا اور سچا مسلمان باور کئے ہوئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ سچے اور پکے مسلمان، جیسے کہ ہمارے اسلاف تھے ان کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی ہستی کا خوف اور کسی حساب کی فکر دل میں رکھتے ہیں، اور تو اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی باوجود گناہوں سے معصوم ہونے کے یہی حال تھا، شمائلِ ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات غمگین اور متفکر نظر آتے تھے۔ [1]

تیسری آیت میں ان خوش نصیب انسانوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ جل شانہٗ کی آیاتِ قدرت میں غور کیا اور اس کو پہچانا، اس پر ایمان لائے اور ایمان کے مقتضیٰ پر عمل کر کے اعمالِ صالحہ کے پابند ہوگئے۔

قرآنِ کریم نے ان حضرات کے لئے دنیا وآخرت میں جو اچھا صلہ اور جزاء مقرر فرمائی ہے اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ یعنی ان کا ربّ ان کو ایمان کی وجہ سے منزلِ مقصود یعنی جنت دکھلائے گا، جس میں چین وآرام کے باغوں میں نہریں بہتی ہوں گی۔

اِس میں لفظ ہدایت آیا ہے جس کے مشہور معنیٰ راستہ بتلانے اور دکھلانے کے ہیں، اور کبھی منزلِ مقصود تک پہنچادینے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس مقام پر یہی معنیٰ مراد ہیں اور منزلِ مقصود سے مراد جنت ہے جس کی وضاحت بعد کے الفاظ میں ہوگئی ہے، جس طرح پہلے طبقہ کی سزا ان کے اپنے کرتوت کا نتیجہ تھی اسی طرح اس دوسرے مؤمن طبقہ کی جزاء کے بارے میں فرمایا کہ یہ بہترین جزاء ان کو ان کے ایمان کی وجہ سے ملی ہے اور چونکہ اوپر ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر آچکا ہے اس لئے اس جگہ ایمان سے وہی ایمان مراد ہوگا جس کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی ہوں، ایمان

---

[1] شمائل ترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص:۱۴

اور عملِ صالح کا بدلہ بے نظیر راحتوں اور نعمتوں کا مقام جنت ہے۔

چوتھی آیت میں جنت میں پہنچنے کے بعد اہلِ جنت کے چند مخصوص حالات بتلائے ہیں، اوّل یہ کہ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ، اس میں لفظ دعوٰی اپنے مشہور معنٰی میں نہیں جو کوئی مدعی اپنے حریف کے مقابلہ میں کیا کرتا ہے، بلکہ اس جگہ لفظ دعوٰی دُعا کے معنی میں ہے، معنٰی یہ ہیں کہ اہلِ جنت کی دُعا جنت میں پہنچنے کے بعد یہ ہوگی کہ وہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہتے رہیں گے یعنی اللہ جل شانہٗ کی تسبیح کیا کریں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دُعا تو عرفِ عام میں کسی چیز کی درخواست اور کسی مقصد کے طلب کرنے کو کہا جاتا ہے، سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ میں نہ کوئی درخواست ہے نہ طلب، اس کو دُعا کس حیثیت سے کہا گیا؟

جواب یہ ہے کہ اس کلمہ سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں ہر راحت ہر مطلب من مانے انداز سے خود بخود حاصل ہوگی، کسی چیز کو مانگنے اور درخواست کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی، اس لئے درخواست وطلب اور معروف دُعا کے قائم مقام ان کی زبانوں پر صرف اللہ کی تسبیح ہوگی اور وہ بھی دُنیا کی طرح کوئی فریضہ عبادت ادا کرنے کے لئے نہیں بلکہ وہ اس کلمۂ تسبیح سے لذت محسوس کریں گے اور اپنی خوشی سے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہا کریں گے، اس کے علاوہ ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "جو بندہ میری حمد وثنا میں ہر وقت لگا رہے یہاں تک کہ اس کو اپنے مطلب کی دُعا مانگنے کی بھی فرصت نہ رہے تو میں اس کو تمام مانگنے والوں سے بہتر چیزوں گا [۱] یعنی بے مانگے اس کے سب کام پورے کردوں گا۔" اِس حیثیت سے بھی لفظ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کو دُعا کہہ سکتے ہیں۔

اسی معنٰی کے اعتبار سے صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی تکلیف و بے چینی پیش آتی تو آپ یہ دُعا پڑھا کرتے تھے:

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔

اور امام طبریؒ نے فرمایا کہ سلفِ صالحین اس کو دُعائے کرب کہا کرتے تھے، اور مصیبت و پریشانی کے وقت یہ کلمات پڑھ کر دُعا مانگا کرتے تھے۔ (تفسیر قرطبی) [۲]

اور امام ابنِ جریر، ابنِ منذر وغیرہ نے ایک یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ اہلِ جنت کو جب کسی چیز کی ضرورت اور

---

[۱] مسند البزار، رقم الحدیث:۱۳۷

[۲] صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الکرب ج:۲ ص:۹۳۹، وصحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء إلخ، باب دعاء الکرب ج:۲ ص:۳۵۱، وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۳۱۴

خواہش ہوگی تو وہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے، یہ سنتے ہی فرشتے ان کے مطلب کی چیز حاضر کردیں گے، گویا کلمہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ اہلِ جنت کی ایک خاص اِصطلاح ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہش کا اظہار کریں گے اور ملائکہ ہر مرتبہ اس کو پورا کردیں گے (روح المعانی وقرطبی) [۱] اِس لحاظ سے بھی کلمہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کو دُعا کہا جاسکتا ہے۔

اہلِ جنت کا دوسرا حال یہ بتلایا کہ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ تَحِیَّہ عرف میں اس کلمہ کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ کسی آنے والے یا ملنے والے شخص کا استقبال کیا جاتا ہے جیسے سلام یا خوش آمدید یا اھلًا وَّسَھْلًا وغیرہ، اس آیت نے بتلایا کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے یا فرشتوں کی طرف سے اہلِ جنت کا تحیہ لفظ سَلام سے ہوگا، یعنی یہ خوش خبری کہ تم ہر تکلیف اور ناگوار چیز سے سلامت رہوگے، یہ سلام خود حق تعالیٰ کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے جیسے سورۂ یٰسٓ میں ہے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ اور فرشتوں کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے جیسے دُوسری جگہ ارشاد ہے وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (الرعد) یعنی فرشتے اہلِ جنت کے پاس ہر دروازہ سے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہتے ہوئے داخل ہوں گے۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں کہ کسی وقت براہِ راست اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچے اور کسی وقت فرشتوں کی طرف سے، اور سلام کا لفظ اگرچہ دنیا میں دُعا ہے لیکن جنت میں پہنچ کر تو ہر مطلب حاصل ہوگا اس لئے وہاں یہ لفظ دُعا کے بجائے خوش خبری کا کلمہ ہوگا۔ (رُوح) [۲]

تیسرا حال اہلِ جنت کا یہ بتلایا کہ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ یعنی اہلِ جنت کی آخری دُعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی نصیب ہوگی جیسا کہ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک رسالہ میں فرمایا کہ جنت میں پہنچ کر عام اہلِ جنت کو علم ومعرفت کا وہ مقام حاصل ہوجائے گا جو دنیا میں علماء کا ہے، اور علماء کو وہ مقام حاصل ہوجائے گا جو یہاں انبیاء کا ہے، اور انبیاء کو وہ مقام حاصل ہوجائے گا جو دنیا میں سیّد الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں قربِ خداوندی کا انتہائی مقام حاصل ہوگا، اور ممکن ہے کہ اسی مقام کا نام مقامِ محمود ہو جس کے لئے اَذان کی دُعا میں آپ نے دُعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ جنت کی اِبتدائی دُعا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ اور آخری دُعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہوگی، اس میں اللہ جل شانہ کی صفات کی دوقسموں کی طرف اشارہ ہے، ایک صفاتِ جلال، جن میں اللہ جل شانہ کے ہر عیب اور ہر

---

[۱] تفسیر الطبری رقم الحدیث: ۱۷۵۶۳ وتفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۳۱۳، وروح المعانی تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۴۴۲

[۲] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۷ ص:۴۴۲

برائی سے پاک ہونے کا ذکر ہے دوسری صفات اکرام، جن میں اس کی بزرگی و برتری اور اعلیٰ کمال کا ذکر ہے، قرآن کریم کی آیت تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾ (الرحمٰن) میں ان دونوں قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سبحانیت اللہ تعالیٰ کی صفات جلال میں سے ہے اور مستحق حمد وثنا ہونا صفات اکرام میں سے ہے اور ترتیب طبعی کے مطابق صفات جلال صفات اکرام سے مقدم ہیں، اس لئے اہل جنت شروع میں صفات جلال کو بلفظ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ بیان کریں گے اور آخر میں صفات اکرام کو بلفظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ذکر کریں گے، یہی ان کا رات دن کا مشغلہ ہے۔

اور ان تینوں احوال کی ترتیب طبعی یہ ہے کہ اہل جنت جب سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے تو اس کے جواب میں ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے سلام پہنچے گا، اس کے نتیجہ میں وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہیں گے۔ (روح المعانی) [1]

اَحکام و مسائل

قرطبی نے اَحکام القرآن میں فرمایا کہ کھانے پینے اور تمام کاموں میں سنت اہل جنت کے اس عمل کے مطابق یہ ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمد للہ پر ختم کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے پیئے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور فارغ ہو کر الحمد للہ کہے۔

مستحب ہے کہ دُعا کرنے والا آخر میں یہ کہا کرے وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور قرطبی نے فرمایا کہ اس کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ سورۂ صٰفّٰت کی آخری آیتیں بھی پڑھے یعنی سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ﴿١٨١﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٨٢﴾ [2]

وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ

اور اگر جلدی پہنچادے اللہ لوگوں کو برائی جیسے کہ جلدی مانگتے ہیں وہ بھلائی تو ختم کردی جائے

اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿١١﴾

ان کی عمر، سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان کو جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں سرگرداں،

[1] روح المعانی تحت هذه الآیات ج:٧ ص:٤٤٢ تا ٤٤٤ [2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیات ج:٨ ص:٣١٤

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ج

اور جب پہنچے انسان کو تکلیف، پکارے ہم کو پڑا ہوا یا بیٹھا یا کھڑا،

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ط

پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلا جائے گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو کسی تکلیف پہنچے پر،

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ

اسی طرح پسند آیا بیباک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں، اور البتہ ہم ہلاک کرچکے ہیں جماعتوں کو

مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا لا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا

تم سے پہلے جب ظالم ہوگئے، حالانکہ لائے تھے ان کے پاس رسول ان کے کھلی نشانیاں، اور ہرگز نہ تھے

لِيُؤْمِنُوْا ط كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ

ایمان لانے والے، یوں ہی سزا دیتے ہیں ہم قوم گنہگاروں کو، پھر تم کو ہم نے نائب کیا

فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ

زمین میں ان کے بعد تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو، اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے

اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ لا قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ

آیتیں ہماری واضح، کہتے ہیں وہ لوگ جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی لے آ کوئی قرآن اس کے سوا

اَوْ بَدِّلْهُ ط قُلْ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِىْ ج اِنْ اَتَّبِعُ

یا اس کو بدل ڈال، تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے، میں تابع داری کرتا ہوں

إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾

اسی کی جو حکم آئے میری طرف، میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے ربّ کی، بڑے دن کے عذاب سے،

قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ

کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس کو تمہارے سامنے اور نہ وہ تم کو خبر کرتا اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں

عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ

ایک عمر اس سے پہلے، کیا پھر تم نہیں سوچتے، پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر

كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾

بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو، بیشک بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر اللہ (ان کافر) لوگوں کو بُرائی (یعنی عذاب) کا نشانہ بنانے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی جلدی وہ اچھائیاں مانگنے میں مچاتے ہیں تو اُن کی مہلت تمام کردی گئی ہوتی۔ (لیکن ایسی جلد بازی ہماری حکمت کے خلاف ہے) لہٰذا جو لوگ ہم سے (آخرت میں) ملنے کی توقع نہیں رکھتے، ہم اُنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔ ⑪ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لیٹے بیٹھے اور کھڑے ہوئے (ہر حالت میں) ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اُس کی تکلیف دُور کردیتے ہیں، تو اس طرح چل کھڑا ہوتا ہے جیسے کبھی اپنے آپ کو پہنچنے والی کسی تکلیف میں ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ جو لوگ حد سے گذر جاتے ہیں، اُنہیں اپنے کرتوت اسی طرح خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ⑫ اور ہم نے تم سے پہلے (کئی) قوموں کو اُس موقع پر ہلاک کیا جب اُنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا تھا، اور اُن کے پیغمبر اُن کے پاس روشن دلائل لے کر آئے تھے، اور وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے۔ ایسے مجرم لوگوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ⑬ پھر ہم نے اُن کے بعد زمین میں تم کو جانشین بنایا ہے تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ ⑭ اور وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے آملنے کی توقع نہیں رکھتے جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، جبکہ وہ بالکل واضح ہوتی

ہیں، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ: ”یہ نہیں، کوئی اور قرآن لے کر آؤ، یا اس میں تبدیلی کرو۔“ (اے پیغمبر!) ان سے کہہ دو کہ: ”مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں۔ میں تو کسی اور چیز کی نہیں، صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ اگر کبھی میں اپنے ربّ کی نافرمانی کر بیٹھوں تو مجھے ایک زبردست دن کے عذاب کا خوف ہے۔“ ⑮ کہہ دو کہ: ”اگر اللہ چاہتا تو میں اس قرآن کو تمہارے سامنے نہ پڑھتا، اور نہ اللہ تمہیں اس سے واقف کراتا۔ آخر اس سے پہلے بھی تو میں ایک عمر تمہارے درمیان بسر کر چکا ہوں۔ کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ⑯ پھر اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے، یا اُس کی آیتوں کو جھٹلائے؟ یقین رکھو کہ مجرم لوگ فلاح نہیں پاتے۔“ ⑰

خلاصۂ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر (ان کی جلدی مچانے کے موافق) جلدی سے نقصان واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدہ کے لئے جلدی مچاتے ہیں (اور اس کے موافق وہ فائدہ جلد واقع کر دیتا ہے اسی طرح اگر نقصان بھی واقع کر دیا کرتا) تو ان کا وعدہ (عذاب) کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا (لیکن ہماری حکمت جس کا بیان ابھی آتا ہے چونکہ اس کو مقتضی نہیں ہے) سو (اس لئے) ہم ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے ان کے حال پر (بلا عذاب چندروز) چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں (اور مستحق عذاب کے ہو جاویں اور وہ حکمت یہی ہے) اور جب اِنسان کو (یعنی ان میں سے بعض کو) کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے، لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی، (اور اس وقت کوئی بت وغیرہ یاد نہیں رہتا ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاهُ [1] (بنی اسرائیل: ۶۷)) پھر جب (اس کی دعا و التجاء کے بعد) ہم اس کی وہ تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی حالت پر آ جاتا ہے (اور ہم سے ایسا بے تعلق ہو جاتا ہے) کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا (اور پھر وہی شرک کی باتیں کرنے لگتا ہے، نَسِیَ مَا کَانَ یَدْعُوْٓا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا [2] (الزمر: ۸)) ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں (جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے) اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے گروہوں کو (انواعِ عذاب سے) ہلاک کر دیا ہے جبکہ انہوں نے ظلم (یعنی کفر و شرک) کیا حالانکہ ان کے پاس ان کے پیغمبر بھی دلائل لے کر آئے اور وہ (بوجہ غایت عناد کے) ایسے کب تھے کہ ایمان لے آتے، ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (جیسا ہم نے ابھی بیان کیا ہے) پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو آباد کیا تاکہ (ظاہری طور پر بھی) ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو (آیا ویسا ہی شرک و کفر کرتے ہو یا ایمان لاتے ہو) اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا

[1] ترجمہ: بجز خدا کے اور جتنوں کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں۔
[2] ترجمہ: جس کے لئے پہلے سے پکار رہا تھا اس کو بھول جاتا ہے اور خدا کے شریک بنانے لگتا ہے۔

نہیں ہے (آپ سے) یوں کہتے ہیں کہ (یا تو) اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لائیے (جس میں ہمارے مسلک کے خلاف مضامین نہ ہوں) یا (کم از کم) اسی (قرآن) میں کچھ ترمیم کر دیجئے (کہ ہمارے مسلک کے خلاف مضامین اس سے حذف کر دیجئے اور اس منطوق سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ وہ لوگ قرآن کو کلامِ محمدی سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ اسی بناء پر جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ) آپ یوں کہہ دیجئے کہ (قطع نظر اس سے کہ ایسے مضامین کا حذف کرنا فی نفسہ کیسا ہے خود) مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں (اور جب بعض کا حذف بھی ممکن نہیں تو کل کا حذف تو بدرجۂ اَولیٰ ناممکن ہے کیونکہ وہ میرا کلام تو ہے ہی نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے آیا ہے، جب یہ ہے تو) بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے (اور بالفرض خدانخواستہ) اگر میں (وحی کا اتباع نہ کروں بلکہ) اپنے رَبّ کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دِن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں (جو اہلِ عصیان کے لئے مخصوص ہے اور بوجہ عصیان کے تمہارے نصیب میں ہے سو میں تو اس عذاب یا اس کے سبب یعنی عصیان کی جرأت نہیں رکھتا اور اگر ان کو اس کے وحی ہونے میں کلام ہے اور یہ آپ ہی کا کلام سمجھے جاتے ہیں تو) آپ یوں کہہ دیجئے کہ (یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کلام معجز ہے کوئی بشر اس پر قادر نہیں ہوسکتا خواہ میں ہوں یا تم ہو سو) اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا (کہ میں یہ کلامِ معجز تم کو نہ سنا سکوں اور اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے تم کو اس کی اطلاع نہ دے) تو (مجھ پر اس کو نازل نہ فرماتا پس) نہ تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا (پس جب میں تم کو سنا رہا ہوں اور میرے ذریعہ سے تم کو اِطلاع ہو رہی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کلامِ معجز کا سنوارنا اور اطلاع کرنا منظور ہوا اور سنانا اور اطلاع دینا بدون وحی کے بوجہ اس کے معجز ہونے کے ممکن نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ وحی منزل اور کلامِ الٰہی ہے) کیونکہ (آخر) اس (کلام کے ظاہر کرنے) سے پہلے بھی تو ایک بڑے حصہ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں (پھر اگر یہ میرا کلام ہے تو یا تو اتنی مدت تک ایک جملہ بھی اس طرز کا نہ نکلا اور یا دفعۃً اتنی بڑی بات بنالی یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے) پھر کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے ہو (جب اس کا کلامِ الٰہی اور حق ہونا ثابت ہوگیا اور پھر بھی مجھ سے درخواست ترمیم کی کرتے ہو اور اس کو نہیں مانتے تو سمجھ لو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (جیسا میرے لئے تجویز کرتے ہو) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلاوے (جیسا اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے) یقیناً ایسے مجرموں کو اصلاً فلاح نہ ہوگی (بلکہ مُعذَّب ابدی ہوں گے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آخرت کے منکر ہیں، اسی وجہ سے جب ان کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ بطورِ استہزاء کہنے لگتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ عذاب ابھی بلالو یا یہ کہ پھر یہ عذاب

جلد کیوں نہیں آ جاتا، جیسے نضر بن حارث نے کہا تھا ''یا اللہ اگر یہ بات سچی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے یا اور کوئی سخت عذاب بھیج دیجئے۔''

پہلی آیت میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہیں، یہ عذاب موعود فوراً اس وقت بھی نازل فرما سکتے ہیں مگر وہ اپنی حکمتِ بالغہ اور لطف و کرم سے ایسا نہیں کرتے یہ نادان جو اپنے حق میں بددُعا کرتے اور مصیبت طلب کرتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ان کی بددُعا کو بھی اسی طرح جلد قبول فرما لیا کرتے جس طرح ان کی اچھی دُعا کو اکثر کر لیتے ہیں تو یہ سب ہلاک ہو جاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دُعائے خیر اور اچھی دُعا کے متعلق تو حق تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ اکثر جلد قبول کر لیتے ہیں اور کبھی کسی حکمت و مصلحت سے قبول نہ ہونا اس کے منافی نہیں، مگر جو انسان کبھی اپنی نادانی سے اور کبھی کسی غصہ اور رنج سے اپنے لئے یا اپنے اہل و عیال کے لئے بددُعا کر بیٹھتا ہے یا انکارِ آخرت کی بنا پر عذاب کو کھیل سمجھ کر اپنے لئے دعوت دیتا ہے اُس کو فوراً قبول نہیں کرتے بلکہ مہلت دیتے ہیں تاکہ منکر کو غور و فکر کر کے اپنے انکار سے باز آنے کا موقع ملے اور اگر کسی وقتی رنج و غصہ یا دل تنگی کے سبب بددُعا کر بیٹھا ہے تو اس کو اِس کی مہلت مل جائے کہ اپنے بھلے بُرے کو دیکھے اور انجام پر نظر ڈال کر اس سے باز آ جائے۔

امام ابن جریر طبریؒ نے بروایتِ قتادہؒ اور بخاریؒ و مسلمؒ نے بروایتِ مجاہدؒ نقل کیا ہے کہ اس جگہ بددُعا سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی انسان غصہ کی حالت میں اپنی اولاد یا مال و دولت کے تباہ ہونے کی بددُعا کر بیٹھتا یا ان چیزوں پر لعنت کے الفاظ کہہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ایسی دُعا قبول کرنے میں جلدی نہیں فرماتے،[1] امام قرطبیؒ نے اس جگہ ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل شانہٗ سے دُعا کی ہے کہ وہ کسی دوست عزیز کی بددُعا اس کے دوست عزیز کے متعلق قبول نہ فرماویں، اور شہر بن حوشب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو فرشتے انسانوں کی حاجت روائی پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ میرا بندہ جو رنج و غصہ میں کچھ بات کہے اس کو نہ لکھو۔ (قرطبی)[2]

اس کے باوجود بعض اوقات کوئی قبولیت کی گھڑی آتی ہے جس میں انسان کی زبان سے جو بات نکلے وہ فوراً قبول ہو جاتی ہے اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد اور مال کے لئے کبھی بددُعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیتِ دُعا کا ہو، اور یہ بددُعا فوراً قبول ہو جائے (اور تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے) صحیح مسلم میں یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے غزوۂ بواط کے واقعہ کے تحت نقل کی گئی ہے۔''[3]

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ یونس وقال ابن عباس فاختلط بہ الآیۃ ج:۲ ص:۶۷۲
[2] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۸ ص:۳۱۵ [3] صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب حدیث جابر الطویل وقصۃ ابی الیسر ج:۲ ص:۴۱۵

ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ کا اصل خطاب اگرچہ منکرینِ آخرت اور ان کے فوری مطالبہ عذاب سے متعلق ہے لیکن اس کے عموم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو کسی رنج وغصہ کی وجہ سے اپنے یا اپنے مال واولاد کے لئے بددُعا کر بیٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عادت اُس کے فضل وکرم کی وجہ سے دونوں کے ساتھ یہی ہے کہ ایسی بددُعاؤں کو فوراً نافذ نہیں فرماتے، تاکہ انسان کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جائے۔

دوسری آیت میں منکرینِ توحید وآخرت کو ایک دوسرے بلیغ انداز سے قائل کیا گیا ہے وہ یہ کہ لوگ عام حالات راحت واطمینان میں خدا وآخرت کے خلاف حجت بازی کرتے اور غیروں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے اور ان سے حاجت روائی کی امیدیں باندھے رکھتے ہیں، لیکن جب کوئی بڑی مصیبت آپڑتی ہے اس وقت یہ لوگ خود بھی اللہ تعالیٰ کے سوا اپنی ساری امید گاہوں سے مایوس ہو کر صرف اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اور لیٹے، بیٹھے، کھڑے غرض ہر حال میں اسی کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ احسان فراموشی کا یہ عالم ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو خدا تعالیٰ سے ایسے آزاد و بےفکر ہو جاتے ہیں کہ گویا کبھی اس کو پکارا ہی نہ تھا اور اس سے کوئی حاجت مانگی ہی نہ تھی، اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاجت روائی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے والے خود بھی اپنے اس عقیدہ کا بطلان مشاہدہ کر لیتے ہیں، مگر پھر عناد وضد کی وجہ سے اُسی باطل عقیدہ پر جمے رہتے ہیں۔

تیسری آیت میں اسی دوسری آیت کے مضمون کی مزید توضیح اور تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے ڈھیل دینے سے یہ نہ سمجھے کہ دنیا میں عذاب آ ہی نہیں سکتا، پچھلی قوموں کی تاریخ اور ان کی سرکشی ونافرمانی کی سزا میں مختلف قسم کے عذاب اسی دنیا میں آچکے ہیں، اِس اُمت میں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام کی وجہ سے یہ وعدہ فرمالیا ہے کہ عذابِ عام نہ آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کے اسی لطف وکرم نے ان لوگوں کو ایسا بےباک کر دیا ہے کہ وہ بڑی جرأت سے عذابِ الٰہی کو دعوت دینے اور اس کا مطالبہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن یاد رہے کہ عذابِ الٰہی سے بےفکری ان کے لئے بھی کسی حال میں رَوا نہیں، کیونکہ پوری اُمت اور پوری دنیا پر عذابِ عام نہ بھیجنے کا وعدہ ضروری ہے مگر خاص خاص افراد اور قوموں پر عذاب آجانا اب بھی ممکن ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ یعنی پھر پچھلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تمہیں ان کا قائم مقام بنایا اور زمین کی خلافت تمہارے حوالہ کر دی مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ زمین کی خلافت تمہارے عیش وآرام کے لئے تمہیں سپرد کی گئی ہے بلکہ اس اعزاز واکرام کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمہارا امتحان لیا جائے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو، پچھلی تاریخِ اُمم سے متأثر ہو کر اپنے حالات کی اصلاح کرتے ہو یا حکومت ودولت کے نشہ میں سرشار ہو جاتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی حکومت واقتدار کوئی فخر وناز کی چیز نہیں بلکہ ایک بھاری بوجھ ہے جس کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔

پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں چار آیتوں میں منکرینِ آخرت کے ایک غلط خیال اور بے جا فرمائش کی تردید ہے، ان لوگوں کو نہ خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی اور نہ وحی ورسالت کے سلسلہ سے واقف تھے، انبیاء علیہم السلام کو بھی عام انسانوں کی طرح جانتے تھے، قرآنِ کریم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو پہنچا اس کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ یہ خود آپ کا کلام اور آپ کی تصنیف ہے، اسی خیال کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ یہ قرآن تو ہمارے اعتقادات ونظریات کے خلاف ہے، جن بتوں کی ہمارے باپ دادا ہمیشہ تعظیم کرتے آئے اور ان کو حاجت روا مانتے آئے ہیں قرآن ان سب کو باطل اور لغو قرار دیتا ہے، بہت سی چیزیں اور معاملات جو ہم برابر استعمال کرتے آئے ہیں قرآن اُن سب کو حرام قرار دیتا ہے، اور پھر قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور حساب کتاب دینا ہوگا، یہ سب چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہم ان کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اس لئے آپ یا تو ایسا کریں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دُوسرا قرآن بنا دیں جس میں یہ چیزیں نہ ہوں یا کم از کم اسی میں ترمیم کر کے ان چیزوں کو نکال دیں۔

قرآنِ کریم نے اوّل ان کے غلط اعتقاد کو رد کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ یہ نہ میرا کلام ہے، نہ اپنی طرف سے اس کو بدل سکتا ہوں میں تو صرف وحی الٰہی کا تابع ہوں، اگر میں ذرا بھی اُس میں اپنے اختیار سے کوئی تبدیلی کروں تو سخت گناہ کا مرتکب ہوں گا اور نافرمانی کرنے والوں پر جو عذاب مقرر ہے میں اس سے ڈرتا ہوں اِس لئے ایسا نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں فرمانِ خداوندی کے تابع کرتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ تمہیں یہ کلام نہ سنایا جائے تو نہ میں تمہیں سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اُس سے باخبر کرتے، اور جب اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ تمہیں یہی کلام سنوایا جائے تو کس کی مجال ہے جو اس میں کوئی کمی بیشی کر سکے۔

اس کے بعد قرآن کے من جانب اللہ اور کلامِ الٰہی ہونے کو ایک واضح دلیل سے سمجھایا **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ** یعنی تم ذرا یہ بھی تو سوچو کہ نزولِ قرآن سے پہلے میں نے تمہارے سامنے چالیس سال کی طویل مدت گزاری ہے، اس مدت میں تم نے کبھی مجھے شعر وسخن یا کوئی مقالہ لکھتے ہوئے نہیں سنا، اگر میں اپنی طرف سے ایسا کلام کہہ سکتا تو کچھ نہ کچھ اس چالیس سال کے عرصہ میں بھی کہا ہوتا، اس کے علاوہ اس چالیس سالہ طویل زندگی میں تم میرے چال چلن میں صدق ودیانت کا تجربہ کر چکے ہو کہ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا تو آج چالیس سال کے بعد آخر جھوٹ بولنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، اس

سے بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صادق امین ہیں، قرآن میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام اُسی کی طرف سے آیا ہوا ہے۔

اہم فائدہ

قرآنِ کریم کی اس دلیل نے صرف قرآن کے کلامِ حق ہونے پر ہی مکمل ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ عام معاملات میں کھرے کھوٹے اور حق و باطل کی پہچان کا ایک اصول بھی بتا دیا کہ کسی شخص کو کوئی عہدہ یا منصب سپرد کرنا ہو تو اس کی قابلیت اور صلاحیت کو جانچنے کا بہترین اصول یہ ہے کہ اُس کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے، اگر اس میں صدق و امانت داری موجود ہے تو آئندہ بھی اس کی توقع کی جاسکتی ہے، اور اگر پچھلی زندگی میں اس کی دیانت و امانت اور صدق وسچائی کی شہادت موجود نہیں تو آئندہ کے لئے محض اس کے کہنے اور دعوے کی وجہ سے اس پر اعتماد کرنا کوئی دانشمندی نہیں، آج عہدوں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی سپردگی میں جس قدر غلطیاں اور ان کی وجہ سے عظیم مفاسد پیدا ہو رہے ہیں ان سب کی اصلی وجہ اسی اصولِ فطرت کو چھوڑ کر رسمی چیزوں کے پیچھے پڑ جانا ہے۔

آٹھویں آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید وارد ہوئی ہے جس میں کسی کلام کو غلط طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کا عذابِ شدید مذکور ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ

اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کی جو نہ نقصان پہنچا سکے ان کو اور نہ نفع اور کہتے ہیں یہ تو

شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ

ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس، تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں

وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ

اور نہ زمین میں، وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو شریک کرتے ہیں، اور لوگ جو ہیں

اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جُدا جُدا ہوگئے، اور اگر نہ ایک بات پہلے ہوچکتی تیرے رَبّ کی

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ

تو فیصلہ ہوجاتا ان میں جس بات میں کہ اختلاف کر رہے ہیں، اور کہتے ہیں کیوں نہ اتری

عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ

اس پر ایک نشانی اس کے رَبّ سے، سو تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو، میں بھی

مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع

تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن (من گھڑت خداؤں) کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ ان کو کوئی فائدہ دے سکتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔ (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: ''کیا تم اللہ کو اُس چیز کی خبر دے رہے ہو جس کا کوئی وجود اللہ کے علم میں نہیں ہے، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں؟'' (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ان کی مشرکانہ باتوں سے بالکل پاک اور کہیں بالا و برتر ہے۔ ﴿۱۸﴾ اور (شروع میں) تمام انسان کسی اور دِین کے نہیں، صرف ایک ہی دِین کے قائل تھے۔ پھر بعد میں وہ آپس مین اختلاف کر کے الگ الگ ہوئے۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہوچکی ہوتی تو جس معاملے میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں، اُس کا فیصلہ (دُنیا ہی میں) کر دیا جاتا۔ ﴿۱۹﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ''اِس نبی پر اُس کے رَبّ کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں کی گئی؟'' تو (اے پیغمبر! تم جواب میں) کہہ دو کہ: ''غیب کی باتیں تو صرف اللہ کے اختیار میں ہیں۔ لہٰذا تم انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔'' ﴿۲۰﴾

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ اللہ (کی توحید) کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو (عبادت نہ کرنے کی صورت میں) نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ (عبادت کرنے کی صورت میں) ان کو نفع پہنچا سکیں اور (اپنی طرف سے بلا دلیل ایک نفع تراش کر) کہتے ہیں کہ یہ (معبود) اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں (اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں) آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز بتلاتے ہو جو خدا تعالیٰ کو معلوم نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں (یعنی جو چیز اللہ کے علم میں نہ ہو، اس کا وجود اور وقوع محال ہے تو تم ایک محال چیز کے پیچھے لگے ہو) اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے اور (پہلے) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے تھے (یعنی سب موحد تھے، کیونکہ آدم علیہ السلام عقیدۂ توحید لے کر آئے، ان کی اولاد بھی ایک زمانے تک انہیں کے عقید اور طریقے پر رہی) پھر (اپنی کجرائی سے) انہوں نے (یعنی بعض نے) اختلاف پیدا کرلیا (یعنی توحید سے پھر گئے، مشرک ہوگئے اور یہ مشرک لوگ ایسے مستحقِ عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے ربّ کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو ابھی نہیں بلکہ آخرت میں دیا جائے گا) تو جس چیز میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا قطعی فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (براہِ عناد سینکڑوں معجزات ظاہر ہو جانے کے باوجود خصوصاً معجزۂ قرآن دیکھنے اور اس کی مثال سے عاجز ہونے کے باوجود) یوں کہتے ہیں کہ ان پر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوا؟ تو آپ فرما دیجئے کہ (معجزہ کا اصل مقصد رسول کے صدق وحقانیت کو ثابت کرنا ہے، وہ تو بہت سے معجزات کے ذریعہ ہو چکا ہے، اب فرمائشی معجزات کی ضرورت تو ہے نہیں، ہاں امکان ہے کہ ظاہر ہوں یا نہ ہوں اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور) غیب کا علم صرف خدا کو ہے (مجھ کو نہیں) اس لئے تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ تمہاری ہر فرمائش پوری ہوتی ہے یا نہیں، اور فرمائشی معجزات کے ظاہر نہ کرنے کی حکمت قرآنِ کریم میں کئی جگہ بتلا دی گئی ہے کہ ان کے ظہور کے بعد عادۃ اللہ یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لائیں تو ساری قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس اُمت کے لئے ایسا عذاب عام منظور نہیں بلکہ اس کو تا قیامت باقی رکھنا مقدر ہو چکا ہے)۔

معارف و مسائل

کافر و مسلم دو قومیں الگ الگ ہیں نسلی اور وطنی قومیت لغو ہے

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً، یعنی تمام اولادِ آدم شروع میں ایک ہی اُمت ایک ہی قوم موحدین کی تھی، شرک

وکفر کا نام نہیں تھا، پھر توحید میں اختلاف پیدا کر کے مختلف قومیں مختلف گروہ بن گئے۔

یہ زمانہ اُمتِ واحدہ اور سب کے مسلمان ہونے کا کتنا تھا اور کب تک رہا؟ روایاتِ حدیث وسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک یہی صورت تھی، نوح علیہ السلام کے زمانے میں شرک وکفر ظاہر ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ (تفسیر مظہری) [1]

یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک ایک طویل زمانہ ہے دنیا میں اِنسانوں کی نسلیں اور آبادی کافی پھیل چکی تھی، ان تمام انسانوں میں رنگ وروپ اور طرزِ معاشرت کا اختلاف ہونا بھی ایک طبعی امر ہے اور مختلف خطوں میں پھیل جانے کے بعد وطن کا اختلاف بھی یقینی ہے اور ممکن ہے کہ بول چال میں زبانیں بھی کچھ مختلف ہوگئی ہوں، مگر قرآن کریم نے اس نسبی، قبائلی، لونی، وطنی اختلاف کو جو امورِ فطریہ ہیں، وحدتِ اُمت میں خلل انداز قرار نہیں دیا، اور ان اختلافات کی وجہ سے اولادِ آدم کو مختلف قومیں مختلف اُمتیں نہیں بلکہ اُمتِ واحدہ قرار دیا۔

ہاں جب ایمان کے خلاف کفر وشرک پھیلا تو کافر ومشرک کو الگ قوم الگ ملت قرار دے کر فَاخْتَلَفُوْا ارشاد فرمایا، قرآنِ کریم کی آیت هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (التغابن: ۲) [2] نے اس مضمون کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ اللہ کی مخلوق اولادِ آدم کو مختلف قوموں میں بانٹنے والی چیز صرف ایمان واسلام سے انحراف ہے، نسبی وطنی رشتوں سے قومیں الگ الگ نہیں ہوتیں، زبان اور وطن یا رنگ ونسل کی بناء پر انسانوں کو مختلف گروہ قرار دینے کی جہالت یہ نئی حماقت ہے جو نئی روشنی نے پیدا کی ہے اور آج کے بہت سے لکھے پڑھے اس نیشنلزم کے پیچھے لگ گئے جو ہزاروں فتنے اور فساد اپنے دامن میں رکھتا ہے، اَعَاذَ اللّٰهُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْهُ۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ

اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو مزا اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے جو ان کو پہنچی تھی اسی وقت بنانے لگیں حیلے

فِیْٓ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

ہماری قدرتوں میں، کہہ دے کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے حیلے، تحقیق ہمارے فرشتے لکھتے ہیں

[1] التفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۱۷ [2] ترجمہ: وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا سو تم میں بعضے کافر ہیں اور بعضے مؤمن ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ج

حیلہ بازی تمہاری وہ ہی تم کو پھراتا ہے جنگل اور دریا میں، یہاں تک کہ جب تم بیٹھے کشتیوں میں،

وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ

اور لے کر چلیں وہ لوگوں کو اچھی ہوا سے اور خوش ہوئے اس سے، آئی کشتیوں پر ہوا تند

وَّجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ لا دَعَوُا اللّٰهَ

اور آئی ان پر موج ہر جگہ سے اور جان لیا انہوں نے کہ وہ گھر گئے پکارنے لگے اللہ کو

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ج لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُونَنَّ مِنَ

خالص ہوکر اس کی بندگی میں، اگر تو نے بچالیا ہم کو اس سے تو بیشک ہم رہیں گے

الشّٰكِرِينَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّا أَنْجٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط

شکرگزار، پھر جب بچادیا ان کو اللہ نے لگے شرارت کرنے اسی وقت زمین میں ناحق کی،

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ لا مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ز ثُمَّ إِلَيْنَا

سنو لوگو تمہاری شرارت ہے تمہی پر، نفع اٹھالو دنیا کی زندگانی کا پھر ہمارے پاس ہے

مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾ إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

تم کو لوٹ کر آنا پھر ہم بتلادیں گے جو کچھ کہ تم کرتے تھے، دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے

كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ

جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے پھر رلاملا نکلا اس سے سبزہ زمین کا جو کہ کھائیں آدمی

وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ

اور جانور، یہاں تک کہ جب پکڑی زمین نے رونق اور مزین ہوگئی اور خیال کیا

اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا

زمین والوں نے کہ یہ ہمارے ہاتھ لگے گی ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اس کو کاٹ کر ڈھیر

كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۲۴

گویا کل یہاں نہ تھی آبادی، اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اِنسانوں کا حال یہ ہے کہ جب اُن کو پہنچنے والی کسی تکلیف کے بعد ہم اُن کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو ذرا سی دیر میں وہ ہماری نشانیوں کے بارے میں چالبازی شروع کر دیتے ہیں۔ کہہ دو کہ: ''اللہ اس سے بھی جلدی کوئی چال چل سکتا ہے۔'' یقیناً ہمارے فرشتے تمہاری ساری چالبازیوں کو لکھ رہے ہیں (۲۱) وہ اللہ ہی تو ہے جو تمہیں خشکی میں بھی اور سمندر میں بھی سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو، اور یہ کشتیاں لوگوں کو لے کر خوشگوار ہوا کے ساتھ پانی پر چلتی ہیں، اور لوگ اس بات پر مگن ہوتے ہیں، تو اچانک اُن کے پاس ایک تیز آندھی آتی ہے، اور ہر طرف سے اُن پر موجیں اُٹھتی ہیں، اور وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر طرف سے گھِر گئے، تو اُس وقت وہ خلوص کے ساتھ صرف اللہ پر اِعتقاد کر کے صرف اُسی کو پکارتے ہیں، (اور کہتے ہیں کہ:) ''(یا اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس (مصیبت سے) نجات دے دی تو ہم ضرور بالضرور شکر گذار لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔'' (۲۲) لیکن جب اللہ اُن کو نجات دے دیتا ہے تو زیادہ دیر نہیں گذرتی کہ وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ ارے لوگو! تمہاری یہ سرکشی درحقیقت خود تمہارے اپنے خلاف پڑ رہی ہے۔ اب تو دُنیوی زندگی کے مزے اُڑا لو، آخر کو ہمارے پاس ہی تمہیں لوٹ کر آنا ہے۔ اُس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ (۲۳) دُنیوی زندگی کی مثال تو کچھ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے زمین سے اُگنے والی وہ چیزیں خوب گھنی ہوگئیں جو اِنسان اور مویشی کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا یہ زیور پہن لیا، اور سنگھار کر کے خوشنما ہوگئی، اور اُس کے مالک سمجھنے لگے کہ بس اب یہ پوری طرح اُن کے قابو میں

ہے، تو کسی رات یا دن کے وقت ہمارا حکم آ گیا (کہ اُس پر کوئی آفت آ جائے)، اور ہم نے اُس کو کٹی ہوئی کھیتی کی سپاٹ زمین میں اس طرح تبدیل کر دیا جیسے کل وہ تھی ہی نہیں۔ اسی طرح ہم نشانیوں کو اُن لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

حلِ لغات

عَاصِفٌ سخت تیز ہوا، حَصِيْدًا کٹی ہوئی کھیتی، كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ یہ غَنِیَ بِالْمَكَانِ سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں۔

اور جب ہم لوگوں کو بعد اس کے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں شرارت کرنے لگتے ہیں (یعنی ان سے اعراض کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تکذیب و استہزاء سے پیش آتے ہیں اور براہِ اعتراض و عناد دوسرے معجزات کی فرمائشیں کرتے ہیں اور مصیبتِ گزشتہ سے عبرت نہیں پکڑتے پس معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا اصل سبب اللہ کی نازل کردہ آیات و معجزات سے اعراض ہے اور یہ اعراض دنیا کی نعمتوں میں مست ہو جانے سے پیدا ہوا ہے، آگے وعید ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس شرارت کی سزا بہت جلد دے گا، بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب شرارتوں کو لکھ رہے ہیں (پس علاوہ علمِ الٰہی میں محفوظ ہونے کے دفتر میں بھی محفوظ ہیں) وہ (اللہ) ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں لئے لئے پھرتا ہے (یعنی جن آلات و اسباب سے تم چلتے پھرتے ہو وہ سب اللہ ہی کے دیئے ہوئے ہیں) یہاں تک کہ (بعض اوقات) جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو، اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ اُن (کی رفتار) سے خوش ہوتے ہیں (اسی حالت میں دفعۃً) ان پر ایک جھونکا (مخالف) ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان (لوگوں) پر موجیں اٹھی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (بری طرح) گھر گئے، (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ اے اللہ) اگر آپ ہم کو اس (مصیبت) سے بچا لیں تو ہم ضرور حق شناس (یعنی موحد) بن جاویں (یعنی اس وقت جیسا اعتقاد توحید کا ہو گیا ہے اس پر قائم رہیں) پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو (اس مہلکہ سے) بچا لیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین (کے مختلف خطوں) میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں (یعنی وہی شرک و معصیت) اے لوگو (سن لو) یہ تمہاری سرکشی تمہارے لئے وبال (جان) ہونے والی ہے (بس) دنیوی زندگی میں (چندے اس سے) فائدہ اٹھا رہے ہو پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو جتلا دیں گے (اور اس کی سزا

دیں گے) بس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس (پانی) سے زمین کے نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں خوب گنجان ہو کر نکلے یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہو گئی (یعنی سبزہ سے خوشنما معلوم ہونے لگی) اور اس (زمین) کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس (کے نباتات پھلوں) پر بالکل قابض ہو چکے تو (ایسی حالت میں) دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا (جیسے پالا یا خشکی یا اور کچھ) سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا کل (یہاں) وہ موجود ہی نہ تھی (پس اسی نباتات کے مثل دنیوی زندگی ہے) ہم اس طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے جو سوچتے ہیں۔

معارف و مسائل

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، جو اچھی بھی ہو سکتی ہے بُری بھی، اردو زبان کے محاورہ سے دھوکہ نہ کھائیں کہ لفظ مکر اُردو میں دھوکہ فریب کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس سے حق تعالیٰ بَری ہے۔

اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ یعنی تمہارے ظلم کا وبال تمہارے ہی اوپر پڑ رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کا وبال یقینی ہے اور آخرت سے پہلے دنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی اور لوگوں پر احسان کرنے کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ آخرت سے پہلے دنیا میں اس کی برکات نظر آنے لگتی ہیں) اور ظلم اور قطع رحمی کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے) (رواہ الترمذی وابن ماجه بسندٍ حَسَن) [1] اور ایک حدیث میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کا وبال اپنے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ظلم، بدعہدی، اور دھوکہ فریب۔ (رواہ ابو الشیخ وابن مردویه فی التفسیر) (از مظہری) [2]

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف، اور دکھاتا ہے جس کو

[1] جامع الترمذی، ابواب الزهد، باب منه قبيل ابواب صفة الجنة ج:۲ ص:۷۷، وسنن ابن ماجة، كتاب الزهد، باب البغی ج:۲ ص:۳۱۰

[2] التفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۱۹ وكنز العمال رقم الحديث:۴۳۷۸۰

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٥﴾ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ

چاہے راستہ سیدھا، جنہوں نے کی بھلائی ان کے لئے ہے بھلائی اور زیادتی، اور نہ چڑھے گی

وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٦﴾

ان کے منہ پر سیاہی اور نہ رسوائی، وہ ہیں جنت والے، وہ اسی میں رہا کریں گے،

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ

اور جنہوں نے کمائیں بُرائیاں بدلہ ملے بُرائی کا اس کے برابر اور ڈھانک لے گی ان کو رسوائی

مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ

کوئی نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے

قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧﴾

اندھیری رات کے ٹکڑوں سے، وہ ہیں دوزخ والے، وہ اسی میں رہا کریں گے

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ

اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے شرک کرنے والوں کو کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم

وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾

اور تمہارے شریک، پھر تڑادیں گے ہم آپس میں ان کو اور کہیں گے ان کے شریک تم ہماری تو بندگی نہ کرتے تھے،

فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾

سو اللہ کافی ہے شاہد ہمارے اور تمہارے بیچ میں، ہم کو تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی،

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ

وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور رجوع کریں گے اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے ان کا

النصف ع ۳/۸ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ

اور جاتا رہے گا ان کے پاس سے جو جھوٹ باندھا کرتے تھے تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے

وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے

وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج

اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی سو بول اٹھیں گے کہ اللہ

فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ

تو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو سو یہ اللہ ہے ربّ تمہارا سچا پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے

اِلَّا الضَّلٰلُ صلے فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

مگر بھٹکنا سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ لوگوں کو سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے تک پہنچا دیتا ہے۔ ﴿۲۵﴾ جن لوگوں نے بہتر کام کیئے ہیں، بہترین حالت اُنہی کے لئے ہے، اور اُس سے بڑھ کر کچھ اور بھی! نیز اُن کے چہروں پر نہ کبھی سیاہی چھائے گی، نہ ذلت۔ وہ جنت کے باسی ہیں! وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۲۶﴾ رہے وہ لوگ جنہوں نے بُرائیاں کمائی ہیں، تو (ان کی) بُرائی کا بدلہ اُسی جیسا برا ہوگا۔ اور اُن پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ (کے عذاب)

سے انہیں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ ایسا لگے گا جیسے اُن کے چہروں پر اندھیری رات کی تہیں چڑھادی گئی ہیں۔ وہ دوزخ کے باسی ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۲۷﴾ اور (یاد رکھو) وہ دن جب ہم ان سب کو اِکٹھا کریں گے، پھر جن لوگوں نے شرک کیا تھا، اُن سے کہیں گے کہ: ''ذرا اپنی جگہ ٹھہرو، تم بھی اور وہ بھی جن کو تم نے اللہ کا شریک مانا تھا!'' پھر اُن کے درمیان (عابد اور معبود کا) جو رشتہ تھا، ہم وہ ختم کر دیں گے، اور اُن کے وہ شریک کہیں گے کہ: ''تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ﴿۲۸﴾ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ بننے کے لئے کافی ہے (کہ) ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔'' ﴿۲۹﴾ ہر شخص نے ماضی میں جو کچھ کیا ہوگا، اس موقع پر وہ خود اُس کو پرکھ لے گا، اور سب کو اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا جو اُن کا مالکِ حقیقی ہے، اور جو جھوٹ اُنہوں نے تراش رکھے تھے، اُن کا کوئی سراغ اُنہیں نہیں ملے گا۔ ﴿۳۰﴾ (اے پیغمبر! ان مشرکوں سے) کہو کہ: ''کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے؟ یا بھلا کون ہے جو سننے اور دیکھنے کی قوتوں کا مالک ہے؟ اور کون ہے جو جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے باہر نکال لاتا ہے؟ اور کون ہے جو ہر کام کا انتظام کرتا ہے؟'' تو یہ لوگ کہیں گے کہ: ''اللہ!'' تو تم ان سے کہو کہ: ''کیا پھر بھی تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ ﴿۳۱﴾ پھر تو لوگو! وہی اللہ ہے جو تمہارا مالکِ برحق ہے۔ پھر حق واضح ہو جانے کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ اس کے باوجود تمہیں کوئی کہاں اُلٹا لئے جا رہا ہے؟'' ﴿۳۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ دارالبقاء کی طرف تم کو بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے (جس سے دارالبقاء تک رسائی ہوسکتی ہے، آگے جزا و سزا کا بیان ہے کہ) جن لوگوں نے نیکی کی ہے (یعنی ایمان لائے ہیں) ان کے واسطے خوبی (یعنی جنت) ہے اور مزید براں (خدا کا دیدار) بھی اور ان کے چہروں پر نہ کدورت (غم کی) چھاوے گی اور نہ ذلت، یہ لوگ جنت میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جن لوگوں نے بدکام کئے (یعنی کفر و شرک کیا) ان کی بدی کی سزا اس کے برابر ملے گی (بدی سے زیادہ نہ ہوگی) اور ان کو ذلت چھالے گی، ان کو اللہ (کے عذاب) سے کوئی نہ بچا سکے گا (ان کی کدورتِ چہرہ کی ایسی حالت ہوگی کہ) گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت (یعنی ٹکڑے) لپیٹ دیئے گئے ہیں، یہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور وہ دن بھی قابلِ ذکر ہے جس روز ہم ان سب (خلائق) کو (میدانِ قیامت میں) جمع کریں گے پھر (من جملہ ان تمام خلائق کے) مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے (تجویز کئے ہوئے) شریک (جن کو تم عبادت میں خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ذرا) اپنی جگہ ٹھہرو (تاکہ تم کو حقیقت تمہارے عقیدہ کی معلوم کرائی جاوے) پھر ہم ان (عابدین و معبودین) کے آپس میں پھوٹ

ڈال دیں گے اور ان کے وہ شرکاء (ان سے خطاب کر کے) کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے (کیونکہ عبادت سے مقصود ہوتا ہے معبود کا راضی کرنا) سو ہمارے تمہارے درمیان خدا کافی گواہ ہے کہ ہم کو تمہاری عبادت کی خبر بھی نہ تھی (اور راضی ہونا تو درکنار البتہ شیاطین کی تعلیم تھی اور وہی راضی تھے، پس اس اعتبار سے ان کی پرستش کرتے تھے) اس مقام پر ہر شخص اپنے کئے ہوئے کا امتحان کرلے گا (کہ آیا واقع میں یہ اعمال نافع تھے یا غیر نافع، چنانچہ ان مشرکین کو بھی حقیقت کھل جاوے گی کہ جن کی شفاعت کے بھروسے ہم ان کو پوجتے تھے انہوں نے اور ہمارے خلاف شہادت دی، نفع کی تو کیا امید کی جاوے) اور یہ لوگ اللہ (کے عذاب) کی طرف جو ان کا مالکِ حقیقی ہے لوٹائے جاویں گے، اور جو کچھ معبود تراش رکھے تھے سب ان سے غائب (اور گم) ہو جاویں گے (کوئی بھی تو کام نہ آوے گا) آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (بتلاؤ) وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے (یعنی آسمان سے بارش کرتا ہے اور زمین سے نباتات پیدا کرتا ہے جس سے تمہارا رزق تیار ہوتا ہے) یا (یہ بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے (کہ پیدا بھی اسی نے کیا، حفاظت بھی وہی کرتا ہے، اور اگر چاہتا ہے تو ان کو ماؤف کر دیتا ہے) اور وہ کون ہے جو جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکالتا ہے اور بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالتا ہے (جیسے نطفہ اور بیضہ کہ وہ جاندار سے نکلتا ہے اور اس سے جاندار پیدا ہوتا ہے) اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے (ان سے سوالات کیجئے) سو ضرور وہ (جواب میں) یہی کہیں گے کہ (ان سب افعال کا فاعل) اللہ (ہے) تو ان سے کہئے کہ پھر (شرک سے) کیوں نہیں پرہیز کرتے سو (جس کے یہ افعال و اوصاف مذکور ہوئے) یہ ہے اللہ جو تمہارا ربِّ حقیقی ہے (اور جب امرِ حق ثابت ہو گیا) پھر (امر) حق کے بعد اور کیا رہ گیا، بجز گمراہی کے (یعنی جو امرِ حق کی ضد ہوگی وہ گمراہی ہے اور توحید کا حق ہونا ثابت ہو گیا، پس شرک یقیناً گمراہی ہے) پھر (حق کو چھوڑ کر) کہاں (باطل کی طرف) پھرے جاتے ہو۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں دنیاوی زندگی اور اس کی ناپائیداری کی مثال اس کھیتی سے دی گئی تھی جو آسمانی پانی سے سیراب ہو کر لہلہانے لگی اور ہر طرح کے پھل پھول نکل آئے اور کھیتی والے خوش ہونے لگے کہ اب ہماری ساری ضرورتیں اس سے پوری ہوں گی، مگر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے رات یا دن میں ہمارے عذاب کا کوئی حادثہ آپڑا جس نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا یہاں کوئی چیز موجود ہی نہ تھی، یہ تو دنیا کی زندگی کا حال تھا، اس کے بعد آیتِ مذکورہ میں اس کے بالمقابل دارِ آخرت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اِرشاد فرمایا وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو دار السلام کی طرف دعوت دیتا ہے یعنی ایسے گھر کی

طرف جس میں ہر طرح کی سلامتی ہی سلامتی ہے نہ اس میں کسی طرح کی کوئی تکلیف ہے نہ رنج وغم، نہ بیماری کا خطرہ، نہ فنا ہونے یا حالت بدل جانے کی فکر۔

دارالسلام سے مراد جنت ہے، اس کو دارالسلام کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی سلامتی اور امن وسکون ہر شخص کو حاصل ہوگا، دوسری وجہ بعض روایات میں ہے کہ جنت کا نام دارالسلام اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ اس میں بسنے والوں کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیز فرشتوں کی طرف سے سلام پہنچتا رہے گا، بلکہ لفظ سلام ہی اہلِ جنت کی اِصطلاح ہوگی، جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہشات کا اظہار کریں گے اور فرشتے ان کو مہیا کریں گے، جیسا کہ اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بطور نصیحت عوام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے دارالسلام کی طرف بلایا، تو اس دعوتِ الٰہیہ کی طرف کب اور کہاں سے قدم اٹھائے گا، خوب سمجھ لے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے اگر تُو نے دنیا ہی سے کوشش شروع کردی تو وہ کامیاب ہوگی اور تو دارالسلام میں پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس دنیا کی عمر کو ضائع کرنے کے بعد یہ چاہا کہ قبر میں پہنچ کر اس دعوت کی طرف چلوں گا تو تیرا راستہ روک دیا جائے گا، تو وہاں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا، کیونکہ وہ دارالعمل نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دارالسلام جنت کے سات ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (تفسیر قرطبی) [1]

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی گھر کا نام دارالسلام رکھنا مناسب نہیں، جیسے جنت یا فردوس وغیرہ نام رکھنا بھی درست نہیں۔

اس کے بعد آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾ یعنی پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستہ پر۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دارالسلام کی دعوت تو سارے اِنسانوں کے لئے عام ہے اور اسی معنٰی کے اعتبار سے سب کے لئے ہدایت بھی عام ہے لیکن ہدایت کی خاص قسم کہ سیدھے راستہ پر کھڑا کردیا جائے اور چلنے کی توفیق دی جائے یہ خاص خاص ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

مذکورہ دو آیتوں میں دارِ دنیا اور دارِ آخرت کا تقابل اور اہلِ دنیا اور اہلِ آخرت کے احوال کا ذکر تھا، اگلی چار آیتوں میں دونوں فریق کی جزا وسزا کا بیان ہے، پہلے اہلِ جنت کا ذکر اس طرح فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے نیکی اِختیار کی یعنی سب

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۳۲۹

سے بڑی نیکی ایمان اور پھر عملِ صالح پر قائم رہے ان کو ان کے عمل کا عمدہ اور بہتر بدلہ ملے گا، اور صرف بدلہ ہی نہیں بلکہ بدلہ سے کچھ زیادہ بھی۔

اس آیت کی تفسیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی وہ یہ ہے کہ اس جگہ اچھے بدلہ سے مراد جنت ہے، اور زِيَادَةٌ سے مراد حق تعالیٰ سبحانہٗ کی زیارت ہے جو اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔ (تفسیر قرطبی بروایتِ انسؓ) [۱]

جنت کی اتنی حقیقت سے تو ہر مسلمان واقف ہے کہ وہ ایسی راحتوں اور نعمتوں کا مرکز ہے جن کو انسان اس وقت تصوّر میں نہیں لاسکتا، اور حق تعالیٰ کی زیارت ان سب نعمتوں پر فائق ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہوچکیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے خطاب فرمائیں گے کہ کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ ہم اس کو پورا کریں گے، اہلِ جنت جواب دیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں، اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور سب اہلِ جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے [۲] تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو ربّ العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی، بقول مولانا رومیؒ ؎

ما نبودیم وتقاضہ ما نبود | لطف تو ناگفتۂ ما می شنود [۳]

اور پھر انہیں اہلِ جنت کا یہ حال بیان فرمایا کہ نہ ان کے چہروں پر کبھی کدورت یا تکلیف وغم کا اثر چھائے گا اور نہ ذلت کا اثر ہوگا جو دنیا میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی پیش آیا کرتا ہے اور آخرت میں اہلِ جہنم کو پیش آئے گا۔

اِس کے بالمقابل اہلِ جہنم کا یہ حال بیان فرمایا کہ جن لوگوں نے بُرے عمل کئے ان کو بُرائی کا بدلہ برابر سرابر ملے گا اس میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، ان کے چہروں پر ذلت چھائی ہوگی، کوئی شخص ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں کی سیاہی کا یہ حال ہوگا کہ گویا اندھیری رات کے پَرت ان پر لپیٹ دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیتوں میں ایک مکالمہ مذکور ہے جو اہلِ جہنم میں اور ان کو گمراہ کرنے والے بتوں یا شیطانوں کے درمیان محشر میں ہوگا، ارشاد فرمایا کہ اس دن ہم سب کو جمع کریں گے پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے تجویز کئے ہوئے معبود ذرا اپنی جگہ ٹھہرو تا کہ تمہیں اپنے عقیدہ کی حقیقت معلوم ہوجائے، اس کے بعد ان لوگوں میں اور ان کے

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۳۳۰، وصحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب إثبات رؤية المؤمنين في الآخرة ...إلخ ج:۱ ص:۱۰۰

[۲] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب إثبات رؤية المؤمنين في الآخرة ...إلخ ج:۱ ص:۱۰۰

[۳] نہ ہم تھے اور نہ ہمارا تقاضا تھا تو نے اپنی مہربانی سے ہماری ان کہی سنی۔

معبودوں میں جو رشتۂ اتحاد دنیا میں پایا جاتا تھا اس کو قطع کر دیا جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے بُت خود بول اٹھیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کیا کرتے تھے، اور خدا کو گواہ بنا کر کہیں گے کہ ہم کو تمہاری مشرکانہ عبادت کی کچھ خبر بھی نہ تھی، کیونکہ نہ ہم میں حس و حرکت ہے اور نہ ان مسائل کو سمجھنے کے قابل عقل و شعور ہے۔

چھٹی آیت میں دونوں فریق اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا ایک مشترک حال بیان فرمایا ہے کہ اس مقام یعنی محشر میں ہر شخص اپنے اپنے کئے ہوئے اعمال کو آزمائے گا کہ وہ نفع بخش تھے یا نقصان رساں، اور سب کے سب اپنے معبودِ حق کے پاس پہنچا دیئے جائیں گے، اور سارے بھروسے اور سہارے جو دنیا میں اِنسان ڈھونڈتا ہے ختم کر دیئے جائیں گے، اور مشرکین جن بتوں کو اپنا مددگار اور سفارشی سمجھا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے۔

ساتویں اور آٹھویں آیت میں قرآنِ حکیم نے اپنے حکیمانہ اور مربیانہ طریق پر مشرکین کی آنکھیں کھولنے کے لئے ان سے کچھ سوالات قائم کئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ان لوگوں سے کہئے کہ آسمان اور زمین میں سے تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ یا کان اور آنکھوں کا کون مالک ہے کہ جب چاہے ان میں شنوائی اور بینائی پیدا کر دے اور جب چاہے سلب کر لے، اور کون ہے جو مردہ چیز میں سے زندہ کو پیدا کر دیتا ہے جیسے مٹی سے گھاس اور درخت، یا نطفہ سے اِنسان اور جانور یا بیضہ سے پرندہ، اور زندہ میں سے مردہ کو پیدا کر دیتا ہے، جیسے انسان اور جانور سے نطفہ بے جان، اور کون ہے جو تمام کائنات کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟

پھر فرمایا کہ جب آپ ان لوگوں سے یہ سوال کریں گے تو سب کے سب یہی کہیں گے کہ ان چیزوں کو پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے! تو آپ ان سے فرمادیں کہ پھر تم کیوں خدا سے نہیں ڈرتے؟ جب ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور باقی رکھنے والا اور ان سب کے کام میں لگانے کا انتظام کرنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے تو پھر عبادت و اطاعت کا حق دار اس کے سوا کسی کو کیوں بناتے ہو۔

آخری آیت میں فرمایا فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ یعنی یہی ہے وہ ذات جس کی صفاتِ کمال کا ذکر ابھی ابھی گزرا ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کا معبودِ برحق ہونا ثابت ہوگیا تو پھر اس حق کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف رُخ پھیرنا کس قدر نامعقول بات ہے۔

اس آیت کے مسائل و فوائد میں سے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آیت میں فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق اور ضلال کے درمیان کوئی واسطہ نہیں جو حق نہیں ہوگا وہ ضلال و گمراہی میں داخل ہوگا، ایسا کوئی کام نہیں ہوسکتا جو نہ حق ہو نہ گمراہی اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ دو متضاد چیزیں حق ہوں، تمام اصولِ عقائد میں یہ قاعدہ جمہور اُمت کے نزدیک مُسلَّم ہے، البتہ جزئی مسائل اور جزئیاتِ فقہیہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک

اجتہادی مسائل میں دونوں جانبوں کو حق کہا جائے گا اور جمہور اس پر متفق ہیں کہ اجتہادی مسائل میں جانبِ خلاف کو ضلال و گمراہی نہیں کہہ سکتے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اسی طرح ٹھیک آئی بات تیرے رَبّ کی ان نافرمانوں پر کہ یہ ایمان نہ لائیں گے،

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو پیدا کرے خلق کو پھر دوبارہ زِندہ کرے، تو کہہ اللہ

يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ

پہلے پیدا کرتا ہے پھر اس کو دہرائے گا سو کہاں سے پلٹے جاتے ہو، پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں

مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ

جو راہ بتلائے صحیح تو کہہ اللہ راہ بتلاتا ہے صحیح، تو اب جو کوئی راہ بتائے صحیح

اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ

اس کی بات ماننی چاہیے یا اس کی جو آپ نہ پائے راہ مگر جب کوئی اور اس کو راہ بتلائے، سو کیا ہوگیا تم کو،

كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ

کیسا اِنصاف کرتے ہو، اور وہ اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر، سو اٹکل کام نہیں دیتی

مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

حق بات میں کچھ بھی اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اِسی طرح جن لوگوں نے نافرمانی کا شیوہ اپنالیا ہے، اُن کے بارے میں اللہ کی یہ بات سچی ہوگئی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ﴿۳۳﴾ کہو کہ: ''جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہو، کیا اُن میں کوئی ایسا ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرے، پھر (اُن کی موت کے بعد) اُنہیں دوبارہ پھر پیدا کردے؟'' کہو کہ: ''اللہ ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اُن (کی موت کے بعد) اُنہیں دوبارہ پھر پیدا کردے گا۔ پھر آخر کوئی تمہیں کہاں اوندھے منہ لئے جارہا ہے؟'' ﴿۳۴﴾ کہو کہ: ''جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہو، کیا اُن میں کوئی ایسا ہے جو تمہیں حق کا راستہ دِکھائے؟'' کہو کہ: ''اللہ حق کا راستہ دِکھاتا ہے۔ اب بتاؤ کہ جو حق کا راستہ دِکھاتا ہو، کیا وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس کی بات مانی جائے، یا وہ (زیادہ حق دار ہے) جس کو خود اُس وقت تک راستہ نہ سوجھے جب تک کوئی دوسرا اُس کی رہنمائی نہ کرے؟ بھلا تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم کس طرح کی باتیں طے کرلیتے ہو؟'' ﴿۳۵﴾ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اِن (مشرکین) میں سے اکثر لوگ کسی اور چیز کے نہیں، صرف وہمی اندازے کے پیچھے چلتے ہیں، اور یہ یقینی بات ہے کہ حق کے معاملے میں وہمی اندازہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔ یقین جانو، جو کچھ یہ لوگ کررہے ہیں، اللہ اُس کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔ ﴿۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

حل لغت

لَایَهِدِّیْ یہ لفظ دراصل لَا یَهْتَدِیْ تھا، تعلیل کرکے لَایَهِدِّیْ بن گیا، معنٰی لَا یَهْتَدِیْ کے ظاہر ہیں، یعنی وہ شخص جو ہدایت نہیں پاتا۔

(آگے تسلی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ ان لوگوں کی باطل پرستی پر مغموم ہوا کرتے تھے، ارشاد ہے کہ جس طرح یہ لوگ ایمان نہیں لاتے) اسی طرح آپ کے رَبّ کی یہ (ازلی) بات کہ یہ ایمان نہ لاویں گے تمام متمرد (سرکش) لوگوں کے حق میں ثابت ہوچکی ہے (پھر آپ کیوں مغموم ہوں اور) آپ (ان سے) یوں (بھی) کہئے کہ کیا تمہارے (تجویز کئے ہوئے) شرکاء میں (عام اِس سے کہ ذوی العقول ہوں جیسے شیاطین یا غیر ذوی العقول جیسے بُت) کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی (مخلوق کو) پیدا کرے پھر (قیامت میں) دوبارہ بھی پیدا کرے (اگر وہ اس وجہ سے کہ اس میں توہین ہے شرکاء کی، جواب میں تامل کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا سو

(اس کی تحقیق کے بعد بھی) پھر تم کہاں (حق سے) پھرے جاتے ہو (اور) آپ (ان سے یوں بھی) کہئے کہ کیا تمہارے (تجویز کئے ہوئے ذوی العقول) شرکاء میں (جیسے شیاطین) کوئی ایسا ہے کہ امرِ حق کا راستہ بتلاتا ہو؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی امرحق کا رستہ (بھی) بتلاتا ہے (چنانچہ اس نے عقل دی، انبیاء بھیجے بخلاف شیاطین کے کہ اوّلاً وہ ان افعال پر قادر نہیں اور محض تعلیم جس کی قدرت ان کو دی گئی ہے وہ اس کو اضلال واغواء میں صَرف کرتے ہیں) تو پھر (ان سے کہئے کہ یہ بتلاؤ کہ) آیا جو شخص امرِحق کا رستہ بتلاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بے بتلائے خود ہی راستہ نہ سوجھے (اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سمجھانے پر بھی اس پر نہ چلے جیسے شیاطین، پھر جب یہ اتباع کے قابل نہ ہوں تو عبادت کے لائق تو کب ہو سکتے ہیں) تو (اے مشرکین) تم کو کیا ہو گیا تم کیسی تجویزیں کرتے ہوں (کہ توحید کو چھوڑ کر شرک کو اختیار کرتے ہو) اور (تماشہ یہ ہے کہ اپنی اس تجویز اور عقیدہ پر یہ لوگ کوئی دلیل نہیں رکھتے بلکہ) ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں (اور) یقیناً بے اصل خیالات امرِحق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں (خیر) یہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اللہ کو سب خبر ہے (وقت پر سزا دے گا)۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ

اور وہ نہیں یہ قرآن کہ کوئی بنالے اللہ کے سوا اور لیکن تصدیق کرتا ہے

بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ قف

اگلے کلام کی اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو جو تم پر لکھی گئیں، جس میں کوئی شبہ نہیں، پروردگارِ عالم کی طرف سے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بنا لایا ہے، تو کہہ دے کہ تم لے آؤ ایک ہی سورت ایسی اور بلا لو جس کو بلا سکو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو، بات یہ ہے کہ جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا

وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ

اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت، اسی طرح جھٹلاتے رہے اُن سے اگلے سو دیکھ لے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم

کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا، اور بعضے ان میں یقین کریں گے قرآن کا اور بعضے

مَّن لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾ ع

یقین نہ کریں گے، اور تیرا ربّ خوب جانتا ہے شرارت والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اُسے کسی نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہو، اللہ نے نہ اُتارا ہو، بلکہ یہ (وحی کی) اُن باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے آچکی ہیں، اور اللہ نے جو باتیں (لوحِ محفوظ میں) لکھ رکھی ہیں، اُن کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ اُس ذات کی طرف سے ہے جو تمام جہانوں کی پرورش کرتی ہے۔ ﴿۳۷﴾ کیا پھر بھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ''پیغمبر نے اسے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے؟'' کہو کہ: ''پھر تو تم بھی اس جیسی ایک ہی سورت (گھڑ کر) لے آؤ، اور (اس کام میں مدد لینے کے لئے) اللہ کے سوا جس کسی کو بلا سکو بلا لو، اگر سچے ہو۔'' ﴿۳۸﴾ بات دراصل یہ ہے کہ جس چیز کا احاطہ یہ اپنے علم سے نہیں کر سکے، اُسے انہوں نے جھوٹ قرار دے دیا، اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں آیا۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے، انہوں نے بھی (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا۔ پھر دیکھو کہ ان ظالموں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۳۹﴾ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے، اور کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور تمہارا پروردگار فساد پھیلانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ ﴿۴۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور یہ قرآن افتراء کیا ہوا نہیں ہے کہ غیر اللہ سے صادر ہوا ہو بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس کے قبل (نازل) ہو چکی ہیں اور اَحکامِ ضروریہ (الٰہیہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے (اور) اس میں کوئی بات شک (وشبہ)

کی نہیں (اور وہ) ربُّ العالمین کی طرف سے (نازل ہوا) ہے، کیا (باوجود اس کے افتراء نہ ہونے کے) یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو افتراء کرلیا ہے، آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا) تو پھر تم (بھی تو عربی ہو اور اعلیٰ درجہ کے فصیح و بلیغ بھی ہو) اس کی مثل ایک ہی سورت (بنا) لاؤ اور (اکیلے نہیں) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو ان کو (مدد کے لئے) بلا لو اگر تم سچے ہو (کہ نعوذ باللہ میں نے تصنیف کرلیا ہے تو تم بھی تصنیف کرلاؤ، مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس قسم کے دلائل سے فائدہ اسی کو ہوتا ہے جو سمجھنا بھی چاہے سو انہوں نے تو کبھی سمجھنا ہی نہ چاہا) بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس (کے صحیح غلط ہونے) کو اپنے احاطۂ علم میں نہیں لائے (اور اس کی حالت سمجھنے کا ارادہ نہیں کیا تو ایسوں سے کیا سمجھنے کی امید ہو سکتی ہے) اور (ان کی اس بےفکری اور بےپرواہی کی وجہ یہ ہے کہ) ہنوز ان کو اس (قرآن کی تکذیب) کا اخیر نتیجہ نہیں ملا (یعنی عذاب نہیں آیا ورنہ سارا نشہ ہرن ہوجاتا اور آنکھیں کھل جاتیں اور حق و باطل متمیّز ہوجاتا لیکن آخر کبھی تو وہ نتیجہ پیش آنے والا ہے ہی، گو اُس وقت ایمان نافع نہ ہو، چنانچہ) جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں اسی طرح (جیسے بے تحقیق یہ جھٹلا رہے ہیں) انہوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا، سو دیکھ لیجئے ان ظالموں کا انجام کیسا (بُرا) ہوا، (اسی طرح ان کا ہوگا) اور (ہم جو ان کا انجامِ بد بتلا رہے ہیں سو سب مراد نہیں کیونکہ) ان میں سے بعضے ایسے ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لے آویں گے اور بعض ایسے ہیں کہ اس پر ایمان نہ لاویں گے اور آپ کا ربّ (ان) مفسدوں کو خوب جانتا ہے (جو ایمان نہ لاویں گے پس خاص ان کو وقتِ موعود پر سزا دے گا)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ تاویل سے مراد اس جگہ مآل اور انجام ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت اور بےفکری سے قرآن میں غور نہیں کیا اور اس کی تکذیب کے انجامِ بد کو نہیں پہچانا، اس لئے تکذیب میں لگے ہوئے ہیں مگر موت کے بعد ہی سب حقائق کھل جاویں گے اور اپنے کئے کا مآلِ بد ہمیشہ کے لئے گلے کا ہار ہوجائے گا۔

وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لئے میرا کام اور تمہارے لئے تمہارا کام تم پر ذمہ نہیں میرے کام کا

وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ

اور مجھ پر ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو، اور بعضے ان میں کان رکھتے ہیں تیری طرف،

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ

کیا تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو سمجھ نہ ہو، اور بعضے ان میں نگاہ کرتے ہیں تیری طرف،

اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ

کیا تو راہ دکھائے گا اندھوں کو اگرچہ وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں، اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر

شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

کچھ بھی لیکن لوگ اپنے اُوپر ظلم کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) اگر یہ تمہیں جھٹلائیں تو (ان سے) کہہ دو کہ: "میرا عمل میرے لئے ہے، اور تمہارا عمل تمہارے لئے۔ جو کام میں کرتا ہوں، اُس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اور جو کام تم کرتے ہو، اُس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔" ﴿۴۱﴾ اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تمہاری باتوں کو (بظاہر) کان لگا کر سنتے ہیں (مگر دِل میں حق کی طلب نہیں رکھتے، اس لئے درحقیقت بہرے ہیں) تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، چاہے وہ سمجھتے نہ ہوں؟ ﴿۴۲﴾ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، (مگر دِل میں انصاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ اندھوں جیسے ہیں) تو کیا تم اندھوں کو راستہ دِکھاؤ گے، چاہے اُنہیں کچھ بھی سجھائی نہ دیتا ہو؟ ﴿۴۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن انسان ہیں جو خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ ﴿۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اگر (ان دلائل کے بعد بھی) آپ کو جھٹلاتے رہیں تو (بس اخیر بات) یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا صاحب) میرا کیا ہوا مجھ کو ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تم کو ملے گا تم میرے عمل کے جواب دہ نہیں ہو، اور میں تمہارے عمل کا جوابدہ نہیں ہوں (جس طریقہ پر چاہو رہو آپ معلوم ہو جاوے گا) اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے (بھی) ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھتے ہیں (لیکن دل میں ارادہ ایمان اور حق طلبی کا نہیں ہے پس اس

اعتبار سے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے پس ان کی حالت بہروں کی سی ہوئی تو) پھر کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان سے ماننے کا انتظار کر) تے ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو (ہاں اگر سمجھ ہوتی تو بہرے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا) اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں (لیکن طلبِ حق نہ ہونے سے ان کی حالت مثل اندھوں کے ہے تو) پھر کیا آپ اندھوں کو رستہ دِکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو (ہاں اگر بصیرت ہوتی تو اندھے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا اور ان کی عقلیں جو اس طرح تباہ ہوگئیں تو) یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا (کہ ان کو قابلیت ہدایت کی نہ دے اور پھر مؤاخذہ فرماوے) لیکن لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں (کہ قابلیتِ موہوبہ کو ضائع کردیتے ہیں اور اس سے کام نہیں لیتے)۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ

اور جس دِن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی دِن،

يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ

ایک دوسرے کو پہچانیں گے، بیشک خسارے میں پڑے جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملنے کو

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ

اور نہ آئے وہ راہ پر اور اگر ہم دکھائیں گے تجھ کو کوئی چیز ان وعدوں میں سے جو کئے ہیں ہم نے ان سے

أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ ﴿٤٦﴾

یا وفات دیں تجھ کو سو ہماری ہی طرف ہے ان کو لوٹنا، پھر اللہ شاہد ہے ان کاموں پر جو وہ کرتے ہیں،

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۚ فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

اور ہر فرقہ کا ایک رسول ہے، پھر جب پہنچا ان کے پاس رسول ان کا فیصلہ ہوا ان میں اِنصاف سے

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾

اور ان پر ظلم نہیں ہوتا، اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو،

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ

تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے بُرے کا نہ بھلے کا مگر جو چاہے اللہ،

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً

ہر فرقہ کا ایک وعدہ ہے، جب آپہنچے گا ان کا وعدہ پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی

وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا

اور نہ آگے سرک سکیں گے، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر آپہنچے تم پر عذاب اس کا راتوں رات یا دن کو

مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ

تو کیا کرلیں گے اس سے پہلے گنہگار، کیا پھر جب عذاب واقع ہوچکے گا تب اس پر یقین کروگے،

آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا

اب قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضہ کرتے تھے، پھر کہیں گے گنہگاروں کو چکھتے رہو

عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ

عذاب ہمیشگی کا، وہی بدلہ ملتا ہے جو کچھ کماتے تھے، اور تجھ سے خبر پوچھتے ہیں

أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾ ع

کیا سچ ہے یہ بات، تو کہہ البتہ قسم میرے ربّ کی یہ سچ ہے، اور تم تھکا نہ سکوگے،

وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ

اور اگر ہو ہر شخص گنہگار کے پاس جتنا کچھ ہے زمین میں البتہ دے ڈالے اپنے بدلے میں،

وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

اور چھپے چھپے پچھتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب، اور ان میں فیصلہ ہوگا انصاف سے

وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

اور ان پر ظلم نہ ہوگا، سن رکھو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں،

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ

سن رکھو وعدہ اللہ کا سچ ہے، پر بہت لوگ نہیں جانتے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے

وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جس دن اللہ ان کو (میدانِ حشر میں) اِکٹھا کرے گا، تو انہیں ایسا معلوم ہوگا جیسے وہ (دُنیا میں یا قبر میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے (اسی لئے) وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن لوگوں نے بڑے گھاٹے کا سودا کیا ہے جنہوں نے اللہ سے (آخرت میں) جا ملنے کو جھٹلایا ہے، اور جو راہِ راست پر نہیں آئے۔ ﴿۴۵﴾ اور (اے پیغمبر!) جن باتوں کی ہم نے ان (کافروں کو) دھمکی دی ہوئی ہے، چاہے اُن میں سے کوئی بات ہم تمہیں (تمہاری زندگی میں) دِکھادیں، یا (اس سے پہلے) تمہاری روح قبض کرلیں، بہرصورت ان کو آخر میں ہماری طرف ہی لوٹنا ہے، پھر (یہ تو ظاہر ہی ہے کہ) جو کچھ یہ کرتے ہیں، اللہ اس کا پورا پورا مشاہدہ کررہا ہے۔ (لہٰذا وہاں ان کو سزا دے گا) ﴿۴۶﴾ اور ہر اُمت کے لئے ایک رسول بھیجا گیا ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کا فیصلہ پورے انصاف سے کیا جاتا ہے، اور

اُن پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ ۴۷ اور یہ (کافر) لوگ (مسلمانوں سے مذاق اُڑانے کے لئے) کہتے ہیں کہ: ''اگر تم سچے ہو تو (اللہ کی طرف سے عذاب کا) یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟'' ۴۸ (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ: ''میں تو خود اپنی ذات کو بھی نہ کوئی نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں، نہ فائدہ پہنچانے کا، مگر جتنا اللہ چاہے۔ ہر اُمت کا ایک وقت مقرر ہے۔ چنانچہ جب اُن کا وہ وقت آجاتا ہے تو وہ اُس سے نہ ایک گھڑی پیچھے جاسکتے ہیں، نہ آگے آسکتے ہیں۔'' ۴۹ ان سے کہو کہ: ''ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کے وقت آئے یا دن کے وقت تو اُس میں کونسی ایسی (اشتیاق کے قابل) چیز ہے جس کے جلد آنے کا یہ مجرم لوگ مطالبہ کر رہے ہیں؟ ۵۰ کیا جب وہ عذاب آہی پڑے گا، تب اُسے مانو گے؟ (اُس وقت تو تم سے یہ کہا جائے گا کہ:) ''اب مانے؟ حالانکہ تم ہی (اس کا انکار کر کے) اس کی جلدی مچایا کرتے تھے!'' ۵۱ پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ: ''اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ تمہیں کسی اور چیز کا نہیں، صرف اُس (بدی) کا بدلہ دیا جا رہا ہے جو تم کماتے رہے ہو'' ۵۲ اور یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ''کیا یہ (آخرت کا عذاب) واقعی سچ ہے؟'' کہہ دو کہ: ''میرے پروردگار کی قسم! یہ بالکل سچ ہے، اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔'' ۵۳ اور جس جس شخص نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے، اگر اُس کے پاس روئے زمین کی ساری دولت بھی ہوگی تو وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے اُس کی پیشکش کر دے گا۔ اور جب وہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اپنی شرمندگی کو چھپانا چاہیں گے۔ اور اُن کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہوگا، اور اُن پر ظلم نہیں ہوگا ۵۴ یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۵۵ وہی زندہ کرتا ہے، اور وہی موت دیتا ہے، اور اُسی کے پاس تم سب کو لوٹایا جائے گا ۵۶

خلاصۂ تفسیر

اور ان کو وہ دن یاد دلایئے جس میں اللہ تعالیٰ ان کو اس کیفیت سے جمع کرے گا کہ (وہ سمجھیں گے کہ) گویا وہ (دنیا یا برزخ میں) سارے دن کی ایک آدھ گھڑی رہے ہوں گے (چونکہ وہ دن مدید بھی ہوگا اور شدید بھی ہوگا، اس لئے دنیا اور برزخ کی مدت اور تکلیف سب بھول کر ایسا سمجھیں گے کہ وہ زمانہ بہت جلد گزر گیا) اور آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے (بھی لیکن ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں گے، اس سے اور رنج وصدمہ ہوگا، کیونکہ شناسا لوگوں سے توقع نفع کی ہوا کرتی ہے) واقعی (اس وقت سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے پاس جانے کو جھٹلایا اور وہ (دنیا میں بھی) ہدایت پانے والے نہ تھے (اس لئے آج خسارہ میں پڑے، پس ان کے عذاب کا اصلی وقت تو یہ دن ہے، ان کو یاد دلا دیجئے) اور (دنیا میں ان پر عذاب واقع ہونا یا نہ ہونا اس کی نسبت یہ بات ہے کہ) جس (عذاب) کا ان سے ہم وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ تھوڑا سا (عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں ان پر اس کا نزول

ہو جاوے) یا (اس کے نزول کے قبل ہی) ہم آپ کو وفات دے دیں (پھر خواہ بعد میں نزول ہو یا نہ ہو) سو (دونوں احتمال ہیں، کوئی شق ضروری نہیں لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر) ہمارے پاس تو ان کو آنا ہی ہے پھر (سب کو معلوم ہے کہ) اللہ ان کے سب افعال کی اطلاع رکھتا ہی ہے (پس ان پر سزا دے گا، غرض یہ کہ دنیا میں خواہ سزا ہو یا نہ ہو مگر اصلی موقع پر ضرور ہوگی) اور (یہ سزا جو ان کے لئے تجویز ہوئی ہے، تو اتمامِ حجت و اِزالۂ عذر کے بعد ہوئی ہے، اور ان کی کیا تخصیص ہے بلکہ ہمیشہ سے ہماری عادت رہی ہے کہ جن اُمتوں کو ہم نے مکلّف بنانا چاہا ہے ان میں سے) ہر ہر اُمت کے لئے ایک حکم پہنچانے والا (ہوا) ہے سو جب ان کا وہ رسول (ان کے پاس) آ چکتا ہے (اور اَحکام پہنچا دیتا ہے اس کے بعد) ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے (وہ فیصلہ یہی ہے کہ نہ ماننے والوں کو عذابِ ابدی میں مبتلا کیا جاتا ہے) اور ان پر (ذرا) ظلم نہیں کیا جاتا (کیونکہ اتمامِ حجت کے بعد سزا دینا خلافِ انصاف نہیں ہے) اور یہ لوگ (عذاب کی وعیدیں سن کر بقصدِ تکذیب یوں) کہتے ہیں کہ (اے نبی اور اے مسلمانو) یہ وعدہ (عذاب کا) کب (واقع) ہوگا، اگر تم سچے ہو (تو واقع کیوں نہیں کرا دیتے) آپ (سب کی طرف سے جواب میں) فرما دیجئے کہ میں (خود) اپنی ذاتِ خاص کے لئے تو کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور کسی ضرر (کے دفع کرنے) کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا (اختیار) خدا کو منظور ہو (اتنا اختیار البتہ حاصل ہے، پس جب خاص اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں تو دوسرے کے نفع ونقصان کا تو کیونکر مالک ہوں گا، پس عذاب واقع کرنا میرے اختیار میں نہیں، رہا یہ کہ کب واقع ہوگا، سو بات یہ ہے کہ) ہر اُمت کے (عذاب کے) لئے (اللہ کے نزدیک) ایک معین وقت ہے (خواہ دنیا میں یا آخرت میں سو) جب ان کا وہ معین وقت آ پہنچتا ہے تو (اس وقت) ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں (بلکہ فوراً عذاب واقع ہو جاتا ہے اسی طرح تمہارے عذاب کا بھی وقت معین ہے، اس وقت اس کا وقوع ہو جاوے گا اور وہ جو فرمائش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جاوے جیسا کہ آیت مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ (یونس: ۴۸) اور رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا (ص: ۱۶) میں ان کی اس جلد بازی کا ذکر ہے، تو) آپ (اس کے متعلق ان سے) فرما دیجئے کہ یہ تو بتلاؤ کہ اگر تم پر خدا کا عذاب رات کو آ پڑے یا دن کو (آ پڑے) تو (یہ تو بتلاؤ کہ عذاب میں کون چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں (یعنی عذاب تو سخت چیز اور پناہ مانگنے کی چیز ہے نہ کہ جلدی مانگنے کی اور چونکہ جلد بازی سے مقصود ان کا تکذیب ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ) کیا (اب تو تکذیب کر رہے ہو جو کہ وقت ہے تصدیق کے نافع ہونے کا) پھر جب وہ (اصلی موعود) آ ہی پڑے گا (اس وقت) اس کی تصدیق کرو گے (جس وقت کہ تصدیق نافع نہ ہوگی اور اس وقت کہا جائے گا کہ) ہاں اب مانا حالانکہ (پہلے سے) تم (بقصدِ تکذیب) اس کی جلدی مچایا کرتے تھے پھر ظالموں (یعنی مشرکوں) سے کہا جاوے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو، تم کو تمہارے ہی کئے کا بدلہ ملا ہے اور وہ (غایتِ تعجب و انکار سے) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی امر ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ ہاں قسم

میرے رَبّ کی کہ وہ واقعی امر ہے، اور تم کسی طرح خدا کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ وہ عذاب دینا چاہے اور تم بچ جاؤ) اور (اس عذاب کی یہ شدت ہوگی کہ) اگر ہر ہر مشرک شخص کے پاس اتنا (مال) ہو کہ ساری زمین میں بھر جاوے تب بھی اس کو دے کر اپنی جان بچانا چاہیں گے (اگر چہ نہ خزانہ ہوگا اور نہ لیا جاوے گا لیکن شدت اس درجہ کی ہوگی کہ مال ہونے کی تقدیر پر سب دینے پر راضی ہو جاویں گے) اور جب عذاب دیکھیں گے تو (مزید فضیحت کے خوف سے) پشیمانی کو (اپنے دل ہی دِل میں) پوشیدہ رکھیں گے (یعنی اس کے آثارِ قولیہ وفعلیہ کو ظاہر نہ ہونے دیں گے، تاکہ دیکھنے والے زیادہ نہ ہنسیں لیکن آخر میں یہ ضبط وتحمل بھی اس کی شدّت کے سامنے نہ چلے گا) اور ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہوگا اور اُن پر (ذرا) ظلم نہ ہوگا، یاد رکھو کہ جتنی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی مِلک ہیں (ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور ان میں یہ جرم بھی داخل ہیں ان کا فیصلہ بھی بطریقِ مذکور کر سکتا ہے) یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے (پس قیامت ضرور آوے گی) لیکن بہت سے آدمی یقین ہی نہیں کرتے، وہی جان ڈالتا ہے، وہی جان نکالتا ہے (پس دوبارہ پیدا کرنا اس کو کیا مشکل ہے) اور تم سب اسی کے پاس لائے جاؤ گے (اور حساب وکتاب اور پھر اس پر ثواب وعذاب ہوگا)۔

معارف ومسائل

يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ یعنی جب قیامت میں مردے قبروں سے اٹھائے جاویں گے تو ایک دوسرے کو پہچانیں گے جیسے کوئی طویل مدت ملے ہوئے نہ گزری ہو۔

امام بغویؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ پہچان شروع میں ہوگی بعد میں قیامت کے ہولناک واقعات سامنے آجائیں گے تو یہ پہچان منقطع ہو جائے گی اور بعض روایات میں ہے کہ پہچان تو پھر بھی رہے گی مگر ہیبت کے مارے بات نہ کرسکیں گے۔ (مظہری) [1]

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ۭ آٰلْـٰٔنَ یعنی کیا تم ایمان اس وقت لاؤ گے جب تم پر عذاب واقع ہو جائے گا خواہ موت کے وقت یا اس سے پہلے ہی، مگر اس وقت تمہارے ایمان کے جواب میں یہ کہا جائے گا آٰلْـٰٔنَ کیا اب ایمان لائے ہو، جب کہ ایمان کا وقت گزر چکا، جیسے غرق ہونے کے وقت فرعون نے جب کہا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ (یونس : ۹۰) جواب میں کہا گیا تھا آٰلْـٰٔنَ اور اس کا یہ ایمان قبول نہیں کیا گیا، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہی رہتا ہے جب تک کہ وہ غرغرۂ موت میں گرفتار نہ ہو جائے [2]

---

[1] تفسير البغوى تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۳۵، والتفسير المظهرى تحت هذه الآية ج:۵ ص:۳۱ .

[2] جامع الترمذى، ابواب الدعوات، باب فى فضل التوبة والاستغفار ج:۲ ص:۱۹۴

یعنی غرغرۂ موت کے وقت کا ایمان اور توبہ اللہ کے نزدیک معتبر نہیں، اسی طرح دنیا میں وقوعِ عذاب سے پہلے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے، جب عذاب آپڑے پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، آخرِ سورت میں قومِ یونس علیہ السلام کا جو واقعہ آرہا ہے کہ ان کی توبہ قبول کر لی گئی، وہ اسی ضابطے کے ماتحت ہے کہ انہوں نے عذاب کو دُور سے آتا ہوا دیکھ کر سچے دل سے اِلحاح وزاری کے ساتھ توبہ کر لی اس لئے عذاب ہٹالیا گیا، اگر عذاب ان پر واقع ہو جاتا پھر توبہ قبول نہ ہوتی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ۵

اے لوگو! تمہارے پاس آئی ہے نصیحت تمہارے رَبّ سے اور شفاء دلوں کے روگ کی

وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ

اور ہدایت اور رحمت مسلمانوں کے واسطے کہہ اللہ کے فضل سے اور اس کی مہربانی سے

فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ط هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۸﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ

سو اسی پر اِن کو خوش ہونا چاہیے، یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جو جمع کرتے ہیں تو کہہ بھلا دیکھو تو

مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا ط

اللہ نے جو اتاری تمہارے واسطے روزی پھر تم نے ٹھہرائی اس میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال،

قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ

کہہ کیا اللہ نے حکم دیا تم کو یا اللہ پر اِفتراء کرتے ہو، اور کیا خیال ہے جھوٹ باندھنے والوں کا

عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

اللہ پر قیامت کے دن، اللہ تو فضل کرتا ہے لوگوں پر

ع ٧ / ١١

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ

اور لیکن بہت لوگ حق نہیں مانتے، اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ

قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ

قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس جب تم مصروف ہوتے ہو

فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ

اس میں، اور غائب نہیں رہتا تیرے ربّ سے ایک ذرّہ بھر زمین میں اور نہ آسمان میں

وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾

اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا جو نہیں ہے کھلی ہوئی کتاب میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

لوگو! تمہارے پاس ایک ایسی چیز آئی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت ہے، اور دِلوں کی بیماریوں کے لئے شفا ہے، اور ایمان والوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے۔ ﴿٥٧﴾ (اے پیغمبر!) کہو کہ: ''یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہئے۔ یہ اُس تمام دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں'' ﴿٥٨﴾ کہو کہ: ''بھلا بتاؤ، اللہ نے تمہارے لئے جو رزق نازل کیا تھا، تم نے اپنی طرف سے اُس میں سے کسی کو حرام اور کسی کو حلال قرار دے دیا!'' ان سے پوچھو کہ: ''کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہو؟'' ﴿٥٩﴾ اور جو لوگ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں، روزِ قیامت کے بارے میں اُن کا کیا گمان ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اللہ انسانوں کے ساتھ فضل کا معاملہ کرنے والا ہے، لیکن اُن میں سے اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ ﴿٦٠﴾ اور (اے پیغمبر!) تم جس حالت میں بھی ہوتے ہو، اور قرآن کا جو حصہ بھی تلاوت کرتے ہو، اور (اے لوگو!) تم جو کام بھی کرتے ہو، تو جس وقت تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو، ہم تمہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ اور تمہارے ربّ سے کوئی ذرّہ برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹی، نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ ﴿٦١﴾

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی جو (بُرے کاموں سے روکنے کے لئے) نصیحت ہے اور (اگر اس پر عمل کر کے بُرے کاموں سے بچیں تو) دلوں میں جو (بُرے کاموں سے) روگ (ہو جاتے) ہیں ان کے لئے شفاء ہے اور (نیک کاموں کے کرنے کے لئے راہنمائی کرنے والی ہے اور (اگر اس پر عمل کر کے نیک کاموں کو اختیار کریں تو) رحمت (اور ذریعۂ ثواب) ہے (اور یہ سب برکات) ایمان والوں کے لئے (ہیں کیونکہ عمل وہی کرتے ہیں، پس قرآن کے یہ برکات سنا کر) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (جب قرآن ایسی چیز ہے، تو) لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے (اور اس کو دولتِ عظیمہ سمجھ کر لینا چاہئے) وہ اس (دنیا) سے بدر جہا بہتر ہے جس کو جمع کر رہے ہیں (کیونکہ دُنیا کا نفع قلیل اور فانی ہے اور قرآن کا نفع کثیر اور باقی) آپ (ان سے) کہئے کہ یہ تو بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے (انتفاع کے) لئے جو کچھ رِزق بھیجا تھا پھر تم نے (اپنی گھڑت سے) اس کا کچھ حصہ حرام اور کچھ حلال قرار دے لیا (حالانکہ اس کی تحریم کی کوئی دلیل نہیں تو) آپ (ان سے) پوچھئے کہ کیا تم کو خدا نے حکم دیا ہے یا (محض) اللہ پر (اپنی طرف سے) افتراء ہی کرتے ہو اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتے ہیں ان کا قیامت کی نسبت کیا گمان ہے (جو بالکل ڈرتے نہیں کیا یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں آوے گی یا آوے گی مگر ہم سے باز پُرس نہ ہوگی) واقعی لوگوں پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے (کہ ساتھ کے ساتھ سزا نہیں دیتا بلکہ توبہ کے لئے مہلت دے رکھی ہے) لیکن اکثر آدمی بے قدر ہیں (ورنہ توبہ کر لیتے) اور آپ (خواہ) کسی حال میں ہوں اور (من جملہ اُن احوال کے) آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور (اسی طرح اور لوگ بھی جتنے ہوں) تم جو کام بھی کرتے ہو ہم کو سب کی خبر رہتی ہے جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو اور آپ کے رَبّ (کے علم) سے کوئی چیز ذرّہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین اور نہ آسمان میں (بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مقدارِ مذکور) سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز (اس سے) بڑی مگر یہ سب (بوجہ احاطۂ علمِ الٰہی کے) کتابِ مبین (یعنی لوحِ محفوظ) میں (مرقوم) ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کی بدحالی اور آخرت میں ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا۔

مذکورہ آیات سے پہلی دو آیتوں میں ان کو اس بدحالی اور گمراہی سے نکلنے کا طریقہ اور عذابِ آخرت سے نجات کا ذریعہ بتلایا گیا ہے اور وہ اللہ کی کتاب قرآن اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور انسان اور انسانیت کے لئے یہ دونوں ایسی عظیم نعمتیں ہیں کہ آسمان و زمین کی ساری نعمتوں سے اعلیٰ و افضل ہیں، اَحکامِ قرآن اور سنتِ رسول کی پیروی انسان کو صحیح معنیٰ میں اِنسان بناتی ہے اور جب انسان صحیح معنیٰ میں اِنسان کامل بن جائے تو سارا جہان درست ہو جائے اور یہ دنیا بھی جنت بن جائے۔

پہلی آیت میں قرآنِ کریم کی چار خصوصیات کا ذِکر ہے:

اوّل مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، مَوْعِظَه اور وعظ کے اصل معنیٰ ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو آخرت کی فکر سامنے آجائے۔ قرآنِ کریم اوّل سے آخر تک اسی موعظۂ حسنہ کا نہایت بلیغ مبلغ ہے، اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید، ثواب کے ساتھ عذاب، دنیا و آخرت میں فلاح وکامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی وغیرہ کا ایسا مِلا جُلا تذکرہ ہے جس کو سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے، پھر اُس پر قرآنِ کریم کا اعجازِ بیان جو دِلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔

مَوْعِظَه کے ساتھ مِنْ رَّبِّكُمْ کی قید نے قرآنی وعظ کی حیثیت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعظ کسی اپنے جیسے عاجز انسان کی طرف سے نہیں جس کے ہاتھ میں کسی کا نفع ونقصان یا عذاب وثواب کچھ نہیں، بلکہ رَبِّ کریم کی طرف سے ہے جس کے قول میں غلطی کا اِمکان نہیں، اور جس کے وعدے اور وعید میں کسی عجز وکمزوری یا عذر کا کوئی خطرہ نہیں۔

قرآن کریم کی دوسری صفت وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ارشاد فرمائی، شِفَاء کے معنٰے بیماری دور ہونے کے ہیں، اور صُدُوْر، صَدر کی جمع ہے جس کے معنیٰ سینہ کے ہیں، مراد اِس سے قلب ہے۔

معنیٰ یہ ہیں کہ قرآنِ کریم دِلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت وشفاء کا نسخہ اکسیر ہے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے، جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں۔ (روح المعانی)[1]

مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی وروحانی ہو یا بدنی اور جسمانی، مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لئے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں، اس لئے اس جگہ ذِکر صرف قلبی اور روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسمانی بیاریوں کے لئے شفاء نہیں ہے۔

روایاتِ حدیث اور علمائے اُمت کے بیشمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآنِ کریم جیسے قلبی امراض کے لئے

---

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۳۹

اکسیر اعظم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے، آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ یعنی قرآن شفاء ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں۔ (روح المعانی از ابن مردویہ)[1]

اسی طرح حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے، آپ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔[2]

علماء اُمت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیاتِ قرآنی کے خواص و فوائد مستقل کتابوں میں جمع بھی کر دیئے ہیں، امام غزالیؒ کی کتاب خواصِ قرآنی اس کے بیان میں مشہور و معروف ہے جس کی تلخیص حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اعمالِ قرآنی کے نام سے فرمائی ہے، اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراضِ جسمانی کے لئے بھی شفاء کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزولِ قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماریوں کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

اس سے ان لوگوں کی بے وقوفی اور کجروی بھی ظاہر ہوگئی جو قرآنِ کریم کو صرف جسمانی بیماریوں کے علاج یا دنیوی حاجات ہی کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ رُوحانی امراض کی اصلاح کی طرف دھیان دیتے ہیں نہ قرآن کی ہدایات پر عمل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے ؎

ترا حاصل زیٰس اش جز ایں نیست — کہ از ہم خواندنش آسان بمیری

یعنی تم نے قرآن کی سورۂ یٰس سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کے پڑھنے سے موت آسان ہو جائے، حالانکہ اس سورت کے معانی اور حقائق و معارف میں غور کرتے تو اس سے کہیں زیادہ فوائد و برکات حاصل کر سکتے تھے۔

بعض اہلِ تحقیق مفسرین نے فرمایا کہ قرآن کی پہلی صفت یعنی مَوْعِظَہ کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال کے ساتھ ہے جن کو شریعت کہا جاتا ہے، قرآن کریم ان اعمال کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے، اور شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ کا تعلق انسان کے اعمالِ باطنہ کے ساتھ ہے، جس کو طریقت اور تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں تیسری صفت قرآنِ کریم کی هُدًى اور چوتھی رَحْمَة بیان کی گئی ہے، هُدًى کے معنی ہدایت یعنی رہنمائی کے ہیں، قرآن کریم انسان کو طریق حق و یقین کی طرف دعوت دیتا ہے، اور انسان کو بتلاتا ہے کہ آفاقِ عالم اور

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۳۹ [2] شعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث:۲۴۷۵

خود ان کے نفوس میں اللہ تعالیٰ نے جو اپنی عظیم نشانیاں رکھی ہیں، ان میں غور و فکر کرو تا کہ تم ان سب چیزوں کے خالق اور مالک کو پہچانو۔

دوسری آیت میں فرمایا قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَبِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾ یعنی لوگوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت ہی کو اصلی خوشی کی چیز سمجھیں اور صرف اسی چیز پر خوش ہوں، دُنیا کے چند روزہ مال و متاع اور راحت و عزّت درحقیقت خوش ہونے کی چیز ہی نہیں، کیونکہ اوّل تو وہ کتنی ہی زیادہ کسی کو حاصل ہو، ادھوری ہی ہوتی ہے مکمل نہیں ہوتی، دوسرے ہر وقت اس کے زوال کا خطرہ لاحق ہے، اس لئے آخرِ آیت میں فرمایا هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾ یعنی اللہ کا فضل و رحمت ان تمام مال و دولت اور عزّت و سلطنت سے بہتر ہے جن کو اِنسان اپنی زندگی بھر کا سرمایہ سمجھ کر جمع کرتا ہے۔

اِس آیت میں دو چیزوں کو فرحت و مسرّت کا سامان قرار دیا ہے ایک فضل دوسرے رحمت، ان دونوں سے مراد یہاں کیا ہے؟ اس بارے میں ایک حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ تم کو قرآن پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی۔ (رُوح المعانی از ابن مردویہ) [۱]

یہی مضمون حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے [۲] اور بہت سے حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اِسلام ہے، اور مطلب اس کا بھی وہی ہے جو حدیثِ سابق سے معلوم ہوا کہ رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن سکھایا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی، کیونکہ اسلام اسی حقیقت کا ایک عنوان ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآنِ کریم کی آیت وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۷﴾ [۳] (الانبیاء) سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے، [۴] اور حاصل اس کا بھی پہلی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں، کیونکہ عمل بالقرآن یا اسلام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی کے مختلف عنوانات ہیں۔

اِس آیت میں مشہور قراءت کے مطابق فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ بصیغۂ غائب آیا ہے، حالانکہ اس کے اصل مخاطب اُس

---

[۱] شعب الإیمان للبیهقیؒ رقم الحدیث: ۲۴۹۲ وروح المعانی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۴۰

[۲] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۱۳۸

[۳] ترجمہ: اور ہم نے آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے۔ [۴] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۴۱

وقت کے موجودین، حاضرین تھے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ صیغۂ خطاب کا استعمال کیا جاتا، جیسا کہ بعض قراءتوں میں آیا بھی ہے، مگر مشہور قراءت میں صیغۂ غائب استعمال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام کی رحمتِ عامہ صرف اس کے وقت کے حاضرین وموجودین کے لئے مخصوص نہیں تھی بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والی نسلوں کو بھی شامل ہے۔ (روح المعانی)[1]

فائدہ

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرح وخوشی کا اس دنیا میں کوئی مقام ہی نہیں، ارشاد ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ (القصص) یعنی خوشی میں مست نہ ہو، اللہ ایسے خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔ اور آیتِ مذکورہ میں بصیغۂ امر خوش ہونے کا حکم دیا گیا ہے، اس ظاہری تعارض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں خوش ہونے کو منع فرمایا ہے وہاں خوشی کا تعلق متاعِ دنیا سے ہے، اور جہاں خوش ہونے کا حکم دیا ہے وہاں خوشی کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے، دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ ممانعت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد نہیں بلکہ خوشی میں بدمست ہوجانا مراد ہے، اور اجازت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد ہے۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو حلال وحرام کے معاملہ میں اپنی ذاتی رائے کو دخل دیتے ہیں، اور قرآن وسنت کی سند کے بغیر جس چیز کو چاہا حلال قرار دے دیا جس کو چاہا حرام کہہ دیا، اس پر قیامت کی شدید وعید ذکر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز یا کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کا اصل مدار انسانی رائے پر نہیں بلکہ وہ خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے ان کے احکام کے بغیر کسی چیز کو نہ حلال کہنا جائز ہے نہ حرام۔

چوتھی آیت میں اللہ جل شانہٗ کے علمِ محیط اور اس کی بے مثال وسعت کا ذکر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے کہ آپ جس کام اور جس حال میں ہمیشہ ہوتے ہیں یا قرآن پڑھتے ہیں اس کا کوئی جزء ہم سے مخفی نہیں اسی طرح تمام انسان جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور آسمان وزمین میں کوئی ایک ذرّہ بھی ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر چیز کتاب مبین یعنی لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔

بظاہر اس جگہ علمِ الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کو محیط ہونے کے بیان میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ اگرچہ مخالف اور دشمن آپ کے بہت ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت آپ کے ساتھ ہے آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ج:۸ ص:۱۴۱

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو لوگ کہ ایمان لائے

وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ

اور ڈرتے رہے، ان کے لئے ہے خوش خبری دنیا کی زندگانی میں اور آخرت میں،

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾

بدلتی نہیں اللہ کی باتیں، یہی ہے بڑی کامیابی۔

آسان ترجمۂ قرآن

یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں، اُن کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿٦٢﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، اور تقویٰ اختیار کئے رہے ﴿٦٣﴾ اُن کے لئے خوشخبری ہے دُنیوی زندگی میں بھی، اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔ ﴿٦٤﴾

خلاصۂ تفسیر

(یہ تو علمِ الٰہی کا بیان ہوا آگے مخلصین و مطیعین کی محفوظیت کا بیان ہے کہ) یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ (کسی مطلب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے اور) وہ (اللہ کے دوست) وہ ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور خوف وحزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں میں (یعنی وعدوں میں) کچھ فرق ہوا نہیں کرتا (پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اس لئے عدمِ خوف وعدمِ حزن لازم ہے اور) یہ (بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان پھر دُنیا وآخرت میں ان کے لئے بشارت کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے فوت ہوجانے کا غم، اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ وپرہیزگاری اختیار کی، ان کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔

اس میں چند باتیں قابلِ غور ہیں: اوّل یہ کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونے کے کیا معنیٰ ہیں؟ دوسرے یہ کہ اولیاء اللہ کی تعریف کیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں؟ تیسرے یہ کہ دنیا وآخرت میں ان کی بشارت سے کیا مراد ہے؟

پہلی بات کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہیں ہوتا، اس سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ آخرت میں حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کردیا جائے گا تو خوف وغم سے ان کو ہمیشہ کے لئے نجات ہوجائے گی، نہ کسی تکلیف وپریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب ومطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی، اس معنیٰ کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہلِ جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی وہ اسی حال میں ہوں گے، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ انجامِ کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب اولیاء اللہ ہی کہلائیں گے، دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخولِ جنت کے بعد سب کے سب اولیاء اللہ کی ہی فہرست میں شمار ہوں گے۔

لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونا دنیا وآخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف وغم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف وغم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہلِ جنت داخل ہیں۔

مگر اس پر حالات وواقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف وغم سے محفوظ نہیں بلکہ ان کا خوف وخشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ (فاطر:۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں، اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ ہی کا یہ حال بیان فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ (المعارج) یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رَبّ کا عذاب ایسی

چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہو کر بیٹھ سکے۔

اور واقعات بھی یہی ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حالات میں متفکر و غمگین نظر آتے تھے، اور آپ نے خود فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

صحابہ کرامؓ میں سب سے افضل حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہؓ وتابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوفِ آخرت کے واقعات بیشمار ہیں۔

اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دُنیا میں خوف وغم سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف وغم میں عام طور سے اہلِ دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام وراحت عزّت ودولت میں ذراسی کمی ہوجانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف وپریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا وبلند ہوتا ہے،[1] ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزّت ودولت، راحت وآرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں، اور نہ یہاں کی محنت وکلفت اور رنج کچھ قابلِ التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے　　　به پیش همت ما هر چه آمد بود مهمانے[2]

اللہ جل شانہٗ کی عظمت ومحبت اور خوف وخشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اُس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج وراحت، سود وزیاں پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، بقولِ بعض ؎

یہ ننگِ عاشقی ہیں سود وحاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

دُوسری بات اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کی علامات سے متعلق ہے، اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظِ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست ومحبّ کے معنی میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب ومحبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی اِنسان وحیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالَم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی، تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہٗ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت ومحبت اور قربِ محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قربِ خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:٨ ص:٥١
[2] ترجمہ: نہ خوشی نے کچھ فائدہ پہنچایا، نہ غمی نے نقصان پہنچایا، میرے ارادے کے سامنے جو چیز بھی آئی وہ مہمان (یعنی عارضی) ہی ثابت ہوئی۔

حدیثِ قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، اور جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے،[1] مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت وسکون اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایتِ خاصہ کے درجات بیشمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سیّد الانبیاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرامؒ کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اُس کے حب وبغض اور محبت وعداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے ہوتا ہے کہ اُس کا ظاہر وباطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرتِ ذکر اور دوامِ طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ واعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم وبیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی، (مظہری از ابن مردویہ)[2] اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ مظہری میں فرمایا کہ اُمت کے افراد کو یہ درجۂ ولایت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ اُمت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر یہ فیضِ صحبت صحابہ کرامؓ کو بلا واسطہ حاصل

[1] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع ج:۲ ص:۹۶۲ [2] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۵ ص:۳۹

تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام اُمت کے اولیاء واقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے اِرشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجۂ ولایت حاصل کرنے کا، جو تین جزء سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرتِ ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرتِ ذکر سے آئینۂ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نورِ ولایت کے اِنعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہما نقل فرمایا ہے۔ (مظہری) [1]

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ [2] یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، اِس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت وصحبت اِنسان کے لئے حصولِ ولایت کا ذریعہ ہے، اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابورزینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی حاصل کرسکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہلِ ذکر کی مجلس وصحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہوسکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لئے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کے لئے کرو۔ [3] (مظہری)

مگر یہ صحبت ومجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبعِ سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف وکرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں، اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو اگرچہ اس سے کبھی کوئی کشف وکرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے۔ (مظہری)

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیثِ قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابنِ ماجہ میں بروایت حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ

[1] التفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:٥ ص:٣٩،٤٠ [2] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب علامة حب الله عز وجل ج:٢ ص:٩١١

[3] شعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث:٨٧٣٤

پہچان بتلائی اَلَّذِیْنَ رُءُوْا ذُکِرَ اللهُ، [1] یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیرِ مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف و کرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔ [2]

آخرِ آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اولیاء کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی، آخرت کی خوش خبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوش خبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوش خبری دی جائے گی جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اُٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر: ۳۴) یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔ [3]

اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں، جو انسان خود دیکھے یا اس کے لئے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لئے خوش خبری ہو۔ (رواہُ البُخاری عن ابی ھریرۃؓ) [4]

اور دُنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مؤمن کے لئے نقد خوش خبری ہے۔ (مسلم و بغوی) [5]

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ وقف لازم

اور رنج مت کر ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کے لئے ہے، وہی ہے سننے والا جاننے والا،

[1] سنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب من لا يؤبه له ج:۲ ص:۳۰۳، وكنز العمال رقم الحديث:۱۷۸۳

[2] التفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۴۱

[3] المعجم الكبير للطبراني رقم الحديث:۲۶۰

[4] تفسير البغوي تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۴۱، وصحيح البخاري، كتاب التعبير، باب المبشرات ج:۲ ص:۱۰۳۵ باختصار۔

[5] تفسير البغوي تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۴۱، وصحيح مسلم، كتاب البر والصلة إلخ، باب إذا اثني على الصالح إلخ ج:۲ ص:۳۳۲

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ

سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے زمین میں، اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں

يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ

اللہ کے سوا شریکوں کو پکارنے والے، سو یہ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے اور کچھ نہیں

اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں، وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں۔ یقین رکھو کہ اقتدار تمام تر اللہ کا ہے، اور وہ ہر بات سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ ﴿۶۵﴾ یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جتنے جان دار ہیں وہ سب اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ کوئی اللہ کے (حقیقی) شرکاء کی پیروی نہیں کرتے۔ وہ کسی اور چیز کی نہیں، محض گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور اُن کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اندازوں کے تیر چلاتے رہیں۔ ﴿۶۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کو ان کی باتیں غم میں نہ ڈالیں (یعنی ان کے کفریات سے مغموم نہ ہوں، کیونکہ علم وحفاظتِ مذکورہ کے علاوہ) تمام تر غلبہ (اور قدرت بھی) خدا ہی کے لئے (ثابت) ہے (وہ اپنی قدرت سے حسبِ وعدہ آپ کی حفاظت کرے گا) وہ (ان کی باتیں) سنتا ہے (اور ان کی حالت) جانتا ہے (وہ آپ کا بدلہ ان سے خود لے لے گا) یاد رکھو کہ جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں (یعنی فرشتے اور جن وانس) یہ سب اللہ ہی کے (مملوک) ہیں (اس کی حفاظت یا مکافات کو کوئی روک نہیں سکتا پس باہمہ وجوہ تسلی رکھنا چاہئے) اور (اگر کسی کو شبہ ہو کہ شاید شرکاء مزاحمت کر سکیں تو اس کی حقیقت سن لو کہ) جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکاء کی عبادت کر رہے ہیں (خدا جانے) کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں

(یعنی ان کے اس عقیدہ کی کیا دلیل ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ بھی دلیل نہیں) محض بے سند خیال کا اتباع کر رہے ہیں اور محض خیالی باتیں کر رہے ہیں (پس واقع میں ان صفاتِ الوہیت کے مثل علم وقدرت وغیرہ نہیں ہیں پھر ان میں احتمالِ مزاحمت کی کب گنجائش ہے)۔

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡهِ وَالنَّهَارَ مُبۡصِرًا ؕ

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو اس میں اور دن دیا دکھلانے والا،

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ

بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں، کہتے ہیں ٹھہرالیا اللہ نے بیٹا وہ پاک ہے،

هُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ

وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، نہیں تمہارے پاس کوئی سند

بِهٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾ قُلۡ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ

اس کی، کیوں جھوٹ کہتے ہو اللہ پر جس بات کی تم کو خبر نہیں، کہہ جو لوگ باندھتے ہیں

عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿۶۹﴾ؕ مَتَاعٌ فِی الدُّنۡیَا ثُمَّ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ

اللہ پر جھوٹ بھلائی نہیں پاتے، تھوڑا سا نفع اٹھالینا دنیا میں پھر ہماری طرف ان کو لوٹنا ہے

ثُمَّ نُذِیۡقُهُمُ الۡعَذَابَ الشَّدِیۡدَ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ ع ۷/۱۲ الثلثة

پھر چکھائیں گے ہم ان کو سخت عذاب بدلہ ان کے کفر کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی، تاکہ تم اُس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو ایسا بنایا جو تمہیں دیکھنے

کی صلاحیت دے۔ اس میں یقیناً اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور سے سنتے ہوں۔ ۶۷ (کچھ) لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ پاک ہے اُس کی ذات! وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے۔ تمہارے پاس اس بات کی ذرا بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ ۶۸ کہہ دو کہ: "جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔" ۶۹ (ان کے لئے) بس دُنیا میں تھوڑا سا مزہ ہے۔ پھر ہمارے پاس ہی اُنہیں لوٹ کر آنا ہے۔ پھر کفر کا جو رویہ انہوں نے اپنا رکھا تھا، اُس کے بدلے ہم اُنہیں شدید عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۷۰

خلاصۂ تفسیر

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دِن بھی اس طور پر بنایا کہ (بوجہ روشن ہونے کے) دیکھنے بھالنے کا ذریعہ ہے، اس (بنانے) میں دلائل (توحید) ہیں ان لوگوں کے لئے جو (تدبُّر کے ساتھ ان مضامین کو) سنتے ہیں، (مشرکین ان دلائل میں غور نہیں کرتے اور شرک کی باتیں کرتے ہیں چنانچہ) وہ کہتے ہیں (نعوذُ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ (کیسی سخت بات کہی) وہ تو کسی کا محتاج نہیں (اور سب اس کے محتاج ہیں) اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (پس سب مملوک ہوئے اور وہ مالک ہوا پس ثابت ہوا کہ کمالات میں کوئی اس کا مشارک ومجانس نہیں، پس اگر اولاد کو اللہ کا مجانس یعنی ہم جنس کہا جائے تو مجانست باطل ہو چکی اور اگر غیر مجانس کہو تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے اور عیوب سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، جیسا سُبْحٰنَهٗ میں اس طرف اشارہ بھی ہے، پس اولاد کا ہونا مطلقاً باطل ہو گیا، ہم نے جو نفیٔ اولاد کا دعویٰ کیا تھا اس پر تو ہم نے دلیل قائم کر دی ہے، اب رہا تمہارا دعویٰ سو) تمہارے پاس (بجز بیہودہ دعویٰ کے) اس (دعویٰ) پر کوئی دلیل (بھی) نہیں (تو) کیا اللہ کے ذِمّے ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم (کسی دلیل سے) علم نہیں رکھتے آپ (ان کا مفتری ہونا ثابت کر کے اس افتراء کی وعید سنانے کے لئے) کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں (جیسے مشرکین) وہ (کبھی) کامیاب نہ ہوں گے (اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو ایسوں کو دنیا میں خوب کامیاب اور آرام وراحت میں پاتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ) یہ دنیا میں (چند روزہ) تھوڑا سا عیش ہے (جو بہت جلد ختم ہوا جاتا ہے) پھر (مر کر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہے پھر (آخرت میں) ہم ان کو ان کے کفر کے بدلے سزائے سخت (کا مزا) چکھا دیں گے۔

وقف لازم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ

اور سنا ان کو حال نوحؑ کا، جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے تم پر

مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ

میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام

وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ

اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ

وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝۷۱ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ

اور مجھ کو مہلت نہ دو، پھر اگر منہ پھیرو گے تو میں نے نہیں چاہی تم سے مزدوری، میری مزدوری ہے

اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۷۲ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ

اللہ پر، اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں فرماں بردار، پھر اس کو جھٹلایا سو ہم نے بچالیا اس کو

وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰھُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

اور جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ان کو قائم کردیا جگہ پر اور ڈبادیا ان کو جو جھٹلاتے تھے

بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۷۳

ہماری باتوں کو، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کا جن کو ڈرایا تھا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) ان کے سامنے نوح کا واقعہ پڑھ کر سناؤ، جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ''میری قوم

کے لوگو! اگر تمہارے درمیان میرا رہنا، اور اللہ کی آیات کے ذریعے خبر دار کرنا تمہیں بھاری معلوم ہو رہا ہے تو میں نے تو اللہ ہی پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ اب تم اپنے شریکوں کو ساتھ ملا کر (میرے خلاف) اپنی تدبیروں کو خوب پختہ کر لو، پھر جو تدبیر تم کرو وہ تمہارے دِل میں کسی گھٹن کا باعث نہ بنے، بلکہ میرے خلاف جو فیصلہ تم نے کیا ہو، اُسے (دِل کھول کر) کر گذرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو، (۷۱) پھر بھی اگر تم نے منہ موڑے رکھا تو میں نے تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اُجرت تو نہیں مانگی۔ میرا اَجر کسی اور نے نہیں، اللہ نے ذمے لیا ہے، اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں بردار لوگوں میں شامل رہوں'' (۷۲) پھر ہوا یہ کہ اُن لوگوں نے نوح کو جھٹلایا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح کو اور جو لوگ اُن کے ساتھ کشتی میں تھے اُنہیں بچالیا، اور اُن کو کافروں کی جگہ زمین میں بسایا، اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا، انہیں (طوفان میں) غرق کر دیا۔ اب دیکھو کہ جن لوگوں کو خبر دار کیا گیا تھا، اُن کا انجام کیسا ہوا؟ (۷۳)

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سنایئے (جو کہ اس وقت واقع ہوا تھا) جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم کو میرا رہنا (یعنی وعظ گوئی کی حالت میں رہنا) اور اَحکام خداوندی کی نصیحت کرنا بھاری (اور ناگوار) معلوم ہوتا ہے تو (ہوا کرے میں کچھ پرواہ نہیں کرتا کیونکہ) میرا تو خدا ہی پر بھروسہ ہے سو تم (میرے ضرر پہنچانے کے متعلق) اپنی تدابیر (جو کچھ کر سکو) مع اپنے شرکاء (یعنی بتوں) کے پختہ کر لو (یعنی تم اور تمہارے معبود سب مل کر میری ضرر رسانی میں اپنا ارمان نکال لو) پھر تمہاری وہ تدبیر تمہاری گھٹن (اور دِل تنگی) کا باعث نہ ہونا چاہئے (یعنی اکثر خفیہ تدبیر سے طبیعت گھٹا کرتی ہے، سو خفیہ تدبیر کی ضرورت نہیں، جو کچھ تدبیر کرو دِل کھول کر علانیہ کرو، میرا نہ لحاظ پاس کرو اور نہ میرے چلے جانے نکل جانے کا اندیشہ کرو کیونکہ اتنے آدمیوں کے پہرہ میں سے ایک آدمی کا نکل جانا بھی مستبعد ہے پھر اخفا کی کیا ضرورت ہے) پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا ہے) کر گزرو اور مجھ کو (ذرا) مہلت نہ دو (حاصل یہ کہ میں تمہاری ان باتوں سے نہ ڈرتا ہوں اور نہ تبلیغ سے رک سکتا ہوں یہاں تک تو نفی خوف کی فرمائی، آگے نفی طمع کی فرماتے ہیں، یعنی) پھر بھی اگر تم اِعراض ہی کئے جاؤ تو (یہ سمجھو کہ) میں نے تم سے (اس تبلیغ پر) کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا (اور میں تم سے کیوں مانگتا کیونکہ) میرا معاوضہ تو صرف (حسبِ وعدۂ کرم) اللہ ہی کے ذمّے ہے (غرض نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ خواہش رکھتا ہوں) اور (چونکہ) مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں رہوں (اس لئے تبلیغ میں حکم کی تعمیل رکھتا ہوں اگر تم نہ مانو گے میرا کیا نقصان ہے) سو (باوجود اس موعظہ بلیغہ کے بھی) وہ لوگ ان کو جھٹلاتے رہے پس (اس پر عذاب طوفان کا مسلط ہوا اور) ہم نے (اس عذاب سے) ان کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے ان کو نجات دی اور ان کو (زمین) پر آباد کیا اور (باقی

جو لوگ رہ گئے تھے) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو (اس طوفان میں) غرق کر دیا، سو دیکھنا چاہئے کیسا (برا) انجام ہوا ان لوگوں کا جو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے جا چکے تھے (یعنی بے خبری میں ہلاک نہیں کئے گئے، پہلے کہہ دیا، سمجھا دیا، نہ مانا سزا پائی)۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

پھر بھیجے ہم نے نوحؑ کے بعد کتنے پیغمبر ان کی قوم کی طرف پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ

سو ان سے یہ نہ ہوا کہ ایمان لے آئیں اس بات پر جس کو جھٹلا چکے تھے پہلے سے، اسی طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں

عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

دلوں پر حد سے نکل جانے والوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس کے بعد ہم نے مختلف پیغمبر اُن کی اپنی اپنی قوموں کے پاس بھیجے، وہ اُن کے پاس کھلے کھلے دلائل لے کر آئے، لیکن اُن لوگوں نے جس بات کو پہلی بار جھٹلا دیا تھا اُسے مان کر ہی نہ دیا۔ جو لوگ حد سے گذر جاتے ہیں، اُن کے دلوں پر ہم اسی طرح مہر لگا دیتے ہیں۔ ﴿۷۴﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر نوح (علیہ السلام) کے بعد ہم نے اور رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، سو وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے (مگر) پھر (بھی ان کی ضد اور ہٹ کی یہ کیفیت تھی کہ) جس چیز کو انہوں نے اوّل (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ نہ ہوا کہ پھر اس کو مان لیتے (اور جیسے یہ لوگ دل کے سخت تھے) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا

پھر تکبر کرنے لگے اور وہ تھے لوگ گنہگار، پھر جب پہنچی ان کو سچی بات ہمارے پاس سے

قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ

کہنے لگے یہ تو جادو ہے کھلا، کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو حق بات کو

لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا

جب وہ پہنچے تمہارے پاس، کیا یہ جادو ہے، اور نجات نہیں پاتے جادو کرنے والے، بولے کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے

عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ

اس رستہ سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اور تم دونوں کو سرداری مل جائے اس ملک میں،

وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ

اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے اور بولا فرعون لاؤ میرے پاس

بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا

جو جادوگر ہو پڑھا ہوا، پھر جب آئے جادوگر کہا ان کو موسیٰ نے ڈالو

مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ

جو تم ڈالتے ہو، پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے،

إِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ

اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے، بیشک اللہ نہیں سنوارتا شریروں کے کام، اور اللہ سچا کرتا ہے

الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں گنہگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اُس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا، تو انہوں نے تکبر کا معاملہ کیا، اور وہ مجرم لوگ تھے۔ ﴿۷۵﴾ چنانچہ جب اُن کے پاس ہماری طرف سے حق کا پیغام آیا تو وہ کہنے لگے کہ ضرور یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ ﴿۷۶﴾ موسیٰ نے کہا: ”کیا تم حق کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو جبکہ وہ تمہارے پاس آچکا ہے؟ بھلا کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے۔“ ﴿۷۷﴾ کہنے لگے: ”کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ جس طور طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، اُس سے ہمیں برگشتہ کردو، اور اِس سرزمین میں تم دونوں کی چودھراہٹ قائم ہوجائے؟ ہم تو تم دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔“ ﴿۷۸﴾ اور فرعون نے (اپنے ملازموں سے) کہا کہ: ”جتنے ماہر جادوگر ہیں، اُن سب کو میرے پاس لے کر آؤ۔“ ﴿۷۹﴾ چنانچہ جب جادوگر آگئے، تو موسیٰ نے اُن سے کہا: ”پھینکو جو کچھ تمہیں پھینکنا ہے۔“ ﴿۸۰﴾ پھر جب اُنہوں نے (اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو) پھینکا (اور وہ سانپ بن کر چلتی ہوئی نظر آئیں) تو موسیٰ نے کہا کہ: ”یہ جو کچھ تم نے دِکھایا ہے، جادو ہے۔ اللہ ابھی اس کو ملیامیٹ کئے دیتا ہے۔ اللہ فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا ﴿۸۱﴾ اور اللہ سچ کو اپنے حکم سے سچ کر دِکھاتا ہے، چاہے مجرم لوگ کتنا برا سمجھیں۔“ ﴿۸۲﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکور) پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنے معجزات (عصا اور یدِ بیضاء) دے کر بھیجا سو انہوں نے (دعوے کے ساتھ ہی ان کی تصدیق کرنے سے) تکبر کیا اور (طلبِ حق کے لئے غور بھی تو نہ کیا) اور وہ لوگ جرائم کے خوگر تھے (اس لئے اطاعت نہ کی) پھر جب (بعد دعویٰ کے) ان کو ہمارے پاس سے (نبوّتِ موسویہ پر) صحیح دلیل پہنچی (مراد اس سے معجزہ ہے) تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے،

موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم اس صحیح دلیل کی نسبت جبکہ وہ تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو (کہ یہ جادو ہے) کیا یہ جادو ہے، حالانکہ جادوگر (جبکہ دعویٰ نبوّت کا کریں تو اظہارِ معجزہ میں) کامیاب نہیں ہوا کرتے (اور میں کامیاب ہوا کہ اوّل دعویٰ کیا پھر معجزات ظاہر کردیئے) وہ لوگ (اس تقریر کا کچھ جواب نہ دے سکے، ویسے ہی براہِ جہالت) کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ اس طریقہ سے ہٹادو جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے اور (اس لئے آئے ہو کہ) تم دونوں کو دنیا میں ریاست (اور سرداری) مل جاوے اور (تم خوب سمجھ لو کہ) ہم تو تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے، اور فرعون نے (اپنے سرداروں سے) کہا کہ میرے پاس تمام ماہر جادوگروں کو (جو ہمارے قلمرو میں ہیں) حاضر کرو (چنانچہ جمع کئے گئے) سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم کو (میدان میں) ڈالنا ہے، سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو یہ ہے (نہ وہ جس کو فرعون والے جادو کہتے ہیں) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا (جو معجزہ کے ساتھ مقابلہ سے پیش آویں) اور اللہ تعالیٰ (جس طرح اہلِ باطل کے باطل کو بمقابلہ معجزاتِ حقہ کے باطل کردیتا ہے اسی طرح) دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق (کہ اثباتِ نبوّت انبیاءؑ کے متعلق ہیں) ثابت کردیتا ہے گو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ

پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون سے اور ان کے سرداروں سے

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

کہ کہیں ان کو بچلا نہ دے، اور فرعون چڑھ رہا ہے ملک میں، اور اس نے ہاتھ چھوڑ رکھا ہے،

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ

اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم

مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً

فرماں بردار، تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا اے ربّ ہمارے نہ آزما ہم پر زور

لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

اس ظالم قوم کا، اور چھڑا دے ہم کو مہربانی فرما کر اِن کافر لوگوں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر ہوا یہ کہ موسیٰ پر کوئی اور نہیں، لیکن خود اُن کی قوم کے کچھ نوجوان فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرتے ڈرتے ایمان لائے کہ کہیں فرعون اُنہیں نہ ستائے۔ اور یقیناً فرعون زمین میں بڑا زور آور تھا، اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر قائم نہیں رہتے۔ ﴿٨٣﴾ اور موسیٰ نے کہا: ''اے میری قوم! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان لے آئے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ رکھو، اگر تم فرماں بردار ہو'' ﴿٨٤﴾ اس پر انہوں نے کہا کہ ''اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کرلیا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالم لوگوں کے ہاتھوں آزمائش میں نہ ڈالئے۔ ﴿٨٥﴾ اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر قوم سے نجات دے دیجئے'' ﴿٨٦﴾

خلاصۂ تفسیر

پس (جب عصا کا معجزہ ظاہر ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) پر (شروع شروع میں) ان کی قوم میں سے صرف قدرے قلیل آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں (ظاہر ہونے پر) ان کو تکلیف (نہ) پہنچاوے اور واقع میں (ڈرنا ان کا بے جا نہ تھا کیونکہ) فرعون اس ملک میں زور (سلطنت) رکھتا تھا اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد (انصاف) سے باہر ہو جاتا تھا (ظلم کرنے لگتا تھا پھر جو شخص حکومت کے ساتھ ظلم کرتا ہو اس سے تو ڈر لگتا ہی ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (جب ان کو خائف دیکھا تو ان سے) فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم (سچے دل سے) اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو (سوچ بچار مت کرو بلکہ) اسی پر توکل کرو اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو، انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا (بعد اس کے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالم لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت کے صدقے ان کافروں سے نجات دے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر

وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رُو اور قائم کرو نماز اور خوش خبری دے ایمان والوں کو

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا

اور کہا موسیٰ نے اے رَبّ ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو رونق اور مال

فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ

دنیا کی زندگی میں اے رَبّ اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے، اے رَبّ مٹادے ان کے مال

وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ

اور سخت کردے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب دردناک، فرمایا

قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ

قبول ہوچکی دُعا تمہاری سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو راہ ان کی

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ

جو ناواقف ہیں، اور پار کردیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے

وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ

اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور تعدّی سے، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا بولا یقین کرلیا میں نے کہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِىْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

کوئی معبود نہیں مگر جس پر ایمان لائے بنی اسرائیل اور میں ہوں فرماں برداروں میں،

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور رہا گمراہوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی پر وحی بھیجی کہ: ''تم دونوں اپنی قوم کو مصر ہی کے گھروں میں بساؤ، اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ بنالو، اور (اس طرح) نماز قائم کرو، اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو۔'' ﴿۸۷﴾ اور موسیٰ نے کہا: ''اے ہمارے پروردگار! آپ نے فرعون اور اُس کے سرداروں کو دُنیوی زندگی میں بڑی سج دھج اور مال و دولت بخشی ہے۔ اے ہمارے پروردگار! اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہ لوگوں کو آپ کے راستے سے بھٹکا رہے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اُن کے مال و دولت کو تہس نہس کر دیجئے، اور اُن کے دِلوں کو اتنا سخت کر دیجئے کہ وہ اُس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔'' ﴿۸۸﴾ اللہ نے فرمایا: ''تمہاری دُعا قبول کر لی گئی ہے۔ اب تم دونوں ثابت قدم رہو، اور اُن لوگوں کے پیچھے ہرگز نہ چلنا جو حقیقت سے ناواقف ہیں۔'' ﴿۸۹﴾ اور ہم نے بنو اسرائیل کو سمندر پار کرادیا، تو فرعون اور اُس کے لشکر نے بھی ظلم اور زیادتی کی نیت سے اُن کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ جب ڈوبنے کا انجام اُس کے سر پر آپہنچا تو کہنے لگا: ''میں مان گیا کہ جس خدا پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں بھی فرماں برداروں میں شامل ہوتا ہوں'' ﴿۹۰﴾ (جواب دیا گیا کہ:) ''اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا، اور مسلسل فساد ہی مچاتا رہا ﴿۹۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (اس دُعا کے قبول کرنے کا سامان کیا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی (ہارون علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لئے (بدستور) مصر میں گھر برقرار رکھو (یعنی وہ ڈر کر گھر نہ چھوڑیں ہم ان کے محافظ ہیں) اور (نماز کے اوقات میں) تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو (مساجد کی حاضری خوف کی وجہ سے معاف ہے) اور (یہ ضروری ہے کہ) نماز کے پابند رہو (تاکہ نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ جلدی اس مصیبت سے چھُڑا دے) اور (اے موسیٰ) آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں (کہ اب جلدی یہ مصیبت ختم ہو جاوے گی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دُعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رَبّ (ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ) آپ نے فرعون کو اور

اس کے سرداروں کو سامانِ تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اے ہمارے رَبّ اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہو چکی تو اب ان کے اموال اور نفوس کو کیوں باقی رکھا جاوے پس) اے ہمارے رَبّ ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دیجئے اور (ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے اس طرح کہ) ان کے دِلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہو جاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذابِ الیم (کے مستحق ہوکر اس) کو دیکھ لیں (سو اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا، موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے، کذا فی الدر المنثور)[1] حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی (کیونکہ آمین کہنا بھی دعاء میں شریک ہونا ہے یعنی ہم ان کے اموال ونفوس اب ہلاک کرنے والے ہیں) سو تم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو (یعنی گو ہدایت ان کی تقدیر میں نہ ہو مگر تبلیغ میں تمہارا تو فائدہ ہے) اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو (ہمارے وعدے کے سچے ہونے کا یا توقف میں حکمت ہونے کا یا تبلیغ کے ضروری ہونے کا) علم نہیں (یعنی ہمارے وعدہ کو سچا سمجھو اور اگر ہلاکت میں دیر ہو جاوے اس میں حکمت سمجھو اور اپنے منصبی کام میں لگے رہو) اور (جب ہم نے فرعون کو ہلاک کرنا چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جایئے، چنانچہ وہ سب کو لے کر چلے اور رستہ میں دریائے شور حائل ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے اس میں راستہ ہو گیا اور) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار کر دیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادہ سے (دریا میں) چلا (کہ دریا سے نکل کر ان سے قتل وقتال کرے لیکن وہ دریا سے پار نہ ہو سکا) یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ ہوکر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں (سو مجھ کو اس غرق سے اور عذابِ آخرت سے نجات دی جاوے فرشتہ کے ذریعہ سے) جواب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے (جبکہ معائنہ آخرت کا شروع ہو گیا) اور (معائنہ آخرت کے) پہلے سے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل وقومِ فرعون کے کچھ حالات اور ان سے متعلق اَحکام مذکور ہیں۔ پہلی آیت میں ایک خاص واقعہ سے متعلق حکم ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل جو دینِ موسوی پر عامل تھے یہ سب

[1] الدر المنثور تحت هذه الآية ج: ۵ ص: ۲۶۲

عام عادت کے مطابق نمازیں صرف اپنے صومعوں (عبادت گاہوں) میں ادا کرتے تھے، اور پچھلی اُمتوں کے لئے حکم بھی یہی تھا کہ ان کی نماز اپنے گھروں میں ادا نہیں ہوتی تھی، یہ خصوصی سہولت اُمتِ محمدیہ کو عطا ہوئی کہ ہر جگہ جہاں چاہیں نماز ادا کرلیں، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھ خصوصیات میں سے ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ میرے لئے ساری زمین کو مسجد بنادیا گیا ہے کہ نماز ہر جگہ ادا ہو جاتی ہے،[۱] یہ دوسری بات ہے کہ فرض نمازوں کا مسجد میں ہی ادا کرنا جماعت کے ساتھ سنتِ مؤکدہ قرار دیا گیا۔ اور نفلی نمازوں کا گھروں میں ادا کرنا افضل ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر تھا کہ مسجد میں صرف فرض نماز پڑھتے تھے، سنن اور نوافل گھر میں جا کر ادا فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں، فرعون جوان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتا اور ان پر ظلم ڈھاتا تھا، اس نے یہ دیکھ کر ان کے تمام عبادت خانوں کو مسمار کردیا تاکہ یہ اپنے مذہب کے مطابق نماز نہ پڑھ سکیں، اس پر حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دونوں پیغمبروں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو وہ حکم دیا جو اس آیت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے مصر میں مکان نئے بنائے جائیں اور ان مکانات کا رُخ قبلہ کی طرف ہو، تاکہ وہ انہیں سکونتی مکانات میں نماز ادا کرسکیں۔

اِس سے معلوم ہوا کہ پچھلی اُمتوں میں اگرچہ عام حکم یہی تھا کہ نمازیں صرف عبادت خانوں میں پڑھی جائیں، لیکن اس خاص حادثہ کی وجہ سے بنی اسرائیل کے لئے اس کی عارضی اجازت دے دی گئی کہ گھروں ہی میں نماز ادا کرلیا کریں اور اپنے گھروں کا رخ قبلہ کی طرف سیدھا رکھیں، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ضرورت کے وقت بھی ان کو مخصوص گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا رُخ قبلہ کی طرف کیا گیا تھا، عام گھروں اور عام مقامات پر نماز کی اجازت اس وقت بھی نہیں تھی، جس طرح اُمتِ محمدیہ کو شہر اور جنگل کے ہر مقام پر نماز ادا کرنے کی سہولت حاصل ہے۔ (روح)[۲]

یہاں یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کو جس قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس سے مراد کونسا قبلہ ہے، کعبہ یا بیت المقدس؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب کا قبلہ تھا، (قرطبی وروح)[۳] بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔

اور جس حدیث میں یہ ارشاد ہے کہ یہود اپنی نمازوں میں صَخرہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے ہیں اس کو اس

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساجد ...إلخ ج:۱ ص:۱۹۹ [۲] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۹۲

[۳] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۳۷۱، وروح المعانی تحت هذه الآية ج:۸ ص:۹۲

زمانہ پر محمول کیا جائے گا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے، یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ قیامِ مصر کے زمانہ میں آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی ہو۔ [۱]

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے لئے استقبالِ قبلہ کی شرط انبیاء سابقین کے زمانہ میں بھی تھی، اسی طرح طہارت اور سترِ عورت کا تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرطِ نماز ہونا بھی معتبر روایات سے ثابت ہے۔

گھروں کو قبلہ رُخ بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان میں نمازیں ادا کی جائیں اِس لئے اس کے بعد وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم دے کر یہ ہدایت کر دی گئی کہ اگر فرعون عبادت گاہوں میں نماز ادا کرنے سے روکتا ہے تو اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی اپنے گھروں میں ادا کرو۔

آخرِ آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے حکم دیا گیا کہ مؤمنین کو آپ خوشخبری سنا دیں کہ ان کا مقصود پورا ہوگا، دشمن پر ان کو غلبہ نصیب ہوگا اور آخرت میں جنت ملے گی۔ (روح) [۲]

آیت کے شروع میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کو بصیغۂ تثنیہ خطاب کیا گیا کیونکہ مکانات قبلہ رُخ کر کے ان میں نماز پڑھنے کی اجازت انہیں کا کام تھا، اُس کے بعد بصیغۂ جمع سب بنی اسرائیل کو شامل کر کے اقامتِ نماز کا حکم دیا گیا کیونکہ اس حکم میں پیغمبر اور اُمت سب داخل ہیں، آخر میں بشارت دینے کا حکم خاص موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا کیونکہ اصل صاحبِ شریعت نبی آپ ہی تھے، بشارتِ جنت دینے کا آپ ہی کو حق تھا۔

دوسری آیت میں قومِ فرعون کی اِصلاح سے مایوس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددُعا کا ذکر ہے جس کے شروع میں انہوں نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کیا کہ آپ نے قومِ فرعون کو زینتِ دنیا کے ساز وسامان اور مال ودولت بہت عطا فرما رکھا ہے، مصر سے لے کر ارضِ حبشہ تک سونے چاندی اور زبرجد وزمرّد یاقوت وغیرہ جواہرات کی کانیں عطا فرما رکھی ہیں (قرطبی) [۳] جس کا اثر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں، کیونکہ عام لوگ ان کے ظاہری ساز وسامان اور عیش وراحت کو دیکھ کر اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ گمراہی پر ہوتے تو ان کو اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں کیوں ملتیں، کیونکہ عام لوگوں کی نظریں اس حقیقت تک نہیں پہنچتیں کہ دنیا کا فروغ بغیر نیک عمل کے کسی انسان کے حق پر ہونے کی علامت نہیں ہو سکتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قومِ فرعون کی اصلاح سے مایوس ہونے کے بعد ان کے مال ودولت سے دوسروں کی گمراہی کا خطرہ محسوس کر کے بددُعا کی، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ یعنی اے میرے پروردگار ان کے اَموال کی صورت بدل کر مسخ وبیکار کر دے۔

---

[۱] روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۹۲ [۲] روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۹۳

[۳] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۳۷۳

حضرت قتادہؒ کا بیان ہے کہ اس دُعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ قومِ فرعون کے تمام زر و جواہرات اور نقد سکے اور باغوں کھیتوں کی سب پیداوار پتھروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں ایک تھیلہ پایا گیا جس میں فرعون کے زمانہ کی چیزیں تھیں ان میں انڈے اور بادام بھی دیکھے گئے جو بالکل پتھر تھے۔ [1]

ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام پھلوں، ترکاریوں اور غلہ کو پتھر بنا دیا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی اُن نو آیات (معجزات) میں سے ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (بنی اسرائیل:۱۰۱)

دوسری بددُعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے یہ کی، وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ یعنی اے پروردگار ان کے دلوں کو ایسا سخت کر دے کہ ان میں ایمان اور کسی خیر کی صلاحیت ہی نہ رہے تاکہ وہ عذابِ الیم آنے سے پہلے ایمان نہ لاسکیں۔

یہ بددُعا بظاہر ایک رسول و پیغمبر کی زبان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر کا وظیفۂ زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایمان وعملِ صالح کی طرف دعوت دیں اور اس کے لئے تدبیریں کریں۔

مگر یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری تدبیریں کرنے کے بعد ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے اور اب چاہتے تھے کہ یہ اپنے اعمال کی سزا دیکھیں، اس میں یہ احتمال تھا کہ کہیں یہ لوگ عذاب آتا دیکھ کر ایمان کا اقرار نہ کر لیں اور اس طرح عذاب ٹل جائے، اس لئے کفر سے بغض و نفرت اس دعا کا سبب بنی، جیسے فرعون غرق ہونے کے وقت ایمان کا اقرار کرنے لگا تو جبریلِ امین نے اس کا منہ بند کر دیا کہ کہیں رحمتِ الٰہی متوجہ ہو کر یہ عذاب سے نہ بچ جائے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بددُعا درحقیقت بددُعا نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے شیطان پر لعنت کہ وہ تو بنصِ قرآن خود ہی ملعون ہے پھر اس پر لعنت کرنے کا منشا اس کے سوا نہیں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت مسلط کر دی ہم بھی اس پر لعنت کرتے ہیں اس صورت میں مطلب اس کا یہ ہوگا کہ ان کے دلوں کا سخت اور ناقابلِ ایمان و اصلاح ہونا من جانب اللہ مقرر ہو چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بصورتِ بددُعا اس کا اظہار فرمایا۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا کی قبولیت کو بیان فرمایا ہے مگر عنوان میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی شریکِ دُعا قرار دے کر یہ خطاب کیا گیا قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یعنی تم دونوں کی دُعا قبول کر لی گئی، وجہ یہ تھی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دُعا کر رہے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام اٰمِيْن کہتے جاتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی دُعا پر آمین کہنا بھی دُعا ہی میں داخل ہے، اور چونکہ دُعا کا مسنون طریقہ قرآن کریم میں آہستہ آواز سے کرنے کا بتلایا گیا ہے تو اس سے آمین کو بھی آہستہ کہنے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۳۷۴، وتفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۱۴۷

اس آیت میں قبولیتِ دُعا کی اطلاع ان دونوں پیغمبروں کو دے دی گئی، مگر تھوڑا سا اِمتحان ان کا بھی لیا گیا کہ قبولیتِ دُعا کا اثر بقول بغوی چالیس سال بعد ظاہر ہوا،[۱] اِسی لئے اس آیت میں قبولیتِ دُعا کے ذکر کے ساتھ ان دونوں حضرات کو یہ بھی ہدایت کردی گئی کہ فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ یعنی اپنے کارِ منصبی دعوت وتبلیغ میں لگے رہیں، قبولیتِ دُعا کا اثر دیر میں ظاہر ہو تو جاہلوں کی طرح جلد بازی نہ کریں۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشہور معجزہ عبورِ دریا کا اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ یعنی جب اس کو غرقابی نے پکڑ لیا تو بول اُٹھا کہ میں ایمان لاتا ہوں اِس بات پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں طاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔

پانچویں آیت میں خود حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے اس کا یہ جواب آیا ہے آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ یعنی کیا اب تم مسلمان ہوتے ہو جبکہ ایمان واسلام کا وقت گزر چکا۔

اِس سے ثابت ہوا کہ عین موت کے وقت کا ایمان لانا شرعاً معتبر نہیں، اس کی مزید تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرماتے رہتے ہیں جب تک غرغرۂ موت کا وقت نہ آجائے۔ (ترمذی)[۲]

غرغرۂ موت سے مراد وہ وقت ہے جب نزعِ روح کے وقت فرشتے سامنے آجاتے ہیں اس وقت دارُ العمل دنیا کی زندگی ختم ہو کر آخرت کے اَحکام شروع ہوجاتے ہیں، اس لئے اس وقت کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں، نہ ایمان نہ کفر، ایسے وقت جو ایمان لاتا ہے اس کو بھی مؤمن نہیں کہا جائے گا اور اس کے ساتھ کفن دفن میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہ کیا جائے گا، جیسا کہ فرعون کے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ بالاجماع فرعون کی موت کفر پر قرار دی گئی ہے نصوصِ قرآن سے بھی یہی واضح ہے اور جس کسی نے فرعون کے اس ایمان کو معتبر کہا ہے یا تو اس کی کوئی تاویل کی جائے ورنہ اسے غلط کہا جائے گا۔ (روح)[۳]

اسی طرح اگر خدانخواستہ ایسی ہی نزعِ روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمۂ کفر کی تاویل کی جائے گی

---

۱ تفسیر البغوی تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۴۸ ۲ جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب فی فضل التوبة إلخ ج:۲ ص:۱۹۴

۳ روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۱۱۴

جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جو کلمہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا لوگ اس کو کلمۂ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت رُوح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے کہ یہ وقت نزعِ روح کا اور غرغرۂ موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا

سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تاکہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی، اور بیشک بہت

مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲ ع وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ

لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے، اور جگہ دی ہم نے بنی اسرائیل کو

مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ ۭ

پسندیدہ جگہ اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی یہاں تک کہ پہنچی ان کو خبر،

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳

بیشک تیرا ربّ ان میں فیصلہ کرے گا قیامت کے دن جس بات میں کہ ان میں پھوٹ پڑی،

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْــَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ

سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب

مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاۗءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۹۴ لا

تجھ سے پہلے بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات تیرے ربّ سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا،

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٥﴾

اور مت ہو ان میں جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہوجائے خرابی میں پڑنے والا،

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ

جن پر ثابت ہوچکی بات تیرے ربّ کی وہ ایمان نہ لائیں گے، اگرچہ پہنچیں ان کو

كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ

ساری نشانیاں جب تک نہ دیکھ لیں عذاب دردناک، سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی

فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ

پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی اٹھالیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾

دُنیا کی زندگانی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک۔

آسان ترجمۂ قرآن

لہٰذا آج ہم تیرے (صرف) جسم کو بچائیں گے، تاکہ تو اپنے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت کا نشان بن جائے، (کیونکہ) بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل بنے ہوئے ہیں'' ﴿٩٢﴾ اور ہم نے بنو اسرائیل کو ایسی جگہ بسایا جو صحیح معنی میں بسنے کے لائق جگہ تھی، اور اُن کو پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔ پھر انہوں نے (دینِ حق کے بارے میں) اُس وقت تک اختلاف نہیں کیا جب تک اُن کے پاس علم نہیں آ گیا۔ یقین رکھو کہ جن باتوں میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، اُن کا فیصلہ تمہارا پروردگار قیامت کے دن کرے گا۔ ﴿٩٣﴾ پھر (اے پیغمبر!) اگر (بفرضِ محال) تمہیں اُس کلام میں ذرا بھی شک ہو جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے تو اُن لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے (آسمانی) کتاب پڑھتے ہیں۔ یقین رکھو کہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہی آیا ہے، لہٰذا تم کبھی بھی شک کرنے والوں میں شامل نہ ہونا۔ ﴿٩٤﴾ نیز کبھی ہرگز اُن

لوگوں میں شامل نہ ہونا جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے، ورنہ تم اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے جنہوں نے گھاٹے کا سودا کر لیا ہے۔ (۹۵) بیشک جن لوگوں کے بارے میں تمہارے رَبّ کی بات طے ہو چکی ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے، (۹۶) چاہے ہر قسم کی نشانی اُن کے سامنے آ جائے، یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ (۹۷) بھلا کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایسے وقت ایمان لے آتی کہ اُس کا ایمان اُسے فائدہ پہنچا سکتا؟ البتہ صرف یونس کی قوم کے لوگ ایسے تھے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دُنیوی زندگی میں رُسوائی کا عذاب اُن سے اُٹھا لیا، اور اُن کو ایک مدّت تک زندگی کا لطف اُٹھانے دیا۔ (۹۸)

خلاصۂ تفسیر

سو (بجائے نجاتِ مطلوبہ کے) آج ہم تیری لاش کو (پانی میں تہ نشین ہونے سے) نجات دیں گے تاکہ تو ان کے لئے موجب عبرت ہو جو تیرے بعد (موجود) ہیں (کہ تیری بدحالی اور تباہی دیکھ کر مخالفتِ اَحکامِ الٰہیہ سے بچیں) اور حقیقت یہ ہے کہ (پھر بھی) بہت سے آدمی ہماری (ایسی ایسی) عبرتوں سے غافل ہیں (اور مخالفتِ اَحکام سے نہیں ڈرتے) اور ہم نے (غرقِ فرعون کے بعد) بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا (کہ اس وقت تو مصر کے مالک ہوگئے اور ان کی اوّل ہی نسل کو بیت المقدس اور ملکِ شام عمالقہ پر فتح دے کر عطا فرمایا) اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں کھانے کو دیں (مصر میں بھی جنت وعیون تھے اور شام کی نسبت بٰرَكْنَا فِيهَا (الاعراف: ۷: ۱۳۷) آیا ہے) سو (چاہئے تھا کہ ہماری اطاعت میں زیادہ سرگرم رہتے لیکن انہوں نے اُلٹا دین میں اختلاف کرنا شروع کیا اور غضب یہ کہ) انہوں نے (جہل کی وجہ سے) اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس (اَحکام کا) علم پہنچ گیا (تھا اور پھر اختلاف کیا آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ) یقینی بات ہے کہ آپ کا رَبّ ان (اِختلاف کرنے والوں) کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ (عملی) کرے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، پھر (اثباتِ حقیقت دینِ محمدی کے واسطے ہم ایک ایسا کافی طریقہ بتلاتے ہیں کہ غیر صاحبِ وحی کے لئے تو کیسے کافی نہ ہوگا وہ ایسا ہے کہ آپ صاحبِ وحی ہیں مگر آپ سے بھی اگر اس کا خطاب بطور قضیۂ شرطیہ کے کیا جاوے تو ممکن ہے اس طرح سے کہ) اگر (بالفرض) آپ اس (کتاب) کی طرف سے شک (وشبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو (اس شک کے دفع کا ایک سہل طریقہ یہ بھی ہے کہ) آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھئے جو آپ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں (مراد توریت وانجیل ہیں وہ من حیث القراءۃ اس کی پیشین گوئیوں کی بناء پر اس قرآن کے صدق کو بتلا دیں گے) بیشک آپ کے پاس آپ کے رَبّ کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں اور نہ (شک کرنے والوں سے بڑھ کر) ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو

جھٹلایا، کہیں آپ (نعوذ باللہ) تباہ نہ ہو جاویں یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے ربّ کی (یہ ازلی) بات (کہ یہ ایمان نہ لاویں گے) ثابت ہو چکی ہے وہ (کبھی) ایمان نہ لاویں گے گو ان کے پاس تمام دلائل (ثبوتِ حق کے) پہنچ جاویں، جب تک کہ عذابِ دردناک کو نہ دیکھ لیں (مگر اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا) چنانچہ (جن بستیوں پر عذاب آچکا ہے ان میں سے) کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا (کیونکہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق نہ ہوئی تھی) ہاں مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم (کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی، اس لئے وہ عذابِ موعود کے آثارِ ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے اور) جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقتِ خاص (یعنی وقتِ موت) تک (خیر خوبی کے ساتھ) عیش دیا (پس اور قریوں کا ایمان نہ لانا اور قومِ یونس علیہ السلام کا ایمان لانا دونوں مشیت سے ہوئے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں فرعون کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ غرقابی کے بعد ہم تیرے بدن کو پانی سے نکال دیں گے، تاکہ تیرا یہ بدن پچھلے لوگوں کے لئے قدرتِ خداوندی کی نشانی اور عبرت بن جائے۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ دریا سے عبور کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہلاک ہونے کی خبر دی تو وہ لوگ فرعون سے کچھ اس قدر مرعوب و مغلوب تھے کہ اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فرعون ہلاک نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی اور دوسروں کی عبرت کے لئے دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا، اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونۂ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی تھی آج تک وہ جگہ جبلِ فرعون کے نام سے معروف ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں، اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔

مگر کچھ عجب نہیں کہ قدرت نے جس طرح غرق شدہ لاش کو عبرت کے لئے کنارہ پر ڈال دیا تھا اسی طرح آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے اس کو گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رکھا ہو، اور اب تک موجود ہو۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ بہت سے لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے غافل ہیں ان میں غور وفکر نہیں کرتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے ورنہ عالم کے ہر ذرّہ ذرّہ میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو اور اس کی قدرتِ کاملہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔

دوسری آیت میں فرعون کے انجامِ بد کے بالمقابل اس قوم کا مستقبل دکھلایا ہے جس کو فرعون نے حقیر و ذلیل بنا رکھا تھا، فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانہ عطا فرمایا کہ پورا ملکِ مصر بھی ان کو مل گیا اور اردن و فلسطین کی ارضِ مقدسہ بھی ان کو مل گئی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذرّیت کے لئے میراث بنا دیا تھا، اچھے ٹھکانے کو قرآن میں مُبَوَّاَ صِدْقٍ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، صِدْق کے معنٰی اس جگہ صالح اور مناسب کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ایسا ٹھکانا ان کو دیا جو ان کے لئے ہر اعتبار سے لائق اور مناسب تھا پھر فرمایا کہ ہم نے اُن کو حلال و پاک چیزوں سے رزق دیا کہ دنیا کی تمام لذائذ اور راحتیں ان کو عطا فرما دیں۔

آخرِ آیت میں پھر ان کی کجروی اور غلط کاری کا ذکر ہے کہ ان میں بہت سے لوگوں نے اِقتدار پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کی اطاعت سے پھر گئے، تورات میں جو نشانیاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ پڑھتے تھے اس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے یہی لوگ ایمان لاتے، مگر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تو یہ سب لوگ نبی آخر الزمان پر اعتقاد رکھتے اور ان کی نشانیوں اور ان کے ظہور کا وقت قریب ہونے کی خبریں لوگوں کو بتایا کرتے تھے اور اپنی دعاؤں میں نبی آخر الزمان کا وسیلہ دے کر دعا کیا کرتے تھے مگر جب نبی آخر الزمان اپنی پوری شہادتوں کے ساتھ اور تورات کی بتلائی ہوئی نشانیوں کے ساتھ تشریف لائے تو یہ لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگے، کچھ لوگ ایمان لائے باقیوں نے انکار کیا، اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کو لفظ جَآءَهُمُ الْعِلْمُ سے تعبیر کیا ہے، یہاں عِلْم سے مراد یقین بھی ہوسکتا ہے تو معنٰی یہ ہوں گے کہ جب مشاہدہ کے ساتھ یقین کے اسباب جمع ہوگئے تو یہ لوگ اختلاف کرنے لگے۔

اور بعض مفسرینؒ نے فرمایا کہ اس جگہ علم سے مراد معلوم ہے یعنی جب وہ ہستی سامنے آگئی جو تورات کی پیشین گوئیوں کے ذریعہ پہلے سے معلوم تھی تو اب لگے اختلاف کرنے۔

آخرِ آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کے اختلاف کا فیصلہ فرماویں گے حق و باطل نکھر جائے گا، اہلِ حق جنت میں اور اہلِ باطل دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

تیسری آیت میں بظاہر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ کو وحی میں شک ہونے کا احتمال نہیں، اس لئے اس خطاب کے ذریعہ مقصود اُمت کو سنانا ہے خود آپ مقصود نہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خطاب عام انسان

کو ہو، کہ اے انسان اگر تجھ کو اُس وحی الٰہی میں کوئی شک ہے جو بواسطہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف بھیجی گئی تو تُو ان لوگوں سے دریافت کر جو تجھ سے پہلے اللہ کی کتاب تورات وانجیل پڑھتے تھے وہ تجھے بتلائیں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام اوران کی کتابیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشخبری دیتی آئی ہیں، جس سے تیرے وساوس دُور ہو جائیں گے۔

تفسیرِ مظہری میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو دین کے معاملہ میں کوئی شبہ پیش آجائے تو اس پر لازم ہے کہ علمائے حق سے سوال کر کے اپنے شبہات کو دور کرے اُن کی پرورش نہ کرتا رہے۔ [1]

چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیتوں میں اسی مضمون کی تائید وتاکید اور غفلت برتنے والوں کو تنبیہ ہے۔

ساتویں آیت میں غفلت شعار منکرین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو، انکار و سرکشی سے اب بھی باز آجاؤ، ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہ ہوگی، ایمان لاؤ گے تو ایمان مقبول نہ ہوگا، اور وہ وقت وہ ہوگا جبکہ موت کے وقت آخرت کا عذاب سامنے آجائے، اسی سلسلہ میں حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا جس میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں۔

اِس آیت میں ارشاد ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ منکر قومیں ایسے وقت ایمان لے آتیں کہ ان کا ایمان ان کو نفع دیتا یعنی موت کے وقت یا وقوعِ عذاب اور مبتلاء عذاب ہو چکنے کے بعد یا قیامِ قیامت کے وقت جبکہ توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا کسی کی توبہ اور ایمان مقبول نہ ہوگا، اُس سے پہلے پہلے اپنی سرکشی سے باز آجائیں اور ایمان لے آئیں، بجز قوم یونس علیہ السلام کے کہ انہوں نے ایسا وقت آنے سے پہلے ہی جب خدا تعالیٰ کا عذاب آتا دیکھا تو فوراً توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، جس کی وجہ سے ہم نے اُن سے رسوا کرنے والا عذاب ہٹا لیا۔

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ توبہ قبول ہو سکتی ہے، البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اور عذابِ آخرت کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہوگا یا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دنیوی عذاب میں مبتلا ہو کر ہو جیسے فرعون کو پیش آیا۔

اس لئے قومِ یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہو جانا عام ضابطہ الٰہیہ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے کیونکہ اُنہوں نے اگرچہ عذاب آتا ہوا دیکھ کر توبہ کی مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کر لی، بخلاف فرعون اور دوسرے لوگوں کے جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غرغرۂ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا اور توبہ قبول نہ ہوئی۔

قومِ یونس علیہ السلام کے واقعہ کی ایک نظیر خود قرآنِ کریم میں بنی اسرائیل کا وہ واقعہ ہے جس میں وہ کوہِ طور کو ان

[1] التفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۵۴

کے سروں پر معلق کر کے ان کو ڈرایا گیا اور توبہ کرنے کا حکم دیا گیا انہوں نے توبہ کر لی تو وہ توبہ قبول ہوئی، جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آیا ہے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (البقرۃ: ۶۳)

''ہم نے ان کے سروں پر کوہِ طور کو معلق کر کے حکم دیا کہ جو احکام تمہیں دیئے گئے ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑو۔''

وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عذاب کے واقع ہونے اور موت میں مبتلا ہونے سے پہلے محض عذاب کا اندیشہ دیکھ کر توبہ کر لی تھی، اسی طرح قومِ یونس علیہ السلام نے عذاب کو آتا ہوا دیکھ کر اخلاص اور الحاح وزاری کے ساتھ توبہ کر لی جس کی تفصیل آگے آتی ہے تو اس توبہ کا قبول ہو جانا ضابطۂ مذکورہ کے خلاف نہیں۔ (قرطبی) [۱]

اس جگہ بعض معاصرین سے ایک سخت غلطی ہوئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کوتاہیوں کی نسبت کر دی اور قوم سے عذاب ہٹ جانے کا سبب پیغمبر کی کوتاہی کو قرار دیا، اور اسی کوتاہی کو سببِ عتاب بنایا جس کا ذکر سورۂ انبیاء اور سورۂ صٰفّٰت میں آیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا اس لئے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ واستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر دیتا پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا۔'' اھ (تفہیم القرآن [۲] مولانا مودودی ج:۲ ص:۳۱۲، طبع ۱۹۶۴ء)

یہاں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے معصوم ہونا تو ایک مُسَلَّمہ عقیدہ ہے

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۳۸۴، ۳۸۵

[۲] تفہیم القرآن کے بعد کے ایڈیشنوں میں اس عبارت سے کسی رجوع کے اعلان کے بغیر یہاں عبارت میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے، یعنی ''فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی'' کے الفاظ نئی عبارت میں موجود نہیں ہیں، لیکن یہ بات اب بھی عبارت میں باقی ہے کہ ''جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔'' لہٰذا تفہیم القرآن کی عبارت میں تبدیلی کے باوجود ''معارف القرآن'' کا تبصرہ علیٰ حالہ برقرار ہے۔ ناشر - اکتوبر ۱۹۹۱ء

جس پر تمام اُمت کا اجماع ہے، اس کی تفصیلات میں کچھ جزوی اختلاف بھی ہیں کہ یہ عصمت ہر قسم کے صغیرہ گناہوں سے ہے یا صرف کبیرہ سے اور یہ کہ یہ عصمت قبل از نبوّت کے زمانے کو بھی شامل ہے یا نہیں، لیکن اس میں کسی فرقہ کسی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے، کیونکہ انبیاء کے لئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہوسکتا کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کا انتخاب فرمایا ہے خود اسی میں کوتاہی کر بیٹھیں، یہ تو فرضِ منصبی میں کھلی ہوئی خیانت ہے جو عام شریف انسانوں سے بھی بعید ہے، اس کوتاہی سے بھی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوا تو پھر دوسرے گناہوں سے عصمت بے فائدہ ہے۔

قرآن وسنت کے مُسلّمہ اُصول اور اجماعی عقیدہ عصمتِ انبیاء کے بظاہر خلاف اگر کسی جگہ قرآن وحدیث میں بھی کوئی بات نظر آتی تو اصولِ مُسلّمہ کی رو سے ضروری تھا کہ اس کی تفسیر ومعنیٰ کی ایسی توجیہ تلاش کی جاتی، جس سے وہ قرآن وحدیث کے قطعی الثبوت اصول سے متصادم ومختلف نہ رہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ مصنفِ موصوف نے جس بات کو قرآنی اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات کے حوالہ سے پیش کیا ہے وہ صحیفۂ یونس میں ہو تو ہو جس کا اہلِ اسلام میں کوئی اعتبار نہیں، قرآنی اشارہ تو ایک بھی نہیں، بلکہ ہوا یہ کہ کئی مقدّمے جوڑ کر یہ نتیجہ زبردستی نکالا گیا ہے، پہلے تو یہ فرض کرلیا گیا کہ قومِ یونس علیہ السلام سے عذاب کا ٹل جانا خدائی دستور کے خلاف واقع ہوا جو خود اسی آیت کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے اور اہلِ تحقیق ائمۂ تفسیر کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، اس کے ساتھ یہ فرض کرلیا گیا کہ خدائی قانون کو اس موقع پر اس لئے توڑا گیا تھا کہ خود پیغمبر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص وقت نکلنے کا مقرر کر دیا گیا تھا، وہ اس وقت مقرر سے پہلے فریضۂ دعوت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگر ذرا بھی غور وانصاف سے کام لیا جائے تو ثابت ہوجائے گا کہ قرآن وحدیث کا کوئی اشارہ ان فرضی مقدمات کی طرف نہیں پایا جاتا۔

خود آیتِ قرآن کے سیاق پر غور کیجئے تو الفاظ آیت کے یہ ہیں:

فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ

جس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ دنیا کے عام بستی والوں کے متعلق بطور اظہارِ افسوس یہ ارشاد ہے کہ وہ ایسے کیوں نہ ہوگئے کہ ایمان اس وقت لے آتے جس وقت تک ایمان مقبول اور نافع ہوتا ہے یعنی عذاب میں یا موت میں مبتلا ہونے سے پہلے پہلے ایمان لے آتے تو ان کا ایمان قبول ہوجاتا، مگر قومِ یونس اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ آثارِ عذاب دیکھ کر عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی ایمان لے آئی تو ان کا ایمان اور توبہ قبول ہوگئی۔

آیت کا یہ واضح مفہوم خود بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی خدائی قانون نہیں توڑا گیا بلکہ عین خدائی دستور کے مطابق ان

کا ایمان اور توبہ قبول کر لی گئی ہے۔

اکثر مفسرین بحرِ محیط، قرطبی، زمخشری، مظہری، روح المعانی وغیرہ نے آیت کا یہی مفہوم لکھا ہے جس میں قومِ یونس کی توبہ قبول ہونا عام قانونِ الٰہی کے تحت ہے، قرطبی کے الفاظ یہ ہیں:

وَقَالَ ابْنُ جُبَيْرٍ غَشِيَهُمُ الْعَذَابُ كَمَا يَغْشَى الثَّوْبُ الْقَبْرَ فَلَمَّا صَحَّتْ تَوْبَتُهُمْ رَفَعَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الْعَذَابَ وَقَالَ الطَّبْرِيُّ خُصَّ قَوْمُ يُوْنُسَ مِنْ بَيْنِ سَائِرِ الْاُمَمِ بِاَنْ تِيْبَ عَلَيْهِمْ بَعْدَ مُعَايَنَةِ الْعَذَابِ وَذُكِرَ ذٰلِكَ عَنْ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْمُفَسِّرِيْنَ وَقَالَ الزُّجَاجُ اِنَّهُمْ لَمْ يَقَعْ بِهِمِ الْعَذَابُ وَاِنَّمَا رَاَوُا الْعَلَامَةَ الَّتِيْ تَدُلُّ عَلَى الْعَذَابِ وَلَوْ رَاَوْا عَيْنَ الْعَذَابِ لَمَا نَفَعَهُمْ اِيْمَانُهُمْ۔ قُلْتُ قَوْلُ الزُّجَاجِ حَسَنٌ فَاِنَّ الْمُعَايَنَةَ الَّتِيْ لَا تَنْفَعُ التَّوْبَةُ مَعَهَا هِيَ التَّلَبُّسُ بِالْعَذَابِ كَقِصَّةِ فِرْعَوْنَ وَلِهٰذَا جَاءَ بِقِصَّةِ قَوْمِ يُوْنُسَ عَلٰى اَثَرِ قِصَّةِ فِرْعَوْنَ وَيُعَضِّدُ هٰذَا قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ (اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ) وَالْغَرْغَرَةُ الْحَشْرَجَةُ وَذٰلِكَ هُوَ حَالُ التَّلَبُّسِ بِالْمَوْتِ وَقَدْ رُوِيَ مَعْنٰى مَا قُلْنَاهُ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (اِلٰی) وَهٰذَا يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ تَوْبَتَهُمْ قَبْلَ رُؤْيَةِ الْعَذَابِ (اِلٰی) وَعَلٰى هٰذَا فَلَا اِشْكَالَ وَلَا تَعَارُضَ وَلَا خُصُوْصَ۔

(ترجمہ) ابن جریر کہتے ہیں کہ عذاب نے ان کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا جیسے قبر پر چادر پھر چونکہ ان کی توبہ صحیح ہوگئی (کہ وقوعِ عذاب سے پہلے تھی) تو ان کا عذاب اٹھا دیا گیا، طبری فرماتے ہیں کہ قومِ یونسؑ کو تمام اقوامِ عالَم سے یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ معاینۂ عذاب کے بعد ان کی توبہ قبول کر لی گئی، زجاج نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ابھی عذاب پڑا نہیں تھا بلکہ علاماتِ عذاب دیکھی تھیں اور اگر عذاب پڑ جاتا تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی، قرطبی فرماتے ہیں کہ زجاج کا قول اچھا اور بہتر ہے کیونکہ جس معاینہ عذاب کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی وہ وہ ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جائے جیسا واقعۂ فرعون میں پیش آیا اور اسی لئے اس سورۃ میں قومِ یونس کا واقعہ فرعون کے واقعہ کے بعد متصلاً ذکر فرمایا ہے تاکہ فرق واضح ہو جائے کہ فرعون کا ایمان ابتلاءِ عذاب کے بعد تھا، بخلاف قومِ یونسؑ کے کہ وہ وقوعِ عذاب سے پہلے ہی ایمان لے آئی، اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک وہ غرغرہ کی حالت میں نہ پہنچ جائے، اور غرغرہ موت کے وقت طاری ہونے والے سکرات کو کہتے ہیں، اور یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں بتلایا ہے کہ قومِ یونس نے وقوعِ عذاب سے پہلے توبہ کر لی تھی، قرطبی فرماتے ہیں کہ اس تقریر و تفسیر پر نہ کوئی اشکال ہے نہ تعارض نہ قومِ یونس کی تخصیص۔ [1]

اور طبری وغیرہ مفسرین نے بھی جو اس واقعہ کو قومِ یونسؑ کی خصوصیت بتلایا ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۸ ص:۳۸۴، ۳۸۵

کہ اس خصوصیت کا سبب یونس علیہ السلام کی کوتاہیاں تھیں بلکہ اس قوم کا سچے دل سے توبہ کرنا اور علم الٰہی میں مخلص ہونا وغیرہ وجوہات لکھی ہیں۔

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ قومِ یونس علیہ السلام کا عذاب ٹل جانا عام قانونِ قدرت کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ عین مطابق تھا تو اس کلام کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔

اسی طرح کسی قرآنی اشارے سے یہ ثابت نہیں کہ عذاب کی وعید سنانے کے بعد یونس علیہ السلام بغیر اذنِ خداوندی اپنی قوم سے الگ ہوگئے بلکہ سیاق آیات اور تفسیری روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا تمام سابق اُمتوں کے ساتھ معاملہ ہوتا آیا تھا کہ جب ان کی اُمت پر عذاب آنے کا فیصلہ کرلیا جاتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے ساتھیوں کو یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیتے تھے جیسا لوط علیہ السلام کا واقعہ بتصریح قرآن میں مذکور ہے، اسی طرح یہاں بھی جب اللہ کا یہ حکم یونس علیہ السلام کے ذریعہ ان لوگوں کو پہنچادیا گیا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا تو یونس علیہ السلام کا اس جگہ سے نکل جانا ظاہر یہی ہے کہ بامرِ خداوندی ہوا ہے۔

البتہ یونس علیہ السلام سے جو پیغمبرانہ شان کے اعتبار سے ایک لغزش ہوئی اور اس پر سورۂ انبیاء اور سورۂ صٰفّٰت کی آیتوں میں عتاب کے الفاظ آئے اور اسی کے نتیجہ میں مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ پیش آیا، وہ یہ نہیں کہ انہوں نے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کردی تھی بلکہ واقعہ وہ ہے جو اوپر مستند تفسیروں کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے حکم کے مطابق تین دِن کے بعد عذاب کے آنے کی وعید سنادی اور پھر باذنِ الٰہی اپنی جگہ کو چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ عذاب نہیں آیا تو اب یونس علیہ السلام کو اس کی فکر لاحق ہوئی کہ میں اپنی قوم میں واپس جاؤں گا تو جھوٹا قرار دیا جاؤں گا اور اس قوم کا یہ دستور تھا کہ جس کا جھوٹ ثابت ہوجائے اس کو قتل کردیں تو اب اپنی قوم کی طرف لوٹ کر جانے میں جان کا بھی اندیشہ ہوا، ایسے وقت بجز اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ اب اس وطن ہی سے ہجرت کر جائیں لیکن سنت انبیاء علیہم السلام کی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ آجائے محض اپنی رائے سے ہجرت نہیں کرتے تو یونس علیہ السلام کی لغزش یہ تھی کہ اللہ کی اجازت آنے سے پہلے ہجرت کا قصد کرکے کشتی پر سوار ہوگئے جو اگرچہ اپنی ذات میں کوئی گناہ نہیں تھا مگر سنتِ انبیاء سے مختلف تھا، اگر آیاتِ قرآن کے الفاظ میں غور کریں تو یونس علیہ السلام کی لغزش فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں بلکہ قوم کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے ہجرت قبل الاذن کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوگی، سورۂ صٰفّٰت کی آیت اس مضمون کے لئے تقریباً صریح ہے، جس میں فرمایا ہے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ [۱] اس میں بقصدِ ہجرت کشتی پر سوار ہونے کو اَبَقَ کے لفظ سے بطور عتاب کے تعبیر کیا گیا ہے،

[۱] ترجمہ: جبکہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے۔

جس کے معنی ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ جانا اور سورۂ انبیاء کی آیت میں ہے وَذَاالنُّوْنِ اِذْذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ [۱] (الانبیاء: ۸۷) جس میں طبعی خوف کی بناء پر قوم سے جان بچا کر ہجرت کرنے کو بطور عتاب کے اس شدید عنوان سے بیان فرمایا ہے، اور یہ سب فرائض رسالت کی مکمل ادائیگی کے بعد اس وقت پیش آیا جبکہ اپنی قوم میں واپس جانے سے جان کا خطرہ لاحق ہوگیا، تفسیر روح المعانی میں یہی مضمون بالفاظِ ذیل لکھا ہے:

اَیْ غَضْبَانَ عَلٰی قَوْمِهٖ لِشِدَّةِ شَكِيْمَتِهِمْ وَتَمَادِیْ اِصْرَارِهِمْ مَعَ طُوْلِ دَعْوَتِهٖ اِيَّاهُمْ وَكَانَ ذِهَابُهٗ هٰذَا هِجْرَةً عَنْهُمْ لٰكِنَّهٗ لَمْ يُؤْمَرْ بِهٖ۔ (روح المعانی ج:۱۷ ص:۱۰۹) [۲]

''یعنی یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اس لئے چل دیئے کہ قوم کی شدید مخالفت اور اپنے کفر پر اصرار کے باوجود زمانہ دراز تک دعوت رسالت پہنچاتے رہنے کا مشاہدہ کر چکے تھے اور ان کا یہ سفر ہجرت کے طور پر تھا مگر ابھی تک ان کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔''

اس میں واضح کر دیا ہے کہ دعوت و رسالت میں کوئی کوتاہی سببِ عتاب نہیں تھی بلکہ قبل از اجازت ہجرت کرنا سببِ عتاب بنا ہے جو فی نفسہٖ کوئی گناہ نہ تھا مگر سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عتاب آیا ہے، معاصر موصوف کو بعض علماء نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا تو سورۂ صٰفّٰت کی تفسیر میں انہوں نے اپنے موقف کی حمایت و تائید میں بہت سے مفسرین کے اقوال بھی نقل فرمائے ہیں جن میں وہب بن منبّہ وغیرہ کی بعض اسرائیلی روایتوں کے سوا کسی سے ان کا یہ موقف صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے معاذ اللہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔

اور یہ بات اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ عام طور پر حضراتِ مفسرین اپنی تفسیروں میں اِسرائیلی روایات بھی نقل کر دیتے ہیں جن کے بارے میں ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ روایات مستند و معتبر نہیں، کسی حکمِ شرعی کا ان پر مدار نہیں رکھا جا سکتا، اسرائیلی روایات خواہ مفسرینِ اسلام کی کتابوں میں ہوں یا صحیفۂ یونسؑ میں صرف انہیں کے سہارے حضرت یونس علیہ السلام پر یہ بہتانِ عظیم لگایا جا سکتا ہے کہ ان سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور کسی مفسرِ اسلام نے اس کو قبول نہیں کیا، وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَبِهٖ اَسْتَغِيْثُ اَنْ يَّعْصِمَنَا مِنَ الْخَطَايَا وَالزَّلَّاتِ۔

حضرت یونس علیہ السلام کا مفصل واقعہ

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں مذکور ہے اور کچھ روایاتِ حدیث و تاریخ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عراق میں موصل کے مشہور مقام نینویٰ میں بستی تھی، ان کی تعداد قرآن

[۱] ترجمہ: اور مچھلی والے کا تذکرہ کیجئے جب وہ خفا ہو کر چل دیئے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر کوئی دار و گیر نہ کریں گے۔

[۲] روح المعانی تحت سورة الأنبياء آية:۸۷، ج:۱۲ ص:۴۵۱۔

کریم میں ایک لاکھ سے زیادہ بتائی ہے ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا، حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ تین دن کے اندر اندر تم پر عذاب آنے والا ہے، حضرت یونسؑ نے قوم میں اس کا اعلان کر دیا، قوم یونس نے آپس میں مشورہ کیا تو اس پر سب کا اتفاق ہوا کہ ہم نے کبھی یونس علیہ السلام کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا اس لئے ان کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، مشورہ میں یہ طے ہوا کہ یہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو ہمارے اندر اپنی جگہ مقیم رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہوگا اور اگر وہ یہاں سے کہیں چلے گئے تو یقین کر لو کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا، حضرت یونس علیہ السلام بارشادِ خداوندی رات کو اس بستی سے نکل گئے، صبح ہوئی تو عذابِ الٰہی ایک سیاہ دھوئیں اور بادل کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلانے لگا اور فضاء آسمانی سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں، یہ دیکھ کر حضرت یونسؑ کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر مشرف بایمان ہو جائیں اور پچھلے انکار سے توبہ کر لیں مگر یونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی اخلاصِ نیت کے ساتھ توبہ واستغفار میں لگ گئے، بستی سے ایک میدان میں نکل آئے، عورتیں بچے اور جانور سب اس میدان میں جمع کر دیئے گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن کر عجز وزاری کے ساتھ اس میدان میں توبہ کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پورا میدان آہ وبکا سے گونجنے لگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور عذاب ان سے ہٹا دیا جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ یہ عاشوراء یعنی دسویں محرم کا دن تھا۔ [1]

ادھر حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر اس انتظار میں تھے کہ اب اس قوم پر عذاب نازل ہوگا، ان کے توبہ واستغفار کا حال ان کو معلوم نہ تھا، جب عذاب ٹل گیا تو ان کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دیا جائے گا کیونکہ میں نے اعلان کیا تھا کہ تین دن کے اندر عذاب آجائے گا، اس قوم میں قانون یہ تھا کہ جس شخص کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ اپنے کلام پر کوئی شہادت نہ پیش کرے تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا، یونس علیہ السلام کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام ہر گناہ ومعصیت سے معصوم ہوتے ہیں مگر انسانی فطرت وطبیعت سے جدا نہیں ہوتے، اس وقت یونس علیہ السلام کو طبعی طور پر یہ ملال ہوا کہ میں نے بحکمِ الٰہی اعلان کیا تھا اور اب میں اعلان کی وجہ سے جھوٹا قرار دیا جاؤں گا، اپنی جگہ واپس جاؤں تو کس منہ سے جاؤں اور قوم کے قانون کے مطابق گردن زدنی بنوں، اس رنج وغم اور پریشانی کے عالم میں اس شہر سے نکل جانے کا ارادہ کر کے چل دیئے یہاں تک کہ بحرِ روم کے کنارہ پر پہنچ گئے وہاں ایک کشتی دیکھی جس میں لوگ سوار ہو رہے تھے، یونس علیہ السلام کو ان لوگوں نے پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا، کشتی روانہ ہو کر جب وسطِ دریا میں پہنچ گئی تو دفعۃً ٹھہر گئی، نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے چلتی ہے، کشتی والوں نے منادی کی کہ ہماری اس کشتی کی

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۵۴۰۵

من جانب اللہ یہی شان ہے کہ جب اس میں کوئی ظالم گناہگار یا بھاگا ہوا غلام سوار ہو جاتا ہے تو یہ کشتی خود بخود رک جاتی ہے، اس آدمی کو ظاہر کر دینا چاہئے تا کہ ایک آدمی کی وجہ سے سب پر مصیبت نہ آئے۔

حضرت یونس علیہ السلام بول اٹھے کہ وہ بھاگا ہوا غلام گناہگار میں ہوں، کیونکہ اپنے شہر سے غائب ہو کر کشتی میں سوار ہونا ایک طبعی خوف کی وجہ سے تھا باذنِ الٰہی نہ تھا، اس بغیر اذن کے اس طرف آنے کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان نے ایک گناہ قرار دیا کہ پیغمبر کی کوئی نقل وحرکت بلا اذن کے نہ ہونی چاہئے تھی اس لئے فرمایا کہ مجھے دریا میں ڈال دو تو تم سب اس عذاب سے بچ جاؤ گے، کشتی والے اس پر تیار نہ ہوئے بلکہ انہوں نے قرعہ اندازی کی تا کہ قرعہ میں جس کا نام نکل آئے اس کو دریا میں ڈالا جائے، اتفاقاً قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا، ان لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تو کئی مرتبہ قرعہ اندازی کی ہر مرتبہ بحکم قضاء وقدر حضرت یونس علیہ السلام کا ہی نام آتا رہا، قرآنِ کریم میں اس قرعہ اندازی اور اس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلنے کا ذکر موجود ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿١٤١﴾ [1] (الصافات)

یونس علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ان کے مخصوص پیغمبرانہ مقام کی وجہ سے تھا کہ اگرچہ انہوں نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی جس کو گناہ اور معصیت کہا جاتا ہے اور کسی پیغمبر سے اس کا امکان نہیں، کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں لیکن پیغمبر کے مقامِ بلند کے مناسب نہ تھا کہ محض خوفِ طبعی سے کسی جگہ بغیر اذنِ خداوندی منتقل ہو جاویں، اس خلافِ شان عمل پر بطورِ عتاب یہ معاملہ کیا گیا۔

اس طرف قرعہ میں نام نکل کر دریا میں ڈالے جانے کا سامان ہو رہا تھا دوسری طرف ایک بہت بڑی مچھلی بحکمِ خداوندی کشتی کے قریب منہ پھیلائے ہوئے لگی ہوئی تھی کہ یہ دریا میں آئیں تو ان کو اپنے پیٹ میں جگہ دے، جس کو حق تعالیٰ نے پہلے سے حکم دے رکھا کہ یونس علیہ السلام کا جسم جو تیرے پیٹ کے اندر رکھا جائے گا یہ تیری غذا نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کا مسکن بنایا ہے، یونس علیہ السلام دریا میں گئے تو فوراً اس مچھلی نے منہ میں لے لیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یونس علیہ السلام اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز رہے یہ ان کو زمین کی تہ تک لے جاتی اور دُور دراز کی مسافتوں میں پھراتی رہی، بعض حضرات نے سات، بعض نے پانچ دن اور بعض نے ایک دن کے چند گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت بتلائی ہے (مظہری) [2] حقیقتِ حال حق تعالیٰ کو معلوم ہے، اس حالت میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ دُعا کی لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿٨٧﴾ [3] (الانبیاء) اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو قبول فرمالیا اور بالکل صحیح وسالم حضرت یونس علیہ السلام کو دریا کے کنارے پر ڈال دیا۔

مچھلی کے پیٹ کی گرمی سے ان کے بدن پر کوئی بال نہ رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب ایک کدّو (لوکی) کا

---

[1] ترجمہ: سو یونس بھی شریکِ قرعہ ہوئے تو یہی ملزم ٹھہرے۔ [2] التفسیر المظہری تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۵۸

[3] ترجمہ: آپ کے سوا کوئی معبود نہیں آپ پاک ہیں میں بے شک قصوروار ہوں۔

درخت اگا دیا، جس کے پتوں کا سایہ بھی حضرت یونس علیہ السلام کے لئے ایک راحت بن گئی، اور ایک جنگلی بکری کو اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرما دیا کہ وہ صبح وشام ان کے پاس آ کھڑی ہوتی اور وہ اس کا دودھ پی لیتے تھے۔

اس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو اس لغزش پر تنبیہ بھی ہوگئی، اور بعد میں ان کی قوم کو بھی پورا حال معلوم ہو گیا۔

اس قصہ میں جتنے اجزاء قرآن میں مذکور یا مستند روایاتِ حدیث سے ثابت ہیں وہ تو یقینی ہیں باقی اجزاء تاریخی روایات کے ہیں جن پر کسی شرعی مسئلہ کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ

اور اگر تیرا رَبّ چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے تمام، اب کیا تو زبردستی کرے گا

النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ

لوگوں پر کہ ہوجائیں باایمان، اور کسی سے نہیں ہوسکتا کہ ایمان لائے

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

مگر اللہ کے حکم سے، اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو نہیں سوچتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو رُوئے زمین پر بسنے والے سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرو گے تاکہ وہ سب مؤمن بن جائیں؟ ﴿۹۹﴾ اور کسی بھی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر مؤمن بن جائے، اور جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے، اللہ ان پر گندگی مسلط کر دیتا ہے۔ ﴿۱۰۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (ان اقوام وقریٰ کی کیا تخصیص ہے) اگر آپ کا رَبّ چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ نہ چاہا اس لئے سب ایمان نہیں لائے) سو (جب یہ بات ہے تو) تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آئیں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدوں خدا کے حکم (یعنی مشیت)

کے ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر (کفر کی) گندگی واقع کردیتا ہے (یعنی وہ تعلق مشیت بسبب ان کے جہل بسیط یا مرکب کے ہوتا ہے، گو اس کا سلسلہ بھی مشیت وحکمت تک پہنچتا ہے)۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ

تو کہہ دیکھ تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈرانے والے

عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا

ان لوگوں کو جو نہیں مانتے، سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہی کے سے دن جو گزر چکے ہیں

مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ

ان سے پہلے، تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ راہ دیکھتا ہوں، پھر ہم بچالیتے ہیں

رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۵

اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے اسی طرح ذمہ ہے ہمارا، بچالیں گے ایمان والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) ان سے کہو کہ: ''ذرا نظر دوڑاؤ کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کیا چیزیں ہیں؟'' لیکن جن لوگوں کو ایمان لانا ہی نہیں ہے، اُن کے لئے (زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی) نشانیاں اور آگاہ کرنے والے (پیغمبر) کچھ بھی کارآمد نہیں ہوتے۔ ﴿۱۰۱﴾ بھلا بتاؤ کہ یہ لوگ (ایمان لانے کے لئے) اس کے سوا کس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ اُس طرح کے دن یہ بھی دیکھیں جیسے ان سے پہلے کے لوگوں نے دیکھے تھے؟ کہہ دو کہ: ''اچھا! تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں'' ﴿۱۰۲﴾ پھر (جب عذاب آتا ہے تو) ہم اپنے پیغمبروں کو اور جو لوگ ایمان لے آتے ہیں، ان کو نجات دے دیتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے یہ بات اپنے ذمے لے رکھی ہے کہ ہم تمام (دوسرے) مؤمنوں کو بھی نجات دیں۔ ﴿۱۰۳﴾

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمان میں اور زمین میں، (آسمان میں ستارے

وغیرہ اور زمین میں بے انتہا مخلوق نظر آتی ہے یعنی ان میں غور کرنے سے توحید کی دلیل عقلی حاصل ہوگی، یہ بیان ہوا ان کے مکلّف ہونے کا) اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے (یہ بیان ہوا ان کے عناد کا) سو (ان کی اس حالتِ عناد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (بدلالتِ حال) صرف ان لوگوں کے سے واقعات کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (یعنی باوجود دلائل اور وعیدوں کے جو ایمان نہیں لاتے تو ان کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے جو ایسے عذاب کا منتظر ہو جو کہ پہلی قوموں پر آیا تھا سو) آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو تم (اس کے) انتظار میں رہو میں بھی تمہارے ساتھ (اس کے) انتظار کرنے والوں میں ہوں (جن گزشتہ قوموں کا اوپر ذکر تھا ہم ان پر تو عذاب واقع کرتے تھے) پھر ہم (اس عذاب سے) اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو بچا لیتے تھے (جس طرح ان مؤمنین کو ہم نے نجات دی تھی) ہم اسی طرح سب ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں یہ (حسبِ وعدہ) ہمارے ذمہ ہے (پس اسی طرح اگر ان کفار پر کوئی افتاد پڑی تو مسلمان اس سے محفوظ رہیں گے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں)۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ

کہہ دے اے لوگو! اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جن کی

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ

تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو اور مجھ کو حکم ہے

اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ

کہ رہوں ایمان والوں میں، اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا دین پر حنیف ہوکر

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ

اور مت ہو شرک والوں میں، اور مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا

وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ

اور نہ بُرا پھر اگر تو ایسا کرے تو تُو بھی اس وقت ہو ظالموں میں، اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ

بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ

کچھ تکلیف تو کوئی نہیں اس کو ہٹانے والا اس کے سوا، اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو،

يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

پہنچائے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں، اور وہی ہے بخشنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) ان سے کہو کہ: ''اے لوگو! اگر تم میرے دِین کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو تو (سن لو کہ) تم اللہ کے سوا جن جن کی عبادت کرتے ہو میں اُن کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ میں اُس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری رُوح قبض کرتا ہے۔ اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مؤمنوں میں شامل رہوں۔ ﴿۱۰۴﴾ اور (مجھ سے) یہ (کہا گیا ہے) کہ: ''اپنا رُخ یکسوئی کے ساتھ اس دِین کی طرف قائم رکھنا، اور ہرگز اُن لوگوں میں شامل نہ ہونا جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مانتے ہیں۔ ﴿۱۰۵﴾ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی ایسے (من گھڑت معبود) کو نہ پکارنا جو تمہیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے، نہ کوئی نقصان۔ پھر بھی اگر تم (بفرضِ محال) ایسا کر بیٹھے تو تمہارا شمار بھی ظالموں میں ہوگا۔'' ﴿۱۰۶﴾ اور اگر تمہیں اللہ کوئی تکلیف پہنچادے تو اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جو اُسے دُور کردے، اور اگر وہ تمہیں کوئی بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرلے تو کوئی نہیں ہے جو اُس کے فضل کا رُخ پھیردے۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، پہنچادیتا ہے، اور وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۰۷﴾

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک (اور تردّد) میں ہو تو (میں تم کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ) میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، لیکن ہاں اس معبود کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے اور مجھ کو (منجانب اللہ) یہ حکم ہوا ہے کہ میں (ایسے معبود پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور (مجھ کو) یہ (حکم ہوا ہے) کہ اپنے آپ کو اس دین (مذکور توحید خالص) کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جاؤ، اور کبھی مشرک مت بننا اور (یہ حکم ہوا ہے کہ) خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر

ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ (عبادت کرنے کی حالت میں) کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ (ترکِ عبادت کی حالت میں) کوئی ضرر پہنچا سکے پھر اگر (بالفرض) ایسا کیا (یعنی غیر اللہ کی عبادت کی) تو اس حالت میں (اللہ کا) حق ضائع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے اور (مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ) اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچاوے تو بجز اس کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں (بلکہ) وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والے ہیں (اور فضل کے تمام افراد مغفرت اور رحمت میں داخل ہیں اور وہ مغفرت اور رحمتِ عظیمہ کے ساتھ موصوف ہیں پس لامحالہ صاحبِ فضل بھی ہیں)۔

قُلْ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى

کہہ دے اے لوگو! پہنچ چکا حق تم کو تمہارے رَبّ سے، اب جو کوئی راہ پر آئے

فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ أَنَا عَلَيْكُمْ

سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو، اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے بُرے کو، اور میں تم پر نہیں ہوں

بِوَكِيْلٍ ۗ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ

مختار، اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ

ع ۱۱ / ۱۶ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ: ''لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق آ گیا ہے۔ اب جو شخص ہدایت کا راستہ اپنائے گا، وہ خود اپنے فائدے کے لئے اپنائے گا، اور جو گمراہی اختیار کرے گا، اُس کی گمراہی کا نقصان خود اُسی کو پہنچے گا، اور میں تمہارے کاموں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔'' ﴿۱۰۸﴾ اور جو وحی تمہارے پاس بھیجی جا رہی ہے، تم اُس کی اتباع کرو، اور صبر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ کوئی فیصلہ کر دے، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ﴿۱۰۹﴾

خلاصہ تفسیر

آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس (دینِ) حق تمہارے ربّ کی طرف سے (بدلیل) پہنچ چکا ہے سو (اس کے پہنچ جانے کے بعد) جو شخص راہِ راست پر آجاوے گا سو وہ اپنے (نفع کے) واسطے راہِ راست پر آوے گا، اور جو شخص (اب بھی) بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال بھی) اُسی پر پڑے گا اور میں تم پر (کچھ بطور ذمہ داری کے) مسلط نہیں کیا گیا (کہ تمہاری بے راہی کی بازپُرس مجھ سے ہونے لگے تو میرا کیا نقصان ہے) اور آپ اس کا اتباع کرتے رہئے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے (اس میں سب اعمال کے ساتھ تبلیغ بھی آگئی) اور (ان کے کفر وایذاء پر) صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (ان کا) فیصلہ کر دیں گے (خواہ دنیا میں ہلاکت کے ساتھ خواہ آخرت میں عذاب کے ساتھ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی اور منصبی کام میں لگے رہئے، ان کی فکر نہ کیجئے) اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہے۔

***

سُوْرَةُ هُوْدٍ

آياتها ۱۲۳ | ۱۱ سُوْرَةُ هُوْدٍ مَّكِّيَّةٌ ۵۲ | ركوعاتها ۱۰

سورۂ ہود مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو تیئیس آیتیں ہیں اور دس رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ ﴿۱﴾

یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے،

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا

کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی، میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں اور یہ کہ گناہ بخشواؤ

رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

اپنے رَبّ سے پھر رجوع کرو اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے تم کو اچھا فائدہ ایک وقت مقرر تک

وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی، اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں ڈرتا ہوں تم پر

عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴

ایک بڑے دن کے عذاب سے، اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے،

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ اَلَا حِيْنَ

سنتا ہے وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے سینے تاکہ چھپائیں اس سے، سنتا ہے جس وقت

يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ

اوڑھتے ہیں اپنے کپڑے جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں، وہ تو جاننے والا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵

دلوں کی بات۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الۗرٰ۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتوں کو (دلائل سے) مضبوط کیا گیا ہے، پھر ایک ایسی ذات کی طرف سے اُن کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو حکمت کی مالک اور ہر بات سے باخبر ہے۔ ۝۱ (یہ کتاب پیغمبر کو حکم دیتی ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہیں) کہ: "اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں اُس کی طرف سے تمہیں آگاہ کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں۔" ۝۲ اور یہ (ہدایت دیتا ہوں) کہ: "اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اُس کی طرف رُجوع کرو، وہ تمہیں ایک مقرر وقت تک (زندگی سے) اچھا لطف اُٹھانے کا موقع دے گا، اور ہر اُس شخص کو جس نے زیادہ عمل کیا ہوگا، اپنی طرف سے زیادہ اجر دے گا۔ اور اگر تم نے منہ موڑا تو مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ ۝۳ اللہ ہی کے

پاس تمہیں لوٹ کر جانا ہے، اور وہ ہر چیز کی پوری قدرت رکھتا ہے'' ④ دیکھو، یہ (کافر) لوگ اپنے سینوں کو اُس سے چھپنے کے لئے دُہرا کر لیتے ہیں۔ یاد رکھو جب یہ اپنے اُوپر کپڑے لپیٹتے ہیں، اللہ اُن کی وہ باتیں بھی جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں، اور وہ بھی جو یہ علی الاعلان کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کا (بھی) پورا پورا علم رکھتا ہے ⑤

خلاصۂ تفسیر

الٓر (کے معنی تو اللہ کو معلوم) یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف (بھی) بیان کی گئی ہیں (اور وہ کتاب ایسی ہے کہ) ایک حکیم باخبر (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف سے (آئی ہے جس کا بڑا مقصد) یہ (ہے) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو میں تم کو اللہ کی طرف سے (ایمان نہ لانے پر عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان لانے پر ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں اور (اس کتاب کے مقاصد میں سے) یہ (بھی ہے) کہ تم لوگ اپنے گناہ (شرک وکفر وغیرہ) اپنے رَبّ سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عملِ صالح کرو، پس ایمان وعملِ صالح کی برکت سے) وہ تم کو وقتِ مقررہ (یعنی وقتِ موت) تک (دُنیا میں) خوش عیشی دے گا اور (آخرت میں) ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا (یہ کہنا بھی بمنزلہ بشیر کے کہنے کے ہے) اور اگر (ایمان لانے والے) تم لوگ اعراض (ہی) کرتے رہے تو مجھ کو (اس صورت میں) تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ کہنا بمنزلہ نذیر کے کہنے کے ہے، اور عذاب کو مستبعد مت سمجھو کیونکہ) تم (سب) کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ ہر شئ پر پوری قدرت رکھتا ہے (پھر استبعاد کی کوئی وجہ نہیں البتہ اگر وہاں تمہاری حاضری نہ ہوتی یا نعوذ باللہ اس کو قدرت نہ ہوتی تو عذاب واقع نہ ہوتا پس ایسی حالت میں ایمان اور توحید سے اعراض نہ کرنا چاہئے، آگے علمِ الٰہی کا اثبات ہے، اور ایسا علم وقدرت دونوں دلیلِ توحید ہیں) یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کئے دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں (یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میں جو باتیں کرتے ہیں تو اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو جاوے اور جس کو اعتقاد ہوگا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے اور آپ کا صاحبِ وحی ہونا دلائل سے ثابت ہے، پس وہ اخفاء کی ایسی تدبیر کبھی نہ کرے گا کیونکہ ایسی تدبیر کرنا گویا بدلالت حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرنا ہے سو) یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت (دوہرے ہوکر) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے ہیں (کیونکہ) بالیقین وہ (تو) دِلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے (تو زبان سے کہی ہوئی تو کیوں نہ جانے گا)۔

معارف و مسائل

سورۂ ہود اُن سورتوں میں سے ہے جن میں پچھلی قوموں پر نازل ہونے والے قہرِ الٰہی اور مختلف قسم کے عذابوں کا اور پھر قیامت کے ہولناک واقعات اور جزا و سزا کا ذکر خاص انداز میں آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں کچھ بال سفید ہوگئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بطور اظہارِ رنج کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، اور بعض روایات میں سورۂ ہود کے ساتھ سورۂ واقعہ اور مرسلات اور عم یتساءلون اور سورۂ تکویر کا بھی ذکر ہے۔ (رواہ الحاکم والترمذی) [۱]

مطلب یہ تھا کہ ان واقعات کے خوف و دہشت کی وجہ سے بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوگئے۔

اس کی پہلی آیت کو الٓرٰ سے شروع کیا گیا ہے، یہ ان حروف میں سے ہیں جن کی مراد اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے درمیان راز ہے دوسروں کو اس پر مطلع نہیں کیا گیا، ان کو اس کی فکر میں پڑنے سے بھی روکا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو مُحْكَمْ بنایا گیا ہے، لفظ مُحْكَمْ اِحْكَام سے بنا ہے، جس کے معنٰی یہ ہیں کہ کسی کلام کو ایسا دُرست کیا جائے جس میں کسی لفظی اور معنوی غلطی یا فساد کا احتمال نہ رہے، اس بناء پر آیات کے محکم بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ان آیات کو ایسا بنایا ہے کہ ان میں کسی لفظی غلطی یا معنوی فساد اور خلل یا باطل کا کوئی اِمکان و احتمال نہیں۔ (قرطبی) [۲]

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مُحْكَمْ اس جگہ مَنْسُوْخ کے مقابلہ میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے مجموعی حیثیت سے محکم غیر منسوخ بنایا ہے یعنی جس طرح پچھلی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ نزولِ قرآن کے بعد منسوخ ہوگئیں، اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد چونکہ سلسلۂ نبوّت و وحی ہی ختم ہوگیا اس لئے یہ کتاب تا قیامت منسوخ نہ ہوگی (قرطبی)۔ [۳] اور قرآن کی بعض آیات کا خود قرآن ہی کے ذریعہ منسوخ ہوجانا اس کے منافی نہیں۔

اسی آیت میں قرآن کی دوسری شان یہ بتلائی گئی ثُمَّ فُصِّلَتْ یعنی پھر ان آیات کی تفصیل کی گئی، تفصیل کے اصلی معنٰی یہ ہیں کہ دو چیزوں کے درمیان فصل و امتیاز کیا جائے، اِسی لئے عام کتابوں میں مختلف مضامین کو فصل فصل کے عنوان

---

[۱] المستدرك للحاكمؒ رقم الحديث: ۳۲۷۲، وجامع الترمذي، ابواب التفسير، باب ومن سورة الواقعة ج:۲ ص:۱۶۵

[۲] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۹ ص:۲   [۳] تفسير القرطبي بحوالۂ بالا۔

سے بیان کیا جاتا ہے، اِس جگہ تفصیل آیات سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق وغیرہ مضامین کی آیات کو جدا جدا کر کے واضح بیان فرمایا گیا ہے۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو بیک وقت پورا کا پورا لوحِ محفوظ میں ثبت کردیا گیا تھا مگر پھر مختلف قوموں اور ملکوں کے حالات وضروریات کے تحت بہت سی قسطوں میں تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا گیا تاکہ اس کا حفظ بھی آسان ہو اور ان پر تدریجی عمل بھی سہل ہوجائے۔

اس کے بعد فرمایا مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ① یعنی یہ سب آیات ایک ایسی ہستی کی طرف سے آئی ہیں جو حکیم بھی ہے اور باخبر بھی، یعنی جس کے ہر فعل میں اتنی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں کہ انسان ان کا احاطہ نہیں کرسکتا اور وہ کائنات عالم کے ذرّہ ذرّہ موجودہ اور آئندہ سے پوری طرح باخبر ہے، ان کے سب حالات موجودہ وآئندہ کو جانتا ہے ان سب پر نظر کر کے اَحکام نازل فرماتا ہے، انسانوں کی طرح نہیں کہ وہ کتنے ہی عقل مند، ہوشیار، تجربہ کار ہوں مگر ان کی عقل ودانش ایک محدود دائرہ میں گھری ہوئی اور ان کا تجربہ صرف اپنے گردوپیش کی پیداوار ہوتا ہے جو بسااوقات آئندہ زمانہ اور آئندہ حالات میں ناکام وغلط ثابت ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں متذکرہ آیات کا بیان ایک سب سے اہم اور مقدم چیز سے شروع ہوتا ہے یعنی حق تعالیٰ کی توحید، ارشاد ہوتا ہے اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ یعنی ان آیات میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان میں سب سے اہم اور مقدم یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت اور پرستش نہ کی جائے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ② یعنی اِن آیات میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ سارے جہان کے لوگوں سے کہہ دیں کہ میں اللہ کی طرف سے تم کو ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں، مراد یہ ہے کہ نافرمانی اور اپنی ناجائز خواہشات کا اتباع کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں اور اطاعت شعار نیک لوگوں کو آخرت کی نعمتوں اور دونوں عالم کی راحتوں کی خوش خبری دیتا ہوں۔

نَذِيْرٌ کا ترجمہ ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ ڈرانے والے دشمن یا درندے یا دوسرے نقصان پہنچانے والوں کے لئے نہیں بولا جاتا، بلکہ نَذِيْر اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی اپنے عزیز کو شفقت ومحبت کی بناء پر ایسی چیزوں سے ڈرائے اور بچائے جو اس کے لئے دنیا یا آخرت یا دونوں میں مضرّت پہنچانے والی ہیں۔

تیسری آیت میں آیاتِ قرآنی کی ہدایات میں سے ایک دوسری ہدایت کا بیان اس طرح فرمایا ہے وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ یعنی ان آیاتِ محکمات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اپنے ربّ سے مغفرت اور معافی مانگا کریں اور توبہ کیا کریں، مغفرت کا تعلق پچھلے گناہوں سے ہے اور توبہ کا تعلق آئندہ ان کے

پاس نہ جانے کے عہد سے ہے، اور درحقیقت صحیح توبہ یہی ہے کہ پچھلے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی طلب کرے اور آئندہ ان کے نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آئندہ کو گناہ سے بچنے کا پختہ عزم اور اہتمام کئے بغیر محض زبان سے استغفار کرنا کذابین یعنی جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے، (قرطبی)[1] اور ایسے ہی استغفار کے متعلق بھی بعض حضرت نے فرمایا ہے کہ ؎

معصیت راخندہ می آید ز استغفارِ ما[2]

یا یہ کہ ایسی توبہ خود قابلِ توبہ ہے۔

اس کے بعد صحیح طور پر استغفار و توبہ کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی فلاح اور عیش و راحت کی خوشخبری اس طرح دی گئی ہے، يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی جن لوگوں نے صحیح طور پر اپنے پچھلے گناہوں سے استغفار کیا اور آئندہ ان سے بچنے کا پختہ عزم اور پورا اہتمام کیا تو صرف یہی نہیں کہ ان کی خطا بخش دی جائے گی بلکہ ان کو اچھی زندگی عطا کی جائے گی، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ زندگی عام ہے دنیا کی زندگی اور آخرت کی دائمی زندگی دونوں کو شامل ہے، جیسے ایک دوسری آیت میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ (النحل: ٩٧) یعنی ہم ضرور ان کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے، اس آیت کے متعلق بھی جمہور مفسرین کی تحقیق یہی ہے کہ دنیا و آخرت کی دونوں زندگیاں اس میں شامل ہیں، سورۂ نوح میں اس کی تصریح بھی اس طرح آگئی ہے کہ استغفار کرنے والوں کے متعلق یہ فرمایا ہے يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝١١ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝١٢ۭ یعنی اگر تم نے صحیح طور سے اللہ سے مغفرت مانگی تو اللہ تعالیٰ تم پر بارانِ رحمت نازل فرمائے گا اور تم کو مال و اولاد سے بامراد کرے گا اور تمہارے لئے باغات اور نہریں عطا فرمائے گا، ظاہر ہے کہ بارانِ رحمت اور مال و اولاد کا تعلق اسی حیاتِ دنیا سے ہے۔

اِسی لئے آیتِ مذکورہ میں متاعِ حسن کی تفسیر بھی اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ استغفار و توبہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت اور عیش کی سہولتیں عطا فرمائے گا اور آفتوں اور عذابوں سے تمہاری حفاظت کرے گا، اور چونکہ حیاتِ دُنیا کا ایک روز ختم ہو جانا لازمی ہے اور اس کی عیش و راحت قانونِ قدرت کے تحت دائمی نہیں ہوسکتی، اس لئے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فرما کر ہدایت کردی کہ دنیا میں پاکیزہ زندگی اور عیش کی سہولتیں ایک خاص میعاد یعنی موت تک حاصل رہیں گی، آخرکار موت ان سب چیزوں کا خاتمہ کردے گی۔

مگر اس موت کے فوراً بعد ہی دوسرے عالم کی زندگی شروع ہو جائے گی اور اس میں بھی توبہ و استغفار کرنے والوں کے لئے دائمی راحتیں میسر ہوں گی۔

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج: ٩ ص: ٣ [2] ترجمہ: ہمارے استغفار پر تو گناہ ہنس رہا ہوتا ہے۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ متاعِ حسن سے مراد یہ ہے کہ انسان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جائے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ متاعِ حسن یہ ہے کہ انسان موجود پر قناعت کرے، مفقود کے غم میں نہ پڑے یعنی دنیا جس قدر میسر ہو اس پر مطمئن ہو جائے جو حاصل نہیں اس کے غم میں نہ پڑے۔

دوسری خوشخبری توبہ و استغفار کرنے والوں کو یہ دی گئی کہ وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ اس میں پہلے فضل سے مراد انسان کا عمل صالح اور دوسرے فضل سے فضلِ خداوندی یعنی جنت ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر نیک عمل والے کو اللہ تعالیٰ اپنا فضل یعنی جنت عطا فرماویں گے۔

پہلے جملہ میں دنیا و آخرت دونوں میں متاعِ حسن یعنی اچھی زندگی کا وعدہ فرمایا ہے اور دوسرے جملہ میں جنت کی لازوال نعمتوں کا، آخرِ آیت میں اِرشاد فرمایا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ۝۳ یعنی اگر اس نصیحت و خیر خواہی سے منہ موڑا اور پچھلے گناہوں سے استغفار اور آئندہ ان سے بچنے کا اہتمام نہ کیا تو یہ اندیشہ قوی ہے کہ تم ایک بڑے دِن کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے بھی ایک ہزار سال کا دن ہوگا اور اس میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے اِعتبار سے بھی وہ سب سے بڑا دِن ہوگا۔

پانچویں آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں تم کچھ بھی کرو اور کسی طرح بھی بسر کرو مگر انجامِ کار مرنے کے بعد تمہیں خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد تمہارے سب ذرّات کو جمع کر کے تم کو از سرِ نو انسان بنا کر کھڑا کر دے۔

چھٹی آیت میں منافقین کے ایک گمانِ بد اور خیالِ فاسد کی تردید ہے کہ یہ لوگ اپنی عداوت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو اپنے نزدیک خوب چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے سینوں میں جو حسد و بغض کی آگ بھری ہوئی ہے اس پر ہر طرح کے پردے ڈالتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح ہمارا اصل حال کسی کو معلوم نہ ہوگا، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کپڑوں کی تہ میں پردوں کے پیچھے جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر سب کچھ روشن ہے، إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۵ کیونکہ وہ تو دِلوں کے پوشیدہ اسرار کو بھی خوب جانتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ

اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی اور جانتا ہے

مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ

جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے، سب کچھ موجود ہے کھلی کتاب میں، اور وہی ہے جس نے بنائے

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاۗءِ

آسمان اور زمین چھ دن میں اور تھا اس کا تخت پانی پر

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ

تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام، اور اگر تو کہے کہ تم اٹھوگے

مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷

مرنے کے بعد تو البتہ کافر کہنے لگیں یہ کچھ نہیں مگر جادو ہے کھلا ہوا،

وَلَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ

اور اگر ہم روکے رکھیں ان سے عذاب کو ایک مدت معلوم تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک دیا عذاب کو،

اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ

سنتا ہے جس دن آئے گا ان پر نہ پھیرا جائے گا ان سے اور گھیر لے گی ان کو

مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸ ع

وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمے نہ لے رکھا ہو۔ وہ اُس کے مستقل

ٹھکانے کو بھی جانتا ہے، اور عارضی ٹھکانے کو بھی۔ ہر بات ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ ⑥ اور وہی ہے جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ جبکہ اُس کا عرش پانی پر تھا۔ تاکہ تمہیں آزمائے کہ عمل کے اعتبار سے تم میں کون زیادہ اچھا ہے۔ اور اگر تم (لوگوں سے) یہ کہو کہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ یہ کہیں گے کہ یہ کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ⑦ اور اگر ہم ان لوگوں سے کچھ عرصے کے لئے عذاب کو مؤخر کردیں تو وہ یہی کہتے رہیں گے کہ: ''آخر کس چیز نے اس (عذاب) کو روک رکھا ہے؟'' ارے جس دن وہ عذاب آ گیا، تو وہ ان سے ٹلائے نہیں ٹلے گا، اور جس چیز کا یہ مذاق اُڑا رہے ہیں، وہ ان کو چاروں طرف سے گھیر لے گی۔ ⑧

خلاصۂ تفسیر

اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو (اور رزق رسانی کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے سو) وہ ہر ایک کی زیادہ رہنے کی جگہ کو اور چند روز رہنے کی جگہ کو جانتا ہے (اور ہر ایک کو وہاں ہی رزق پہنچاتا ہے، اور گو سب چیزیں علمِ الٰہی میں تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ہی) سب چیزیں کتاب مبین (یعنی لوحِ محفوظ) میں (بھی منضبط و مندرج) ہیں (غرض واقعات ہر طرح محفوظ ہیں، آگے تخلیق کا مع اس کی بعض حکمتوں کے بیان ہے جس سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، کیونکہ ابتدائی تخلیق دلیل ہے اس پر کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے) اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ سب آسمان اور زمین کو چھ دن (کی مقدار) میں پیدا کیا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا (کہ یہ دونوں چیزیں پہلے سے پیدا ہو چکی تھیں اور یہ پیدا کرنا اس لئے ہے) تاکہ تم کو آزماوے کہ (دیکھیں) تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے (مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کو پیدا کیا، تمہارے حوائج و منافع اس میں پیدا کئے تاکہ تم ان کو دیکھ کر توحید پر استدلال کرو اور ان سے منتفع ہو کر منعم کا شکر اور خدمت کہ عبارت ہے عملِ صالح سے، بجالاؤ، سو بعض نے ایسا کیا، بعض نے نہ کیا) اور اگر آپ (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یقیناً تم لوگ مرنے کے بعد (قیامت کے روز دوبارہ) زندہ کئے جاؤ گے تو (ان میں) جو لوگ کافر ہیں وہ (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ تو نرا صاف جادو ہے (جادو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باطل ہوتا ہے مگر مؤثر، اسی طرح قرآن کو نعوذ باللہ باطل سمجھتے تھے لیکن اس کے مضامین کا مؤثر ہونا بھی مشاہدہ کرتے تھے، اس مجموعہ پر یہ حکم کیا، نعوذ باللہ منہ، مقصود اِس سے آخرت کا انکار تھا، آگے ان کے منشاء انکار کا جواب ارشاد ہے) اور اگر تھوڑے دنوں تک (مراد دنیوی زندگی ہے) ہم ان سے عذابِ (موعود) کو ملتوی رکھتے ہیں (کہ اس میں حکمتیں ہیں) تو (بطور انکار و استہزاء کے) کہنے لگتے ہیں کہ (جب ہم تمہارے نزدیک مستحقِ عذاب ہیں تو) اس عذاب کو کون چیز روک رہی ہے (یعنی اگر عذاب کوئی چیز ہوتی تو اب تک ہو چکتا جب نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں، حق تعالیٰ

جواب دیتے ہیں کہ) یاد رکھو جس دن (وقتِ موعود پر) وہ (عذاب) ان پر آپڑے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا اور جس (عذاب) کے ساتھ یہ استہزاء کررہے تھے وہ ان کو آگھیرے گا (مطلب یہ کہ باوجود استحقاق کے یہ تاخیر اس لئے ہے کہ بعض حکمتوں سے اُس کا وقت معین ہے پھر اس وقت ساری کسر نکل جاوے گی)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیت میں حق تعالیٰ کے علمِ محیط کا ذکر تھا جس سے کائنات کا کوئی ذرّہ اور دلوں کے چھپے ہوئے راز بھی مخفی نہیں، آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس کی مناسبت سے انسان پر ایک عظیم الشان احسان کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اس کے رزق کی کفالت حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف انسان کی بلکہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی، وہ جہاں کہیں رہتا ہے یا چلا جاتا ہے اس کی روزی اس کے پاس پہنچتی ہے، تو کفار کے یہ ارادے کہ اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ سے چھپالیں جہالت اور بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں، پھر اس کے عموم میں جنگل کے تمام درندے، پرندے اور حشرات الارض، دریا اور خشکی کے تمام جانور داخل ہیں اس عموم کی تاکید کے لئے لفظ مِنْ کا اضافہ کرکے وَمَامِنْ دَآبَّۃٍ فرمایا ہے، دَآبَّہ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے، پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں زمین ہی پر ہوتا ہے، دریائی جانوروں کا بھی تعلق زمین سے ہونا کچھ مخفی نہیں، ان سب جانداروں کے رزق کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے کر ایسے الفاظ سے اس کو بیان کیا ہے جیسے کوئی فریضہ کسی کے ذمہ ہو، ارشاد فرمایا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق، یہ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری حق تعالیٰ پر ڈالنے والی کوئی اور طاقت نہیں بجز اس کے کہ اسی نے اپنے فضل سے یہ وعدہ فرمالیا، مگر وعدہ ایک صادق کریم کا ہے جس میں خلاف ورزی کا کوئی امکان نہیں، اسی یقین کو ظاہر کرنے کے لئے اس جگہ لفظ عَلٰی لایا گیا ہے جو فرائض کے بیان کے لئے استعمال ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نہ کسی حکم کا پابند ہے نہ اس کے ذمہ کوئی چیز فرض یا واجب ہے۔

رِزْق لغت میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے جاندار اپنی غذا حاصل کرے اور جس کے ذریعہ اس کی روح کی بقاء اور جسم میں نَما یعنی فربہی اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

رزق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس کا رزق ہے وہ اس کا مالک بھی ہو، کیونکہ تمام جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے مالک نہیں ہوتے ان میں مالکیت کی صلاحیت ہی نہیں، اسی طرح چھوٹے بچے اپنے رزق کے مالک نہیں ہوتے مگر رزق ان کو ملتا ہے۔

رِزق کے اس عام معنٰی کے اعتبار سے علماء نے فرمایا کہ رزق حلال بھی ہوسکتا ہے حرام بھی کیونکہ جو شخص کسی

دوسرے کا مال ناجائز طور پر لے کر کھالے تو یہ مال غذا تو اس شخص کی بن گیا مگر حرام طور پر بنا، اگر یہ اپنی حرص میں اندھا ہو کر ناجائز طریقے استعمال نہ کرتا تو جو رزق اس کے لئے مقرر تھا وہ جائز طور پر اس کو ملتا۔

رزق کی خدائی ذمہ داری پر ایک سوال اور جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مرجاتے ہیں، اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔

ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجلِ مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہوجاتی، جب یہ عمر پوری ہوگئی تو اس کو بہرحال مرنا ہے اور اس جہان سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا رزق بند کردیا گیا، اس سے موت واقع ہوئی۔

امام قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت ابوموسیٰؓ اور ابومالکؓ وغیرہ قبیلہ اشعریّین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ توشہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہوگیا، انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرمادیں، یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھ رہے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا، اس شخص کو یہ آیت سن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کرکے وہیں سے واپس ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا، واپس جاکر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہوجاؤ، تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد آرہی ہے، اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسبِ قرارداد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے، وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا کہ دو آدمی ایک (قصعہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اٹھائے لا رہے ہیں، قصعہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تشلہ یا سینی، لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا، انہوں نے خوب شکم سیر ہوکر کھایا پھر بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تاکہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صَرف فرمادیں، اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس ولذیذ تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میں نے نہیں بلکہ اُس ذاتِ قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لیا ہے۔ [1]

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیاتِ الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوّت و رسالت عطا ہو کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں اس کا کون متکفل ہوگا، اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں، انہوں نے تعمیلِ حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا، حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں، ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا، اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتّہ تھا۔ [2]

حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہوگئے، زوجۂ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے، وہاں جا رہا ہوں۔

ساری مخلوق کو رزق رسانی کا عجیب وغریب نظامِ قدرت

اس آیت میں حق تعالیٰ نے صرف اس پر اکتفاء نہیں فرمایا کہ ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لے لیا بلکہ انسان کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا اس آیت میں **مستقر** اور **مستودع** کی مختلف تفسیریں منقول ہیں مگر لغت کے اعتبار سے وہ اقرب ہے جس کو کشّاف نے اختیار کیا ہے کہ **مستقر** اُس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں کوئی شخص مستقل طور پر جائے قیام یا وطن بنالے اور **مستودع** اُس جگہ کو جہاں عارضی طور پر کسی ضرورت کے لئے ٹھہرے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو دنیا کے لوگوں اور حکومتوں کی ذمہ داری پر قیاس نہ کرو، دنیا میں اگر کوئی شخص یا کوئی اِدارہ آپ کے رزق کی ذمہ داری لے لے تو اتنا کام بہر حال آپ کو کرنا پڑے گا کہ اگر اپنی مقررہ جگہ کو چھوڑ کر

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۹ ص:۷ [2] روح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۸ ص:۱۵۲

کسی دوسری جگہ جانا ہوتو اس فرد یا ادارہ کو اطلاع دیں کہ میں فلاں تاریخ سے فلاں تک فلاں شہر یا گاؤں میں رہوں گا، رزق کے وہاں پہنچنے پہنچانے کا انتظام کیا جائے، مگر حق تعالیٰ کی ذمہ داری میں آپ پر اس کا بھی کوئی بار نہیں کیونکہ وہ آپ کی ہر نقل وحرکت سے باخبر ہے، آپ کے مستقل جائے قیام کو بھی جانتا ہے اور عارضی اقامت کی جگہ سے بھی واقف، بغیر کسی درخواست اور نشان دہی کے آپ کا راشن وہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرتِ مطلقہ کے پیشِ نظر صرف اس کا ارادہ فرمالینا تمام کاموں کے سرانجام ہونے کے لئے کافی تھا کسی کتاب یا رجسٹر میں لکھنے لکھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر مسکین انسان جس نظام کا خوگر ہوتا ہے اس کو اس نظام پر قیاس کر کے بھول چوک کا کھٹکا ہوسکتا ہے اس لئے اس کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ یعنی یہ سب کچھ ایک واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے، اس واضح کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے جس میں تمام کائنات کی روزی، عمر، عمل وغیرہ کی پوری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں جو حسبِ موقع وضرورت متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمان اور زمین کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔ [۱]

اور بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش سے پہلے مختلف دور سے گزرتا ہے، جب اس کے اعضاء کی تکمیل ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم کرتے ہیں جو اس کے متعلق چار چیزیں لکھ لیتا ہے، اوّل اس کا عمل جو کچھ وہ کرے گا، دوسرے اس کی عمر کے سال، مہینہ، دن اور منٹ اور سانس تک لکھ لئے جاتے ہیں، تیسرے اس کو کہاں مرنا اور کہاں دفن ہونا ہے، چوتھے اس کا رزق کتنا اور کس کس طریقے سے پہنچنا ہے، [۲] (اور لوحِ محفوظ میں آسمان زمین کی پیدائش سے بھی پہلے لکھا ہونا اس کے منافی نہیں)۔

دُوسری آیت میں حق تعالیٰ کے علمِ محیط اور قدرتِ قاہرہ کا ایک اور مظہر ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور ان چیزوں کے پیدا کرنے سے پہلے عرشِ رحمٰن پانی پر تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے پہلے پانی پیدا کیا گیا ہے اور آسمان وزمین کو چھ دن میں پیدا کرنے کی تفصیل سورۂ حٰمٓ سجدہ کی آیت (۱۰، ۱۱) میں اِس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، دو دِن میں زمین

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم وموسٰی علیهما السلام ج:۲ ص:۳۳۵

[۲] صحیح البخاری، کتاب الأنبیاء، باب خلق آدم صلوات الله علیه وذریته ج:۱ ص:۴۶۸، وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیة خلق الآدمی فی بطن امه إلخ ج:۲ ص:۳۳۲

کے پہاڑ، دریا، درخت اور جانداروں کی غذاو بقاء کا سامان بنایا گیا، دو دِن میں سات آسمان بنائے گئے۔

تفسیرِ مظہری میں ہے کہ آسمان سے مراد وہ تمام علویات ہیں جو اوپر کی سمت میں ہیں اور زمین سے مراد تمام سفلیات ہیں جو نیچے کی جہت میں ہیں، [۱] اور دن سے مراد وہ مقدار وقت ہے جو آسمان زمین کی پیدائش کے بعد آفتاب کے طلوع سے غروب تک ہوتا ہے اگر چہ آسمان وزمین کی پیدائش کے وقت نہ آفتاب تھا نہ اس کا طلوع وغروب۔

حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ میں یہ بھی تھا کہ ان تمام چیزوں کو ایک آن میں پیدا فرمادیں مگر اس نے اپنی حکمت سے اس عالم کے نظام کو تدریجی بنایا ہے جو انسان کے مزاج کے مناسب ہے۔

آخرِ آیت میں آسمان وزمین کے پیدا کرنے کا مقصد یہ بتلایا ہے لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یعنی یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی گئیں کہ ہم تمہارا امتحان لیں کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرنے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان وزمین کا پیدا کرنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ ان کو عمل کرنے والے انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ وہ ان چیزوں سے اپنے معاش کا فائدہ بھی حاصل کریں اور ان میں غور کر کے اپنے مالک اور رَبّ کو بھی پہچانیں۔

حاصل یہ ہوا کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے اصل مقصود انسان ہے بلکہ انسان میں بھی اہلِ ایمان ہیں اور ان میں بھی وہ انسان جو سب سے اچھا عمل کرنے والا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ سارے بنی آدم میں سب سے اچھا عمل کرنے والے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ تمام کائنات کے پیدا کرنے کا اصل مقصد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود ہے۔ (مظہری) [۲]

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حق تعالیٰ نے اِس جگہ اَحْسَنُ عَمَلًا فرمایا ہے، یعنی کون اچھا عمل کرنے والا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرنے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ نماز، روزہ، تلاوت وذکر کی عملی کثرت اور بہت بڑی مقدار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی نظر حسنِ عمل پر ہے، اسی حسنِ عمل کو ایک حدیث میں اِحسان سے تعبیر کیا گیا ہے، [۳] جس کا حاصل یہ ہے کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو اور کوئی دنیوی غرض اس میں نہ ہو اور اُس عمل کی صورت بھی وہ اختیار کی جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، جس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بتلایا اور اُمت کے لئے اتباعِ سنت کو لازم قرار دیا، خلاصہ یہ ہے کہ تھوڑا عمل جو پورے اخلاص کے ساتھ سنت کے مطابق ہو وہ اس زیادہ عمل سے بہتر ہے جس میں یہ چیزیں نہ ہوں یا کم ہوں۔

---

۱ التفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۵ ص:۶۹ ۲ التفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۵ ص:۶۹، ۷۰

۳ صحيح البخاری، کتاب الإيمان، باب سؤال جبرائيل إلخ ج:۱ ص:۱۲

ساتویں آیت میں منکرینِ قیامت و آخرت کا حال بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے اُس کو جادو کہہ کر ٹال دینا چاہتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو عذاب کی وعیدوں پر انبیاء علیہم السلام کا اعتبار نہ کر کے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی وعید تھی وہ کیوں نہیں آجاتا۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾

اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں اس سے، تو وہ ناامید ناشکر ہوتا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ

اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچی تھی اس کو تو بول اُٹھے دور ہوئیں برائیاں مجھ سے،

اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ

وہ تو اِترانے والا شیخی خورا ہے مگر جو لوگ صابر ہیں اور کرتے ہیں نیکیاں،

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ

ان کے واسطے بخشش ہے اور ثواب بڑا، سو کہیں تُو چھوڑ بیٹھے گا کچھ چیز اس میں سے جو وحی آئی تیری طرف

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ

اور تنگ ہوگا اس سے تیرا جی اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں کیوں نہ اترا اس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ

مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ ؕ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

فرشتہ، تُو تو ڈرانے والا ہے، اور اللہ ہے ہر چیز کا ذمہ دار، کیا کہتے ہیں کہ

افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

بنا لایا ہے تو قرآن کو، کہہ دے تم بھی لے آؤ ایک دس سورتیں ایسی بنا کر اور بلالو جس کو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا

بلاسکو اللہ کے سوا اگر ہو تم سچے، پھر اگر نہ پورا کریں تمہارا کہنا تو جان لو

اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

کہ قرآن تو اترا ہے اللہ کی وحی سے اور یہ کہ کوئی حاکم نہیں اس کے سوا، پھر اب تم حکم مانتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب ہم انسان کو اپنی طرف سے کسی رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں، پھر وہ اُس سے واپس لے لیتے ہیں تو وہ مایوس (اور) ناشکرا بن جاتا ہے ﴿۹﴾ اور اگر اُسے کوئی تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اُسے نعمتوں کا مزہ چکھا دیں تو وہ کہتا ہے کہ ساری برائیاں مجھ سے دُور ہوگئیں۔ (اس وقت) وہ اِترا کر شیخیاں بگھارنے لگتا ہے۔ ﴿۱۰﴾ ہاں! مگر جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں، اور نیک عمل کرتے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کو مغفرت اور بڑا اجر نصیب ہوگا۔ ﴿۱۱﴾ پھر (اے پیغمبر!) جو وحی تم پر نازل کی جارہی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ تم اُس کا کوئی حصہ چھوڑ بیٹھو؟ اور اس سے تمہارا دِل تنگ ہو جائے؟ کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ''ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا، یا کوئی فرشتہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟'' تم تو ایک آگاہ کرنے والے ہو! اور اللہ ہے جو ہر چیز کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔ ﴿۱۲﴾ بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ وحی اس (پیغمبر) نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہے؟ (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ: ''پھر تو تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنالاؤ، اور (اس کام میں مدد کے لئے) اللہ کے سوا جس کسی کو بلاسکو بلالو، اگر تم سچے ہو۔'' ﴿۱۳﴾ اس کے بعد اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو (اے لوگو!) یقین کرلو کہ یہ وحی صرف اللہ کے علم سے اُتری ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ تو کیا اب تم فرماں بردار بنوگے؟ ﴿۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزا چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ نا امید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزا چکھا دیں تو (ایسا اِتراتا ہے کہ) کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب کبھی نہ ہوگا پس) وہ اِترانے لگتا ہے شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (مراد اس سے مؤمنین ہیں کہ ان میں کم وبیش یہ خصال ہوتی ہیں سو) وہ ایسے نہیں ہوتے (بلکہ زوالِ نعمت کے وقت صبر سے کام لیتے ہیں اور عطاءِ نعمت کے وقت شکر وطاعت بجالاتے ہیں پس) ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے (خلاصہ یہ ہے کہ بجز مؤمنین کے اکثر آدمی ایسے ہی ہیں کہ ذرا سی دیر میں نڈر ہو جاویں ذرا سی دیر میں نا امید ہو جاویں اس لئے یہ لوگ تاخیر عذاب کے سبب بے خوف اور منکر ہوگئے، یہ لوگ جو انکار واستہزاء سے پیش آتے ہیں) سو شاید آپ (تنگ ہو کر) ان اَحکام میں سے جو کہ آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں بعض کو (یعنی تبلیغ کو) چھوڑ دینا چاہتے ہیں (یعنی کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں سو ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ تو آپ کر نہیں سکتے پھر تنگ ہونے سے کیا فائدہ) اور آپ کا دِل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو) ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا یا ان کے ہمراہ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی بولتا چالتا) کیوں نہیں آیا (یعنی ایسے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے سو ایسی باتوں سے آپ تنگ نہ ہوجئے کیونکہ) آپ تو (ان کفار کے اعتبار سے) صرف ڈرانے والے ہیں (یعنی پیغمبر ہیں جس کے لئے دراصل کسی بھی معجزے کی ضرورت نہیں) اور پورا اختیار رکھنے والا ہر شیئ پر (تو) صرف اللہ ہی ہے (آپ نہیں ہیں، جب یہ بات ہے تو ان معجزات کا ظاہر کرنا آپ کے اختیار سے باہر ہے پھر اس کی فکر اور اس فکر سے تنگی کیوں ہو اور چونکہ پیغمبر کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہے اور آپ کا بڑا معجزہ قرآن ہے تو اس کو نہ ماننے کی کیا وجہ) کیا (اس کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو (اپنی طرف سے) خود بنالیا ہے، آپ جواب میں فرما دیجئے کہ (اگر یہ میرا بنایا ہوا ہے) تو (اچھا) تم بھی اس جیسی دس سورتیں (جو تمہاری) بنائی ہوئی (ہوں) لے آؤ اور (اپنی مدد کے لئے) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو پھر یہ کفار اگر تم لوگوں کا (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کا یہ) کہنا (کہ اس کی مثل بنالاؤ) نہ کر سکیں تو تم (ان سے کہہ دو کہ اب تو) یقین کر لو کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم (اور قدرت) سے اترا ہے (اس میں اور کسی کے نہ علم کا دخل ہے اور نہ قدرت کا) اور یہ (بھی یقین کر لو) کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں (کیونکہ معبود خدائی کی صفات میں کامل ہوتا ہے پھر اگر اور کوئی ہوتا تو اس کو قدرت بھی پوری ہوتی اور اس قدرت سے وہ تم لوگوں کی مدد کرتا کہ تم اس کی مثل لے آتے کیونکہ موقع تحقیق دین کا اس کو مقتضی تھا پس اس کے مثل بنانے سے ان کے عاجز ہونے سے رسالت اور توحید دونوں

ثابت ہوگئے جب دونوں ثابت ہوگئے) تو اب بھی مسلمان ہوتے ہو (یا نہیں)۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق اور اس میں شبہات نکالنے والوں کا جواب مذکور ہے، اور اس کے شروع یعنی پہلی تین آیتوں میں انسان کی ایک طبعی عادتِ قبیحہ کا ذکر اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت ہے۔

پہلی دو آیتوں میں فطری طور پر انسان کا غیر مستقل مزاج، جلدی پسند ہونا اور موجودہ حالت میں کھپ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینا بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے کہ اگر ہم انسان کو کوئی نعمت چکھاتے ہیں اور پھر اس سے واپس لے لیتے ہیں تو وہ بڑا ہمت ہار، ناامید اور ناشکرا بن جاتا ہے، اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پیش آئی ہو کسی نعمت کا مزا چکھادیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا اور وہ اترانے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان فطرتاً عاجل پسند اور موجودہ حالت کو سب کچھ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے اگلے پچھلے حالات وواقعات میں غور وفکر اور ان کو یاد رکھنے کا خوگر نہیں ہوتا اسی لئے نعمت کے بعد تکلیف آجائے تو رحمت سے ناامید ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے، یہ خیال نہیں کرتا کہ جس ذاتِ حق نے پہلے نعمت دی تھی وہ پھر بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اگر اس کو تکلیف ومصیبت کے بعد کوئی راحت ونعمت مل جائے تو بجائے اس کے کہ پچھلی حالت میں غور کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا اس کا شکر کرتا، اور زیادہ اکڑنے اِترانے لگتا ہے، اور پچھلی حالت کو بھول کر یوں سمجھنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو میرا حق ہے مجھے ملنا ہی چاہئے اور میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گا، غافل یہ خیال نہیں کرتا کہ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت وراحت کی حالت بھی باقی نہ رہے۔

چنان نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند [1]

اِنسان کی موجود پرستی اور ماضی و مستقبل کو بھول جانے کا یہ عالَم ہے کہ ایک صاحبِ اقتدار کے خاک وخون پر دُوسرا شخص اپنے اقتدار کی بنیاد استوار کرتا ہے اور کبھی نیچے کی طرف نظر نہیں کرتا کہ اس سے پہلا صاحبِ اقتدار بھی اسی طرح رہا کرتا تھا، اس کے انجام سے بےخبر ہو کر نشۂ اقتدار کے مزے لیتا ہے۔

اسی موجود پرستی اور حال مستی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور رسول آتے ہیں جو انسان کو ماضی کے عبرتناک واقعات یاد دلا کر مستقبل کی فکر سامنے کردیتے ہیں اور یہ سبق سکھاتے ہیں کہ کائنات کے بدلتے ہوئے حالات

[1] ترجمہ: وہ حالت باقی نہ رہی تو یہ حالت بھی باقی نہیں رہے گی۔

وتغیرات میں غور کرو کہ کونسی طاقت ان کے پردے میں کام کر رہی ہے، بقول حضرت شیخ الہندؒ ؎

انقلاباتِ جہاں واعظِ ربّ ہیں دیکھو ہر تغیر سے صدا آتی ہے فَافْهَمْ، فَافْهَمْ [1]

مؤمنِ کامل بلکہ انسانِ کامل وہی ہے جو ہر تغیر و انقلاب اور ہر رنج و راحت میں دستِ قدرت کی مستور طاقت کا مشاہدہ کرے، آنی فانی راحت و رنج اور اس کے صرف مادّی اسباب پر دل نہ لگائے۔

عقل مند کا کام یہ ہے کہ اسباب سے زیادہ مسبّب الاسباب کی طرف نظر کرے، اُسی سے اپنا رشتہ مضبوط باندھے۔

تیسری آیت میں ایسے ہی کامل انسانوں کو عام انسانی فطرت سے مستثنیٰ اور ممتاز کرنے کے لئے فرمایا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۗ یعنی اس عام انسانی کمزوری سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن میں دو صفتیں پائی جائیں، ایک صبر، دوسرے عملِ صالح۔

لفظ صبر عربی زبان میں اردو محاورہ سے بہت عام معنٰی میں استعمال ہوتا ہے اور اصلی معنٰی لفظ صبر کے باندھنے اور روکنے کے ہیں، قرآن وسنت کی اصطلاح میں نفس کو اس کی ناجائز خواہشات سے روکنے کا نام صبر ہے، اس لئے مفہوم صبر میں تمام گناہوں اور خلافِ شرع کاموں سے پرہیز آ گیا، اور عملِ صالح میں تمام فرائض وواجبات اور سنن و مستحبات آ گئے، معنی یہ ہو گئے کہ اس عام انسانی کمزوری سے وہ لوگ بچے رہیں گے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور حساب قیامت کے خوف کی وجہ سے ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتے ہیں جو اللہ ورسول کو ناپسند ہے اور ہر ایسے عمل کی طرف دوڑیں جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں۔

اسی آیت کے آخر میں ان کامل انسانوں کا صلہ اور جزاء بھی یہ بتلائی گئی ہے کہ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑪ یعنی ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کی خطائیں بخش دی جائیں گی اور ان کے نیک عمل کا بہت بڑا بدلہ ان کو ملے گا۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا کی نعمت اور کلفت دونوں کے بارے میں قرآنِ کریم نے اَذَقْنَا یعنی چکھانے کا لفظ استعمال کر کے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اصل نعمت اور کلفت آخرت کی ہے، دنیا میں نہ راحت مکمل ہے نہ کلفت بلکہ چکھنے اور نمونہ کے درجہ میں ہے تاکہ انسان کو آخرت کی نعمتوں اور تکلیفوں کا کچھ اندازہ ہو سکے، اس لئے بھی دنیا کی نہ راحت کچھ زیادہ خوش ہونے کی چیز ہے نہ مصیبت کچھ زیادہ غم کرنے کی، اگر غور کرو تو آج کل کی اصطلاح میں یہ ساری دُنیا آخرت کا شورُوم ہے جس میں راحت وکلفت کے صرف نمونے رکھے ہیں۔

چوتھی آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ تھا کہ مشرکینِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مختلف قسم کی فرمائشیں پیش کیں ایک یہ کہ اس قرآن میں ہمارے بتوں کو بُرا کہا گیا ہے اس لئے ہم اس پر ایمان نہیں

[1] ترجمہ: فَافْهَمْ، فَافْهَمْ کا مطلب ہے: سمجھ جاؤ، سمجھ جاؤ۔

لا سکتے، اس لئے یا تو آپ کوئی دُوسرا قرآن لائیں یا اسی میں بدل کر ترمیم کردیں، اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط (یونس:۱۵) (بغوی، مظہری) [1]

دوسرے یہ کہ ہم آپ کے رسول ہونے پر جب یقین کریں کہ یا تو دنیا کے بادشاہوں کی طرح آپ پر کوئی خزانہ نازل ہو جائے جس سے سب کو بخشش کریں، یا پھر کوئی فرشتہ آسمان سے آجائے وہ آپ کے ساتھ یہ تصدیق کرتا پھرے کہ بیشک یہ اللہ کے رسول ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی لغو وبیہودہ فرمائشوں سے دِل تنگ ہوئے، کیونکہ رحمۃ للعالمین سے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، ان کے ایمان لانے کی فکر کو دِل سے نکال دیں، اور نہ یہ ممکن تھا کہ ان کی بے ہودہ فرمائشوں کو پورا کریں، کیونکہ اوّل تو یہ فرمائشیں نری بے عقلی پر مبنی ہیں، بت اور بت پرستی اور دوسری بُری چیزوں کو برا نہ کہا جائے تو ہدایت کیسے ہو اور خزانہ کا نبوّت کے ساتھ کیا جوڑ، ان لوگوں نے نبوّت کو بادشاہت پر قیاس کرلیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ دستور نہیں کہ ایسی حالت پیدا کردیں کہ لوگ ایمان لانے پر مادّی طور سے مجبور ہو جائیں، ورنہ سارا جہان اس کے قبضۂ قدرت میں ہے کسی کی کیا مجال تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی عقیدہ یا عمل رکھ سکتا، مگر اس نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اس دنیا کو دارُ الامتحان بنایا ہے، یہاں کسی نیکی پر عمل یا بدی سے پرہیز پر مادّی اسباب کے ذریعہ کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا البتہ آسمانی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ نیک وبد اور اچھے بُرے کا امتیاز اور ان کے نتائج بتلا کر نیکی پر عمل اور بدی سے پرہیز پر آمادہ کیا جاتا ہے، اگر رسول کے ساتھ معجزانہ طور پر کوئی فرشتہ اس کے قول کی تصدیق کے لئے مامور ہوتا اور جب کوئی نہ مانتا تو اسی وقت اس کو نقد عذاب کا سامنا ہوتا تو یہ ایمان پر مجبور کرنے کی ایک صورت ہوتی نہ اس میں ایمان بالغیب رہتا جو ایمان کی اصل رُوح ہے اور نہ انسان کا اپنا کوئی اختیار رہتا جو اس کے عمل کی روح ہے اور علاوہ اس کے کہ ان کی فرمائشیں لغو اور بے ہودہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی فرمائشیں کرنا خود اس کی دلیل تھی کہ یہ لوگ رسول ونبی کی حقیقت کو نہیں پہچانتے، رسول اور خدا میں کوئی فرق نہیں کرتے، رسول کو خدا تعالیٰ کی طرح قادرِ مطلق سمجھتے ہیں اسی لئے اُس سے ایسے کاموں کی فرمائش کرتے ہیں جو اللہ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔

غرض رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایسی فرمائشوں سے سخت دِلگیر اور دِلتنگ ہوگئے تو آپ کی تسلی اور ان کے خیالات کی اصلاح کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، جس میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ کیا آپ ان کے کہنے سے مجبور ہو کر اللہ کے بھیجے ہوئے قرآن کا کوئی حصہ چھوڑ دیں گے جس سے یہ لوگ ناخوش ہوتے ہیں مثلاً جس میں بتوں کی مجبوری وبیکسی اور کسی چیز پر قادر نہ ہونے کا بیان ہے، اور کیا آپ ان کی ایسی فرمائشوں سے دِلتنگ

[1] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۱۲۵، والتفسیر المظهری ج:۵ ص:۷۱

ہو جائیں گے، یہاں لفظ لَعَلَّكَ سے اس مضمون کو تعبیر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع آپ کے بارے میں ایسا گمان ہوسکتا تھا، بلکہ مقصود آپ کا ان چیزوں سے بَری ہونا بیان کرنا ہے، کہ آپ نہ قرآن کا کوئی حصہ ان کی رعایت سے چھوڑ سکتے ہیں اور نہ آپ کو ان کی فرمائشوں سے دِلتنگی ہونی چاہئے، کیونکہ آپ تو اللہ کی طرف سے نذیر یعنی ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں اور سب کاموں کو سرانجام دینا تو اللہ ہی کی قدرت میں ہے، ڈرانے والے کی تخصیص مخاطب کی خصوصیت کی وجہ سے کی گئی کیونکہ یہ کافر تو ڈرانے ہی کے مستحق ہیں ورنہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نذیر یعنی ڈرانے والے ہیں ایسے ہی بشیر یعنی نیک لوگوں کو خوشخبری سنانے والے بھی ہیں، اس کے علاوہ نذیر در حقیقت اُس ڈرانے والے کو کہتے ہیں جو شفقت ومحبت کی بناء پر خراب اور مضر چیزوں سے ڈرائے، اس لئے نذیر کے مفہوم میں بشیر کا مفہوم بھی ایک حیثیت سے شامل ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں مشرکین کی طرف سے خاص قسم کے معجزات کا مطالبہ تھا، اگلی آیتوں میں ان کو اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ قرآن ایک ایسا معجزہ تمہارے سامنے آچکا ہے جس کے معجزہ ہونے کا تم بھی انکار نہیں کرسکتے، تو اگر یہ معجزات کا مطالبہ نیک نیتی سے رسول کی سچی حقانیت معلوم کرنے کے لئے ہے تو وہ پورا ہو چکا اور اگر محض عناد کے لئے ہے تو اگر تمہارے مطلوبہ معجزات بھی دکھلا دیئے جائیں تو اہلِ عناد سے کیا توقع ہے کہ اُن کو دیکھ کر بھی وہ اسلام قبول کریں گے، بہرحال قرآنِ کریم کا واضح معجزہ ہونا ناقابلِ انکار ہے۔

اس پر مشرکین وکفار کی طرف سے جو غلط شبہات پیدا کئے گئے ان کی تردید اگلی دو آیتوں میں اس طرح کی گئی ہے کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ قرآن کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنالیا ہے اللہ کا کلام نہیں۔

اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسا قرآن خود بنا سکتے ہیں تو تم بھی اُس جیسی صرف دس سورتیں ہی بنا کر دکھلا دو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ دس سورتیں کوئی ایک ہی آدمی بنائے بلکہ دنیا جہان کے لوگ سب مل کر بھی بنالائیں، اور جب وہ دس سورتیں بنانے سے بھی عاجز ہوں تو آپ فرمادیجئے کہ اب تو حقیقت واضح ہوگئی کیونکہ اگر یہ قرآن کسی انسان کا کلام ہوتا تو دوسرے انسان بھی اس جیسا کلام بنا سکتے، اور سب کا عاجز ہونا اِس کی قوی دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے جس میں کسی ادنیٰ کمی بیشی کی گنجائش نہیں اور انسانی طاقت سے برتر ہے۔

قرآنِ کریم نے اس جگہ دس سورتیں مقابلہ میں بنا کر لانے کا ارشاد فرمایا ہے اور دوسری ایک آیت میں یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ ایک ہی سورت اس جیسی بنالاؤ؟

وجہ یہ ہے کہ پہلے دس سورتیں بنانے کا حکم دیا گیا، جب وہ اس سے عاجز ہوگئے تو پھر اُن کے عاجز ہونے کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے سورۂ بقرہ کی آیت میں فرمایا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی زیادہ نہیں صرف

ایک ہی سورت اس جیسی بنالاؤ، مگر وہ قرآنِ کریم کی اس تحدّی اور ان کے لئے انتہائی آسانی کردینے کے باوجود کچھ نہ کرسکے تو قرآنِ کریم کا معجزہ ہونا اور بلاشبہ اللہ کا کلام ہونا ثابت ہوگیا، اسی لئے آخر میں فرمایا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٤﴾ یعنی کیا تم اب بھی مسلمان اور اطاعت گزار بنو گے، یا اسی خوابِ غفلت میں رہو گے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا

جو کوئی چاہے دنیا کی زندگانی اور اس کی زینت بھگتا دیں گے ہم ان کو ان کے عمل دنیا میں

وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

اور ان کو اس میں کچھ نقصان نہیں، یہی ہیں جن کے واسطے کچھ نہیں آخرت میں

اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

آگ کے سوا، اور برباد ہوا جو کچھ کیا تھا یہاں اور خراب گیا جو کمایا تھا،

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ

بھلا ایک شخص جو ہے صاف رستہ پر اپنے ربّ کے اور اس کے ساتھ ساتھ ہے ایک گواہ اللہ کی طرف سے اور اس سے پہلے گواہ تھی

كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ

موسیٰ کی کتاب رستہ بتاتی اور بخشواتی (اوروں کی برابر ہے؟) یہی لوگ مانتے ہیں قرآن کو، اور جو کوئی منکر ہو اس سے

مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ

سب فرقوں میں سے سو دوزخ ہے ٹھکانہ اس کا، سو تو مت رہ شبہ میں اس سے، بیشک وہ حق ہے

مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾

تیرے ربّ کی طرف سے اور پر بہت سے لوگ یقین نہیں کرتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ (صرف) دُنیوی زندگی اور اُس کی سج دھج چاہتے ہیں، ہم اُن کے اعمال کا پورا پورا صلہ اسی دُنیا میں بھگتا دیں گے، اور یہاں اُن کے حق میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ ⑮ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ کارگذاری انہوں نے کی تھی، وہ آخرت میں بیکار ہو جائے گی، اور جو عمل وہ کر رہے ہیں، (آخرت کے لحاظ سے) کالعدم ہیں۔ ⑯ بھلا بتاؤ کہ وہ شخص (ان کے برابر کیسے ہوسکتا ہے) جو اپنے رَبّ کی طرف سے آئی ہوئی روشن ہدایت (یعنی قرآن) پر قائم ہو، جس کے پیچھے اُس کی حقانیت کا ایک ثبوت تو خود اُسی میں آیا ہے، اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی (اُس کی حقانیت کا ثبوت ہے) جو لوگوں کے لئے قابلِ اتباع اور باعثِ رحمت تھی۔ ایسے لوگ اس (قرآن پر) ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان گروہوں میں سے جو شخص اس کا انکار کرے، تو دوزخ ہی اس کی طے شدہ جگہ ہے۔ لہٰذا اس (قرآن) کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یقین رکھو کہ یہ حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لا رہے۔ ⑰

خلاصۂ تفسیر

جو شخص (اپنے اعمالِ خیر سے) محض حیاتِ دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے (جیسے شہرت و نیک نامی وجاہ اور ثواب آخرت حاصل کرنے کی اس کی نیت نہ ہو) تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزاء) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی (یعنی دنیا ہی میں ان کے اعمال کے عوض ان کو نیک نامی اور صحت و فراغ عیش و کثرت اموال و اولاد عنایت کر دیا جاتا ہے جبکہ ان کے اعمال کا اثر ان کے اضداد پر غالب ہو اور اگر اضداد غالب ہوں تو پھر یہ اثر نہیں مرتب ہوتا، یہ تو دنیا میں ہوا، رہا آخرت میں، سو) یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے (بوجہ فسادِ نیت کے مگر صورت ظاہری کے اعتبار سے ثابت سمجھا جاتا ہے آخرت میں یہ ثبوت بھی زائل ہو جاوے گا) کیا منکرِ قرآن ایسے شخص کی برابری کرسکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رَبّ کی طرف سے آیا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے (یعنی اس کا معجز ہونا جو کہ دلیلِ عقلی ہے) اور (ایک) اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (یعنی توریت اس کے ساتھ شہادت کے لئے موجود) ہے جو کہ (اَحکام بتلانے کے اعتبار سے) اِمام ہے اور (اَحکام پر جو ثمرہ

وثواب ملے گا اس کے اعتبار سے وہ کتاب سبب) رحمت ہے (اور یہ دلیل نقلی ہے، غرض قرآن کے صدق وصحت کے لئے عقلی اور نقلی دونوں دلیلیں موجود ہیں پس ان ہی دلائل کے سبب سے) ایسے لوگ (جن کا ذکر ہوا کہ وہ صاحبِ بینہ ہیں) اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور (کافر کا یہ حال ہے کہ) جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس قرآن کا انکار کرے گا تو دوزخ اس کے وعدہ کی جگہ ہے (پھر منکرِ قرآن مصدِّق قرآن کے برابر کب ہوا) سو (اے مخاطب) تم قرآن کی طرف سے شک میں مت پڑنا بلا شک وشبہ وہ سچی کتاب ہے تمہارے رَبّ کے پاس سے (آئی ہے) لیکن (باوجود ان دلائل کے غضب ہے کہ) بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔

معارف ومسائل

مخالفینِ اسلام کو جب عذاب کی وعیدیں سنائی جاتیں تو وہ اپنی خیرات وصدقات اور خدمتِ خلق ورفاہِ عام کے کاموں کو سند میں پیش کرتے تھے کہ ہم ایسے نیک کام کرتے ہیں پھر ہم کو عذاب کیسا؟ اور آج تو بہت ناواقف مسلمان بھی اس شبہ میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جو کافر ظاہری اعمال واخلاق درست رکھتے ہیں، خلقِ خدا کی خدمت اور خیرات وصدقات کرتے ہیں، سڑکیں، پُل، شفاخانے، پانی کی سبیلیں بناتے اور چلاتے ہیں اُن کو مسلمانوں سے اچھا جانتے ہیں، مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ ہر عمل کے مقبول اور باعثِ نجاتِ آخرت ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے لئے کیا گیا ہو، اور اللہ کے لئے کرنا وہی معتبر ہے جو اس کے رسول کے بتلائے ہوئے طریقہ پر کیا گیا ہو، جو شخص اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان ہی نہیں رکھتا اس کے تمام اعمال واخلاق ایک بے روح ڈھانچہ ہے جس کی شکل وصورت تو اچھی بھلی ہے مگر روح نہ ہونے کی وجہ سے دارِ آخرت میں اس کا کوئی وزن اور اثر نہیں، البتہ دنیا میں چونکہ اُس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ظاہری صورت کے اعتبار سے وہ نیک عمل ہے اس لئے اللہ جل شانہٗ نے اپنے کمالِ عدل وانصاف کی بناء پر اس عمل کو بھی بالکل ضائع نہیں قرار دیا بلکہ اس کے کرنے والے کے پیشِ نظر جو مقصد تھا کہ دنیا میں اس کی عزّت ہو لوگ اس کو سخی، کریم، بڑا آدمی سمجھیں، دنیا کی دولت، تندرستی اور راحت نصیب ہو، اللہ تعالیٰ اُس کو یہ سب کچھ دنیا میں دیدیتے ہیں، آخرت کا تصور اور وہاں کی نجات اس کے پیشِ نظر ہی نہ تھی اور نہ اس کا بے روح عمل وہاں کی نعمتوں کی قیمت بن سکتا تھا اس لئے ان اعمال کا وہاں کچھ عرض نہ ملے گا اور کفر ومعصیت کی وجہ سے جہنم میں رہے گا، یہ خلاصہ مضمون ہے پہلی آیت کا، اب اس کے الفاظ کو دیکھئے۔

ارشاد ہے کہ جو شخص صرف دنیا کی زندگی اور اس کی رونق ہی کا ارادہ کرتا رہا تو ہم اس کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی

میں پورا دیدیتے ہیں، اُن کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی، یہ ایسے لوگ ہیں کہ اُن کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اَور کچھ نہیں۔

یہاں یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قرآن میں اس جگہ مَنْ اَرَادَ کا مختصر لفظ چھوڑ کر مَنْ كَانَ يُرِيْدُ کا لفظ اختیار فرمایا ہے جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے جس کا ترجمہ 'ارادہ کرتا رہا' کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال صرف ایسے لوگوں کا ہے جو اپنے اعمال وحسنات سے صرف دُنیا ہی کا فائدہ چاہتے رہے کبھی آخرت کی فکر ہی نہ ہوئی، اور جو شخص آخرت کی فکر اور وہاں کی نجات کے لئے عمل کرتا ہے پھر اس کے ساتھ کچھ دنیا کا بھی ارادہ کر لے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

ائمۂ تفسیر کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں آئی ہے یا مسلمانوں کے، یا مسلم وکافر دونوں سے متعلق ہے؟

آیت کے آخری جملہ میں جو الفاظ آئے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے بجز دوزخ کے کچھ نہیں، اس سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار ہی کے متعلق ہے کیونکہ مسلمان کتنا ہی گناہگار ہو، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخرکار جنت میں جائے گا، اسی لئے ضحاک وغیرہ مفسرین نے اس کو کفار ہی کے متعلق قرار دیا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اپنے نیک اعمال سے صرف دُنیا کی بھلائی، راحت، دولت، عزّت کے طلبگار رہیں، نیک عمل اسی نیت سے کرتے ہیں کہ دُنیا میں عزّت وراحت ملے، اور مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اپنے اعمالِ بد کی سزا نہ بھگت لیں گے اس وقت تک ان کو بجز دوزخ کے کچھ نہ ملے گا۔

اور زیادہ راجح اور واضح بات یہ ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے اعمالِ صالحہ کو صرف دُنیا کے فوائد دولت، عزّت، صحت وغیرہ کی نیت سے کرتے ہیں خواہ ایسا کرنے والے کافر ہوں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، یا مسلمان ہوں جو زبان سے آخرت کے قائل ہیں مگر عمل میں اس کی فکر نہیں رکھتے، بلکہ ساری فکر دنیا ہی کے فوائد سے وابستہ رکھتے ہیں، حضراتِ مفسرین میں سے مجاہد، میمون بن مہران، معاویہ رضی اللہ عنہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ [۱] سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت ومذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ (قرطبی) [۲]

اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے تھے

---

[۱] صحيح البخاري، باب بدء الوحي ج:۱ ص:۱ [۲] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۹ ص:۱۳، ۱۴

کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزّت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدل نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث نقل کر کے رو پڑے اور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا سے اس حدیث کی تصدیق ہوتی ہے۔ [1]

صحیح مسلم میں بروایتِ انس رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مؤمن جو نیک کام کرتا ہے اُس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے، اور کافر (چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اُس) کا حساب دنیا ہی میں بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزّت، صحت، راحت اس کو دیدی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔ [2]

تفسیرِ مظہری میں ہے کہ مؤمن اگرچہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہش مند ہوتا ہے مگر آخرت کا اِرادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دُنیا میں بقدرِ ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔ [3]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوئے تو سارے گھر میں چند گنی چنی چیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دُعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرماویں، کیونکہ ہم فارس و رُوم کو دیکھتے ہیں وہ دُنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ سن کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ اُنہیں دُنیا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ (مظہری) [4]

جامع ترمذی اور مسند احمد میں بروایتِ انس رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دِل کو غنی کر دیتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا فرمادیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:٩ ص:١٤، وجامع الترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی الریاء والسمعة ج:٢ ص:٦٣

[2] صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامهم، باب جزاء المؤمن بحسناته إلخ ج:٢ ص:٣٧٤

[3] التفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:٥ ص:٧٤

[4] التفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:٥ ص:٧٤، وصحیح البخاری، کتاب المظالم والقصاص، باب الغرفة والعلیة المشرفة إلخ ج:١ ص:٣٣٤

اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوسِ دُنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آجاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے۔ [۱]

آیتِ مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ دنیا کا ارادہ کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دیدیا جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ باوجود دنیا کا ارادہ کرنے اور کوشش کرنے کے دنیا میں بھی ان کا مطلب پورا نہیں ہوتا اور بعض دفعہ کچھ بھی نہیں ملتا ـــــ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت میں اس جگہ اجمال ہے اس کی پوری تفصیل سورۂ اِسراء کی اس آیت میں ہے، جس میں فرمایا، مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (بنی اسرائیل:۱۸) یعنی جو شخص دنیا ہی کا ارادہ کرتا رہتا ہے ہم اس کو دنیا ہی میں نقد دیدیتے ہیں، مگر یہ دینا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، اوّل یہ کہ جس قدر دینا چاہیں اُتنا ہی دیتے ہیں ان کی مانگ اور طلب کے برابر دینا ضروری نہیں، دُوسرے یہ کہ صرف اُسی شخص کو دیتے ہیں جس کو دینا بتقاضائے حکمت مناسب سمجھتے ہیں ہر ایک کو دینا ضروری نہیں۔

دوسری آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنینِ مخلصین کا حال ان لوگوں کے مقابلہ میں پیش کیا گیا جن کا مبلغِ علم اور منتہائے مقصود صرف دُنیا ہے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ یہ دو گروہ برابر نہیں ہوسکتے، پھر ان کا یہ حال بیان کر کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورسالت کا تمام عالمِ انسان کے لئے قیامت تک عام ہونا، اور جو شخص آپ پر ایمان نہ لائے خواہ اعمال کچھ بھی کرے اس کا گمراہ اور جہنمی ہونا بیان فرمایا ہے۔

پہلے جملہ میں فرمایا کہ کیا منکرِ قرآن ایسے شخص کی برابری کرسکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اُس کے رَبّ کی طرف سے آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے اور اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب گواہ ہے، جو قابلِ اقتداء اور لوگوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجی گئی تھی۔

اس آیت میں بَيِّنَة سے مراد قرآن ہے اور شَاهِد کے معنٰی میں اَئمۂ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں، بیان القرآن میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ شاهد سے مراد وہ اِعجازِ قرآنی ہے جو خود قرآن میں موجود ہے، [۲] تو معنٰی یہ ہوگئے کہ وہ لوگ جو قرآن پر قائم ہیں اور ان کے پاس قرآن کی حقانیت کا ایک گواہ تو خود قرآن میں موجود ہے یعنی اس کا اِعجاز اور دُوسرا گواہ اس سے پہلے بصورتِ تورات آچکا ہے جو موسیٰ علیہ السلام لوگوں کے لئے قابلِ اقتداء اور رحمتِ حق کی حیثیت سے لائے تھے کیونکہ تورات میں قرآنِ کریم کا حق ہونا واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الزهد، باب منه، ج:۲ ص:۷۳، ومسند احمد رقم الحديث:۲۰۶۰۸

[۲] بیان القرآن تحت هٰذه الآیة (فی ضمن الترجمة) ج:۲ ص:۲۰۸

دوسرے جملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کو قیامت تک مدارِ نجات قرار دینے کا بیان اس طرح فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور ملتوں میں سے جو شخص بھی آپ کا انکار کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ جو یہودی یا نصرانی میری دعوت کو سنے اور اس کے باوجود میری لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لائے تو وہ اہلِ جہنم میں سے ہوگا۔[1]

اس سے ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے جو بہت سے یہود و نصاریٰ یا دُوسرے مذہب کے پیروؤں کے بعض ظاہری اعمال کی بناء پر ان کو حق پر کہتے ہیں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے بغیر صرف ظاہری اعمال کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں، یہ قرآن مجید کی آیتِ مذکورہ اور حدیث کی اس صحیح روایت سے کھلا تصادم ہے، وَالْعِیاذُ بِاللہ۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ وہ لوگ رُوبرو آئیں گے اپنے ربّ کے

وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ

اور کہیں گے گواہی دینے والے یہی ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے ربّ پر سن لو پھٹکار ہے اللہ کی

عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا

نا انصاف لوگوں پر جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈھتے ہیں اس میں کجی،

وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ

اور وہی ہیں آخرت سے منکر وہ لوگ نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ج: ١ ص: ٨٦

وقف لازم

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ

اور نہیں ان کے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی دونا ہے ان کے لئے عذاب

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

نہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ دیکھتے تھے، وہی ہیں جو

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ

کھو بیٹھے اپنی جان اور گم ہوگیا ان سے جو جھوٹ باندھا تھا، اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ

فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

آخرت میں یہی ہیں سب سے زیادہ نقصان میں، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک

وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور عاجزی کی اپنے رَبّ کے سامنے وہ ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں رہا کریں گے،

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ

مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا اور بہرا اور دوسرا دیکھتا اور سنتا،

ع ۲

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع

کیا برابر ہے دونوں کا حال، پھر کیا تم غور نہیں کرتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ ایسے لوگوں کی اُن کے رَبّ کے پاس پیشی ہوگی،

اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ: ''یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹی باتیں لگائی تھیں۔'' سب لوگ سن لیں کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر ⑱ جو اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکتے تھے، اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے، اور آخرت کے تو وہ بالکل ہی منکر تھے۔ ⑲ ایسے لوگ رُوئے زمین پر کہیں بھی اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے، اور اللہ کے سوا اُنہیں کوئی یار و مددگار میسر نہیں آسکتے۔ اُن کو دُگنا عذاب دیا جائے گا۔ یہ (حق بات کو نفرت کی وجہ سے) نہ سن سکتے تھے، اور نہ اُن کو (حق) سجھائی دیتا تھا ⑳ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کے لئے گھاٹے کا سودا کرلیا تھا، اور جو معبود انہوں نے گھڑ رکھے تھے، انہیں اُن کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ ㉑ لامحالہ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ㉒ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اور وہ اپنے پروردگار کے آگے جھک کر مطمئن ہوگئے ہیں، تو وہ جنت کے بسنے والے ہیں۔ وہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ ㉓ ان دو گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو، اور دوسرا دیکھتا بھی ہو، سنتا بھی ہو۔ کیا یہ دونوں اپنے حالات میں برابر ہوسکتے ہیں؟ کیا پھر بھی تم عبرت حاصل نہیں کرتے؟ ㉔

خلاصۂ تفسیر

اور ایسے شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (کہ اس کی توحید کا اس کے رسول کی رسالت کا اور اس کے کلام ہونے کا انکار کرے) ایسے لوگ (قیامت کے روز) اپنے رَبّ کے سامنے (مفتری ہونے کی حیثیت سے) پیش کئے جائیں گے اور (اعمال کے) گواہ فرشتے (علی الاعلان) یوں کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنے رَبّ کی نسبت جھوٹی باتیں لگائی تھیں، سب سن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی (زیادہ) لعنت ہے جو کہ (اپنے کفر و ظلم کے ساتھ) دوسروں کو بھی خدا کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اور اس (راہِ دین) میں کجی (اور شبہات) نکالنے کی تلاش (اور فکر) میں رہا کرتے تھے (تاکہ دوسروں کو گمراہ کریں) اور آخرت کے بھی منکر تھے (یہ فرشتوں کے اعلان کا مضمون تھا، آگے اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے کہ) یہ لوگ (تمام) زمین (کے تختہ) پر (بھی) خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کرسکتے تھے (کہ کہیں جا چھپتے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ نہ آتے) اور نہ ان کا خدا کے سوا کوئی مددگار ہوا (کہ بعد گرفتاری کے چھڑا لیتا) ایسوں کو (اوروں سے) دونی سزا ہوگی (ایک کافر ہونے کی اور ایک دوسروں کو کافر بنانے کی کوشش کرنے کی) یہ لوگ (مارے نفرت کے اَحکامِ الٰہی کو) سن نہ سکتے تھے اور نہ (غایتِ عناد سے راہ حق کو) دیکھتے تھے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو برباد کر بیٹھے اور جو معبود اُنہوں نے تراش رکھے تھے (آج) ان سے سب غائب (اور گم) ہوگئے (کوئی بھی تو کام نہ آیا پس) لازمی بات ہے کہ

آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ میں یہی لوگ ہوں گے (یہ تو انجام ہوگا کافروں کا آگے مسلمانوں کا انجام مذکور ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کئے اور (دِل سے) اپنے رَبّ کی طرف جھکے (یعنی انقیاد اور خشوع دِل میں پیدا کیا) ایسے لوگ اہلِ جنت ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہا کریں گے (یہ دونوں کے انجام کا تفاوت بیان ہوگیا، آگے تفاوت حال کی مثال ہے جس پر انجام کا تفاوت مرتب ہوتا ہے پس ارشاد ہے کہ) دونوں فریق (مذکورین یعنی مؤمن وکافر) کی حالت ایسی ہے جیسے ایک شخص ہو اندھا بھی ہو اور بہرا بھی (جو نہ عبارت کو سنے نہ اشارہ کو دیکھے تو اس کے سمجھنے کی عادۃً کوئی صورت ہی نہیں) اور ایک شخص ہو جو دیکھتا بھی ہو اور سنتا بھی ہو (اُس کو سمجھنا بہت آسان ہو) کیا یہ دونوں شخص حالت میں برابر ہیں (ہرگز نہیں، یہی حالت کافر اور مسلمان کی ہے کہ وہ ہدایت سے بہت دُور ہے اور یہ ہدایت سے موصوف ہے) کیا تم (اس فرق کو) سمجھتے نہیں (ان دونوں میں فرق بدیہی ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ز اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ لا

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ میں تم کو ڈر کی بات سناتا ہوں کھول کر

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ط اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾

کہ نہ پرستش کرو اللہ کے سوا میں ڈرتا ہوں تم پر دردناک دِن کے عذاب سے،

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

پھر بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم کے ہم کو تو تُو نظر نہیں آتا مگر ایک آدمی ہم جیسا

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ج وَمَا نَرٰى لَكُمْ

اور دیکھتے نہیں کوئی تابع ہوا ہو تیرا مگر جو ہم میں نیچ قوم ہے بلا تأمل اور ہم نہیں دیکھتے تم کو

عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ

اوپر اپنے کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو بولا اے قوم دیکھو تو

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ

اگر میں ہوں صاف راستہ پر اپنے رَبّ کے اور اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے

فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝۲۸ وَيٰقَوْمِ

پھر اس کو تمہاری آنکھ سے مخفی رکھا، تو کیا ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں اس پر اور تم اس سے بیزار ہو، اور اے میری قوم

لَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ

نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال، میری مزدوری نہیں مگر اللہ پر اور میں نہیں ہانکنے والا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹

ایمان والوں کو ان کو ملنا ہے اپنے رَبّ سے لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ جاہل ہو،

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

اور اے قوم کون چھڑائے مجھ کو اللہ سے اگر ان کو ہانک دوں کیا تم دھیان نہیں کرتے

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ

اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں

مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ

فرشتہ ہوں اور نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری آنکھ میں حقیر ہیں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی،

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱ قَالُوْا يٰنُوْحُ

اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے جی میں ہے یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں، بولے اے نوح

قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ

تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا اب لے آ جو تو وعدہ کرتا ہے ہم سے اگر

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ

تو سچا ہے، کہا کہ لائے گا تو اس کو اللہ ہی اگر چاہے گا

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ

اور تم نہ تھکا سکو گے بھاگ کر، اور نہ کارگر ہوگی تم کو میری نصیحت جو چاہوں کہ تم کو نصیحت کروں

اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ؕ

اگر اللہ چاہتا ہوگا کہ تم کو گمراہ کرے وہی ہے ربّ تمہارا اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے،

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ

کیا کہتے ہیں کہ بنا لایا قرآن کو کہہ دے اگر میں بنا لایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا ذمہ نہیں

مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

جو تم گناہ کرتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے نوح کو اُن کی قوم کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ: ''میں تمہیں اس بات سے صاف صاف آگاہ
کرنے والا پیغمبر ہوں ﴿۲۵﴾ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ یقین جانو مجھے تم پر ایک دُکھ دینے والے دن کے عذاب
کا اندیشہ ہے۔'' ﴿۲۶﴾ اس پر اُن کی قوم کے وہ سردار لوگ جنہوں نے کفر اختیار کرلیا تھا، کہنے لگے کہ: ''ہمیں تو اس سے زیادہ
(تم میں) کوئی بات نظر نہیں آرہی کہ تم ہم جیسے ہی ایک انسان ہو۔ اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ صرف وہ لوگ تمہارے

پیچھے لگے ہیں جو ہم میں سب سے زیادہ بے حیثیت ہیں، اور وہ بھی سطحی طور پر رائے قائم کر کے۔ اور ہمیں تم میں کوئی ایسی بات بھی دِکھائی نہیں دیتی جس کی وجہ سے ہم پر تمہیں کوئی فضیلت حاصل ہو، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم سب جھوٹے ہو" ⦗۲۷⦘ نوح نے کہا: "اے میری قوم! ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی ایک روشن ہدایت پر قائم ہوں، اور اُس نے مجھے خاص اپنے پاس سے ایک رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہے، پھر بھی وہ تمہیں سجھائی نہیں دے رہی، تو کیا ہم اُس کو تم پر زبردستی مسلط کر دیں جبکہ تم اُسے ناپسند کرتے ہو؟ ⦗۲۸⦘ اور اے میری قوم! میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے سوا کسی اور نے ذمے نہیں لیا۔ اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، میں ان کو دُھتکارنے والا نہیں ہوں۔ ان سب کو اپنے رَبّ سے جا ملنا ہے۔ لیکن میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسے لوگ ہو جو نادانی کی باتیں کر رہے ہو۔ ⦗۲۹⦘ اور اے میری قوم! اگر میں ان لوگوں کو دُھتکار دوں تو کون مجھے اللہ (کی پکڑ) سے بچائے گا؟ کیا تم پھر بھی دِھیان نہیں دو گے؟ ⦗۳۰⦘ اور میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میرے قبضے میں اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کی ساری باتیں جانتا ہوں، اور نہ میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ اور جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں، اُن کے بارے میں بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ انہیں کبھی کوئی بھلائی عطا نہیں کرے گا۔ ان کے دِلوں میں جو کچھ ہے، اُسے اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اگر میں ان کے بارے میں ایسی باتیں کہوں تو میرا شمار یقیناً ظالموں میں ہوگا" ⦗۳۱⦘ انہوں نے کہا کہ: "اے نوح! تم ہم سے بحث کر چکے، اور بہت بحث کر چکے۔ اب اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ (عذاب) جس کی دھمکی ہمیں دے رہے ہو۔" ⦗۳۲⦘ نوح نے کہا کہ: "اُسے تو اللہ ہی تمہارے پاس لے کر آئے گا، اگر چاہے گا، اور تم اُسے بے بس نہیں کر سکتے۔ ⦗۳۳⦘ اگر میں تمہاری خیرخواہی کرنا چاہوں تو میری خیرخواہی اُس صورت میں تمہارے کوئی کام نہیں آسکتی جب اللہ ہی نے (تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے) تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ وہی تمہارا پروردگار ہے، اور اُسی کے پاس تمہیں واپس لے جایا جائے گا۔" ⦗۳۴⦘ بھلا کیا (عرب کے یہ کافر) لوگ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دو کہ: "اگر میں نے اسے گھڑا ہوگا تو میرے جرم کا وبال مجھی پر ہوگا، اور جو جرم تم کر رہے ہو، میں اُس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔" ⦗۳۵⦘

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو (اور جو بت تم نے قرار دے رکھے ہیں، وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑ دو، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے جا کر ان سے فرمایا کہ) میں تم کو (درصورت عبادت غیر اللہ کے) صاف صاف ڈراتا ہوں (اور اس

ڈرانے کی تفصیل یہ ہے کہ) میں تمہارے حق میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دِن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں سو ان کی قوم میں جو کافر سردار تھے وہ (جواب میں) کہنے لگے کہ (تم جو نبوّت کا دعویٰ کرتے ہو جیسا نذیر مبین سے معلوم ہوتا ہے تو ہمارے جی کو یہ بات نہیں لگتی کیونکہ) ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا آدمی دیکھتے ہیں (اور بشر کا نبی ہونا دور از کار ہے) اور اگر (بعض لوگوں کے اتباع کرنے سے استدلال کیا جاوے تو وہ قابلِ استدلال نہیں کیونکہ) ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارا اتباع انہیں لوگوں نے کیا ہے جو ہم میں بالکل رذیل ہیں (جن کی عقل اکثر خفیف ہوتی ہے پھر) وہ (اتباع) بھی محض سرسری رائے سے (ہوا ہے یعنی اوّل تو ان کی عقل ہی صائب نہیں غور کے بعد بھی غلطی کرتے دوسرے پھر غور بھی نہیں کیا، اس لئے ایسے لوگوں کا تم کو نبی سمجھ لینا یہ کوئی حجت نہیں بلکہ بالعکس ہمارے اتباع سے مانع ہے کیونکہ شرفاء کو رذیلوں کی موافقت سے عار آتی ہے نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کے اغراض بھی حصولِ مال یا ترفع ہوا کرتا ہے، سو یہ لوگ بھی دل سے ایمان نہیں لائے) اور (اگر یہ کہا جاوے کہ باوجود رذیل ہونے کے ان لوگوں کو کسی خاص امر کے اعتبار سے ہم پر فضیلت ہے جس کے اعتبار سے ان کی رائے اس باب میں صائب ہے سو) ہم تم لوگوں میں (یعنی تم میں اور مسلمانوں میں) کوئی بات اپنے سے زیادہ نہیں پاتے (اس لئے تم مسلمانوں کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے) بلکہ ہم تم کو (بالکل) جھوٹا سمجھتے ہیں، نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم (تم جو کہتے ہو کہ تمہاری نبوّت جی کو نہیں لگتی تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رَبّ کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے میری نبوّت ثابت ہوتی ہو) اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت (یعنی نبوّت) عطا فرمائی ہو پھر وہ (نبوّت یا اس کی حجت) تم کو نہ سوجھتی ہو تو (میں کیا کروں مجبور ہوں) کیا ہم اس (دعویٰ یا دلیل) کو تمہارے سر منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ، (مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ جی کو نہیں لگتی یہ محض اس وجہ سے ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، اور میرے پاس اس کے واقع اور صحیح ہونے کی دلیل موجود ہے یعنی معجزہ وغیرہ نہ کہ کسی کا اتباع، اس سے اس کا جواب بھی ہوگیا کہ ان کا اتباع حجت نہیں لیکن کسی دلیل کا فائدہ موقوف ہے غور وفکر پر وہ تم کرتے نہیں اور یہ میرے بس سے باہر ہے) اور (اتنی بات اور زائد فرمائی کہ) اے میری قوم (یہ تو سوچو کہ اگر میں نبوّت کا غلط دعویٰ کرتا تو آخر اس میں میرا کچھ مطلب تو ہوتا مثلاً یہی ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے خوب مال کماؤں گا تو تم کو معلوم ہے کہ) میں تم سے اس (تبلیغ) پر کچھ مال نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (اسی سے آخرت میں اس کا طالب ہوں اسی طرح اور اغراض بھی اگر غور کرو تو منتفی پاؤ گے پھر جب کوئی غرض نہیں پھر مجھ کو جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا، خلاصہ یہ ہے کہ کذبِ دعویٰ کو کوئی امر مقتضی نہیں اور صدقِ دعویٰ پر دلیل قائم ہے پھر نبوّت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے) اور (تم جو اتباعِ اراذل کو اپنے اتباع سے مانع بتلاتے ہو اور صراحۃً یا دلالۃً یہ چاہتے ہو کہ میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں سو) میں تو ان ایمان والوں کو نکالتا نہیں (کیونکہ) یہ لوگ اپنے رَبّ کے پاس (عزت ومقبولیت کے

ساتھ) جانے والے ہیں (اور بھلا کوئی شخص مقربانِ شاہی کو نکالا کرتا ہے اور اس سے اس کا بھی جواب ہو گیا کہ یہ لوگ دِل سے ایمان نہیں لائے) لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ (خواہ مخواہ کی) جہالت کر رہے ہو (اور بے ڈھنگی باتیں کر رہے ہو) اور (بالفرض والتقدیر) اگر میں ان کو نکال بھی دوں تو (یہ بتلاؤ کہ) مجھ کو خدا کی گرفت سے کون بچائے گا (کیا تم میں اتنی ہمت ہے جو ایسے بیہودہ مشورے دے رہے ہو) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے اور (اس تقریر میں ان کے تمام شبہات کا جواب ہو گیا لیکن آگے ان سب جوابوں کا پھر تتمہ ہے یعنی جب میری نبوّت دلیل سے ثابت ہے تو اوّل تو دلیل کے سامنے استبعاد کوئی چیز نہیں پھر یہ کہ وہ مستبعد بھی نہیں البتہ کسی امرِ عجیب کا دعویٰ نہیں کرتا چنانچہ) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور (یہ تو اپنی نبوّت کے متعلق ارشاد فرمایا، آگے اپنے تابعین کے متعلق ارشاد ہے یعنی) جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں میں ان کی نسبت (تمہاری طرح) یہ نہیں کہہ سکتا کہ (یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے اس لئے) اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو ثواب نہ دے گا ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے (تو ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں اخلاص ہو تو پھر میں ایسی بات کیونکر کہہ دوں) میں تو (اگر ایسی بات کہہ دوں تو) اس صورت میں ستم ہی کروں (کیونکہ بے دلیل دعویٰ کرنا گناہ ہے، جب نوح علیہ السلام نے سب باتوں کا پورا پورا جواب دے دیا جس کا جواب پھر ان سے کچھ بن نہ پڑا تو عاجز ہو کر) وہ لوگ کہنے لگے کہ اے نوح تم ہم سے بحث کر چکے پھر اس بحث کو بڑھا بھی چکے سو (اب بحث چھوڑو اور) جس چیز سے تم ہم کو دھمکایا کرتے ہو (کہ عذاب آجاوے گا) وہ ہمارے سامنے لے آؤ انہوں نے فرمایا کہ (اس کو لانے والا میں کون ہوں مجھ کو پہنچا دینے سنا دینے کا حکم تھا سو میں بجالا چکا) اس کو تو اللہ تعالیٰ بشرطیکہ اس کو منظور ہو تمہارے سامنے لاوے گا اور (اس وقت پھر) تم اس کو عاجز نہ کر سکو گے (کہ وہ عذاب واقع کرنا چاہے اور تم نہ ہونے دو) اور (جو میرا کام تھا پہنچا دینا اور سنا دینا اس میں میں نے تمہاری پوری خیرخواہی اور دِلسوزی کی لیکن) میری خیرخواہی تمہارے کام نہیں آ سکتی گو میں تمہاری کیسی ہی خیرخواہی کرنا چاہوں جبکہ اللہ ہی کو تمہارا گمراہ کرنا منظور ہو (جس کی وجہ تمہارا عناد و استکبار ہے مطلب یہ ہے کہ جب تم ہی اپنی بدقسمتی سے اپنے لئے نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا نہ چاہو تو میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) وہی تمہارا مالک ہے (اور تم مملوک تو تم پر اس کے تمام حقوق واجب ہیں اور تم ان کو براہِ عناد ضائع کر کے مجرم ہو رہے ہو) اور اسی کے پاس تم کو جانا ہے (وہ تمہارے اس سارے عناد و کفر کی کسر نکال دے گا) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرآن خود تراش لیا ہے آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اگر (بالفرض) میں نے تراشا ہو گا تو میرا یہ جرم مجھ پر (عائد) ہو گا (اور تم میرے جرم سے بری الذمہ ہو گے) اور (اگر تم نے یہ دعویٰ تراشا ہو گا یعنی مجھ پر بہتان لگایا ہو گا تو تمہارا یہ جرم تم پر عائد ہو گا اور) میں تمہارے اس جرم سے بری الذمہ رہوں گا۔

معارف ومسائل

حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دی تو قوم نے ان کی نبوّت ورسالت پر چند شبہات واعتراضات پیش کئے، حضرت نوح علیہ السلام نے باذنِ اللہ ان کے جوابات دیئے جن کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل دیانت اور معاشرت کے بھی آگئے ہیں، آیاتِ مذکورہ میں یہی مکالمہ بیان فرمایا گیا ہے۔

تیسری آیت میں مشرکین کی گفتگو ہے جس میں چند شبہات واعتراضات کئے گئے ہیں، اس آیت کے حل طلب الفاظ کی تشریح یہ ہے:

لفظ مَلَأُ عام طور پر جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، بعض ائمۂ لغت کا کہنا ہے کہ قوم کے سرداروں اور ذمہ داروں کی جماعت کو مَلَأُ کہتے ہیں، بَشَر کا ترجمہ ہے انسان یا آدمی اَرَاذِل اَرْذَل کی جمع ہے حقیر وذلیل کو کہا جاتا ہے جس کی قوم میں کوئی حیثیت اور عزّت نہ ہو، بَادِيَ الرَّأْيِ کے معنی ہیں "ابتدائی اور سطحی رائے۔"

ان لوگوں کا پہلا اعتراض حضرت نوح علیہ السلام کی نبوّت ورسالت پر یہ تھا کہ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا یعنی آپ تو ہمیں جیسے انسان اور آدمی ہو، ہماری ہی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے ہو پھر ہم آپ کا یہ فوق العادت امتیاز کیسے تسلیم کرلیں کہ آپ خدا کے رسول اور پیغمبر ہیں۔

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانوں کی طرف جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا جائے وہ جنس بشر سے نہ ہونا چاہئے بلکہ کوئی فرشتہ ہو جس کا امتیاز سارے انسانوں کو چارو ناچار تسلیم کرنا پڑے۔

اس کا جواب چوتھی آیت میں یہ دیا گیا: يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝۲۸

اس میں بتلایا گیا کہ رسول کا بشر یا آدمی ہونا تو نبوّت ورسالت کے منافی نہیں بلکہ غور کرو تو یہی ضروری ہے کہ آدمیوں کا رسول آدمی ہونا چاہئے تاکہ آدمیوں کو اُس سے دین سیکھنا آسان ہو انسان اور فرشتہ کے مزاج میں زمین آسمان کا تفاوت ہے، اگر فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیا جاتا تو انسانوں کو اس سے دین سیکھنا سخت مشکل ہو جاتا، کیونکہ فرشتہ کو تو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے، نہ اُس کو انسانی ضروریات وحوائج پیش آتی ہیں وہ انسانوں کی اس کمزوری کا احساس کیسے کرتا، اور بغیر اس احساس کے انسان عمل میں اس کا اتباع کیسے کرسکتے، یہ مضمون قرآن کی دوسری آیتوں میں صراحۃً اور اشارۃً کئی جگہ آچکا ہے یہاں اس کا ذکر کرنے کے بجائے یہ بتلایا کہ اگر عقل سے کام لو تو رسول وپیغمبر کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ آدمی نہ ہو، ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بینہ اور حجت اس کے ساتھ ہو جس کو دیکھ کر

لوگوں کو یہ تسلیم کرنا آسان ہو جائے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، وہ بینہ اور حجت عام لوگوں کے لئے انبیاء علیہم السلام کے معجزات ہوتے ہیں، اِسی لئے نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے ساتھ اللہ کی طرف سے بینہ اور حجت اور رحمت لے کر آیا ہوں تم اس کو دیکھتے اور غور کرتے تو انکار نہ کرتے، مگر تمہارے انکار و عناد نے تمہاری نگاہوں کو اُس سے اندھا کر دیا اور تم انکار کر بیٹھے اور اپنی ضد پر جم گئے۔

مگر خدا تعالیٰ کی یہ رحمت جو پیغمبر کے ذریعہ آتی ہے ایسی چیز نہیں کہ زبردستی لوگوں کے سر ڈال دی جائے، جب تک وہ خود اس کی طرف رغبت نہ کریں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ دولتِ ایمان جو میں لے کر آیا ہوں اگر میرا بس چلتا تو تمہارے انکار اور ضد کے باوجود تمہیں دے ہی دیتا، مگر یہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے، یہ نعمت زبردستی کسی کے سر نہیں ڈالی جاسکتی، اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبردستی کسی کو مؤمن یا مسلمان بنانا کسی دورِ نبوّت میں جائز نہیں رکھا گیا، بزورِ شمشیر اسلام پھیلانے کا سفید جھوٹ گھڑنے والے خود بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں مگر ایک بات ہے جو ناواقفوں کے دِلوں میں تردّد پیدا کرنے کے لئے چلتی کی جاتی ہے۔

اس کے ضمن میں اس کی وجہ بھی سمجھی گئی کہ فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا گیا، وجہ یہ ہے کہ فرشتہ جو مافوق العادت قوت وطاقت رکھتا ہے اور اپنے وجود کی ہر حیثیت میں انسان سے ممتاز ہے اُس کو دیکھ کر ایمان لانا تو ایک جبری عمل ہو جاتا، کس کی مجال تھی کہ فرشتہ کے سامنے وہ ہٹ دھرمی کرتا جو انبیاء کے سامنے کی جاتی ہے اور شرعاً وہ ایمان مقبول نہیں جو کسی قوتِ قاہرہ سے مجبور ہو کر اِختیار کیا جائے، بلکہ مطلوب اِیمان بالغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کا پورا مشاہدہ کئے بغیر ایمان اختیار کیا جائے۔

ان کا دُوسرا اعتراض یہ تھا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر ایمان لانے والے سب سرسری نظر میں حقیر و ذلیل کمینے لوگ ہیں، کوئی شریف بڑا آدمی نہیں، اس اعتراض کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ تمہاری بات اگر حق اور صحیح ہوتی تو قوم کے بڑے لوگ اس کو قبول کرتے، ان چھوٹے اور رذیل لوگوں کا قبول کرنا اس کی علامت ہے کہ آپ کی دعوت ہی قبول کرنے کے قابل نہیں، دُوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے لئے آپ کی دعوتِ ایمان قبول کرنے سے رکاوٹ یہ ہے کہ ہم ایمان لے آئیں تو بحیثیت مسلمان ہم بھی ان کے برابر سمجھے جائیں گے، نمازوں کی صفوف اور دوسری مجالس میں ہمیں ان کے ساتھ ان کے برابر بیٹھنا پڑے گا یہ ہم سے نہیں ہوسکتا۔

حقیقت سے دُور ان ناواقفوں نے غرباء فقراء کو جن کے پاس مال کی بہتات نہیں اور دنیوی جاہ و مال نہیں اُن کو اَرَاذِل قرار دے رکھا تھا، حالانکہ یہ خود ایک جاہلانہ خیال ہے، عزّت و ذلت اور عقل و فہم مال و دولت کے تابع نہیں بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ جاہ و مال کا ایک نشہ ہوتا ہے جو انسان کو بہت سی معقول اور صحیح باتوں کے سمجھنے اور قبول کرنے سے روک دیتا ہے،

کمزور غریب آدمی کی نظر کے سامنے یہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں وہ حق اور صحیح بات کو قبول کرنے میں مسابقت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ پیغمبروں پر اوّل ایمان لانے والے غرباء فقراء ہی ہوتے ہیں، اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی تصریحات بھی موجود ہیں، اِسی وجہ سے جب ہرقل شاہِ رُوم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دعوتِ ایمان کے لئے پہنچا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ معاملہ کی تحقیق کرے چونکہ اُس نے تورات وانجیل میں انبیاء علیہم السلام کی علامات پڑھی ہوئی تھیں اس لئے اُس وقت عرب کے جو لوگ ملک شام میں آئے ہوئے تھے ان کو جمع کر کے ان علامات کے متعلق چند سوالات کئے۔

ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کا اتباع کرنے والے قوم کے کمزور اور غریب لوگ ہیں یا وہ جو قوم کے بڑے کہلاتے ہیں؟ ان لوگوں نے بتلایا کہ کمزور اور غریب لوگ ہیں! اس پر ہرقل نے اقرار کیا کہ یہ علامت تو سچے نبی ہونے کی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اوّل اوّل اتباع کرنے والے یہی کمزور غریب لوگ ہوتے ہیں۔ [۱]

خلاصہ یہ ہے کہ غرباء وفقراء کو رَذِیل سمجھنا ان کی جہالت تھی، حقیقت میں رَذِیل تو وہ ہے جو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے مالک کو نہ پہچانے، اس کے اَحکام سے روگردانی کرے، اسی لئے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کمینہ اور رذیل کون ہے؟ تو فرمایا وہ لوگ جو بادشاہوں اور افسروں کی خوشامد میں لگے رہیں، اور ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کمینہ وہ آدمی ہے جو اپنا دین بیچ کر دنیا کمائے، کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ کمینہ کون ہے تو فرمایا وہ شخص جو اپنا دین برباد کر کے کسی دوسرے کی دُنیا سنوارے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمینہ وہ شخص ہے جو صحابہ کرامؓ کو بُرا کہے [۲] کیونکہ وہ پوری اُمت کے سب سے بڑے محسن ہیں جن کے ذریعہ دولتِ ایمان وشریعت اُن کو پہنچی ہے۔

بہرحال ان کے اس جاہلانہ خیال کی تردید پانچویں آیت میں اوّل تو اس طرح کی گئی ہے کہ پیغمبر کی نظر کسی کے مال پر نہیں ہوتی وہ کسی سے اپنی خدمت وہمدردی کا معاوضہ نہیں لیتا اُس کا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے اس کی نظر میں امیر وغریب برابر ہوتے ہیں، تم اس سے نہ ڈرو کہ ہم مال دار ہیں، مسلمان ہوجائیں گے تو ہم سے مال کا مطالبہ کیا جائے گا۔

دوسرے یہ بتلایا گیا کہ تم جو ایمان قبول کرنے کے لئے یہ شرط پیش کرتے ہو کہ میں غریب لوگوں کو اپنے پاس سے نکال دُوں تو سمجھ لو کہ یہ میں نہیں کرسکتا کیونکہ یہ لوگ اگرچہ غریب ہیں مگر بارگاہِ رَبّ العزّت میں ان کی رسائی اور اعزاز ہے ایسے لوگوں کو نکالنا کوئی عقل کا کام نہیں۔

اور مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اگر بالفرض میں ان کو نکال دوں تو قیامت کے روز یہ لوگ جب

[۱] صحیح البخاری، باب بدء الوحی ج:۱ ص:۴، ۵ [۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۹ ص:۲۳، ۲۴

اپنے ربّ کے سامنے جائیں گے اور فریاد کریں گے تو میرے پاس کیا جواب ہوگا، چوتھی آیت کا یہی مضمون ہے کہ اگر میں ان کو نکال دوں تو مجھے خدا کے عذاب سے کون بچائے گا، آخر میں فرمایا کہ یہ سب تمہاری جہالت ہے کہ تم آدمیت کو نبوّت کے منافی سمجھتے ہو یا غریب لوگوں کو نکال دینے کی فرمائش کرتے ہو۔

ساتویں آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ تقریر نقل کی گئی ہے جو اُنہوں نے اپنی قوم کے سب اعتراضات سننے کے بعد ان کو کچھ اصولی ہدایات دینے کے لئے اِرشاد فرمائی جس میں بتلایا گیا ہے کہ نبوّت و رسالت کے لئے وہ چیزیں ضروری نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہیں۔

مثلاً پہلے فرمایا وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اس میں ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہے کہ جب اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں تو ان کے ہاتھ میں خزانے ہونے چاہئیں جن سے لوگوں کو داد و دہش کرتے رہیں، نوح علیہ السلام نے بتلا دیا کہ انبیاء کی بعثت کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو متاع دنیا میں اُلجھائیں، اس لئے خزانوں سے اُن کا کیا کام۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے اُس خیال کی تردید ہو جو بعض لوگ سمجھا کرتے ہیں کہ اللہ نے انبیاء کو بلکہ اولیاء کو بھی مکمل اختیارات دے دیئے ہیں، اللہ کی قدرت کے خزانے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں تو نوح علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے خزانوں کا مکمل اختیار کسی نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، اولیاء کا تو کیا ذکر ہے، البتہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں اور خواہشیں اپنی قدرت سے پوری فرماتے ہیں۔

دُوسرے فرمایا وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ان جاہلوں کا یہ بھی خیال تھا کہ جو شخص خدا تعالیٰ کا رسول ہو وہ عالم الغیب بھی ہونا چاہئے، اس جملہ نے واضح کر دیا کہ نبوّت و رسالت علمِ غیب کی مقتضی نہیں اور کیسے ہوتی جبکہ علمِ غیب حق تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے جس میں کوئی نبی یا فرشتہ شریک نہیں ہوسکتا، ہاں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں غیب کے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کو عالم الغیب کہنا درست نہیں ہوتا کیونکہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جس غیب کو چاہیں معلوم کرلیں۔

تیسری بات یہ فرمائی وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ یعنی میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اس میں ان کے اس خیال کی تردید ہوگئی کہ رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہئے۔

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمہاری نظریں جن غریب بے سرمایہ لوگوں کو حقیر و ذلیل دیکھتی ہیں میں تمہاری طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کوئی خیر اور بھلائی نہ دے گا کیونکہ خیر اور بھلائی کا تعلق مال و دولت سے نہیں بلکہ انسان کے

قلب سے ہے اور دلوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا قلب خیر و صلاح کے قابل ہے کس کا نہیں۔
پھر فرمایا کہ اگر میں بھی تمہاری طرح ان کو حقیر و ذلیل کہنے لگوں تو میں بھی ظالم ہو جاؤں گا۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ

اور حکم ہوا طرف نوح کی کہ اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لاچکا

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

سو غمگین نہ رہ اُن کاموں پر جو کر رہے ہیں، اور بنا کشتی روبرو ہمارے اور ہمارے حکم سے

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ

اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بیشک غرق ہوں گے، اور وہ کشتی بناتا تھا

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا

اور جب گزرتے اس پر سردار اس کی قوم کے ہنسی کرتے اس سے، بولا اگر تم ہنستے ہو ہم سے

فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ

تو ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو، اب جلد جان لوگے کہ کس پر آتا ہے

عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا

عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اُترتا ہے اس پر عذاب دائمی یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا

وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ

اور جوش مارا تنور نے کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں ہر قسم سے جوڑا دو عدد اور اپنے گھر کے لوگ

اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰

مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور سب ایمان والوں کو، اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور نوح کے پاس وحی بھیجی گئی کہ: "تمہاری قوم میں سے جو لوگ اب تک ایمان لا چکے ہیں، اُن کے سوا اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا جو حرکتیں یہ لوگ کرتے رہے ہیں، تم اُن پر صدمہ نہ کرو۔ ۳۶ اور ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کی مدد سے کشتی بناؤ، اور جو لوگ ظالم بن چکے ہیں، اُن کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا۔ یہ اب غرق ہو کر رہیں گے۔" ۳۷ چنانچہ وہ کشتی بنانے لگے۔ اور جب بھی اُن کی قوم کے کچھ سردار اُن کے پاس سے گذرتے تو اُن کا مذاق اُڑاتے تھے۔ نوح نے کہا کہ: "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو جیسے تم ہنس رہے ہو، اُسی طرح ہم بھی تم پر ہنستے ہیں۔ ۳۸ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آ رہا ہے جو اُسے رُسوا کر کے رکھ دے گا، اور کس پر وہ قہر نازل ہونے والا ہے جو کبھی ٹل نہیں سکے گا۔" ۳۹ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا، اور تنور اُبل پڑا، تو ہم نے (نوح سے) کہا کہ: "اس کشتی میں ہر قسم کے جانوروں میں سے دو دو کے جوڑے سوار کر لو، اور تمہارے گھر والوں میں سے جن کے بارے میں پہلے کہا جا چکا ہے (کہ وہ کفر کی وجہ سے غرق ہوں گے) اُن کو چھوڑ کر باقی گھر والوں کو بھی، اور جتنے لوگ ایمان لائے ہیں اُن کو بھی (ساتھ لے لو)" اور تھوڑے ہی سے لوگ تھے جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے! ۴۰

خلاصۂ تفسیر

اور (جب نصیحت کرتے ہوئے ایک زمانۂ دراز گزر گیا اور کچھ اثر نہ ہوا تو) نوح (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو (اس وقت تک) ایمان لا چکے ہیں اور کوئی (نیا) شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لاوے گا سو جو کچھ یہ لوگ (کفر و ایذاء و استہزاء) کر رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو (کیونکہ غم تو خلافِ توقع سے ہوتا ہے جب ان سے مخالفت کے سوا کوئی اور توقع ہی نہیں پھر کیوں غم کیا جاوے) اور (چونکہ ہمارا ارادہ اب ان کو غرق کرنے کا ہے اور اس لئے طوفان آنے کو ہے پس) تم (اس طوفان سے بچنے کے لئے) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کر لو (کہ اس کے ذریعہ سے طوفان سے تم اور مؤمنین محفوظ رہو گے) اور (یہ سن لو کہ) مجھ سے کافروں (کی نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جاویں گے (ان کے لئے یہ قطعی طور پر تجویز ہو چکا ہے تو ان کی سفارش بے کار ہو گی، غرض

نوح علیہ السلام نے سامان کشتی کا جمع کیا) اور وہ کشتی تیار کرنے لگے (خواہ خود یا دوسرے کاریگروں کے ذریعہ سے) اور (اثنائے تیاری میں) جب کبھی ان کی قوم میں کسی رئیس گروہ کا ان پر گزر ہوتا تو (ان کو کشتی بناتا دیکھ کر اور یہ سن کر کہ طوفان آنے والا ہے) ان سے ہنسی کرتے (کہ دیکھو پانی کا کہیں نام ونشان نہیں مفت مصیبت جھیل رہے ہیں) آپ فرماتے کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو (کہ عذاب ایسا نزدیک آپہنچا ہے اور تم کو ہنسی سوجھ رہی ہے ہم اس پر ہنستے ہیں) سو ابھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا جاتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور (بعد مرگ) اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے (غرض اسی طرح کے مکالمات اور معاملات ہوا کرتے) یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچا اور زمین سے پانی اُبلنا شروع ہوا (اور یہ علامت تھی طوفان شروع ہو جانے کی اور اوپر سے پانی برسنا شروع ہوا اس وقت) ہم نے (نوح علیہ السلام سے) فرمایا کہ ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو کہ انسان کے لئے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اس (کشتی) میں چڑھا لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (چڑھا لو) باستثناء اس کے جس پر (غرق ہونے کا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی ان میں جو کافر ہو جن کی نسبت اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ کہہ دیا گیا ہے، اس کو سوار مت کرنا اور گھر والوں کے علاوہ) دوسرے ایمان والوں کو بھی (سوار کر لو) اور بجز قلیل آدمیوں کے اُن کے ساتھ کوئی ایمان نہ لایا تھا (بس ان ہی کے سوار کرنے کا حکم ہو گیا)۔

معارف ومسائل

حضرت نوح علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تقریباً ایک ہزار سال کی عمرِ دراز عطا فرمائی، اس کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دینے اور قوم کی اصلاح کرنے کی فکر اور پیغمبرانہ جدوجہد کا بھی یہ درجہ عطا فرمایا کہ اس طویل مدّتِ عمر میں ہمیشہ اپنی قوم کو دینِ حق اور کلمۂ توحید کی دعوت دیتے رہے، قوم کی طرف سے سخت سخت ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا ان کی قوم ان پر پتھراؤ کرتی یہاں تک کہ بے ہوش ہو جاتے پھر جب ہوش آتا تو دُعا کرتے کہ یا اللہ میری قوم کو معاف کر دے یہ بے وقوف جاہل ہیں جانتے نہیں، قوم کی ایک نسل کے بعد دوسری کو اور دوسری کے بعد تیسری کو اس امید پر دعوت دیتے کہ شاید یہ حق کو قبول کر لیں۔

جب اس عمل پر صدیاں گزر گئیں تو رَبُّ العزّت کے سامنے ان کی حالتِ زار کی شکایت کی جو سورۂ نوح میں مذکور ہے رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ اور اتنے طویل مصائب کے بعد اس مردِ خدا کی زبان پر یہ دُعا آئی، رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝۲۶ (المؤمنون) یعنی اے میرے پروردگار ان کی تکذیب کے بالمقابل آپ میری مدد کیجئے۔

قومِ نوح کا ظلم و جور حد سے گزر جانے کے بعد حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان آیات سے خطاب فرمایا جو اُوپر مذکور ہیں۔ (بغوی، مظہری) [1]

ان میں اوّل تو حضرت نوح علیہ السلام کو یہ بتلایا گیا کہ آپ کی قوم میں جن کو ایمان لانا تھا، لے آئے اب کوئی اور شخص ایمان قبول نہ کرے گا ان کے دِلوں پر ان کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کی بناء پر مہر لگ چکی ہے اس لئے اب آپ اس قوم کا غم نہ کھائیں اور ان کے ایمان قبول نہ کرنے سے پریشان نہ ہوں۔

دوسری بات یہ بتلائی گئی کہ اب ہم اس قوم پر عذاب پانی کے طوفان کا بھیجنے والے ہیں اس لئے آپ ایک کشتی تیار کریں جس میں آپ کے اہل وعیال اور جتنے مسلمان ہیں مع اپنی ضروریات کے سماسکیں تاکہ طوفان کے وقت یہ سب اس میں سوار ہو کر نجات پاسکیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق کشتی بنائی، پھر جب طوفان کی ابتداء کی علامات سامنے آگئیں کہ زمین سے پانی اُبلنے لگا تو نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ خود مع اپنے اہل وعیال کے اور اُن لوگوں کے جو آپ پر ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار ہو جائیں، اور انسانوں کی ضروریات جن جانوروں سے متعلق ہیں جیسے گائے، بیل، بکری، گھوڑا، گدھا وغیرہ ان کا بھی ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق سب کو سوار کرلیا۔

آخر میں فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور کشتی میں سوار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔

یہ خلاصۂ مضمون ہے آیاتِ متذکرہ کا، اب ہر ایک آیت کے مفہوم کی تشریح اور اُن سے متعلقہ مضامین ومسائل دیکھئے۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر یہ وحی بھیجی گئی کہ ان کی قوم میں سے جو ایمان لانے والے تھے لاچکے ہیں آئندہ اور کوئی ایمان نہ لائے گا اس لئے یہ لوگ جو کچھ معاملہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں اُس سے آپ غمگین و پریشان نہ ہوں، کیونکہ غم و پریشانی عموماً جب ہوتی ہے جب کسی سے صلاح وفلاح کی امید وابستہ ہو، مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہوتی ہے آپ ان سے مایوس ہو جائیے، اور جو تکلیف وصدمہ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی ایذاؤں سے پہنچ رہا تھا اُس کے انتظام کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا کہ ان کو پانی کے طوفان میں غرق کردیا جائے گا، انہیں حالات میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر اپنی قوم کے لئے وہ بددُعا آئی تھی جس کا ذکر سورۂ نوح میں کیا گیا ہے:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

---

[1] تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۱۷۳، والتفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۸۳

یعنی اے میرے پروردگار! اب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑیئے، کیونکہ اگر یہ رہے تو ان کی آئندہ نسل بھی ایسی ہی سرکش اور فاجر و کافر ہوگی۔

یہی دُعا قبول ہوکر پوری قومِ نوح طوفان میں غرق کی گئی۔

نوح علیہ السلام کو کشتی سازی کی تعلیم

حضرت نوح علیہ السلام کو جب کشتی بنانے کا حکم ملا اُس وقت وہ نہ کشتی کو جانتے تھے نہ اس کے بنانے کو، اس لئے دوسری آیت میں ان کی سفینہ سازی کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا یعنی آپ کشتی بنائیں ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق۔

روایاتِ حدیث میں ہے کہ جبرئیل امین نے بذریعہ وحیِ الٰہی حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی تمام ضروریات اور اس کا طریقہ بتلایا، اُنہوں نے سال کی لکڑی سے یہ کشتی تیار کی۔

بعض تاریخی روایات میں اس کی پیائش یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ تین سو گز لانبا، پچاس گز چوڑا، تیس گز اونچا سہ منزلہ جہاز تھا اور روشن دان مروجہ طریق کے مطابق دائیں بائیں کھلتے تھے [1] اس طرح یہ جہاز سازی کی صنعت وحی خداوندی کے ذریعہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے ہاتھوں شروع ہوئی، پھر اس میں ترقیات ہوتی رہیں۔

تمام ضروری صنعتوں کی اِبتدا وحی کے ذریعہ ہوئی

حافظ شمس الدین ذہبیؒ کی الطب النبوی میں بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان سب کی ابتداء بذریعہ وحی الٰہی کسی پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آئی ہے پھر حسبِ ضرورت اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں، سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف جو وحی آئی ہے اس کا بیشتر حصہ زمین کی آبادکاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے، بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعہ چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ کی ایجادات میں سے ہے۔

سرسیّد صاحب بانی علیگڑھ کالج نے خوب فرمایا ہے کہ زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کرلیں لیکن مدارِ کار ہر قسم کی گاڑیوں کا دُھری اور پہیے پر ہی رہا، وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی سے لے کر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے اس لئے سب سے بڑا موجد گاڑیوں کا وہ شخص ہے جس نے پہیہ ایجاد کیا کہ دنیا بھر کی ساری مشینری کی

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۳۱۹

رُوح یہیہ ہی ہے اور معلوم ہو چکا کہ یہ ایجاد پیغمبر اوّل حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بذریعہ وحی الٰہی عمل میں آئی ہے۔

اِس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اشیاء ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ بطورِ وحی انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی ہدایت دینے کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ آپ کی قوم پر طوفان آئے گا، وہ غرق ہوں گے، اُس وقت آپ اپنی شفقت کی بناء پر ان کے بارے میں کوئی سفارش نہ کریں۔

تیسری آیت میں سفینہ سازی کے زمانہ میں قومِ نوح علیہ السلام کی غفلت اور انجامِ بد سے بے فکری کا حال ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام بحکمِ خداوندی کشتی بنانے میں مشغول تھے ان کی قوم کے سردار جب ان کو دیکھتے اور پوچھتے کہ کیا کر رہے ہو؟ تو یہ فرماتے کہ طوفان آنے والا ہے اس لئے کشتی تیار کر رہا ہوں ان کی قوم ان کا مذاق اڑاتی اور استہزاء کرتی تھی کہ یہاں پینے کے لئے تو پانی کا قحط ہے، یہ بزرگ اس خشکی میں کشتی چلانے کی فکر میں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا کہ ''اگر آج تم ہم سے استہزاء کرتے ہو تو یاد رکھو کہ ایک دِن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں ہم تم سے استہزاء کریں گے''، مراد یہ ہے کہ حالات ایسے پیش آئیں گے جو خود تمہارے استہزاء کے موجب ہوں گے، کیونکہ حقیقۃً استہزاء و تمسخر شانِ انبیاء کے خلاف ہے وہ کسی کے لئے جائز نہیں بلکہ حرام ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات:۱۱) یعنی کوئی کسی کے ساتھ استہزاء نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ وہ اِس استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو، اس لئے یہاں استہزاء سے مراد اُن کے استہزاء کا عملی جواب ہے کہ جب تم عذاب میں گرفتار ہوگے تو ہم تمہیں بتلائیں گے کہ یہ ہے تمہارے استہزاء کا انجام، جیسا کہ اس کے بعد چوتھی آیت میں فرمایا ہے کہ ''عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور کس پر دائمی عذاب ہوتا ہے۔'' پہلے عذاب سے دنیا کا اور عذابِ مقیم سے آخرت کا دائمی عذاب مراد ہے۔

پانچویں آیت میں طوفان کی ابتداء اور اس سے متعلقہ ہدایات اور واقعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس میں ارشاد فرمایا حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ یعنی جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تَنُّوْر سے پانی اُبلنا شروع ہو گیا۔

لفظ تَـنُّـوْر کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، سطحِ زمین کو بھی تنور کہتے ہیں، روٹی پکانے کے تنور کو بھی تنور کہا جاتا ہے، زمین کے بلند حصہ کے لئے بھی تنور بولا جاتا ہے ـــ اِسی لئے ائمۂ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ اس جگہ تَنُّوْر سے مراد سطحِ زمین ہے کہ اُس سے پانی اُبلنے لگا ـــ بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام ''عَيْـن وَرْدَہ'' ملکِ شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا ـــ بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا، وہ مراد ہے، اکثر مفسرین حضرت حسنؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

اور شعبیؒ تو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ تنور شہر کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجد کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ کے گھر کے تنور سے پانی اُبلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آ گیا۔ (قرطبی ومظہری) [1]

مفسر قرطبیؒ نے فرمایا کہ اگرچہ تَنُّوْر کے معنی میں مفسرین کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی اختلاف نہیں، جب طوفان کا پانی ابلنا شروع ہوا تو روٹی پکانے کے تنور سے بھی نکلا، سطح زمین سے بھی اُبلا، ملکِ شام عَیْنُ الْوَرْدَۃ کے تنور سے بھی نکلا، جیسا کہ قرآنِ کریم نے خود تصریح فرمائی ہے فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا (القمر) یعنی ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے لئے کھول دیئے اور زمین سے چشمے ہی چشمے پھوٹ پڑے۔

شعبیؒ نے اپنے بیان میں یہ بھی فرمایا کہ یہ کوفہ کی جامع مسجد، مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ کے بعد چوتھی مسجد ہے جو ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔

آیت میں آگے یہ بیان فرمایا کہ جب طوفان شروع ہو گیا تو حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا اِحْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یعنی سوار کر لیجئے اس کشتی میں ہر جوڑے والے جانوروں کا ایک ایک جوڑا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کشتیٔ نوح میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ صرف وہ جانور جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، اس لئے تمام دریائی جانور اس سے نکل گئے اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض سب نکل گئے صرف پالتو جانور گائے، بیل بھینس، بکری وغیرہ رہ گئے۔

اس سے وہ شبہ دور ہو گیا جو سطحی نظر میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کشتی میں اتنی وسعت کیسے ہوگئی کہ دُنیا بھر کے جانور سما گئے۔

اور پھر نوح علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے اہل وعیال کو بجز ان کے جو کفر پر ہیں کشتی میں سوار کر لیں اور ان سب لوگوں کو بھی جو آپ پر ایمان لائے ہیں، مگر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

کشتی والوں کی صحیح تعداد قرآن وحدیث میں متعین نہیں کی گئی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۹ ص:۳۳، ۳۴، والتفسیر المظهری تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۸۶، وتفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۱۷۶

ہے کہ تعداد کل اسّی آدمیوں کی تھی جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان کی تین بیبیاں تھیں، چوتھا بیٹا کفار کے ساتھ رہ کر طوفان میں غرق ہوا۔ [1]

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ

اور بولا سوار ہوجاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا بیشک میرا ربّ ہے

لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰى نُوْحُۨ

بخشنے والا مہربان اور وہ لیے جارہی تھی ان کو لہروں میں جیسے پہاڑ اور پکارا نوحؑ نے

ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے اے بیٹے سوار ہوجا ساتھ ہمارے اور مت رہ ساتھ کافروں کے

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَاۗءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ

بولا جا لگوں گا کسی پہاڑ کو جو بچالے گا مجھ کو پانی سے کہا کوئی بچانے والا نہیں آج

مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ

اللہ کے حکم سے مگر جس پر وہی رحم کرے اور حائل ہوگئی دونوں میں موج پھر ہوگیا

مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَاۗءَكِ وَيٰسَمَاۗءُ اَقْلِعِيْ

ڈوبنے والوں میں اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا

وَغِيْضَ الْمَاۗءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَي الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا

اور سوکھا دیا گیا پانی اور ہوچکا کام اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا کہ

[1] تفسیر البغوی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۱۷۷

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

دُور ہو قوم ظالم۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور نوح نے (ان سب سے) کہا کہ: ''اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس کا چلنا بھی اللہ ہی کے نام سے ہے، اور لنگر ڈالنا بھی۔ یقین رکھو کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔'' ﴿۴۱﴾ اور وہ کشتی پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیان چلی جاتی تھی۔ اور نوح نے اپنے اُس بیٹے کو جو سب سے الگ تھا، آواز دی کہ: ''بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ، اور کافروں کے ساتھ نہ رہو۔'' ﴿۴۲﴾ وہ بولا: ''میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔'' نوح نے کہا: ''آج اللہ کے حکم سے کوئی کسی کو بچانے والا نہیں ہے، سوائے اُس کے جس پر وہ ہی رحم فرما دے۔'' اس کے بعد اُن کے درمیان موج حائل ہو گئی، اور ڈُوبنے والوں میں وہ بھی شامل ہوا۔ ﴿۴۳﴾ اور حکم ہوا کہ: ''اے زمین! اپنا پانی نگل لے، اور اے آسمان! تھم جا'' چنانچہ پانی اُتر گیا، اور سارا قصہ چکا دیا گیا، کشتی جودی پہاڑ پر آ ٹھہری، اور کہہ دیا گیا کہ: ''بربادی ہے اُس قوم کی جو ظالم ہو!'' ﴿۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) نے (سب جانوروں کو سوار کر کے اپنے متبعین سے) فرمایا کہ (آؤ) اس کشتی میں سوار ہو جاؤ (اور غرق سے کچھ اندیشہ مت کرنا کیونکہ) اس کا چلنا اور ٹھہرنا (سب) اللہ ہی کے نام سے ہے (اور وہی اس کے محافظ ہیں پھر اندیشہ کیوں کیا جاوے اور گو بندوں کے گناہ مقتضی غرق کو ہیں مگر) بالیقین میرا ربّ غفور ہے رحیم ہے (وہ اپنی رحمت سے گناہ بخش دیتا ہے اور حفاظت بھی کرتا ہے، غرض سب کشتی پر سوار ہو گئے اور اس اثناء میں پانی بڑھ گیا) اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے (ایک سگے یا سوتیلے) بیٹے کو (جس کا نام کنعان تھا اور وہ باوجود فہمائش کے ایمان نہ لایا تھا اور بوجہ ایمان نہ لانے کے کشتی میں سوار نہ کیا گیا تھا اور اس وقت کشتی کنارے کے قریب ہی تھی اور وہ کنارہ پر موجود تھا بطور آخری دعوت کے) پکارا اور وہ (کشتی سے) علیحدہ مقام پر تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے (کشتی میں سوار ہونے کی شرط کہ ایمان ہے، بجالا کر جلدی) ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور (عقیدہ میں) کافروں کے ساتھ مت ہو (یعنی کفر کو چھوڑ دے کہ غرق سے بچ جاوے) وہ کہنے لگا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی

(میں غرق ہونے) سے بچالے گا (کیونکہ وہ وقت ابتداءِ طوفان کا تھا پہاڑوں کے اوپر پانی نہ پہنچا تھا) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں (نہ پہاڑ اور نہ اور کوئی چیز) لیکن جس پر وہی رحم کرے (تو اس کو خود ہی بچالے، غرض کنعان اس وقت بھی ایمان نہ لایا اور پانی زور شور کے ساتھ اس طرف سے بڑھ گیا) اور دونوں (باپ بیٹوں) کے بیچ میں ایک موج حائل ہوگئی پس وہ (بھی مثل دوسرے کافروں کے) غرق ہوگیا اور (جب کفار سب غرق ہوچکے تو) حکم ہوگیا کہ اے زمین اپنا پانی (جو کہ تیری سطح پر موجود ہے) نگل جا، اور اے آسمان (برسنے سے) تھم جا (چنانچہ دونوں امر واقع ہوگئے) اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی (کوہ) جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دُور۔

معارف ومسائل

کشتیوں اور دُوسری سواریوں پر سوار ہونے کے آداب

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں کشتی اور سواری پر سوار ہونے کے آداب کی تعلیم ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا کہہ کر سوار ہوں، مَجْرٰے کے معنٰی جاری ہونا اور چلنا اور مُرْسٰی کے معنٰی رکنا اور ٹھہرنا ہیں، معنٰی یہ ہیں کہ اس کشتی اور سواری کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور اس کے نام سے ہے اور رکنا اور ٹھہرنا بھی اسی کی قدرت کے تابع ہے۔

ہر سواری کا چلنا اور ٹھہرنا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے

انسان اگر ذرا بھی غور سے کام لے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کشتی ہو یا خشکی پر چلنے والی کوئی سواری، نہ اس کا پیدا کرنا بنانا اس کی قدرت میں ہے نہ چلانا اور ٹھہرانا اس کے بس کا ہے، انسان اپنی سطحی اور سرسری نظر کی بناء پر سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو بنایا اور چلایا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ اس نے وہ لوہا، لکڑی، پیتل، المونیم وغیرہ پیدا کئے ہیں جو ان تمام سواریوں کا خام مادّہ ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ ایک تولہ لوہا یا ایک فٹ لکڑی پیدا کرسکے، پھر ان خام اجناس (مٹیریل) سے طرح طرح کے کَل پُرزے بنانے کی عقل وفہم کس نے دی؟ کیا یہ عقل وفہم انسان نے خود پیدا کرلی ہے؟ اگر خود پیدا کرلینا انسان کے بس میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بے وقوف کم عقل نہ رہتا، ہر شخص افلاطون وارسطو ہی بن کر رہتا، کہیں کی لکڑی کہیں کا لوہا، کہیں کے آلات واوزار استعمال کرکے سواری کا ڈھانچہ بھی بن گیا، اب اس منوں اور ٹنوں کے بھاری بوجھ کو لے کر زمین پر دوڑنے یا ہوا پر اڑنے کے لئے جس طاقت (پاور) کی ضرورت ہے وہ خواہ پیٹرول سے حاصل کی جائے یا ہوا اور پانی کے ٹکراؤ سے برقی صورت میں حاصل کی جائے، بہرحال سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے انسان نے کس چیز کو پیدا

کیا ہے، پٹرول اس نے پیدا کیا یا ہوا، پانی اس نے بنایا، اُن میں آکسیجن، ہائیڈروجن کی طاقتیں اس نے پیدا کیں؟

اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے تو اس کو سائنس کی اُعجوبہ کاری اور عروج کے اس زمانہ میں بھی اپنی بے بسی اور عاجزی ہی کا مشاہدہ ہوگا، اور اس اقرار کے بغیر نہ رہ سکے گا کہ ہر سواری کا چلنا اور رُکنا سب خالقِ کائنات حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہے۔

غافل انسان اپنے ظاہری جوڑ توڑ کے تصرفات جن کا دوسرا نام سائنسی ایجادات ہے ان پر فخر و غرور کے نشہ میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس غفلت کا پردہ چاک کرتے ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا کی اصل حقیقت سامنے کر دیتے ہیں، دیکھنے میں تو یہ ایک دو لفظی فقرہ ہے مگر غور کیجئے تو یہ کلید اور کنجی ہے ایک ایسے دروازہ کی جہاں سے انسان اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے روحانی عالَم کا باشندہ بن جاتا ہے، اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں جمال حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہیں سے مؤمن کی دنیا اور کافر کی دنیا میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے، سواری پر دونوں سوار ہوتے ہیں لیکن مؤمن کا قدم جو سواری پر آتا ہے وہ اُس کو صرف زمین کی مسافت قطع نہیں کراتا بلکہ عالَمِ بالا سے بھی روشناس کر دیتا ہے۔

دوسری اور تیسری آیت میں بتلایا کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے سب اہل و عیال کشتی میں سوار ہو گئے مگر ایک لڑکا جس کا نام کنعان بتلایا جاتا ہے سوار ہونے سے رہ گیا تو پدرانہ شفقت سے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو پکارا کہ ہمارے ساتھ کشتی میں آجاؤ، کافروں کے ساتھ نہ رہو کہ غرق ہو جاؤ گے، یہ لڑکا کافروں دشمنوں کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور حقیقت میں کافر تھا مگر غالباً حضرت نوح علیہ السلام کو اس کے کافر ہونے کا یقینی طور پر علم نہ تھا اور اگر علم تھا تو کفر سے توبہ کر کے ایمان لانے کی دعوت کے طور پر اس کو کشتی میں سوار ہونے اور کافروں کا ساتھ چھوڑنے کی نصیحت فرمائی، مگر اس بدبخت نے اس وقت بھی طوفان کو سرسری سمجھا اور کہنے لگا کہ آپ فکر نہ کریں، میں پہاڑ پر چڑھ کر طوفان سے بچ جاؤں گا، حضرت نوح علیہ السلام نے پھر متنبہ کیا کہ ظالم کس خیال میں ہے آج کوئی اونچی عمارت یا پہاڑ کسی کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں اور بچنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم فرماویں، باپ بیٹے کی یہ گفتگو دور سے چل ہی رہی تھی کہ ایک موج اس طوفان کی آئی اور بیٹے کو بہا لے گئی، تاریخی روایات میں ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام کا پانی بڑے سے بڑے پہاڑ کی چوٹی سے پندرہ گز اور بعض روایات کے لحاظ سے چالیس گز اونچائی پر تھا۔

چوتھی آیت میں طوفان کے ختم ہونے اور حالات کے ہموار ہونے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو خطاب کر کے حکم دیا يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ اے زمین تو اپنا پانی نگل لے، مراد یہ تھی کہ جس قدر پانی زمین سے اُبلا تھا اس کے لئے یہ حکم دے دیا کہ اس کو پھر زمین اپنے اندر اتار لے، آسمان کو حکم دیا گیا کہ اب پانی برسانا بند کر دے، اس طرح

زمین سے نکلا ہوا پانی پھر زمین میں چلا گیا اور آسمان سے آئندہ پانی برسنا بند ہو گیا، آسمان سے برسا ہوا جتنا پانی زمین پر موجود تھا اس کو قدرت نے دریاؤں اور نہروں کی شکل دے دی جس سے انسان فائدہ اُٹھائے۔ (تفسیر قرطبی ومظہری)[1]

اس آیت میں حق تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو خطاب کر کے اَحکام دیئے ہیں، حالانکہ ظاہر نظر میں وہ کوئی ذی شعور چیزیں نہیں، اِسی لئے بعض حضرات نے اس کو مجاز واستعارہ پر محمول کیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری نظر اور ہمارے اعتبار سے دنیا کی جتنی چیزیں بے شعور، بے حس، بے جان ہیں، حقیقت میں وہ سب ذی روح ذی شعور چیزیں ہیں البتہ اُن کا شعور وادراک اس درجہ کا نہیں جس درجہ کا انسان وغیرہ کو حاصل ہے اِسی لئے ان کو غیر ذی شعور قرار دے کر اَحکامِ شرعیہ کا مکلّف نہیں بنایا گیا، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس پر شاہد ہیں جیسے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل: ۴۴) یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد وتسبیح نہ پڑھتی ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اس کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت عقل وشعور پر، اِس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں عقل وشعور اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق موجود ہے اُسی عقل وشعور سے وہ اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور جس کام پر اُس کو اُس کے پیدا کرنے والے نے لگا دیا ہے اُس کام کو ہر چیز خوب سمجھتی ہے اور اُس کی ادائیگی میں بڑی مضبوطی سے لگی ہوئی ہے، آیتِ قرآن اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰہٰ) کا یہی مطلب ہے، اس لئے اس آیت میں اگر آسمان وزمین کے خطاب کو حقیقی معنٰی میں خطاب قرار دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ بقول رومیؒ ؎

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند با من وتو مردہ باحق زندہ اند[2]

چوتھی آیت کے آخر میں فرمایا کہ زمین وآسمان نے اَحکام کی تعمیل کی تو طوفان کا قصہ ختم ہو گیا، اور سفینہ نوح علیہ السلام جودی پہاڑ پر ٹھہر گیا، اور ظالموں کو ہمیشہ کے لئے ''رحمت سے دُور'' کہہ دیا گیا۔

جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے اس کا محلِ وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطنِ اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصہ کا نام جودی ہے، اسی کے ایک حصہ کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہِ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں، مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہری تھی۔

قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں جن کو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج: ۹ ص: ۴۱ والتفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج: ۵ ص: ۸۹

[2] ترجمہ: مٹی، ہوا، پانی اور آگ غلام ہیں، میرے اور تیرے اعتبار سے مردہ ہیں لیکن اللہ کے نزدیک زندہ ہیں۔

تفسیر طبری اور بغوی میں ہے کہ نوح علیہ السلام ۱۰ رماہ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینہ تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سات مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کو بلند کر کے غرق سے بچا لیا تھا، پھر ۱۰ محرم یوم عاشوراء میں طوفان ختم ہو کر کشتی جبل جودی پر ٹھہری، حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا اور کشتی میں جتنے آدمی ساتھ تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی کے شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا۔ (مظہری وقرطبی)[1]

روزِ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ کی اہمیت تمام شرائع انبیاء میں قدیم سے چلی آتی ہے ابتداء اسلام میں رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشوراء کا روزہ فرض تھا، رمضان کی فرضیت نازل ہونے کے بعد فرض نہیں، مگر سنت اور ثوابِ عظیم ہمیشہ کے لئے ہے۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ

اور پکارا نوح نے اپنے رَبّ کو کہا اے رَبّ میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے

وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ

اور تو سب سے بڑا حاکم ہے فرمایا اے نوح وہ نہیں تیرے گھر والوں میں

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ

اس کے کام ہیں خراب سو مت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں، میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو

اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ

کہ نہ ہوجائے تُو جاہلوں میں بولا اے رَبّ میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ پوچھوں تجھ سے

مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

جو معلوم نہ ہو مجھ کو، اور اگر تُو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے تو میں ہوں نقصان والوں میں،

---

[1] تفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:۹ ص:۴۲،۴۱، والتفسير المظهری ج:۵ ص:۹۰

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ

حکم ہوا اے نوح اُتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ تجھ پر اور ان فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں،

وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

اور دوسرے فرقے ہیں کہ ہم فائدہ دیں گے ان کو پھر پہنچے گا ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ

یہ باتیں من جملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف نہ تجھ کو ان کی خبر تھی

وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع

اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے سو تو صبر کر البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا۔

ع ۴ معانقة ۹

الوقف علی قائم أحسن والحق ۱۲

آسان ترجمۂ قرآن

اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ: ”اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے گھر ہی کا ایک فرد ہے، اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے، اور تو سارے حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے!“ ﴿۴۵﴾ اللہ نے فرمایا: ”اے نوح! یقین جانو وہ تمہارے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ناپاک عمل کا پلندہ ہے۔ لہٰذا مجھ سے ایسی چیز نہ مانگو جس کی تمہیں خبر نہیں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں شامل نہ ہو۔“ ﴿۴۶﴾ نوح نے کہا: ”میرے پروردگار! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ آئندہ آپ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی، اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں بھی اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا جو برباد ہو گئے ہیں۔“ ﴿۴۷﴾ فرمایا گیا کہ: ”اے نوح! اب (کشتی سے) اُتر جاؤ، ہماری طرف سے وہ سلامتی اور برکتیں لے کر جو تمہارے لئے بھی ہیں، اور تمہارے ساتھ جتنی قومیں ہیں، اُن کے لئے بھی! اور کچھ قومیں ایسی ہیں جن کو ہم (دُنیا میں) لطف اُٹھانے کا موقع دیں گے، پھر ان کو ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا۔“ ﴿۴۸﴾ (اے پیغمبر!) یہ غیب کی کچھ باتیں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں۔ یہ باتیں نہ تم اس سے پہلے جانتے تھے، نہ تمہاری قوم۔ لہٰذا صبر سے کام لو، اور آخری انجام متقیوں ہی کے حق میں ہوگا۔ ﴿۴۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (جب) نوح (علیہ السلام نے کنعان کو ایمان لانے کے لئے فرمایا اور اس نے نہ مانا تو اس کے غرق ہونے کے قبل انہوں) نے (اس امید پر کہ شاید حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کے دِل میں ایمان اِلقاء فرمادے اور ایمان لے آوے) اپنے رَبّ کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رَبّ میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا (یہ) وعدہ بالکل سچا ہے (کہ گھر والوں میں جو ایمان والے ہیں ان کو بچالوں گا) اور (گو یہ سردست ایمان والا اور مستحقِ نجات نہیں ہے لیکن) آپ احکم الحاکمین (اور بڑی قدرت والے) ہیں (اگر آپ چاہیں تو اس کو مؤمن بنادیں تاکہ یہ بھی اس وعدۂ حقہ کا محل بن جائے، خلاصہ معروض کا دُعا تھی اس کے مؤمن ہوجانے کے لئے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نوح یہ شخص (ہمارے علمِ ازلی میں) تمہارے (اِن) گھر والوں میں نہیں (جو ایمان لاکر نجات پاویں گے یعنی اس کی قسمت میں ایمان نہیں بلکہ) یہ (خاتمہ تک) تباہ کار (یعنی کافر رہنے والا) ہے سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست مت کرو جس کی تم کو خبر نہیں (یعنی ایسے امر محتمل کی دُعا مت کرو) میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں داخل نہ ہوجاؤ، نوح نے عرض کیا کہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ (آئندہ) آپ سے ایسے امر کی درخواست کروں جس کی مجھ کو خبر نہ ہو اور (گزشتہ معاف کردیجئے کیونکہ) اگر آپ میری مغفرت نہ فرماویں گے اور مجھ پر رحم نہ فرماویں گے تو میں تو بالکل تباہ ہی ہوجاؤں گا (جب جودی پر کشتی ٹھہرنے کے چندروز بعد پانی بالکل اتر گیا اس وقت نوح علیہ السلام سے) کہا گیا (یعنی اللہ تعالیٰ نے خود یا کسی فرشتہ کے ذریعہ سے ارشاد فرمایا) کہ اے نوح (اب جودی پر سے زمین پر) اترو ہماری طرف سے سلام اور برکتیں لے کر جو تم پر نازل ہوں گی اور ان جماعتوں پر کہ تمہارے ساتھ ہیں (کیونکہ ساتھ والے سب مسلمان تھے اور اس علّت کے اشتراک سے قیامت تک کے مسلمانوں پر بھی سلام و برکات کا نزول معلوم ہوگیا) اور (چونکہ یہ کلام بعد والے مسلمانوں پر بھی برکات کے نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور بعد والوں میں بعضے کافر بھی ہوں گے اِس لئے اُن کا حال بھی بیان فرماتے ہیں کہ) بہت سی ایسی جماعتیں بھی ہوں گی کہ ہم ان کو (دنیا میں) چندروز عیش دیں گے پھر (آخرت میں) ان پر ہماری طرف سے سزاسخت واقع ہوگی، یہ قصہ (آپ کے اِعتبار سے) من جملہ اخبارِ غیب کے ہے جس کو ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچاتے ہیں اس (قصہ) کو اس (ہمارے بتلانے) کے قبل نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم (جانتی تھی، اس اعتبار سے غیب تھا اور بجز وحی کے دوسرے سب اسباب علم کے یقیناً مفقود ہیں پس ثابت ہوگیا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے اور یہی نبوّت ہے لیکن یہ لوگ بعد ثبوتِ نبوّت کے بھی آپ کی مخالفت کرتے ہیں) سو صبر کیجئے (جیسا اس قصہ

میں نوح علیہ السلام کا صبر آپ کو معلوم ہوا ہے) یقیناً نیک انجامی متقیوں کے لئے ہے (جیسا نوح علیہ السلام کے قصہ میں معلوم ہوا کہ کفار کا انجام بُرا اور مسلمانوں کا انجام اچھا ہوا اسی طرح ان کفار کا چند روزہ زور شور ہے پھر اخیر میں غلبہ حق ہی کو ہوگا) ۔

معارف و مسائل

سورۂ ہود کی مذکورہ پانچ آیتوں میں طوفانِ نوح علیہ السلام کا باقی حصہ اور اس سے متعلق ہدایات مذکور ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان جب والدِ بزرگوار کی نصیحت اور دعوت کے باوجود کشتی میں سوار نہ ہوا تو اس کو موجِ طوفان میں مبتلا دیکھ کر شفقتِ پدری نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اللہ رَبّ العزّت کی بارگاہ میں عرض کیا کہ آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میرے گھر والوں کو طوفان سے بچائیں گے اور بلاشبہ آپ کا وعدہ حق و صحیح ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ میرا بیٹا جو میرے گھر والوں میں داخل ہے وہ طوفان کی نذر ہو رہا ہے اور آپ تو اَحکم الحاکمین ہیں ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، اب بھی اس کو طوفان سے بچا سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ یہ لڑکا آپ کے اہل وعیال میں داخل نہیں رہا کیونکہ اُس کا عمل اچھا نہیں بلکہ تباہ کار ہے اس لئے آپ کو نہیں چاہئے کہ اس حقیقتِ حال سے بے خبر رہ کر مجھ سے کوئی سوال کریں، ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ۔

حق تعالیٰ کے اس اِرشاد سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اس بیٹے کے کفر کا پورا حال معلوم نہ تھا اس کے نفاق کی وجہ سے وہ اس کو مسلمان ہی جانتے تھے، اسی لئے اس کو اپنے اہل کا ایک فرد قرار دے کر طوفان سے بچانے کی دعا کر بیٹھے ورنہ اگر اُن کو حقیقتِ حال معلوم ہوتی تو ایسی دُعا نہ کرتے، کیونکہ اُن کو صریح طور پر پہلے ہی یہ ہدایت دے دی گئی تھی کہ جب طوفان آجائے تو پھر آپ ان سرکشوں میں سے کسی کے متعلق کوئی سفارش کی گفتگو نہ فرمائیں، جیسا کہ پچھلی آیات میں گزر چکا ہے وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷ اس صاف و صریح حکم کے بعد ناممکن تھا کہ پیغمبر خدا اس کی خلاف ورزی کی جرأت کرتے، بجز اس احتمال کے جس کو اُوپر خلاصۂ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ اس دُعا کا حاصل اس بیٹے کے مؤمن ہو جانے کی دُعا ہے یہ نہیں کہ اس کے موجودہ حال میں اس کو طوفان سے بچایا جائے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی اس کے کفر سے لاعلمی اور اُس کی بناء پر دُعا نجات کو بھی حق تعالیٰ نے عذرِ صحیح قرار نہیں دیا اور اسی لئے تنبیہ کی گئی کہ بغیر علم کے ایسی دُعا کیوں کی، اور یہ پیغمبرانہ شان کی ایک ایسی لغزش ہے جس کو حضرت نوح علیہ السلام اُس وقت بھی اپنے عذر میں پیش کریں گے جب محشر میں پوری مخلوقِ خدا آپ سے شفاعت کرنے کی درخواست کرے گی تو وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے ایسی لغزش ہو چکی ہے اس لئے میں شفاعت کی جرأت نہیں کر سکتا۔

کافر اور ظالم کے لئے دُعا جائز نہیں

اِس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دُعا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دُعا کرنے والا پہلے یہ معلوم کرلے کہ جس کام کی دُعا کررہا ہے وہ جائز وحلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دُعا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، تفسیر رُوح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لئے دُعا کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز وحرام ہونا معلوم ہو اُس کے لئے دُعا کا ناجائز ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگیا۔ [۱]

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہوگیا ہے کہ جو شخص کسی دُعا کے لئے آیا اُس کے واسطے ہاتھ اٹھادیئے اور دُعا کردی حالانکہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدمہ کے لئے یہ دُعا کرارہا ہے اُس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لئے دُعا کرارہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں، کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلا ہوگا یا کسی کی حق تلفی کرکے اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے گا۔

ایسی دُعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام وناجائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی حالت بھی ہوتو حقیقتِ حال اور معاملہ کے جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دُعا کے لئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔

مؤمن وکافر میں رشتۂ اُخوّت نہیں ہوسکتا وطنی یا نسبی بنیاد پر قومیت کی تعمیر اُصولِ اسلام سے بغاوت ہے

دُوسرا مسئلہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مؤمن اور کافر کے درمیان اگرچہ رشتہ قرابت کا ہو، مگر دینی اور اجتماعی معاملات میں اس رشتہ داری کا کوئی اثر نہیں ہوگا، کوئی شخص کتنا ہی عالی نسب ہو، کتنے ہی بڑے بزرگ کی اولاد ہو، یہاں تک کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں داخل ہونے کا شرف رکھتا ہو، اگر وہ مؤمن نہیں ہے تو دینی معاملات میں اُس کے اس نسب عالی اور قرابت نبوی کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا، تمام دینی معاملات میں تو مدارِ کار ایمان اور صلاح وتقویٰ پر ہے، جو صالح ومتقی ہے وہ اپنا ہے جو ایسا نہیں وہ بیگانہ ہے۔

هزار خویش که بیگانه از خدا باشد فدائے یک تن بیگانه کآشنا باشد [۲]

اگر دینی معاملات میں بھی ان رشتہ داریوں کی رعایت ہوتی تو بدر واُحد کے میدانوں میں بھائی کی تلوار بھائی پر نہ چلتی، بدر واُحد اور اَحزاب کے معرکے تو سب کے سب ایک ہی خاندانوں کے افراد کے درمیان پیش آئے ہیں، جس

---

[۱] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۸ ص:۲۵۹

[۲] ترجمہ: ہزار قریب رشتہ دار جو خدا تعالیٰ سے بے گانہ ہوں اس ایک شخص پر فدا ہیں جو آشنائے حق ہو۔

نے واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت اور برادری نسبی تعلقات یا وطنی اور لسانی وحدتوں پر دائر نہیں ہوتی بلکہ ایمان و عمل پر دائر ہے، ایمان والے خواہ کسی ملک کے باشندے اور کسی خاندان کے افراد اور کوئی زبان بولنے والے ہوں سب ایک قوم اور ایک برادری ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰) کا یہی مطلب ہے، اور جو ایمان و عملِ صالح سے محروم ہیں وہ اسلامی برادری کے فرد نہیں، قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زبانی اس حقیقت کو بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الممتحنہ: ۴) یعنی ہم تم سے بھی بَری ہیں اور تمہارے معبودوں سے بھی۔

اس مسئلہ میں احقر نے دینی معاملات کی قید اس لئے لگائی ہے کہ دنیوی معاملات میں حسنِ معاشرت، حسنِ اخلاق اور احسان و کرم کا سلوک کرنا الگ چیز ہے وہ غیر صالح سے بھی جائز بلکہ مستحسن اور ثواب ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا تعامل اور غیر مسلموں کے ساتھ احسان و سلوک کے بیشمار واقعات اس پر شاہد ہیں۔

آج کل جو وَطنی اور لسانی یا لونی بنیادوں پر قومیت کی تعمیر کی جاتی ہے، عرب برادری ایک قوم، ہندی، سندھی دوسری قوم قرار دی جاتی ہے، یہ قرآن و سنت کے خلاف اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولِ سیاست سے بغاوت کے مرادف ہے۔

تیسری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے جو معذرت پیش ہوئی اس کا ذکر ہے، جس کا خلاصہ اللہ جل شانہٗ کی طرف رُجوع و التجاء اور غلط کاموں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ لینے کی دعاء اور پھر گزشتہ لغزش کی معافی اور مغفرت و رحمت کی درخواست ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان سے اگر کوئی خطا سرزد ہو جائے تو آئندہ اُس سے بچنے کے لئے تنہا اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ سے پناہ اور یہ دُعا مانگے کہ یا اللہ! آپ ہی مجھے خطاؤں اور گناہوں سے بچا سکتے ہیں۔

چوتھی آیت میں قصہ طوفان کا خاتمہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب طوفان ختم ہو چکا اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی، اور زمین کا پانی زمین نے نگل لیا، اور آسمان کا باقی ماندہ پانی نہروں، دریاؤں کی شکل میں محفوظ ہو گیا، جس کے نتیجہ میں زمین انسانی رہائش کے قابل ہو گئی تو حضرت نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ اب آپ پہاڑ سے زمین پر اتریئے، اور کوئی فکر نہ کیجئے کیونکہ آپ کے ساتھ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہوں گی، یعنی آفات اور مصائب سے سلامتی اور مال و اولاد میں وسعت و برکت ہوگی۔

اس ارشاد کے مطابق طوفان کے بعد دنیا میں ساری انسانی آبادی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے، قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ (الصافات) یعنی اس واقعہ کے بعد دنیا میں باقی رہنے

والی سب قومیں صرف نوح علیہ السلام ہی کی ذرّیت واولاد ہوں گی، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو اہلِ تاریخ آدمِ ثانی کا نام دیتے ہیں۔

پھر یہ سلامت و برکت کا وعدہ جو حضرت نوح علیہ السلام سے کیا گیا ہے صرف اُن کی ذات تک محدود نہیں بلکہ فرمایا گیا وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۚ یعنی جو اُمتیں اور جماعتیں آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہیں ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور برکت نازل ہوگی، حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو آیت میں اُمَمٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو اُمَّـةٌ کی جمع ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ کشتی میں سوار ہونے والے مختلف قوموں اور اُمتوں پر مشتمل تھے حالانکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے زیادہ تر حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے لوگ تھے اور معدودے چند دوسرے مؤمن بھی تھے، تو ان لوگوں کو مختلف اُمتیں اور قومیں اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ ان کی آنے والی نسلوں میں مختلف اُمتیں اور قومیں ہوں گی، اِس سے معلوم ہوا کہ اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۚ کے الفاظ میں وہ تمام نسلِ انسانی داخل ہے جو قیامت تک پیدا ہوگی۔

اسی لئے اس کی ضرورت پڑی کہ سلامت و برکت کے مضمون میں تفصیل کی جائے کیونکہ قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی میں تو مؤمن بھی ہوں گے کافر بھی، مؤمن کے لئے تو سلامت و برکت اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے درست ہے کہ دنیا میں بھی ان کو سلامت و برکت نصیب ہوگی آخرت میں بھی، لیکن اسی نسل میں جو کفار ہوں گے وہ تو جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، ان کو سلامت و برکت کا محل قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا اس لئے آخرِ آیت میں فرمادیا وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ یعنی دنیا کی سلامت و برکت تو اللہ تعالیٰ کا خوانِ یغما ہے جس سے دوست دشمن سبھی کھاتے پیتے ہیں اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوں گے جو نوح علیہ السلام کی اولاد میں کفر اختیار کریں گے لیکن آخرت کی نجات وفلاح یہ صرف مؤمنین کے لئے مخصوص ہوگی، کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دلا کر فارغ کر دیا جائے گا، آخرت میں اُس کے لئے بجز عذاب کے کچھ نہ ہوگا۔

طوفانِ نوح کی یہ تفصیلی خبریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی معلوم کر کے اپنی قوم کو سنائیں تو یہ واقعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے کی ایک شہادت بن گیا، اِس پر متنبہ کرنے کے لئے پانچویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ نوح علیہ السلام اور اُن کے طوفان کے واقعات یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو نہ آپ پہلے سے جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، عرب، ہی اِس سے واقف تھے، آپ نے اُن کو بتلایا تو اس کا راستہ بجز اِس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے بذریعۂ وحی آپ کو بتلایا ہے، کیونکہ اگر آپ کی قوم کے لوگ لکھے پڑھے اور تاریخِ عالم سے واقفیت رکھنے والے ہوتے تو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ آپ نے ان لوگوں سے سن کر یہ واقعات بیان کر دیئے ہیں، لیکن جبکہ پوری قوم بھی اِن واقعات سے

بے خبر تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی دوسرے ملک میں تشریف نہیں لے گئے تو اس خبر کا راستہ صرف وحی متعین ہو گیا جو نبی کے پیغمبر برحق ہونے کی واضح دلیل ہے۔

آخر آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ آپ کی نبوّت و رسالت پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل کے ہوتے ہوئے بھی اگر کچھ بدبخت نہیں مانتے اور آپ سے جھگڑا کرتے ہیں تو آپ کو اپنے پہلے پیغمبر نوح علیہ السلام کا اُسوہ دیکھنا چاہئے کہ اُنہوں نے ایک ہزار سال کی طویل عمر ساری اُنہیں اذیتوں میں گزار دی، تو جس طرح اُنہوں نے صبر کیا آپ بھی ایسا ہی صبر سے کام لیں، کیونکہ یہ متعین ہے کہ انجامِ کار کامیابی متقی لوگوں کو ہی ملے گی۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی ہود کو بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ

تم سب جھوٹ کہتے ہو، اے قوم میں تم سے نہیں مانگتا اس پر مزدوری میری مزدوری

اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ

اسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر کیا تم نہیں سمجھتے، اور اے قوم گناہ بخشواؤ اپنے ربّ سے

ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ

پھر رجوع کرو اسی کی طرف چھوڑ دے گا تم پر آسمان سے دھاریں اور زیادہ دے گا تم کو

قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ

زور پر زور اور روگردانی نہ کرو گنہگار ہوکر بولے اے ہود تو ہمارے پاس کوئی سند لے کر نہیں آیا

وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے ٹھاکروں (معبودوں) کو تیرے کہنے سے اور ہم نہیں تجھ کو ماننے والے،

إِنْ نَّقُوْلُ إِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ إِنِّيْٓ أُشْهِدُ اللّٰهَ

ہم تو یہ ہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے ٹھاکروں (معبودوں) نے بُری طرح، بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو

وَاشْهَدُوْٓا أَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا

اور تم گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں اُن سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کے سوا سو بُرائی کرو میرے حق میں تم سب مل کر

ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ إِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ

پھر مجھ کو مہلت نہ دو، میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رَبّ ہے میرا اور تمہارا، کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا

إِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ؕ إِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا

مگر اللہ کے ہاتھ میں ہے چوٹی اُس کی، بیشک میرا رَبّ ہے سیدھی راہ پر، پھر اگر تم منہ پھیرو گے

فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّآ أُرْسِلْتُ بِهٖٓ إِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ

تو میں پہنچا چکا تم کو جو میرے ہاتھ بھیجا تھا تمہاری طرف، اور قائم مقام کرے گا میرا رَبّ کوئی اور لوگ،

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا ؕ إِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا

اور نہ بگاڑ سکو گے اللہ کا کچھ، تحقیق میرا رَبّ ہے ہر چیز پر نگہبان اور جب پہنچا ہمارا حکم

نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ

بچادیا ہم نے ہود کو اور جو لوگ ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور بچادیا ان کو

مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ

ایک بھاری عذاب سے، اور یہ تھے عاد کہ منکر ہوئے اپنے رَبّ کی باتوں سے اور نہ مانا اس کے رسولوں کو

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۵۹ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً

اور مانا حکم ان کا جو سرکش تھے مخالف، اور پیچھے سے آئی ان کو اس دنیا میں پھٹکار

وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ

اور قیامت کے دن بھی سن لو عاد منکر ہوئے اپنے رَبّ سے سن لو پھٹکار ہے عاد کو

قَوْمِ هُوْدٍ ۶۰ ع وَاِلٰي ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

جو قوم تھی ہود کی۔ اور ثمود کی طرف بھیجا ان کا بھائی صالح، بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا

کوئی حاکم نہیں تمہارا اس کے سوا، اسی نے بنایا تم کو زمین سے اور بسایا تم کو

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۶۱ قَالُوْا يٰصٰلِحُ

اس میں سو گناہ بخشواؤ اس سے اور رجوع کرو اس کی طرف تحقیق میرا رَبّ نزدیک ہے قبول کرنے والا بولے اے صالح

قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا

تجھ سے تو ہم کو امید تھی اس سے پہلے کیا تو ہم کو منع کرتا ہے کہ پرستش کریں جن کی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادے،

وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۶۲ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ

اور ہم کو تو شبہ ہے اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دِل نہیں مانتا، بولا اے قوم بھلا دیکھو تو

اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ

اگر مجھ کو سمجھ مل گئی اپنے رَبّ کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی رحمت اپنی طرف سے پھر کون بچائے مجھ کو اس سے

اِنۡ عَصَيۡتُهٗ قف فَمَا تَزِيۡدُوۡنَنِىۡ غَيۡرَ تَخۡسِيۡرٍ ﴿۶۳﴾ وَيٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ

اگر اس کی نافرمانی کروں سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے اور اے قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی

لَـكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِىۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ

تمہارے لئے نشانی سو چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں اور مت ہاتھ لگاؤ بری طرح پھر آ پکڑے گا تم کو

عَذَابٌ قَرِيۡبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوۡهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ط

عذاب بہت جلد پھر اس کے پاؤں کاٹے تب کہا فائدہ اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن،

ذٰلِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا

یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچادیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے

مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ ﴿۶۶﴾

اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے، بیشک تیرا رَبّ وہی ہے زور والا زبردست،

وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ﴿۶۷﴾ لا

اور پکڑ لیا اُن ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے

كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ط اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوۡدَا۟ كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ ط اَلَا بُعۡدًا لِّثَمُوۡدَ ﴿۶۸﴾ ع

جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں، سن لو ثمود منکر ہوئے اپنے رَبّ سے، سن لو پھٹکار ہے ثمود کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور قومِ عاد کے پاس ہم نے اُن کے بھائی ہود کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے کہا: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت

کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم نے جھوٹی باتیں تراش رکھی ہیں۔ ﴿۵۰﴾
اے میری قوم! میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اَجر کسی اور نے نہیں، اُس ذات نے اپنے ذمے لیا ہے
جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ ﴿۵۱﴾ اے میری قوم! اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی
مانگو، پھر اُس کی طرف رُجوع کرو، وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارشیں برسائے گا، اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید قوت کا
اضافہ کرے گا، اور مجرم بن کر منہ نہ موڑو۔'' ﴿۵۲﴾ انہوں نے کہا: ''اے ہود! تم ہمارے پاس کوئی روشن دلیل لے کر نہیں
آئے، اور ہم اپنے خداؤں کو صرف تمہارے کہنے سے چھوڑنے والے نہیں ہیں، اور نہ ہم تمہاری بات پر ایمان لا سکتے
ہیں۔ ﴿۵۳﴾ ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے خداؤں میں سے کسی نے تمہیں بُری طرح جھپیٹے میں لے لیا
ہے۔'' ہود نے کہا: ''میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو کہ تم اللہ کے سوا جس جس کو اُس کی خدائی میں شریک مانتے
ہو، میں اُس سے بَری ہوں۔ ﴿۵۴﴾ اب تم سب کے سب مل کر میرے خلاف چالیں چل لو، اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ ﴿۵۵﴾ میں
نے تو اللہ پر بھروسہ کر رکھا ہے، جو میرا بھی پروردگار ہے، اور تمہارا بھی پروردگار۔ زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس
کی چوٹی اُس کے قبضے میں نہ ہو۔ یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔ ﴿۵۶﴾ پھر بھی اگر تم منہ موڑتے ہو، تو جو پیغام دے
کر مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا تھا، میں نے وہ تمہیں پہنچا دیا ہے۔ اور (تمہارے کفر کی وجہ سے) میرا پروردگار تمہاری جگہ
کسی اور قوم کو یہاں بسا دے گا، اور تم اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بیشک میرا پروردگار ہر چیز کی نگرانی کرتا ہے۔'' ﴿۵۷﴾ اور
(آخر کار) جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت کے ذریعے ہود کو اور جو لوگ اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے، اُن کو بچا لیا،
اور انہیں ایک سخت عذاب سے نجات دے دی۔ ﴿۵۸﴾ یہ تھے عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا اِنکار کیا،
اور اُس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، اور ہر ایسے شخص کا حکم مانا جو پرلے درجے کا جابر اور حق کا پکا دُشمن تھا! ﴿۵۹﴾ اور (اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ) اس دُنیا میں بھی پھٹکار اُن کے پیچھے لگا دی گئی، اور قیامت کے دن بھی۔ یاد رکھو کہ قومِ عاد نے اپنے رَبّ کے
ساتھ کفر کا معاملہ کیا تھا! یاد رکھو کہ بربادی عاد ہی کی ہوئی، جو ہود کی قوم تھی! ﴿۶۰﴾ اور قومِ ثمود کے پاس ہم نے اُن کے بھائی
صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے کہا: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُسی
نے تم کو زمین سے پیدا کیا، اور اُس میں تمہیں آباد کیا۔ لہٰذا اُس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اُس کی طرف رُجوع
کرو۔ یقین رکھو کہ میرا رَبّ (تم سے) قریب بھی ہے، دُعائیں قبول کرنے والا بھی۔'' ﴿۶۱﴾ وہ کہنے لگے: ''اے صالح! اس
سے پہلے تو تم ہمارے درمیان اس طرح رہے ہو کہ تم سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ جن (بتوں) کی عبادت ہمارے باپ
دادا کرتے آئے ہیں کیا تم ہمیں اُن کی عبادت کرنے سے منع کرتے ہو؟ جس بات کی تم دعوت دے رہے ہو، اُس کے
بارے میں تو ہمیں ایسا شک ہے جس نے ہمیں اِضطراب میں ڈال دیا ہے۔'' ﴿۶۲﴾ صالح نے کہا: ''اے میری قوم! ذرا مجھے

یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی ایک روشن ہدایت پر قائم ہوں، اور اُس نے مجھے خاص اپنے پاس سے ایک رحمت (یعنی نبوّت) عطا فرمائی ہے، پھر بھی اگر میں اُس کی نافرمانی کروں تو کون ہے جو مجھے اللہ (کی پکڑ) سے بچالے؟ لہٰذا تم (میرے فرائض سے روک کر) بربادی میں مبتلا کرنے کے سوا مجھے اور کیا دے رہے ہو؟ ﴿۶۳﴾ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی بن کر آئی ہے۔ لہٰذا اس کو آزاد چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے، اور اس کو بُرے ارادے سے چھونا بھی نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں عنقریب آنے والا عذاب آ پکڑے۔'' ﴿۶۴﴾ پھر ہوا یہ کہ انہوں نے اُس کو مار ڈالا۔ چنانچہ صالح نے کہا کہ: ''تم اپنے گھروں میں تین دن اور مزے کرلو، (اُس کے بعد عذاب آئے گا، اور) یہ ایسا وعدہ ہے جسے کوئی جھوٹا نہیں کرسکتا۔'' ﴿۶۵﴾ پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ جو ایمان لائے تھے، اُن کو اپنی خاص رحمت کے ذریعے نجات دی، اور اُس دن کی رُسوائی سے بچالیا۔ یقیناً تمہارا پروردگار بڑی قوت کا، بڑے اقتدار کا مالک ہے۔ ﴿۶۶﴾ اور جن لوگوں نے ظلم کا راستہ اپنایا تھا، اُن کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، جس کے نتیجے میں وہ اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے پڑے رہ گئے ﴿۶۷﴾ جیسے کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو کہ ثمود نے اپنے رَبّ کے ساتھ کفر کا معاملہ کیا تھا! یاد رکھو کہ بربادی ثمود ہی کی ہوئی۔ ﴿۶۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں تم (اس بت پرستی کے اعتقاد میں) محض مفتری ہو (کیونکہ اس کا باطل ہونا دلیل سے ثابت ہے) اے میری قوم (میری نبوّت جو دلائل سے ثابت ہے اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ) میں تم سے (تبلیغ) پر کچھ معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اس (اللہ) کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو (عدمِ محض سے) پیدا کیا پھر کیا تم (اس کو) نہیں سمجھتے (کہ دلیل نبوّت موجود ہے اور اس کے خلاف کوئی وجہ شبہ کی نہیں پھر نبوّت میں شبہ کی کیا وجہ) اور اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رَبّ سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو پس ایمان و عملِ صالح کی برکت سے) وہ تم پر خوب بارش برسادے گا (درمنثور میں ہے کہ قومِ عاد پر تین سال متواتر قحط پڑا تھا اور ویسے بارش خود بھی مطلوب ہے) اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو قوت دے کر تمہاری قوّت (موجودہ) میں ترقی دے گا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو، ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے ہود آپ نے ہمارے سامنے (اپنے رسول من اللہ ہونے کی) کوئی دلیل تو پیش نہیں کی (یہ قول

ان کا عناد اُتھا) اور ہم آپ کے (صرف) کہنے سے تو اپنے معبودوں (کی عبادت) کو چھوڑنے والے ہیں نہیں اور ہم کسی طرح آپ کا یقین کرنے والے نہیں (اور) ہمارا قول تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے آپ کو کسی خرابی میں (مثل جنون وغیرہ کے) مبتلا کر دیا ہے (چونکہ آپ نے ان کی شان میں گستاخی کی انہوں نے باؤلا کر دیا اس لئے ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو کہ خدا ایک ہے میں نبی ہوں) ہود (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم جو کہتے ہو کہ کسی بت نے مجھ کو باؤلا کر دیا ہے تو) میں (علی الاعلان) اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی (سن لو اور) گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے (بالکل) بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک (عبادت) قرار دیتے ہو، سو (میری عداوت اوّل تو پہلے سے ظاہر ہے اور اب اس اعلانِ براءت سے اور زیادہ مؤکد ہوگئی تو اگر ان بتوں میں کچھ قوت ہے تو) تم (اور وہ) سب مل کر میرے ساتھ (ہر طرح کا) داؤ گھات کر لو (اور) پھر مجھ کو ذرا مہلت نہ دو (اور کوئی کسر نہ چھوڑو، دیکھوں تو سہی میرا کیا کر لیں گے اور جب وہ مع تمہارے کچھ نہیں کر سکتے تو اکیلے تو کیا خاک کر سکتے ہیں اور میں یہ دعویٰ اس لئے دِل کھول کر کر رہا ہوں کہ بت تو محض عاجز ہیں ان سے تو اس لئے نہیں ڈرتا، رہ گئے تم، سو گو تم کو کچھ قدرت طاقت حاصل ہے لیکن میں تم سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ) میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے جو میرا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے (یعنی سب اس کے قبضے میں ہیں، بے اس کے حکم کے کوئی کان نہیں ہلا سکتا اس لئے میں تم سے بھی نہیں ڈرتا اور اِس تقریر سے ایک نیا معجزہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ایک شخص تن تنہا ایسے بڑے بڑے زور آور لوگوں سے ایسی مخالفانہ باتیں کرے اور وہ اس کا کچھ نہ کر سکیں پس وہ جو کہتے تھے مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ اس سے اِس کا بھی ایک جواب ہوگیا کہ اگر معجزہ سابقہ سے قطع نظر کی جاوے تو لو یہ دُوسرا معجزہ ہے پس نبوّت پر دلیل قائم ہوگئی اور اس میں جو منشاء اشتباہ تھا اِعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ اس کا بھی جواب ہوگیا پس نبوّت ثابت ہوگئی، اس سے توحید کا وجوب بھی ثابت ہوگیا جس کی طرف میں دعویٰ کرتا ہوں اور تمہارا کہنا مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا الخ باطل ہوگیا اور صراطِ مستقیم یہی ہے اور) یقیناً میرا ربّ صراطِ مستقیم پر (چلنے سے ملتا) ہے (پس تم بھی اس صراطِ مستقیم کو اختیار کرو تاکہ مقبول ومقرب ہو جاؤ) پھر اگر (اس بیان بلیغ کے بعد بھی) تم (راہِ حق سے) پھرے رہو گے تو میں تو (معذور سمجھا جاؤں گا کیونکہ) جو پیغام دے کر مجھ کو بھیجا گیا تھا وہ تم کو پہنچا چکا ہوں (لیکن تمہاری کمبختی آوے گی کہ تم کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے گا) اور تمہاری جگہ میرا ربّ دوسرے لوگوں کو اس زمین میں آباد کر دے گا (سو تم اس اعراض وکفر میں اپنا ہی نقصان کر رہے ہو) اور اس کا تم کچھ نقصان نہیں کر رہے (اور اگر اس ہلاک میں کسی کو یہ شبہ ہو کہ خدا کو کیا خبر کہ کون کیا کر رہا ہے تو خوب سمجھ لو کہ) بالیقین میرا ربّ ہر شئے کی نگہداشت کرتا ہے (اس کو سب خبر رہتی ہے، غرض ان تمام حجتوں پر بھی ان لوگوں نے نہ مانا) اور (سامانِ عذاب شروع ہوا سو) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) پہنچا (اور ہوا کے طوفان کا عذاب نازل ہوا تو) ہم نے ہود (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے ان کو اپنی

عنایت سے (اس عذاب سے بچالیا) اوران کو ہم نے ایک بہت ہی سخت عذاب سے بچالیا (آگے اوروں کو عبرت دلانے کے لئے فرماتے ہیں) اور یہ (جن کا ذکر ہوا) قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے رَبّ کی آیات (یعنی دلائل اور اَحکام) کا انکار کیا اوراس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم (اور) ضدی تھے اور (ان افعال کا یہ نتیجہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ ساتھ رہے گی چنانچہ دُنیا میں اس کا اثر عذاب طوفان سے ہلاک ہونا تھا اور آخرت میں دائمی عذاب ہوگا) خوب سن لو، قوم عاد نے اپنے رَبّ کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے دُوری ہوئی (دونوں جہان میں) عاد کو جو کہ ہود (علیہ السلام) کی قوم تھی، اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اس کا تم پر یہ انعام ہے کہ) اس نے تم کو زمین (کے مادہ سے) پیدا کیا اور تم کو اس (زمین) میں آباد کیا (یعنی ایجاد وابقاء دونوں نعمتیں عطا فرمائیں جس میں سب نعمتیں آ گئیں، جب وہ ایسا منعم ہے) تو تم اپنے گناہ (شرک وکفر وغیرہ) اس سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عملِ صالح کرو) بیشک میرا رَبّ (اس شخص سے) قریب ہے (جو اس کی طرف متوجہ ہو اور اس شخص کی عرض) قبول کرنے والا ہے (جو اس سے گناہ معاف کراتا ہے) وہ لوگ کہنے لگے اے صالح تم تو اس کے قبل ہم میں ہونہار (معلوم ہوتے) تھے (یعنی ہم کو تم سے امید تھی کہ اپنی لیاقت ووجاہت سے فخرِ قوم اور ہمارے لئے مایۂ ناز اور ہمارے لئے سرپرست بنو گے، افسوس اس وقت جو باتیں کر رہے ہو اس سے تو ساری امیدیں خاک میں ملتی نظر آتی ہیں، کیا تم ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے منع کرتے ہو جن کی عبادت ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں (یعنی تم ان سے منع مت کرو) اور جس دین کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو (یعنی توحید) واقعی ہم تو اس کی طرف سے بڑے (بھاری) شبہ میں ہیں جس نے ہم کو تردّد میں ڈال رکھا ہے (کہ مسئلۂ توحید ہمارے خیال ہی میں نہیں آتا) آپ نے (جواب میں) فرمایا اے میری قوم (تم جو کہتے ہو کہ تم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے ممانعت مت کرو تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رَبّ کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے توحید ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے رحمت (یعنی نبوّت) عطا فرمائی ہو (جس سے اس توحید کی دعوت کا میں مامور ہوں) سو (اس حالت میں) اگر میں خدا کا کہنا نہ مانوں (اور دعوتِ توحید کو ترک کر دوں جیسا تم کہتے ہو) تو (یہ بتلاؤ کہ) پھر مجھ کو خدا (کے عذاب) سے کون بچالے گا تو تم تو (ایسا بُرا مشورہ دے کر) سراسر میرا نقصان ہی کر رہے ہو (یعنی اگر خدانخواستہ قبول کرلوں تو بجز نقصان کے اور کیا ہاتھ آوے گا اور چونکہ انہوں نے معجزہ کی بھی ثبوتِ رسالت کے لئے درخواست کی تھی اس لئے آپ نے فرمایا) اور اے میری قوم (تم جو معجزہ چاہتے ہو سو) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی

لئے اللہ کی اونٹنی کہلائی کہ اللہ کی دلیل ہے) سو (علاوہ اس کے یہ بوجہ معجزہ ہونے کے میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو فوری عذاب آ پکڑے (یعنی دیر نہ لگے) سو انہوں نے (باوجود اس اتمامِ حجت کے) اس (اونٹنی) کو مار ڈالا تو صالح (علیہ السلام) نے فرمایا (خیر) تم اپنے گھروں میں تین دن اور بسر کرلو (تین دن کے بعد عذاب آتا ہے اور) یہ ایسا وعدہ ہے جس میں ذرا جھوٹ نہیں (کیونکہ من جانب اللہ ہے) سو (تین دن گزرنے کے بعد) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آ پہنچا ہم نے صالح (علیہ السلام) کو اور جو اِن کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے) بچالیا اور (ان کو کیسی چیز سے بچالیا) اس دن کی بڑی رسوائی سے بچالیا (کیونکہ قہرِ الٰہی میں مبتلا ہونے سے بڑھ کر کیا رُسوائی ہوگی) بیشک آپ کا رَبّ ہی قوت والا غلبہ والا ہے (جس کو چاہے سزا دیدے جس کو چاہے بچالے) اور ان ظالموں کو ایک نعرہ نے آ دبایا (کہ وہ آواز تھی جبریل علیہ السلام کی) جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (اور ان کی یہ حالت ہوگئی) جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (قوم) ثمود نے اپنے رَبّ کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے ثمود کو دُوری ہوئی۔

معارف و مسائل

سورۂ ہود کی مذکورہ پہلی گیارہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے جن کے نام سے یہ سورت موسوم ہے، اس سورت میں نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک قرآنِ کریم کے خاص طرز میں سات انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اُمتوں کے واقعات مذکور ہیں، جن میں عبرت و موعظت کے ایسے مظاہر موجود ہیں کہ جس دل میں ذرا بھی حیات اور شعور باقی ہو وہ ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، عبرت کے علاوہ ایمان اور عملِ صالح کے بہت سے اُصول و فروع اور انسان کے لئے بہترین ہدایات موجود ہیں۔

قصص و واقعات تو اس میں سات پیغمبروں کے درج ہیں مگر سورت کا نام حضرت ہود علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ہود علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے قومِ عاد میں مبعوث فرمایا، یہ قوم اپنے ڈِیل ڈول اور قوّت و شجاعت کے اعتبار سے پورے عالم میں ممتاز سمجھی جاتی تھی، حضرت ہود علیہ السلام بھی اِسی قوم کے فرد تھے، لفظ اَخَاهُمْ هُوْدًا میں اسی طرف اشارہ

فرمایا گیا ہے، مگر یہ اتنی قوی اور بہادر قوم افسوس کہ اپنی عقل وفکر کو کھو بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھوں سے تراشی ہوئی پتھروں کی مورتیوں کو اپنا خدا ومعبود بنا رکھا تھا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جو دعوتِ دین اپنی قوم کے سامنے پیش کی اُس کی تین اُصولی باتیں ابتدائی تین آیتوں میں مذکور ہیں:- اوّل دعوتِ توحید اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو لائقِ عبادت سمجھنا جھوٹ اور افتراء ہے، دُوسرے یہ کہ میں جو یہ دعوت توحید لے کر آیا ہوں اور اُس کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا ہے تم یہ تو سوچو سمجھو کہ میں نے یہ مشقت ومحنت کیوں اختیار کر رکھی ہے، نہ میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ مانگتا ہوں نہ مجھے تمہاری طرف سے کوئی مادّی فائدہ پہنچتا ہے اگر میں اس کو اللہ تعالیٰ کا فرمان اور حق نہ سمجھتا تو آخر ضرورت کیا تھی کہ تمہیں دعوت دینے اور تمہاری اصلاح کرنے میں اتنی محنت برداشت کرتا۔

وعظ ونصیحت اور دعوتِ دین پر اُجرت

قرآنِ کریم نے یہ بات تقریباً سب ہی انبیاء کی زبان سے نقل کی ہے کہ ہم تم سے اپنی دعوت ومحنت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا اگر معاوضہ لیا جائے تو دعوت مؤثر نہیں رہتی، جس پر تجربہ شاہد ہے کہ وعظ ونصیحت پر اُجرت لینے والوں کی بات سامعین پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اپنی پچھلی زندگی میں جو کفر وگناہ تم کر چکے ہو، اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت مانگو اور اگلی زندگی میں ان سب گناہوں سے توبہ یعنی اس کا پختہ ارادہ اور معاہدہ کرو کہ اب اُن کے پاس نہ جائیں گے، اگر تم نے یہ استغفار وتوبہ کا عمل کر لیا تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی دائمی فلاح تو ملے ہی گی، دنیا میں بھی اُس کے بڑے فوائد کا مشاہدہ کرو گے، ایک یہ کہ توبہ واستغفار کرنے سے تمہاری قحط سالی دور ہو جائے گی، وقت پر خوب بارش ہوگی جس سے تمہارے رزق میں وسعت پیدا ہوگی، دوسرے یہ کہ تمہاری طاقت وقوت بڑھ جائے گی۔

یہاں طاقت وقوت کا لفظ عام ہے جس میں بدنی صحت وقوت بھی داخل ہے اور وہ طاقت بھی جو مال اور اولاد کی بہتات سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں سے توبہ واستغفار کا خاصہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی رزق میں وسعت اور مال واولاد میں برکت ہوتی ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے ان کی دعوت کا جواب وہی اپنی جاہلانہ رَوِش سے یہ دیا کہ آپ نے ہمیں کوئی معجزہ تو دکھلایا نہیں صرف زبانی بات ہے اس لئے ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہ چھوڑیں گے اور آپ پر ایمان نہ

لائیں گے، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے معبود بتوں کو بُرا کہنے کی وجہ سے آپ کسی دماغی خرابی میں مبتلا ہوگئے اس لئے ایسی باتیں کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں ہود علیہ السلام نے پیغمبرانہ جرأت کے ساتھ فرمایا کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو سن لو کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اللہ کے سوا تمہارے سب معبودوں سے بیزار ہوں اب تم اور تمہارے بت سب مل کر میرے خلاف جو کچھ داؤ گھات کر سکتے ہو کرلو اور اگر میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو اور مجھے ذرا مہلت بھی نہ دو۔

اور فرمایا کہ اتنی بڑی بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کرلیا ہے جو میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی، جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اُس نے پکڑ رکھی ہے کسی کی مجال نہیں کہ اُس کے اِذن ومشیت کے بغیر کسی کو ذرّہ برابر نقصان یا تکلیف پہنچا سکے، یقیناً میرا رَبّ صراطِ مستقیم پر ہے، یعنی جو صراطِ مستقیم پر چلتا ہے، رَبّ اُس کو ملتا ہے، اُس کی مدد کرتا ہے۔

پوری قوم کے مقابلہ میں ایسا بلند بانگ دعویٰ اور ان کو غیرت دلانا اور پھر پوری بہادر قوم میں سے کسی کی مجال نہ ہونا کہ اُن کے مقابلہ میں کوئی حرکت کرے، یہ سب ایک مستقل معجزہ تھا ہود علیہ السلام کا، جس سے ان کی اس بات کا بھی جواب ہوگیا کہ آپ نے ہمیں کوئی معجزہ نہیں دِکھلایا، اور اِس کا بھی جواب ہوگیا کہ ہمارے بتوں نے آپ کو دماغی خرابی میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ اگر بتوں میں یہ طاقت ہوتی تو اس وقت ان کو زندہ نہ چھوڑتے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم اسی طرح حق سے برگشتہ رہو گے تو سمجھ لو کہ جو پیغام دے کر مجھے بھیجا گیا ہے میں تمہارے سامنے پہنچا چکا ہوں تو اَب اِس کا نتیجہ اِس کے سوا کیا ہے کہ تم پر خدا کا قہر وغضب آجائے اور تم سب نیست ونابود ہو جاؤ، اور میرا رَبّ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اس زمین پر آباد کر دے، اور اس معاملہ میں جو کچھ کر رہے ہو اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہیں کر رہے، یقیناً میرا رَبّ ہر چیز کی نگہداشت کرتا ہے وہ تمہارے ہر کام اور خیال سے باخبر ہے۔

ان لوگوں نے ان باتوں میں سے کسی چیز پر کان نہ دھرا اور اپنی سرکشی پر قائم رہے تو خدا تعالیٰ کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں ان پر نازل ہوا جس نے مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا، آدمی اور جانور ہوا میں اُڑ کر آسمانی فضاء تک جاتے اور وہاں سے اوندھے گرتے تھے آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ پکار سنائی دیتی تھی، یہاں تک کہ یہ بے مثال قوّت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک وبرباد ہوگئی۔

جب اس قوم پر عذابِ الٰہی کا حکم نافذ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سنتِ الٰہیہ کے مطابق اپنے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اس سخت عذاب سے بچالیا کہ عذاب آنے سے پہلے اُن کو اس جگہ سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔

قومِ عاد کے واقعہ اور عذاب کا ذکر کرنے کے بعد دُوسروں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے کے لئے ارشاد

فرمایا کہ یہ ہے وہ قومِ عاد جنہوں نے اپنے رَبّ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی لعنت یعنی رحمت سے دوری اِن کے ساتھ ساتھ لگی رہی اور قیامت میں بھی اسی طرح ساتھ لگی رہے گی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ قومِ عاد پر ہوا کا طوفان مسلط ہوا تھا، مگر سورۂ مؤمنون میں یہ مذکور ہے کہ ان کو ایک سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کیا گیا، ہوسکتا ہے کہ قومِ ہود علیہ السلام پر دونوں قسم کے عذاب نازل ہوئے ہوں۔

قومِ عاد اور ہود علیہ السلام کا واقعہ تمام ہوا۔

اِس کے بعد آٹھ آیتوں میں حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے جو قومِ عاد کی دُوسری شاخ یعنی قومِ ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے، انہوں نے بھی اپنی قوم کو سب سے پہلے توحید کی دعوت دی، قوم نے حسبِ عادت اِن کو جھٹلایا اور یہ ضد کی کہ آپ کا نبی برحق ہونا ہم جب تسلیم کریں جبکہ ہمارے سامنے اس پہاڑ کی چٹان میں سے ایک اونٹنی ایسی ایسی نکل آئے۔

صالح علیہ السلام نے ان کو ڈرایا کہ تمہارا منہ مانگا معجزہ اگر اللہ تعالیٰ نے ظاہر کردیا اور پھر بھی تم نے ایمان لانے میں کوئی کوتاہی کی تو عادۃ اللہ کے مطابق تم پر عذاب آجائے گا اور سب ہلاک و برباد ہوجاؤ گے، مگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے اللہ تعالیٰ نے ان کا مطلوبہ معجزہ اپنی قدرتِ کاملہ سے ظاہر فرمادیا، پہاڑ کی چٹان شق ہوکر ان کے بتائے ہوئے اوصاف کی اونٹنی برآمد ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس اونٹنی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں ورنہ تم پر عذاب آجائے گا مگر وہ اس پر بھی قائم نہ رہے، اونٹنی کو ہلاک کرڈالا، بالآخر خدا تعالیٰ نے اُن کو پکڑ لیا، حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے مؤمن ساتھی عذاب سے بچالئے گئے باقی پوری قوم ایک سخت ہیبت ناک آواز کے ذریعہ ہلاک کردی گئی۔

اس واقعہ میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ یعنی آپ کے دعوائے نبوّت اور بت پرستی کو منع کرنے سے پہلے ہم کو آپ سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں کہ آپ ہماری قوم کے لئے بڑے مصلح اور رہنما ثابت ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء کی پرورش بچپن ہی سے نہایت پاکیزہ اخلاق وعادات میں کرتے ہیں جس کو دیکھ کر سبھی اُن سے محبت کرتے اور عظمت سے پیش آتے ہیں جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اعلانِ نبوّت سے پہلے سارا عرب امین کا خطاب دیتا اور سچا اور صالح اعتقاد رکھتا تھا، نبوّت کے دعویٰ اور بت پرستی سے ممانعت کرنے پر سب مخالف ہوگئے۔

تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ یعنی جب ان لوگوں نے حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کرکے اس معجزہ والی اونٹنی کو

مارڈالا تو جیسا پہلے ان کو متنبہ کر دیا گیا تھا کہ ایسا کرو گے تو اللہ کا عذاب تم پر آئے گا، اب وہ عذاب اس طرح آیا کہ ان کو تین روز کی مہلت دی گئی اور بتلا دیا گیا کہ چوتھے روز تم سب ہلاک کئے جاؤ گے۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ تین روز جمعرات، جمعہ اور ہفتہ تھے، اتوار کے روز ان پر عذاب نازل ہوا [۱] وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ یعنی ان ظالموں کو پکڑ لیا ایک سخت آواز نے، یہ سخت آواز حضرت جبریل علیہ السلام کی تھی جس میں ساری دنیا کی بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہیبت ناک آواز تھی جس کو انسانی قلب و دماغ برداشت نہیں کر سکا، ہیبت سے سب کے دِل پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قومِ صالح سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے لیکن سورۂ اعراف میں ان کے متعلق یہ آیا ہے فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ (الاعراف:۷۸) یعنی پکڑ لیا اُن کو زلزلہ نے ___ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر عذاب زلزلہ کا آیا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے زلزلہ آیا ہو پھر سخت آواز سے سب ہلاک کر دیئے گئے ہوں، [۲] واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ

اور البتہ آچکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر بولے سلام وہ بولا سلام ہے

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ نَکِرَھُمْ

پھر دیر نہ کی کہ لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا، پھر جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا

وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾

اور دِل میں ان سے ڈرا، وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی،

وَامْرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ فَضَحِکَتْ فَبَشَّرْنٰھَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ

اور اس کی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی اس کو اسحاق کے پیدا ہونے کی، اور اسحاق کے پیچھے

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۹ ص:۶۰

[۲] تفسیر القرطبی، سورۃ الأعراف ج:۷ ص:۲۴۲، وتفسیر البحر المحیط، سورۃ الأعراف ج:۵ ص:۳۸۵

يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ

یعقوب کی، بولی اے خرابی کیا میں بچہ جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں اور یہ خاوند میرا ہے بوڑھا،

اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ

یہ تو ایک عجیب بات ہے، وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے اللہ کی رحمت ہے

وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

اور برکتیں تم پر اے گھر والو! تحقیق اللہ ہے تعریف کیا گیا بڑائیوں والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہمارے فرشتے (انسانی شکل میں) ابراہیم کے پاس (بیٹا پیدا ہونے کی) خوشخبری لے کر آئے۔ انہوں نے سلام کہا، ابراہیم نے بھی سلام کہا، پھر ابراہیم کو کچھ دیر نہیں گذری تھی کہ وہ (ان کی مہمانی کے لئے) ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے، ﴿۶۹﴾ مگر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس (بچھڑے) کی طرف نہیں بڑھ رہے، تو وہ ان سے کھٹک گئے، اور اُن کی طرف سے دِل میں خوف محسوس کیا۔ فرشتوں نے کہا: ''ڈریے نہیں، ہمیں (آپ کو بیٹے کی خوشخبری سنانے اور) لوط کی قوم کے پاس بھیجا گیا ہے۔'' ﴿۷۰﴾ اور اِبراہیم کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں، وہ ہنس پڑیں، تو ہم نے اُنہیں (دوبارہ) اسحاق کی، اور اسحاق کے بعد یعقوب کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ ﴿۷۱﴾ وہ کہنے لگیں: ''ہائے! کیا میں اس حالت میں بچہ جنوں گی کہ میں بوڑھی ہوں، اور یہ میرے شوہر ہیں جو خود بڑھاپے کی حالت میں ہیں؟ واقعی یہ تو بڑی عجیب بات ہے!'' ﴿۷۲﴾ فرشتوں نے کہا: ''کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کر رہی ہیں؟ آپ جیسے مقدس گھرانے پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہی برکتیں ہیں۔ بیشک وہ ہر تعریف کا مستحق، بڑی شان والا ہے۔'' ﴿۷۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے (بشکل بشر) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (اُن کے فرزند اسحاق علیہ السلام کی) بشارت لے کر آئے (گو مقصودِ اعظم ان کے آنے کا قومِ لوط پر عذاب واقع کرنا تھا، لقولہ تعالیٰ فَمَا خَطْبُكُمْ اِلخ) اور (آنے کے وقت) انہوں نے سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی سلام کیا (اور پہچانا نہیں کہ یہ فرشتے ہیں معمولی مہمان

سمجھے) پھر دیر نہیں لگائی کہ ایک تلا ہوا (فربہ لقوله تعالیٰ سَمِیْن) بچھڑا لائے (اور ان کے سامنے رکھ دیا، یہ تو فرشتے تھے کیوں کھانے لگے تھے) سو جب ابراہیم (علیہ السلام) نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے تک نہیں بڑھتے تو ان سے متوحش ہوئے اور ان سے دِل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ مہمان تو نہیں کوئی مخالف نہ ہوں کہ بارادہ فساد آئے ہوں اور میں گھر میں ہوں احباب واصحاب پاس نہیں یہاں تک کہ بے تکلفی سے اس کو زبان سے بھی ظاہر کردیا، لِقَوْلِہٖ تعالیٰ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ [1] (الحجر:۵۲)) وہ فرشتے کہنے لگے ڈرومت (ہم آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں آپ کے پاس بشارت لے کر آئے ہیں کہ آپ کے ایک فرزند پیدا ہوگا اسحاق اور اس کے پیچھے ایک فرزند ہوگا یعقوب، اور بشارت اس لئے کہا کہ اوّل تو اولاد خوشی کی چیز ہے، پھر ابراہیم علیہ السلام بوڑھے ہوگئے تھے بی بی بھی بہت بوڑھی تھیں امید اولاد کی نہ رہی تھی، آپ نے نورِ نبوّت سے توجہ کرکے پہچان لیا کہ واقعی فرشتے ہیں، لیکن فراستِ نبوّت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کے سوا اور بھی کسی بڑے کام کے لئے آئے ہیں اس لئے اس کی تعیین کے ساتھ سوال کیا فَمَا خَطْبُكُمْ یعنی کس کام کے لئے آئے ہیں؟ اس وقت انہوں نے کہا کہ) ہم قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں (کہ ان کو سزاءِ کفر میں ہلاک کریں، ان میں تو یہ گفتگو ہورہی تھی) اور ابراہیم (علیہ السلام) کی بی بی (حضرت سارہ کہیں) کھڑی (سن رہی) تھیں پس (اولاد کی خبر سن کر جس کی ان کو بعد اس کے کہ اسماعیل علیہ السلام بطنِ ہاجرہ سے متولد ہوئے تمنا بھی تھی، خوشی سے) ہنسیں (اور بولتی پکارتی آئیں اور تعجب سے ماتھے پر ہاتھ مارا، لِقَوْلِہٖ تعالیٰ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا [2] (الذاریات:۲۹)) سو ہم نے (یعنی ہمارے فرشتوں نے) ان کو (مکرر) بشارت دی اسحاق (کے پیدا ہونے) کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی (جو کہ اسحاق کے فرزند ہوں گے جس سے معلوم ہوگیا کہ تمہارے ہاں فرزند ہوگا اور زندہ رہے گا یہاں تک کہ وہ بھی صاحبِ اولاد ہوگا، اس وقت) کہنے لگیں کہ ہائے خاک پڑے اب میں بچہ جنوں گی بڑھیا ہوکر اور یہ میرے میاں (بیٹھے) ہیں بالکل بوڑھے، واقعی یہ بھی عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا کہ کیا (خاندانِ نبوّت میں رہ کر اور ہمیشہ معجزات ومعاملاتِ عجیبہ دیکھ دیکھ کر) تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو (اور خصوصاً) اس خاندان کے لوگوں پر تو اللہ تعالیٰ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع واقسام کی) برکتیں (نازل ہوتی رہتی) ہیں بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے (وہ بڑے سے بڑا کام کرسکتا ہے، پس بجائے تعجب کے اس کی تعریف اور شکر میں مشغول ہو) ۔

معارف ومسائل

اِن پانچ آیتوں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند فرشتوں کو ان

[1] ترجمہ: ابراہیمؑ کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں۔ [2] ترجمہ: اتنے میں ان کی بی بی بولتی پکارتی آئیں پھر ماتھے پر ہاتھ مارا۔

کے پاس اولاد کی بشارت دینے کے لئے بھیجا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ حضرت سارہ سے کوئی اولاد نہ تھی اور ان کو اولاد کی تمنا تھی مگر دونوں کا بڑھاپا تھا بظاہر کوئی امید نہ تھی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ خوشخبری بھیجی اور وہ بھی اس شان کی کہ نرینہ اولاد ہوگی اور ان کا نام بھی اسحاق تجویز فرمادیا اور پھر یہ بھی بتلادیا کہ وہ زندہ رہیں گے اور وہ بھی صاحبِ اولاد ہوں گے، ان کے لڑکے کا نام یعقوب ہوگا اور دونوں اللہ تعالیٰ کے رسول و پیغمبر ہوں گے، یہ فرشتے چونکہ بشکل انسانی آئے تھے اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے ان کو عام مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی، بھونا ہوا گوشت لاکر سامنے رکھا، مگر وہ تو حقیقۃً فرشتے تھے کھانے پینے سے پاک، اس لئے کھانا سامنے ہونے کے باوجود اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، ابراہیم علیہ السلام کو یہ دیکھ کر اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ مہمان نہیں معلوم ہوتے ممکن ہے کسی فساد کی نیت سے آئے ہوں، فرشتوں نے ان کا یہ اندیشہ معلوم کر کے بات کھول دی اور بتلادیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں آپ گھبرائیں نہیں، ہم آپ کو اولاد کی بشارت دینے کے علاوہ ایک اور کام کے لئے بھی بھیجے گئے ہیں کہ قومِ لوط پر عذاب نازل کریں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ حضرت سارہ پسِ پردہ یہ گفتگو سن رہی تھیں، جب معلوم ہوگیا کہ یہ انسان نہیں فرشتے ہیں تو پردہ کی ضرورت نہ رہی، بڑھاپے میں اولاد کی خوشخبری سن کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں کہ کیا میں بڑھیا ہو کر اولاد جنوں گی، اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں، فرشتوں نے جواب دیا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب کرتی ہو جس کی قدرت میں سب کچھ ہے، خصوصاً تم خاندانِ نبوّت میں رہ کر اس کا مشاہدہ بھی کرتی رہتی ہو کہ اس خاندان پر اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی رحمت و برکت نازل ہوتی رہتی ہے جو اکثر سلسلہ اسبابِ ظاہری سے بالاتر ہوتی ہے پھر تعجب کی کیا بات ہے ـــــ یہ اس واقعہ کا خلاصہ ہے آگے آیاتِ مذکورہ کی پوری تفصیل دیکھئے۔

پہلی آیت میں بتلایا ہے کہ یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کوئی خوشخبری لے کر آئے تھے اس خوشخبری کا ذکر آگے تیسری آیت میں ہے، فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ۔

[۱] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ تین فرشتے، جبریل، میکائیل، اور اسرافیل تھے۔ (قرطبی) انہوں نے بشکلِ انسانی آ کر ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کو انسان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی۔

[۲] حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے وہ انسان ہیں جنہوں نے دنیا میں مہمان نوازی کی رسم جاری فرمائی۔ (قرطبی) ان کا معمول یہ تھا کہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے بلکہ ہر کھانے کے وقت تلاش کرتے تھے کہ کوئی مہمان آجائے تو اس کے ساتھ کھائیں۔

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۹ ص: ۶۲ [۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۹ ص: ۶۴

قرطبی نے بعض اِسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ ایک روز کھانے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان کی تلاش شروع کی تو ایک اجنبی آدمی ملا جب وہ کھانے پر بیٹھا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بِسْمِ اللہ کہو، اس نے کہا کہ میں جانتا نہیں اللہ کون اور کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دسترخوان سے اُٹھادیا، جب وہ باہر چلا گیا تو جبریلِ امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے تو اس کے کفر کے باوجود ساری عمر اُس کو رزق دیا اور آپ نے ایک لقمہ دینے میں بھی بخل کیا۔'' یہ سنتے ہی ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے اور اس کو واپس بلایا، اس نے کہا کہ جب تک آپ اس کی وجہ نہ بتلائیں کہ پہلے کیوں مجھے نکالا تھا اور اب پھر کیوں بلا رہے ہیں میں اس وقت تک آپ کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واقعہ بتلادیا تو یہی واقعہ اس کے مسلمان ہونے کا سبب بن گیا، اس نے کہا کہ وہ رَبّ جس نے یہ حکم بھیجا ہے بڑا کریم ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گیا اور مؤمن ہوکر باقاعدہ بِسْمِ اللہ پڑھ کر کھانا کھایا۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادتِ مہمان نوازی کے مطابق بشکلِ انسانی آنے والے فرشتوں کو انسان اور مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی اور فوراً ہی ایک تلا ہوا بچھڑا سامنے لاکر رکھ دیا۔

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ آنے والے فرشتے اگرچہ بشکل انسانی آئے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت ان کو بشری خواص کھانے پینے کے بھی عطا کردیئے جاتے مگر حکمت اسی میں تھی کہ یہ کھانا نہ کھائیں تاکہ ان کے فرشتے ہونے کا راز کھلے اس لئے شکلِ انسانی میں بھی اُن کے مَلَکی خواص کو باقی رکھا گیا جس کی وجہ سے اُنہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ بڑھایا۔

بعض روایات میں ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ تیر تھے اُن کی نوک اس تلے ہوئے گوشت میں لگانے لگے، ان کے اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے عُرف کے مطابق یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ شاید یہ کوئی دشمن ہوں کیونکہ اُن کے عُرف میں کسی مہمان کا کھانے سے انکار کرنا ایسے ہی شر وفساد کی علامت ہوتا تھا (قرطبی) [2] فرشتوں نے بات کھول دی کہ ہم فرشتے ہیں اِس لئے نہیں کھاتے، آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

اَحکام ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں معاشرت سے متعلق بہت سے اَحکام اور اہم ہدایات آئی ہیں جن کو امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے لکھا ہے:

---

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۹ ص:۶۸ [2] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۹ ص:۶۵

سنت سلام

قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے سنت ہے کہ جب آپس میں ملیں تو سلام کریں، آنے والے مہمان کو اس میں پیش قدمی کرنا چاہئے اور دوسروں کو جواب دینا چاہئے۔

یہ رسم تو ہر قوم وملت میں پائی جاتی ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے کچھ کلمات بولتے ہیں مگر اسلام کی تعلیم اس معاملہ میں بھی بے نظیر اور بہترین ہے کیونکہ سلام کا مسنون لفظ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اللہ کے نام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ذکر اللہ بھی ہے اور مخاطب کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعاء بھی اور اپنی طرف سے اُس کی جان ومال وآبرو کے لئے سلامتی کی ضمانت بھی۔

قرآنِ کریم میں اس جگہ فرشتوں کی طرف سے صرف سَلٰمًا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جواب میں سَلٰمٌ ذکر کیا گیا ہے بظاہر یہاں پورے الفاظ سلام کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، جیسے عرف ومحاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کو سلام کیا، مراد یہ ہوتی ہے کہ پورا کلمہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہا، اسی طرح یہاں لفظ سلام سے پورا کلمہ مسنونہ سلام کا مراد ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے لوگوں کو بتلایا ہے، یعنی ابتداء سلام میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اور جواب سلام وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ۔

مہمانی اور مہمان داری کے چند اُصول

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ یعنی نہیں ٹھہرے ابراہیم علیہ السلام مگر صرف اِس قدر کہ لے آئے تَلا ہوا بچھڑا۔

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے آتے ہی جو کچھ کھانے پینے کی چیز میسر ہو اور جلدی سے مہیا ہو سکے وہ لا رکھے، پھر اگر صاحبِ وسعت ہے تو مزید مہمانی کا انتظام بعد میں کرے۔ (قرطبی) [۱]

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان کے لئے بہت زیادہ تکلّفات کی فکر میں نہ پڑے، آسانی سے جو اچھی چیز میسر ہو جائے وہ مہمان کی خدمت میں پیش کر دے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں گائے بیل رہتے تھے، اِس لئے بچھڑا ذبح کر کے فوری طور پر اُس کا گوشت تل کر سامنے لا رکھا۔ (قرطبی) [۲]

تیسرے یہ کہ آنے والوں کی مہمانی کرنا آدابِ اسلام اور مکارمِ اخلاق میں سے ہے، انبیاء وصلحاء کی عادت ہے، اِس میں علماء کا اِختلاف ہے کہ مہمانی کرنا واجب ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس پر ہیں کہ واجب نہیں، سنت اور مستحسن ہے،

---

[۱] تفسیر القرطبی ج: ۹ ص: ۶۴ [۲] تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

بعض نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر واجب ہے کہ جو شخص ان کے گاؤں میں ٹھہرے اس کی مہمانی کریں کیونکہ وہاں کھانے کا کوئی دُوسرا انتظام نہیں ہوسکتا اور شہر میں ہوٹل وغیرہ سے اس کا انتظام ہوسکتا ہے، اِس لئے شہر والوں پر واجب نہیں۔ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں یہ مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ [۱]

فَلَمَّا رَآ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ نَکِرَھُمْ یعنی جب دیکھا ابراہیم علیہ السلام نے کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں پہنچتے تو متوحش ہوگئے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ مہمان کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے سامنے جو چیز پیش کی جائے اُس کو قبول کرے، (کھانے کو دِل نہ چاہے یا مضر سمجھیں تو معمولی سی شرکت دِلجوئی کے لئے کرلیں)۔

اِسی جملہ سے دُوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ میزبان کو چاہئے کہ صرف کھانا سامنے رکھ کر فارغ نہ ہوجائے بلکہ اس پر نظر رکھے کہ مہمان کھا رہا ہے یا نہیں، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ فرشتوں کے کھانا نہ کھانے کو محسوس کیا۔

مگر یہ نظر رکھنا اس طرح ہو کہ مہمان کے کھانے کو تکتا نہ رہے، سرسری نظر سے دیکھ لے کیونکہ مہمان کے لقموں کو دیکھنا آدابِ ضیافت کے خلاف اور مدعو کے لئے باعثِ شرمندگی ہوتا ہے جیسا ہشام بن عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ کے دسترخوان پر ایک روز ایک اعرابی کو یہ واقعہ پیش آیا کہ اعرابی کے لقمہ میں بال تھا، امیر المؤمنین ہشام نے دیکھا تو بتلایا، اَعرابی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ہم ایسے شخص کے پاس کھانا نہیں کھاتے جو ہمارے لقموں کو دیکھتا ہے۔ [۲]

امام طبری نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ اوّل جب فرشتوں نے کھانے سے انکار کیا تو یہ کہا تھا کہ ہم مفت کا کھانا نہیں کھاتے اگر آپ قیمت لے لیں تو کھائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ ہاں اس کھانے کی ایک قیمت ہے وہ ادا کردو، وہ قیمت یہ ہے کہ شروع میں اللہ کا نام لو اور آخر میں اس کی حمد کرو، جبریلِ امین نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خلیل بنایا ہے یہ اسی کے مستحق ہیں۔ [۳]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کھانے کے شروع میں بِسْمِ اللہِ اور آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا سنت ہے۔

فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرٰھِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْہُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا

پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اُس کو خوشخبری جھگڑنے لگا ہم سے

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۹ ص:۶۴ [۲] تفسیر القرطبی ج:۹ ص:۶۵، ۶۶

[۳] تفسیر الطبری تحت ھٰذہ الآیۃ رقم الحدیث:۱۸۳۱۴

فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝۷۴ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝۷۵ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ

قوم لوط کے حق میں البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دِل ہے رجوع رہنے والا اے ابراہیم

اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ

چھوڑ یہ خیال وہ تو آچکا حکم تیرے رَبّ کا اور ان پر آتا ہے عذاب

غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝۷۶ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا

جو لوٹایا نہیں جاتا۔ اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا ان کے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں

وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝۷۷ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ

اور بولا آج دِن بڑا سخت ہے، اور آئی اس کے پاس قوم اس کی دوڑتی بے اختیار، اور آگے سے

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ

کر رہے تھے بُرے کام بولا اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝۷۸

سو ڈرو اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن،

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝۷۹

بولے تُو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝۸۰ قَالُوْا يٰلُوْطُ

کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور ہوتا یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں مہمان بولے اے لوط

إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوْٓا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ

ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رَبّ کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ط إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَآ أَصَابَهُمْ ط

اور مڑکر نہ دیکھے تم میں کوئی مگر عورت تیری کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو اُن کو پہنچے گا

إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ﴿٨١﴾ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا

ان کے وعدہ کا وقت ہے صبح، کیا صبح نہیں ہے نزدیک پھر جب پہنچا حکم ہمارا کرڈالی ہم نے وہ بستی

عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ ۙ مَّنْضُودٍ ﴿٨٢﴾ لا

اُوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ط وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾ ع

تیرے رَبّ کے پاس اورنہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور

ع ۷ ۱۵ النصف

آسان ترجمۂ قرآن

پھر جب ابراہیم سے گھبراہٹ دُور ہوئی، اور اُن کو خوشخبری مل گئی تو اُنہوں نے ہم سے لوط کی قوم کے بارے میں (ناز کے طور پر) جھگڑنا شروع کردیا۔ ﴿۷۴﴾ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑے بردبار، (اللہ کی یاد میں) بڑی آہیں بھرنے والے، (اور) ہر وقت ہم سے لَو لگائے ہوئے تھے۔ ﴿۷۵﴾ (ہم نے اُن سے کہا:) ''ابراہیم! اس بات کو جانے دو۔ یقین کرلو کہ تمہارے رَبّ کا حکم آچکا ہے، اور ان لوگوں پر ایسا عذاب آکر رہے گا جس کو کوئی پیچھے نہیں لوٹا سکتا۔'' ﴿۷۶﴾ اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ اُن کی وجہ سے گھبرائے، اُن کا دِل پریشان ہوا، اور وہ کہنے لگے کہ: ''آج کا یہ دن بہت کٹھن ہے۔'' ﴿۷۷﴾ اور اُن کی قوم کے لوگ اُن کے پاس دوڑتے ہوئے آئے، اور اس سے پہلے وہ برے کام کیا ہی کرتے تھے۔ لوط نے کہا: ''اے میری قوم کے لوگو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لئے کہیں زیادہ پاکیزہ ہیں، اس لئے اللہ سے ڈرو،

اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رُسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی ایک بھی بھلا آدمی نہیں ہے؟'' (۷۸) کہنے لگے: ''تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹیوں سے ہمیں کچھ مطلب نہیں، اور تم خوب جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟'' (۷۹) لوط نے کہا: ''کاش کہ میرے پاس تمہارے مقابلے میں کوئی طاقت ہوتی، یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے سکتا!'' (۸۰) (اب) فرشتوں نے (لوط سے) کہا: ''اے لوط! ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ (کافر) لوگ ہرگز تم تک رسائی حاصل نہیں کرسکیں گے۔ لہٰذا تم رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر بستی سے روانہ ہو جاؤ، اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ ہاں مگر تمہاری بیوی (تمہارے ساتھ نہیں جائے گی) اُس پر بھی وہی مصیبت آنے والی ہے جو اور لوگوں پر آرہی ہے۔ یقین رکھو کہ ان (پر عذاب نازل کرنے) کے لئے صبح کا وقت مقرّر ہے۔ کیا صبح بالکل نزدیک نہیں آگئی؟'' (۸۱) پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اس زمین کے اُوپر والے حصے کو نیچے والے حصے میں تبدیل کر دیا، اور ان پر پکی مٹی کے تہ بر تہ پتھر برسائے (۸۲) جن پر تمہارے رَبّ کی طرف سے نشان لگے ہوئے تھے۔ اور یہ بستی (مکہ کے ان) ظالموں سے کچھ دُور نہیں ہے۔ (۸۳)

خلاصۂ تفسیر

پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) کا وہ خوف زائل ہوگیا (جب فرشتوں نے لَا تَخَفْ کہا اور ان کا فرشتہ ہونا معلوم ہوگیا) اور ان کو خوشی کی خبر ملی (کہ اولاد پیدا ہوگی) تو (ادھر سے بے فکر ہو کر دُوسری طرف متوجہ ہوئے کہ قوم لوط ہلاک کی جاوے گی اور) ہم سے لوط (علیہ السلام) کی قوم کے بارے میں (سفارش جو باعتبار مبالغہ و اصرار کے صورۃً جدال (تھا) کرنا شروع کیا (جس کی تفصیل دُوسری آیت میں ہے کہ وہاں تو لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں اِس لئے عذاب نہ بھیجا جاوے کہ ان کو گزند پہنچے گا، مطلب یہ ہوگا کہ اس بہانہ سے قوم بچ جاوے جیسا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے اور شاید ابراہیم علیہ السلام کو ان کے مؤمن ہونے کی امید ہو) واقعی ابراہیم بڑے حلیم الطبع رحیم المزاج، رقیق القلب تھے (اس لئے سفارش میں مبالغہ کیا، اِرشاد ہوا کہ) اے اِبراہیم (گو بہانہ لوط علیہ السلام کا ہے مگر اصلی مطلب معلوم ہوگیا کہ قوم کی سفارش ہے سو) اس بات کو جانے دو (یہ ایمان نہ لاویں گے اسی لئے) تمہارے رَبّ کا حکم (اس کے متعلق) آچکا ہے اور (اس کے سبب سے) ان پر ضرور ایسا عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹلنے والا نہیں (اس لئے اس باب میں کچھ کہنا سننا بیکار ہے، رہا لوط علیہ السلام کا وہاں ہونا سو ان کو اور سب ایمان والوں کو وہاں سے علیحدہ کر دیا جاوے گا اس کے بعد عذاب آوے گا تا کہ ان کو گزند نہ پہنچے، چنانچہ اس پر بات ختم ہوگئی) اور (ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے فارغ ہو کر) جب ہمارے وہ فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے تو لوط (علیہ السلام) ان کے (آنے کی) وجہ سے (اس لئے) مغموم

ہوئے (کہ وہ بہت حسین نو جوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نا معقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) اُن کے (آنے کے) سبب بہت تنگدل ہوئے (اور غایت تنگدلی سے) کہنے لگے کہ آج کا دن بہت بھاری ہے (کہ ان کی تو ایسی صورتیں اور قوم کی یہ حرکتیں اور میں تن تنہا، دیکھئے کیا ہوتا ہے؟) اور ان کی قوم (نے جو یہ خبر سنی تو) ان کے (یعنی لوط علیہ السلام کے) پاس دوڑے ہوئے آئے اور پہلے سے نا معقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے (اسی خیال سے اب بھی آئے) لوط (علیہ السلام بڑے گھبرائے اور براہ تملق) فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں وہ تمہارے (نفس کی کامرانی کے) لئے (اچھی) خاصی ہیں سو (اَمردوں پر نگاہ کرنے کے باب میں) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھ کو فضیحت مت کرو (یعنی اِن مہمانوں کو کچھ کہنا مجھ کو شرمندہ اور رسوا کرنا ہے، اگر ان کی رعایت نہیں کرتے کہ مسافر ہیں تو میرا خیال کرو کہ تم میں رہتا سہتا ہوں، افسوس اور تعجب ہے) کیا تم میں کوئی بھی (معقول آدمی اور) بھلا مانس نہیں (کہ اس بات کو سمجھے اور اَوروں کو سمجھائے) وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ کی ان (بہو) بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ عورتوں سے ہم کو رغبت ہی نہیں) اور آپ کو تو معلوم ہے (یہاں آنے سے) جو ہمارا مطلب ہے، لوط (علیہ السلام نہایت عاجز اور زِچ ہو کر) فرمانے لگے کیا خوب ہوتا اگر میرا تم پر کچھ زور چلتا (کہ خود تمہارے شر کو دفع کرتا) یا کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑتا (مراد یہ کہ میرا کوئی کنبہ قبیلہ ہوتا کہ میری مدد کرتا، لوط علیہ السلام کا جو اس قدر اضطراب دیکھا تو) فرشتے کہنے لگے کہ اے لوط (ہم آدمی نہیں جو آپ اس قدر گھبراتے ہیں) ہم تو آپ کے رَبّ کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں (تو ہمارا تو کیا کر سکتے ہیں اور آپ اپنے لئے بھی اندیشہ نہ کریں) آپ تک (بھی) ہرگز ان کی رسائی نہیں ہوگی (کہ آپ کو کچھ تکلیف پہنچا سکیں اور ہم ان پر عذاب نازل کرنے آئے ہیں) سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر (یہاں سے باہر) چلے جایئے اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں) ہاں مگر آپ کی بیوی (بوجہ مسلمان نہ ہونے کے نہ جاوے گی) اس پر بھی وہی آفت آنے والی ہے جو اَور لوگوں پر آوے گی (اور ہم رات کے وقت نکل جانے کو اس لئے کہتے ہیں کہ) ان کے (عذاب کے) وعدہ کا وقت صبح کا وقت ہے (لوط علیہ السلام بہت دق ہو گئے تھے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہوا بھی ہو جاوے کَذَا فِی الدر المنثور، فرشتوں نے کہا) کیا صبح کا وقت قریب نہیں (غرض لوط علیہ السلام شباشب دُور نکل گئے اور صبح ہوئی اور عذاب کا سامان شروع ہوا) سو جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا تو ہم نے اس زمین (کو اُلٹ کر اُس) کا اُوپر کا تختہ تو نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور اس سرزمین پر کھنگر کے پتھر (مراد جھانوہ جو پک کر مثل پتھر کے ہو جاتا ہے) برسانا شروع کئے جو لگاتار گر رہے تھے جن پر آپ کے رَبّ کے پاس (یعنی عالَم غیب میں) خاص نشان بھی تھا (جس سے اَور پتھروں سے وہ پتھر ممتاز تھے) اور (اہلِ مکہ کو چاہئے کہ اِس قصہ سے عبرت پکڑیں کیونکہ) یہ بستیاں (قومِ

لوط کی) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں (ہمیشہ شام کو آتے جاتے ان کی بربادی کے آثار دیکھتے ہیں پس ان کو اللہ اور رسول کی مخالفت سے ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

سورۂ ہود میں اکثر انبیاء سابقین اور اُن کی اُمتوں کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی بناء پر مختلف قسم کے آسمانی عذابوں کا بیان آیا ہے، آیاتِ مذکورہ میں حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کا حال اور قومِ لوط پر عذابِ شدید کا بیان ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کافر ہونے کے علاوہ ایک ایسی خبیث بدکاری اور بے حیائی میں مبتلا تھی جو دنیا میں کبھی پہلے نہ پائی گئی تھی جس سے جنگل کے جانور بھی نفرت کرتے ہیں کہ مرد مرد کے ساتھ منہ کالا کرے جس کا وبال وعذاب عام بدکاری سے بدرجہا زیادہ ہے، اِسی لئے اس قوم پر ایسا شدید عذاب آیا جو عام بے حیائی اور بدکاری کرنے والوں پر کبھی نہیں آیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ جو اِن آیات میں مذکور ہے اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چند فرشتے جن میں جبریلِ امین بھی شامل تھے اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے بھیجے، جو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں فلسطین پہنچے جس کا واقعہ پچھلی آیات میں بیان ہو چکا ہے، اُس کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے جن کا مقام وہاں سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ جس قوم کو عذاب میں پکڑتے ہیں اُس پر اُن کے عمل کے مناسب ہی عذاب مسلط فرماتے ہیں، اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہ فرشتے حسین لڑکوں کی شکل میں بھیجے گئے جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے تو ان کو بشکلِ انسانی دیکھ کر اُنہوں نے بھی مہمان سمجھا اور اس وقت وہ سخت فکر وغم میں مبتلا ہو گئے کہ مہمانوں کی مہمانی نہ کی جائے تو یہ شانِ پیغمبری کے خلاف ہے اور اگر ان کو مہمان بنایا جاتا ہے تو اپنی قوم کی خباثت معلوم ہے، اس کا خطرہ ہے کہ وہ مکان پر چڑھ آئیں اور ان مہمانوں کو اذیت پہنچائیں اور وہ اُن کی مدافعت نہ کر سکیں، اور دِل میں کہنے لگے کہ آج بڑی سخت مصیبت کا دن ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے اس عالَم کو عجیب عبرت کی جگہ بنایا ہے جس میں اُس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے بیشمار مظاہر ہوتے ہیں، آزر بُت پرست کے گھر میں اپنا خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا کر دیا، حضرت لوط علیہ السلام جیسے مقبول و برگزیدہ پیغمبر کے گھر میں ان کی بیوی کافروں سے ملتی اور حضرت لوط علیہ السلام کی مخالفت کرتی تھی، جب یہ محترم

مہمان حسین لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں مقیم ہو گئے تو ان کی بیوی نے ان کی قوم کے اوباش لوگوں کو خبر کر دی کہ آج ہمارے گھر میں اس طرح کے مہمان آئے ہیں۔ (قرطبی ومظہری) [1]

حضرت لوط علیہ السلام کا سابقہ اندیشہ سامنے آ گیا، جس کا بیان دوسری آیت میں ہے وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۖ یعنی آ گئی ان کے پاس ان کی قوم دوڑی ہوئی، اور وہ پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے۔

اِس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ اپنے خبیث عمل کی نحوست سے اس قدر بے حیاء ہو چکے تھے کہ علانیہ حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ دوڑے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کی مدافعت مشکل ہے تو ان کو شر سے باز رکھنے کے لئے فرمایا کہ تم اس شر و فساد سے باز آ جاؤ تو میں اپنی لڑکیاں تمہارے سرداروں کے نکاح میں دے دوں گا، اُس زمانہ میں مسلمان لڑکی کا نکاح کافر سے جائز تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ تک یہی حکم جاری تھا اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے کر دیا تھا حالانکہ یہ دونوں کفر پر تھے، بعد میں وہ آیات نازل ہوئیں جن میں مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے حرام قرار پایا۔ (قرطبی) [2]

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اپنی لڑکیوں سے مراد اپنی پوری قوم کی لڑکیاں ہیں کیونکہ ہر پیغمبر اپنی قوم کے لئے مثل باپ کے ہوتا ہے اور پوری اُمت اُس کی روحانی اولاد ہوتی ہے جیسا کہ آیتِ کریمہ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۖ [3] (الاحزاب:٦) کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں، جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام اُمت کا باپ قرار دیا ہے، اس تفسیر کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی خبیث عادت سے باز آؤ، شرافت کے ساتھ قوم کی لڑکیوں سے نکاح کرو، اُن کو بیبیاں بناؤ۔

پھر لوط علیہ السلام نے اُن کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ اور پھر عاجزانہ درخواست کی وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۖ یعنی مجھ کو میرے مہمانوں کے متعلق رسوا نہ کرو، اور فرمایا اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿٧٨﴾ یعنی کیا تم میں کوئی ایک بھی بھلا مانس اور شریف آدمی نہیں جو میری فریاد سنے۔

مگر وہاں شرافت و انسانیت کا کوئی اثر کسی میں باقی نہ تھا، سب نے جواب میں کہا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ

---

[1] التفسير المظهری تحت هذه الآية ج:٥ ص:١٠٣، وتفسير القرطبی تحت هذه الآية ج:٩ ص:٧٥

[2] تفسير القرطبی ج:٩ ص:٧٦

[3] ترجمہ: نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں۔

حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾ یعنی آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آپ کی لڑکیوں کی کوئی ضرورت نہیں، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔

اس وقت ہر طرح سے عاجز ہو کر لوط علیہ السلام کی زبان پر کلمہ آیا لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ یعنی کاش مجھ میں اِتنی قوت ہوتی کہ میں اس پوری قوم کا خود مقابلہ کر سکتا یا پھر کوئی جتھہ اور جماعت ہوتی جو مجھے ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دِلاتی۔

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھ کر بات کھول دی اور کہا کہ گھبرایئے نہیں آپ کی جماعت بڑی قوی اور مضبوط ہے، ہم اللہ کے فرشتے ہیں ان کے قابو میں آنے والے نہیں، ان پر عذاب واقع کرنے کے لئے آئے ہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوط پر رحم فرماویں وہ کسی مضبوط جماعت کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے، اور ترمذی میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کا کنبہ قبیلہ اُس کا حمایتی نہ ہو (قرطبی) [1] خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفارِ قریش نے ہزار طرح کی تدبیریں کیں لیکن آپ کے پورے خاندان نے آپ کی حمایت کی، اگرچہ مذہب میں وہ سب آپ کے موافق نہ تھے، اسی وجہ سے پورے بنی ہاشم اُس مقاطعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے جس میں کفارِ قریش نے ان پر دانا پانی بند کر دیا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قومِ لوط ان کے گھر پر چڑھ آئی تو لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس شریر قوم سے پس پردہ ہو رہی تھی فرشتے بھی مکان کے اندر تھے، ان لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا اُس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آئے، جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہہ دیا کہ آپ دروازہ کھول دیں، اب ہم ان کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں، دروازہ کھولا تو جبریلِ امین نے اپنے پَر کا اشارہ ان کی آنکھوں کی طرف کیا جس سے سب اندھے ہو گئے اور بھاگنے لگے۔

اس وقت فرشتوں نے بحکم ربانی حضرت لوط علیہ السلام کو کہا فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ یعنی آپ رات کے آخری حصہ میں اپنے اہل وعیال کو لے کر یہاں سے نکل جایئے ـــــــ اور یہ ہدایت کر دیجئے کہ ان میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، بجز آپ کی بیوی کے کیونکہ اُس پر تو وہی عذاب پڑنے والا ہے جو قوم پر پڑے گا۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج: ۹ ص: ۷۸، وصحیح البخاری، کتاب الأنبیاء، باب قول الله تعالیٰ لقد کان فی یوسف الآیة ج: ۱ ص: ۴۷۹، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة یوسف ج: ۲ ص: ۱۴۴

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بیوی کو ساتھ نہ لیں، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ آپ کے اہل میں داخل ہو کر ساتھ چلے گی مگر وہ آپ کے اس حکم پر عمل نہ کرے گی جو آپ اپنے اہل وعیال کو دیں گے کہ کوئی مُڑ کر نہ دیکھے، بعض روایات میں ہے کہ یوں ہی ہوا کہ یہ بیوی بھی ساتھ چلی مگر قوم پر عذاب آنے کا دھاکہ سنا تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور قوم کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرنے لگی، اسی وقت ایک پتھر آیا جس نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ (قرطبی ومظہری) [1]

فرشتوں نے یہ بھی بتلا دیا کہ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ یعنی ان پر صبح ہوتے ہی عذاب آجائے گا حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اور بھی جلد عذاب آجائے، اس پر فرشتوں نے کہا اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ یعنی صبح تو کچھ دور نہیں، ہوا چاہتی ہے۔

پھر اس عذاب کا واقعہ قرآن نے اس طرح بیان فرمایا کہ جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے ان بستیوں کے اوپر کا حصہ نیچے کر دیا اور ان پر ایسے پتھر برسائے جن پر ہر ایک کے نام کی علامت لگی ہوئی تھی۔

روایات میں ہے کہ یہ چار بڑے بڑے شہر تھے جن میں یہ لوگ بستے تھے، انہیں بستیوں کو قرآنِ کریم میں دوسری جگہ "مُؤْتَفِکَات" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو جبریلِ امین نے اپنا پَر ان سب شہروں کی زمین کے نیچے پہنچا کر سب کو اس طرح اوپر اٹھا لیا کہ ہر چیز اپنی جگہ رہی، پانی کے برتن سے پانی بھی نہیں گرا، آسمان کی طرف سے کتوں اور جانوروں اور انسانوں کی آوازیں آرہی تھیں ان سب بستیوں کو آسمان کی طرف سیدھا اُٹھانے کے بعد اوندھا کر کے پلٹ دیا، جو ان کے عملِ خبیث کے مناسب حال تھا۔

آخرِ آیت میں قومِ لوط کا عذاب ذکر کرنے کے بعد موجودہ اقوامِ دنیا کو متنبہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ یعنی پتھراؤ کا عذاب آج بھی ظالموں سے کچھ دور نہیں، جو لوگ اس قوم کی طرح ظلم و بے حیائی پر جمے رہیں وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے دُور نہ سمجھیں آج بھی یہ عذاب آسکتا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں بھی کچھ لوگ وہ عمل کریں گے جو قومِ لوط کرتی تھی، جب ایسا ہونے لگے تو انتظار کرو کہ اُن پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قومِ لوط پر آیا ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۹ ص:۸۰، والتفسیر المظهری تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۱۰۵

غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ

اس کے سوا اور نہ گھٹاؤ ماپ اور تول کو میں دیکھتا ہوں تم کو آسودہ حال اور ڈرتا ہوں

عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ

تم پر عذاب سے ایک گھیر لینے والے دن کے، اور اے قوم پورا کرو ماپ اور تول کو

بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

انصاف سے اور نہ گھٹادو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت مچاؤ زمین میں فساد،

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ڬ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ

بولے اے شعیب تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو یہ سکھایا کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے

اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

یا چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں، تو ہی بڑا باوقار ہے نیک چلن

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ

بولا اے قوم دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آگئی اپنے ربّ کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو

رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ

نیک روزی، اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے چھڑاؤں،

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ

میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہوسکے اور بن آنا ہے اللہ کی مدد سے

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۸۸﴾ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ

اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے، اور اے میری قوم نہ کماؤ میری ضد کرکے یہ کہ پڑے تم پر

مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ

جیسا کچھ کہ پڑچکا قومِ نوح پر یا قومِ ہود پر یا قومِ صالح پر اور قومِ لوط

مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ

تم سے کچھ دور ہی نہیں اور گناہ بخشواؤ اپنے ربّ سے اور رجوع کرو اس کی طرف البتہ میرا ربّ ہے مہربان

وَدُودٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا

محبت والا بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں جو تو کہتا ہے اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں

ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿۹۱﴾

کمزور ہے اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کرڈالتے، اور ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں،

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ ۖ وَاتَّخَذْتُمُوهُ

بولا اے قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے اور اس کو ڈال رکھا تم نے

وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۹۲﴾ وَيَا قَوْمِ

پیٹھ پیچھے بھلا کر، تحقیق میرے ربّ کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اور اے میری قوم

اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ

کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں، آگے معلوم کرلو گے کس پر آتا ہے عذاب

يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝۹۳

رُسوا کرنے والا اور کون ہے جھوٹا، اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا

اور جب پہنچا ہمارا حکم، بچادیا ہم نے شعیب کو اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی مہربانی سے

وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۴ ۙ

اور آپکڑا ان ظالموں کو کڑک نے، پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے،

ع ۸ ۱۲ ۸ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝۹۵ ع

گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے، سن لو پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے (ان سے) کہا کہ: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی مت کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ خوشحال ہو، اور مجھے تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تمہیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔ (۸۴) اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول پورا پورا کیا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو، اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔ (۸۵) اگر تم میری بات مانو تو (لوگوں کا حق ان کو دینے کے بعد) جو کچھ اللہ کا دیا بچ رہے، وہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے۔ اور (اگر نہ مانو تو) میں تم پر پہرہ دار مقرر نہیں ہوا ہوں۔'' (۸۶) وہ کہنے لگے: ''اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جن کی عبادت کرتے آئے تھے، ہم انہیں بھی چھوڑ دیں، اور اپنے مال و دولت کے بارے میں

جو کچھ ہم چاہیں، وہ بھی نہ کریں؟ واقعی تم تو بڑے عقل مند، نیک چلن آدمی ہو!'' ⁨۸۷⁩ شعیب نے کہا: ''اے میری قوم کے لوگو! ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہوں، اور اُس نے خاص اپنے پاس سے مجھے اچھا رزق عطا فرمایا ہے (تو پھر میں تمہارے غلط طریقے پر کیوں چلوں؟) اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ میں جس بات سے تمہیں منع کر رہا ہوں، تمہارے پیچھے جا کر وہی کام خود کرنے لگوں۔ میرا مقصد اپنی استطاعت کی حد تک اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور مجھے جو کچھ توفیق ہوتی ہے، صرف اللہ کی مدد سے ہوتی ہے۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے، اور اُسی کی طرف میں (ہر معاملے میں) رُجوع کرتا ہوں۔ ⁨۸۸⁩ اور اے میری قوم! میرے ساتھ ضد کا جو معاملہ تم کر رہے ہو، وہ کہیں تمہیں اس انجام تک نہ پہنچا دے کہ تم پر بھی ویسی ہی مصیبت نازل ہو جیسی نوح کی قوم پر یا ہودؑ کی قوم پر یا صالح کی قوم پر نازل ہو چکی ہے۔ اور لوط کی قوم تو تم سے کچھ دُور بھی نہیں ہے۔ ⁨۸۹⁩ تم اپنے رَبّ سے معافی مانگو، پھر اسی کی طرف رُجوع کرو۔ یقین رکھو کہ میرا رَبّ بڑا مہربان، بہت محبت کرنے والا ہے۔'' ⁨۹۰⁩ وہ بولے: ''اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے درمیان ایک کمزور آدمی ہو، اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ ہم پر تمہارا کچھ زور نہیں چلتا'' ⁨۹۱⁩ شعیب نے کہا: ''اے میری قوم! کیا تم پر میرے خاندان کا دباؤ اللہ سے زیادہ ہے؟ اور اُس کو تم نے بالکل ہی پسِ پشت ڈال رکھا ہے! یقین جانو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میرا پروردگار اُس سب کا پورا اِحاطہ کئے ہوئے ہے۔ ⁨۹۲⁩ اور اے میری قوم! تم اپنے حال پر رہ کر (جو چاہو) عمل کئے جاؤ، میں بھی (اپنے طریقے کے مطابق) عمل کر رہا ہوں۔ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر وہ عذاب نازل ہوگا جو اُسے رُسوا کر کے رکھ دے گا، اور کون ہے جو جھوٹا ہے؟ اور تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔'' ⁨۹۳⁩ اور (آخر کار) جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے شعیب کو اور اُن کے ساتھ جو ایمان لائے تھے، ان کو اپنی خاص رحمت سے بچا لیا، اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، انہیں ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، اور وہ اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے منہ گرے رہ گئے ⁨۹۴⁩ جیسے کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو! مدین کی بھی ویسی ہی بربادی ہوئی جیسی بربادی ثمود کی ہوئی تھی۔ ⁨۹۵⁩

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اہلِ مدین سے) فرمایا کہ اے میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں (یہ حکم تو دیانات وعقائد کے متعلق ان کے مناسب حال تھا) اور (دُوسرا حکم معاملات کے متعلق ان کے مناسب یہ فرمایا کہ) تم ناپ تول میں کمی مت کیا کرو (کیونکہ) میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں (پھر تم کو ناپ تول میں کمی کرنے کی کیا

ضرورت پڑی ہے اور حقیقۃً تو کسی کو بھی ضرورت نہیں ہوتی) اور (علاوہ اس کے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضا ہے خود خوف ضرر بھی اس کو مقتضی ہے کیونکہ اس میں) مجھ کو تم پر اندیشہ ہے ایسے دِن کے عذاب کا جو انواعِ عذاب کا جامع ہوگا اور (ہر چند کہ کمی نہ کرنا مستلزم ہے پورا کرنے کو مگر تاکید کے لئے اس کی ممانعت کے بعد اس امر کی تصریح بھی فرمائی کہ) اے میری قوم تم ناپ اور تول پوری پوری طرح کیا کرو اور لوگوں کا ان چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا تمہاری عادت ہے) اور (شرک اور لوگوں کے حقوق میں کمی کر کے) زمین میں فساد کرتے ہوئے حد (توحید وعدل) سے مت نکلو (لوگوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد) اللہ کا دِیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بچ جائے وہ تمہارے لئے (اِس حرام کمائی سے) بدرجہا بہتر ہے (کیونکہ حرام میں گو وہ کثیر ہو برکت نہیں اور انجام اس کا جہنم ہے اور حلال میں گو وہ قلیل ہو برکت ہوتی ہے اور انجام اس کا رضائے حق ہے) اگر تم کو یقین آوے (تو مان لو) اور (اگر یقین نہ آوے تو تم جانو) میں تمہارا پہرہ دینے والا تو ہوں نہیں (کہ تم سے جبراً یہ افعال چھڑا دوں جیسا کرو گے بھگتو گے) وہ لوگ (یہ تمام مواعظ ونصائح سن کر) کہنے لگے اے شعیب ! کیا تمہارا (مصنوعی اور وہمی) تقدس تم کو (ایسی ایسی باتوں کی) تعلیم کر رہا ہے کہ (تم ہم سے کہتے ہو کہ) ہم ان چیزوں (کی پرستش) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں اور اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں واقعی آپ بڑے عقل مند دین پر چلنے والے ہیں (یعنی جن باتوں سے ہم کو منع کرتے ہو دونوں میں سے کوئی بُرا نہیں کیونکہ ایک کی دلیل تو نقلی ہے کہ ہمارے بڑوں سے بُت پرستی ہوتی آئی ہے، دُوسرے کی دلیل عقلی ہے کہ اپنا مال ہے اس میں ہر طرح کا اختیار ہے پس ہم کو منع نہ کرنا چاہئے، اور حلیم رشید تمسخر سے کہا، جیسا بد دینوں کی عادت ہوتی ہے دین داروں کے ساتھ تمسخر کرنے کی اور ان کی نقلی وعقلی، دونوں دلیلوں کا فساد بدیہی ہے) شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا اے میری قوم (تم جو مجھ سے چاہتے ہو کہ میں توحید وعدل کی نصیحت نہ کروں تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رَبّ کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے توحید وعدل ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے ایک عمدہ دولت (یعنی نبوّت) دی ہو (جس سے مجھ پر تبلیغ ان اَحکام کی واجب ہو، یعنی توحید وعدل کا حق ہونا بھی ثابت اور ان کی تبلیغ بھی واجب) تو پھر کیسے تبلیغ نہ کروں اور میں (جس طرح ان باتوں کی تم کو تعلیم کرتا ہوں خود بھی تو اس پر عمل کرتا ہوں) یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں (برخلاف سے یہ ہی مراد ہے کہ تم کو اَور راہ بتلاؤں اور خود اَور راہ پر چلوں، مطلب یہ ہے کہ میری نصیحت محض خیر خواہی ودلسوزی سے ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ میں وہی باتیں بتلاتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے بھی پسند کرتا ہوں غرض) میں تو اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے امکان میں ہے اور مجھ کو جو کچھ (عمل واصلاح کی) توفیق ہو جاتی ہے صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے (ورنہ کیا میں اور کیا میرا ارادہ) اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف (تمام امور میں) رجوع کرتا ہوں (خلاصہ یہ کہ توحید وعدل

کے وجوب پر دلائل بھی قائم، اور بامرِ خداوندی اس کی تبلیغ، اور ناصح ایسا دِلسوز اور مصلح، پھر بھی نہیں مانتے بلکہ اُلٹی مجھ سے اُمید رکھتے ہو کہ میں کہنا چھوڑ دوں چونکہ اِس تقریر میں دلسوزی اور اصلاح کی اپنی طرف نسبت کی ہے، اس لئے مَا تَوْفِيْقِيْٓ إلـخ فرمادیا، یہاں تک تو ان کے قول کا جواب ہوگیا، آگے ترہیب وترغیب فرماتے ہیں) اور اے میری قوم میری ضد (اور عداوت) تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہوجاوے کہ تم پر بھی اسی طرح کی مصیبتیں آپڑیں جیسے قومِ نوح یا قومِ ہود یا قومِ صالح پر پڑیں تھیں اور (اگر ان قوموں کا قصہ پرانا ہوچکا ہے اور اس لئے اس سے متاثر نہیں ہوتے تو) قومِ لوط تو (ابھی) تم سے (بہت) دور (زمانہ میں) نہیں ہوئی (یعنی ان قوموں کی نسبت ان کا زمانہ نزدیک ہے، یہ تو ترہیب کا مضمون ہوگیا، آگے ترغیب ہے) اور تم اَپنے رَبّ سے اپنے گناہ (یعنی شرک وظلم) معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ کیونکہ ایمان سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں، گو حقوق ادا کرنے پڑیں) پھر (طاعتِ عبادت کے ساتھ) اس کی طرف متوجہ ہو بلاشک میرا رَبّ بڑا مہربان بڑی محبت والا ہے (وہ گناہ کو معاف کردیتا ہے اور طاعت کو قبول کرتا ہے) وہ لوگ (یہ لاجواب دِل آویز تقریر سن کر جوابِ معقول سے عاجز ہوکر براہِ جہالت) کہنے لگے کہ شعیب! بہت سی باتیں تمہاری کہی ہوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتیں (یہ بات یا تو اس وجہ سے کہی ہو کہ اچھی طرح توجہ سے آپ کی باتیں نہ سنی ہوں یا تحقیراً کہا ہو کہ نعوذ باللہ یہ ہذیان ہے سمجھنے کے قابل نہیں، چنانچہ بددینوں سے یہ سب امور واقع ہوتے ہیں) اور ہم تم کو اپنے (مجمع) میں کمزور دیکھ رہے ہیں اور اگر تمہارے خاندان کا (کہ ہمارے ہم مذہب ہیں ہم کو) پاس نہ ہوتا تو ہم تم کو (کبھی کا) سنگسار کرچکے ہوتے اور ہماری نظر میں تمہاری کچھ توقیر ہی نہیں (لیکن جس کا لحاظ ہوتا ہے اُس کے سبب اس کے رشتہ دار کی بھی رعایت ہوتی ہے، مطلب ان کا یہ تھا کہ تم ہم کو یہ مضامین مت سناؤ ورنہ تمہاری جان کا خطرہ ہے، پہلے تمسخر کے طور پر تبلیغ سے روکا تھا، اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ إلـخ اور اب دھمکی دے کر روکا) شعیب (علیہ السلام) نے (جواب میں) فرمایا اے میری قوم (افسوس اور تعجب ہے کہ میری جو نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے کہ میں اس کا نبی ہوں وہ تو میرے اِہلاک سے مانع نہ ہوئی اور جو میری نسبت خاندان کے ساتھ ہے کہ ان کا رشتہ دار ہوں وہ اس سے مانع ہوئی تو اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ تم خاندان کا لحاظ اللہ سے بھی زیادہ کرتے ہو تو) کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ سے بھی زیادہ باتوقیر ہے (کہ خاندان کا تو پاس کیا) اور اس کو (یعنی اللہ تعالیٰ کو) تم نے پس پشت ڈال دیا (یعنی اس کا پاس نہ کیا، سو اس کا خمیازہ عنقریب بھگتو گے کیونکہ) یقیناً میرا رَبّ تمہارے سب اعمال کو (اپنے علم میں) اِحاطہ کئے ہوئے ہے اور اے میری قوم (اگر تم کو عذاب کا بھی یقین نہیں آتا تو اخیر بات یہ ہے کہ تم جانو، بہتر ہے) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں (سو) اب جلدی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رُسوا کردے گا اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا تھا (یعنی تم مجھ کو دعوئ نبوّت میں جھوٹا کہتے ہو اور حقیر سمجھتے ہو تو اب معلوم ہوجاوے گا کہ جرمِ کذب کا مرتکب اور سزائے

ذلت کا مستوجب کون تھا تم یا میں) اور تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ دیکھیں عذاب کا وقوع ہوتا ہے جیسا میں کہتا ہوں یا عدمِ وقوع جیسا تمہارا گمان ہے، غرض ایک زمانہ کے بعد عذاب کا سامان شروع ہوا) اور جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا (تو) ہم نے (اس عذاب سے) شعیب (علیہ السلام) کو اور جو ان کی ہمراہی میں اہلِ ایمان تھے ان کو اپنی عنایت (خاص) سے بچالیا اور ان ظالموں کو ایک سخت آواز نے (کہ نعرۂ جبریلؑ تھا) آپکڑا سو اپنے گھروں کے اندر اوندھے گرے رہ گئے (اور مرگئے) جیسے کبھی اِن گھروں میں بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (اور عبرت پکڑو) مدین کو رحمت سے دُوری ہوئی جیسا ثمود رحمت سے دُور ہوئے تھے۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر آیات میں حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کا واقعہ مذکور ہے، اُن کی قوم کفر و شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی بھی کرتی تھی، حضرت شعیب علیہ السلام نے اُن کو ایمان کی دعوت دی اور ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا اور اس کے خلاف کرنے پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا مگر یہ اپنے انکار اور سرکشی پر قائم رہے تو پوری قوم ایک سخت عذاب کے ذریعہ ہلاک کردی گئی ____ جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ یعنی ہم نے بھیجا مَدْيَن کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو۔ مَدْيَن اصل میں ایک شہر کا نام تھا جس کو مَدْیَن بن ابراہیم نے بسایا تھا اس کا محلِ وقوع ملکِ شام کے موجودہ مقام ''معان'' کو بتلایا جاتا ہے، اس شہر کے باشندوں کو بھی بجائے اہلِ مدین کے مدین کہہ دیا جاتا ہے، شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں جو اسی قوم مدین میں سے ہیں اسی لئے اُن کو مدین کا بھائی فرما کر اس نعمت کی طرف اشارہ کردیا کہ اس قوم کے رسول کو اللہ تعالیٰ نے اِسی قوم سے بنایا تاکہ اُن سے مانوس ہو کر اُن کی ہدایات کو بآسانی قبول کرسکیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ۔

اِس میں حضرت شعیب علیہ السلام نے پہلے تو اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی کیونکہ یہ لوگ مشرک تھے، درختوں کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے، جس کو قرآن میں لفظ اَيْكَه سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی نسبت سے اہلِ مدین کو اَصْحٰبُ الْاَيْكَه کا لقب بھی دیا گیا ہے، اس کفر و شرک کے ساتھ ان میں ایک اور عیب و گناہ نہایت سخت یہ تھا کہ بیوپار اور لین دین کے وقت ناپ تول میں کمی کر کے لوگوں کا حق مار لیتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو اس سے منع فرمایا۔

فائدہ

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ کفر و شرک سب گناہوں کی جڑ ہے جو قوم اِس میں مبتلا ہے اُس کو پہلے

ایمان ہی کی دعوت دی جاتی ہے، ایمان سے پہلے دُوسرے معاملات اور اعمال پر توجہ نہیں دی جاتی، دُنیا میں اُن کی نجات یا عذاب بھی اسی ایمان وکفر کی بنیاد پر ہوتا ہے، تمام انبیاء سابقین اور ان کی قوموں کے واقعات جو قرآن میں مذکور ہیں اِسی طرزِ عمل کے شاہد ہیں، صرف دو قومیں ایسی ہیں جن پر عذاب نازل ہونے میں کفر کے ساتھ اُن کے اعمالِ خبیثہ کو بھی دخل رہا ہے، ایک لوط علیہ السلام کی قوم، جس کا ذِکر اس سے پہلے آچکا ہے کہ اُن پر جو عذاب پوری بستی اُلٹ دینے کا واقع ہوا اُس کا سبب اُن کے عملِ خبیث کو بتلایا گیا ہے، دُوسری قوم شعیب علیہ السلام کی ہے جن کے عذاب کا سبب کفر وشرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی کرنے کو بھی قرار دیا گیا ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب گناہوں سے زیادہ مبغوض اور شدید ہیں، بظاہر وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ پوری نسلِ انسانی کو اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے اور پورے عالَم میں اس سے فسادِ عظیم پھیل جاتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے کے خبیث عمل سے روکنے کے لئے پیغمبرانہ شفقت کے ساتھ اوّل تو یہ فرمایا: اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ یعنی میں تمہیں اس وقت خوشحالی میں دیکھتا ہوں، کوئی فقر وفاقہ اور مالی تنگی نہیں جس کی وجہ سے اس بلاء میں مبتلا ہو، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر اس کو مقتضی ہے کہ تم اس کی مخلوق پر ظلم نہ کرو، اور پھر یہ بھی بتلادیا کہ اگر تم نے میری بات نہ سنی اور اس عملِ خبیث سے باز نہ آئے تو مجھے خطرہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب تمہیں گھیر لے، اس عذاب سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہوسکتا ہے اور دنیا کا بھی، پھر دُنیا کے عذاب بھی مختلف قسم کے آسکتے ہیں، اَدنیٰ عذاب یہ ہے کہ تمہاری یہ خوشحالی ختم ہوجائے اور تم قحط اور گرانی اشیاء میں مبتلا ہوجاؤ، جیسا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قحط اور گرانی اشیاء کے عذاب میں مبتلا کردیتے ہیں۔" [1]

اور اگرچہ ناپ تول کی کمی کو منع کرنے سے پورا ناپنا تولنا خود ہی ضروری ہوجاتا ہے لیکن مزید تاکید کے لئے شعیب علیہ السلام نے فرمایا، وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ یعنی اے میری قوم تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں کو کم نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، پھر اُن کو شفقت کے ساتھ سمجھایا۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ یعنی لوگوں کے حقوق ناپ تول پورا کرکے ادا

[1] سنن ابن ماجة، ابواب الفتن، باب العقوبات ج:۲ ص:۲۹۰

کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے تمہارے لئے وہی بہتر ہے اگر تم میری بات مانو، اور اگر میری بات نہ مانو گے تو یاد رکھو میں اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم پر کوئی عذاب آ جائے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ خطیب الانبیاء ہیں،[1] آپ نے اپنے حسنِ بیان سے اپنی قوم کو سمجھانے اور ہدایت پر لانے کی پوری کوشش میں انتہا کر دی، مگر یہ سب کچھ سننے کے بعد قوم نے وہی جواب دیا جو جاہل قومیں اپنے مصلحین کو دیا کرتی ہیں، اُن پر پھبتیاں کسیں، اِستہزاء کیا، کہنے لگے:

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ یعنی کیا تمہاری نماز تمہیں یہ بتلاتی ہے کہ ہم اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ کہ ہم اپنے مملوک اموال میں خود مختار نہ رہیں کہ جس طرح ہمارا جی چاہے معاملہ کریں بلکہ اپنے معاملات بھی آپ سے پوچھ پوچھ کر کیا کریں کہ کیا حلال ہے کیا حرام؟

حضرت شعیب علیہ السلام کی نماز پوری قوم میں معروف تھی کہ بکثرت نوافل وعبادت میں لگے رہتے تھے اس لئے ان کے ارشادات کو بطور استہزاء کے نماز کی طرف منسوب کیا کہ تمہاری یہ نماز ہی تمہیں (معاذ اللہ) ایسی غلط باتیں بتاتی ہے، اُن کے اِس کلام سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی یوں سمجھتے تھے کہ دین وشریعت کا کام صرف عبادات تک محدود ہے معاملات میں اس کا کیا دخل ہے، ہر شخص اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اُس پر کوئی پابندی لگانا دِین کا کام نہیں، جیسے اس زمانہ میں بھی بہت سے بے سمجھ لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں۔

قوم نے خالص ہمدردی، دلسوزی اور نصیحت کا جواب اِس قدر تلخ دیا مگر حضرت شعیب علیہ السلام شانِ پیغمبری رکھتے تھے، یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اُسی ہمدردی کے ساتھ مخاطب ہو کر مزید فہمائش کے لئے فرمانے لگے:

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ یعنی اے میری قوم مجھے بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رَبّ کی طرف سے اپنی بات کے حق ہونے پر دلیل اور کافی شہادت رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے بہترین رزق بھی عطا فرمایا ہو، کہ ظاہری رزق جس پر معاش کا مدار ہے وہ بھی عطا فرمایا اور باطنی رِزق فہم وعقل اور اس پر وحی ونبوّت کا انعام گرانمایہ بھی عطا فرمایا تو پھر کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے میں بھی تمہاری طرح گمراہی اور ظلم کو اختیار کر لوں اور حق بات تمہیں نہ پہنچاؤں، اس کے بعد فرمایا:

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ یعنی یہ بھی تو سمجھو کہ میں جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی تو اس کے پاس نہیں جاتا، اگر میں تمہیں منع کرتا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تو تمہارے لئے کہنے کی گنجائش تھی۔

[1] المستدرك للحاكمؒ رقم الحديث: ۴۰۳۴

اِس سے معلوم ہوا کہ داعی اور واعظ و مبلغ کے عمل کو اس کی وعظ و نصیحت میں بڑا دخل ہوتا ہے جس چیز پر واعظ خود عامل نہ ہو اُس کی بات کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، پھر فرمایا:

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ یعنی میرا مقصد اس ساری جد و جہد اور تمہیں بار بار کی فہمائش سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ مقدور بھر اصلاح کی کوشش کروں، اور پھر فرمایا کہ یہ کوشش بھی درحقیقت میرے اپنے اختیار سے نہیں بلکہ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ؀ یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے کرتا ہوں، ورنہ میرے بس میں کچھ نہ تھا، اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف ہر کام میں، میں رجوع کرتا ہوں۔

اِس پند و نصیحت کے بعد پھر اُن کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا، وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ؀ یعنی تم سوچو سمجھو، ایسا نہ ہو کہ میری مخالفت اور عداوت تم پر کوئی ایسا عذاب لا ڈالے جیسا تم سے پہلے قومِ نوح، یا قومِ ہود یا قومِ صالح علیہم السلام پر آچکا ہے، اور لوط علیہ السلام کی قوم اور اُن کا عبرتناک عذاب تو تم سے کچھ دُور بھی نہیں، یعنی مقامی اِعتبار سے بھی قومِ لوط کی اُلٹی ہوئی بستیاں مدین کے قریب ہی ہیں اور زمانہ کے اعتبار سے بھی تم سے بہت قریب زمانہ میں ان پر عذاب آیا ہے اس سے عبرت حاصل کرو اور اپنی ضد سے باز آجاؤ۔

اُن کی قوم اس کو سن کر اور بھی زیادہ اشتعال میں آگئی اور کہنے لگی کہ اگر آپ کے خاندان کی حمایت آپ کو حاصل نہ ہوتی تو ہم آپ کو سنگسار کر دیتے، حضرت شعیب علیہ السلام نے اس پر بھی ان کو نصیحت فرمائی کہ تم کو میرے خاندان کا تو خوف ہوا مگر خدا تعالیٰ کا کچھ خوف نہ آیا جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے۔

بالآخر جب قوم نے کوئی بات نہ مانی تو شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا تم اب عذاب کا انتظار کرو، اس کے بعد حق تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام اور اُن پر ایمان لانے والوں کو حسبِ دستور اس بستی سے نکال لیا اور باقی سب کے سب جبریل علیہ السلام کی ایک سخت آواز سے یکدم ہلاک ہوگئے۔

اَحکام و مسائل

ناپ تول کی کمی کا مسئلہ

مذکورہ آیات میں قومِ شعیب علیہ السلام پر عذاب آنے کا ایک سبب اُن کا ناپ تول میں کمی کرنا تھا جس کو تطفیف

کہا جاتا ہے، اور قرآنِ کریم نے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① میں اُن کے عذابِ شدید کا بیان فرمایا ہے اور باجماعِ اُمت ایسا کرنا سخت حرام ہے، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ایک ارشاد کے ماتحت حضرت امام مالکؒ نے مؤطا میں فرمایا کہ ناپ تول کی کمی سے اصل مراد یہ ہے کہ کسی کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اُس کو پورا ادا نہ کرے بلکہ اس میں کمی کرے خواہ وہ ناپنے تولنے کی چیز ہو یا دُوسری طرح کی،[1] اگر کوئی ملازم اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، کسی دفتر کا ملازم یا کوئی مزدور اپنے کام کے وقت مقرر میں کمی کرتا ہے یا مقررہ کام کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ بھی اِسی فہرست میں داخل ہے، کوئی شخص نماز کے آداب وسنن پورے بجا نہیں لاتا وہ بھی اسی تطفیف کا مجرم ہے، نعوذ باللہ منہ۔

مسئلہ

تفسیرِ قرطبی میں ہے کہ قومِ شعیب کی ایک عادت یہ تھی کہ ملک کے رائج سکوں درہم ودِینار میں سے کنارے کاٹ کر سونا چاندی بچا لیتے اور یہ کٹے ہوئے سکے پوری قیمت سے چلتے کر دیتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو اِس سے منع فرمایا۔

حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلامی سلطنت کے سکوں کا توڑنا حرام قرار دیا ہے، اور آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ⑱ (النمل) کی تفسیر میں امامِ تفسیر حضرت زید بن اسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ لوگ درہم ودینار کو توڑ کر اپنا فائدہ حاصل کر لیا کرتے تھے جس کو قرآن نے فسادِ عظیم قرار دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ دِرہم کو کاٹ رہا تھا، موصوف نے اُس کو کوڑوں کی سزا دی اور سر مونڈھوا کر شہر میں گشت کرایا۔ (تفسیر قرطبی)[2]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ⑯ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ⑰ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ

پھر وہ چلے حکم پر فرعون کے، اور نہیں بات فرعون کی کچھ کام کی، آگے ہوگا اپنی قوم کے

---

[1] مؤطا مالك، كتاب وقوت الصلاة رقم الحديث: ۲۲ [2] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج: ۹ ص: ۸۸

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا

قیامت کے دن پھر پہنچائے گا ان کو آگ پر، اور بُرا گھاٹ ہے جس پر پہنچے، اور پیچھے سے ملتی رہی

فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ

اس جہان میں لعنت اور دن قیامت کے بھی، بُرا انعام ہے جو ان کو ملا یہ تھوڑے سے حالات ہیں

الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ

بستیوں کے ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض ان میں سے اب تک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا

وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ

لیکن ظلم کر گئے وہی اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے ان کے ٹھاکر (معبود) جن کو پکارتے تھے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

سوائے اللہ کے کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم تیرے ربّ کا اور نہیں بڑھایا ان کے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ پیغمبر بنا کر ﴿۹۶﴾ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، تو انہوں نے فرعون ہی کی بات مانی، حالانکہ فرعون کی بات کوئی ٹھکانے کی بات نہیں تھی ﴿۹۷﴾ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، اور ان سب کو دوزخ میں لا اُتارے گا۔ اور وہ بدترین گھاٹ ہے جس پر کوئی اُترے۔ ﴿۹۸﴾ اور پھٹکار اس دُنیا میں بھی ان کے پیچھے لگا دی گئی ہے، اور قیامت کے دن بھی۔ یہ بدترین صلہ ہے جو کسی کو دیا جائے۔ ﴿۹۹﴾ یہ ان بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ (بستیاں) وہ ہیں جو ابھی اپنی جگہ کھڑی ہیں، اور کچھ کٹی ہوئی فصل (کی طرح بے نشان) بن چکی ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور ان پر ہم نے کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تمہارے پروردگار کا حکم آیا تو جن معبودوں کو وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، وہ ان کے ذرا بھی کام

نہ آئے، اور اُنہوں نے اِن کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔ ﴿۱۰۱﴾

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (بھی) اپنے معجزات اور دلیل روشن دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا سو (نہ فرعون نے مانا اور نہ ان کے سرداروں نے مانا بلکہ فرعون بھی اپنے کفر پر رہا اور) وہ لوگ (بھی) فرعون (ہی) کی رائے پر چلتے رہے اور فرعون کی رائے کچھ صحیح نہ تھی وہ (فرعون) قیامت کے دن اپنی قوم سے آگے آگے ہوگا پھر ان (سب) کو دوزخ میں جا اُتارے گا، اور وہ (دوزخ) بہت ہی بُری جگہ ہے اُترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جاویں گے اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ رہے گی، چنانچہ یہاں قہر سے غرق ہوئے اور وہاں دوزخ نصیب ہوگا) بُرا انعام ہے جو اُن کو دیا گیا، یہ (جو کچھ اُوپر قصص میں مذکور ہوا) ان (غارت شدہ) بستیوں کے بعض حالات تھے جن کو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں (سو) بعض بستیاں تو ان میں (اب بھی) قائم ہیں (مثلاً مصر کہ آلِ فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بھی آباد رہا) اور بعض کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور (ہم نے جو ان مذکورہ بستی والوں کو سزائیں دیں سو) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا (کہ بلا قصور سزا دی ہو جو کہ صورۃً ظلم ہے) لیکن انہوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا (کہ ایسی حرکتیں کیں جن سے مستوجب سزا ہوئے) سو ان کے وہ معبود جن کو وہ خدا کو چھوڑ کر پوجتے تھے ان کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے جب آپ کے رَبّ کا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا (کہ ان کو عذاب سے بچا لیتے) اور (فائدہ تو کیا پہنچا اور) اُلٹا ان کو نقصان پہنچایا (یعنی سبب نقصان کے ہوئے کہ ان کی پرستش کی بدولت سزایاب ہوئے)۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗ

اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رَبّ کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم کرتے ہوتے ہیں، بیشک اس کی پکڑ

اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ

دردناک ہے شدت کی، اس بات میں نشانی ہے اس کو جو ڈرتا ہے آخرت کے عذاب سے،

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ

وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہوں گے سب لوگ اور وہ دن ہے سب کے پیش ہونے کا، اور اس کو ہم دیر جو کرتے ہیں

اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ

سو ایک وعدہ کے لئے جو مقرر ہے، جس دن وہ آئے گا بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اس کے حکم سے، سو ان میں

شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ

بعض بدبخت ہیں ور بعض نیک بخت، سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں ان کو وہاں چیخنا ہے

وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ لا خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ

اور دھاڑنا، ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے

رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ

تیرا ربّ، بیشک تیرا ربّ کر ڈالتا ہے جو چاہے، اور جو لوگ نیک بخت ہیں سو جنت میں ہیں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ

ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا ربّ،

عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ

بخشش ہے بے انتہا سو تو نہ رہ دھوکے میں ان چیزوں سے جن کو پوجتے ہیں یہ لوگ

مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ

کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے ان کے باپ دادے اس سے پہلے، اور ہم دینے والے ہیں ان کو

نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ ع ۹

ان کا حصہ یعنی عذاب سے بلا نقصان، اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ

اور اگر نہ ہوتا ایک لفظ کہ پہلے فرماچکا تھا تیرا رَبّ تو فیصلہ ہوجاتا ان میں اور ان کو اس میں شبہ ہے کہ

مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ

مطمئن نہیں ہونے دیتا، اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا دے گا رَبّ تیرا ان کو ان کے اعمال

إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۱۱۱﴾

اس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو بستیاں ظالم ہوتی ہیں، تمہارا رَبّ جب اُن کو گرفت میں لیتا ہے تو اُس کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ واقعی اُس کی پکڑ بڑی دردناک، بڑی سخت ہے۔ ﴿۱۰۲﴾ ان ساری باتوں میں اُس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو۔ وہ ایسا دن ہوگا جس کے لئے تمام لوگوں کو اِکٹھا کیا جائے گا، اور وہ ایسا دن ہوگا جسے سب کے سب کھلی آنکھوں دیکھیں گے۔ ﴿۱۰۳﴾ ہم نے اُسے ملتوی کیا ہے تو بس ایک گنی چنی مدت کے لئے ملتوی کیا ہے ﴿۱۰۴﴾ جب وہ دن آجائے گا تو کوئی اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا۔ پھر اُن میں کوئی بدحال ہوگا، اور کوئی خوش حال۔ ﴿۱۰۵﴾ چنانچہ جو بدحال ہوں گے، وہ دوزخ میں ہوں گے جہاں ان کی چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں گی۔ ﴿۱۰۶﴾ یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تمہارے رَبّ ہی کو کچھ اور منظور ہو۔ یقیناً تمہارا رَبّ جو اِرادہ کرلے، اس پر اچھی طرح عمل کرتا ہے۔ ﴿۱۰۷﴾ اور جو لوگ خوش حال ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تمہارے رَبّ ہی کو کچھ اور منظور ہو۔ یہ ایک ایسی عطا ہوگی جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ ﴿۱۰۸﴾ لہٰذا (اے پیغمبر!) یہ (مشرکین) جن (بتوں) کی عبادت کرتے ہیں، ان کے بارے میں ذرا بھی شک میں نہ رہنا۔ یہ تو اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جیسے ان کے باپ دادے پہلے ہی عبادت کیا کرتے تھے، اور یقین رکھو کہ ہم ان سب کو ان کا حصہ پورا پورا چکا دیں گے، جس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ﴿۱۰۹﴾ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی، تو اس میں بھی اختلاف کیا گیا تھا۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ ہوچکی ہوتی (کہ ان کو پورا عذاب آخرت میں

دیا جائے گا) تو ان کا فیصلہ (یہیں دُنیا میں) ہو چکا ہوتا۔ اور یہ لوگ اس کے بارے میں (ابھی تک) سخت قسم کے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ﴿۱۱۰﴾ اور یقین رکھو کہ سب لوگوں کا معاملہ یہی ہے کہ تمہارا پروردگار اُن کے اعمال کا بدلہ پورا پورا دے گا۔ یقیناً وہ ان کے تمام اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۱۱۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کے رَبّ کی داروگیر ایسی ہی (سخت) ہے جب وہ کسی بستی والوں پر داروگیر کرتا ہے جبکہ وہ ظلم (وکفر) کیا کرتے ہوں، بلاشبہ اس کی داروگیر بڑی اَلَم رساں (اور) سخت ہے (کہ اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا) ان واقعات میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے (وجہ عبرت ظاہر ہے کہ جب دُنیا کا عذاب ایسا سخت ہے حالانکہ یہ دارالجزاء نہیں تو آخرت کا جو کہ دارالجزاء ہے کیسا سخت عذاب ہوگا) وہ (یعنی آخرت کا دِن) ایسا دن ہوگا کہ اس میں تمام آدمی جمع کئے جاویں گے اور وہ سب کی حاضری کا دن ہے اور (وہ دن گو اب تک آیا نہیں لیکن اس سے کوئی اس کے آنے میں شک نہ کرے آوے گا ضرور) ہم اس کو صرف تھوڑی مدت کے لئے (بعض مصلحتوں سے) ملتوی کئے ہوئے ہیں (پھر) جس وقت وہ دن آوے گا (مارے ہیبت کے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ) کوئی شخص بدن خدا کی اِجازت کے بات تک (بھی) نہ کر سکے گا (ہاں جب حساب کتاب کے لئے حاضری ہوگی اور ان کے اعمال پر جواب طلب کیا جاوے گا اس وقت البتہ منہ سے بات نکلے گی خواہ وہ بات مقبول ہو یا مقبول نہ ہو سو اس حالت میں تو سب اہلِ موقف شریک ہوں گے) پھر (آگے) ان میں (یہ فرق ہوگا کہ) بعض تو شقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعضے سعید (یعنی مؤمن) ہوں گے سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ وپکار پڑی رہے گی (اور) ہمیشہ ہمیش کو اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں (یہ محاورہ ہے ابدیت کے لئے) اور کوئی نکلنے کی سبیل نہ ہوگی ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دُوسری بات ہے (کیونکہ) آپ کا رَبّ جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کر سکتا ہے (مگر باوجود قدرت کے یہ یقینی ہے کہ خدا یہ بات نہ چاہے گا اس لئے نکلنا نصیب نہ ہوگا) اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے (اور) وہ اس میں (داخل ہونے کے بعد) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں (گو جانے کے قبل کچھ سزا بھگتی ہو) ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (مگر یہ یقینی ہے کہ خدا یہ بات کبھی نہ چاہے گا پس نکلنا بھی کبھی نہ ہوگا بلکہ) وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا (اور جب کفر کا وبال اُوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا) سو (اے مخاطب) جس چیز کی یہ پرستش کرتے ہیں اس کے بارے میں ذرا شبہ نہ کرنا (بلکہ یقین رکھنا کہ ان کا یہ عمل موجب سزا ہے بوجہ باطل ہونے کے، اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ) یہ لوگ بھی اسی طرح (بلا دلیل بلکہ خلافِ

دلیل) عبادت (غیر اللہ کی) کر رہے ہیں جس طرح ان کے قبل ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے (امر خلافِ دلیل باطل اور موجب سزا ہوتا ہے) اور ہم یقیناً (قیامت کو) ان کا حصہ (عذاب کا) ان کو پورا پورا بے کم وکاست پہنچادیں گے، اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی تھی سو اس میں (بھی مثل قرآن کے) اختلاف کیا گیا (کہ کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، یہ کوئی آپ کے لئے نئی بات نہیں ہوئی پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (یہ منکرین ایسے مستحق عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رَبّ کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو آخرت میں دوں گا) تو (جس چیز میں یہ اختلاف کر رہے ہیں) اُن کا (قطعی) فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا (یعنی وہ عذابِ موعود واقع ہو جاتا) اور یہ لوگ (باوجود قیامِ براہین کے ابھی تک) اس (فیصلہ یعنی عذابِ موعود) کی طرف سے ایسے شک میں (پڑے) ہیں جس نے ان کو تردّد میں ڈال رکھا ہے (کہ ان کو عذاب کا یقین ہی نہیں آتا، شک کا مطلب یہی ہے) اور (کسی کے شک وانکار سے یہ عذاب ٹلے گا نہیں بلکہ) بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں کہ آپ کا رَبّ ان کو ان کے اعمال (کی جزا) کا پورا پورا حصہ دے گا، بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا تو آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں، وہ کام یہ ہیں جو اگلی آیات میں مذکور ہیں)۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ

سو تو سیدھا چلا جا جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو، بیشک

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ

وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی آگ

وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

لہٰذا (اے پیغمبر!) جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، اُس کے مطابق تم بھی سیدھے راستے پر ثابت قدم رہو، اور وہ لوگ بھی جو توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہیں، اور حد سے آگے نہ نکلو۔ یقین رکھو کہ جو عمل بھی تم کرتے ہو، وہ اُسے پوری طرح

دیکھتا ہے ﴿۱۱۲﴾ اور (مسلمانو!) ان ظالم لوگوں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، کبھی دوزخ کی آگ تمہیں بھی آ پکڑے، اور تمہیں اللہ کو چھوڑ کر کسی قسم کے دوست میسر نہ آئیں، پھر تمہاری کوئی مدد بھی نہ کرے۔ ﴿۱۱۳﴾

خلاصۂ تفسیر

جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہِ دین پر) مستقیم رہئے اور وہ لوگ بھی (مستقیم رہیں) جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہیں اور دائرۂ (دین) سے ذرا مت نکلو یقیناً وہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور (اے مسلمانو! ان) ظالموں کی طرف (یا جو ان کی مثل ہوں ان کی طرف دِلی دوستی سے یا اعمال واحوال میں مشارکت ومشابہت سے) مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جاوے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر تمہاری حمایت کسی طرف سے بھی نہ ہو (کیونکہ رفاقت تو حمایت سے سہل ہے جب رفاقت کرنے والا بھی کوئی نہیں تو حمایت کرنے والا کون ہوتا)۔

معارف ومسائل

سورۂ ہود میں انبیاء سابقین اور اُن کی قوموں کے واقعات نوح علیہ السلام سے شروع کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک خاصی ترتیب وتفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں، جن میں سینکڑوں مواعظ وحِکَم اور اَحکام وہدایات ہیں، ان واقعات کے ختم پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اُمتِ محمدیہ کو اُن سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی، فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ یعنی یہ ہیں پہلے شہروں اور بستیوں کے واقعات جو ہم نے آپ کو سنائے ہیں، یہ بستیاں جن پر اللہ تعالیٰ کے عذاب آئے ہیں ان میں سے بعض کے تو ابھی کچھ عمارات یا کھنڈرات موجود ہیں اور بعض بستیاں ایسی کردی گئی ہیں جیسے کھیتی کاٹنے کے بعد زمین ہموار کردی جائے، پچھلی کھیتی کا نشان تک نہیں رہتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود اُنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو چھوڑ کر بتوں اور دوسری چیزوں کو اپنا خدا بنا بیٹھے، جس کا انجام یہ ہوا کہ جب خدا تعالیٰ کا عذاب آیا تو ان خودساختہ خداؤں نے ان کی کوئی مدد نہ کی، اور اللہ تعالیٰ جب بستیوں کو عذاب میں پکڑتے ہیں تو ان کی گرفت ایسی ہی سخت اور دردناک ہوا کرتی ہے۔

اس کے بعد ان کو آخرت کی فکر میں مشغول کرنے کے لئے فرمایا کہ اِن واقعات میں اُن لوگوں کے لئے بڑی

عبرت اور نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں، جس دن تمام اولادِ آدمؑ ایک جگہ جمع اور موجود ہوگی، اُس دن کا حال یہ ہوگا کہ کسی شخص کی مجال نہ ہوگی کہ بغیر اجازتِ خداوندی ایک حرف بھی زبان سے بول سکے۔

اس کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکرر خطاب کر کے ارشاد فرمایا فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ یعنی آپ دین کے راستہ پر اُسی طرح مستقیم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی مستقیم رہیں جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہوگئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود سے نہ نکلو کیونکہ وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

اِستقامت کا مفہوم اور اہم فوائد و مسائل

''استقامت'' کے معنٰی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے، پتھر وغیرہ کے عمود کو ماہر انجینئر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائمہ ہی رہے کسی طرف ادنیٰ میلان نہ ہو لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں ہر حال میں اِستقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، ''استقامت'' لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنٰی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسبِ معاش اور اُس کی آمد و صَرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہٗ کی قائم کردہ حدود کے اندر اُس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی، زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

دُنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں، عقائد میں استقامت نہ رہے تو بدعات سے شروع ہو کر کفر و شرک تک نوبت پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی ذات وصفات کے متعلق جو معتدل اور صحیح اصول رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اس میں افراط وتفریط یا کمی بیشی کرنے والے خواہ نیک نیتی ہی سے اس میں مبتلا ہوں گمراہ کہلائیں گے، انبیاء علیہم السلام کی عظمت و محبت کی جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان میں کمی کرنے والوں کا گمراہ و گستاخ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، ان میں زیادتی اور غلو کر کے رسول کو خدائی صفات واختیارات کا مالک بنا دینا بھی اسی طرح کی گمراہی ہے، یہود ونصاریٰ اسی گمراہی میں کھوئے گئے، عبادات اور تقرب الی اللہ کے لئے جو طریقے قرآنِ عظیم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دیئے ہیں، ان میں ذرا سی

کمی کوتاہی جس طرح انسان کو استقامت سے گرا دیتی ہے اسی طرح ان میں اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی استقامت کو برباد کر کے انسان کو بدعات میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ بڑی نیک نیتی سے یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں اپنے رَبّ کو راضی کر رہا ہوں اور وہ عین ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اِسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو بدعات و محدثات سے بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے اور اس کو شدید گمراہی قرار دیا ہے، اس لئے انسان پر لازم ہے کہ جب وہ کوئی کام عبادت اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی کے لئے کرے تو کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کر لے کہ یہ کام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے اس کیفیت وصورت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں، اگر ثابت نہیں تو اس میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرے۔

اسی طرح معاملات اور اخلاق و معاشرت کے تمام ابواب میں قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے اُصول پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیم کے ذریعہ ایک معتدل اور صحیح راستہ قائم کر دیا ہے، جس میں دوستی، دشمنی، نرمی، گرمی، غصہ اور بُردباری، کنجوسی اور سخاوت، کسبِ معاش اور ترکِ دنیا، اللہ پر توکل اور امکانی تدبیر، اسبابِ ضروریہ کی فراہمی اور مسبّب الاسباب پر نظر، اِن سب چیزوں میں ایک ایسا معتدل صراطِ مستقیم مسلمانوں کو دیا ہے کہ اس کی نظر عالم میں نہیں مل سکتی، ان کو اختیار کرنے سے ہی انسان، انسانِ کامل بنتا ہے اُس میں استقامت سے ذرا گرنے ہی کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء وارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے۔

سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملہ میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، آپ نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ، یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور پھر اُس پر مستقیم رہو۔ (رواہ مسلم، از قرطبی) [1]

اور عثمان بن حاضر اَزدیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرما دیجئے، آپ نے فرمایا عَلَیْكَ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالْاِسْتِقَامَۃِ اِتَّبِعْ وَلَا تَبْتَدِعْ (رواہ الدارمی فی مسندہ، از قرطبی) [2] یعنی تم تقویٰ اور خوفِ خدا کو لازم پکڑو اور استقامت کو بھی، جس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں شریعت کا اتباع کرو، اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کرو۔

اِس دُنیا میں سب سے زیادہ دُشوار کام استقامت ہی ہے اسی لئے محققینِ صوفیاء نے فرمایا ہے کہ استقامت کا

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام ج:۱ ص:۴۸، وتفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۹ ص:۱۰۷

[2] سنن الدارمی، کتاب المقدمۃ، باب من ھاب الفتیا إلخ رقم الحدیث: ۱۴۱ وتفسیر القرطبی ج:۹ ص:۱۰۷

مقام کرامت سے بالاتر ہے، یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے، اگرچہ عمر بھر اُس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پورے قرآن میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شاق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اور فرمایا کہ جب صحابہ کرامؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لحیہ مبارک میں کچھ سفید بال دیکھ کر بطور حسرت وافسوس کے عرض کیا کہ اب تیزی سے بڑھاپا آپ کی طرف آرہا ہے تو فرمایا کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، سورۂ ہود میں جو پچھلی قوموں پر سخت وشدید عذاب کے واقعات مذکور ہیں وہ بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں مگر ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت ہی اُس کا سبب ہے۔

تفسیر قرطبی میں ابوعلی سری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو عرض کیا کہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اس سورت میں جو انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور ان کی قوموں کے عذاب کا ذکر ہے اس نے آپ کو بوڑھا کیا؟ تو فرمایا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد نے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ! [1]

یہ ظاہر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو انسانِ کامل کی مثالی صورت بن کر اس دُنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپ کی عادت تھی مگر پھر اس قدر بار پایا تو اس لئے محسوس فرمایا کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امرِ الٰہی کے مطابق استقامت ہونا چاہئے، انبیاء علیہم السلام پر جس قدر خوف وخشیتِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ جل شانہ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پوری ہوئی یا نہیں۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو اپنی استقامت کی تو زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ وہ بحمد اللہ حاصل تھی مگر اس آیت میں پوری اُمت کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے، اُمت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر وغم طاری ہوا۔

حکمِ استقامت کے بعد فرمایا وَلَا تَطْغَوْا یہ لفظ مصدر ''طغیان'' سے بنا ہے، اس کے معنیٰ حد سے نکل جانے کے ہیں جو ضد ہے استقامت کی، آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ اُس کے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی ودنیوی خرابی کا راستہ ہے۔

دُوسری آیت میں انسان کو خرابی اور بربادی سے بچانے کے لئے ایک اور اہم ہدایت نامہ دیا گیا ہے وَلَا تَرْكَنُوٓا

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۹ ص:۱۰۷۔

اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ یعنی ظالموں کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے۔ لَا تَرْكَنُوْا مصدر رکون سے بنا ہے جس کے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد ورضا کے ہیں، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم وجور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین ودُنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان، اُن سے راضی ہونا، اُن پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اُسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے۔

اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ وتابعین کے چند اقوال منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض واختلاف نہیں، سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو، ابن جریجؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو (قرطبی)[1] سدیؒ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو یعنی ان کے بُرے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہؓ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم وجور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[2]

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اُس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے۔ (مظہری)[3]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلِ کفر اور اہلِ معصیت اور اہلِ بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کسی مجبوری سے اُن سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح وفساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے،[4] اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرفِ لَا کے اندر جمع کر دیا ہے، ایک پہلی آیت میں لَا تَطْغَوْا اور دُوسرا دُوسری آیت میں لَا تَرْكَنُوْا، پہلے لفظ میں حدودِ شرعیہ سے نکلنے کی اور دُوسرے لفظ میں بُرے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۹ ص:۱۰۸ [2] تفسیر البیضاوی تحت هذه الآية ج:۳ ص:۱۲۴

[3] التفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۵ ص:۱۲۳ [4] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۹ ص:۱۰۸

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ

اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں میں رات کے، البتہ نیکیاں دُور کرتی ہیں

السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۚ ﴿۱۱۴﴾ وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

برائیوں کو، یہ یادگاری ہے یاد رکھنے والوں کو، اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ

ثواب نیکی کرنے والوں کا، سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں

اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ

ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے کہ جن کو

اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ

ہم نے بچالیا ان میں سے اور چلے وہ لوگ جو ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے

وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ

اور تھے گنہگار، اور تیرا ربّ ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے بستیوں کو زبردستی سے

وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً

اور لوگ وہاں کے نیک ہوں، اور اگر چاہتا تیرا ربّ کر ڈالتا لوگوں کو ایک رستہ پر

وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ

اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں، مگر جن پر رحم کیا تیرے ربّ نے اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا ہے

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور پوری ہوئی بات تیرے رَبّ کی کہ البتہ بھردوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے،

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ

اور سب چیز بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو

وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور آئی تیرے پاس اس سورت میں تحقیق بات اور نصیحت اور یادداشت ایمان والوں کو

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ لا

اور کہہ دے ان کو جو ایمان نہیں لاتے کام کئے جاؤ اپنی جگہ پر ہم بھی کام کرتے ہیں

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں اور اللہ کے پاس ہے چھپی بات آسمانوں کی اور زمین کی

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ

اور اسی کی طرف رجوع ہے سب کام کا، سو اسی کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ اور تیرا رَبّ بے خبر نہیں

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع

جو کام تم کرتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو

مٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک نصیحت ہے اُن لوگوں کے لئے جو نصیحت مانیں۔ ﴿۱۱۴﴾ اور صبر سے کام لو، اس لئے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ﴿۱۱۵﴾ تم سے پہلے جو اُمتیں گذری ہیں، بھلا اُن میں ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جن کے پاس اتنی بچی کھچی سمجھ تو ہوتی کہ وہ لوگوں کو زمین میں فساد مچانے سے روکتے؟ ہاں تھوڑے سے لوگ تھے جن کو ہم نے (عذاب سے) نجات دی تھی۔ اور جو لوگ ظالم تھے، وہ جس عیش وعشرت میں تھے، اُسی کے پیچھے لگے رہے، اور جرائم کا ارتکاب کرتے رہے۔ ﴿۱۱۶﴾ اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں پر ظلم کرکے اُنہیں تباہ کردے جبکہ اُن کے باشندے صحیح رَوِش پر چل رہے ہوں۔ ﴿۱۱۷﴾ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقے کا پیرو بنا دیتا، (مگر کسی کو زبردستی کسی دِین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے، اس لئے انہیں اپنے اختیار سے مختلف طریقے اپنانے کا موقع دیا گیا ہے) اور وہ اب ہمیشہ مختلف راستوں پر ہی رہیں گے۔ ﴿۱۱۸﴾ البتہ جن پر تمہارا پروردگار رحم فرمائے گا، اُن کی بات اور ہے (کہ اللہ انہیں حق پر قائم رکھے گا) اور اسی (امتحان) کے لئے اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تمہارے رَبّ کی وہ بات پوری ہوگی جو اُس نے کہی تھی کہ: ''میں جہنم کو جِنّات اور اِنسانوں دونوں سے بھر دُوں گا۔'' ﴿۱۱۹﴾ اور (اے پیغمبر!) پیغمبروں کے واقعات میں سے وہ سارے واقعات ہم تمہیں سنا رہے ہیں جن سے ہم تمہارے دِل کو تقویت پہنچائیں، اور ان واقعات کے ضمن میں تمہارے پاس جو بات آئی ہے، وہ خود بھی حق ہے، اور تمام مؤمنوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی بھی ہے۔ ﴿۱۲۰﴾ اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں، اُن سے کہو کہ: ''تم اپنی موجودہ حالت پر عمل کئے جاؤ، ہم بھی (اپنے طریقے پر) عمل کر رہے ہیں۔ ﴿۱۲۱﴾ اور تم بھی (اللہ کے فیصلے کا) انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔'' ﴿۱۲۲﴾ آسمانوں اور زمین میں جتنے پوشیدہ بھید ہیں، وہ سب اللہ کے علم میں ہیں، اور اُسی کی طرف سارے معاملات لوٹائے جائیں گے۔ لہٰذا (اے پیغمبر!) اُس کی عبادت کرو، اور اُس پر بھروسہ رکھو۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو، تمہارا پروردگار اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ﴿۱۲۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر (یعنی اوّل اور آخر میں) اور رات کے کچھ حصوں میں بیشک نیک کام (نامۂ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں بُرے کاموں کو یہ بات (کہ نیکیوں سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں) ایک (جامع) نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے (کیونکہ ہر نیکی اس قاعدۂ کلیہ میں داخل ہے، پس اس سے ہر نیکی کی رغبت ہونا چاہئے) اور (ان منکرین کی طرف سے جو معاملات پیش آتے ہیں ان پر) صبر کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے (صبر بھی اعلیٰ درجہ کی نکوکاری ہے اس کا پورا اجر ملے گا اور اوپر جو سابقہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات مذکور ہوئے) تو (وجہ اس کی یہ ہوئی کہ) جو اُمتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار

لوگ نہ ہوئے جو کہ (دوسروں کو) ملک میں فساد (یعنی کفر وشرک) پھیلانے سے منع کرتے بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ان میں سے ہم نے (عذاب سے) بچالیا تھا (کہ وہ تو البتہ جیسے خود کفر وشرک سے تائب ہوگئے تھے اوروں کو بھی منع کرتے رہتے تھے اور ان ہی دونوں عمل کی برکت سے وہ عذاب سے بچ گئے تھے باقی اور لوگ چونکہ خود ہی کفر میں مبتلا تھے اُنہوں نے اَوروں کو بھی منع نہ کیا) اور جو لوگ نافرمان تھے وہ جس ناز ونعمت میں تھے اسی کے پیچھے پڑے رہے اور جرائم کے خوگر ہوگئے (کہ اس سے باز ہی نہ آئے، خلاصہ یہ کہ نافرمانی تو ان میں عام طور پر رہی اور منع کرنے والا کوئی ہوا نہیں اس لئے سب ایک ہی عذاب میں مبتلا ہوئے ورنہ کفر کا عذاب عام ہوتا اور فساد کا خاص، اب بوجہ منع نہ کرنے کے غیر مفسد بھی مفسد ہونے میں شریک قرار دیئے گئے اس لئے جو عذاب مجموعہ کفر وفساد پر نازل ہوا وہ بھی عام رہا) اور (اس سے ثابت ہوگیا کہ) آپ کا رَبّ ایسا نہیں کہ بستیوں کو کفر کے سبب ہلاک کردے اور ان کے رہنے والے (اپنی اور دُوسروں کی) اِصلاح میں لگے ہوں (بلکہ جب بجائے اِصلاح کے فساد کریں اور فساد کرنے والوں کو منع نہ کریں اس وقت عذاب خاص کے مستحق ہوجاتے ہیں) اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو سب آدمیوں کو ایک ہی طریقہ کا بنادیتا (یعنی سب کو مؤمن کردیتا لیکن بعض حکمتوں سے ایسا منظور نہ ہوا، اس لئے دین کے خلاف مختلف طریقوں پر ہوگئے) اور (آئندہ بھی) ہمیشہ اختلاف (ہی) کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کے رَبّ کی رحمت ہو (وہ دین کے خلاف طریقہ اختیار نہ کرے گا) اور (اس اختلاف پر غم یا تأسف یا تعجب نہ کیجئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اسی واسطے پیدا کیا ہے (کہ ان میں اختلاف رہے) اور (اختلاف کے لئے پیدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کے رَبّ کی یہ بات پوری ہوگی کہ میں جہنم کو جنات سے اور انسانوں سے دونوں سے بھردوں گا (اور خود اس کی حکمت یہ ہے کہ جس طرح مرحومین میں صفتِ رحمت کا ظہور ہو مغضوبین میں صفت غضب کی ظاہر ہو پھر اس ظہور کی حکمت یا اس حکمت کی حکمت اللہ ہی کو معلوم، غرض اس ظہور کی حکمت سے جہنم میں جانا بعضوں کا ضرور اور جہنم میں جانے کے لئے وجود کفار کا تکویناً ضروری اور وجودِ کفار کے لئے اختلاف لازم، یہ وجہ ہے سب کے مسلمان نہ ہونے کی) اور پیغمبروں کے قصوں میں سے ہم یہ سارے (مذکورہ) قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں (ایک فائدہ بیانِ قصص کا تو یہ ہوا جس کا حاصل آپ کو تسلی دینا ہے) اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچا ہے جو خود بھی راست (اور قطعی) ہے اور مسلمانوں کے لئے (بُرے کاموں سے روکنے کے لئے) نصیحت ہے اور (اچھے کام کرنے کے لئے) یاددہانی ہے (یہ دُوسرا فائدہ بیانِ قصص کا ہوا، ایک فائدہ نبی کے لئے، دوسرا اُمت کے لئے) اور جو لوگ (باوجود ان حُجَجِ قاطعہ کے بھی) ایمان نہیں لاتے ان سے کہہ دیجئے کہ (میں تم سے اُلجھتا نہیں) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو ہم بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہے ہیں اور (ان اعمال کے نتیجہ کے) تم (بھی) منتظر رہو، ہم بھی منتظر ہیں (سو عنقریب باطل کھل جاوے گا) اور آسمانوں اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا

ہی کو ہے (تو بندوں کے اعمال تو غیب بھی نہیں ان کا علم تو بدرجۂ اَولیٰ حق تعالیٰ کو ہے) اور سب اُمور اسی کی طرف رجوع ہوں گے (یعنی علم و اختیار دونوں اللہ ہی کے ہیں پھر اس کو کیا مشکل ہے اگر اعمال کی جزا وسزا دیدے اور جب وہ ایسا علم و اختیار رکھتا ہے) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اُسی کی عبادت کیجئے (جس میں تبلیغ بھی داخل ہے) اور اُسی پر بھروسہ رکھئے (اگر تبلیغ میں کسی اذیت کا احتمال ہو، یہ بیچ میں بطور جملۂ معترضہ کے آپ سے خطاب فرمادیا، آگے پھر وہی مضمون ہے یعنی) اور آپ کا رَبّ ان باتوں سے بے خبر نہیں جو کچھ تم لوگ کررہے ہو (جیسا کہ اوپر علم غیب سے اعمال کا علم بدرجۂ اَولیٰ ثابت ہوگیا)۔

معارف و مسائل

اُسلوبِ قرآنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ

سورۂ ہود میں انبیاء سابقین اور اُن کی قوموں کے عبرتناک حالات وواقعات ذکر کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمتِ محمدیہ کو چند ہدایات دی گئی ہیں جن کا سلسلہ پچھلی آیت فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ سے شروع ہوا ہے، ان ہدایات میں قرآنِ کریم کا یہ حسنِ بیان کس قدر دلکش اور ادب آموز ہے کہ جس کام کا حکم مثبت انداز میں دیا گیا اس میں تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنایا گیا ہے اور اُمتِ محمدیہ کو تبعاً اُس میں شامل کیا گیا ہے، جیسے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ اور مذکورۂ صدر آیت میں اَقِمِ الصَّلٰوةَ اور اس کے بعد وَاصْبِرْ ـــــ اور جس کام سے روکا گیا اور اس سے بچنے کی ہدایت کی گئی تو اس میں براہِ راست اُمت کو خطاب کیا گیا، جیسے پچھلی آیتوں میں لَا تَطْغَوْا اور لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔

اور غور کیا جائے تو پورے قرآن میں عام طور پر یہی طرز استعمال ہوا ہے کہ اَمر کا مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا گیا ہے اور نہی وممانعت کا مخاطب اُمت کو، جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا اظہار ہے کہ جو کام قابلِ ترک ہیں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی ان سے پرہیز کرتے ہیں، آپ کی فطرتِ سلیمہ اور طبیعت ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی تھی کہ کسی بُری خواہش اور بُری چیز کی طرف میلان ہی نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایسی چیزیں جو ابتداءِ اسلام میں جائز وحلال تھیں مگر انجام کار ان کا حرام ہونا اللہ تعالیٰ کے علم میں طے شدہ تھا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حلال ہونے کے زمانہ میں کبھی ان کے پاس نہیں گئے، جیسے شراب یا سود اور جوا وغیرہ۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے آپ کو اور آپ کی پوری اُمت کو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا

گیا ہے، علمائے تفسیر صحابہ وتابعین کا اس پر اتفاق ہے کہ ''صلوٰۃ'' سے مراد اس جگہ فرض نمازیں ہیں (بحرِ محیط، قرطبی)، [۱] اور ''صلوٰۃ کی اِقامت'' سے مراد اُس کی پوری پابندی اور مداومت ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نماز کو اُس کے تمام آداب کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے، بعض نے فرمایا کہ نماز کو اس کے افضل وقت میں ادا کرنا مراد ہے، یہی تین قول آیت اَقِمِ الصَّلٰوۃَ کی تفسیر میں منقول ہیں اور درحقیقت یہ کوئی اختلاف نہیں یہ سبھی چیزیں ''اِقامتِ صلوٰۃ'' کے مفہوم میں شامل ہیں۔

اِقامتِ صلوٰۃ کا حکم دینے کے بعد نماز کے اوقات کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ''دِن کے دونوں سروں یعنی شروع اور آخر میں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔'' کیونکہ زُلَفًا، زُلفۃ کی جمع ہے جس کے معنٰی ایک حصہ اور قطعہ کے ہیں، دن کے دونوں سروں کی نماز کے متعلق اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ پہلے سرے کی نماز نمازِ فجر ہے، آخری سرے کی نماز بعض حضرات نے مغرب کو قرار دیا ہے کہ دِن کے بالکل ختم پر ہے اور بعض حضرات نے عصر کی نماز کو دن کے آخری سرے کی نماز قرار دیا ہے کیونکہ دن کی آخری نماز وہی ہے، وقتِ مغرب دن کا جزء نہیں بلکہ دن گزرنے کے بعد آتا ہے، اور زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ یعنی رات کے حصوں کی نماز سے مراد جمہور مفسرین حسن بصریؒ، مجاہدؒ، محمد بن کعبؒ، قتادہؒ، ضحاکؒ وغیرہم نے مغرب وعشاء کی نماز کو قرار دیا ہے، اور ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں ارشاد فرمایا ہے کہ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ مغرب وعشاء ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر) [۲]

جبکہ طَرَفَیِ النَّهَارِ سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہوئی اور زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ سے مغرب وعشاء کی تو اِس آیت میں چار نمازوں کے اوقات کا بیان آ گیا صرف ظہر کی نماز کا بیان رہ گیا جو دوسری آیت اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل: ۷۸) میں آیا ہے۔

اس آیت میں اوقاتِ مذکورہ میں ''اِقامتِ صلوٰۃ'' کے حکم کے بعد ان کا ایک عظیم فائدہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ یعنی نیک کام مٹا دیتے ہیں بُرے کاموں کو، حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ ''نیک کام'' سے تمام نیک کام مراد ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقات، حسنِ خلق، حسنِ معاملہ وغیرہ سب داخل ہیں مگر نماز کو ان سب میں اولیت حاصل ہے، اسی طرح ''سیئات'' کا لفظ تمام بُرے کاموں کو حاوی اور شامل ہے خواہ وہ کبیرہ گناہ ہوں یا صغیرہ، لیکن قرآن مجید کی ایک دُوسری آیت نیز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات نے اس کو صغیرہ گناہوں کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، معنٰی یہ ہیں کہ نیک کام جن میں نماز سب سے افضل ہے، صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں اور ان

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۹ ص:۱۰۹، وتفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۶ ص:۲۶۸

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۳۵۴، ۳۵۵

کے گناہ کو مٹا دیتے ہیں، قرآنِ کریم میں ہے، اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (النساء:۳۱) یعنی اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کا خود کفارہ کر دیں گے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ دُوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دُوسرے رمضان تک اُن تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے جو ان کے درمیان صادر ہوں، جبکہ یہ شخص کبائر یعنی بڑے گناہوں سے بچ رہا ہو، [۱] مطلب یہ ہے کہ بڑے گناہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے مگر چھوٹے گناہ دُوسرے نیک کام، نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کرنے سے خود بھی معاف ہو جاتے ہیں، مگر تفسیر بحرِ محیط میں محققین علماءِ اُصول کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صغیرہ گناہ بھی نیک کام کرنے سے جبھی معاف ہوتے ہیں جبکہ آدمی اُن کے کرنے پر نادم ہو اور آئندہ کے لئے نہ کرنے کا ارادہ کرے، اُن پر اصرار نہ کرے، [۲] روایاتِ حدیث میں جتنے واقعات کفارہ ہو جانے کے منقول ہیں ان سب میں یہ تصریح بھی ہے کہ اُن کا کرنے والا جب اپنے فعل پر نادم ہوا اور آئندہ کے لئے توبہ کرے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گناہ معاف ہو جانے کی بشارت سنائی۔ واللہ اعلم

مشہور و معروف روایاتِ حدیث میں کبائر یعنی بڑے گناہ ان چیزوں کو بتلایا ہے:- اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک یا برابر قرار دینا، قصداً کسی فرض نماز کا چھوڑنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، حرام کاری، چوری، شراب نوشی، ماں باپ کی نافرمانی، جھوٹی قسم، جھوٹی گواہی، جادو کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال ناجائز طور پر لے لینا، میدانِ جہاد سے بھاگنا، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا، کسی کا مال ناجائز طور پر غصب کرنا، عہد شکنی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، کسی کو گالی دینا، کسی شخص کو ناحق مجرم قرار دینا، وغیرہ ـــــ کبیرہ اور صغیرہ یعنی بڑے اور چھوٹے گناہوں کی تفصیل مستقل رسالوں میں علماء نے لکھ دی ہیں، میرے رسالہ گناہ بے لذّت میں بھی مذکور ہے وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

بہرحال آیتِ مذکورہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نیک کام کرنے سے بھی گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بُرے کام کے بعد نیک کام کر لو تو وہ اس کی برائی کو مٹا دے گا، اور فرمایا کہ لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو۔ (ابن کثیر بحوالہ مسند احمد) [۳]

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمایئے آپ نے فرمایا کہ "اگر تم سے کوئی گناہ ہو جائے تو اُس کے بعد کوئی نیک کام کر و تا کہ وہ اُس کو مٹا دے۔ [۴]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء والصلاة عقبه ج:۱ ص:۱۲۲

[۲] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآیة ج:۶ ص:۲۶۹

[۳] مسند احمد، حدیث معاذ بن جبل رضی الله عنه رقم الحدیث:۲۲۶۳۴، وتفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۳۶۰

[۴] مسند احمد، حدیث ابی ذر رضی الله عنه رقم الحدیث:۲۲۱۰۴

درحقیقت ان احادیث میں گناہ سے توبہ کرنے کا مسنون ومحمود طریقہ بتلایا گیا ہے جیسا کہ مسندِ احمد میں بروایت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اس کو چاہئے کہ وضو کرکے دو رکعت نمازِ نفل ادا کرلے تو اس گناہ کی معافی ہوجائے گی (الروایات کلها من ابن کثیر)[1] اس نماز کو نمازِ توبہ ہی کہا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ یعنی یہ ایک نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، اس میں ذٰلِكَ کا اشارہ قرآنِ کریم کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور اَحکامِ اَمر و نہی کی طرف بھی، جن کا ذکر اس سے پہلے آیا ہے، مراد یہ ہے کہ یہ قرآن یا اُس کے مذکورہ اَحکام اُن لوگوں کے لئے ہدایت ونصیحت ہیں جو نصیحت سننے اور ماننے کے عادی ہیں اس میں اشارہ یہ ہے کہ ہٹ دھرم، ضدی آدمی جو کسی چیز پر غور ہی نہ کرے وہ ہر ہدایت سے محروم رہتا ہے۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ یعنی آپ صبر وثابت قدمی کے ساتھ رہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔

''صبر'' کے لفظی معنٰی باندھنے کے ہیں اسی لئے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے بھی ''صبر'' بولا جاتا ہے جس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ نیک کاموں کے کرنے پر اپنے نفس کو ثابت قدم رکھے اور یہ بھی کہ بُرے کاموں میں مبتلا ہونے سے اُس کو روکے، اس جگہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم دینے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ جو اَحکام آیاتِ مذکورہ میں آپ کو دیئے گئے ہیں مثلاً اِستقامت، اقامتِ صلوٰۃ وغیرہ ان پر آپ مضبوطی سے قائم رہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اور ایذاؤں پر صبر کی تلقین مقصود ہو، اور اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محسنین یعنی نکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اس میں بظاہر ''محسنین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیاتِ مذکورہ کے اَحکام امر و نہی کے پابند ہوں، یعنی دین میں استقامت کا مقام ان کو حاصل ہو، حدودِ شرعیہ کی پوری رعایت کرتے ہوں، ظالموں کے ساتھ دوستی اور بے ضرورت تعلق نہ رکھتے ہوں، نماز کو آداب کے ساتھ افضل وقت میں ادا کرنے کے پابند ہوں، تمام اَحکامِ دین پر ثابت قدم ہوں۔

اور خلاصہ ان سب کا وہی ہے جو ''احسان'' کی تعریف میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اِطاعت وعبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یا کم از کم یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں،[2] جب انسان کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے یقین کا یہ درجہ حاصل ہوجائے تو اُس کے تمام اقوال وافعال خود بخود درست ہوجاتے

[1] مسند احمد، مسند ابی بکر الصدیق رضی الله عنه رقم الحدیث:۲، وتفسیر ابن کثیر سورة آل عمران:۱۳۵، ج:۲ ص:۱۲۴

[2] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبریل النبی صلی الله علیه وسلم ج:۱ ص:۱۲

ہیں، علماء سلف میں تین کلمے ایسے معروف تھے جو باہم ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے، وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں اوّل یہ کہ جو شخص آخرت کے لئے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے دُنیا کے کاموں کو خود بخود درست فرمادیتے ہیں اور ان کی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں، دُوسرے یہ کہ جو شخص اپنی باطنی حالت کو درست کرلے کہ قلب کا رُخ سب سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دے تو اللہ تعالیٰ اُس کی ظاہری حالت کو خود بخود درست فرمادیتے ہیں، تیسرے یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملہ کو صحیح و درست کرلے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور تمام لوگوں کے درمیان کے معاملات کو خود درست فرمادیتے ہیں، اصل عبارت ان تین کلمات کی یہ ہے:- وَكَانَ اَهْلُ الْخَبَرِ يَكْتُبُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ بِثَلَاثِ كَلِمَاتٍ، مَنْ عَمِلَ لِاٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ اَمْرَ دُنْيَاهُ، وَمَنْ اَصْلَحَ سَرِيْرَتَهٗ اَصْلَحَ اللّٰهُ عَلَانِيَتَهٗ وَمَنْ اَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اَصْلَحَ اللّٰهُ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ۔ (تفسیر روح المعانی ج:۲ ص:۱۳۱)

تیسری اور چوتھی آیتوں میں پچھلی اقوام پر عذابِ الٰہی نازل ہونے کی وجہ اور لوگوں کو اُس سے بچنے کی ہدایت اس طرح دی گئی ہے کہ فرمایا:

''ان پچھلی قوموں میں افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا کہ ان میں کچھ بھی سمجھ دار نیک لوگ ہوتے جو اپنی قوم کو فساد کرنے سے باز رکھتے، بجز تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا، اور وہی عذاب سے محفوظ رہے، اور باقی پوری قوم دُنیا کی لذتوں میں پھنس کر جرائم پیشہ بن گئی۔''

اِس آیت میں اہل الرائے اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ اُولُوْا بَقِيَّةٍ سے تعبیر کیا ہے، بَقِيَّه کا لفظ باقیماندہ چیز کے لئے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کردیتا ہے مگر اُس کو نہیں دیتا، اسی لئے عقل و بصیرت کو ''بَقِيَّه'' کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا کہ آپ کا ربّ شہروں اور بستیوں کو ظلم سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ ان کے بسنے والے نیکوکار یعنی مسلمان ہوں ــــــ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ظلم و جور کا کوئی امکان نہیں، جن کو ہلاک کیا جاتا ہے وہ اسی کے مستحق ہوتے ہیں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے اور مُصْلِحُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو باوجود مشرک کافر ہونے کے معاملات اور اخلاق اچھے رکھتے ہیں، کسی کو نقصان و ایذا نہیں پہنچاتے، جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ دُنیا کا عذاب کسی قوم پر محض اُن کے مشرک و کافر ہونے کی وجہ سے نہیں آتا جب تک کہ وہ اعمال و اخلاق میں بھی ایسے کام نہ کرنے لگیں جن سے زمین میں فساد پھیلتا ہے، پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آئے اُن کے خاص خاص اعمالِ بد اُس کا سبب بنے، نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کو طرح طرح کی

ایذائیں پہنچائیں، قومِ شعیب علیہ السلام نے ناپ تول میں کمی کر کے فساد پھیلایا، قومِ لوط علیہ السلام نے بدترین قسم کی بدکاری کو شیوہ بنایا، قومِ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے اپنے پیغمبروں پر ظلم ڈھائے، قرآنِ کریم نے دنیا میں ان پر عذاب آنے کا سبب انہی اعمال و افعال کو بتلایا ہے، نرے کفر و شرک کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا اُس کی سزا تو جہنم کی دائمی آگ ہے، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ ملک وسلطنت کفر و شرک کے ساتھ چل سکتے ہیں مگر ظلم و جور کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

اِختلافِ مذموم اور محمود

پانچویں آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی اُمت وملت بنا دیتا ـــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبولِ اسلام پر مجبور کر ڈالتے، سب کے سب مسلمان ہی ہو جاتے ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا مگر بتقاضائے حکمت اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اس نے انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کر دیا ہے اُس کے ماتحت وہ اچھا یا بُرا جو چاہے عمل کر سکتا ہے، اور انسان کی طبائع مختلف ہیں اِس لئے راہیں مختلف ہوتی ہیں اور عمل مختلف ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ دینِ حق سے اختلاف کرتے ہی رہیں گے بجز اُن لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی، یعنی انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دینِ حق اور تعلیمِ انبیاء کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمۂ دین اور فقہاءِ اسلام میں ہونا ناگزیر ہے اور عہدِ صحابہؓ سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمتِ الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کے اختلافات کو اس آیت کی رُو سے غلط، خلافِ رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاقِ آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ

❋❋❋

تفسیر معارف القرآن میں قرآنِ کریم کی سورتوں کی فہرست

جامعہ دارالعلوم کراچی

JAMIA DARULULOOM KARACHI